شہریت اور اس سے متعلق مسائل

[اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کے ۲۳ ویں سمینار مؤرخہ ۱ تا ۳/ مارچ ۲۰۱۴ء منعقدہ جامعہ علوم القرآن، جمبوسر (گجرات) میں پیش کئے جانے والے علمی و تحقیقی مقالات، مباحثات اور مناقشات کا مجموعہ]

ایفا پبلیکیشنز - نئی دہلی

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	:	شہریت اور اس سے متعلق مسائل
صفحات	:	۶۹۰
قیمت	:	۵۹۰
سن طباعت	:	فروری ۲۰۱۵ء

ناشر

ایفا پبلیکیشنز

۱۶۱-ایف، بیسمنٹ، جوگا بائی، پوسٹ باکس نمبر: ۹۷۰۸

جامعہ نگر، نئی دہلی-۱۱۰۰۲۵

ای میل:ifapublication@gmail.com

فون:26981327 - 011

مجلس ادارت

۱- مولانا محمد نعمت اللہ اعظمی

۲- مولانا محمد برہان الدین سنبھلی

۳- مولانا بدر الحسن قاسمی

۴- مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

۵- مولانا عتیق احمد بستوی

۶- مفتی محمد عبید اللہ اسعدی

بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

پیش لفظ	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی	۱۱

پہلا باب: تمہیدی امور

اکیڈمی کا فیصلہ		۱۵
سوالنامہ		۱۷
تلخیص مقالات	ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی	۱۹
عرض مسئلہ	مولانا اختر امام عادل قاسمی	۷۹
	ڈاکٹر و مفتی محمد شاہجہاں ندوی	۹۵

دوسرا باب: ماہرین کی تحریریں

شہریت کے حقوق وفرائض-قرآن وحدیث کی روشنی میں	پروفیسر ڈاکٹر حسن السید خطاب	۱۰۳
ملکی آئین اور بین الاقوامی معاہدات کی پابندی کا مسئلہ	عبداللہ بن علی سالم	۱۴۰
اسلام میں شہریت کی حیثیت اور اسلامی ممالک میں رہنے والے غیر مسلموں کے شہری حقوق-قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک تحقیقی مطالعہ	پروفیسر ڈاکٹر علی محی الدین قرہ داغی	۱۴۷
شہریت کا مسئلہ-شہریت، حقوق انسانی اور بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں	ڈاکٹر عرشی خان	۲۰۶
ہندوستان میں شہریت کا قانون-ایک جائزہ	پروفیسر اقبال علی خان	۲۴۵
کسی مسلم ریاست کی شہریت: مسائل وچیلنجز	ڈاکٹر سیف الدین عبدالفتاح	۲۵۸
شہریت اور پناہ گزینوں سے متعلق حقوق	ڈاکٹر رشید کھوس	۲۹۶

تیسرا باب: تفصیلی مقالات

شہریت اور شہری حقوق کی شرعی بنیادیں	ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی	۳۲۹
انسان کی شہریت اور حقوق کا مسئلہ-فقہ وقانون کی نظر میں	مولانا اختر امام عادل قاسمی	۳۴۷
شرعی اور سیاسی تناظر میں شہریت اور اس سے متعلق احکام	مولانا محمد اقبال ٹنکاروی	۳۸۴
غیر مسلموں کو مسلم ملک میں شہریت دینا	مولانا ابوسفیان مفتاحی	۴۰۲

اسلام میں حصول شہریت کی بنیاد اور موجودہ سیاسی نظام	مولانا خورشید انور اعظمی	۴۱۰
کسی بھی ملک کا شہری ہونے کی شرعی بنیادیں	مولانا خورشید احمد اعظمی	۴۲۱
حقوق شہریت کی حقیقت واصلیت شرعی نقطہ نظر سے	مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی آواپوری	۴۳۰
اسلام اور شہریت	مولانا اشرف عباس قاسمی	۴۴۷
شہریت کا مسئلہ-حقوق اور احکام کے تناظر میں	مولانا رحمت اللہ ندوی	۴۵۷
شہریت سے متعلق چند اہم مسائل	قاضی محمد حسن ندوی مدھبونی	۴۶۴
شہریت حاصل کرنے کی شرعی بنیاد	مولانا محمد قمر الزماں ندوی	۴۷۵
اسلام میں حصول شہریت کے بنیادی عناصر	مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی	۴۸۴
اسلام کے عطا کردہ شہری ودیگر حقوق	مولانا عبیداللہ ندوی	۴۹۸
قانون اسلام میں شہریت کا مفہوم اور شہریوں کے حقوق	مولانا نثار احمد حصیر القاسمی	۵۱۱
شہریت کے شرعی احکام	مولانا محمد توقیر بدر القاسمی	۵۲۷
حصول شہریت کے موجودہ مسائل	مولانا ریحان مبشر قاسمی	۵۳۷
اسلام میں شہریت کی بنیادیں	مولانا محمد فخر عالم نعمانی	۵۷۲
مروجہ نظام شہریت اور اسلامی شریعت	مولانا احمد نور عینی قاسمی	۵۸۳

چوتھا باب: مختصر تحریریں

شہریت سے متعلق جوابات	مولانا زبیر احمد قاسمی	۶۱۱
مما لک اسلامیہ میں غیر مسلم کو شہریت دینے کا مسئلہ	ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی	۶۱۵
تبدیلی وطن کے جواز اور تحصیل شہریت کا حکم	مفتی حبیب اللہ قاسمی	۶۲۲
شہریت، حصول شہریت اور حقوق	مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی	۶۲۴
شہریت-اسلامی تناظر میں	ڈاکٹر مفتی محمد فہیم اختر ندوی	۶۳۰
کسی دوسرے مسلم یا غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا	مفتی محمد جعفر ملی رحمانی	۶۳۶
شہریت کا مسئلہ-قرآن وسنت کی روشنی میں	مفتی محمد ابوبکر قاسمی	۶۳۹
شہریت اور شہری حقوق کے حصول کا مسئلہ	مولانا عبداللہ کاوی والا	۶۴۳
شریعت اسلامی میں شہریت کی اساس	مفتی محمد سلمان منصور پوری	۶۴۵
مسلم ملکوں میں غیر مسلم کی شہریت کا مسئلہ	مفتی ظہیر احمد کانپوری	۶۵۱

عصر حاضر میں حصول شہریت کا مسئلہ	مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی	۶۵۶
شہریت سے متعلق بعض اہم مسائل	مفتی سعید اسعد قاسمی	۶۵۸
شہریت کے فقہی وقانونی اصول وضوابط	مولانا ضیاء اللہ عباس ندوی	۶۶۲
اسلامی نقطہ نظر سے حقوق شہریت	مولانا محمد ثوبان اعظم القاسمی	۶۶۸

پانچواں باب: اختتامی امور

مناقشہ:	۶۷۵

☆☆☆

پیش لفظ

شہریت اور اسلامی نقطہ نظر

اللہ تعالی نے کائنات کی یہ وسیع وعریض بستی اپنے تمام بندوں کے لئے بسائی ہے، انسان کے علاوہ اللہ تعالی کی دوسری مخلوقات نے عملی طور پر اس آفاقیت کو باقی رکھا ہے، ایسا نہیں ہے کہ ایک ملک کے شیر کو دوسرے ملک میں جانے کی اجازت نہیں ہو، یا ایک خطہ میں رہنے والی ہرن کو دوسرے خطے میں رہنے کے لئے ویزے کی ضرورت پڑتی ہو، انسان کے بارے میں بھی اسلام کا بنیادی تصور یہی ہے، بقول شاعر:

ہر ملک، ملک ماست کہ ملک خدائے ماست

لیکن انسان کی فطرت میں کچھ ایسی تنگ نظری واقع ہوئی ہے کہ اسے اپنے ہی ہم جنسوں کا وجود گوارہ نہیں، اسی لئے اس نے اس دنیا کو براعظموں، ملکوں اور صوبوں میں تقسیم کردیا ہے اور بہت چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں دنیا بٹ گئی ہے، اسی تقسیم کے بطن سے شہریت کا مسئلہ پیدا ہوا ہے، ہر ملک نے اپنی سرحدوں کو باہر کے لوگوں کے لئے بند کر رکھا ہے، سرحد سے باہر چاہے ایک ہی زبان بولنے والے لوگ، ایک ہی نسل سے تعلق رکھنے والے اور ایک ہی مذہب کے ماننے والے ہوں، لیکن انہیں سرحد پار کرنے کی اجازت نہیں اور نہ ان کو سرحد کے اس پار رہنے والوں کے مماثل حقوق واختیارات حاصل ہیں؛ اسی لئے شہریت کے مسئلہ نے اس دور میں بڑی اہمیت حاصل کرلی ہے اور اس سے بہت سے حقوق اور ذمہ داریاں متعلق ہوگئی ہیں۔

حقوق وفرائض کی تعیین میں عدل واعتدال ضروری ہے اور اسلام نے جس نظام حیات کا تصور پیش کیا ہے، اس میں بنیادی طور پر اس پہلو کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اسی پس منظر میں اکیڈمی کے ۲۳ویں فقہی سمینار منعقدہ جمبوسر (گجرات) بتاریخ ۲۸-۲۹ر ربیع الثانی وکیم جمادی الاولی ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱-۳ر مارچ ۲۰۱۴ء میں اس بین الاقوامی مسئلہ کو شامل کیا

گیا، عام طور پر ہمارے روایتی علماء کے بارے میں یہ تصور پایا جاتا ہے کہ وہ موجودہ دور کے تقاضوں سے نابلد اور عالمی حالات ومسائل سے بے خبر ہیں، لیکن اس سمینار میں علماء اور ارباب افتاء نے جو گراں قدر مقالات لکھے، جس فکری گہرائی کے ساتھ مسائل پر غور کیا، حالات پر احکام شریعت کو منطبق کیا اور شریعت کی اصل روح ''قیام عدل'' کو اخذ واستنباط کی بنیاد بنایا، وہ اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے کافی ہے، امید ہے کہ یہ مجموعہ اس مسئلہ پر اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کے اعتبار سے رہنما ثابت ہوگا۔

اللہ تعالی جزائے خیر عطا فرمائے محبّ عزیز مولانا احمد نادر القاسمی رفیق شعبہ علمی کو کہ انہوں نے دقت نظر کے ساتھ اس مجلّہ کی پروف ریڈینگ کی ہے اور اس کے اکثر حصہ کی ایڈیٹنگ کا بھی فریضہ انجام دیا ہے، جبکہ کچھ صفحات کی ایڈیٹنگ شعبہ علمی کے ایک اور رفیق ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی نے کی ہے، دعا ہے کہ یہ مجموعہ عنداللہ وعندالناس مقبول ہو، ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

خالد سیف اللہ رحمانی
(جنرل سکریٹری، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا)

۲/ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ
۲۳/جنوری ۲۰۱۵ء

پہلا باب

تمہیدی امور

اکیڈمی کا فیصلہ:

شہریت سے متعلق مسائل

۱- اسلام ایک دین اور مسلمان ایک امت ہیں، اسلام مسلمانوں کو ایک وحدت سے جوڑتا ہے اور ان کو ایک جسم وجان کا درجہ دیتا ہے، اس لحاظ سے اسلام کا اصل مزاج یہ ہے کہ مسلمان خواہ وہ دنیا کے کسی حصے میں ہوں، کلمہ کی بنیاد پر ایک امت ہیں، اور ان کے درمیان کسی تفریق وامتیاز کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی اور نہ کسی جانبدارانہ سلوک کی اجازت دی جاسکتی ہے۔

۲- البتہ عہد جدید میں مغرب کے اثرات سے موجودہ نظام شہریت نے جو حد بندیاں قائم کی ہیں اور جغرافیائی بنیادوں پر انسانوں میں تقسیمات کی گئی ہیں نیز ہر ملک کے شہری کو ایک الگ قوم تصور کیا جاتا ہے، افسوس کہ اس کے اثرات امت مسلمہ پر بھی پڑے ہیں، مختلف ملکوں میں رہنے والے مسلمانوں کو قومِ واحد کی بجائے مختلف قوموں میں تقسیم کردیا گیا ہے اور ان کی آزادانہ نقل وحرکت اور قیام وسکونت میں مشکلات پیدا ہوگئی ہیں، گو یہ نظام، اسلام کے آفاقی نظریۂ وحدت سے ہم آہنگ نہیں ہے، لیکن موجودہ بین الاقوامی احوال اور علاقائی مصالح واسباب کے تحت ملکوں میں شہریت کا جو نظام رائج ہے، موجودہ حالات میں اس کو قبول کرنے کی گنجائش ہے۔

۳- مسلم یا غیر مسلم ملک کا مسلمان کسی مسلم ملک میں شہریت کا خواہش مند ہو اور اس کے اپنے ملک میں دین وایمان، جان ومال اور عزت وآبرو کو سخت خطرہ درپیش ہو تو اس مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا لازم ہوگا۔

۴- کسی ملک کے مسلمان مجبور ہوکر دوسرے مسلم ملک میں پناہ گزیں ہوجائیں تو ایسے ملک کا فریضہ ہے کہ وہ ان پناہ گزینوں کو تمام شہری حقوق عطا کرے۔

۵- کسی مسلمان کے لیے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی درج ذیل صورتیں ہیں:

(الف) ایسا غیر مسلم ملک جہاں دین وایمان جان ومال اور نسل کے تحفظ کو خطرہ ہو وہاں کی شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے؛ البتہ اس قسم کے خطرات نہ ہوں تو جائز ہے۔

(ب) کسی ملک کی غیر اسلامی تہذیب وتمدن سے متأثر ہو کر وہاں کی شہریت حاصل کرنا جائز نہیں ہے۔

(ج) محض معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے مسلم ملک کے کسی شہر کا غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا ناپسندیدہ ہے۔

(د) معاشی مجبوریوں طبی ضرورتوں، اور تعلیمی مقاصد کے لیے غیر مسلم ملک کی شہریت کا حصول جائز ہے۔

(ھ) دعوتی اغراض کے لیے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا مستحب ہے۔

☆☆☆

سوالنامہ:

شہریت سے متعلق بعض مسائل

گذشتہ ادوار میں کسی ملک میں بسنے کے لئے قانونی طور پر شہریت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، جب عالم اسلام ایک جھنڈے کے نیچے تھا تب تو یہ صورت حال تھی، جب مختلف مسلم مملکتیں موجود میں آگئیں، اس وقت بھی یہی صورت حال باقی رہی، غیر مسلم حضرات بھی مسلم ممالک میں اسی طرح آباد ہوسکتے تھے؛ البتہ جب ایک ملک میں بسنے والا وقتی ضرورت اور عارضی قیام کے لئے دوسرے ملک میں جاتا تو اسے امان حاصل کرنی پڑتی اور تجارتی مقاصد کے تحت جاتا تو ٹیکس ادا کرنا ہوتا؛ لیکن موجودہ دور میں قومی عصبیتوں اور علاقہ ووطن کی بنیاد پر انسانیت کی تقسیم کے مغربی تصور کے تحت ایک ملک کا رہنے والا یونہی نہ تو دوسرے ملک میں داخل ہوسکتا ہے اور نہ وہاں آباد ہوسکتا ہے، یہ بھی ایک افسوسناک حقیقت ہے کہ اس معاملہ میں مغربی ملکوں سے زیادہ دل ونگاہ کی تنگی مسلم ملکوں میں پائی جاتی ہے۔

دوسری طرف عصر حاضر میں معاشی مقاصد، سیاسی حالات، تہذیبی مماثلت اور موسم کی موافقت وعدم موافقت کی وجہ سے نقل آبادی کا سلسلہ جاری ہے، اس پس منظر میں یہ مسئلہ جسے حق شہریت حاصل کرنے سے تعبیر کیا جاتا ہے، بڑی اہمیت اختیار کر گیا ہے، اب یہ بین الاقوامی مسئلہ ہے اور اقوام متحدہ نے اس سلسلہ میں کئی اہم فیصلے کئے ہیں۔

اس پس منظر میں شرعی نقطۂ سے چند سوالات آپ کی تحقیق وتوجہ کے طالب ہیں:

(۱) اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے کس بات کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے: کسی ملک میں بود وباش اختیار کر لینے کو، وہاں معاشی سرگرمیاں انجام دینے کو، ایک مخصوص مدت تک وہاں قیام کو، یا کسی اور بات کو؟

(۲) اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً ضروری ہوگا یا نہیں؟

(۳) بعض دفعہ کسی خاص خطہ میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں اور وہاں کے مسلمان کسی اور مسلم ملک کی پناہ لیتے ہیں تو انھیں پناہ گزیں کا درجہ دیا جاتا ہے؛ لیکن انھیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، کیا یہ بات شرعاً درست ہے؟ کیا یہ بات جائز مانی جاسکتی ہے کہ مسلمان تارکین وطن کو دوسرے مسلمان ملک میں اس ملک کے قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی

سہولتیں نہیں دی جائیں؟

(۴) اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے کیا حقوق مانے جائیں گے؟ جیسے: ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں اُمیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق، وغیرہ۔

(۵) شریعتِ اسلامی میں پناہ گزینوں کو کیا حقوق حاصل ہوں گے، نیز کون سے حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے اور ان کو حاصل نہیں ہوں گے؟

(٦) کیا کسی مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی؟

(۷) کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا؟

☆☆☆

تلخیص مقالات:

شہریت کا مسئلہ

ڈاکٹر صفدر زبیر ندوی☆

بنی نوع انسان شروع زمانہ سے ہی نقل مکانی کرتا آرہا ہے، اور تب ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ آباد ہوجانا آسان تھا، لیکن اب سرحدی حدبندیوں نے نقل مکانی کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کردی ہیں، نقل مکانی کرکے کسی دوسری جگہ مستقل سکونت اختیار کرنا روز بروز مشکل ہوتا جارہا ہے، موجودہ زمانہ کی جنگی صورتحال، معاشی ناہمواری اور مختلف قوموں کے درمیان ذہنی انتشار نے اس راہ میں مزید مشکلات پیدا کردی ہیں، اس کے نتیجہ میں کسی ملک کی شہریت کے حصول میں طرح طرح کے مسائل سامنے آنے لگے ہیں، خاص طور پر پناہ گزینوں کے تعلق سے نئی پیچیدگیاں سامنے آرہی ہیں، یہ ایک اہم اور حساس مسئلہ بنتا جارہا ہے، اس لئے اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے اس کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اپنے ۲۳ ویں فقہی سمینار (منعقدہ ۱-۳ مارچ ۲۰۱۴ء جمبوسر گجرات) کا موضوع بحث بنایا ہے، اس موضوع پر ملکی اور بیرون ملک علماء کے اب تک ۳۲ر مقالے اکیڈمی کو موصول ہوچکے ہیں، جن کی تلخیص ذیل میں پیش کی جارہی ہے، تاکہ ہر ایک کی آراء سے استفادہ آسان ہوسکے۔

اکیڈمی نے اس موضوع سے متعلق سات سوالات علماء کی خدمت میں ارسال کئے تھے جن میں سے پہلا سوال تھا:

سوال نمبر: (۱) اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے کس بات کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟

شہریت کا موضوع ہونے کی وجہ سے بعض حضرات نے لفظ شہریت کے معنی ومطالب پر بھی روشنی ڈالی ہے، اور اس لفظ کو موجودہ دور کی اصطلاح قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ شہریت (Citizenship) کا ترجمہ ہے اور قومیت (Nationality) اسی کا وسیع تر مفہوم ہے، جس کا معنی ہے: کسی بھی ملک میں قانونی طور سے رہنے کا حق پانا، یعنی فرد اور ملک کے درمیان رابطہ وتعلق کا نام شہریت ہے، جس کا تعین ملکی آئین وقانون کرتا ہے اور اس آئین وقانون کے مطابق اس

☆ رفیق شعبہ علمی، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔

شہری کو حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اس پر ملک کے تعلق سے ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں (دائرۃ المعارف البریطانیہ، آکسفورڈ ڈکشنری) (دیکھئے مقالہ: مولانا محمد توقیر بدر القاسمی، مولانا نثار احمد حصیر القاسمی وغیرہ)۔

جبکہ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کا کہنا ہے کہ شہریت اپنے جدید مفاہیم کے ساتھ معاصر دور کی پیداوار تو ہے، لیکن اس کے ابتدائی خدوخال سے اسلام کی تاریخ نا آشنا نہیں ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ میثاق مدینہ کی بعض دفعات سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جس اجتماعیت کی بنیاد رکھی تھی اس میں مختلف اہل مذاہب شریک تھے، شہر کی حفاظت ان سب کی مشترکہ ذمہ داری تھی، شہر پر حملہ ہو یا اس معاہدہ میں شامل فریقوں میں سے کسی فریق پر حملہ ہو تو اس کی مدد اور شہر کا مقابلہ تمام فریقوں پر لازم تھا۔ غور کیا جائے تو شہریت کے موجودہ تصور کی بنیاد میں یہی بات شامل ہے۔

اس شہریت کی بعض حضرات نے دو قسمیں کی ہیں: پیدائشی شہریت اور اکتسابی یا اختیاری شہریت۔

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی، مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا احمد نور عینی قاسمی کے بقول پیدائشی شہریت سے مراد کسی ملک میں پیدائش کی بنیاد پر بچہ کو ملنے والی شہریت ہے، لیکن مولانا احمد نور عینی قاسمی نے اس کی تفصیل کرتے ہوئے اس کی دو شقیں بیان کی ہیں: ایک یہ کہ بچہ کی جائے پیدائش کا اعتبار کیا جائے گا، خواہ اس کے والدین کہیں اور کے رہنے والے ہوں، جیسا کہ ارجنٹینا میں قانونی طور پر اس کا اعتبار کیا جاتا ہے، اگر ارجنٹینا کے رہنے والے والدین کے بچے کی پیدائش کسی اور ملک میں ہوئی تو وہ بچہ ارجنٹینا کا شہری نہیں سمجھا جائے گا۔ دوسرا یہ کہ بچہ کی پیدائش میں والدین کی شہریت کا اعتبار کیا جاتا ہے، والدین جس ملک کے باشندہ ہیں بچہ کو اسی ملک کا شہری سمجھا جائے گا، خواہ اس کی پیدائش کہیں پر بھی ہو، جیسا کہ جرمنی، سویڈن اور سوئٹزرلینڈ وغیرہ کا قانون ہے، لیکن بعض ممالک ایسے ہیں کہ ان کے یہاں دونوں صورتیں پائی جاتی ہیں یعنی ان کے ملک کے والدین کے بچے کی پیدائش کہیں پر بھی ہو وہ والدین کے ملک کے شہری کہلائیں گے، اور اگر غیر ملکی والدین کے بچے کی پیدائش اس ملک میں ہوئی ہے تو وہ بھی والدین کے ملک کے بجائے اپنے پیدائشی ملک کے شہری کہلائیں گے، جیسا کہ امریکہ، برطانیہ، فرانس وغیرہ میں یہ قانون ہے۔

اکتسابی یا اختیاری شہریت سے مراد یہ ہے کہ ایک شخص پیدائشی طور پر کسی ملک کا شہری ہے، لیکن وہ کسی دوسرے ملک کا شہری بننا چاہتا ہے، یعنی اس کے حصول میں سعی وارادہ کا دخل ہو، اس شہریت کے حصول کے دو طریقوں کا ذکر مولانا اختر امام عادل قاسمی نے کیا ہے:

۱- اس ملک میں شادی کر لی جائے۔

۲- حکومت سے شہریت کے حصول کی درخواست کی جائے۔

جبکہ مولانا احمد نور عینی قاسمی نے مزید چار طریقوں کا اضافہ کیا ہے:

۱-زمین خریدنا۔

۲-سرکاری ملازمت اختیار کرنا۔

۳- لمبے عرصے تک قیام کرنا۔

۴-غیر ملکی والدین کے بچوں کو بالغ ہونے کے بعد شہریت کا اختیار حاصل ہونا۔

لیکن مولانا اختر امام عادل صاحب نے یہ بھی تفصیل کی ہے کہ کبھی ایسا ہوگا کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت منسوخ ہوجاتی ہے، جیسے کہ اگر کوئی ہندوستانی برطانیہ کی شہریت حاصل کرلے تو اس کی ہندوستانی شہریت منسوخ ہوجائے گی، اور یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت برقرار رہے، جیسے کہ اگر کوئی پاکستانی برطانیہ کی شہریت حاصل کرلے تو اسے دونوں جگہوں کی شہریت برقرار رکھنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔

مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی کی رائے ہے کہ شہریت کے لئے قریب ترین لفظ وطن ہے، جیسا کہ قرآن نے **''ومساکن ترضونها''** (توبہ: ۲۴) کو اوطان کے معنی میں استعمال کیا ہے، اسی طرح استدلال میں **''المسلم مواطنا فی أوربا''** کی یہ عبارت بھی پیش کرتے ہیں: **كلمة الوطن فی اللغة تشير إلى الأرض التی يقيم عليها الإنسان وهو محل الإنسان** (ص/ ۳۴)۔

اور مولانا نثار احمد حصیر قاسمی کہتے ہیں کہ اسلامی شریعت میں شہریت وطنیت کے ہم معنی ہے، جبکہ مولانا محمد فخر عالم نعمانی کا کہنا ہے کہ شہریت کی اصطلاح وطنیت سے قریب تو ہے، لیکن مفہوم میں بڑا فرق ہے، شہریت جنسیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جب کہ وطنیت کے لفظ میں بہت توسع ہے، وقتی رہائش گاہ کے لئے بھی وطن کا لفظ استعمال ہوسکتا ہے، مگر دونوں میں فرق کرنے کے لئے مستقل قیام گاہوں کو وطن اصلی یا وطن قرار کہا جاتا ہے، اور عارضی قیام گاہوں کو وطن اقامت، وطن سکونت یا وطن مستعار کہا جاتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جس معنی میں آج شہریت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے وہ اصطلاح صرف وطن اصلی یا وطن قرار میں پائی جاتی ہے، اس کی تفصیل مولانا اختر امام عادل قاسمی نے اپنے مقالہ میں پیش کی ہے۔

اسلام میں حصول شہریت کی بنیادیں:

اکثر مقالہ نگار حضرات نے پیدائش، رشتہ ازدواج اور مستقلاً بود و باش اختیار کر لینے کو شہریت کے حصول کی بنیاد قرار دیا ہے، اور اسے وطن اصلی سے مشابہ یا قائم مقام قرار دے کر مندرجہ ذیل عبارتوں کو اپنا مستدل بنایا ہے:

آیات:

۱-''ومن آیاته خلق السموات والأرض واختلاف ألسنتکم وألوانکم إن فی ذلک لآیات للعالمین''(الروم:۲۲)(مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۲-''ولا تکونوا کالتی نقضت غزلها من بعد قوة أنکاثا تتخذون أیمانکم دخلا بینکم أن تکون أمة هی أربی من أمة إنما یبلوکم الله به ولیبینن لکم یوم القیامة ما کنتم فیه تختلفون''(النحل:۹۲) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۳-''یا أیها الناس إنا خلقناکم من ذکر وأنثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أکرمکم عند الله أتقاکم''(الحجرات:۱۳)(مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۴-''یا أیها الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منهما رجالاً کثیراً ونساء''(النساء:۱)(مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۵-''والذین آووا ونصروا أولئک هم المؤمنون حقا''(انفال:۷۴)(مقالہ مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی)۔

۶-''ولقد بوأنا بنی إسرائیل مبوأ صدق''(یونس:۹۳)(مقالہ مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی)۔

عبارات:

۱-''الوطن الأصلی هو موطن ولادته أو تأهله أی تزوجه، قال فی شرح المنیة: ولو تزوج المسافر ببلد ولم ینو الإقامة به، فقیل: لا یصیر مقیما، وقیل: یصیر مقیما، وهو الأوجه، ولو کان له أهل ببلدتین فأیتهما دخلها صار مقیما، أو توطنه، أی عزم علی القرار فیه وعدم الارتحال، وإن لم یتأهل''(ردالمحتار ۲/۵۸۶)(مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ریحان مبشر قاسمی)۔

۲-''الأوطان ثلاثة: وطن أصلی وهو مولد الإنسان، وموضع تأهل به، أو من قصد التعیش به لا الارتحال، ولو تزوج المسافر فی بلد لم ینو الإقامة فیه، قیل: یصیر مقیما، وقیل: لا''(فتح القدیر ۲/۴۱) (مقالہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

۳-''الوطن الأصلی هو مولد الرجل والبلد الذی هو فیه'' (التعریفات للجرجانی ۱/۳۲۷) (مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۴-''من تأهل ببلدة فهو من أهلها'' (شرح السیر الکبیر ۱/۱۰۷) (مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا ریحان مبشر قاسمی)۔

۵-''الأوطان ثلاثة: وطن أصلی وهو وطن الإنسان فی بلدته أو بلدة أخری اتخذها داراً وتوطن بها مع أهله وولده ولیس من قصده الارتحال عنها، بل التعیش بها، وطن الإقامة وهو أن یقصد الإنسان أن یمکث فی موضوع صالح للإقامة خمسة عشر یوماً أو أکثر، ووطن السکنی وهو أن یقصد الإنسان المقام فی غیر بلدته أقل من خمسة عشر یوما'' (بدائع الصنائع ۱/۲۸۰) (مقالہ مولانا محمد فخر عالم نعمانی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی، مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی محمد ثناء الہدی قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی)۔

۶-''والوطن فی الثانیة هو المسافر بقریة فیها أهله وولده، فأقام عندهم ولو صلاة واحدة أتم... ومن کتاب ابن المواز: وإذا لم تکن مسکنه، ولکنه نکح بها فلا یتم حتی یبنی بأهله ویلزمه السکنی'' (مواہب الجلیل لشرح مختصر خلیل للحطاب ۲/۵۰۰) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۷-''وطن أصلی وهو مولد الرجل والبلد الذی تأهل به'' (المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی ۲/۳۵) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی)۔

۸-''هو الذی ولد فیه أو تزوج أو لم یتزوج وقصد التعیش فیه لا الارتحال عنه'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۳۰۴) (مقالہ مفتی اشرف عباس قاسمی)۔

۹-''الأول الوطن وهو ما اتخذ فیه الإقامة بنیة التأبید'' (شرح مختصر خلیل للخرشی ۵/۸۸) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

بعض مقالہ نگاروں نے اس میں کچھ اضافے بھی کئے ہیں اور مختلف رجحانات کا اظہار کیا ہے، جیسا کہ مولانا ریحان مبشر مئوی قاسمی نے بعض ممالک کے تعلق سے زمین کی خریداری، سرکاری ملازمت کا حصول، معاشی سرگرمی انجام دینے اور ملک کے انضمام کو بھی شہریت کے حصول کی بنیاد قرار دیا ہے، لیکن آگے کہتے ہیں کہ اول الذکر تینوں اصولوں کو اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بنیاد نہیں بنایا جاسکتا کہ یہ ٹھوس معیار یا مستحکم اصول نہیں ہیں اور انہیں اختیار کرنے میں بہت سارے

مسائل سامنے آسکتے ہیں۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی، مولانا خورشید انور اعظمی اور مولانا محمد شاہجہاں ندوی وغیرہ نے ایمان وعقیدہ اور وحدت دین کو بھی شہریت اور وطنیت کی بنیاد قرار دیا ہے، مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے مندرجہ ذیل آیات سے استدلال کیا ہے:

۱-''والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض''(التوبہ:۷۱)۔

۲-''إن الأرض لله يورثها من يشاء من عباده''(الاعراف:۱۲۸)۔

۳-''يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا الكافرين أولياء من دون المؤمنين أتريدون أن تجعلوا لله عليكم سلطاناً مبينا''(النساء:۱۴۴)۔

۴-''إنما المؤمنون إخوة''(الحجرات:۱۰)(مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے والے صحابہ کرام مدینہ منورہ کے شہری ایمان کی بنیاد پر قرار پائے۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی نے اس کے مستدلات میں درج ذیل دو حدیثوں کا اضافہ کیا ہے:

۱-''المسلمون كرجل واحد إن اشتكى عينه اشتكى كله وإن اشتكى رأسه اشتكى كله''(صحیح مسلم، باب تراحم المؤمنین وتعاطفہم، حدیث نمبر:۶۷۵۴)۔

۲-''إنما مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم كالجسد إذا اشتكى منه شيئاً تداعى له سائر الجسد''(مسند الشہاب القضاعی، حدیث نمبر:۱۳۶۷)۔

☆ مفتی محمد ابوبکر قاسمی نے مورث کی شہریت کو بھی وارث کے لئے اس ملک کی شہریت کے حصول کی بنیاد قرار دیا ہے۔

☆ مولانا محمد توقیر بدر قاسمی اور مفتی سعید اسعد قاسمی لکھتے ہیں کہ اگر کوئی مسلمان اپنے معاشی نظام کو بہتر بنانے کے لئے کسی ملک میں مستقل سکونت اختیار کرلے تو اسے شہریت کے حصول کی بنیاد مانا جائے گا۔

☆ مولانا محمد مصطفی قاسمی کے مطابق معاشی سرگرمیاں انجام دینے اور ایک مخصوص مدت تک قیام کرنے کو بھی شہریت کے حصول کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

☆ قاری ظفر الاسلام صدیقی نے اکیڈمی کے ۱۷ویں سمینار کی دو تجاویز کو شہریت کی بنیاد بنانے کی بات کہی ہے، جو درج ذیل ہے:

۱- جائے ملازمت وتجارت میں طویل اقامت کے ساتھ ذاتی مکان بھی بنالینا دائمی قیام کی نیت پر دلالت کرتا ہے، اس لئے مذکورہ جگہ وطن اصلی شمار کی جائے گی۔

۲- جائے ملازمت وتجارت میں ذاتی مکان تو نہیں بنایا، بلکہ کرایہ کے مکان یا ادارہ وکمپنی کے فراہم کردہ مکان میں اہل وعیال کے ساتھ مستقل قیام کی نیت سے رہائش پذیر ہے تو اس جگہ کو وطن اصلی کا حکم حاصل ہوگا۔

واضح ہو کہ ان دونوں قراردادوں میں اہل وعیال کے ساتھ مستقل قیام کی نیت کو جنسیت کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

لیکن مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی اور مفتی محمد جعفر ملی رحمانی کی رائے ہے کہ تجارتی ومعاشی مقاصد کے تحت محدود ومخصوص مدت تک قیام یا کسی اور مقصد سے عارضی قیام کو شہریت کی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا ہے، ان حضرات نے درج ذیل عبارتوں کو اپنا مستدل قرار دیا ہے:

۱-''**وطن الإقامة: موضع ينوى أن يستقر فيه خمسة عشر يوما أو أكثر من غير أن يتخذه مسكنا**''(التعریفات/۳۲۷)۔

۲-''**لو انتقل من البلد الذى تأهل به بأهله وتوطن ببلدة أخرى لا تبقى البلدة المنتقل عنها وطنا له، ألا ترى أن مكة كانت وطنا أصلياً لرسول اللهﷺ ثم هاجرمنها إلى المدينة بأهله وتوطن ثمة انتقض وطنه بمكة حتى قال عليه السلام عام حجة الوداع: أتمّوا صلاتكم يا أهل مكة، فإنا قوم سفر**''(کفایۃ شرح ہدایہ ۲/۱۷)۔

۳-''**ولو تزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة به فقيل: لايصير مقيما، وقيل: يصير مقيما وهو الأوجه**''(ردالمحتار ۲/۶۴۱)۔

۴-''**وإن قال الميمنة غدا على أهل المصيصة فكان رجل من أهل الكوفة سكن المصيصة، فإن كان اتخذها منزلا فهو من المصيصة، لقولهﷺ: "من تأهل ببلدة فهو من أهلها"، ولأن من يكون ساكنا فى بلدة مقيما بها يعد فى الناس من أهلها، ألا ترى أنا إذا عددنا فقهاء الكوفة ذكرنا فى جملتهم النخعى والشعبى وأبا حنيفة رضى الله عنهم وهم ما كانوا من الكوفة فى الأصل ولكنهم سكنوها**''(شرح کتاب السیر الکبیر ۱/۱۷۰)۔

جبکہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور ایک حد تک مولانا ریحان مبشر قاسمی کا رجحان یہ ہے کہ اگر مصلحت متقاضی ہو اور مسلمانوں کے مفادات متاثر نہ ہوتے ہوں تو ایک مخصوص مدت کے قیام کے بعد شہریت دے دینے میں کوئی حرج نہیں ہے،

مستدلات درج ذیل ہیں:

۱- ’’تصرف الإمام علی الرعیة منوط بالمصلحة‘‘ (الاشباہ ۱/۳۲۸)۔

۲- ’’والأصل أن الحربی إذا دخل دار الإسلام بأمان، ینبغی للإمام أن یتقدم إلیه، فیضرب له مدة معلومة علی حسب ما یقتضی رأیه، ویقول له: إن جاوزت المدة جعلتک من أهل الذمة، فقد رضی بصیرورته ذمیا‘‘ (بدائع الصنائع ۷/۱۱۰)۔

☆ مفتی حبیب اللہ قاسمی، مفتی محمد سلمان منصور پوری، حافظ کلیم اللہ عمری، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اور مولانا محمد قمر الزماں ندوی وغیرہ نے شہریت کے حصول کے لئے ملک کی حکومت کی اجازت، اس کی مصلحت اور اس کے قوانین وضوابط کو بنیاد بنایا ہے، لیکن مولانا عبید اللہ ندوی نے اس کے ساتھ یہ شرط لگائی ہے کہ یہ اصول وضابطے اور قوانین خلاف شرع نہ ہوں، نیز کسی حرام کے ارتکاب پر مبنی نہ ہوں، اور بقول مفتی ثناء الہدی قاسمی حکومت کی اجازت کے بغیر وہاں داخل ہونا یا وہاں بود وباش اختیار کرنا شرعاً ممنوع ہوگا۔ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی نے اس کی تفصیل کرتے ہوئے کسی ملک میں بود وباش اختیار کر لینے کو شہریت کے حصول کی بنیاد بنانے کے لئے حکومت سے اجازت لینے کی قید لگائی ہے، اور اس سلسلہ میں بعض احادیث سے استدلال کیا ہے، مثلاً:

۱- ایک اعرابی نے مدینہ ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو آپ ﷺ نے منع کرتے ہوئے فرمایا: ’’ویحک إن شأن الهجرة شدید، فهل لک من إبل؟ قال: نعم، قال: فهل تؤدی صدقتها؟ قال: نعم، قال: فاعمل من وراء البحار، فإن الله لم یترک من عمل لک شیئاً‘‘ (بخاری ۲/۹۱۱، کتاب الادب)۔

۲- بخاری کی حدیث میں غزوہ طائف کے بیان میں ایک مخنث کا ذکر آیا ہے جس کا نام ’’ھیت‘‘ تھا، اس نے عبد اللہ بن ابی امیہ کے سامنے نازیبا انداز گفتگو اپنایا، جس پر حضور ﷺ نے اس کی تنبیہ کی، علامہ قسطلانی کے حوالہ سے محشی لکھتے ہیں: ’’ثم أجلاه من المدینة إلی الحمی، فلما ولّي عمر بن الخطاب قیل له: إنه قد ضعف وکبر، فاحتاج فأذن له أن یدخل کل جمعة فیسأل الناس ویرد إلی مکانه‘‘ (حاشیہ بخاری ۲/۶۱۹، کتاب المغازی)۔

۳- صاحب ’’عمدۃ القاری‘‘ نے حضرت ابوموسی کے حوالہ سے دور صدیقی وفاروقی میں اس طرح کے پیش آنے والے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے: ’’نفی أبوبکر ماتعاً إلی فدک، ولیس بها أحد یومئذ من المسلمین، وأخرج عمر فلاناً وفلاناً‘‘ (عمدۃ القاری ۹/۳۴)۔

☆ مولانا رحمت اللہ ندوی کے نزدیک شہریت کی بنیاد کوئی ایک متعین شی نہیں ہے، بلکہ مختلف چیزوں میں سے کسی کو بھی بنیاد بنایا جاسکتا ہے، اور اس سلسلہ میں جس ملک کی جو پالیسی یا قانون حکومت ہو اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

دوہری شہریت:

مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا محمد فخر عالم نعمانی کی رائے میں ایک شخص دوہری شہریت بھی حاصل کرسکتا ہے، مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو شہریت کے حصول کے مستقل بنیادوں میں سے کوئی ایک بنیاد (مثلاً رشتہ ازدواج) حاصل ہوگئی، یعنی پہلے سے اس کے اہل وعیال کسی ملک میں ہوں اور اس نے کسی دوسرے ملک میں شادی کرلی تو اسے دونوں جگہوں کی شہریت حاصل ہوجائے گی اور دونوں جگہوں کی حیثیت اس کے لئے وطن اصلی کی ہوگی، استدلال کے طور پر یہ عبارت پیش کی ہے:

"وإن کان له أهل بلدة فاستحدث بلدة أخرى أهلاً فكل واحد منهما وطن أصلي وروى أنه كان لعثمان رضى الله عنه أهل بمكة وأهل بمدينة، وكان يتم الصلاة بهما جميعا" (المحیط البرہانی ۳۶/۲)۔

غیر مسلم کی شہریت:

بعض مقالہ نگاروں نے غیر مسلم کی شہریت کے تعلق سے بھی بحث کی ہے، اور اس سلسلہ میں ولاء اور عقد ذمہ کو بنیاد بنایا ہے، اور **"وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه"** (سورۂ توبہ: ۶۰) کو دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

☆ مولانا احمد نور عینی قاسمی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ اسلام میں حصول شہریت کی اصل دو بنیادیں ہیں: غیر مسلموں کے لئے عقد ذمہ اور مسلمانوں کے لئے ہجرت، اگر کوئی شخص ہجرت کر کے دارالاسلام آجائے تو وہ پورے دارالاسلام کا شہری ہوگا، اور اگر شہریت کا طالب کوئی غیر مسلم ہے تو اسے مسلم مملکت کا شہری بننے کے لئے عقد ذمہ کرنا پڑے گا، البتہ مولانا موصوف نے ایک قید یہ لگائی ہے کہ اگر کوئی شخص دارالاسلام میں آتا ہے یا کوئی مسلمان دارالاسلام سے باہر کہیں سکونت اختیار کرلیتا ہے تو ایسے شخص کو مملکت کو حرج وضرر سے بچانے کے لئے اپنا رجسٹریشن کرانے کا پابند بنایا جاسکتا ہے۔

☆ مولانا محمد قمر الزماں ندوی عقد ذمہ کے ساتھ ساتھ معاہدہ ولاء کو بھی اسلامی مملکت کی شہریت کے حصول کے لئے بنیاد قرار دیتے ہیں، اور استدلال میں میثاق مدینہ کو پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ شہریت کی یہ اساس عقیدہ کی اساس کے علاوہ تھی جو اختلاف عقیدہ کے باوجود انہیں اسلامی ریاست کا فرد شمار کرتی تھی، اور نبی کریم ﷺ کا یہ قول: **"لهم ما للمسلمين وعليهم ما عليهم"** (ابن حبان) اس سلسلہ میں قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا احمد نور عینی قاسمی وغیرہ نے ذمی کی شہریت کے تعلق سے یہ تفصیل کی ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم وقتی قیام کی غرض سے یا مستامن کی حیثیت سے دارالاسلام میں داخل ہوکر طویل مدت تک قیام کرے یا مستقل قیام کا ارادہ کرلے، یا کسی متوطن سے رشتہ ازدواج قائم کرلے، یا کوئی خراجی زمین خرید لے تو اسے شہریت حاصل ہوجائے گی اور ذمی، یعنی اسلامی ریاست کا غیر مسلم شہری قرار پائے گا۔

عارضی قیام کی مدت:

بعض حضرات نے عارضی قیام کی مدت پر بھی بات کی ہے، اور کم از کم مدت ایک سال قرار دیا ہے، بعض حضرات نے اس مدت کو حکومت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے۔

لیکن مولانا رحمت اللہ ندوی کہتے ہیں کہ یہ عارضی مدت ایک ہفتہ کی بھی ہوسکتی ہے، اور طویل مدت ایک سال یا اس سے زائد ہوسکتی ہے، ''**إذا دخل الحربی إلينا مستأمنا لم يمكّن أن يقيم فی دارنا سنة، ويقول له الإمام: إن أقمت تمام السنة وضعت عليک الجزية .... وللإمام أن يوقت فی ذلک ما دون السنة كالشهر والشهرين**''(ہدایہ ثانی ر ۵۸۵)۔

مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی نے مدت کی تعیین میں افراد کے اعتبار سے فرق کیا ہے، ان کا رجحان یہ ہے کہ غیر مسلم مستامن کے لئے شہریت کے حصول کے لئے اس کے قیام کی مدت زیادہ سے زیادہ ایک سال کی ہوگی، لیکن اگر کوئی ایسا غیر مسلم جو کسی میدان میں اختصاص رکھتا ہو، اور مستقبل میں اس سے ضرر کا اندیشہ نہ ہو اور ملک کو اس کی خدمات کی اشد ضرورت ہو تو کسی مدت کے بغیر ہی اسے شہریت دی جاسکتی ہے، اپنی رائے کی تائید میں والی مصر حضرت عمرو بن العاصؓ کا وہ واقعہ پیش کیا ہے کہ جب آپ کو قسطنطنیہ کے مشہور عیسائی طبیب اتوشیوس راسطیوس کے فضل وکمال کی شہرت کا پتہ چلا تو اسے اپنے پاس بلا کر اپنے ساتھ رکھ لیا، ''**فلازمه وكان لا يكاد يفارقه**''(دیکھئے: معارف، جلد ر ۶۶، ماہ نومبر ۱۹۵۰ء ص ر ۳۴۳)۔

مفتی محمد اقبال ٹنکاروی اور مولانا عبید اللہ ندوی وغیرہ نے ۴ ر سال یا اس سے زائد کی مدت کو بہتر قرار دیا ہے، اور محدثین کے اس اصول سے استدلال کیا ہے کہ راوی کو کسی شہر کی طرف منسوب کرنے کے لئے اس کے قیام کی مدت اس شہر میں کتنی ہونی چاہئے؟ ''**كم المدة التی إن أقامها الشخص فی بلد نسب إليها؟ أربع سنين، وهو قول عبد الله بن المبارک**''(تیسیر مصطلح الحدیث، باب ر ۲۰، ص ر ۲۳۳)، بعض محدثین کے یہاں اس سے کم مدت بھی ہے (دیکھئے: الباعث الحثیث، باب معرفۃ أوطان الرواۃ وبلدانہم)۔

موجودہ نظام شہریت:

متعدد حضرات نے موجودہ نظام شہریت کے ضمن میں دارالحرب، دارالاسلام اور دارالمعاہدہ وغیرہ کی بحث کی ہے، اور مختلف حوالے درج کئے ہیں، اسی ضمن میں مولانا رحمت اللہ ندوی نے لکھا ہے کہ ملکوں کی تقسیم دارالحرب اور دارالاسلام کے اعتبار سے کرنا آج کل محل نظر ہے، اس پر سب سے تفصیلی بحث مولانا احمد نور عینی قاسمی نے کی ہے، جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

اسلامی تعلیمات میں شہریت کے بنیادی تصور (یعنی کسی مملکت کا مستقل باشندہ بننا اور مملکتوں کے اختلاف سے حقوق وفرائض کا مختلف ہونا) کو تسلیم کیا گیا ہے؛ لیکن چونکہ مروجہ نظام شہریت کی رو سے دارالاسلام کی شہریت کا تعدد لازم آتا ہے، ہر مسلم مملکت کی علاحدہ شہریت ہے اور شہریت کا یہ تعدد حقوق وفرائض کے سلسلہ میں مسلمانوں کو اجنبی اور شہری کے خانوں میں تقسیم کرتا ہے اس لئے یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک جدید مسئلہ ہے، اس مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے شہریت کے سلسلہ میں چند باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے؛ تاکہ دائرۂ بحث کی تحدید ہوجائے:

☆ شہریت کا ایک مفہوم یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی الگ الگ شہریتیں تسلیم کی جائیں اور دارالحرب کی مختلف مملکتوں کی شہریتوں کو مستقل الگ شہریت کا درجہ دیا جائے، فقہ اسلامی میں اس کی صراحت موجود ہے؛ لہذا یہ دائرۂ بحث سے خارج ہے۔

☆ شہریت سے اگر مراد کسی مملکت (دار) کا مستقل باشندہ بننا ہو تو اس کا بھی واضح تصور فقہ اسلامی میں موجود ہے، اس لئے اس پر بحث کرنا بے سود ہے۔

☆ شریعت میں چوں کہ بہ غرض تعارف علاقہ وقبائل کی طرف نسبت کرنا جائز ہے؛ اس لئے شہریت کا یہ پہلو کہ علاقے کی طرف نسبت کرکے مصری شہری یا فلسطینی شہری کہا جائے، کسی بحث کا محتاج نہیں ہے۔

☆ مسلمانوں کے سلسلہ میں اصل تو یہی ہے کہ مسلمان دارالاسلام کے جس حصے کو چاہیں اپنا مسکن بنائیں؛ لیکن موجودہ دور کے پیچیدہ نظام حکومت میں اس اصل پر مطلقاً عمل کرنے میں کاروبار سلطنت حرج اور ضرر سے دوچار ہوسکتا ہے، اس لئے "الحرج مدفوع" اور "الضرر یزال" جیسے فقہی قواعد کی رو سے نو واردین اور مہاجرین کو رجسٹریشن کا پابند بنایا جاسکتا ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں اصل یہی ہے کہ ان کی درخواست قبول کرلی جائے؛ البتہ کسی شرعی مانع اور معقول عذر کی وجہ سے ان کی درخواست رد کی جاسکتی ہے۔

☆ وہ مباح امور جن کے جواز اور عدم جواز کے سلسلہ میں شریعت خاموش ہو اور ان کے جائز ہونے کی صراحت

شرع میں وارد نہ ہوئی ہو، ایسے امر کے بارے میں مسلم مملکتوں کے حکمراں باہمی رضامندی سے "**الأصل في الأشياء الإباحة**" اور "**المسلمون على شروطهم**" (ترمذی: حدیث نمبر ۱۳۵۲) کی روسے شہریت سے متعلق قانون سازی کر سکتے ہیں۔

☆ مذکورہ بالا باتیں اس قدر واضح ہیں کہ ان پر بحث کرنا تحصیل حاصل ہے؛ لیکن قومیت کو قوانین شہریت کا مدار بنانا، دارالاسلام کو کسی مرکز کے تابع کرنے کے بجائے ہر مملکت کو مستقل مملکت کی حیثیت دینا، مسلمانوں کے حقوق وفرائض کا جغرافیائی سرحدوں تک سمٹ آنا، علاقہ وملک کی بنیاد پر مسلمانوں کے حقوق وفرائض تقسیم کرنا، ان کو ملکی وغیر ملکی شہری واجنبی اور مستقل باشندہ وپناہ گزیں کے خانوں میں باٹنا، حصول شہریت کے طریقہ کار اور فسخ شہریت کے اسباب کے سلسلہ میں وضعی قوانین نافذ کرنا — مروجہ نظام شہریت سے متعلق یہ وہ امور ہیں جو بحث وتحقیق کے متقاضی ہیں اور ان ہی امور کی وجہ سے شہریت کا مروجہ نظام ایک جدید مسئلہ بن گیا ہے، اس مسئلہ کی تکییف شرعی کی بابت دونوں طرح کے نقاط نظر ہیں، ایک جواز کا نقطۂ نظر اور دوسرا عدم جواز کا، ان دونوں نقاط نظر کے دلائل حسب ذیل ہیں:

جواز کے دلائل:

۱- ولاء الموالاۃ: اس ولاء کی تعریف ''موسوعہ فقہیہ'' میں یوں مذکور ہے:

"**هو أن يعاهد شخص شخصا آخر على أنه إن جنى فعليه أرشه، وإن مات فميراثه له**" (ولاء: ۱۲۸/۴۵)۔

حنفیہ نے اس کی توضیح یوں کی ہے:

"**تفسير ولاء الموالاة أن يسلم الرجل على يدي رجل فيقول للذي أسلم على يديه أو لغيره: واليتك على أني إن مت فميراثي لك، وإن جنيت فعقلي عليك وعلى عاقلتك، وقبل الآخر منه، فهذا هو نفس ولاء الموالاة**'' (المحیط البرہانی ۱۸۷/۴)۔

ولاء الموالاۃ کی مذکورہ بالا تعریف وتوضیح سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اس کے ذریعہ موالات کرنے والے (المولی الاسفل) اور جس کے ساتھ موالات کی گئی (المولی الاعلی) دونوں کو کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور دونوں پر فرائض عائد ہوتے ہیں؛ لہذا جس طرح اس ولاء کے ذریعہ کسی دوسرے نسب اور خاندان کے فرد سے حقوق وفرائض متعلق ہوتے ہیں، جو ولاء الموالاۃ نہ کرنے والے سے متعلق نہیں ہوتے اسی طرح مملکت بھی ایک بڑا قومی خاندان ہے اور اگر کوئی شخص شہریت حاصل کرے تو اس سے وہ حقوق وفرائض متعلق ہوتے ہیں جو شہریت حاصل نہ کرنے والوں سے متعلق نہیں ہوتے؛ لہذا جب ولاء الموالاۃ شرعا جائز ہے تو عقد شہریت بھی شرعا جائز ہوگا۔

۲- ’’عن أبی الدرداء قال: قال رسول اللهﷺ: ما أحل الله فی کتابه فهو حلال وما حرم فهو حرام وما سکت منه فهو عفو، فاقبلوا من الله عافیته، فإن الله لم یکن لینسی شیئاً، ثم تلا: ’’وما کان ربک نسیاً‘‘ رواه البزار والطبرانی فی الکبیر وإسناده حسن ورجاله موثقون ‘‘(مجمع الزوائد: کتاب العلم ۱/۴۱۶)۔

اس حدیث میں یہ واضح حکم ہے جن چیزوں کی حلت وحرمت مذکور نہ ہو؛ بلکہ وہ مباح درج کی ہوں تو وہ جواز کے دائرے میں رہیں گی، موجودہ نظام شہریت کا تعلق بھی اسی قبیل سے ہے، اس لئے اسے اختیار کرنا شرعاً جائز ہوگا۔

۳- فقہ کا مشہور قاعدہ ہے: ’’الأصل فی الأشیاء الإباحة‘‘ اس قاعدہ کی رو سے فقہاء نے بے شمار مسائل کو مباح ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، موجودہ نظام شہریت بھی اسی اصل کی رو سے مباح ہے؛ لہذا حاکموں کو یہ اختیار ہے کہ وہ اسے قانون کی شکل میں نافذ کرسکیں، اس کی نظیر تدوین دواوین کا نظام ہے، جو ’’الأصل فی الأشیاء الإباحة‘‘ کے تحت مباح تھا، حضرت عمرؓ نے اس کو باضابطہ مملکت کے ایک نظام کی شکل دی۔

۴- موجودہ نظام شہریت کا تعلق ایک طرح سے بین الاقوامی قانون ومعاہدہ سے ہے اور معاہدہ کی پابندی شرعاً ضروری ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

’’یا أیها الذین آمنوا أوفوا بالعقود‘‘(المائدہ:۱)(اے ایمان والو! اپنے عقدومعاہدے پورے کرو)۔

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

’’الصلح جائز بین المسلمین إلا صلحاً حرم حلالاً أو أحل حراماً، والمسلمون علی شروطهم إلا شرطاً حلالاً أو أحل حراماً – قال أبوعیسی: هذا حدیث حسن صحیح‘‘(ترمذی، حدیث نمبر: ۱۳۵۲)۔

لہذا بین الاقوامی معاہدے کی وجہ سے مسلم مملکتوں میں مروجہ شہریت کے نظام کو اپنانا اسلامی مزاج کے عین مطابق ہے۔

۵- بالفرض اگر موجودہ نظام شہریت کو اصلاً ناجائز مان بھی لیا جائے تو بھی شہریت کا حصول ایک مجبوری بن گئی ہے؛ کیوں کہ اس کے بغیر کوئی بھی شخص کسی دوسری مملکت کا باشندہ نہیں بن سکتا، اس لئے ’’الضرورات تبیح المحظورات‘‘ قاعدے کے تحت شہریت کا یہ نظام جواز کے دائرہ میں آجائے گا۔

عدم جواز کے دلائل:

۱- آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

''أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله وأن محمداً عبده ورسوله، وأن يستقبلوا قبلتنا ويأكلوا ذبيحتنا وأن يصلوا صلاتنا، فإذا فعلوا ذلک حرمت علينا دماؤهم وأموالهم إلا بحقها، لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين ..... قال أبوعيسى: هذا حديث حسن صحيح غريب من هذا الوجه'' (ترمذی حدیث نمبر:۲۶۰۸)۔

اس حدیث میں مسلمانوں کو حقوق حاصل ہونے اوران پر فرائض عائد ہونے کی بنیاد اسلام کو بنایا گیا ہے اور جنس ووطن اور علاقہ وملک سے قطع نظر تمام مسلمانوں کو حقوق وفرائض کے سلسلہ میں یکساں درجہ دیا گیا ہے۔

وہ قبائل جو مملکت مدینہ کی حدود میں داخل نہیں تھے؛ بلکہ بعد میں مملکت مدینہ کے ساتھ الحاق کرلیا تھا ان کو بھی آپ ﷺ نے یہی بتایا کہ ان میں سے جو لوگ ایمان قبول کرلیں ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ہمیں حاصل ہیں اور ان پر وہی فرائض عائد ہوں گے جو ہم پر عائد ہیں؛ مثلاً آپ ﷺ نے شاہان حمیر کے قاصد کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا کہ:

''إنه من أسلم من يهودى أو نصرانى فإنه من المؤمنين، له مالهم وعليه ما عليهم'' (سیرت ابن ہشام ۲/۵۸۸)۔

اور عمرو بن حزمؓ کو یمن روانہ فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا:

''من أسلم من يهودى أو نصرانى إسلاماً خالصاً من نفسه ودان بدين الإسلام، فإنه من المؤمنين، له مثل ما لهم وعليه مثل ما عليهم'' (سیرت ابن ہشام ۲/۵۹۴)۔

اسی طرح قبیلہ غفار کے نام آپ ﷺ نے یہ نامہ مبارک رقم فرمایا:

''... أنهم من المسلمين، لهم ما للمسلمين وعليهم ما على المسلمين'' (طبقات ابن سعد، ذکر بعثت الرسول)۔

یہی بات حضرت سلمان فارسیؓ نے مملکت فارس کے معرکہ آراؤں سے کہی تھی:

''فإن أسلمتم فلكم مثل الذى لنا وعليكم مثل الذى علينا'' (ترمذی، کتاب السیر، حدیث نمبر: ۱۵۴۸)۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی یہ حدیث اس بات کی مزید وضاحت کرتی ہے کہ اگر مملکت فارس کی فارسی قوم بھی حلقہ بہ گوش اسلام ہوجائے تو اسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو عرب کی قوم کو حاصل ہیں اور اس پر بھی وہی فرائض عائد ہوں گے جو عربوں پر عائد ہیں؛ کیونکہ حقوق وفرائض کی بنیاد اسلام ہے؛ نہ کہ نسل وملک، مگر موجودہ نظام شہریت میں حقوق وفرائض کی بنیاد ملک ومملکت ہے نہ کہ اسلام، یہی وجہ ہے کہ ایک مسلم مملکت کے باشندے کو دوسری مسلم مملکت میں اجنبیوں کے درجہ میں رکھا جاتا ہے، اسی لئے موجودہ نظام شہریت اپنے وضعی اصولوں کے ساتھ شرعاً ناقابل قبول ہے۔

۲-مسلم ملک کا کسی دوسرے ملک کے مسلمان کوشہریت دینا:

اکثر مقالہ نگار حضرات نے شہریت کی درخواست کو قبول کرنا مسلم ملک پر شرعاً واجب اور ضروری قرار دیا ہے، اگر وہ مسلمان کسی مجبوری خصوصاً ایمان واسلام کی حفاظت کی وجہ سے اس مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے، جیسا کہ آیات واحادیث سے واضح ہوتا ہے:

۱-**"إنما المؤمنون إخوة"** (الحجرات:۱۰)۔

۲-**"والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض"** (التوبہ:۷۱)۔

۳-**"وإن استنصروكم فى الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق والله بما تعملون بصير"** (انفال:۷۲)۔

۴-**"قال رسول الله ﷺ: انصر أخاك ظالماً أو مظلوماً، فقال رجل: يا رسول الله! أنصره إذا كان مظلوما أفرأيت إذا كان ظالماً كيف أنصره؟ قال: تحجزه أو تمنعه من الظلم فإن ذلك نصره"** (بخاری ۱۰۲۸/۲)۔

مگر بعض حضرات نے اس سلسلہ میں قیود اور شرطیں لگائی ہیں، مثلاً:

☆ مولانا احمد نور عینی قاسمی کا کہنا ہے کہ شہریت کی درخواست کو قبول کرنا اگر اسلامی نقطہ نظر سے مسلمانوں یا مسلم ملک کی مصلحت کے خلاف ہو تو پھر اس کی درخواست رد کی جاسکتی ہے، موصوف نے مثال میں اس واقعہ کو پیش کیا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عثمانؓ نے حضرت ابوذرؓ کو بعض انتظامی مصلحتوں کی وجہ سے مدینہ سے باہر منتقل کردیا تھا، کیونکہ ان کا مدینہ میں رہنا بعض پہلوؤں سے مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں تھا۔

☆ مولانا سعید اسعد قاسمی یہ شرط لگاتے ہیں کہ شرعی وسائل اور رقبہ میں اس کے آباد کرنے کی گنجائش موجود ہو۔

☆ مولانا زبیر احمد قاسمی نے یہ شرط لگائی کہ درخواست کو قبول کرنے میں اس مسلم ملک کو کوئی ضرر شدید لاحق نہ ہو۔

☆ مفتی اشرف عباس قاسمی کی رائے ہے کہ اگر کسی معاہدے کی خلاف ورزی ہورہی ہو تو درخواست قبول نہ ہوگی، کیونکہ معاہدوں پر قائم رہنا اور وعدوں کا ایفاء کرنا بھی اسلامی مملکت کی اہم ذمہ داریوں میں سے ہے، اور مثال میں حضرت ابوجندلؓ اور حضرت ابوبصیرؓ کے واقعہ کو پیش کیا ہے۔

لیکن مولانا اختر امام عادل قاسمی نے اس معاہدہ سے خواتین کو الگ رکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ پوری مدت معاہدہ میں کسی کو مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی گئی، لیکن ہجرت کرکے آنے والی خواتین کو حضور ﷺ نے واپس نہیں فرمایا، اس لئے کہ

معاہدہ کی رو سے حضرت ام کلثوم بنت عقبہ یاسبیعہ بنت حارث اسلمیہ کی واپسی کا مسئلہ اٹھا تو اس پر ''**یا أیھا الذین آمنوا إذا جاءکم المؤمنات مھاجرات......**'' (سورۂ ممتحنہ:۱۰) والی آیت اتری اور مدینہ آنے والی خواتین کو اس معاہدہ سے مستثنیٰ کیا گیا، چنانچہ مولانا موصوف بھی اس کے قائل ہیں کہ اس قسم کے معاہدوں کا اطلاق خواتین پر نہیں ہونا چاہئے۔

جبکہ مولانا محمد فخر عالم نعمانی ایسے معاہدہ کو کالعدم قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر اسلامی ریاست غیر مسلم ملکوں سے مہاجرین کے معاملہ میں کوئی معاہدہ کرے جس کی رو سے دوسرے ملکوں کے مہاجرین کو اسلامی حکومتیں اپنے یہاں مستقل سکونت نہ دے سکتی ہوں تو یہ شرط حنفیہ کے نزدیک باطل ہے اور اس طرح کے کسی معاہدہ کو پورا کرنا ضروری نہیں ہے (فتاوی ہندیہ ۲/۱۹۷)۔

☆ مولانا ابوسفیان مفتاحی نے اس شرط کے ساتھ اجازت دی کہ وہ مسلمان فساد اور بغاوت کا مزاج نہ رکھتا ہو۔

☆ مولانا زبیر احمد قاسمی اور مفتی عبد اللہ کاوی والا کا کہنا ہے کہ اگر کوئی مسلمان صرف خواہش کی بنیاد پر شہریت اختیار کرنا چاہے تو مسلم ملک پر اس درخواست کو قبول کرنا ضروری نہ ہوگا، حکومت کو اختیار ہوگا چاہے تو قبول کرے اور چاہے تو رد کردے۔ لیکن مولانا محمد توقیر بدر قاسمی اور مفتی سعید اسعد قاسمی کا رجحان یہ ہے کہ اگر وہ مسلمان علم دوست ہے، دینی مزاج رکھتا ہے، اور اس کے اس ملک میں آنے سے مسلمانوں کا بھلا ہوگا تو ایسے شخص کی درخواست قبول کی جانی چاہئے، بلکہ بقول مولانا محمد توقیر بدر قاسمی ایسی صورت میں واجب اور ضروری ہے، اور استدلال میں قرآن کی یہ آیت پیش کی ہے: ''**ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ ما علیک من حسابھم من شئ وما من حسابک علیھم من شئ فتطردھم فتکون من الظالمین**'' (الانعام:۵۲)۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی کی رائے ہے کہ مجبوری اگر ایسی ہے کہ اس سے دین یا جان یا عزت وآبرو یا مال کو شدید خطرہ لاحق ہو تو ایسی صورت میں شہریت کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً فرض ہوگا، اور دلیل کے طور پر یہ آیات پیش کی ہیں:

۱- ''إن الذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا بأموالھم وأنفسھم فی سبیل اللہ والذین آووا ونصروا أولئک بعضھم أولیاء بعض والذین آمنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شئ حتی یھاجروا وإن استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر'' (الانفال:۷۲)۔

۲- ''والذین آمنوا وھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللہ والذین آووا ونصروا أولئک ھم المؤمنون حقا لھم مغفرۃ ورزق کریم'' (الانفال:۷۴)۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی، مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی اور مولانا عبید اللہ ندوی نے مجبوری یا خواہش کے بجائے مطلق ہجرت کرکے دار الاسلام میں آنے والوں کے لئے توسع کا رکھا ہے، اور قرآن کی اس آیت کو دلیل بنایا ہے:

۱-"إن الذین توفاهم الملائکة ظالمی أنفسهم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الأرض قالوا ألم تکن أرض الله واسعة فتهاجروا فیها فأولئک مأواهم جهنم وساء ت مصیرا" (النساء: ۹۷) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۲-"یا أیها الذین آمنوا إذا جاءتکم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهن الله أعلم بإیمانهن فإن علمتموهن مؤمنات فلا ترجعوهن إلی الکفار" (الممتحنہ: ۱۰) (مقالہ مولانا محمد فخر عالم نعمانی)۔

۳-"لا تثریب علیکم الیوم ....." (معارف القرآن ۵/ ۳۰۹) (مقالہ مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی)۔

☆ مولانا عبید اللہ ندوی نے مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کا استثناء کیا ہے، اور اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ وہاں شہریت دیئے جانے سے تعداد میں کافی اضافہ ہوگا جس کی وجہ سے حج وعمرہ کی ادائیگی میں دشواری ہوگی۔

☆ مولانا خورشید انور اعظمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، اور مولانا ریحان مبشر قاسمی اگر کوئی مسلمان مجبوری کے بجائے صرف اپنی خواہش کی بنیاد پر کسی مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا واجب وضروری کے بجائے صرف مستحب ہوگا۔ مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے دلیل کے طور پر یہ حدیث پیش کی ہے: "المسلم أخو المسلم لا یظلمه ولا یسلمه، من کان فی حاجة أخیه، کان الله عزوجل فی حاجته" (بخاری، حدیث نمبر: ۲۴۴۲، مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۰)۔

☆ مولانا خورشید احمد اعظمی نے صرف دینی وشرعی مجبوری کی وجہ سے درخواست کو قبول کرنے کو واجب قرار دیا ہے، اور دلیل کے طور پر یہ آیت ذکر کی ہے، "وإن استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر إلا علی قوم بینکم وبینهم میثاق والله بما تعملون بصیر" (انفال: ۷۲)۔

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی وغیرہ نے درخواست دینے والے مسلمان کے سلسلہ میں مسلم ملک اور غیر مسلم ملک کا باشندہ ہونے میں فرق کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

اگر وہ کسی مسلم ملک کا باشندہ ہے اور وہاں اسے کوئی مجبوری نہیں ہے، صرف ایک قلبی تمنا وخواہش ہے کہ کسی دوسرے ملک میں آباد ہو تو ایسے مسلمان کی درخواست کو قبول کرنا دوسرے مسلم ملک پر ضروری نہ ہونا چاہئے؛ کیونکہ یہاں بھی

وہ کسی مسلمان حاکم کی ولایت میں ہےاور یہاں وہ تمام دینی اموراچھی طرح ادا کرسکتا ہے۔

ہاں! اگر مجبوری ہے، مسلم حکومت ہونے کے باوجود کچھ دینی امور، دینی تعلیم اور بنیادی مذہبی وشہری حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے، پھر بھی یہ مسلمان اس ملک میں رہ کر جدوجہد کرے اور بنیادی حقوق کے حصول کے لئے کوشاں رہے،تو امید ہے کہ ماحول سازگار ہوگا،سعی وکاوشیں بارآور ہوگی۔

پھر بھی اگر یہ لوگ کسی دوسرے مسلم ملک میں مجبوری کی وجہ سے شہریت لینا چاہتے ہیں تو ان کو حق شہریت دینے کے بجائے یہ صورت زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے کہ دوسرے مسلم ممالک اس مسلم ملک پر دباؤ بنائیں جو اپنے مسلم شہریوں کو بنیادی حقوق سے محروم رکھے ہوئے ہے۔ کیوں کہ شہریت طلب کرنے والے کو شہریت دے دینا یہ کوئی حل معلوم نہیں ہوتا، اہل حکومت مسلمان ہیں؛ لہذا انہیں کسی کا آلۂ کار نہ بننے پر سمجھایا جائے،اور رعایا کے حقوق سمجھائے جائیں؛ تاکہ وہ لوگ جو کسی مجبوری کی وجہ سے کسی طرح دوسرے ملک کی شہریت لینے کے خواہش مند ہونے کے باوجود شہریت نہیں لے سکتے انہیں بھی فائدہو۔

ہاں! اگر کسی مسلمان ملک کا حاکم یا برسراقتدار جماعت کسی فرقۂ ضالہ کی ہمنوا ہےاوراس سے یہ توقع رکھنا بیجا ہو کہ وہ کسی مسلمان کو ان کے بنیادی حقوق، دینی امور کی ادائیگی اور بنیادی دینی تعلیم کا حق دے تو ایسے مسلمان کو حق شہریت طلب کرنے پر اخوت ایمانی، بھائی چارگی، غیرت وحمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے ملک کو شہریت دینی چاہئے۔ کیونکہ اس مسلمان پر اب مسلم ملک میں زمین تنگ کردی گئی ہے؛ حالانکہ اللہ پاک کی پیدا کردہ زمین میں وسعت ہے تو اب دوسرا مسلم ملک اس وسعت میں اپنے اس مسلم بھائی کو آباد کرے۔

اوراگر وہ کسی کافر ملک میں آباد ہےاوراب کسی مسلم ملک میں شہریت لینا چاہتا ہے تو اگراس مسلمان کو کافر ملک میں پریشانی نہیں ہےاور حالات بھی سازگار ہیں،لوگوں کو عبادات وغیرہ کی اجازت ہےاوروہ مسلمان اس کافر ملک سے مسلمان ملک میں آباد ہونا چاہے تو بھی اس کو حق شہریت دینا بہتر معلوم ہوتا ہے، جیسے مہاجرین حبشہ آپ ﷺ کی مکی زندگی میں حبشہ ہجرت کرکے آباد ہوئے تھےاور وہاں کے بادشاہ کی طرف سے کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں تھی، وہ صحابہ کرام وہیں رہے۔ حضرت جعفرؓ فرماتے ہیں:

”**لما نزلنا أرض الحبشة جاورنا خير جار وأمنا على ديننا، عبدنا الله تعالى لا نؤذى ونسمع شيئاً نكرهه**“(السیرۃ الحلبیہ :باب الہجرۃ الثانیۃ إلی الحبشہ ۲/۳۰)۔

فتح خیبر کے بعد مہاجرین حبشہ میں سے حضرت جعفر بن ابوطالبؓ کو آپ نے حبشہ واپس نہیں لوٹایا، بلکہ ان کی آمد پر

خوشی کا اظہار کیا۔ ''السیرۃ الحلبیہ'' میں ہے:

''**وقدم عليه ﷺ بعد فتح خيبر جعفر بن أبي طالب رضي الله عنه من أرض الحبشة ومعه الأشعريون.... ولما أقبل عليه ﷺ جعفر رضي الله عنه قام ﷺ إلى جعفر وقبله بين عينيه**''(غزوہ خیبر ۷۵۶/۲)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت جعفرؓ عیسائی مملکت حبشہ میں ایک طویل مدت تک مقیم رہے، بلکہ ہجرت نبوی ﷺ کے بعد بھی کئی سال تک مقیم رہے، اسی لئے ان کی آمد پر آپ ﷺ بہت خوش ہوئے، کیوں کہ لمبی مدت کے بعد ملاقات بھی ہورہی تھی، ''**ما أدري أنا بقدوم جعفر أسر أو بفتح خيبر**''، حضرت جعفرؓ کی یہ آمد سن ہجری ۷ر میں ہوئی، اس کے بعد وہ حبشہ نہیں گئے، اور ۹ھ میں موتہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔

اور اگر وہ ایسے کافر ملک سے آیا ہے جہاں مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھایا جارہا ہے، عبادات پر پابندیاں اور شعائر کی بے حرمتی ہورہی ہے، تو ایسے لوگوں کو مسلمان ملک میں شہریت دینا لازم ہونا چاہئے، جیسے کئی صحابہ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی اور انہیں ہمیشہ کے لئے وہاں اقامت مل گئی، اسی طرح کئی دیگر شہروں اور ملکوں سے صحابہ اسلام میں داخل ہوئے اور مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔

بعض حضرات کا کہنا ہے کہ شہریت کی درخواست کو قبول کرنا مسلم ملک پر ضروری نہ ہوگا، یہ رائے مفتی ثناء الہدی قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی، حافظ کلیم اللہ عمری، مفتی محمد سلمان منصور پوری وغیرہ کی ہے، البتہ مفتی محمد سلمان منصور پوری اور مفتی ثناء الہدی قاسمی وغیرہ کہتے ہیں کہ اگر درخواست دہندہ کے حالات متقاضی ہوں تو اسلامی اخوت کی بنیاد پر شہریت دی جانی چاہئے۔ ''**يجب أن يعلم بأن الأمان كما يجوز مرسلاً يجوز معلقا بالشرط**''(فتاوی تاتارخانیہ ۶۷/۷)۔

☆ مولانا نثار احمد حصیر قاسمی کی رائے ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مجبوری کی وجہ سے شہریت کے حصول کی درخواست دیتا ہے تو اس درخواست کو قبول کرنا اس ملک پر صرف اخلاقی ذمہ داری ہوگی، اگر جان ومال، عزت وآبرو اور دین ومذہب خطرے میں ہو تو اس وقت اس کی درخواست قبول کرنا لازم وضروری ہوگا۔

☆ مولانا ریحان مبشر قاسمی کا رجحان یہ ہے کہ اگر دنیاوی مجبوری ہے تو درخواست کو قبول کرنا ضروروا جب نہ ہوگا، اور اگر دینی مجبوری ہو تبھی اس درخواست کو قبول کرنا مسلم ملک پر واجب ہوگا۔

☆ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کی رائے یہ ہے کہ اگر کسی دینی یا دنیاوی ضرورت کے بغیر صرف خواہش کے تحت دوسرے ملک کی منتقلی چاہتا ہے تو ایسی درخواست کو قبول کرنے کا فیصلہ ارباب ملک ملکی مفاد کے پیش نظر کرنے میں خودمختار ہوں گے۔

۳- پناہ گزینوں کو شہریت اور ملک کے قدیم باشندوں کی طرح جملہ حقوق دیئے جانے کا مسئلہ:

اس سلسلہ میں اکثر مقالہ نگاروں کا رجحان یہ ہے کہ ظلم وزیادتی یا خانہ جنگی کی وجہ سے وطن چھوڑنے والے مسلمان پناہ گزینوں کو پناہ دینے والے مسلم ملک پر شرعاً یہ ضروری قرار دیا جائے کہ وہ ان مہاجرین کو شہریت بھی دے اور وہ حقوق وسہولتیں بھی دے جو وہاں کے باشندوں کو حاصل ہیں، ان میں سے اکثر حضرات نے دلیل کے طور پر ہجرت مدینہ کو مثال میں پیش کیا ہے، اور مندرجہ ذیل آیات واحادیث سے بھی استدلال کیا ہے:

آیات:

۱-"إنما المؤمنون إخوة" (حجرات:۱۰) (مقالہ مفتی عبداللہ کاوی والا، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد اقبال ٹنکاروی)۔

۲-"والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض" (توبہ:۷۱) (مقالہ مولانا اختر امام عادل قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی)۔

۳-"إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم فی سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئک بعضهم أولياء بعض والذين آمنوا ولم يهاجروا مالكم من ولايتهم من شئ حتى يهاجروا وإن استنصروكم فی الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق والله بما تعملون بصير" (الانفال: ۷۲) (مقالہ مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا محمد شاہجہاں ندوی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا محمد فخر عالم نعمانی، مولانا اختر امام عادل قاسمی)۔

۴-"ومن يهاجر فی سبيل الله يجد فی الأرض مراغماً كثيراً وسعة" (النساء:۱۰۰) (مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۵-"وما لكم لا تقاتلون فی سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنساء والولدان الذين يقولون ربنا أخرجنا من هذه القرية الظالم أهلها واجعل لنا من لدنک ولياً واجعل لنا من لدنک نصيراً" (النساء:۷۵) (مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا عبید اللہ ندوی)۔

۶-"والذين هاجروا فی الله من بعد ما ظلموا لنبوءنهم فی الدنيا حسنة ولأجر الآخرة أكبر لو كانوا يعلمون" (نحل:۴۱) (مقالہ مولانا عبید اللہ ندوی)۔

احادیث:

۱-"قال رسول اللهﷺ: انصر أخاک ظالماً أو مظلوماً" (بخاری ۲/۱۰۹۲۸) (مقالہ مفتی سعید اسعد

قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی، مولانا عبید اللہ ندوی)۔

۲-’’قال رسول اللهﷺ: الخلق عيال الله فأحب الخلق إلى الله من أحسن إلى عياله‘‘(مشکوۃ ۲/۴۲۵)(مقالہ مولانا محمد مصطفی قاسمی)۔

۳-’’المؤمن للمؤمن كالبنيان يشدّ بعضه بعضا ‘‘(بخاری، حدیث نمبر:۲۲۲۶)(مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۴-’’المسلم أخو المسلم لايظلمه ولا يسلمه ومن كان فى حاجة أخيه كان الله فى حاجته ومن فرج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيامة ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة‘‘(بخاری، حدیث نمبر:۲۲۶۲)(مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۵-’’قال رسول اللهﷺ: مثل المؤمنين فى توادهم وتراحمهم وتعاطفهم مثل الجسد، إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى ‘‘(مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۵)(مقالہ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی)۔

۶-’’كونوا عباد الله إخواناً المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يكذبه ولا يحقره ‘‘(مسلم، حدیث نمبر:۶۷۰۶)۔

۷- ایک حدیث میں آپﷺ نے امیر لشکر کو حکم دیا:’’ثم ادعهم إلى التحول من دارهم إلى دارالمهاجرين، وأعلمهم إن فعلوا ذلک أن لهم ما للمهاجرين، وأن عليهم ما على المهاجرين‘‘(مسلم، حدیث نمبر:۱۷۳۱)(مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۸-حضرت انسؓ سے مروی ہے:’’دعا النبى ﷺ الأنصار أن يقطع لهم البحرين، قالوا: لا، إلا أن تقطع لإخواننا من المهاجرين مثلها‘‘(بخاری، حدیث نمبر:۳۱۶۳)(مقالہ مولانا محمد شاہجہاں ندوی)۔

۹-’’قال النبى ﷺ ألا من ظلم معاهداً أو انتقص حقه أو كلّفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئاً بغير طيب نفس منه، فأنا حجيجه يوم القيامة‘‘(ابوداؤد، حدیث نمبر:۳۰۵۲)(مقالہ مفتی محمد سلمان منصور پوری)۔

عبارات:

۱-’’امرأة مسلمة سبيت بالمشرق وجب على أهل المغرب تخليصها من الأسر ما لم تدخل دار الحرب؛ لأن دار الإسلام كمكان واحد‘‘(فتاوی بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶/۳۰۸)(مقالہ مولانا خورشید انور اعظمی)۔

۲-''القاعدة العامة فی حقوق أهل الذمة: أن لهم ما لنا وعليهم ما علينا، وهذه القاعدة جرت علی لسان فقهاء الحنفية وتدل عليها عبارات فقهاء المالكية والشافعية والحنابلة'' (بدائع الصنائع ۱۱۱/۶) (مقالہ مفتی محمد سلمان منصور پوری)۔

۳-''ويؤيدها بعض الآثار عن السلف: فقد روی عن علی بن أبی طالب أنه قال: إنما قبلوا الجزية لتكون أموالهم كأموالنا ودماؤهم كدمائنا'' (الموسوعۃ الفقہیہ ۱۲۷/۷) (مقالہ مفتی محمد سلمان منصور پوری)۔

☆ مفتی سعید اسعد قاسمی اور مولانا محمد توقیر بدر قاسمی کا کہنا ہے کہ پناہ گزیں کا اگر اس ملک میں مستقل ٹھہرنے کا ارادہ ہے تب تو اس ملک پر شہریت دینا لازم ہوگا، لیکن اگر اس کا اپنے ملک لوٹ جانے کا ارادہ ہو تو لوٹتے وقت تک اس کی دادرسی ایک دینی فریضہ سمجھ کر کی جائے گی، حدیث میں ہے:

''قال رسول الله ﷺ: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه'' (بخاری ۸۸۹/۲)، اسی طرح علامہ جصاص رازی احکام القرآن میں لکھتے ہیں: ''وليس يمتنع أن يكون نفی الولاية مقتضيا للأمرين جميعا من نفی التوارث والنصرة، ثم نسخ نفی الميراث بإيجاب التوارث بالأرحام مهاجراً كان أو غير مهاجر وإسقاطه بالهجرة فحسب، ونسخ نفی إيجاب النصرة بقوله تعالی: "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض'' (احکام القرآن ۹۸/۳)۔

☆ مفتی عبداللہ کاوی والا، مفتی محمد شاہجہاں ندوی اور مولانا محمد ابوبکر قاسمی نے مظلوم مسلم پناہ گزینوں کو شہریت سے محروم رکھنا اور ان کے قدیم باشندوں کے درمیان تفریق روا رکھنے کو سراسر ظلم وعدوان قرار دیا ہے، مولانا شاہجہاں ندوی مزید لکھتے ہیں کہ اگر صورتحال یہ ہو کہ دارالکفر کے مسلمان اسلام کے جرم میں ستائے جا رہے ہوں تو ان کو ظلم سے بچانے کے لئے ان کی مدد کرنا فرض ہے، اور معاہد قوم سے جنگ نہ کرنے کا جواز اس وقت ہے جبکہ تارکین وطن مسلمانوں کو مسلم ملک اپنا شہری بنانے کے لئے تیار ہو، بصورت دیگر عہد توڑ کر ظالم کی سرکوبی لازم ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "والذين تبوؤا الدار والإيمان من قبلهم يحبون من هاجر إليهم ولا يجدون فی صدورهم حاجة مما أوتوا ويؤثرون علی أنفسهم ولو كان بهم خصاصة، ومن يوق شحّ نفسه فأولئک هم المفلحون'' (الحشر:۹)۔

☆ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کے بقول اسلامی اخوت ایسی مصیبت کے موقع پر ان کی باعزت امداد ونصرت کو لازمی قرار دیتی ہے۔ اگر انہیں باعزت شہری کا درجہ دے کر ملک کی آبادی میں شامل کرلیا جائے تو یہ پناہ گزیں ملک کی معیشت اور قوت میں اضافہ کا ذریعہ بنیں گے۔

☆ مولانا ابوسفیان مفتاحی نے اس سوال کے جواب کی تفصیل کرتے ہوئے دونمونے پیش کئے ہیں، ایک حضرت یوسف علیہ السلام کے مصر میں قیام کونمونہ بنایا ہے، اور دوسرا ہجرت حبشہ کے واقعہ کونمونہ بنایا ہے، پہلے نمونہ کا خلاصہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مظالم کے باوجود کسی مسلم ملک میں پناہ لینے کے لئے ترک وطن نہیں کرنا چاہئے، بلکہ وہیں کے عوام اور حکام حکومت کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ رہنا چاہئے، جبکہ دوسرے نمونہ کا خلاصہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ مظالم سے تنگ آ کر کسی دوسرے مسلم ملک کی طرف ترک وطن کر کے پناہ لینا شرعاً جائز ہے، اگر وہ حکومت ان کو اپنا شہری تسلیم کر کے شہریت دیدے تو بہت بہتر ہے۔

☆ مولانا احمد نور عینی قاسمی کی رائے ہے کہ پناہ گزینوں اور شہریوں کے درمیان امتیازی سلوک کرنا شرعاً روا نہیں ہے، البتہ پناہ گزینوں کو حق رائے دہی اور حق امیدواری سے استفادہ نہ کرنے دینے کی شرعاً گنجائش ہے۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا محمد فخر عالم نعمانی کا خیال ہے کہ سیاسی پناہ کے لئے کسی ملک میں اقامت اختیار کرنا ایک وقتی عمل ہوتا ہے...ظاہر ہے کہ شہریت کے حصول کے لئے مستقل قیام کا ارادہ ضروری ہے، لہذا اگر اس بنیاد پر ملک کے عام شہری اور سیاسی پناہ گزینوں میں فرق کیا جاتا ہے تو شرعاً کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا، اور مثال میں یہ حدیث پیش کی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ سے باہر قیام پذیر لوگوں کے بارے میں فرمایا: ''**فإن أبوا أن يتحولوا منها فأخبرهم أنهم يكونون كأعراب المسلمين يجرى عليهم حكم الله الذى يجرى على المؤمنين ولا يكون لهم فى الغنيمة والفئ شئ إلا أن يجاهدوا مع المسلمين**'' (مسلم، حدیث نمبر: ۴۶۱۹)۔

☆ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی نے مظالم کے شکار پناہ گزینوں کے لئے اعانت کی دوصورتیں ذکر کی ہیں، ایک یہ کہ یہ مسلم ملک اس ظالم ملک کے حاکم پر کسی طرح دباؤ بنائے تاکہ ان مظلومین کو سکون مل سکے، دوسرے یہ کہ امن و پناہ دینے کے بجائے ان پناہ گزینوں کو شہریت دے دے تاکہ یہ پر امن و پرسکون زندگی گزار سکیں، دلیل کے طور پر درج ذیل دو حدیثیں ذکر کی ہیں:

۱- ''**ولينصر الرجل أخاه ظالماً أو مظلوماً، إن كان ظالماً فلينهه فإنه له نصر، وإن كان مظلوماً فلينصره**'' (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۴)۔

۲- ''**من فرّج عن مسلم كربة فرّج الله عنه بها كربة من كرب يوم القيامة**'' (مسلم، حدیث نمبر: ۲۵۸۰)۔

☆ مولانا عبید اللہ ندوی کا کہنا ہے کہ اگر پناہ گزینوں کی نیت یہ ہے کہ حالات درست ہونے کے بعد ہم اپنے ملک واپس چلے جائیں گے تو ان کو پناہ گزین کا درجہ دینے اور اس ملک کا شہری تسلیم نہ کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، البتہ

پناہ گزیں ہونے کے باوجود انہیں تمام انسانی اور مدنی حقوق ملیں گے، لیکن آگے انہوں نے اس کا بھی اضافہ کیا کہ اگر ان پناہ گزینوں کو ملک کے قدیم باشندوں کی طرح سہولتیں نہ دی جائیں تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، اس تعلق سے موصوف نے دلیل کے طور پر تین مثالیں دی ہیں:

۱-"**لا یستوی منکم من أنفق من قبل الفتح وقاتل أولئک أعظم درجة من الذین أنفقوا من بعد وقاتلوا، وکلاً وعد الله الحسنی**"(الحدید:۱۰)۔

۲-علماء ومحدثین نے صحابہ کرام کے مراتب قائم کئے ہیں، مثلاً سابقین اولین، بدریین، احدیین وغیرہ۔

۳-محدثین نے بعض مواقع پر قدیم الاسلام اور حدیث العہد بالاسلام رواۃ میں فرق کیا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سہولیات میں کچھ فرق کیا جا سکتا ہے۔

پناہ گزینوں کو شہری تسلیم نہ کرنا:

بعض مقالہ نگار حضرات نے پناہ گزینوں کو شہری تسلیم نہ کئے جانے کو راجح قرار دیا ہے، جیسا کہ مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی کا کہنا ہے کہ پناہ گزینوں کو شہری سہولیات تو دی جائیں گی، مگر شہری حقوق نہیں، پناہ گزینوں کو شہری تسلیم نہ کیا جانا شرعاً درست ہے، اس لئے کہ ان کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ حالات سازگار ہونے کے بعد وہ اپنے ملک لوٹ جائیں گے۔

☆ مولانا اشرف عباس قاسمی کی رائے ہے کہ شہریت کے لئے بین الاقوامی ضوابط اور ملکی نزاکتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر انہیں جدید اصطلاح کے اعتبار سے شہری تسلیم نہ کرے فقط پناہ گزیں قرار دے تب بھی گنجائش ہے۔

☆ حافظ کلیم اللہ عمری مدنی کے نزدیک ان مہاجرین کی حیثیت ایک مہمان کی ہے، ان کے لئے شہریوں کی طرح پوری رعایتیں دینا یا سہولتیں فراہم کرنا حکومت کے واجبات میں سے نہیں ہے۔

☆ مفتی محمد سلمان منصور پوری کی رائے ہے کہ اگر قومی یا بین الاقوامی مصلحت اس میں کسی وجہ سے مانع ہو تو اسلامی حکومت کو ایسے مسلمانوں کو شہریت دینا لازم نہیں ہے۔

☆ مولانا رحمت اللہ ندوی کے نزدیک پناہ گزینوں کو اس شرط کے ساتھ شہریت حاصل ہوگی کہ ملک میں گنجائش ہو اور وہاں کے قدیم باشندوں کے حقوق متاثر نہ ہوں، اور تقریباً یہی رجحان مولانا قمر الزماں ندوی کا بھی ہے۔

☆ مولانا ریحان مبشر قاسمی نے شہری تسلیم نہ کئے جانے کی دو صورتیں ذکر کی ہیں، ایک یہ کہ صرف کاغذی طور پر شہری نہ ہوں باقی ساری سہولیات انہیں فراہم ہوں، دوسرے یہ کہ شہری حقوق سے ان کو محروم رکھا جائے۔ پہلی صورت میں اگر

وہ شہری تسلیم نہ کیے جائیں، بلکہ انہیں مہاجر سمجھا جائے، مگر انہیں سارے حقوق حاصل ہوں تو بظاہر اس میں کوئی اشکال معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں سیاسی حقوق سے محروم کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے۔

۴- اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے کیا کیا حقوق مانے جائیں گے؟

تقریباً تمام ہی مقالہ نگاروں نے سوالنامہ میں دیئے گئے تمام حقوق کو شہریت کے حقوق مانا ہے، اور کہا ہے کہ نئے شہریوں کو بھی قدیم شہریوں کی طرح تمام حقوق ملیں گے۔

۱- **''إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل، إن الله نعمّا يعظكم به إن الله كان سميعاً بصيراً''** (النساء: ۵۸) (مقالہ مفتی سعید اسعد قاسمی، مفتی محمد ابوبکر قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی)۔

۲- **''ألا كلكم راع وكلكم مسؤول عن رعيته، فالأمير الذى على الناس راع عليهم وهو مسئول عنهم''** (ابوداؤد ۲/۴۰۶)۔

البتہ بعض حضرات نے ان حقوق میں مزید اضافے کیے ہیں اور کچھ قیود وشرائط بھی بیان کی ہیں، مثلاً:

☆ مفتی ثناء الہدی قاسمی، مفتی حبیب اللہ قاسمی اور مفتی محمد سلمان منصور پوری کے مطابق ملک اور حکومت کا جو قانون اور دستور ہوگا اسی کے مطابق انہیں حقوق اور سہولتیں دی جائیں گی۔

۱- **''أما بعد: فقد نزل عليّ رسلكم راجعين إلى قريتكم، فإذا جاءكم كتابى هذا فإنكم آمنون لكم ذمة الله وذمة رسوله، وإن رسول الله غافر لكم سيئاتكم، ولا ظلم ولا عدوى وإن رسول الله جاركم مما منع منه نفسه، وإن عليكم رجع ما خرجت نخلكم، فإن سمعتم وأطعتم فإن على رسول الله ﷺ أن يكرم كريمكم ويعفو عن سيئكم وأن ليس عليكم أمير إلا من عند أنفسكم أو من أهل رسول الله ﷺ''** (طبقات ابن سعد ۱/۲۸، ۲/۳۰)۔

۲- **''ولنجران وحاشيتهم جوار الله، ومن سأل منهم حقا فبينهم النصف غير ظالمين ولا مظلومين، ولا يؤاخذ أحداً منهم بظلم آخر، وعلى ما فيه هذه الصحيفة جوار الله وذمة النبى ﷺ''** (الطبقات الکبری لابن سعد ۲/۳۶)۔

☆ مفتی محمد ابوبکر قاسمی نے مذہب، عقل، مال، نسب اور جان کی حفاظت اور مفتی محمد جعفر ملی رحمانی نے ذاتی ملکیت کی حفاظت، شخصی آزادی، آزادی اظہار رائے اور عقیدہ ومسلک کی آزادی جیسے حقوق کا اضافہ کیا ہے، لیکن مفتی ابوبکر قاسمی نے ووٹ

دینے یا امیدوار بننے یا ملازمت یا علاج کے سلسلہ میں یہ رائے دی ہے کہ حکومت حسب صلاحیت اور حسب لیاقت قانون وضع کرسکتی ہے۔

☆ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کا رجحان یہ ہے کہ اگر ملک جمہوری بنیادوں پر قائم ہو تبھی ووٹ دینے کا حق ہوگا، اگر حکومت کی بنیاد عوامی رائے پر نہ ہو تو ہر شہری اس کا مجاز نہیں ہوگا کہ وہ ووٹ دے کر حکمراں کا انتخاب کرے، اور دلیل کے طور پر تاتارخانیہ کی یہ عبارت پیش کی ہے: ''**قال علماؤنا: یصیر المرء سلطانا بأمرین: بالمبایعة معه ویعتبر بالمبایعة معه مبایعة أشرافهم وأعیانهم**'' (تاتارخانیہ ۷/۵۵)۔ البتہ وہ کہتے ہیں کہ ہر شہری کو تمام سرکاری اداروں سے انتفاع کا حق ہوگا۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا فخر عالم نعمانی کہتے ہیں کہ اسلام میں شہریت کے وہ تمام حقوق قابل قبول ہوں گے جس کی تعیین معروف پر ہو، انسانیت کی فلاح و بہبود پیش نظر ہو اور شریعت کے کسی نص سے متصادم نہ ہو۔

☆ ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کی رائے یہ ہے کہ ملک کے ہر شہری کو اپنی انسانی اور مذہبی زندگی کو بہتر طور پر گزارنے نیز ملک کے نظم ونسق کو چلانے میں یکساں طور پر شامل ہونے کے لئے جتنے بھی قسم کے حقوق واختیارات ہوسکتے ہیں وہ سب شہریت کے حقوق تسلیم کئے جائیں گے۔

☆ مولانا خورشید انور اعظمی نے اسلامی نقطہ نظر سے شہریت کے حقوق سے ان حقوق کو مراد لیا ہے جن کا تعلق مصالح ضروریہ یعنی حفاظت دین، حفاظت جان، حفاظت عقل، حفاظت نسل اور حفاظت مال سے ہو۔

☆ مفتی اشرف عباس قاسمی لکھتے ہیں کہ جمہوری نظام حکومت میں شہریوں کے جتنے حقوق ہیں اسلام ان سب کی تقریر کرتا ہے، اور ملک کے استحکام اور دفاع کی مشترکہ کوششوں کی اجازت، بلکہ ترغیب دیتا ہے، معاہدۂ حلف الفضول اور میثاق مدینہ کی مختلف دفعات پر نظر کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے، اور آگے لکھتے ہیں کہ مسلم مملکت میں غیر مسلم شہریوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلم شہریوں کو حاصل ہیں، البتہ ووٹ دینے کا حق یا انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق وغیرہ وہ حقوق ہیں جو محض شہری ہونے کی حیثیت سے مسلم مملکت غیر مسلم مواطن کو بھی فراہم کرے یہ کوئی ضروری نہیں ہے۔

☆ قاضی محمد حسن ندوی کا کہنا ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے بحیثیت انسان وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شہریت کے لئے ناگزیر ہیں؛ لیکن آگے وہ کہتے ہیں کہ جو بھی حقوق دیئے جائیں وہ شریعت کے دائرہ میں ہوں، اس سے چشم پوشی کرکے کوئی حق دینا یا اس کا استعمال کرنا شرعاً درست نہ ہوگا۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے سوالنامہ میں مذکور حقوق میں شخصی آزادی کا حق، عقیدہ کی آزادی کا حق، اظہار رائے

کا حق اور معصیت سے دوری کے حق کا اضافہ کیا ہے، اور "**لا ينال عهدى الظالمين**" (بقرہ: ۱۲۴)، "**لا طاعة لمخلوق فی معصية الله عزوجل**" (مسند احمد، نمبر: ۱۰۹۴)، "**لا طاعة فی معصية الله، إنما الطاعة فی المعروف**" (بخاری، نمبر: ۷۲۵۷) کو دلیل کے طور پر اپنی بات کی تائید میں پیش کیا ہے، جبکہ مولانا رحمت اللہ ندوی نے اقلیتوں کو اپنے مفادات کے تحفظ کا حق اور تشکیل حکومت کے عمل میں شرکت کے حق کا اضافہ کیا ہے۔

☆ مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی کے مطابق جو بھی بنیادی و قانونی حق ہیں وہ سب شہریوں کو حاصل ہوں گے، موصوف نے اسلامی نقطۂ نظر سے شہریوں کو حاصل ہونے والے حقوق کی تعداد ۵۵ گنوائی ہیں جو درج ذیل ہیں:

(۱) تحفظ دین کا حق، (۲) تحفظ نفس کا حق، (۳) تحفظ نسل کا حق، (۴) تحفظ مال کا حق، (۵) تحفظ عقل کا حق، (۶) تحفظ عزت وآبرو کا حق، (۷) تحفظ نجی زندگی کا حق، (۸) تحفظ شخصی آزادی کا حق، (۹) عمل غیر کی ذمہ داری سے بریت کا حق، (۱۰) ظلم کے خلاف احتجاج کا حق، (۱۱) مساوات کا حق، (۱۵) حصول عدل وانصاف کا حق، (۱۶) تحفظ معاش کا حق، (۱۷) معصیت سے اجتناب کا حق، (۱۸) سیاسی زندگی میں شرکت کا حق، (۱۹) آزادی نقل وحرکت اور سکونت کا حق، (۲۰) آزادیٔ نقل وحرکت اور ہجرت کا حق، (۲۱) اجرت ومعاوضہ کا حق، (۲۲) ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق، (۲۳) مذہبی دل آزاری سے تحفظ کا حق، (۲۴) تحفظ ناموس خواتین کا حق، (۲۵) شک وشبہات کی بنا پر کارروائی نہ کرنے کا حق، (۲۶) نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون کا حق، (۲۷) معذوروں اور کمزوروں کے تحفظ کا حق، (۲۸) ووٹ دینے کا حق، (۲۹) الیکشن میں امیدوار ہونے کا حق، (۳۰) سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، (۳۱) سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، (۳۲) سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق، (۳۳) روزگار کا حق، (۳۴) عدالتی چارہ جوئی کا حق، (۳۵) معاشی تگ ودو کا حق، (۳۶) ایک مقام سے دوسرے مقام پر بلا اجازت آمدورفت کا حق، (۳۷) تجارت اور صنعت وحرفت کا حق، (۳۸) مقامات مقدسہ کے تحفظ کا حق، (۳۹) ازدواجی زندگی گزارنے کا حق، (۴۰) رہبانیت سے اجتناب کا حق، (۴۱) ازدواجی زندگی میں شقاق ونفاق حائل ہوجانے پر طلاق کا حق، (۴۲) مسلم لا کے تحفظ کا حق، (۴۳) مسلم اوقاف کے تحفظ کا حق، (۴۴) مساجد ومدارس کے تحفظ کا حق، (۴۵) خانقاہ ومقابر کے تحفظ کا حق، (۴۶) عورت کا حق مہر، (۴۷) عورت کو خلع کا حق، (۴۸) عورت کو نفقہ کا حق، (۴۹) قصاص وخون بہا کا حق، (۵۰) وراثت ووصیت کا حق، (۵۱) معاملات کا حق، (۵۲) تعزیرات ومحاربت کا حق، (۵۳) عورت کو عصمت وعفت کی زندگی گزارنے کا حق، (۵۴) عورت کو اپنے محرم کے علاوہ نامحرم سے پردہ کرنے کا حق، (۵۵) عورت کو گھر میں پردہ نشیں رہنے کا حق۔ یہ سب بنیادی حقوق میں شامل ہیں، ان حقوق کو کوئی سلب وغصب نہیں کرسکتا ہے، کیوں کہ اللہ تعالی کی جانب سے عطا کردہ حقوق ہیں۔

☆ مولانا ریحان مبشر قاسمی نے حقوق پر بحث کرتے ہوئے ان کی چار نظریاتی تقسیم کی ہے: قدرتی حقوق کا نظریہ، حقوق کا تاریخی نظریہ، حقوق کا سماجی فلاحی نظریہ اور حقوق کا عینی یا فرد کی شخصیت کا نظریہ، اور پھر اس کے بعد حقوق کی چار بنیادی تقسیمیں کی ہیں: قدرتی حقوق، اخلاقی حقوق، قانونی حقوق اور معاشی حقوق۔ اور پھر ان کے ضمن میں آنے والے ذیلی حقوق کو مندرجہ ذیل چارٹ میں سمونے کی کوشش کی ہے:

☆ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی نے حقوق کی قدرے تفصیل کی ہے اور مختلف پہلوؤں سے اس کا جائزہ لیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ حکومتوں نے حقوق کی تقسیم حریت، مساوات اور اخوت کے اصول کی روشنی میں کی ہے، یہ اصول نہ صرف مشترکہ طور پر تمام حقوق کی تعیین کرتے ہیں، بلکہ ان میں سے ہر اصول اپنے مخصوص زمرہ میں مخصوص حقوق سے بھی ہم رشتہ ہے، اس لحاظ سے موصوف نے ان حقوق کی چار زمروں میں تقسیم کی ہے اور پھر ان کی ذیلی تقسیمیں کی ہیں:

(۱) حریت کے حقوق، (۲) مساوات کے حقوق، (۳) فلاحی حقوق، (۴) نجی ملکیت کے حقوق۔

(۱) حریت کے حقوق تین زمروں میں منقسم ہیں:

الف- سیاسی آزادی کے حقوق۔

ب- شہری آزادی کے حقوق۔

ج- اقتصادی آزادی کے حقوق۔

سیاسی آزادی کے حقوق میں عموماً ملکی انتخابات میں حصہ لینے، سیاسی عہدوں کے لئے امیدوار ہونے، حکام کو عرضداشت اور اپنی شکایات کرنے اور ان کا ازالہ کرانے کے حقوق شامل ہیں، سیاسی پارٹی بنانے کا حق اگرچہ سیاسی آزادی ہی کا ایک جزو ہے، لیکن رسماً اظہار رائے، جلسہ وجلوس اور اجتماع کی عام شہری آزادیوں سے منسلک ہے۔

شہری آزادی (سول لبرٹی) کے حقوق کو فی زمانہ تین خانوں میں منقسم کیا گیا ہے:

۱- شخصی آزادی یعنی جان وتن یا تشخص کی سلامتی کا حق (مثلاً جسمانی ایذا، حبس بے جا، غیر انسانی سزا اور خلوت ومسکنت میں دخل بے جا سے تحفظ کا حق، اندرون ملک نقل وحرکت کی آزادی، کسی بھی مقام پر ٹھہرنے یا بسنے کی آزادی، ملک سے باہر سفر کرنے اور ملک میں واپس آنے کی آزادی، اور دوسرے ممالک میں پناہ گزینی کا حق۔

۲- ذہنی سرگرمیوں کی آزادی کے حقوق مثلاً عقیدہ، ضمیر اور مذہب کی آزادی، فکری اور نظریاتی آزادی کے حقوق، اظہار رائے، جلسہ وجلوس اور جماعت سازی کی آزادی۔

۳- عملی سرگرمیوں کی آزادی کے حقوق مثلاً معاہدہ کرنے کی آزادی، کاروبار کی آزادی، نجی جائیداد کی

خرید وفروخت کی آزادی، شادی بیاہ کرنے اور خاندان بسانے کا حق، وغیرہ۔

(۲) مساوات کے حقوق: اس زمرہ میں کم ازکم چھ حقوق آتے ہیں:

۱-قانونی مساوات: یعنی قانونی مرتبہ کی مساوات کا حق۔

۲-عدالتی کارروائی میں دوسروں کے مساوی قانونی سلوک پانے کا حق اور قانون کے تحت مساویانہ تحفظ پانے کا حق۔

۳-ٹیکسوں کی ادائیگی میں دوسروں کے مساوی سلوک پانے کا حق۔

۴-دوسروں کے برابر سماجی مواقع پانے کا حق۔

۵-دوسروں کے برابر سرکاری ملازمتوں، سیاسی عہدوں اور سرکاری اعزازات میں حصہ پانے کا حق۔

۶-سیاسی مساوات، یعنی ملکی سیاست میں دوسروں کے برابر نمایندگی اور حصہ داری پانے کا حق، سرکاری حکام سے اپنی شکایات کا ازالہ کرانے کا حق اور استبداد وبدعنوانی کے خلاف مناسب طریقہ پر حدود کی رعایت کے ساتھ احتجاج، سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کرنے کا حق۔

(۳) فلاحی خدمات پانے کا حق: فرانسیسی ماہر قانون لیوں ڈیوگوئی نے اخوت کے بجائے ''سماجی سالمیت'' کی اصطلاح استعمال کرکے افراد کے تین فلاحی حقوق اور ان کے متوازی سرکار کے تین بنیادی فرائض متعین کئے ہیں، یعنی:

۱-تعلیم پانے کا حق۔

۲-بوقت ضرورت سرکاری امداد پانے کا حق۔

۳-روزگار اور ذریعۂ معاش پانے کا حق۔

اخوت یا تعاون کا اصول نہ صرف سرکاری امداد اور معیشت کو بلکہ سماجی زندگی کے تمام دوسرے زمروں کو بھی محیط ہے، اس کے مطابق افراد کو ہر میدان میں اپنی ذہنی ومادی بہبود کے لئے درکار تمام سہولیات اور خدمات پانے کا حق ہے۔

(۴) نجی ملکیت کے حقوق: فطری حقوق اور انسانی حقوق کے اب تک کے تمام اعلانات میں نجی ملکیت کے حقوق کو نمایاں جگہ دی گئی ہے، قدیم زمانہ سے آج تک سیاسی مفکروں کی اکثریت نجی ملکیت کو فرد کی مسرت اور بہبود کے لئے لابدی قرار دیتی ہے (مبادی سیاسیات: باب ۴، شہریت اور شہری حقوق وفرائض، حقوق کی زمرہ بندی کا بیان، ص: ۷۱-۷۸)۔

پھر آگے چل کر موصوف نے شہریوں کو ملنے والے حقوق کا ذکر چارٹ کی شکل میں کیا ہے جو مندرجہ ذیل ہے:

۵- شرعی نقطۂ نظر سے پناہ گزینوں کو کیا حقوق حاصل ہوں گے، نیز کون سے حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے اور ان کو حاصل نہیں ہوں گے؟

اس سلسلہ میں بعض مقالہ نگار حضرات کا رجحان یہ ہے کہ پناہ گزینوں کو وہ سب حقوق حاصل ہوں گے جو حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے، یہ رائے ان تمام حضرات کی ہے: مفتی عبداللہ کاوی والا، مفتی محمد سلمان منصور پوری، مولانا خورشید انور اعظمی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا محمد مصطفی قاسمی، مولانا محمد توقیر بدر قاسمی، مولانا احمد نور عینی قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مولانا زبیر احمد قاسمی، مفتی محمد ابوبکر قاسمی۔

☆ البتہ مولانا احمد نور عینی قاسمی نے حقوق میں یکسانیت کی وجہ دار الاسلام کی وحدت کو قرار دیا ہے، ان کا کہنا ہے کہ دار الاسلام کی حدود میں خواہ کتنی ہی مملکتیں وجود میں آ جائیں، مملکتوں کا یہ تعدد مسلمانوں کے حقوق و فرائض اور ان کے احکام پر چنداں اثر انداز نہیں ہوگا؛ کیونکہ دار الاسلام ٹکڑیوں میں بٹ جانے کے باوجود بھی ایک مملکت کے حکم میں ہے۔ تائید میں مندرجہ ذیل عبارتیں پیش کی ہیں:

۱- ''...... **لأن الإسلام دار أحكام، فباختلاف المنعة والملك لا تتباين الدار فيما بين المسلمين؛ لأن حكم الإسلام يجمعهم، فأما دار الحرب ليست بدار أحكام ولكن دار قهر، فباختلاف المنعة والملك تختلف الدار فيما بينهم**'' (المبسوط ۳/ ۳۳، اسی سے ملتے جلتے الفاظ البحر الرائق ۸/ ۵۷۳ اور تبیین الحقائق ۶/ ۲۴۰ میں بھی ہیں)۔

۲- ڈاکٹر وہبہ زحیلی میراث کی بحث میں شامی قانون کی ایک دفعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

وأما القانون السوري في المادة (۲۶۴) ''فإنه نص على أنه لا يمنح الأجنبي حق الإرث ...... وهذا شامل مع الأسف المسلمين من جنسيات مختلفة، وهو لم يقل به فقيه ...... لأن المسلم لا يعتبر في بلاد دار الإسلام أجنبيا'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۱۰/ ۷۲۶۲)۔ تقریباً یہی موقف معاصر اہل علم میں سے ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے ''احکام الذمیین والمستأمنین'' ص: ۷۳ میں، جسٹس علی علی منصور نے ''الشریعۃ الإسلامیۃ والقانون الدولی'' ص/ ۹۱ میں، ڈاکٹر علی بن عبد الرحمٰن الطیار نے ''حقوق غیر المسلمین فی الدولۃ الإسلامیۃ'' ص/ ۷۷ میں، ایران کے شیعہ اسکالر صدر الدین قبانچی نے ''المذہب السیاسی فی الإسلام'' ص/ ۱۲۹ میں اختیار کیا ہے (مقالہ: مولانا احمد نور عینی قاسمی)۔

☆ قاضی محمد حسن ندوی نے حدیث رسول ﷺ ''**أنزل الناس على قدر منازلهم**'' کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ حقوق میں فرق کیا ہے، مثلاً پناہ گزینوں کو شروع میں ووٹ دینے کا حق اور امیدوار ہونے کا حق حاصل نہیں ہوگا۔

☆ مولانا زبیر احمد قاسمی کہتے ہیں کہ جن حقوق کا تعلق انسان کی بنیادی ضرورتوں سے نہیں ہے تو وہ پناہ گزینوں کو حاصل نہیں ہوں گے، مثلاً ووٹ دینے کا حق، امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لینے کا حق وغیرہ۔

☆ جبکہ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی کی رائے یہ ہے کہ پناہ گزینوں کو بنیادی حقوق کے ساتھ ساتھ سیاسی حقوق میں سے ووٹ دہی کا حق اور عدالتی چارہ جوئی کا حق ملنا چاہئے، یہاں تک کہ موصوف یہ کہتے ہیں کہ اگر پناہ گزینوں کی آبادی ایک ہی جگہ ہے تو ان میں سے کسی آدمی کو منتخب کر کے ایوان میں بھیجا جانا چاہئے تا کہ وہ پناہ گزینوں کے مسائل ایوان میں رکھ سکے۔

☆ مفتی محمد سلمان منصور پوری کی رائے میں شریعت میں پناہ گزیں کی الگ سے اصطلاح نہیں ہے، بلکہ یہ ایک سیاسی اصطلاح ہے، لیکن حکم یہی ہے کہ پناہ گزینی کی وجہ سے کوئی تفریق نہیں کی جائے گی، بلکہ اسے شہریوں کے برابر حقوق ملیں گے۔

۱-''**وحکم أموالهم حکم أموال المسلمین فی حرمتها**'' (ابن عابدین ۳/۲۴۳)۔

۲-''**وعلی ذلک فلأهل الذمة حق الإقامة آمنین مطمئنین علی دمائهم وأموالهم وأعراضهم وعلی الإمام حمایتهم کل من أراد بهم سوءاً من المسلمین أو أهل الحرب أو أهل الذمة، لأنه التزم بالعهد حفظهم من الاعتداء علیهم، فیجب علیه الذب عنهم ومنع من یقصدهم بالأذی من المسلمین أو الکفار، واستنقاذ من أسر منهم واسترجاع ما أخذ من أموالهم سواء کانوا مع المسلمین أم منفردین عنهم فی بلدهم، لأنهم بذلوا الجزیة لحفظهم وحفظ أموالهم**'' (دیکھئے: بدائع الصنائع ۷/۱۱۱، الشرح الصغیر للدردیر ۱/۱۴۰، المہذب ۲/۲۵۶، کشاف القناع ۳/۱۳۹، المغنی ۸/۵۳۵)۔

☆ لیکن اس کے برعکس مفتی اشرف عباس قاسمی کا کہنا ہے کہ پناہ یا جوار کا حق قدیم عربی اور اسلامی خصال میں سے ہے، اور عرب شاعری میں اس کے بکثرت نمونے موجود ہیں (دیکھئے: اللجوء فی الإسلام للدکتور أحمد ابوالوفاء)، اسی طرح حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جب حبشہ ہجرت کرنا چاہا تو ابن الدغنہ نے انہیں اپنی حفاظت اور پناہ میں لے لیا۔ مکہ مکرمہ کے ستائے ہوئے مسلمانوں کو شاہ حبشہ نجاشی نے اور مدینہ منورہ کے قبیلہ اوس وخزرج نے پناہ دی۔ اسی طرح قرآن کریم کی اس آیت کی روشنی میں اسلام میں پناہ گزینوں کے تعلق سے احکام کے خط وخال متعین کئے جاسکتے ہیں: ''**والذین تبوؤا الدار والإیمان من قبلهم یحبون من هاجر إلیهم ولا یجدون فی صدورهم حاجة مما أوتوا ویؤثرون علی أنفسهم ولو کان بهم خصاصة ومن یوق شحّ نفسه فأولئک هم المفلحون**'' (الحشر: ۹)۔ اور یہی کچھ تفصیلات مولانا ریحان مبشر قاسمی نے بھی ذکر کی ہیں۔

بعض حضرات کی رائے ہے کہ پناہ گزینوں کا قیام عارضی ہوتا ہے، لہذا ان کو شہری حقوق نہیں حاصل ہوں گے، مفتی ثناء الہدی قاسمی کہتے ہیں کہ ان کی حیثیت مہمانوں کی سی ہے، ان کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک ہونا چاہئے، جبکہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی اور حافظ کلیم اللہ عمری کا کہنا ہے کہ شہریوں کی طرح بنیادی حقوق ان کو حاصل ہوں گے، اور ملکی انتظامی امور سے متعلق جو حقوق ہیں ان کو دینے کی بظاہر ضرورت متقاضی نہیں ہے، یہی رجحان مولانا عبید اللہ ندوی کا ہے اگر انہیں شہری تسلیم نہیں کیا گیا ہے، لیکن مولانا ابوسفیان مفتاحی کی رائے بغیر کسی قید وشرط کے مطلق یہ ہے کہ جو حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے وہ پناہ گزینوں کو حاصل نہیں ہوں گے۔ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی کا خیال یہ ہے کہ پناہ گزیں کا حکم مستأمن کی طرح ہے، اور ایک مستأمن کو کسی ملک میں پناہ لینے پر جو حقوق حاصل ہوتے ہیں وہ تمام حقوق پناہ گزینوں کو حاصل ہوں گے، ''**المستأمن أی طالب للأمان (هو من يدخل دار غيره بأمان) مسلماً كان أو حربياً (دخل مسلم دارالحرب بأمان حرم تعرضه لشئ) من دم ومال وفرج (منهم) إذ المسلمون عند شروطهم**'' (الدرالمختار مع الشامیہ ۳/۲۴۷)۔ مولانا رحمت اللہ ندوی کے بقول پناہ گزینوں کو شہریوں کے مساوی حقوق نہیں ملیں گے، البتہ معاہدہ کے تحت حقوق کا استحقاق رکھیں گے، لیکن اگر پناہ گزیں شہری بن جائیں تو انہیں بھی وہ جملہ حقوق حاصل ہوجائیں گے جو شہریوں کو حاصل ہیں۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کا کہنا ہے کہ پناہ گزین اگر مختصر مدت کے لئے ہیں تو ان کی حیثیت مہمان کی ہوگی اور انہیں بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں گے، لیکن اگر پناہ گزیں طویل مدت کے لئے آئے ہوئے ہیں تو ایسے مسلم پناہ گزینوں کو مکمل شہری حقوق فراہم کرنا کسی بھی مسلم ملک کا مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہوگا۔

بعض حضرات نے پناہ گزینوں کے حقوق کے تعلق سے قدرے تفصیل کی ہے، مثلاً:

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے پناہ گزینوں کے درج ذیل حقوق ذکر کئے ہیں:

۱- ان کا دفاع کیا جائے، ان کی حمایت ونصرت کی جائے، ان کو پناہ دی جائے اور ان کو ٹھہرانے کا نظم کیا جائے۔

۲- پناہ گزینوں پر اگر ظلم وجبر کا اندیشہ ہو تو انہیں ان کے ملک کے حوالہ نہ کیا جائے۔

۳- پناہ گزینوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جن سے شہری مستفید ہوتے ہیں، جیسے جان ومال، عزت وآبرو کا تحفظ، معاشی حمایت، عدل وانصاف، عقیدہ ورائے کی آزادی، چلنے پھرنے، سفر کرنے کی آزادی، شادی بیاہ اور خاندان کی تشکیل، پرامن جماعتوں اور پارٹیوں میں شرکت، کام اور پیشہ اختیار کرنے، سونے اور آرام کرنے صحت کے تحفظ اور تحصیل علم کے حقوق حاصل ہوں گے۔

پناہ گزینوں اور شہریوں کے حقوق کے درمیان فرق کے بارے میں موصوف لکھتے ہیں کہ اگر مستقل اور دائمی طور

سے پناہ دی گئی ہے تو پناہ گزینوں اور عام شہریوں کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہوگا، جیسا کہ انصار نے مہاجرین کو دائمی پناہ دی تھی، اور تمام انسانی اور شہری حقوق میں ان کو شریک کیا تھا۔ اور اگر عارضی طور سے پناہ دی گئی ہے اور پناہ گزیں غیر مسلم ہے تو ایسی صورت میں سیاسی حقوق کے علاوہ دیگر انسانی حقوق اسے حاصل رہیں گے۔

☆ مولانا ریحان مبشر قاسمی کے نزدیک پناہ گزینوں کو مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہوں گے:

۱- دارالاسلام میں داخلے اور بقدر حاجت رکنے کا حق، ۲- مذہبی آزادی کا حق، ۳- نفس کے تحفظ کا حق، ۴- عقل کے تحفظ کا حق، ۵- عزت وآبرو کے تحفظ کا حق، ۶- مناسب گھر بنانے کا حق، ۷- تعامل وتملک کا حق، ۸- آزادی کا حق، ۹- تعلیم کا حق، ۱۰- واپس نہ کئے جانے کا حق۔

شہریوں کے خصوصی حقوق کے تعلق سے موصوف لکھتے ہیں کہ وہ حقوق جو سیاسی امور سے متعلق ہیں مثلاً: ووٹ دینا، انتخاب میں حصہ لینا، الیکشن لڑنا، قانون ساز اداروں کا ممبر بننا، سیاسی عہدوں پر مامور ہونا، یہ سب شہریوں کو حاصل ہوں گے، لیکن پناہ گزینوں کے تعلق سے اگر ملک کی مصلحت ان سے محروم رکھنے کی ہو تو انہیں محروم رکھا جاسکتا ہے۔

☆ مولانا قمر الزماں ندوی کا کہنا ہے کہ پناہ گزینوں کو وہ سارے حقوق حاصل نہیں ہوسکتے جو وہاں کے قدیم باشندوں کو حاصل ہیں، مثلاً پناہ گزینوں کو اراضی کی خریداری کی اجازت بغیر حکومت کی اجازت حاصل کئے نہیں ہوگی، اگر حکومت نے ان کو کیمپ رہنے کے لئے فراہم کردیا ہے اور انہیں کیمپوں میں رہنے کا مکلّف بنایا ہے تو ان کو پختہ مکان بنانے کی اجازت نہیں ہوگی، اسی طرح سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق اور وہ حقوق جو شہریوں کے لئے خاص ہیں وہ بھی پناہ گزینوں کو حاصل نہیں ہوں گے، الا یہ کہ حکومت اجازت دیدے۔

لیکن مولانا نثار احمد حصیر قاسمی نے اور حقوق کے ساتھ جائیدادوں کا مالک بننا، کاروبار کرنا اور ملازمت کرنا بھی پناہ گزینوں کا حق قرار دیا ہے، اور اس کے لئے دلیل کے طور پر درج ذیل آیت وحدیث پیش کی ہے:

۱- "**والذین آمنوا من بعد وھاجروا وجاھدوا معکم فأولئک منکم وأولوا الأرحام بعضھم أولی ببعض فی کتاب اللہ إن اللہ بکل شئ علیم**" (انفال:۷۵)۔

۲- "**إن حقوق المھاجرین ھی نفس حقوق من یستضیفونھم**"۔

۶- کیا کسی مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی؟

اکثر مقالہ نگار حضرات نے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت دی ہے اور اسے درست قرار دیا ہے

اگر ضرورت اور مجبوری کی بنا پر ہو، لیکن ان میں سے اکثر حضرات نے دین وایمان کے محفوظ ہونے کی بھی شرط لگائی ہے۔

آیات:

۱-"هو الذى جعل لكم الأرض ذلولاً فامشوا فى مناكبها وكلوا من رزقه" (الملک:۱۵) (مقالہ: مولانا زبیر احمد قاسمی، مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

احادیث:

۱-حضرت ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں: "دخلت أسماء بنت عميس وهى ممن قدم معنا على حفصة زوج النبىﷺ زائرة، وقد كانت هاجرت إلى النجاشى فيمن هاجر إليه فدخل عمر على حفصة، وأسماء عندها، فقال عمر حين رأى أسماء: من هذه؟ قالت: أسماء بنت عميس، قال عمر: الحبشية هذه؟ البحرية هذه؟ فقالت أسماء: نعم، فقال عمر: سبقناكم بالهجرة، فنحن أحق برسول اللهﷺ منكم، فغضبت، وقالت كلمة: كذبت يا عمر كلّا، والله كنتم مع رسول اللهﷺ يطعم جائعكم، ويعظ جاهلكم، وكنا فى دار، أو فى أرض البعداء البغضاء فى الحبشة، وذلك فى الله وفى رسوله، وأيم الله لا أطعم طعاماً ولاأشرب شراباً حتى أذكر ما قلت لرسول اللهﷺ، ونحن كنا نؤذى ونخاف، وسأذكر ذلك لرسول اللهﷺ وأسأله، ووالله لا أكذب ولا أزيغ ولا أزيد على ذلك، قال: فلما جاء النبىﷺ قالت: يا نبى الله! إن عمر قال: كذا وكذا، فقال رسول اللهﷺ: ليس بأحق بى منكم، وله ولأصحابه هجرة واحدة، ولكم أنتم أهل السفينة هجرتان" (مسلم، حدیث نمبر:۲۵۰۳) (مقالہ مولانا محمد توقیر بدر قاسمی)۔

۲-"فهذا ضماد الأزدى أسلم ثم رجع إلى قومه وعاش معهم حتى هاجر رسول اللهﷺ إلى المدينة الخ" (مسلم، کتاب الجمعہ ۱/۲۸۴) (مقالہ: مفتی محمد سلمان منصور پوری، مفتی ثناء الہدی قاسمی)۔

۳-حضرت عمرو بن عبسہ السلمی نے اسلام قبول کرنے کے بعد مکہ میں سکونت کی خواہش ظاہر کی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "لكن ارجع إلى أهلك فإذا سمعت بى قد ظهرت فأتنى" (مسلم، حدیث نمبر:۸۳۲) (مقالہ: مفتی اشرف عباس قاسمی)۔

عبارات:

۱-"إن اضطر إليه مسلم بسبب أنه أوذى فى وطنه أو اضطهد بالسجن أو مصادرة أمواله للغير ما ذنب أو جريمة ولم يجد لنفسه مأمنا إلا فى مثل هذه البلاد فإنه يجوز له التجنس بهذه الجنسيات دون أى كراهة بشرط أن يعزم على نفسه المحافظة على دينه وفى حياته العلمية والابتعاد

عن المنكرات الشائعة هناك والدليل على ذلك أن الصحابة رضی الله عنهم هاجروا إلى الحبشة بعد ما اضطهدوا من قبل أهل مكة والحبشة يومئذ يسودها الكفار'' (بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ للشیخ محمد تقی عثمانی، ص/۳۲۸) (مقالہ مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی)۔

۲-''والمسلم يمكنه أن يعيش خارج دار الإسلام وحتى فی دار الحرب إذا كان متمكنا من إظهار دينه، وإذا كان بعض الفقهاء تحدثوا عن وجوب الهجرة من دار الحرب، فقد كان ذلك مشروطا بعدم القدرة على إظهار الدين ......، ولا بد أن يشير إلى أن الأحناف لا يوجبون الهجرة من دار الحرب فی جميع الظروف لقول رسول الله ﷺ : لا هجرة بعد الفتح، ولكن جهاد ونية ،وهذا يؤكد أن جمهور المذاهب والعلماء يرون مشروعية العيش المشترك مع غير المسلمين ولو كان ذلك تحت سلطان غير إسلامی'' (المسلم مواطنا فی أوربا للشیخ فیصل مولوی، ص/۱۸-۱۹) (مقالہ: مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی، مفتی محمد سلمان منصور پوری، مفتی ثناء الہدی قاسمی)۔

۳-''جواز الهجرة إلى دار الكفر والبقاء فيها حيث إن هؤلاء الأصحاب بقوا إلى عام خيبر حيث يقول جعفر رضی الله عنه: فخرجنا حتى أتينا المدينة فتلقانی رسول الله ﷺ وأعتنقنی ثم قال: ما أدری أنا بفتح خيبر أفرح أم بقدوم جعفر'' (البدایۃ والنہایہ ۴/۱۷۹، مجمع الزوائد ۶/۳۰) (مقالہ: مفتی محمد سلمان منصور پوری)۔

☆ اور مولانا ریحان مبشر قاسمی نے احکام کے اعتبار سے شہریت اختیار کرنے والوں کی تفصیل بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

اس پورے حالات اور پس منظر کے بعد کسی مسلمان کے لئے غیر مسلم میں سکونت اختیار کرنے کے بارے میں تفصیل ہوگی اور حالات کے اعتبار سے حکم میں فرق آئے گا اور درج ذیل احکام مرتب ہوں گے:

(۱) بلا کراہت جائز، (۲) مستحب اور موجب اجر وثواب، (۳) واجب، (۴) مکروہ، (۵) حرام۔

(۱) اگر کسی مسلمان کو اس کے وطن میں ناحق ایذا پہنچائی جائے یا بلا جرم کے قید وبند کی صعوبتیں دی جائیں یا مال ودولت کو آمرانہ طور پر غصب کیا جائے اور کوئی مامون جگہ نہ مل سکے تو غیر مسلم ملک میں تین شرط کے ساتھ رہنا جائز ہوسکتا ہے:

۱- اس ملک میں دین پر عمل کرنے کی آزادی ہو اور آدمی کو یقین ہو کہ وہ اپنے مذہب کا پابند رہے گا۔

۲- ماحول سے اس کے عقیدے خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور وہاں رائج فواحش ومنکرات سے بچے رہنا ممکن

ہو۔خصوصاً نوجوان غیر شادی شدہ طبقہ؛ کیوں کہ ان ممالک میں فتنوں کے چوپٹ دروازے کھلے رہتے ہیں۔

۳-آدمی کے پاس اتنا علم ہو کہ وہ شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے پر قادر ہو۔

"قد سئل الشيخ عبد الله بن جبرين ما حكم الحصول على الجنسية الكافرة؟ أجاب لقوله: من اضطر إلى طلب جنسية دولة كافرة كمطارد من بلده، ولم يجد مأوى، فيجوز له ذلک بشرط أن يظهر دينه ويكون متمكنا من أداء الشعائر الدينية، وأما الحصول على الجنسية من أجل مصلحة دنيوية محضة فلا أرى جوازه" (اسلام ویب: مرکز الفتوی، رقم الفتوی: ۱۸۸۱۴۳)۔

یا کوئی شخص اپنے معاشی مسئلے میں الجھن کا شکار ہو اور اسے اپنے ملک میں تلاش بسیار کے باوجود جائز ملازمت اور معاشی وسائل حاصل نہ ہوں اور اسے فقر وفاقہ کی نوبت آپہنچے اور غیر مسلم ملک میں جائز ملازمت مل رہی ہو تو مذکورہ بالا تینوں شرائط کے ساتھ وہاں رہنے کی اجازت ہوگی، کیونکہ اہل علم نے مصیبت کے نزول کے وقت اپنے وطن سے نکلنے کی اجازت دی ہے۔

"ذكر ابن العربي في أحكام القرآن عند قوله تعالى: "وإذ أخرجه الذين كفروا .. الآية" (توبہ: ۴۰) **في هذه الآية دليل على جواز الفرار من خوف العدد وترک الصبر على ما ينزل من بلاء الله وعدم الاستسلام المؤدي إلى الآلام والهموم"** (احکام القرآن لابن العربی ۲/ ۵۱۴)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حصول رزق بھی شریعت کا ایک حکم ہے اور اسے ایک فریضہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

"عن عبد الله بن مسعودؓ قال: قال رسول الله ﷺ: طلب كسب الحلال فريضة بعد الفريضة" (رواہ البیہقی فی شعب الایمان؛ مشکاۃ کتاب البیوع، باب الکسب مطلب الحلال)، اور اپنے ہاتھ کی کمائی کو شریعت بہت پسندیدہ نگاہ سے دیکھتی ہے:

"عن رافع بن خديج قال: قيل يا رسول الله! أي الكسب أطيب؟ قال: عمل الرجل بيده وكل بيع مبرور" (مشکاۃ، کتاب البیوع باب الکسب مطلب الحلال)۔

اور اس کے لئے شریعت نے کسی خاص امکان اور مخصوص جگہ کی قید نہیں لگائی بلکہ آزادی دے رکھی ہے کہ جہاں مرضی ہو اپنا رزق تلاش کرو، فرمان باری تعالی ہے:

"هو الذي جعل لكم الأرض ذلولاً فامشوا في مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور" (ملک: ۱۵)۔

اس حکم میں ایک اورصورت بھی داخل ہوسکتی ہے (یعنی وہاں رہنا جائز ہوگا) جو ہندوستان اوراس جیسے مما لک پر منطبق ہے جہاں پر مسلمان اپنے دامن اور جان ومال کے لحاظ سے (عمومی حالات میں) محفوظ ہیں اور جہاں پر انہیں آزادی مکمل طور پر حاصل ہے، اور شعائر دین پر بلا تکلیف وایذاء کے عمل پیرا ہوتے ہیں۔ مذکورہ بالا حالات میں اس جیسے مما لک میں بھی سکونت اختیار کرنا جائز ہوگا؛ کیونکہ وہ شرعی ہجرت اس وقت واجب ہوتی ہے جب کسی ملک کے حالات دینی اعتبار سے ناگفتہ بہ ہوں اور وہاں کے مسلمانوں کو اپنا دین ومال وعزت بچانا دشوار ہو، ہاں اس بات کے استحباب سے قطعاً انکار کی گنجائش نہ ہوگی کہ آدمی وہاں سے ہجرت کر کے کسی مسلم ملک کی پناہ لے لے بشرطیکہ اس کا حصول متعذر نہ ہو؛ کیونکہ وہاں رہ کر جو دینی مصالح ہوسکتے ہیں غیر مسلم ملک میں وہ نہیں ہوسکتے، مثلاً: خیر ومعروف کی کثرت، منکرات وفواحش کی قلت، علماء کرام اور مشائخ عظام کی زیارت، مسلمان کی جماعت میں کثرت پیدا کرنا اوران کی معاونت، کفار سے عدم اختلاط اور عدم تکثیر سواد کفار وغیرہ وغیرہ۔

حضور ﷺ کے عم محترم حضرت عباسؓ اسلام لانے کے بعد مکہ میں ہی مقیم تھے اور فتح مکہ سے کچھ پہلے ہجرت کی ہے، اسی طرح حضرت نعیم نحامؓ نے جب مدینہ منورہ ہجرت کا ارادہ کیا تو ان کی قوم بنوعدی ان کے پاس آئی اور کہا: آپ ہمارے درمیان ہی رہیں یہاں سے ہجرت نہ کریں، جو آپ کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرے گا، ہم اس سے نمٹیں گے، اور جن یتیموں اور بے سہارا عورتوں کی کفالت کرتے تھے کرتے رہیں، چنانچہ وہ ہجرت سے رک گئے، پھر اس کے بعد ہجرت کی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: تمہاری قوم میری قوم سے بہتر ہے، میری قوم نے مجھے نکالا اور میرے قتل کا ارادہ کیا، اور تمہاری قوم نے نہ صرف تمہیں روکا، بلکہ تمہاری حفاظت کا بھی وعدہ کیا (مغنی ۱۳/۱۵۱، کتاب الجہاد، فصل فی الہجرۃ)۔

ابن قدامہ علیہ الرحمہ اپنی مایہ ناز تصنیف ''المغنی'' میں رقم طراز ہیں:

”فالناس فی الهجرة علی ثلاثة أضرب: أحدها: من تجب علیه وهو من یقدر علیها، ولا یمکنه إظهار دینه أو لا تمکنه إقامة واجبات دینه مع المقام بین الکفار فهذا تجب علیه الهجرة، لقول الله تعالی: ”إن الذین توفاهم الملائکة ظالمی أنفسهم قالوا فیم کنتم، قالوا کنا مستضعفین فی الأرض قالوا ألم تکن أرض الله واسعة فتهاجروا فیها فأولئک مأواهم جهنم وسائت مصیرا“، وهذا وعید یدل علی الوجوب۔ الثانی: من لا هجرة علیه وهو من یعجز عنها، إما لمرض أو إکراه علی الإقامة، وأضعف من النساء والولدان وشبههم، فهذا لا هجرة علیه، لقول الله تعالی: ”إلا المستضعفین من الرجال والنساء والولدان لا یستطیعون حیلة ولا یهتدون سبیلاً، فأولئک عسی الله

أن يعفو عنهم، وكان الله عفواً غفوراً'' ولا توصف باستحباب، لأنها غير مقدور عليها۔ والثالث: من يستحب له ولا تجب عليه، وهو من يقدر عليها، ولكنه يتمكن من إظهار دينه، وإقامته فی دار الكفر فتستحب له ليتمكن من جهادهم، وتكثير المسلمين ومعونتهم، ويتخلص من تكثير الكفار ومخالطتهم، ورؤية المنكر بينهم، ولا تجب عليه، لإمكان إقامة واجب دينه بدون الهجرة '' (المغنی ۱۳/۱۵۱ کتاب الجہاد، فصل فی الہجرۃ)۔

مذکورہ عبارت سے یہ بات بھی عیاں ہوگئی کہ مشرکین کے ساتھ رہنے میں جو وعیدیں احادیث میں وارد ہوئی ہیں، وہ اس مقامات پر محمول ہیں جہاں مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنا مشکل ہو یا عقیدہ خراب ہونے کا اندیشہ ہو، یا جان ومال، عزت وآبرو اور اہل وعیال پر خوف ہو۔

حضرت مفتی شفیعؒ کی عبارت اس سلسلے میں بھی کافی چشم کشا ہے، جس کو نقل کرنا افادیت سے خالی نہیں، بغرض افادیت نقل کی جاتی ہے:

''جس دار الکفر میں عام احکام دینیہ پر عمل کرنے کی آزادی ہو وہاں سے ہجرت فرض واجب تو نہیں، مگر مستحب بہر حال ہے، اور اس میں دار الکفر ہونا بھی ضروری نہیں، دار الفسق جہاں احکام الہیہ کی خلاف ورزی اعلاناً ہوتی ہو، اس کا بھی یہی حکم ہے، اگرچہ وہاں کے حکمراں کے مسلمان ہونے کی بنا پر اس کو دار الاسلام کہا جاتا ہو۔ یہ تفصیل حافظ ابن حجرؒ نے تحریر فرمائی ہے، اور قواعد حنفیہ میں کوئی چیز اس کے منافی نہیں، اور مسند احمد کی ایک روایت جو ابو یحییٰ مولی زبیر بن عوام سے منقول ہے وہ بھی اس پر شاہد ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**البلاد بلاد الله والعباد عباد الله حيثما أصبت خيراً فأقم**''، سب شہر اللہ کے شہر ہیں اور سب بندے اللہ کے بندے ہیں، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہو جائیں وہاں اقامت کرو'' (معارف القرآن ۶/۷۱۱، سورہ عنکبوت: ۵۶)۔

(۲) مستحب: غیر مسلم ممالک میں رہنے سے مقصود اگر دین کی اشاعت ہو یا وہاں رہنے والے مسلمانوں کو دین اور احکام اسلام سے روشناس کرانا ہو، اور انہیں ثابت قدمی پر ابھارنا ہو تو یہ نہ صرف مستحب، بلکہ موجب اجر وثواب بھی ہوگا، کیونکہ بہت سے صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی نیک مقصد سے اور دینی جذبے سے سرشار ہوکر غیر مسلم ممالک میں سکونت اختیار کی ہے، اور بعد میں یہ چیزیں ان کے مناقب میں شمار ہوئیں۔

(۳) واجب: غیر مسلم ممالک میں کوئی مقتدی اور مستند عالم ہو اور لوگ اس سے فیض یاب ہو رہے ہوں اور وہ دین اسلام کی ترویج اور احکامات الہیہ کی اشاعت کا ذریعہ اور سبب ہو، اور اس کے وہاں سے منتقل ہونے میں ضرر لاحق ہو تو ایسے شخص کو

ان مقامات پر سکونت اختیار کرنا واجب ہوگا۔

(۴) مکروہ: اگر کسی کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل ہیں کہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے تو محض عیش وعشرت یا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت اور سکونت کراہت سے خالی نہ ہوگی؛ کیونکہ وہاں رائج فواحش ومنکرات سے آدمی کے رہن واخلاق متاثر ہونے کا نہ صرف اندیشہ ہوتا ہے، بلکہ صورت حال یہ دیکھی گئی ہے کہ وہاں رہنے سے دینی حمیت کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے آدمی پگھل جاتا ہے۔ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

”والمشابهة والمشاركة فى الأمور الظاهرة، توجب مشابهة ومشاكلة فى الأمور الباطنة على وجه المسارقة والتدريج الخفى، وقد رأينا اليهود والنصارى الذين عاشروا المسلمين هم أقل كفراً من غيرهم، كما رأينا المسلمين الذين أكثروا من معاشرة اليهود والنصارى هم أقل إيماناً من غيرهم ممن جرّد الإسلام“ (اقتضاء الصراط المستقيم ۱/۴۸۸ کتاب الاعیاد ط: مکتبۃ الرشید الریاض)۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے، چناں چہ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”من جامع المشرک وسکن معه فإنه مثله“ (ابوداؤد: کتاب الجہاد باب الإقامۃ بأرض الشرک)۔

اسی طرح آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”عن جرير بن عبد الله قال قال (رسول الله ﷺ): أنا بريء من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله! لم؟ قال: لا ترائى ناراهما“ (ابوداؤد کتاب الجہاد، باب النہی عن قتل من المعتصم بالسجود)۔ قال ابن قدامة: ومعناه لا يكون بموضع يرى نارهم ويرون ناره إذا أوقدت“ (المغنی ۱۳/۱۵۱، ط: دار عالم الکتب الریاض)۔

مراسیل ابی داؤد میں حضرت مکحول سے مروی ہے کہ اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو (مراسیل ابی داؤد)۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام نے لکھا ہے: حصول مال کی غرض سے مسلمانوں کا دار الحرب میں سکونت اختیار کرنے اور ان کی جماعت وتعداد میں اضافہ کرنے سے دین خطرے میں پڑ جاتا ہے، اور یہ ایسا سبب ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہوتی ہے، کیوں کہ ایسا آدمی جھوٹی گواہی دینے میں نہیں جھجکتا۔

”وفى شرح أدب القاضى للشهيد حسام الدين: أسباب الجرح كثيرة: منها ركوب بحر

الهند، لأنه مخاطرة بنفسه ودينه من سكنى دار الحرب، وتكثير سوادهم وعددهم، لأجل الحال ومثله لا يبالى بشهادة الزور" (تکملۃ البحر الرائق ۷/۱۵۱ کتاب الشہادات، باب من تقبل شہادتہ ومن لا تقبل)۔

اور یہ بات محقق ومسلم ہے کہ عدالت گناہ کے کام سے مجروح ہوتی ہے۔

(۵) حرام: بعض صورت میں غیر مسلم ممالک میں رہنا حرام ہے، اس کو حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ہے، وہ لکھتے ہیں:

''اگر کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے، یا دارالکفر کی شہرت اور قومیت دارالاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے، یا اپنی پوری عملی زندگی بود وباش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے۔ ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں'' (فقہی مقالات ۱/۲۳۵)۔

آخر میں علامہ ابن عثیمین کا فتوی نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

"الإقامة فى بلاد الكفار خطر عظيم على دين المسلم وأخلاقه وسلوكه وآدابه وقد شاهدنا وعبرنا انحراف كثير ممن أقاموا هناک، فرجعوا بغير ما ذهبوا به، رجعوا فساقاً، وبعضهم يرجع مرتداً عن دينه وكافراً به وبسائر الأديان والعياذ بالله، حتى ضاروا إلى الجحود المطلق، والاستهزاء بالدين وأهله السابقين منهم واللاحقين،و لهذا كان ينبغى؛ بل يتعين التحفظ من ذلک ووضع الشروط التى تمنع من الهوى فى تلک المهالک، فالإقامة فى بلاد الكفر لا بد فيها من شرطين أساسيين:

الشرط الأول: أمن المقيم على دينه بحيث يكون عنده من العلم والإيمان وقوة العزيمة ما يطمئنه على الثبات على دينه، والحذر من الانحراف والزيغ وأن يكون مضمراً لعداوة الكافرين وبغضهم، مبتعداً عن موالاتهم ومحبتهم مما ينافى الإيمان''۔

الشرط الثانى: أن يتمكن من إظهار دينه بحيث يقوم بشعائر الإسلام بدون مانع، فلا يمنع من إقامة الصلاة والجمعة والجماعات إن كان معه من يصلى جماعة ومن يقيم الجمعة ولا يمنع من الزكاة والصيام والحج وغيرها من شعائر الدين، وإن كان لا يتمكن من ذلک لم تجز الإقامة لوجوب الهجرة حينئذ" (الفتاوی الشرعیہ فی المسائل العصریۃ من فتاوی علماء البلد الحرام: ۹۳۴، أحکام الکفار، الإقامۃ فی بلاد الکفار)۔

۴-بعض حضرات نے مفتی تقی عثمانی صاحب کی کتاب فقہی مقالات (جلد اول) سے یہ تحریر بھی بطور دلیل پیش کی ہے:

کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک میں اس ملک کے باشندے اور شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقل مسکن بنالینا، ایک ایسا مسئلہ ہے، جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کے اغراض ومقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوجاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا اس کو جیل میں ظلماً قید کرلیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو، ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہ وہاں جاکر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے اور وہاں رائج شدہ منکرات وفواحشات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے گا۔

(۲) اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی حالات سے دوچار ہوجائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں؛ حتی کہ وہ نان جویں کا بھی محتاج ہوجائے، ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے، جس کی بنا پر وہ وہاں رہائش اختیار کرلے تو مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فریضہ ہے، جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی؛ بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو؛ چنانچہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے:

"هو الذی جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا في مناكبها وكلوا من رزقه، وإليه النشور" (سورۂ ملک:۱۵)۔

(۳) اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا، اس نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا صرف یہ نہیں کہ جائز ہے؛ بلکہ موجب اجر وثواب ہے، چنانچہ بہت سے صحابہ اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی اور جو بعد میں ان کے فضائل ومناقب اور محاسن میں شمار ہونے لگی (مقالہ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی، مولانا قمر الزماں ندوی، مولانا عبید اللہ ندوی، قاضی محمد حسن ندوی)۔

(۴) اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں، جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں

کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوشحالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات ومنکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے اور بلاضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش وعشرت اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں، ان میں دینی حمیت کمزور ہو جاتی ہے، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کے ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ ''سنن ابوداود'' میں حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے؛ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: ''**من جامع المشرک وسکن معه، فإنه مثله**'' (جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے) (ابوداؤد: کتاب الضحایا)۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

''**أنا بريء من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله! لم؟ قال: لا ترآى ناراهما**'' (میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا: یارسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، تم یہ امتیاز نہیں کر سکو گے کہ یہ مسلمان کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے)۔

امام خطابیؒ حضور ﷺ کے اس قول مبارک کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''مختلف اہل علم نے اس قول کی شرح مختلف طریقوں سے کی ہے، چنانچہ بعض اہل علم کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اور مشرک حکم کے اعتبار سے برابر نہیں ہو سکتے، دونوں کے مختلف احکام ہیں اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دارالاسلام اور دارالکفر دونوں کو علیحدہ علیحدہ کر دیا ہے، لہذا کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ملک میں ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ جب مشرکین اپنی آگ روشن کریں گے اور یہ مسلمان ان کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے ہوگا تو دیکھنے سے یہی خیال کریں گے کہ یہ بھی انہیں میں سے ہیں، علماء کی اس تشریح سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دارالکفر جائے تو اس کے لئے وہاں پر ضرورت

سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے (معالم السنن للخطابی ۳/۷ ۴۳)۔

اور مراسیل ابوداود عن المکحول میں روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو'' (تہذیب السنن لابن قیم ۳/۷ ۴۳)۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ صرف ملازمت کی غرض سے کسی مسلمان کا دارالحرب میں رہائش اختیار کرنا، اوران کی تعداد میں اضافہ کا سبب بننا ایسا فعل ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہوجاتی ہے (تکملہ ردالمحتار ۱/۱۰۱)۔

۵- پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دارالکفر کی شہریت اور قومیت کو دارالاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بودوباش میں ان کا طرز اختیار کرکے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے، ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقا حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (فقہی مقالات: مقالہ: مغربی ممالک کے چند جدید فقہی مسائل ۱/۲۲۲-۲۲۵) (مقالہ: مولانا محمد اقبال ٹنکاروی، مولانا قمر الزماں ندوی، قاضی محمد حسن ندوی، مولانا عبیداللہ ندوی، مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی)۔

☆ جبکہ مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی نے شہریت اختیار کرنے والوں کے اغراض ومقاصد کے تنوع کو بنیاد بنا کر شہریت کے احکام کو بیان کیا ہے۔، پانچ اقسام تو وہی ہیں جو اوپر فقہی مقالات کے حوالہ سے بیان ہوئے، مزید کا اضافہ آپ نے کیا ہے، لکھتے ہیں:

اسی طرح اگر کوئی شخص اعلی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرتا ہے حالانکہ خود اس کے ملک اور شہر میں وافر مقدار میں تعلیمی وسائل حاصل ہیں، ایسی صورت حال میں وہ کسی غیر مسلم ملک میں تعلیمی مشن کی تکمیل کے لئے رہائش کرتا ہے تو ایسی رہائش اختیار کرنا اس کے لئے زہر ہلاہل ثابت ہوگی، شرعی نقطہ نظر سے مطلقاً اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا حرام ہوگا۔

مفتی جعفر ملی رحمانی نے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کو چند شرطوں کے ساتھ مقید کیا ہے:

۱- غیر مسلم ممالک یا شہروں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص احکام اسلام پر مکمل کاربند رہے۔''**يا أيها الذين آمنوا ادخلوا فى السلم كافة ولا تتبعوا خطوات الشيطان**'' (البقرہ:۲۰۸)۔

۲- وہاں مروجہ منکرات ومحظورات سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھے۔''**إن الله يأمر بالعدل والإحسان**

وإيتاء ذى القربى وينهى عن الفحشاء والمنكر والبغى"(النحل:۹۰)۔

۳-اس کے پاس دینی وشرعی علم اتنا ہو کہ جس سے وہ احکام اسلام سے متعلق پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو دفع کرسکتا ہو۔

۴-اس کے پاس اتنا تقوی ودیانت ہو جو اسے سہولت سے روک سکے۔"شرط على المسافر إلى تلك البلاد أن يكون عنده علم يدفع به الشبهات، ودين يمنعه الشهوات، وأن يكون محتاجاً إلى ذلك السفر"(مجموع الثمین للعثیمین،ص/۵۰)۔

۵-ایسے ملک کی شہریت اختیار کرے جو اسے فوج میں داخلہ، مسلمانوں کے خلاف جنگ اور غیر اسلامی امور کی انجام دہی پر مجبور نہ کرے۔"إن كان المسلم المسافر إلى بلاد الكفار يقدر على إظهار دينه ولا يخاف من الفتنة فيه، ولا يوالى المشركين، فهذا يجوز له السفر، كما فعل بعض الصحابة رضى الله عنهم كأبى بكر الصديق رضى الله عنه فقد سافر إلى بلدان المشركين للتجارة، ولم ينكر عليه النبىﷺ، وكما صرح بذلك العلماء أن القادر على إظهار دينه فى ديار الكفار فلا بأس بإقامته فيها، وهذا يدل على أن من سافر إليها لغرض وقدر على إظهار دينه جاز له ذلك"(اختلاف الدین وآثارہ فی أحکام الشریعۃ الإسلامیۃ، ص/۱۷۰)۔

☆لیکن مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کا اس سلسلہ میں کہنا ہے کہ ملکوں کی صورتحال کے اعتبار سے وہاں کی شہریت کے احکام میں اختلاف ہوگا، وہ لکھتے ہیں:

(۱) پہلی قسم ان غیر مسلم ممالک کی ہے جن کی صورتحال مکی زندگی کے مشابہ ہو، یعنی وہاں دین وایمان محفوظ نہ رہے، مگر ہجرت پر قدرت بھی ہو، تو ایسے وقت دوسرے ملک جانا خواہ وہ غیر مسلم ملک ہی کیوں نہ ہو، واجب ہوگا، قرآن کریم نے ان لوگوں کو ڈانٹ پلائی ہے جنہوں نے ہجرت کی قدرت کے باوجود ہجرت نہیں کی، اور قتل ہو گئے۔

"إن الذين توفاهم الملائكة ظالمى أنفسهم قالوا فيم كنتم قالوا كنا مستضعفين فى الأرض، قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها، فأولئك مأواهم جهنم وساءت مصيرا" (نساء:۹۷)۔

البتہ بمصلحت قیام کرے تو حرج نہیں ہوگا، جیسا کہ حضرت عباس نے بمصلحت تاخیر سے ہجرت کی۔

(۲) دوسری صورت حال یہ ہے کہ ملک میں امن وامان نہیں، دین وایمان کو ہر لمحہ خطرہ، مگر ہجرت کی قدرت بھی نہیں تو ایسی صورت میں اس ملک میں رہنے میں گناہ نہیں ہے، قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت میں استثناء موجود ہے:

"إلا المستضعفين من الرجال والنساء والولدان لا يستطيعون حيلة ولا يهتدون سبيلا فأولئک عسى الله أن يعفو عنهم وكان الله عفوا غفورا" (نساء:۹۸،۹۹)۔

(۳) تیسری قسم ان ملکوں کی ہے جو ہیں غیر مسلم ملک، مگر کسی مسلمان کا وہاں رہنا بحیثیت اقلیت بھی مضر نہیں ہے، بلکہ دین وایمان اور جان ومال ہر ایک کو تحفظ حاصل ہے، جیسا کہ آج غیر مسلم ملکوں کی صورتحال ہے، اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں ان ممالک میں زیادہ مواقع ہیں کہ مسلمان ترقی کرے۔ ایسے ملکوں میں رہنے کے سلسلے میں دو نظریئے ہیں:

(۱) حضرت امام مالک کے نزدیک ایسے ملکوں میں رہنا جائز نہیں، خواہ دین پر عمل کرنا کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو، یہ تو غیر اسلامی قانون کو اپنے اوپر تھونپ لینا ہے۔

(۲) جبکہ دوسری رائے جمہور کی ہے، بالخصوص حنابلہ وحنفیہ کی کہ ایسے ملکوں میں رہنا جائز ہے۔

اختلاف کا منشا حدیثوں میں اختلاف ہے، بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا حکم منسوخ ہوگیا: "لا هجرة بعد الفتح" (بخاری ۱/ ۴۲۳)۔

اور بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا سلسلہ جاری ہے:

"لا تنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبة ولا تنقطع التوبة حتى تطلع الشمس من مغربها" (ابوداؤد ۱/ ۳۳۶)۔

البتہ دوسری قسم کی حدیثیں ایسی حالت پر محمول ہیں کہ جب دین وایمان محفوظ نہ ہو، یا ایسے ملکوں پر محمول ہیں جو قبل الفتح مکہ کے نقش قدم پر ہوں۔

جبکہ امام مالکؒ دوسری قسم کی احادیث سے استدلال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہر وہ ملک جو غیر مسلم اقتدار کے ماتحت ہے وہاں رہنا یا وہاں کی شہریت حاصل کرنا جائز نہیں، بلکہ وہاں سے بھاگنا ضروری ہے، نیز ترمذی کی روایت جو سابق میں گذر چکی ہے، رسول اللہ ﷺ نے مسلموں کے ساتھ رہنے والے سے بیزاری کا اظہار فرمایا۔

بیہقی کی روایت میں صاف طور پر منع کیا گیا ہے: "لا تساكنوا المشركين ولا تجامعوهم، فمن ساكنهم أو جامعهم فهو مثلهم" (بیہقی ۹/ ۱۸، کتاب السیر، باب الرخصہ فی الاقامہ بدار المشرک)۔

ترمذی کی روایت اور بیہقی کی روایت دونوں ہی متکلم فیہ ہیں، اگر اس سے اعراض بھی کیا جائے تو یہ جمہور کے نزدیک انہی ممالک پر محمول ہیں جہاں فتنہ کا خوف ہو۔

امام مالکؒ کی عقلی دلیل کہ غیر اسلامی قانون کو اپنے اوپر تھونپ لینا ہے، اس کی معنویت اس دور میں ختم ہوگئی ہے، غیر مسلم ملکوں میں دین وشریعت پر عمل کرنے والے جس قدر آزاد ہیں، خدا معاف کرے اسلامی ملکوں میں بسنے والے اسی

قدر گھٹن محسوس کرتے ہیں، غیر مسلم ملکوں میں آج کوئی رکاوٹ نہیں ہے، آج ان ممالک کی مثال حبشہ جیسی ہے، جس طرح حبشہ کی سکونت میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا تھا، اسی طرح ان ملکوں میں سکونت بھی جائز ہونی چاہئے۔

☆ مولانا نوراحمد عینی قاسمی نے اس میں دو قسم کے ممالک کا اضافہ کر کے لکھا ہے کہ اسرائیل کی شہریت اختیار کرنا اور ٹھیٹھ قسم کے دارالحرب میں جہاں دین پر عمل کرنا دشوار ترین ہو تو ایسے ممالک کی شہریت اختیار کرنا درست نہیں ہے۔

مولانا اختر امام عادل قاسمی نے اس سلسلہ میں تفصیلی گفتگو کی ہے، ملکوں کی صورتحال اور احکام کی نوعیت میں فرق کے اعتبار سے تفصیلات پیش کی ہیں، مولانا محمد فخر عالم نعمانی نے اس کا خلاصہ پیش کیا ہے جسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:

فقہاء نے غیر مسلم ملکوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، اور ان تینوں کے الگ الگ احکام بیان کئے ہیں:

۱- پہلی قسم ان غیر مسلم ممالک کی ہے جہاں بحیثیت مسلمان کسی شخص کا قیام سخت مشکل ہو، دین پر قائم رہ کر وہاں رہنا ممکن نہ ہو۔ ایسے ملکوں میں جانا وہاں قیام کرنا باتفاق فقہاء کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ۳/ ۲۲۸، المدونۃ الکبری ۵/ ۱۵۶۵، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل ص: ۱۶، قاموس الفقہ ۵/ ۳۳۳)۔

۲- دوسری قسم ان غیر اسلامی ممالک کی ہے جہاں کھل کر دین پر عمل کرنے کی آزادی نہ ہو، جان و مال عزت و آبرو پر خطرات کے بادل منڈلاتے رہتے ہوں مگر مسلمانوں کے لئے کوئی دوسری جائے ہجرت نہ ہو یا ہجرت کے اخراجات کے متحمل نہ ہوں، ایسے مسلمانوں پر باتفاق فقہاء ہجرت واجب نہیں ہے اور ان ملکوں میں اقامت ان کے لئے باعث گناہ نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ۳/ ۲۲۸، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل، ص: ۱۷، قاموس الفقہ ۵/ ۳۳۳)۔

۳- تیسری قسم ان غیر اسلامی ممالک کی ہے، جہاں مسلمانوں کے لئے بحیثیت ایک اقلیت کوئی خطرہ نہ ہو، مذہبی آزادی حاصل ہو، اس کے یا اس کی نسلوں کے دین و ایمان کو مکمل تحفظ فراہم ہو۔ ایسے ملکوں میں اقامت اختیار کرنے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

(۱) ایک رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایسے ملکوں میں جانا یا رہنا بھی جائز نہیں، اگر قدرت میسر ہو تو مقیم مسلمانوں کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے، یہ رائے فقہائے مالکیہ کی ہے اور شافعیہ کا ایک قول بھی اسی کے مطابق ملتا ہے (المدونۃ الکبری ۵/ ۱۵۶۵)۔

(۲) دوسری رائے یہ ہے کہ ایسے ملکوں میں جانا قیام کرنا درست ہے اور مقیم مسلمانوں کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہیں ہے، یہ رائے حنفیہ اور حنابلہ کی ہے اور شافعیہ کا صحیح مسلک بھی یہی ہے (احکام القرآن للجصاص ۲/ ۳۰۵، اعلاء السنن للتھانوی ۱۲/ ۳۶۱)۔ دور حاضر کے علماء کی بھی نظریات مختلف ہیں: (۱) علماء کا ایک طبقہ عدم جواز کا قائل ہے، (۲) اور دوسرا طبقہ جواز کا قائل ہے۔

عدم جواز کے قائلین کی دورائیں ہیں:

الف-ایک طبقہ اس کو خروج عن الاسلام اور صریح ارتداد کے مترادف قرار دیتا ہے اور ایسے تمام حضرات پر مرتدین کے احکام جاری کرنے کا قائل ہے جو غیر مسلم ملکوں میں مقیم ہیں (فتاوی الامام محمد رشید رضا ۱۷۵۰/۵)۔

ب-دوسرا طبقہ اس کو ارتداد نہیں کہتا، بلکہ صرف معصیت قرار دیتا ہے (مجلۃ الفقہ الاسلامی ۱۱۵۶/۲)۔

پھر جواز کے قائلین میں بھی دو نقطۂ نظر ہیں:

الف-ایک کی رائے یہ ہے کہ اس کی گنجائش صرف بوقت ضرورت ہے۔عرب علماء میں شیخ احمد بن احمد الخلیلی رکن مجمع الفقہ الاسلامی کی یہی رائے ہے۔مصری دارالافتاء نے بھی اسی کے مطابق فتوی دیا ہے (فتوی نمبر:۸۸۹، ۲۰۰۰ء)۔

ب-دوسری رائے اصلاً جواز کا ہے۔البتہ حالات وظروف اور اغراض ومقاصد کے لحاظ سے حکم کی نوعیت میں فرق ہوسکتا ہے، عصر حاضر کے جمہور علماء کی رائے یہی ہے۔اس رائے کے حامل چند مشہور نام یہ ہیں:

ڈاکٹر یوسف القرضاوی (ان کا فتوی ویب سائٹ پر موجود ہے)، ڈاکٹر محمد رأفت عثمانی عمید الکلیۃ الشرعیۃ جامعۃ ازہر، ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی (فقہ الاقلیات المسلمہ ص:۶۰۹)۔مفتی محمد تقی عثمانی (بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ ص:۳۲۰)۔مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (قاموس الفقہ ۳۳۴/۵) وغیرہ۔

قائلین عدم جواز کے دلائل:

جو حضرات عدم جواز کی رائے رکھتے ہیں ان کے موقف کی درج ذیل دلیلیں ہیں:

۱-"**ألم تر إلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليك وما أنزل من قبلك يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أمروا أن يكفروا به ويريد الشيطان أن يضلهم ضلالاً بعيداً**"(سورہ نساء:۶۰)۔

طاغوت سے مراد وہ نظام قانون ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو۔غیر مسلم ملک میں شہریت حاصل کرنا گویا بااختیار اسلامی نظام قانون سے نکل کر طاغوتی نظام قانون میں داخل ہونا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے انحراف ہے (فتاوی محمد رشید رضا مصری ۱۷۵۵/۵)۔

۲-"**ومن يبتغ غير الإسلام ديناً فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين**"(آل عمران:۸۵)۔

جو حضرات اسلامی مملکت سے نکل کر غیر اسلامی مملکت میں قیام پذیر ہیں یا قیام کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اس آیت کریمہ کے مصداق ہیں۔

۳-بعض احادیث سے بھی ان حضرات نے استدلال کیا ہے جن میں صراحت کے ساتھ غیر مسلموں کے درمیان

اقامت وسکونت سے منع کیا گیا ہے: "**لا تساکنوا المشرکین ولا تجامعوهم فمن یساکنهم أو جامعهم فهو مثلهم**" (ترمذی باب ماجاء فی کراہیۃ المقام کتاب السیر ۲۸۹/۹)۔

۴- "**أنا بریئ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین**" (ترمذی کتاب السیر باب ماجاء فی کراہیۃ المقام بین أظہر المشرکین ۲۸۹/۱)۔

جب غیر اسلامی ملکوں میں مقیم مسلمانوں کو ان ملکوں کے چھوڑ دینے کا حکم دیا جارہا ہے تو مسلم ملکوں سے منتقل ہوکر وہاں جانے کی اجازت کیسے مل سکتی ہے؟

ایک عقلی استدلال یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان کے غیر اسلامی ملک میں جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے آپ کو اسلامی قوانین کے سایہ سے نکال کر غیر اسلامی قوانین کے لئے پیش کررہا ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی صاحب ایمان کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی (مقدمات ابن رشد مع المدونۃ الکبری ۱۵۹/۹ ۳، المدونۃ الکبری الامام المالک ۱۵۶۵/۵)۔

قائلین جواز کے دلائل:

جمہور علماء کے پیش نظر وہ قرآنی آیات ہیں جن میں اسلام کی آفاقیت اور اس کی دعوت عامہ کا ذکر موجود ہے، مثلاً:

۱- "**هو الذی أرسل رسوله بالهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون**" (سورہ توبہ: ۳۳)۔

۲- "**وما أرسلناک إلا کافة للناس بشیراً ونذیراً ولکن أکثر الناس لا یعلمون**" (سورہ سبا: ۲۸)۔

۳- "**ادع إلی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن**" (النحل: ۱۲۵)۔

۴- "**قل هذه سبیلی أدعو إلی الله علی بصیرة أنا ومن اتبعنی**" (یوسف: ۱۰۸)۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت دنیا کے ہر خطے میں پہنچانا اس امت کا منصبی فریضہ ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان اسلامی ملکوں سے نکل کر غیر اسلامی ملکوں میں جائیں اور اسلام کی دعوت چاردانگ عالم میں پہنچائیں۔ صحابہ کرام کا عمل ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے کہ انہوں نے سخت مشکل حالات میں اپنا وطن چھوڑ کر غیر اسلامی ملکوں کا سفر کیا وہاں قیام کیا اور دین کی دعوت دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچائی۔

قول راجح:

مذکورہ مباحث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہور کا موقف ہی زیادہ مضبوط اور لائق ترجیح ہے۔ کیونکہ اب

غیر اسلامی ممالک کی صورت حال بدل گئی ہے، آج ان ممالک میں فکر وعقیدہ اور اظہار وخیالات ونظریات کی آزادی ہے۔

اگر عدم جواز کی رائے مان بھی لی جائے تو اس کو استعماری دور پر محمول کیا جائے گا جب کہ غیر مسلم ملکوں میں کسی صاحب ایمان کا داخلہ مشکل تھا اور اس کو ارتداد کے مترادف مانا جاتا تھا، اب وہ صورت حال باقی نہیں، آج وہاں اسلامی ادارے، دینی تحریکات وتنظیمات کی خاصی تعداد خدمت دین میں مصروف ہے اور ان کے لئے کوئی قانونی یا سیاسی رکاوٹ نہیں ہے، اس لئے آج ان ممالک میں نہ اسلام کے لئے کوئی خطرہ ہے اور نہ مسلمانوں کے لئے۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کے وہاں داخلہ یا اقامت کو ممنوع قرار دیا جائے۔

معاشی وطبی مقاصد کے لئے غیر مسلم ملک کی سکونت اختیار کرنا:

اس کی کئی صورتیں ہیں:

الف- اپنے ملک میں معاش کی بنیادی وسائل میسر نہ ہوں اس کی وجہ سے کوئی مسلمان غیر مسلم ملک چلا جائے اور وہاں اقامت کرے تو جمہور فقہاء کے نزدیک اس کی اجازت ہے (المبسوط للسرخسی ۱۰/۸۸، احکام القرآن للعربی ۱/۵۱۵)۔

ب- بنیادی وسائل معاش اپنے ملک میں میسر ہوں جس سے زندگی گذر بسر ہوسکتی ہو، مگر اپنی یا اپنے خاندان کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے کسی غیر مسلم میں ملک میں قیام کرے تو اس کی بھی گنجائش ہے (احکام القرآن لابن العربی ۱/۴۸٦، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۵/۳۵۱)۔

ج- تجارتی مقاصد کے تحت غیر اسلامی ملکوں میں قیام کیا جائے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک یہ بھی جائز ہے (المبسوط للسرخسی ۱۰/۸۸)۔ بعض اماموں کے نزدیک دنیوی اغراض کے لئے غیر اسلامی ملک میں قیام جائز نہیں ہے (مقدمات ابن رشد ۹/ ۳۱۵۹)۔

د- اگر کسی مرض کا مناسب علاج مسلم ملک میں میسر نہ ہو تو اس کے لئے غیر مسلم ملک کا سفر کرنا اور صحت کے لئے وہاں قیام کرنا جائز ہے (فتاوی ورسائل للمسافرین علماء کی ایک جماعت، ص:۳۹)۔

بعض مقالہ نگار حضرات کا کہنا ہے کہ ایک مسلمان کا کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا درست نہیں ہے، مختلف حضرات نے مختلف وجوہات بیان کی ہیں، مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب مطلقاً اجازت نہیں دیتے ہیں، البتہ بغیر شہریت اختیار کئے ہوئے صرف غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرنا جائز قرار دیتے ہیں۔ مولانا خورشید انور اعظمی صاحب نے صرف تبلیغ دین اور مصالح مسلمین کی خاطر غیر مسلم ملک میں قیام کی اجازت دی ہے، اور تجارت کی خاطر وہاں صرف جانے کی اجازت دیتے ہیں اقامت کی نہیں، جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ اور سعید بن زیدؓ وغیرہم نے تجارتی

سفر کیا تھا۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی نے شہریت اختیار نہ کرنے کے وجوہات میں لکھا ہے کہ غیر مسلم ملک میں ایمان پر ڈاکہ ڈالنے والے امور موجود ہوتے ہیں، برائیوں، شرور وفتن کا دور دورہ ہوتا ہے، اسلامی تشخص کا تحفظ دشوار ہوجاتا ہے، حلال وحرام کے درمیان تمیز آہستہ آہستہ ختم ہوجاتی ہے، کفار ومشرکین کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے، قرآن کریم نے کفار ومشرکین کے ساتھ ایسی دوستی کو مذموم قرار دیا ہے، جو اسلام کے مصالح کے خلاف ہو۔

۱-"یا أیها الذین آمنوا لا تتخذوا آبائکم وإخوانکم أولیاء إن استحبوا الکفر علی الإیمان، ومن یتولهم منکم فأولئک هم الظالمون" (التوبہ:۲۳)۔

۲-"الذین یتخدون الکافرین أولیاء من دون المؤمنین أیبتغون عندهم العزة فإن العزه لله جمیعا، وقد نزل علیکم فی الکتاب أن إذا سمعتم آیات الله یکفر بها ویستهزأ بها فلا تقعدوا معهم حتی یخوضوا فی حدیث غیره إنکم إذا مثلهم إن الله جامع المنافقین والکافرین فی جهنم جمیعا" (النساء:۱۳۹-۱۴۰)۔

۳-من جامع المشرک وسکن معه فإنه مثله (ابوداؤد، حدیث:۲۷۸۷) (مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۴-"أنا بریئ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین، قالوا: یا رسول الله! لم؟ قال: لا ترا ئی ناراهما" (ابوداؤد، حدیث نمبر:۲۶۴۵) (مقالہ مولانا خورشید احمد اعظمی)۔

۵- ابن رشد (الجد) لکھتے ہیں: "فکیف یباح لأحد الدخول إلا بلادهم، حیث تجری علیه أحکامهم فی تجارة أو غیرها، وقد کره مالک رحمه الله تعالی أن یسکن أحد ببلد یسب فیه السلف، فکیف ببلد یکفر فیه الرحمن، وتعبد فیه من دونه الأوثان، لا تستقر نفس أحد علی هذا إلا وهو مسلم سوء مریض الإیمان" (المقدمات الممہدات ۲/۱۵۲)۔

☆ مولانا خورشید احمد اعظمی صاحب نے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کو بعض وجوہ سے ناجائز اور حرام لکھا ہے، ان کا خیال ہے اور یہی رجحان مفتی ابوبکر قاسمی کا بھی ہے کہ یہ مرادف ہے غیر مسلموں کے ساتھ محبت وموالاۃ کو اور اس کے شریعت مخالف قوانین کے تسلیم کر لینے کو، قرآن میں اس کی ممانعت وارد ہے۔

۱-"لا یتخذ المؤمنون الکافرین أولیاء من دون المؤمنین، ومن یفعل ذلک فلیس من الله فی شئ إلا أن تتقوا منهم تقاة ویحذرکم الله نفسه وإلی الله المصیر" (آل عمران:۲۸)۔

۲- ”یا أیہا الذین آمنوا لا تتخذوا الکافرین أولیاء من دون المؤمنین أتریدون أن تجعلوا للہ علیکم سلطانا مبینا“(النساء:۱۴۴)۔

۳-”یا أیہا الذین آمنوا لا تتخذوا الیہود والنصاری أولیاء بعضہم أولیاء بعض، ومن یتولہم منکم فإنہ منہم إن اللہ لا یہدی القوم الظالمین“ (المائدہ:۵۱)۔

۴-”فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینہم“ (النساء:۶۵)۔

اخیر میں مولانا موصوف یہ لکھتے ہیں کہ دونوں رجحانات یعنی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے اور نہ کرنے کے مآخذ ودلائل کے پیش نظر ایک رجحان یہ بھی سامنے آتا ہے کہ بہتر یہ ہے کہ اگر مسلمان کو کسی مسلم ملک کی سکونت میسر ہو تو بلا وجہ شرعی یا ضرورت شدیدہ کسی غیر مسلم ملک کی سکونت اختیار نہ کرے۔

بہر حال بدرجہ مجبوری غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کی جاسکتی ہے، لیکن مولانا محمد توقیر بدر قاسمی، مفتی سعید اسعد قاسمی، مولانا خورشید احمد اعظمی، مفتی محمد جعفر ملی رحمانی وغیرہ کے بقول محض معاشی فوائد اور خوشحال زندگی کی خاطر ایک مسلمان کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا درست اور مناسب نہیں ہے۔ ان حضرات کی دلیل ہے:

ا-”قال النبی ﷺ: ألا إنی بریء من کل مسلم مع مشرک“(مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰/۲۸۶)۔

لیکن مولانا ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی کی رائے یہ ہے کہ اگر اس کے ملک میں معاشی وسائل مفقود ہوں کہ ضروریات زندگی بھی میسر نہیں ہو پارہی ہو تو اس کے لئے دینی شعائر کی حفاظ کے ساتھ اجازت ہے، کیونکہ کسب معاش فرض کے بعد دوسرا فریضہ ہے، ”ہو الذی جعل لکم الأرض ذلولا فامشوا فی مناکبہا وکلوا من رزقہ وإلیہ النشور“(ملک:۱۵)۔

مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی نے بھی معاشی فوائد کی خاطر غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت اسی وقت دی ہے جبکہ دین وایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو، اور مسلم ملک میں عزت وآبرو کے ساتھ معاشی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، اور یہ شرط بھی لگائی کہ شہریت اختیار کرنے والا اپنے داعیانہ کردار کو فراموش نہ کرے، ”أم کنتم شہداء إذ حضر یعقوب الموت، إذ قال لبنیہ ما تعبدون من بعدی، قالوا نعبد إلہک وإلہ آبائک إبراہیم وإسماعیل وإسحاق إلہا واحدا ونحن لہ مسلمون“ (بقرہ:۱۳۳)۔

۷-کسی مسلم ملک کا غیر مسلموں کو شہریت دینا:

سوال نمبر: ۷-کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا؟

اکثر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ مکہ ومدینہ کو چھوڑ کر کسی بھی مسلم ملک میں غیر مسلموں کو آباد کیا جاسکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان کو شہریت دینے میں قومی، ملی اور ملکی مصالح کو کوئی خطرہ نہ ہو۔

۱-"ولنجران وحاشيتها جوار الله وذمة محمد النبی رسول الله علی أموالهم وأنفسهم وملتهم وغائبتهم وشاهدهم وعشيرتهم وبيعهم وكل ما تحت أيديهم من قليل أو كثير لا يغير أسقف من أسقفيته ولا راهب من رهبانيته" (الطبقات الکبری لابن سعد ۲/۳۶، الوثائق السیاسیۃ للعہد النبوی/۱۴۰)(مقالہ مولانا محمد سلمان منصور پوری)۔

۲-"جمهور الفقهاء على أن عقد الذمة مع غير المسلمين يتولى إبرامه الإمام أو نائبه، لأن ذلك يتعلق بنظر الإمام وما يراه من المصلحة" (موسوعہ فقہیہ ۷/۱۲۲)(مقالہ مولانا محمد سلمان منصور پوری)۔

۳-"وقال الحنفية وهو رواية عند المالكية ورواية عن أحمد يجوز عقد الذمة لجميع الكفار إلا عبدة الأوثان من العرب" (موسوعہ فقہیہ ۷/۱۲۴)(مقالہ مولانا زبیر احمد قاسمی)۔

۴-"عن عمرو بن ميمون قال: وأوصيه بذمة الله وذمة رسوله أن يؤتى لهم بعهدهم وأن يقاتل من ورائهم ولا يكلفوا إلا طاقتهم" (بخاری ۱/۴۲۹)(مقالہ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی)۔

مفتی سعید اسعد قاسمی اور مولانا محمد توقیر بدر قاسمی نے مکہ اور مدینہ کے ساتھ ساتھ یمامہ کو بھی شامل کیا ہے کہ یہ علاقے چھوڑ کر ہی غیر مسلم کو آباد کیا جاسکتا ہے، کہ قرآن کریم نے اس کی اجازت دی ہے۔"لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم فی الدين ولم يخروجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين" (ممتحنہ:۸)۔

☆ مولانا خورشید احمد اعظمی وغیرہ کا کہنا ہے کہ خلافت راشدہ، خلافت امویہ، خلافت عباسیہ اور خلافت عثمانیہ کے تمام ہی ادوار میں غیر مسلموں کو اسلامی سلطنت میں مستقل شہری کی حیثیت سے رہائش کی اجازت رہی ہے، خواہ جزیہ لے کر ہو یا بغیر جزیہ کے۔

☆ مفتی محمد جعفر ملی رحمانی اور ڈاکٹر محمد فہیم اختر ندوی کے بقول جزیرۃ العرب کے علاوہ علاقوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا۔"وإن أحد من المشركين استجارک فأجره حتى يسمع

کلام الله ثم أبلغه مأمنه ذلک بأنهم قوم لا یعلمون" (توبہ:٦)۔

☆ مولانا محمد شاہجہاں ندوی اور ڈاکٹر مولانا ظفر الاسلام صدیقی اور مولانا نثار احمد حصیر قاسمی کہتے ہیں کہ اگر اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا تقاضا ہو تو چند غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کیا جاسکتا ہے، "**والأصل فیه أن الحربی لا یمکن من إقامة دائمة فی دارنا إلا بالاسترقاق أو الجزیة، لأنه یصیر عینا لهم وعونا علینا فیلحق المضرة بالمسلمین**"(ہدایہ مع البنایہ ۷/۲۰۷)۔

☆ قاضی محمد حسن ندوی لکھتے ہیں کہ غیر مسلموں کو مسلم معاشرہ میں آباد کرنے میں دو صورتیں پیدا ہوں گی، ایک اعتبار سے منفعت ہے کہ اسلامی تعلیمات واخلاق کی تبلیغ آسان ہوگی، دوسری صورت میں مضرت ہے کہ غیر اسلامی تہذیب سے مسلمانوں کا متاثر ہونا لازم آئے گا، لہٰذا غیر مسلموں کو مسلم ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی سے ہٹ کر علاحدہ جگہ میں آباد کرنے کی اجازت ہوگی تاکہ مسلمان ان کی تہذیب سے متاثر نہ ہوں، اور ان کی مدد کرنے میں اور ان کو دین اسلام سے قریب کرنے میں سہولت بھی ہو۔ اور بقول مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی اور مولانا محمد توقیر بدر قاسمی کا بھی یہی رجحان ہے کہ یہ امت دعوت ہیں اور مسلمانوں کی قربت سے ان کے حق قبول کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور یہ صلہ رحمی کی تعلیمات کے عین مطابق بھی ہے۔

☆ مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی کا کہنا ہے کہ غیر مسلموں کو دو شرطوں کے ساتھ مسلم ملک میں مستقل سکونت کی اجازت دی جاسکتی ہے، ان دونوں شرطوں کے بارے میں ابن قدامہ لکھتے ہیں: "**لا یجوز عقد الذمة المؤبدة إلا بشرطین: أحدهما : أن یلتزموا إعطاء الجزیة فی کل حول، والثانی: التزام أحکام الإسلام وهو قبول ما یحکم به علیهم من أداء حق أو ترک محرم لقول الله تعالی: حتی یعطوا الجزیة عن ید وهم صاغرون، وقول النبی ﷺ فی حدیث بریدة: فادعهم إلی أداء الجزیة، فإن أجابوک فاقبل منهم وکف عنهم**" (المغنی لابن قدامہ ۱۰/۵۶۳) "**ترک الکافر فی دار الإسلام بالجزیة جائز**" (تاتارخانیہ ۱/۲۵٦)۔

☆ مولانا احمد نور عینی قاسمی نے غیر مسلموں کو آباد کرنے کو درست تو قرار دیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی تین باتوں کو پیش نظر رکھنے پر زور دیا ہے۔

۱- نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "**أخرجوا المشرکین من جزیرة العرب**" (بخاری، حدیث:۳۱٦۸) اور "**لا یجتمع دینان فی جزیرة العرب**" (مؤطا امام مالک، حدیث نمبر:۱٦۷۱)، ان کو شہریت دینے کے سلسلہ میں ان احادیث کو نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے۔

۲-استعمار کی سیاہ تاریخ پیش نظر رہنی چاہئے، اور استعماری عناصر کو شہریت دینے کے سلسلہ میں محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

۳-غیر مسلموں کو آباد کرنے کے سلسلہ میں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ کہیں ان کی بڑھتی تعداد مسلم مملکت کے لئے خطرہ کا باعث نہ ہو اور وہ اپنی کثیر تعداد کی وجہ سے ووٹ کی طاقت کے ذریعہ اسلامی مملکت کی بیخ کنی کردیں، یا بغاوت کر کے اپنی الگ مملکت قائم کرلیں۔

☆ مولانا اختر امام عادل قاسمی اور مولانا محمد فخر عالم نعمانی نے حرم وحجاز کے علاوہ علاقوں میں غیر مسلموں کو آباد کرنے کو چند باتوں کے ساتھ مشروط کیا ہے جن کی تعمیل غیر مسلموں کے لئے ضروری ہوگی۔

۱-کتاب الٰہی کا احترام کریں، اور اس کے بارے میں کسی طعن وتحریف کا تذکرہ نہ کریں، ۲-ناموس رسالت میں کوئی بے ادبی نہ ہو، ۳-دین اسلام کی تحقیر نہ کریں، ۴-کسی مسلم خاتون کی عصمت وعفت کو داغدار نہ کریں، ۵-کسی مسلمان کو دینی یا مالی فتنہ میں مبتلا نہ کریں، ۶-اہل حرب کی مدد اور ان کے لئے جاسوسی نہ کریں، ۷-مسلمانوں کے شہر میں علی الاعلان شراب وخنزیر فروخت نہ کریں، ۸-کھلم کھلا فواحش کا اظہار وارتکاب نہ کریں (الأحکام السلطانیہ للماوردی ر ۱۴۵)۔

☆ مولانا ریحان مبشر قاسمی کا کہنا ہے کہ ایسا غیر مسلم جو مرتد نہ ہو اسے حجاز کے علاوہ میں شہریت دینا جائز ہوگا، موصوف کا کہنا ہے کہ یہود ونصاری اور مجوسیوں سے عقد ذمہ کیا جاسکتا ہے، لیکن مشرکین عرب اور مرتدین سے عقد ذمہ کرنا جائز نہ ہوگا۔

مفتی اشرف عباس قاسمی اور مولانا ریحان مبشر قاسمی وغیرہ کا یہ بھی کہنا ہے کہ ان کو عہدے اور مناصب بھی دئے جاسکتے ہیں کہ اس کی مثالیں عہد خلفائے راشدین، عہد بنی امیہ اور عہد بنی عباس اور بعد کے ادوار میں ملتی ہیں، ایک مغربی مورخ نے لکھا ہے کہ ''ہمیں بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم اسلامی تاریخ میں غیر مسلموں کو حکومت کے مناصب پر دیکھتے ہیں'' (احکام الذمیین ر ۷۹)، اسی طرح مشہور مؤرخ آدم میز نے لکھا ہے کہ ''**من الأمور التی تعجب لها کثرة عدد العمال والولاة وکبار المؤظفین والمتصرفین غیر المسلمین فی الدولة الاسلامیة فکأن النصاری هم الذین یحکمون المسلمین فی بلاد الاسلام**'' (الحضارۃ الاسلامیۃ ۱ ر ۱۱۸)۔

مسلم ملک کی شہریت نہ دینا:

بعض مقالہ نگار حضرات نے غیر مسلموں کو مسلم ملک کی شہریت نہ دینے کو بہتر قرار دیا ہے، اور اس پر تو سبھی کا اتفاق ہے کہ حرم اور حجاز کے اطراف میں کسی غیر مسلم کو شہریت دی ہی نہیں جاسکتی، چونکہ قرآن میں ارشاد ہے: ''إنما المشرکون

نجس فلا يقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا“(توبہ:۲۸)، اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:”أخرجوا المشركين من جزيرة العرب“(بخاری،حدیث:۳۱۶۸)،”لأخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب حتى لا أدع إلا مسلما“ (مسلم،حدیث نمبر:۴۶۹۳)”لا يجتمع فى أرض العرب دينان“(مسنداحمد۲۵۷/۶)۔

☆ حافظ کلیم اللہ عمری مدنی کا کہنا ہے کہ غیر مسلموں کو زیادہ سے زیادہ پناہ گزینوں کی طرح انسانی ہمدردی اور دعوتی نقطہ نظر سے مسلم ملکوں میں وقتی طور پر پناہ دیا جاسکتا ہے۔

☆ مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب ان کو آباد کرنا اس لئے درست قرار نہیں دیتے کہ وہ رفتہ رفتہ اپنی آبادی میں بڑھ کر مسلم ملکوں میں بغاوت وفساد کی آگ بھڑکانا شروع کردیں گے اور اپنی آبادی کے بٹوارہ وعلاحدگی کے لئے مسلم ملکوں سے احتجاج شروع کردیں گے، اور جس خطہ میں ان کی آبادی غالب ہوگی اور مسلمان کم ہوں گے تو وہ مسلمانوں کو مارنا پیٹنا اور تنگ کرنا شروع کردیں گے۔

☆ مولانا خورشید انور اعظمی صاحب کے مطابق غیر مسلم کو جزیرۃ العرب میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، البتہ وہ جزیرۃ العرب کے علاوہ دوسرے مسلم ملکوں میں سکونت اختیار کرسکتا ہے، بخلاف أمصار المسلمين التى ليست فى جزيرة العرب، يمكنون من سكناها ولا خلاف فى ذلك (فتح القدیر۳۰۱/۵)۔

☆ مفتی محمد اقبال ٹنکاروی صاحب کی رائے ہے کہ آج کل اسلام ومسلم دشمنی اور مسلمانوں سے عناد سے کوئی ناواقف نہیں ہے، ایسے میں کچھ جزوی حالات میں کڑی شرائط کے ساتھ آباد کرنے کی گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن انہیں حساس شعبے، لشکر، حکومتوں کے اعلی شعبے ومناصب وغیرہ میں ملازمتیں نہیں دی جائیں گی۔

☆ مفتی محمد ابوبکر قاسمی صاحب بالعموم یہ کہتے ہیں کہ مسلم ملکوں خصوصا جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کو مستقل شہریت دے کر بسانا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے۔

☆ مولانا قمر الزماں ندوی لکھتے ہیں کہ سرزمین حجاز میں غیر مسلموں اور اہل کتاب کو مستقل یا عارضی شہری کی حیثیت سے آباد کرنا کسی حال میں درست نہیں ہے، اور دلیلوں کے ساتھ علامہ ابن باز کی یہ تحریر بھی بطور دلیل پیش کی ہے:

”لقد صح أن الرسول ﷺ قال: ”لايجتمع فى الجزيرة دينان“ وصح عنه ايضا أنه أمر بإخراج اليهود والنصارى من الجزيرة وأمر أن لا يبقى فيها إلا مسلم، وأوصى عند موته عليه الصلاة والسلام باخراج المشركين من الجزيرة، فهذا أمر ثابت عن رسول الله و ليس فيه شك، والواجب على الحكام أن ينفذوا هذه الوصية كما نفذها خليفة المسلمين عمر رضى الله عنه باخراج اليهود

من خيبر و اجلائهم"۔

موصوف پھر آگے لکھتے ہیں کہ عرب ملکوں میں ضرورت کی بنا پر ایسے ہی غیر مسلموں کو رہائش کی اجازت دی جائے جو مسلمانوں کے دشمن نہ ہوں یا ان سے برسر جنگ نہ ہوں، اور جب ان کو شہریت کی اجازت مل جائے تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ان میں دعوت وتبلیغ سے غافل نہ ہوں اور اسلام کے محاسن کو بیان کرنے سے پیچھے نہ رہیں (دیکھئے: مجموع فتاوی الشیخ ابن باز)۔

☆ مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی صاحب جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کو شہریت نہ دیئے جانے کے تمام دلائل ذکر کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری شرح بخاری میں جمہور علماء کی رائے نقل کی ہے کہ جزیرۃ العرب میں صرف حجاز کے اندر مشرکوں کو داخل ہونے یا شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہ ہوگی، حجاز میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، حدیبیہ، یمامہ، طائف وغیرہ کے قرب وجوار کے تمام علاقے اس زمرہ میں شامل ہوں گے، ان کے علاوہ جزیرۃ العرب میں شمار ہونے والے دیگر مقامات کا یہ حکم نہیں ہوگا، کیونکہ علماء کا اتفاق ہے کہ یمن میں مشرکوں کا داخلہ ممنوع نہیں ہے، حالانکہ یمن بھی جزیرۃ العرب میں داخل ہے، حنفیہ کے نزدیک مسجد الحرام کے علاوہ حدود حرم کے دیگر مقامات میں داخلہ کی اجازت ہے، امام مالک کے نزدیک تجارت کی غرض سے حرم میں داخلہ کی اجازت ہے، امام شافعی کے نزدیک حرم میں داخلہ کی اجازت بالکل نہیں ہے، ہاں اس صورت میں جب صرف مسلمانوں کی کوئی مصلحت وحکمت ہو تو اس کی رعایت ونصرت کے خیال سے حکومت کی اجازت ہی سے وہ داخل ہو سکتے ہیں (فتح الباری ۱۹۷/۶)۔

☆ مولانا عبید اللہ ندوی نے اس سوال کے جواب میں جو تفصیلات پیش کی ہیں ان کا خلاصہ ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے:

کفار کے حق میں مسلم ممالک کی تین اقسام ہیں:

الف- حرم پاک: تو کسی کافر کے لئے اس میں داخل ہونا کسی بھی حال میں درست نہیں، چاہے وہ ذمی ہو یا مستأمن، ائمہ اربعہ میں سے امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اسی کے قائل ہیں، حتی کہ اگر دار الکفر سے کفار کا کوئی قاصد آئے اور امام المسلمین حرم میں ہو تو بھی اس کو دخول کی اجازت نہیں دی جائے گی بلکہ امام المسلمین خود باہر تشریف لا کر یا اپنا نمائندہ اور قاصد بھیج کر اس کا پیغام سنیں گے۔

دلیل: ان حضرات ائمہ کی دلیل قرآن پاک کی آیت "**إنما المشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام**" (سورۂ توبہ: ۲۸) کا ظاہری مفہوم ہے۔

ائمہ حنفیہ کی دلیل بھی قرآن پاک کی یہی آیت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آیت کا دو مفہوم ہے:

الف- ممانعت ان مشرکین کے ساتھ خاص ہے جن کو دخول مکہ اور دیگر تمام مساجد میں دخول سے روک دیا گیا تھا، ذمہ نہ ہونے کی وجہ سے، اور ان سے اسلام اور قتال کے سوا کوئی چیز (ذمہ، جزیہ وغیرہ) قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ مشرکین عرب ہیں۔

ب- مشرکین کو حج کے لئے دخول مکہ سے روکا گیا ہے، یعنی کوئی کافر و مشرک حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہوسکتا، دلیل اس کی یہ ہے کہ:

۱- سن ۹ھ میں حضور ﷺ کی طرف سے یہ اعلان کرایا گیا تھا: "**ألا لا يحج بعد العام مشرك ولا يطوفن بالبيت عريان**" (ترمذی:۳۰۹۱) (سن لو! اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی کعبۃ اللہ کا برہنہ طواف کرے گا)، چنانچہ سن ۱۰ھ میں جب حضور ﷺ نے حجۃ الوداع فرمایا تو وہاں کوئی مشرک موجود نہ تھا۔

۲- دوسری دلیل یہ ہے کہ اسی آیت کے آگلے حصہ میں ہے: "**وإن خفتم عيلة فسوف يغنيكم الله من فضله**" (سورۂ توبہ:۲۸) سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حج کے لئے دخول ممنوع ہے۔

۳- آیت میں "نجس" سے مراد نجس اعتقادی ہے، چنانچہ ثقیف کا وفد حضور ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے ان کے قیام کے لئے مسجد میں سائبان لگوادیا تھا، صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! یہ نجس لوگ ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان لوگوں کی نجاست کا کچھ اثر زمین پر نہیں پڑتا ہے بلکہ ان کی نجاست کا اثر خود ان پر پڑتا ہے (بحوالہ ابحاث ہیئۃ کبار العلماء ۷/۵۳۲)۔

رہ گئی بات یہ کہ کافر اور ذمی کا استثناء کیوں کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کافر معاہد کا استثناء اس آیت کی وجہ سے ہے: "**إلا الذين عاهدتم من المشركين**" (التوبہ:۴)۔

نیز حضرت ابو الزبیر فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت جابر بن عبداللہؓ سے اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہوئے سنا: "**فلا يقربوا المسجد إلا أن يكون عبداً أو واحداً من أهل الذمة**" (احکام القرآن ۴/۲۷۹-۲۸۱)۔

۲- بلاد اسلام کی دوسری قسم حجاز مقدس یا جزیرۃ العرب ہے، اس کی حد بندی میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض کہتے ہیں کہ اس کی حد یمامہ، نجد، یمن اور مدینہ منورہ کے درمیان کا حصہ ہے، کلبی فرماتے ہیں کہ حجاز کی حد جبل طئی اور طریق عراق کے درمیان کا حصہ ہے، حربی فرماتے ہیں: تبوک بھی حجاز کا حصہ ہے (فقہ السنۃ ۳/۵۵، موسوعہ فقہیہ ۳/۱۲۶، ۱۲۷)، اب

جزیرۃ العرب کوصرف تین حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے: ایک اس کے مغربی اور جنوبی ساحلوں کے پہاڑ اوران کے ساحل ومیدان، اس میں حجاز، تہامہ، عسیر، یمن، حضرموت، شحرمرہ وطفار، اورعمان شامل ہیں۔ دوسرے جزیرۃ العرب کے مختلف صحراء وریگستان اس میں صحراء الربع الخالی، الدہناء، النفوذ اور بادیۃ الشام شامل ہیں۔ تیسرے اس کی سطح مرتفع نیز اس کے مشرق میں واقع سواحل اورمیدان، اس میں نجد (یمامہ، قصیم، جبال طئی) احساء، قطر، کویت اور بحرین شامل ہیں (جزیرۃ العرب؍ص۲۶، ۲۷)۔

ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ امام، خلیفہ یا اس کے نائب کی اجازت سے کفار اس میں داخل ہوسکتے ہیں، لیکن مدت مسافرت (تین دن) سے زیادہ قیام نہیں کرسکتے ہیں۔

امام صاحب فرماتے ہیں: ان کو قیام اور استیطان (وطن بنانے) سے منع نہیں کیا جائے گا۔

بلاد اسلام کی ان دوقسموں کے بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ ان ممالک کے دین، امن وسکون اور استقرار کے پیش نظر اور کفار کے قیام کی وجہ سے پڑوسی ممالک کو جوخطرات لاحق ہوئے ہیں ان کے پیش نظر کسی بھی غیرمسلم کو ان میں مستقل قیام اور استیطان کی ہرگز اجازت نہ دی جائے۔

۳- تیسری قسم تمام بلاد اسلام ہے، ان میں کافر عہد، ذمہ اور امان لے کر قیام کرسکتا ہے، البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک مساجد میں داخل نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ کسی مسلمان کی اجازت نہ حاصل کرلے، امام صاحبؒ کے نزدیک بغیر اجازت بھی داخل ہوسکا ہے، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک کسی بھی حال میں داخل نہیں ہوسکتا ہے چاہے اجازت ہو یا نہ ہو (فقہ السنہ ۳؍۵۵)۔

غیرمسلموں کو مسلم ملک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنے کے سلسلے میں روایات اور عمل صحابہ اور فقہاء کی عبارتوں سے جواز اور عدم جواز دونوں کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ حدیث ہے: "**أنا بریئ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین**" (ابوداؤد کتاب الجہاد رقم: ۲۶۴۵)، نیز دوسری حدیث میں ہے: "**من جامع المشرکین وسکن معه فإنه مثله**" (ابوداؤد کتاب الجہاد: ۲۷۸۷)، مراسیل ابوداؤد میں ہے: "**لا تنزلوا الذریة بإزاء العدو**" (ابوداؤد فی المراسیل، باب إنزال الذریۃ الثغور والسواحل)۔

یہ اور اس طرح کی تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ غیرمسلموں کو مسلم ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے نہ آباد کرنا چاہئے نہ خود آباد ہونا چاہئے۔

لیکن دوسری طرف جب ہم صحابہ کرام کا عمل دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ صحابہؓ کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم ملکوں میں ان کے درمیان آباد ہوئی، نیز فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر دارالکفر سے کوئی کافر دارالاسلام آئے تو امام المسلمین اسے اپنی صوابدید پر زیادہ سے زیادہ ایک سال کی مہلت دے سکتا ہے، اگر وہ اس سے زیادہ رہ گیا تو اب وہ اپنے وطن نہیں جا سکتا بلکہ وہ اسی ملک کا شہری شمار ہوگا، چنانچہ صاحب ہدایہ تحریر کرتے ہیں:

"وإذا دخل الحربي إلينا مستأمنا لم يمكّن أن يقيم فی دارنا سنة، ويقول له الإمام: إن أقمت تمام السنة وضعت عليک الجزية وإذا أقامها بعد مقال الإمام يصير ذمياً، ثم لا يترک أن يرجع إلى دار الحرب"(ہدایہ ۲/۵۸۶)۔

نیز قرآن پاک میں ہے: **"وإن أحد من المشركين استجارک فأجره حتى يسمع كلام الله"**(سورۂ توبہ:۶)، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کو قیام کی اجازت ہونی چاہئے تا کہ وہ محاسن اسلام سے واقف ہو سکے۔

نیز حضور ﷺ نے فرمایا: **"المؤمن الذي يخالط الناس ويصبر على أذاهم خير من الذي لم يخالط الناس ولم يصبر على أذاهم"** (ترمذی رقم:۲۵۰، ابن ماجہ رقم:۴۰۳۲)۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے درمیان اقامت کی اجازت دینا یا خود ان کے درمیان سکونت اختیار کرنا جائز ہے۔

دلائل پر غور کرنے کے بعد راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ جواز اور عدم جواز کا نہیں بلکہ اولی اور غیر اولی کا ہے، اولی اور بہتر یہ ہے کہ مسلمان اپنی آبادیاں الگ قائم کریں، کالونیاں الگ بنائیں، لیکن اگر ان کے درمیان رہنے یا ان کو اپنے درمیان رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو اس انداز سے رہیں کہ ان کے محلے الگ اور مسلمانوں کے محلے الگ ہوں، اور اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو تو غالب اکثریت والے مسلمانوں کے علاقہ میں رہائش اختیار کریں۔

خلاصہ یہ کہ اگر ضرورت ہو تو غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا جائز ہوگا، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

"قال القرطبی: فيه (أخرجوا المشركين من جزيرة العرب) أن على الامام إخراج كل من دان بغير دين الإسلام من كل بلد غلب عليها المسلمون عنوة إذا لم يكن بالمسلمين ضرورة إليهم كعمل الأرض ونحو ذلک وعلى ذلک أقر عمرؓ من أقر بالسواد والشام"(فتح الباری ۶/۴۰۸)۔

البتہ اس امر کا خیال ضرور رہے کہ وہ تعداد کے اعتبار سے مغلوب اور مسلمان غالب ہی رہیں، واللہ اعلم۔

☆ ☆ ☆

عرض مسئلہ:

مسئلہ شہریت پر علماء کی آراء- تنقیح وتجزیہ

مولانا اختر امام عادل قاسمی☆

کسی ملک میں انسان کی شہریت کا مسئلہ ایک جدید اور حساس مسئلہ ہے،اس موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی کے جاری کردہ سوالنامہ پر ۲۹ علماء اور اصحاب افتاء نے اپنے جوابات ارسال فرمائے،جن کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں:

۱-مولانا زبیر احمد قاسمی (سیتامڑھی بہار)، ۲-مفتی حبیب اللہ قاسمی (مہذب پور اعظم گڈھ)، ۳-مفتی عبداللہ کاوی والا (کنتھاریہ گجرات) ۴-مولانا نثار احمد حصیر القاسمی (حیدرآباد) ۵-مولانا احمد نور عینی القاسمی (متعلم المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد) ۶-قاضی محمد حسن ندوی (بھروچ) ۷-مولانا محمد توقیر بدر القاسمی (پھلواری شریف پٹنہ) ۸-مولانا عبید اللہ ندوی (بھروچ گجرات) ۹-ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی (دارالعلوم مئو) ۱۰- مولانا ریحان مبشر قاسمی (اجراڑہ میرٹھ) ۱۱-مولانا محمد قمر الزماں ندوی (پرتاپ گڈھ) ۱۲-مولانا رحمت اللہ ندوی (دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) ۱۳-مفتی سعید اسعد قاسمی (بردوان) ۱۴-مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی (پھلواری شریف پٹنہ) ۱۵- حافظ کلیم اللہ عمری (عمرآباد) ۱۶- مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی (کیرالا) ۱۷-مفتی محمد شاہجہاں ندوی (کیرالا) ۱۸-مفتی فخر عالم نعمانی (منوروا شریف سمستی پور بہار) ۱۹-مولانا جعفر ملی صاحب (اکل کوا مہاراشٹر) ۲۰-مولانا خورشید انور اعظمی (بنارس) ۲۱-مفتی محمد سلمان منصور پوری (شاہی مرادآباد) ۲۲-دکتور رشید کھوس جامعہ قرویین (عربی مقالہ) ۲۳-مولانا اشرف عباس (دارالعلوم دیوبند) ۲۴-مولانا خورشید احمد اعظمی (مئو) ۲۵-مولانا محمد اقبال ٹنکاروی (ماٹلی والا بھروچ) ۲۶-مفتی محمد ابوبکر قاسمی (برہم پور دربھنگہ) ۲۷-مولانا ابوسفیان مفتاحی (مفتاح العلوم مئو) ۲۸-مولانا مصطفیٰ قاسمی (شکرپور بھروارہ دربھنگہ) ۲۹-اور حقیر راقم الحروف اختر امام عادل قاسمی۔

ان کے علاوہ تین اور مقالے عربی زبان میں آئے ہیں،جو موضوع سے متعلق ہیں،مگر سوالنامہ کی ترتیب پر نہیں

☆ مہتمم جامعہ ربانی منوروا شریف۔

ہیں اور نہ ان میں سوالنامہ کے تمام اجزاء سے تعرض کیا گیا ہے، مثلاً:

۱- ڈاکٹر علی محی الدین القرۃ داغی (دوحہ) کا مقالہ "**المواطنة فی الاسلام وحقوق المواطنین غیر المسلمین فی ظلہ**" (صفحات ۴۴) شہریت کے موضوع پر علمی وتحقیقی مقالہ ہے، نیز اس میں غیر مسلم شہریوں کے حقوق پر بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے، لیکن سوالنامہ کے کئی اجزاء کا جواب اس میں موجود نہیں ہے، مثلاً مسلم ملکوں میں کسی بیرونی مسلمان کو شہریت دینے کے اصول کیا ہیں؟ اس ضمن میں حکومت کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ شہریوں کے حقوق کی تفصیلات؟ پناہ گزینوں کے حقوق؟ قدیم اور جدید شہریوں کے حقوق میں فرق کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ کسی مسلمان کے لئے غیر مسلم ملک میں قیام یا شہریت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟...... وغیرہ اس طرح کے کئی سوالات کے جوابات اس مقالہ میں موجود نہیں ہیں، ......شہریت کی بنیادوں سے بھی کوئی خاص بحث نہیں کی گئی ہے،...... ایسا لگتا ہے کہ مرتب کے پیش نظر فقہ اکیڈمی کا سوالنامہ نہیں ہے، بلکہ غالباً یہ پہلے کی تحریر ہے، اسی لئے ہمارے بعض مقالہ نگاروں کے یہاں بھی اس کا حوالہ موجود ہے۔

۲- ڈاکٹر حسن السید خطاب (مصر) کا مقالہ "**حقوق المواطنة وواجباتها فی ضوء الکتاب والسنة**" (صفحات ۲۷) بھی بہت معلوماتی ہے اور اس میں شہریت کے مفہوم وماخذ اور اس سے وابستہ حقوق وواجبات پر کافی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور بہت سے اہم علمی نکات کی اس میں نشاندہی کی گئی ہے، مگر ہمارے سوالنامہ کے کئی پہلو اس میں بھی تشنۂ جواب ہیں، مثلاً: شہریوں کے مابین حقوق کے امتیازات کا مسئلہ، امیدوار مسلمانوں کی درخواستوں پر حکومت کی ذمہ داریاں، پناہ گزینوں کے حقوق، غیر مسلم ملکوں کی شہریت کا حکم وغیرہ کئی اہم پہلوؤں سے اس مقالہ میں کوئی تعرض نہیں کیا گیا ہے۔

۳- ڈاکٹر ولید خالد الربیع (کویت) کا مقالہ "**حق اللجوء السیاسی فی الفقه الاسلامی والقانون الدولی**" (صفحات ۵۶) پناہ گزینوں کے حقوق واحکام پر محققانہ تفصیلی مقالہ ہے، جس میں اسلامی قانون اور بین الاقوامی قانون کا بہترین علمی موازنہ پیش کیا گیا ہے، لیکن سوالنامہ کے دوسرے اجزاء کے بارے میں یہ مقالہ کلیتاً خاموش ہے۔

اس لئے یہ تینوں مقالات اپنی انفرادی علمی اہمیت کے باوجود ہمارے عرض میں شامل نہیں ہیں۔

شہریت سے متعلق چار اہم مباحث (یعنی سوال نمبر ۱ تا ۴) میرے عرض کا موضوع ہیں:

(۱) کسی بھی ملک میں شہریت کی شرعی بنیادیں کیا ہیں؟ جن کے پیش نظر حکومت اسلامی کسی کی شہریت کا فیصلہ کرے، یا کوئی امیدوار ان کو بنیاد بنا کر اپنی شہریت کی درخواست پیش کرے۔

(۲) امیدوار مسلمانوں کی درخواست شہریت کے تعلق سے حکومت اسلامی کی شرعی ذمہ داری کیا ہے؟

(۳) مسلم ملکوں میں پناہ گزیں افراد کے حقوق اور قدیم شہریوں سے ان کے امتیاز کا معاملہ۔

(۴) حقوق شہریت - اسلامی نقطۂ نظر سے۔

۱-شہریت-مفہوم،حکم شرعی اور بنیادیں

سوالنامہ میں شہریت کے مفہوم اور اس کے حکم شرعی پر کوئی سوال نہیں اٹھایا گیا ہے،لیکن ظاہر ہے کہ مسئلہ کی تحقیق وتطبیق ان پر موقوف ہے،شی ءکی حقیقت معلوم نہ ہو یا معلوم ہو،لیکن ہم اس کو جائز تصور نہ کریں تو اس کے اسباب وعوامل کی بھی ضرورت نہ ہوگی،اس لئے شہریت کی بنیادوں پر گفتگو سے پہلے بالترتیب شہریت کی حقیقت اور اس کے حکم شرعی پر بھی تھوڑی روشنی ڈالنی ضروری ہے:

شہریت کا مفہوم:

اکثر مقالہ نگاروں نے اپنے مفہوم ذہنی سے کام لیا ہے اور شہریت کے مفہوم اور اس کی حقیقت سے کوئی تعرض نہیں کیا ہے،البتہ بعض حضرات نے اس جانب توجہ دی ہے اور اس نئی اصطلاح کا مطلب واضح کیا ہے،ان کے اسماء گرامی ہیں:

۱-مولانا نثار احمد حصیر القاسمی ۲-مولانا احمد نور عینی قاسمی ۳- قاضی محمد حسن ندوی ۴-مفتی ثناء الہدیٰ قاسمی ۵-مفتی فخر عالم نعمانی ۶-مولانا خورشید احمد اعظمی ۷-مولانا محمد اقبال ٹنکاروی ۸-اور حقیر راقم الحروف اختر امام عادل قاسمی،

تعبیرات کے معمولی فرق کے ساتھ تقریباً ان سبھی حضرات نے شہریت کی یہ تعریف کی ہے:

''شہریت موجودہ اصطلاح میں فرد اور حکومت کے درمیان اس مخصوص سیاسی اور قانونی رابطہ کا نام ہے جس کی بنیاد پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے بعض تقاضوں اور واجبات کی تعمیل کرنی پڑتی ہے،یہ وہ قانونی رشتہ ہے جس کی بنیاد پر ایک فرد کا وجود اور تشخص اس ریاست کی طرف منسوب ہوجاتا ہے جہاں کا وہ شہری ہے،مثلاً ہندوستانی،امریکی وغیرہ(اختر امام عادل قاسمی)

بعض لوگوں نے اسی کو کسی ملک میں قانونی طور پر مستقل رہنے کے حق سے تعبیر کیا ہے(مولانا ثناء الہدیٰ قاسمی ،قاضی محمد حسن ندوی،مولانا احمد نور عینی قاسمی)

بعض حضرات نے شہریت کی قسموں پر بھی روشنی ڈالی ہے،: ۱- پیدائشی یا غیر اختیاری شہریت،جو کسی سرزمین پر ولادت کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے ۲-اختیاری شہریت،جو سعی وارادہ سے حاصل کی جائے،مثلاً اس ملک کے متوطن سے شادی کرکے یا حکومت کو درخواست دے کر وغیرہ(اختر امام عادل قاسمی،مولانا احمد نور عینی قاسمی،مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی،مولانا فخر عالم نعمانی)

بہرحال یہ ایک اتفاقی نکتہ ہے،جن لوگوں نے شہریت کی تعریف ذکر نہیں کی ہے ان کے ذہن میں بھی بظاہر شہریت کا یہی تصور ہے۔

مروجہ نظام شہریت کی شرعی حیثیت

شہریت کی مذکورہ بالا تعریف کے مطابق ساری دنیا میں مروج نظام شہریت کی شرعی حیثیت کیا ہے؟...... ہمارے تمام مقالہ نگار اور اصحاب افتاء نے اس کو درست مان کر گفتگو کی ہے، البتہ مولانا احمد نور عینی القاسمی صاحب نے اپنے مقالہ میں اس مسئلہ کو اٹھایا ہے، ان کے پیش نظر متعدد عرب مفکرین کی تحریریں ہیں جن میں اکثر وحدت اسلامی اور دعوت اسلامی کے علمبردار ہیں اور ان کا موضوع فقہی احکام ومسائل کی تحقیق وتحلیل سے زیادہ اسلام کے آفاقی تصورات کی توسیع وتبلیغ ہے،......

مولانا احمد نور صاحب کو سرے سے مروجہ نظام شہریت ہی سے اتفاق نہیں ہے، ان کے نزدیک یہ ایک غیر اسلامی اور باطل نظام ہے،......

قاضی محمد حسن ندوی صاحب کو بھی ان کا ہی ہم خیال کہنا چاہئے، اس لئے کہ گوانہوں نے اس نظام شہریت پر صراحت کے ساتھ کوئی سوالیہ نشان نہیں لگایا ہے اور نہ اس ضمن میں کوئی بحث کی ہے، لیکن ان کے نزدیک بھی کسی اسلامی ملک میں سکونت وشہریت کے لئے صرف مسلمان ہونا کافی ہے، باقی آج شہریت کی جو بنیادیں مانی جاتی ہیں، ولادت، بودوباش ،معاشی سرگرمیاں اور شادی بیاہ وغیرہ یہ سب مغربی فکر کی پیداوار ہیں،

مولانا احمد نور عینی صاحب نے اپنے مقالہ میں مروجہ شہریت کے عدم جواز پر کئی دلیلیں پیش کی ہیں، مثلاً:

(الف) ساری دنیا کے مسلمانوں کو خلافت واحدہ کے سایہ میں زندگی گذارنی چاہئے، حدیث میں ہے کہ دوسرا خلیفہ ہو تو اسے قتل کر ڈالو، اسی لئے فقہاء دارالحرب میں تعدد کے قائل ہیں دارالاسلام میں نہیں، دنیا کے تمام مسلمان خواہ وہ کہیں رہتے ہوں ایک ہی برادری کے افراد ہیں، ان میں سکونت وشہریت کے باب میں کوئی فرق نہیں ہے، ہمارے اسلامی ذخیرہ میں کوئی ایسی نظیر موجود نہیں ہے جو مسلمانوں کو زمینی اعتبار سے تقسیم کرتی ہو، پورے فقہی ذخیرہ میں کوئی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ دارالاسلام میں رہنے کے لئے مسلمانوں سے اسلام کے علاوہ کسی اور عقد کا مطالبہ کیا گیا ہو، کوئی بھی مسلمان ہجرت کر کے دارالاسلام میں رہائش اختیار کر سکتا تھا، البتہ غیر مسلموں سے عقد ذمہ کرایا جاتا تھا اور اس کے لئے کچھ بنیادیں بھی مقرر کی گئی تھیں،

(ب) ہجرت مدینہ کے بعد جو دستور مدینہ تیار ہوا اس میں مسلم شہری اور غیر مسلم شہری کی تقسیم تو ملتی ہے، لیکن مسلمانوں میں کوئی دوسری تقسیم نہیں ملتی، سارے مسلمانوں کے خون کی قیمت ایک رکھی گئی ہے، (**المسلمون تتکافأ دمائهم**) ان کی صلح کو صلح واحد کا درجہ دیا گیا ہے (**ان سلم المؤمنین واحدة**)

(ج) مروجہ نظام شہریت غیر اسلامی نظریات پر مبنی ہے اور اس میں ناجائز وجوہات سے مسلمانوں میں تفریق کی

گئی ہے مثلاً ملک کی حفاظت کا فریضہ دنیا کے تمام مسلمانوں پر ہے، اسی طرح مسلم قیدیوں کی رہائی کا فریضہ اور مظلوموں کی طرف سے دفاعی جنگ کی ذمہ داری تمام مسلمانوں پر ہے جبکہ مروجہ نظام شہریت یہ ذمہ داریاں صرف اس ملک کے باشندوں پر عائد کرتا ہے......اسلام کہتا ہے کہ ساری زمین اللہ کی ہے (ان ارضی واسعة) (سورۂ عنکبوت:۵۶) کہیں بھی مسلمان رہ سکتے ہیں، لیکن مروجہ شہریت اس کی اجازت نہیں دیتی، اگر کوئی مسلمان نقل مکانی کر کے دوسرے ملک چلا جائے تو مروجہ نظام اس کی شہریت کو ختم کر دیتا ہے وغیرہ۔

لیکن مسئلہ کا یہ جذباتی پہلو ہے اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو مذکورہ دلائل میں کوئی زیادہ وزن نہیں ہے، جس کی تفصیل یہ ہے کہ:

(الف) مذکورہ تمام دلائل کا تعلق اسلام کے آفاقی تصورات اور وحدت اسلامی کے نظریات سے ہے جن پر ہمارا پورا یقین ہے، مگر وہ اسلام کے حالت غلبہ کے احکام ہیں، لیکن جب مسلمان حالت غلبہ میں نہ ہوں اور روئے زمین پر کئی متوازی نظام سیاست رائج ہوں (جن کے اتحاد پر مسلمانوں کے بہت سے عالمی مسائل موقوف ہوں)، ان سے یکسر صرف نظر کر لینا زمینی حقائق وواقعات کا انکار اور یکگونہ خود فریبی کے ہم معنیٰ ہے، ایسی صورت حال میں اسلام کی وہ تعلیمات اور فقہی نظائر پیش نظر رہنی چاہئیں جو عہد مغلوبی میں امت کے لئے رہنما خطوط بن سکیں مثلاً:

☆ عہد نبوت کا وہ حصہ جس میں مسلمانوں کو سیاسی غلبہ حاصل نہیں تھا مکی دور یا قیام حبشہ کا دور ☆ یا پھر مسلمانوں کے سیاسی انتشار کے بعد جب دنیا میں متعدد مسلم مملکتیں وجود میں آ گئیں اور خلافت واحدہ کا آفاقی نظریہ خود مسلمانوں کے ہاتھوں عملاً پامال کر دیا گیا اور دوسری غیر مسلم طاقتیں روئے زمین پر ابھرنے لگیں، اس وقت کے علماء اور اصحاب رشد نے کیا طرز عمل اختیار کیا؟ اور کیسی عملی ہدایات دیں؟ آج کے دور میں ان سے روشنی حاصل کرنے کی ضرورت ہے،......عہد عباسی کے بعد بلکہ اسی دور سے مسلمانوں کی سیاسی وحدت ٹوٹنے لگی تھی اور دنیا میں ایک سے زائد مسلم حکومتیں وجود میں آ گئی تھیں، ان کے متحد کرنے کی تو کچھ کوششیں ضرور ہوئیں، لیکن کسی نے ان کو ناجائز مملکت قرار نہیں دیا۔

(ب) مقالہ نگار موصوف شہریت کی اصطلاح سے تو خائف ہیں، لیکن رجسٹریشن کا اصول تسلیم کرتے ہیں یعنی باہر سے آنے والے مسلمان اپنا رجسٹریشن کرائیں اور یہ بھی مانتے ہیں کہ اس کا مکمل اختیار حکومت کو حاصل ہے، یعنی اگر حکومت مصلحت نہ سمجھے تو رجسٹریشن سے انکار یا آئندہ کے لئے موخر کر سکتی ہے،......نتیجہ دونوں کا ایک ہے اس کو شہریت کا نام دیں یا رجسٹریشن کا، حاصل ایک ہی ہے......شہریت کے تمام اصول وضوابط یہی جاننے کے لئے ہوتے ہیں کہ امیدوار کی درخواست قبول کرنا ملک وملت کے مفاد میں ہوگا یا نہیں؟......

(ج) یہ درست ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے ہر مسلمان کو کسی بھی مسلم ملک میں رہنے کا قانونی حق ہے، لیکن ہر وہ شخص جو اپنے کو مسلمان ظاہر کرے اس کو بلا تحقیق شہریت دے دی جائے تو فساد عظیم برپا ہوگا، اسلام میں ایسی نظیریں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر مدعی اسلام امیدوار کو مملکت میں سکونت کی فوری اجازت دینا ضروری نہیں ہے، قرآن کریم میں ہے:

''**یایها الذین آمنوا إذا جاء تکم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهن الله اعلم بایمانهن فإن علمتموهن مؤمنات فلاترجعوهن إلی الکفار** ''(الممتحنۃ:۱۰)۔

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے پاس مؤمن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کا جائزہ لو، اللہ ان کے ایمان کو زیادہ جانتا ہے، اگر وہ تمہیں مؤمن معلوم ہوں تو ان کو کافروں کے پاس مت لوٹاؤ۔

ہر آنے والے کا ایمان علم الٰہی میں ہونے کے باوجود اس کے دعوائے اسلام کی تصدیق کے لئے ظاہری کارروائی کا حکم دیا گیا اور تفتیشی مراحل کی تکمیل تک مملکت میں داخلہ سے روکنے کا اختیار دیا گیا،...... جب کہ عورتوں کا معاملہ زیادہ حساس ہے اس کے باوجود تحقیقی مراحل عبور کرنے کی اجازت دی گئی،...... شہریت کے جملہ قواعد اسی تحقیق پر مبنی ہیں کہ امیدوار شخص کس حد تک اس ملک کے قانون سے اپنی وفاداری نباہ سکے گا؟ اور ملک وملت کے لئے اس کی افادیت کتنی ہوگی؟ وغیرہ......

ایک اور آیت سے اس کی تائید ہوتی ہے:

''**إن جاء کم فاسق بنبإ فتبینوا**''(سورۃ الحجرات:٦) (جب کوئی فاسق خبر لائے تو تحقیق کرلو)۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کسی دعویٰ یا درخواست کو بلا تأمل اس لئے مان لینا کہ وہ کسی مسلمان کی طرف سے پیش ہوا ہے یہ مؤمنانہ سادگی نہیں حماقت ہے۔

نیز بخاری شریف میں ایک اعرابی کا قصہ مذکور ہے جو مدینہ ہجرت کرنے کا خواہشمند تھا لیکن اس کے حالات معلوم کرنے کے بعد اس کو مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی، بلکہ سمندر پار دور دراز خطہ میں اپنے مقام پر ہی رہنے کا حکم دیا گیا'' **فاعمل من وراء البحار** (بخاری کتاب الادب باب ماجاء فی الرجل ویحک ج ۲ ص ۹۱۱)۔

اسی طرح ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ حکومت بعض مصالح کے تحت کسی شخص کی سکونت کو محدود کردے مثلاً خلیفۂ ثالث حضرت عثمان غنیؓ نے حضرت ابوذر غفاریؓ کو مدینہ سے باہر ایک پہاڑی علاقہ میں بھیج دیا تھا اور ان کے تمام تر تقدس کے باوجود ان کو مدینہ میں رہنے کی اجازت نہیں دی تھی۔

(د) یہ تصور بھی اصولی طور پر اپنی جگہ درست ہے کہ دنیا کے تمام ملی مسائل ہر مسلمان کے لئے مرکز توجہ ہیں جیسے قیدیوں کے چھڑانے کا معاملہ، مظلوموں کے دفاع کا مسئلہ، ملک کے تحفظ کا معاملہ وغیرہ،...... لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کے

عالمی مسائل کا براہ راست تعلق عام مسلمانوں سے نہیں ہے، بلکہ اولوالامر اور ارباب اقتدار سے ہے، یہی حضرات بین الاقوامی سیاسی معاملات میں عام مسلمانوں کی نمائندگی کر سکتے ہیں، ہر شخص کو اس کا پابند کرنا اور اس جدوجہد میں شرکت کا حکم دینا تکلیف مالا یطاق ہے۔

نیز ایسی بعض مثالیں موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انتظامی طور پر یہ ذمہ داریاں خطوں کے لحاظ سے تقسیم کی جاسکتی ہیں جس میں دوسرے خطہ کے لوگ شریک نہ ہوں، مثلاً:

رسول اللہ ﷺ نے مدینہ کی اسلامی ریاست تشکیل دینے کے بعد وہاں کے قبائل کی مستقل اکائیاں بنادی تھیں، اس وقت ہر قبیلہ کی الگ الگ آبادی ہوا کرتی تھی، ہر قبیلہ اپنی آبادی کا ذمہ دار ہوتا تھا، اور دیت ادا کرنا اور قیدیوں کو چھڑانا وغیرہ ہر محلّہ کی مستقل اپنی ذمہ داری ہوتی تھی اور اس ذمہ داری کی ادائیگی میں عموماً دوسرے قبیلہ (محلّہ) کے لوگ شریک نہیں ہوتے تھے (السیرة النبویة لعبد الملک بن هشام ج ۲ ص ۳۶۸ تا ۳۷۰)۔

تعزیرات اسلامی میں اس کی ایک مثال قسامۃ آج بھی موجود ہے، جو صرف ایک مخصوص آبادی پر عائد ہوتی ہے،

اسی طرح یہ خیال بھی کلیتاً درست نہیں کہ مسلمان دار الاسلام میں رہ کر ہی ملک کے دفاع کا کام انجام دے سکتے ہیں، حضرت عباسؓ نے حضور ﷺ کے حکم پر مکہ میں رہ کر اسلام اور مملکت اسلامیہ کی جو بے نظیر خدمت انجام دی، وہ اسلام کی سیاسی تاریخ کا روشن باب ہے، نیز اس باب میں اسلام کے بین الاقوامی معاملات کے اس جزئیہ سے بھی روشنی ملتی ہے کہ اسلامی سیاست کے کسی دور میں اگر دوبارہ حدیبیہ جیسے حالات پیدا ہوجائیں اور کفار مسلمانوں سے مغلوبانہ شرطوں کے لئے اصرار کریں اور مسلمان مجبور ہوکر یا کسی سیاسی مصلحت کی بنا پر اس طرح کا یک طرفہ معاہدہ کرلیں کہ اسلامی مملکت کسی مسلمان کو اپنے حدود میں ان کی مرضی کے بغیر سکونت یا شہریت نہیں دے گی جو دار الکفر سے وہاں جانا چاہتے ہوں، ......تو کیا اس طرح کے معاہدہ کی گنجائش ہوگی؟ اور کیا یہ قابل عمل ہوگا؟، ...... مالکیہ اور حنابلہ مطلقاً اور شافعیہ دین وایمان اور جان ومال کے تحفظ کی قید کے ساتھ اس معاہدہ کو درست اور قابل عمل قرار دیتے ہیں، گویا ان کے نزدیک صلح حدیبیہ کا معاملہ وقتی نہیں تھا اور وہ سنت قائمہ ہے منسوخ نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی حالت مغلوبی کے ساتھ خاص ہے اور جب بھی مسلمان ان حالات سے دوچار ہونگے ان کو حدیبیہ کے فارمولہ پر عمل کرنے کی گنجائش ہوگی (حاشیۃ الدسوقی ج ۲ ص ۲۰۶، ۲۰۷، الخرشی ج ۳ ص ۱۵۱، کشاف القناع للبہوتیؒ ج ۳ ص ۱۱۴، المغنی لابن قدامۃؒ ج ۱۰ ص ۵۱۷، نہایۃ المحتاج للرملیؒ ج ۸ ص ۱۱۰، مغنی المحتاج للشربینیؒ ج ۴ ص ۲۶۴)۔

حنفیہ اس معاہدہ کو باطل قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک صلح حدیبیہ کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، اب مسلمانوں کو ذلت ومغلوبیت کے ساتھ یک طرفہ معاہدہ کی اجازت نہیں ہے، اللہ نے اسلام کو سربلندی عطا کی ہے، اس لئے کسی مسلم حکمراں کو یہ اجازت نہ ہوگی کہ وہ ذلت آمیز شرطوں پر معاہدہ کرے (فتاویٰ ہندیۃ ج ۲ ص ۱۹۷ ط دار الفکر بیروت لبنان، وشرح السیر الکبیر ج ۵ ص ۴۱)

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ذلت ومغلوبیت کے بغیر شہریت وسکونت کے تعلق سے کوئی بین الاقوامی قرارداد پاس ہو جس کی پابندی ہر ملک کے لئے مساوی طور پر ضروری ہو تو اس صورت میں حنفیہ کے اصول کا بھی تقاضا ہونا چاہئے کہ شہریت کی عالمی قرارداد منظور کی جائے اور کسی بھی ملک سے آنے والے امیدوار کے معاملے میں اس کی رعایت کی جائے، ورنہ ملک کی سالمیت ووقار پر سوالیہ نشان لگ سکتا ہے، راقم الحروف نے اپنے مقالہ میں اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

(ح) یہ درست ہے کہ شہریت عصر حاضر کی نئی اصطلاح ہے، لیکن یہ خیال درست نہیں کہ اس کی جڑیں ہماری قدیم اصطلاحات میں موجود نہیں ہیں، بڑی حد تک یہ اصطلاح وطنیت سے قریب ہے، شہریت کے ضمن میں جن حقوق وواجبات کا ذکر کیا جاتا ہے اگر آپ جائزہ لیں تو وہ سب آپ کو کسی نہ کسی عنوان سے حدیث وسیر اور فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گے، وطن سے محبت ووفاداری، اس کے لئے جان ومال کی قربانی، وطن کی نسبت پر عزت وافتخار، وطن میں ہر طرح کی آزادی وغیرہ کا تصور پہلے سے موجود ہے، خود میثاق مدینہ نے پہلی بار وطن کی بنیاد پر ایک نئی امت اور نئی قوم کا جو تصور دیا تھا اور حقوق و واجبات کی جو تفصیلات فراہم کی تھیں آج کی وطنیت اسی کی نقل محسوس ہوتی ہے، دکتور رشید کہوس نے اپنے مقالہ میں اس پر اچھی بحث کی ہے.....فرق صرف نئی عنوان بندی کا ہے..... نیز پہلے یہ ایک شخص کا انفرادی جذبہ وعمل مانا جاتا تھا، اب اس میں حکومت بھی شریک ہوگئی ہے اور اس کو ایک معاہدہ کی شکل دے دی گئی ہے،......

اس فرق کی وجہ عرف وعادات کا تغیر ہے، پہلے بہت سے ان عرفی حقوق وواجبات کا تصور نہیں تھا جو آج حکومت کی طرف سے فرد کو حاصل ہوتے ہیں اس لئے کسی کی وطنیت کی اطلاع حکومت کو دینی ضروری نہیں ہوتی تھی، لیکن آج بہت سے حقوق اسی وقت حاصل ہو سکتے ہیں جب کہ حکومت کے پاس آنے جانے والوں کی تفصیلات موجود ہوں، شہریت کی ضابطہ بندی کا بڑا مقصد یہی ہے، اس کی مثال عہد فاروقی میں مردم شماری کا نظام ہے، عہد نبوت اور عہد صدیقی میں ریاست کے عام شہریوں کے لئے وظائف کا انتظام نہیں تھا، اس لئے نہ مردم شماری کی ضرورت تھی اور نہ دفتری ریکارڈ کی، عہد فاروقی میں بیت المال سے وظائف کا سلسلہ شروع ہوا، اس لئے پوری مملکت کا سروے کیا گیا اور تمام شہریوں کی تفصیلات دفتر میں محفوظ کی گئیں، اس کے بغیر حکومت کی جانب سے ملنے والی سہولیات ملک کے شہریوں تک پہونچ نہیں سکتی تھیں،......تو نظم وضبط کے نقطۂ نظر سے اس طرح کی قانون سازی کی گنجائش ہے۔

(و) اسی طرح یہ خیال بھی درست نہیں کہ مروجہ نظام شہریت میں جن اسباب سے شہریت ختم کردی جاتی ہے وہ سراسر ظلم اور غیر اسلامی ہے،......اسلئے کہ یہ محض اندرونی انتظام ہے، یعنی حکومت سے حاصل ہونے والے حقوق کے موانع کیا ہیں؟ اس ضمن میں ان کی تفصیلات درج ہوتی ہیں اور موانع حقوق کا نظام شریعت میں پہلے سے موجود ہے، مثلاً میراث میں

فلاں فلاں چیزیں مانع ارث ہیں،...... کسی کا شوہر لاپتہ ہوجائے تو اس کو نکاح کی اجازت کب ہوگی؟ وغیرہ

علاوہ ازیں وطنیت کے خاتمہ کا تصور بھی نیا نہیں بہت قدیم ہے، ہماری تمام کتابوں میں یہ بحث آئی ہے کہ وطن اصلی کس صورت میں باطل ہوتا ہے؟ اور وطن اقامت کس صورت میں؟

مذکورہ بالا وجوہات کے پیش نظر مروجہ شہریت کے عدم جواز والی بات صحیح معلوم نہیں ہوتی اور جمہور علماء کا موقف جواز ہی درست نظر آتا ہے۔

شہریت کی بنیادیں

۳- اب بنائے شہریت کے مسئلہ پر آیئے، گو یہ مسئلہ جدید ہے اور پچھلے ادوار میں عام مسلمانوں کی شہریت کے لئے اس طرح کا کوئی باقاعدہ نظام موجود نہ تھا، لیکن اگر اس کے لئے کوئی نظام بنایا جائے تو اس کی بنیادیں کیا ہونگی؟......، واضح رہے کہ یہ اصلاً انتظامی اور سیاسی معاملہ ہے، لیکن اگر حکومت کی طرف سے کچھ انتظامی قواعد مقرر ہوتے ہیں تو ان کی پاسداری اور اس معاملہ میں حکومت کی اطاعت یقیناً عین دین ہے،

اس مسئلہ پر قاضی محمد حسن ندوی اور مولانا احمد نور عینی کی رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ ہجرت کر کے دارالاسلام چلا جائے اور وہاں رجسٹریشن کرالے، البتہ غیر مسلموں کے لئے مولانا احمد نور نے عقد ذمہ کو بنیاد قرار دیا ہے۔

انکے علاوہ باقی تمام مقالہ نگار علماء جو مروجہ نظام شہریت کو درست مانتے ہیں ان میں سے چند حضرات (مولانا زبیر احمد قاسمی، مفتی ابوبکر قاسمی، مولانا ابوسفیان مفتاحی اور مولانا نثار احمد حصیر القاسمی) نے اس سلسلے میں کوئی جواب نہیں دیا ہے، مفتی محمد سلمان منصور پوری صاحب نے بھی اس کو حکومت پر محول کیا ہے، جبکہ مفتی حبیب اللہ صاحب اور حافظ کلیم اللہ عمری صاحب نے اس کی ضرورت نہیں سمجھی ہے ان کے نزدیک ہر ملک کا اپنا جو قانون ہے وہی معتبر ہے، اسلام کے نام پر اس میں مداخلت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

باقی اکثر حضرات نے ایک یا چند بنیادوں کا تذکرہ کیا ہے، بعض کو ان میں جزوی اختلاف بھی ہے، البتہ یہ احساس تقریباً قدر مشترک ہے کہ ہر ملک اپنے مصالح کے تحت شہریت کی قانون سازی میں بنیادوں کے تعین کا خود اختیار رکھتا ہے، بشرطیکہ وہ شریعت کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو، سوالنامہ میں جن بنیادوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، اگر وہ حکومتوں کے یہاں معمول بہ ہیں تو ان کو شہریت کی اساس قرار دینے میں مضائقہ نہیں،...... مثلاً:

☆ ولادت: یعنی وہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو، یہ غیر اختیاری شہریت کی صورت ہے، سوالنامہ میں اس کا ذکر نہیں ہے، لیکن یہ شہریت کی سب مضبوط قسم ہے۔

☆ نکاح: یعنی وہاں کے متوطن سے رشتۂ زوجیت قائم کرلے۔

☆مستقل بود و باش کا ارادہ ہوخواہ ملازمت اور ذریعۂ معاش کے سلسلے میں یا کسی اور وجہ سے۔

فقہاء کے یہاں ان تینوں چیزوں کا تذکرہ آیا ہے اور انہوں نے ان کو فی الجملہ وطنیت کی اساس قرار دیا ہے، حوالہ کے لئے دیکھئے (المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی ج ۲ ص ۳۵، ۳۶، بدائع الصنائع للکاسانیؒ ج ۱ ص ۳۱۶، المبسوط ج ۱۰ ص ۸۴ کتاب السیر باب فی توظیف الخراج، فقہ مالکی میں: شرح مختصر خلیل للخرشیؒ ج ۵ ص ۸۸، مواہب الجلیل لشرح مختصر خلیل للحطابؒ ج ۲ ص ۵۰۰)۔

مفتی ثناء الہدیٰ صاحب مستقل بود و باش کو شہریت کی بنیاد نہیں مانتے، انہوں نے اس کا ماخذ تحریر نہیں کیا ہے، البتہ اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ مغربی ممالک میں اس کا تعامل نہیں ہے،......مگر اس دلیل کی معقولیت کے علاوہ واقعیت بھی تصدیق طلب ہے۔

☆مخصوص مدت تک قیام: فقہاء نے اس کو فی الجملہ شہریت کی اساس مانا ہے، البتہ اس مدت کی حد کیا ہوگی؟ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے، اکثر علماء نے اس کی مدت ایک سال بیان کی ہے، اس کا مأخذ مستامن کے بارے فقہاء کا یہ قول ہے کہ اگر وہ ایک سال قیام کرلے تو وہ ذمی (یعنی غیر مسلم شہری) ہوجائے گا اور اگر وہ اہل وعیال کے ساتھ مقیم ہے تو اس کی پوری فیملی وہاں کی شہری قرار پائے گی (دیکھئے: البدائع للکاسانیؒ ج ۷ ص ۱۱۰، الاحکام السلطانیۃ للماوردیؒ ص ۱۴۶، المبسوط للسرخسیؒ ج ۱۰ ص ۸۴، السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۸۶۵، ابن عابدین ج ۳ ص ۲۴۶، المہذب للشیرازیؒ ج ۲ ص ۲۵۱ وغیرہ)

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی کی رائے یہ ہے کہ چار سال یا اس سے زائد کی مدت مقرر ہونی چاہئے، اس لئے کہ محدثین ایسے شخص کو کسی مقام کی طرف منسوب کرتے ہیں جو کم از کم چار سال وہاں مقیم رہا ہو (تیسیر مصطلح الحدیث باب ۲۰ ص ۲۳۳)۔

جبکہ ان کے برعکس ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب صرف دو ہفتہ کا قیام کافی قرار دیتے ہیں، انہوں نے اس کا کوئی ماخذ نہیں لکھا، ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کی کتاب ''النظریۃ العامۃ للشریعۃ الاسلامیۃ'' کا حوالہ دیا ہے،......لیکن فقہاء نے جہاں اس مسئلہ کو بیان کیا ہے وہاں اس کی وضاحت ہے کہ قیام طویل ہونا چاہئے، دو ہفتہ کا قیام تو بہت مختصر ہے۔

میرے خیال سے مدت قیام کے تعین کا مسئلہ ہر ملک کے اپنے حالات ومصالح کے لحاظ سے مختلف ہوسکتا ہے، اس لئے اس کو حکومتوں کی صوابدید پر چھوڑ دینا چاہئے۔

☆زمین کی خرید: یعنی کوئی شخص کسی ملک میں جا کر زمین خرید لے،......فقہاء نے مستامن کے ضمن میں یہ بات لکھی ہے کہ زمین خریدنے سے وہ ذمی ہوجائے گا (حوالۂ بالا)۔

☆کوئی مضبوط ذریعۂ معاش اختیار کرنا: بعض حضرات نے اس کا ذکر کیا ہے (مولانا رحمت اللہ ندوی) فقہاء کے یہاں گو صراحت کے ساتھ اس کا ذکر نہیں آیا ہے، لیکن دلالۃً یہ خریداری زمین کے ضمن میں آتا ہے، اس لئے کہ تجارت بھی زراعت کی طرح منفعت بخش ہے، جس سے تاجر اور حکومت دونوں کا نفع وابستہ ہے، البتہ چلتی پھرتی تجارت معتبر نہ ہوگی،

بلکہ زمین کی طرح اس کی بنیادیں مضبوط ہوں۔

☆ اسی ضمن میں سرکاری ملازمت کے حصول کو بھی سبب مانا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اس میں مالی نفع کے ساتھ ملک کی جانی خدمت بھی ہے۔

مولانا ریحان مبشر، مولانا جعفر ملی، مولانا خورشید انور اعظمی، مولانا خورشید احمد اعظمی آخر الذکر چاروں بنیادوں (مخصوص مدت تک قیام، زمین کی خرید، تجارت، اور ملازمت) کو شہریت کے باب میں مؤثر نہیں مانتے، ان کا خیال یہ ہے کہ آج کے تیز رفتار دور میں تجارت وملازمت کہیں سے بھی کی جاسکتی ہے (مولانا جعفر ملی)، نیز وطن اصلی کے ضمن میں فقہاء نے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے (مولانا خورشید احمد)......لیکن ظاہر ہے کہ فقہاء نے دوسرے مقام پر ان چیزوں کا ذکر کیا ہے، جبکہ سرحدوں کی پابندی نہ ہونے کی وجہ سے پہلے زمانہ میں بھی لوگ مختلف ملکوں میں تجارتیں کیا کرتے تھے۔

میرے خیال میں فقہاء نے مذکورہ جن چیزوں کا ذکر کیا ہے، وہ حصر کے لئے نہیں ہے، بلکہ یہ اس دور کی چند معروف صورتوں کا تذکرہ ہے، کیونکہ یہ چیزیں منصوص نہیں ہیں، بلکہ اجتہادی ہیں، جن میں عرف وعادت اور مشاہدہ وتجربہ کا دخل ہوتا ہے، اس لئے اگر کسی ملک کی انتظامیہ شہریت کے لئے کچھ نئی بنیادیں وضع کرے، یا مذکورہ چیزوں میں ترمیم کرے یا کچھ شرطوں کا اضافہ کرے تو اس کی گنجائش ہوگی، بشرطیکہ اس کا مقصد ملک وملت کی سلامتی اور مسلمانوں کا تحفظ ہو، اس لئے کہ عرف وعادت میں تغیر ممکن ہے، ملکی قانون میں تبدیلی تغیر عرف کی علامت قرار دی جائے گی۔

نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ شریعت کے کسی حکم سے متصادم نہ ہو مثلاً کئی ملکوں میں تبنیت (یعنی کسی اجنبی شخص کو اپنی جائز اولاد قرار دینے) کو بھی شہریت کی اساس مانا جاتا ہے، (اصول سیاسیات، ڈاکٹر ہاشم قدوائی ص ۱۳۵) مگر ظاہر ہے کہ یہ اسلام کے حکم صریح کے خلاف ہے، اس لئے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاسکتی۔

مفتی محمد شاہجہاں ندوی صاحب نے شہریت کی بنیادوں میں سب سے پہلے ایمان کا تذکرہ کیا ہے،......حالانکہ غیر مسلموں کو بھی دارالاسلام (جزیرۃ العرب کا استثنا کرکے) کی شہریت دی جاسکتی ہے۔

۲- شہریت کے امیدوار مسلمانوں کے لئے اسلامی ریاست کی ذمہ داری:

سوالنامہ کا دوسرا اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ کسی مسلم یا غیر مسلم ملک کا رہنے والا مسلمان کسی اسلامی ملک میں شہریت کا خواہشمند ہو تو اس اسلامی ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا ضروری ہوگا یا نہیں؟

اکثر حضرات نے حالات کی قید کے ساتھ جواب تحریر کیا ہے، البتہ مفتی حبیب اللہ صاحب، حافظ کلیم اللہ عمری صاحب، مولانا جعفر ملی صاحب، مفتی سلمان منصور پوری صاحب نے علی الاطلاق یہ جواب دیا ہے کہ شہریت کی درخواست

قبول کرنا اسلامی ملک پر ضروری نہیں ہے، ہر ملک کا اپنا نظام قانون ہے، اس کے مطابق وہ جو چاہے فیصلہ کرنے کا مجاز ہے ......مولانا جعفر ملی صاحب نے وضاحت کی ہے کہ اخلاقاً ضروری ہے بشرطیکہ آدمی اچھا ہو،

ان کے بالمقابل ڈاکٹر رشید کھوس، مولانا مصطفیٰ قاسمی اور مولانا ابوسفیان مفتاحی سکونت و پناہ کی ہر اس درخواست کی تعمیل ضروری قرار دیتے ہیں جو کسی مسلمان کی طرف سے آئی ہو، ان کا مطمح نظر یہ ہے کہ اسلام کی نسبت پر کوئی بھی مسلمان کسی بھی مسلم ملک میں منتقل ہونے کا حق رکھتا ہے۔......اس پر گفتگو گذر چکی ہے۔

مولانا رحمت اللہ ندوی صاحب کا جواب واضح نہیں ہے۔

ان کے علاوہ تمام حضرات کی رائے یہ ہے کہ اگر اس ملک میں جہاں کا وہ باشی ہے اس کے لئے حالات انتہائی سنگین ہوں اور اس کے دین وایمان، جان ومال اور عزت وآبرو کو سخت خطرہ درپیش ہو......تو اسلامی ریاست پر اس کی درخواست کو قبول کرنا لازم ہوگا، بشرطیکہ اس ملک کے اپنے اجتماعی مصالح متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو۔

اس حکم کا ماخذ وہ آیات واحادیث ہیں جن میں ہجرت کی تاکید اور غیر اسلامی ماحول میں قیام وسکونت کی ناپسندیدگی وارد ہوئی ہے،......

اسی طرح وہ آیات وروایات بھی جن میں مسلمانوں کو عموماً اور مسلم قیادتوں کو خصوصاً مخاطب کر کے اپنے مظلوم ومجبور بھائیوں کی نصرت ومدد کی تلقین سنائی گئی ہے......

نیز سواد مسلمین کی کثرت، اسلامی ماحول کی قوت اور غیر اسلامی معاشرہ سے حتی الامکان اجتناب کی تلقین کرنے والے نصوص بھی اس باب میں خاص اہمیت رکھتے ہیں، کئی حضرات نے اس طرح کی کئی چیزوں کو پیش کیا ہے، احقر کے مقالہ میں بھی اس سلسلے کی تفصیلات موجود ہیں،

☆البتہ اگر کسی ملک کے قانونی نظام میں اس کی گنجائش نہ ہو مثلاً اس ملک سے کوئی خاص معاہدہ ہو یا امیدواروں کی تعداد اتنی زیادہ ہو جس کا تحمل اس کے اقتصادی نظام میں نہ ہو تو ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ شہریت کی درخواست قبول کرنے کو واجب نہیں کہا جا سکتا، قانونی گنجائش والی بات اکثر لوگوں نے نہیں لکھی ہے، لیکن ملکوں کے معاہدات کے تعلق سے فقہاء نے جو بحثیں کی ہیں ان کی روشنی میں اس پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے اور ایسے حالات میں شہریت کے لزوم کی بات بہر حال مشکل ہوگی،......مفتی محمد سلمان منصور پوری، مولانا خورشید انور اعظمی اور مولانا اشرف عباس قاسمی نے اس کا ذکر کیا ہے، اسی طرح حقیر راقم الحروف نے اپنے مقالہ میں اس پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔

مولانا شبیر احمد عثمانیؒ رقمطراز ہیں: مگر جس جماعت سے آزاد مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہے، اس کے مقابلے میں تا ایفائے عہد دار الحرب کے مسلمانوں کی امداد نہیں کی جا سکتی (حاشیہ عثمانی بر ترجمہ شیخ الہند ص ۲۴۷) (مقالہ مولانا خورشید اعظمی)۔

ابن کثیرؒ،طبریؒ اور دیگر مفسرین نے بھی اس مضمون کو بیان کیا ہے (جامع البیان للطبریؒ ج ۲۰ ص ۶۶-۷۰)

البتہ ان حالات میں بھی مدینہ اور انصار کی تاریخ پر نظر رکھتے ہوئے اور اللہ کی قوت پر بھروسہ کرتے ہوئے بہتر یہی ہوگا کہ ممکن حد تک قربانی کی تاریخ تازہ کی جائے اور جذبۂ ایثار کے ساتھ اپنے مظلوم بھائیوں کی شہریت قبول کی جائے۔

☆ جس صورت میں شہریت دینا ممکن نہ ہو اس صورت میں اسلامی ملکوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ باہر سے ان مسلمانوں کو ہر ممکن قانونی اور مالی امداد بہم پہونچائیں۔

☆ اگر درخواست دہندہ کو اپنے ملک میں ذاتی طور پر اس کے دین یا جان ومال کے معاملے میں کوئی دشواری نہ ہو، لیکن بہتر مستقبل یا اسلامی ماحول کی امید پر وہ مسلم ملک میں منتقل ہونے کا خواہشمند ہے تو اس درخواست کو قبول کرنا ضروری نہیں ہے، وہ ملک اپنے نظام کے مطابق فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا، اس لئے کہ معتبر قول کے مطابق اگر دین وایمان اور جان ومال کو خطرہ نہ ہو تو غیر اسلامی ملک میں قیام وسکونت کی اجازت ہے، بلکہ دینی اور ملی مقاصد کے تحت بہتر ہے کہ مسلمان ساری دنیا کے ملکوں میں بڑی تعداد میں موجود ہوں اور وہاں کے سیاسی، ثقافتی، معاشی اور دفاعی نظام میں مؤثر کردار ادا کریں......،عہد نبوت سے لیکر بعد کے کئی ادوار میں مسلمانوں نے غیر اسلامی علاقوں میں رہ کر اسلام اور مسلمانوں کے لئے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں، یہ سنہری تاریخ ہمیشہ نگاہوں کے سامنے رہنی چاہئے۔

۳-اسلامی مملکت میں پناہ گزینوں اور قدیم شہریوں کے مابین امتیاز کا معاملہ

سوالنامہ کا تیسرا جزو یہ ہے کہ بعض دفعہ کسی ملک کے مسلمان مجبور ہو کر کسی مسلم ملک سے سیاسی پناہ کی درخواست کرتے ہیں اور مسلم ملک اس کو سیاسی پناہ دینے پر آمادہ بھی ہوجاتے ہیں، لیکن ان کو پناہ گزیں کی حیثیت سے رکھا جاتا ہے ،انہیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، کیا اس کی شرعاً گنجائش ہوگی؟

اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:

(الف) سیاسی پناہ محدود مدت کے لئے لی جائے، یعنی اگر ان کے ملک کے حالات درست ہوگئے تو وہ لوٹ جائیں گے،......ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان کی حیثیت مہمانوں کی ہوگی، مقامی شہریوں کا درجہ انہیں حاصل نہ ہوگا، انہیں زندگی کی تمام جائز سہولیات فراہم کی جائیں گی، لیکن شہریت کے حقوق ومراعات سے محروم رہیں گے،......ہمارے اکثر مقالہ نگاروں کی رائے یہی ہے......البتہ مولانا جعفر ملی صاحب، مولانا مصطفےٰ قاسمی اور مفتی سلمان منصور پوری صاحب عارضی پناہ کی صورت میں بھی جملہ حقوق کی فراہمی ضروری قرار دیتے ہیں اور اس میں کسی فرق کو روا نہیں سمجھتے، مگر ان کی یہ بات دو وجہ سے کمزور ہے:

☆ ایک یہ کہ ان سے مستقل شہریت کا معاہدہ ہی نہیں ہوا، ایسی حالت میں امتیاز اور فرق مراتب قدرتی ہے، ......خود رسول اللہ ﷺ نے دار الہجرت مدینہ منورہ کی اصل آبادی اور وقتی مقاصد کے تحت باہر سے آنے والوں کے درمیان امتیاز قائم فرمایا تھا: ''**إنهم يكونون كأعراب المسلمين ......ولايكون لهم في الغنيمة والفيء شيء**'' (صحیح مسلم حدیث نمبر ۴۶۱۹) ترجمہ: وہ اعرابی مسلمانوں کی طرح ہونگے......غنیمت وفیء میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔

☆ نیز اسلامی قانون کا مسلمہ اصول ہے: ''**المغنم بالمغرم في الإسلام** ''(درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج ا ص ۹۰) ترجمہ: اسلام میں نفع نقصان کے ساتھ وابستہ ہے۔

شہریوں کو حقوق ملتے ہیں تو ان سے مطالبات بھی وابستہ ہوتے ہیں۔

(ب) لیکن اگر سیاسی پناہ کا عمل وقتی نہ ہو، بلکہ مستقل طور پر اس ملک میں آباد ہوجانے کا عزم ہو اور اپنے ملک واپسی کا کوئی ارادہ نہ ہو، ایسی صورت میں حافظ کلیم اللہ عمری صاحب، مفتی حبیب اللہ صاحب اور مولانا اشرف عباس قاسمی صاحب کی رائے یہ ہے کہ امتیاز درست ہے اور مستقل شہری کا درجہ دینا ضروری نہیں ہے، صرف بہتر ہے، یہ ملک کے اپنے نظام اور عالمی حالات پر انحصار کرتا ہے۔

ان کے علاوہ بقیہ تمام مقالہ نگار حضرات امتیازی سلوک کو روا نہیں سمجھتے، بلکہ ان کو مستقل شہری کا درجہ دیا جانا ضروری قرار دیتے ہیں، قدیم وجدید میں اخلاقی فرق کا امکان تو ہے، مگر قانونی طور پر حقوق شہریت میں ان کے ساتھ امتیازی برتاؤ کرنا جائز نہیں ہے،......

میرے خیال میں یہی رائے زیادہ مضبوط اور اسلام کی روح اور مزاج سے قریب ہے، اور اس کی کئی وجوہ ہیں:

☆ اس کا مأخذ قرآن وحدیث کے وہ نصوص ہیں جن میں قدیم باشندوں اور باہر سے آنے والے مہاجرین کو باہم اولیاء قرار دیا گیا ہے، مثلاً: قرآن کریم کا یہ ارشاد اس سلسلے میں بہت واضح ہے:

''**إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئك بعضهم أولياء بعض** ''(الانفال:۷۲)۔

(جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اللہ کے لئے اپنی جانی اور مالی صلاحیتیں خرچ کیں اور وہ لوگ جنہوں نے ان کو پناہ دی اور مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور ولی ہیں)۔

☆ اسی لئے نبی کریم ﷺ نے دار الاسلام منتقل ہوجانے والے مسلمانوں کو وہاں کے مقیم مسلمانوں کے مساوی قرار دیا، اور ان کو باہم بھائی بھائی بنا دیا، اسلام میں جغرافیہ اور رنگ ونسل کوئی چیز نہیں ہے، یہ صرف باہم تعارف کے ذرائع ہیں، لیکن اصل پہچان رشتۂ ایمان ہے، اگر کوئی چیز اس کی راہ میں حائل ہوتی ہے تو اس کو فنا کرکے صرف کلمہ کو پہچان کی بنیاد

بنایا جائے گا، اور کلمہ شریک تمام لوگ بھائی بھائی قرار دیئے جائیں گے۔

☆ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''من صلیٰ صلاتنا واستقبل قبلتنا وأکل ذبیحتنا فهوالمسلم لهٗ ماللمسلم وعلیه ماعلی المسلم'' (صحیح بخاری ج۱ ص۱۵۳ حدیث نمبر ۳۸۵ ط دار ابن کثیر بیروت ۱۹۸۷ء)۔

(جو ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کا استقبال کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے، وہ مسلمان ہے اور اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور اس پر وہ تمام واجبات عائد ہونگی جو مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں)۔

☆ اس کی تائید اس مسئلۂ شرعی سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی مستامن (وقتی امان لیکر آنے والا غیر مسلم) یا ذمی (اسلامی حکومت کا غیر مسلم شہری) اسلام قبول کرلے تو باتفاق فقہاء اس کا عقد ذمہ ختم ہوجاتا ہے اور وہ تمام امتیازات بھی کالعدم ہوجاتے ہیں جو غیر مسلم ہونے کی وجہ سے بہت سی چیزوں میں پیدا ہوتے ہیں اور جملہ حقوق وواجبات میں وہ وہاں کے قدیم شہریوں کے مساوی قرار پاتا ہے (ہدایۃ مع فتح القدیر ج۵ ص ۳۰۳، جواہر الاکلیل ج۱ ص۲۶۷، مغنی المحتاج ج۴ ص۲۵۸، الاحکام السلطانیۃ لابی یعلیٰ ص ۱۴۳، ۱۴۴)۔

اس سے وحدت ایمانی کی معنویت سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور زیر بحث مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

البتہ شہریت کی تکمیل کے لئے انتظامی طور پر کچھ قواعد وضوابط بنائے جاسکتے ہیں اور اس کے لئے کچھ مدت یا مراحل بھی مقرر کئے جاسکتے ہیں......

مثلاً اس باب میں ہم مستامن کے مسئلے سے استیناس کر سکتے ہیں کہ اگر کوئی مستامن دارالاسلام میں ایک مخصوص مدت (حنفیہ کے نزدیک اس کی مدت ایک سال ہے، علیٰ اختلاف الاقوال) تک قیام کرلے، یا وہاں کے متوطن سے شادی کرلے، یا کوئی خراجی زمین خرید لے وغیرہ تو اس کو ذمی یعنی دارالاسلام کا باقاعدہ شہری قرار دیا جائے گا (البدائع للکاسانیؒ ج۷ ص ۱۱۰، الاحکام السلطانیۃ للماوردیؒ ص ۱۴۶، المبسوط للسرخسیؒ ج ۱۰ ص ۸۴، السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۸۶۵، ابن عابدینؒ ج ۳ ص ۳۴۶، المہذب للشیرازیؒ ج۲ ص۲۵۱)۔

نیز ہدایہ کی یہ عبارت: **''وللإمام أن یوقت في ذلک مادون السنة کالشهر والشهرین''** (ہدایۃ مع الفتح ج۶ ص ۲۲) ترجمہ: امام اس میں مہینہ دو مہینہ مدت کی تعیین کرسکتا ہے،

اس فقہی جزئیہ کو انتظامی مراحل کے لئے بطور رہنما اصول استعمال کیا جاسکتا ہے۔

۴-حقوق شہریت

چوتھا سوال یہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے حقوق کیا ہیں؟ سوالنامہ میں بطور مثال چند چیزوں کا ذکر کیا گیا

ہے جیسے: ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری اسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق وغیرہ۔

تمام مقالہ نگاروں نے مذکور چیزوں کو حقوق شہریت کے ضمن میں تسلیم کیا ہے، مولانا عبیداللہ ندوی نے حقوق کی تین قسمیں کی ہیں، انسانی حقوق، شہری حقوق اور سیاسی حقوق،

مولانا ریحان مبشر نے حقوق کی چار قسمیں کی ہیں: قدرتی حقوق، اخلاقی حقوق، قانونی حقوق، معاشی حقوق، پھر ہر ایک کی قسم در قسم بیان کی ہے،

مولانا زبیر احمد قاسمی نے عقد ذمہ کے ضمن میں فقہاء کے ذکر کردہ بعض حقوق کا تذکرہ کیا ہے،

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی، مولانا محبوب فروغ احمد اور مولانا شاہجہاں ندوی نے بھی بعض حقوق کی تفصیل بیان کی ہے،

مفتی حبیب اللہ صاحب نے لکھا ہے کہ ہر ملک کا آئین جو حق دے گا وہی ملے گا اس سے زیادہ نہیں،

دراصل اسلام نے حقوق وواجبات کی کوئی تفصیل مقرر نہیں کی ہے، کچھ حقوق بنیادی ہیں اور کچھ احوال وظروف اور زمان ومکان کے تغیرات سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے ان کی تفصیلات کا تعین ممکن نہیں، بس معروف کی بنیاد پر جو حقوق وواجبات ہر ملک کے اپنے عرف میں شہریت سے متعلق سمجھے جاتے ہیں، شریعت ان کی نفی نہیں کرتی، ایک روایت میں یہ الفاظ آئے ہیں:

''**لہٗ ماللمسلم وعلیه ماعلی المسلم**'' (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۵۳)۔

یعنی وہ تمام حقوق جو مسلمانوں کو ملتے ہیں وہ اس کو ملیں گے اور وہ تمام واجبات جو مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں اس پر عائد ہوںگے۔ اس مضمون کی اور بھی جو روایات آئی ہیں ان میں بھی عموماً یہی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔

اسی طرح ہجرت کے بعد نبی کریم ﷺ نے جو میثاق مدینہ تیار فرمایا اس میں بلا امتیاز مذہب وملت داخلی اور خارجی سطح پر جن حقوق وواجبات کی نشاندہی کی گئی ہے، ان سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حقوق کے باب میں کوئی خاص شکل مقرر نہیں ہے، بلکہ ان کا تعلق مختلف ملکوں کے اپنے حالات، تقاضے، اور عرف سے ہے اور اس معاملے میں ہر ملک کی انتظامیہ پوری طرح آزاد ہے کہ کس چیز کو وہ حق قرار دیتی ہے اور کس چیز کو واجبات میں شامل کرتی ہے، بس شرط یہ ہے کہ اس تعین کی بنیاد معروف پر ہو، انسانیت کی فلاح پیش نظر ہو، اسلام کی روح اور مقاصد سے ہم آہنگ ہو اور شریعت کی کسی نص سے متصادم نہ ہو واللہ اعلم بالصواب وعلمہٗ اتم واحکم

شہریت اور اس سے متعلق مسائل

(سوال نمبر ۵، ۶، ۷)

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی ☆

احقر کو شہریت اور اس سے متعلق مسائل کے سوال نمبر ۵ تا ۷ کے تعلق سے عرض مسئلہ پیش کرنے کا مکلّف کیا گیا ہے، چنانچہ اکیڈمی سے اس موضوع پر مجھے بتیس مقالات موصول ہوئے۔

سوال نمبر (۵) شریعتِ اسلامی میں پناہ گزینوں کو کیا حقوق حاصل ہوں گے، نیز کون سے حقوق شہریوں کو حاصل ہوں گے اور ان کو حاصل نہیں ہوں گے؟

اس سوال کی دو شقیں ہیں: شق اول، یعنی اسلامی شریعت میں پناہ گزینوں کے حقوق، اس کے جواب میں تمام مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ اسلام میں پناہ گزینوں کو تمام انسانی حقوق حاصل ہوں گے، جیسے: مذہب، جان و مال، عقل اور عزت و آبرو کے تحفظ، سرکاری ہاسپٹل میں علاج ومعالجہ خورد ونوش اور رہائش کی سہولت، خرید وفروخت اور ملکیت حاصل کرنے، باہمی نزاع ختم کرنے کے لئے عدالتی چارہ جوئی تعلیم حاصل کرنے، ظلم وجبر سے حفاظت، حالات کی سازگاری تک رکنے اور نصرت وحمایت کے دیگر حقوق حاصل ہوں گے۔

اس موقف کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱-"إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله، والذين أ ووا ونصروا أولئک بعضهم أولياء بعض" (انفال:۷۲)۔

۲-"لاإكراه فى الدين، قدتبين الرشد من الغي" (بقرہ:۲۵۶)۔

۳-"إن الله يأمر بالعدل والاحسان" (نحل:۹۰)۔

۴-"وإن أحد من المشركين استجارک فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأ منه" (توبہ:۶)۔

۵-"لا ينهاكم الله عن الذين لم يقتالوكم فى الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم

☆ صدر شعبہ حدیث وعلوم حدیث واستاذ فقہ واصول فقہ، جامعہ اسلامیہ، شانتا پورم، مالا پورم کیرالا۔

وتقسطوا إليهم، إن الله يحب المقسطين"(ممتحنہ:٨)۔

ان تمام آیتوں میں بے بسوں کے ساتھ ہمدردی، حمایت اور ظلم و جبر سے اجتناب کا حکم دیا گیا ہے۔

٦-مظلوموں، کمزوروں اور بے کسوں کی مدد کے لئے ہونے والے معاہدہ (حلف الفضول) کے متعلق آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:"لقد شهدت في دار عبد الله: جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم، ولو أد......به في الإسلام لأجبت"(معرفۃ السنن والآثار للبیہقی حدیث نمبر ١٣٢٣٢)۔

دوسری شق، یعنی شہریوں اور پناہ گزینوں کے حقوق کے درمیان فرق کے جواب میں بیشتر مقالہ نگار حضرات کی رائے ہے کہ پناہ گزینوں کا قیام عارضی ہوتا ہے، یہی عرف و عادت ہے، چنانچہ وہ خود حالات ساز گار ہونے کے بعد اپنے ملکوں کو واپس ہو جاتے ہیں، لہذا ان کو بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں گے، لیکن سیاسی حقوق جیسے امیدوار بننے، ووٹ ڈالنے اور اہم ملکی وانتظامی مناصب پر فائز ہونے کے حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔ البتہ مولانا محمد اقبال ٹنکاروی کے نزدیک سیاسی حقوق میں ووٹ دہی اور عدالتی چارہ جوئی کا حق ملے گا، دیگر حقوق حاصل نہیں ہوں گے، اس موقوف کے دلائل درج ذیل ہیں:

١-"المغنم بالمغرم في الإسلام"(دررالحکام شرح مجلۃ الأحکام ١/ ٩٠، دفعہ ٨٧) (نفع نقصان کے ساتھ جڑا ہوا ہے)۔

چنانچہ ملک کے مستقل شہریوں پر بہت سی ذمہ داریاں ہوتی ہیں، جیسے: ملک کے تحفظ و دفاع کے لئے جان و مال کی قربانی دینا، سرکاری خزانہ کے استحکام کے لئے ٹیکس ادا کرنا وغیرہ، لہذا انہیں جو سیاسی حقوق حاصل ہیں، وہ پناہ گزینوں کو حاصل نہیں ہوں گے، البتہ اگر مستقل اور دائمی طور سے پناہ دی گئی ہو، تو پناہ گزینوں اور عام شہریوں کے حقوق میں کوئی فرق نہ ہوگا، جیسا کہ انصار نے مہاجرین کو دائمی پناہ دی تھی، اور تمام انسانی اور شہری حقوق میں ان کو شریک کیا تھا، اسی وجہ سے ان کا لقب "انصار" پڑا۔

دوسری رائے مفتی محمد سلمان منصور پوری، مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی اور مفتی عبداللہ کاوی والا کی ہے کہ پناہ گزینوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو قدیم شہریوں کو حاصل ہیں، ان میں کوئی تفریق نہیں ہوگی، یہی رائے قاضی محمد حسن ندوی کی ہے، ان کی دلیل یہ ہے کہ خدمت خلق، انسانی ہمدردی اور اسلامی تعلیمات کا یہی تقاضا ہے کہ عام شہریوں اور پناہ گزینوں کے حقوق میں کوئی فرق و امتیاز نہ کیا جائے، تیسری رائے: مولانا خورشید احمد اعظمی اور راقم الحروف کی ہے کہ اگر پناہ گزیں غیر مسلم ہے اور اسے عارضی پناہ دی گئی ہے، تو اسے سیاسی حقوق کے علاوہ دیگر انسانی حقوق حاصل ہوں گے، البتہ مسلم پناہ گزیں جو عارضی پناہ کے لئے آیا اس کے اور ملک کے اصلی اور مستقل شہریوں کے درمیان حقوق میں فرق کرنا درست نہیں ہے، اس لئے کہ مسلم پناہ گزیں انسانی رشتہ کے ساتھ ایمانی اخوت میں بھی بندھا ہوا ہے، اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"والمؤمنون

والمؤمنات بعضهم أولياء بعض"(سورۂ توبہ:۷۱)۔

اور اکثریت کی یہ دلیل محل نظر ہے کہ مستقل باشندگان کی ذمہ داریاں زیادہ ہیں، کیونکہ مسلم پناہ گزینوں کو تمام ذمہ داریوں میں شریک کیا جاسکتا ہے، نیز کتاب وسنت میں کوئی ایسی نص موجود نہیں ہے جو درجات کی بلندی اور اجر وثواب کے علاوہ دیگر حقوق میں مسلمانوں کے حقوق کے درمیان تفریق کرتی ہو، نیز یہ کہنا کہ بہت سے وفود وقتی تعلیم وتربیت کے لئے مدینہ منورہ آتے تھے اور کچھ دنوں قیام کر کے واپس چلے جاتے تھے ظاہر ہے کہ حقوق وواجبات کے معاملے میں ان کو اہل مدینہ کا مقام تو حاصل نہیں ہوسکتا تھا؟ یہ ایک ظن ہے، جس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

اسی طرح یہ استدلال محل نظر ہے کہ بہت سے وہ لوگ جو مدینہ سے باہر قیام پذیر تھے، ان کے بارے میں حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ: "اگر یہ لوگ دار الہجرت منتقل ہونے پر رضامند نہ ہوں، تو ان کو خبردار کردو کہ وہ اعرابی مسلمانوں کے درجے میں ہوں گے، اور وہ حکم الہی کے اسی طرح پابند ہوں گے، جس طرح دیگر مسلمان پابند ہیں، مگر ان کو مال غنیمت اور فیٔ میں کوئی حصہ نہیں ملے گا، جب تک کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شرکت نہ کریں" (صحیح مسلم حدیث نمبر ۴۶۱۹) یہ استدلال محل نظر اس لئے ہے کہ یہ حضرات مدنی اسٹیٹ سے باہر تھے، جبکہ موضوع بحث ریاست کے اندر آنے والے پناہ گزیں ہیں۔

سوال نمبر (۶) کیا کسی مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی؟

اس کے جواب میں تقریباً تمام مقالہ نگار حضرات کا اتفاق ہے کہ اس مسئلہ پر رہائش اختیار کرنے والے کے اغراض ومقاصد اور غیر مسلم ملک کی صورتحال کے لحاظ سے حکم لگے گا، چنانچہ اس کی مختلف صورتیں ہوسکتی ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۱- ایسے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا حرام ہے، جہاں دین پر عمل کرنا دشوار ہو، اور انفرادی زندگی میں بھی اسلامی احکام کی بجا آوری مشکل ہو، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: "**ألم تر إلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليک وما أنزل من قبلک يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أمروا أن يكفروا به ويريد الشيطان أن يضلهم ضلالا بعيدا**" (نساء:۶۰)۔

نیز فرمان الہی ہے: "**يا يها الذين آمنوا لا تتخذوا ء أباء كم وإخوانكم أولياء إن استحبوا الكفر على الإيمان ومن يتولهم منكم فأولئک هم الظالمون**" (توبہ:۲۳)، پہلی آیت میں جس طاغوت سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے، اس سے مراد وہ نظام قانون ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو، چنانچہ غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا، یہ اختیار خود اسلامی نظام قانون سے نکل کر طاغوتی نظام قانون میں داخل ہونا ہے، اور ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے

انحراف کے مترادف ہے، اور دوسری آیت میں رشتہ دار کفار کی موالات سے منع کیا گیا ہے، تو دوسرے کفار کی موالات اختیار کرنا کیونکر درست ہوگا؟ اور اسی جیسی حالت کے لئے نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "**من جامع المشرک وسکن معه، فإنه مثله**" (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر ۲۷۸۷، اور اس کی سند صحیح ہے)۔

اور ایک دیگر موقع سے ارشاد ہے: "**أنا بريء من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله، ولم؟ قال: لا تر ا ء ی ناراهما**" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۲۶۴۵، اگرچہ اس حدیث کے بارے میں ارسال کا کلام ہے، پھر بھی یہ صحیح ہے)۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کا سبب غیر مسلموں سے قلبی تعلق، ان کے تہذیب و تمدن پر فخر، ان کے طرز زندگی کی مشابہت اختیار کرنا، اور مسلمانوں سے نفرت ہو، تو ایسی حالت میں غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا، ناجائز ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "**الذين يتخذون الكافرين أولياء من دون المؤمنين، يبتغون عندهم العزة، فإن العزة لله جميعا**" (نساء: ۱۳۹)، نیز فرمان الٰہی ہے: "**يايها الذين ء امنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء بعضهم أولياء بعض، ومن يتولهم، منكم، فإنهم منهم إن الله لا يهدى القوم الظالمين**" (مائدہ: ۵۱)، ان جیسی آیات کریمہ میں غیر مسلم سے قلبی تعلق کی صریح ممانعت ہے۔

۳- اگر خدانخواستہ ایسی مجبوری ہو کہ مسلم ملک میں بادشاہی یا ڈکٹیٹر نظام کی وجہ سے دین و مذہب، جان و مال، عقل و خرد اور عزت و آبرو کو خطرہ ہو، اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو، تو ایسی صورت میں غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، بشرطیکہ اس بات کا اطمینان ہو کہ وہاں جا کر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے گا، اور وہاں رائج شدہ منکرات سے خود کو محفوظ رکھ سکے گا، ارشاد الٰہی ہے: "**ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها، فأولئک مأواهم جهنم وسآ ء ت مصيرا**" (نساء: ۴)، اس آیت میں دین کے تحفظ اور مظالم سے نجات کے لئے ہجرت کو واجب قرار دیا گیا ہے، اور فقہی قاعدہ ہے: "**الأخذ بأعظم المصلحتين، ودفع أعظم المفسدتين**" (الأشباہ والنظائر لابن نجیم ۱/۸۸، الأشباہ للسیوطی ص ۸۷)۔

۴- غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا دعوتی نقطہ نظر سے ہو، تو ایسا کرنا درست ہے، ارشاد باری تعالی ہے: "**وما أرسلناک إلا رحمة للعالمين**" (انبیاء: ۱۰۷)، ایک جگہ ارشاد ہے: "**هو الذي أرسل رسوله بالهدى و دين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون**" (توبہ: ۳۳)، نیز فرمان الٰہی ہے: "**أدع إلى سبيل ربک بالحكمة والموعظة الحسنة، وجادهم بالتي هي أحسن**" (نحل: ۱۳۵)، ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی

دعوت دنیا کے ہر خطہ میں پہنچانا اس امت کا منصبی فریضہ ہے، اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کریں، تاکہ اسلام کی دعوت اور اسلامی زندگی کے نمونے دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچے۔

۵-مسلم ملک میں عزت وآبرو کے ساتھ معاشی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، اور غیر مسلم ملک میں اپنے اور اپنی نسل کے دین وایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو، تو ایسی حالت میں معاش کے مقصد سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا جائز ہے، ارشاد باری تعالی ہے:"**هو الذی جعل لکم الأرض ذلولا فامشوا فی مناکبها، وکلوا من رزقه، وإلیه النشور**"(ملک:۱۵)، نیز فرمان الٰہی ہے:"**لیس علیکم جناح أن تبتغوا فضلا من ربکم**"(بقرہ:۱۹۸)، ان آیات کریمہ کا تقاضہ ہے کہ جہاں رزق دستیاب ہو، وہاں جاکر حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۶-محض معیار زندگی بلند کرنے اور مالی فراخی حاصل کرنے کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا مکروہ ہے، کیونکہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر خود کو وہاں رائج منکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے، اور بلا ضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے، اس لئے کہ غیر مسلم ملک میں ہر طرف ایمان پر ڈاکہ ڈالنے والے امور موجود ہوتے ہیں، برائیوں اور شر وفتن کا دور دورہ ہوتا ہے، اور برے مناظر عام ہوتے ہیں، جس سے معصیت کا رجحان پروان چڑھتا ہے، اور نیکی اور تقوی کی روح کمزور ہوجاتی ہے، اسلامی تشخص کا تحفظ دشوار ہوجاتا ہے، حلال وحرام کے درمیان تمیز آہستہ آہستہ ختم ہوجاتی ہے، کفار ومشرکین کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے، اور ایک دو نسل تک اسلام کی حفاظت کسی حد تک ہوجاتی ہے، لیکن بعد کی نسلوں سے اسلام یا تو دور ہوجاتا ہے، یا برائے نام رہ جاتا ہے۔

۷-غیر مسلم ملک میں پیدائش کی بنیاد پر شہریت حاصل ہو، اور دین وایمان کو کوئی خطرہ نہ ہو، اور دعوتی مواقع حاصل ہوں، اور مسلم ملک کی طرف ہجرت کی گنجائش نہ ہو، تو ایسے ملک میں رہنا جائز ہے، چنانچہ اسی جیسی حالت کے لئے ماوردیؒ نے لکھا ہے:"**إذا قدر علی إظهار الدین في بلد من بلاد الکفر، فقد صارت البلدة دار اسلام، فالإقامة فیها أفضل من الرحلة عنها، لما یترجی من دخول غیره فی الإسلام**"(المجموع ۱۹/ ۲۶۴)۔

۸-اسرائیل کی شہریت اختیار کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ وہ مسلمانوں کی زمین غصب کر کے تشکیل کی گئی ریاست ہے، چنانچہ وہاں کے عہدیداروں کو شہریت کی درخواست پیش کرنا اس بات کا اعتراف ہوگا کہ یہ ملک ان غاصبوں کا ہے، البتہ مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب کی رائے یہ ہے کہ شہریت اختیار کئے بغیر رہ سکتا ہے، لیکن شہریت اختیار کرنا مطلقاً جائز نہیں ہوگا، لیکن یہ رائے نظر ثانی کی محتاج ہے، اس لئے کہ دعوتی نقطہ نظر سے شہریت اختیار کرنے میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

سوال نمبر(۷) کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا؟

اس کے جواب میں بھی تقریبا تمام مقالہ نویسوں کا اتفاق ہے کہ جزیرۃ العرب کو چھوڑ کر مسلم ملک کے دیگر خطوں میں غیر مسلم حضرات کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہے، بشرطیکہ ان کی سکونت سے اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کو نہ فی الحال اور نہ ہی مستقبل میں کوئی خطرہ ہو، اور انہیں مسلم ملک کے آئین کی پاسداری منظور ہو۔

اس موقف کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱-"**أخرجوا المشركين من جزيرة العرب**"(بخاری شریف حدیث نمبر ۳۱۶۸)۔

۲-"**لا يجتمع دينان في جزيرة العرب**" (مؤطا مالک حدیث نمبر ۱۶۷۱)۔

۳-"**عن عبد الله بن عمرو، قال: قال رسول الله ﷺ "من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة، وإن ريحها لتوجد من مسيرة أربعين عاما**"(صحیح بخاری، حدیث نمبر ۳۱۶۶، ۶۹۱۴، سنن ابن ماجہ حدیث نمبر ۲۶۸۶)اس حدیث سے واضح ہے کہ بلا جرم ناحق کسی ذمی کو قتل کرنا حرام ہے، اور یہ ظاہر ہے کہ ذمی دار الاسلام کا مستقل باشندہ ہوتا ہے۔

۴-"**الأصل أن إعطاء الأمان أو طلبه مباح، وقد يكون حراما أو مكروها، إذا كان يؤدي إلى ضرر أو إخلال بواجب أو مندوب**"(الموسوعۃ الفقہیۃ ۶/ ۲۳۴)۔

۵-"**ترک الكافر في دار الإسلام بالجزية جائز**"(تاتارخانیہ ۷/ ۲۵۶، مسئلہ نمبر ۱۰۴۳۲)، البتہ مولانا ابوسفیان مفتاحی صاحب کی رائے ہے کہ آج کے پُرفتن دور میں مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست نہیں ہے، کیونکہ آئندہ مسلمانوں کے لئے خطرہ بن سکتے ہیں، لیکن یہ رائے محل نظر ہے، اس لئے کہ غیر مسلموں کی معمولی تعداد کا مسلمانوں کے لئے خطرہ بننا مستبعد ہے۔

☆☆☆

دوسرا باب

ماہرین کی تحریریں

شہریت کے حقوق وفرائض
قرآن وحدیث کی روشنی میں

پروفیسر ڈاکٹر حسن السید خطاب☆

الحمدلله رب العالمين الملک الحق المبين والصلاة والسلام على النبى الامى سيدنامحمدﷺ وآله وأصحابه وسلم والتابعين لهم باحسان الى يوم الدين وبعد!

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہریت کوخصوصی اہمیت حاصل ہے، کیونکہ اس کا شمارایک ایسے رابطہ کے طور پر ہوتا ہے جوحکومت کوشہریوں سے مربوط کرتا ہے، وہ محض فرد اورحکومت کے درمیان ایک تعلق ہی نہیں ہے بلکہ ایک عملی کردار کا نام ہے جس کا اثر تمام شہریوں پر پڑتا ہے، اورجس کے نتیجہ میں تمام افراد شہریوں کے درمیان باہمی مساوات کی اہمیت کا ادراک کرتے ہیں، یہیں سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ شہریت معاشرہ میں تمام افراد کی کامل رکنیت کی حیثیت کواس پر مرتب ہونے والے حقوق وفرائض کے ساتھ تسلیم کرتا ہے، اس کا مطلب ہے کہ قوم کے تمام ہی فرزندان جووطن کی سرزمین پرزندگی گزارتے ہیں بلاکسی امتیاز کے سب برابر ہیں، قرآن مجید کی بہت سی آیتوں میں شریعت نے شہریت کے حقوق کوتسلیم کیا ہے، انہی آیات میں سے ایک آیت ہے:

”لاينهاكم الله عن الذين يقاتلوكم فى الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا اليهم ان الله يحب المقسطين“(سورہ ممتحنہ:۸)۔

(جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی ہواورتمہیں جلاوطن نہیں کیا ہو، ان کے ساتھ سلوک واحسان اورمنصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تمہیں نہیں روکتا، بے شک اللہ تعالی توانصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ایک سے زائد مواقع پر یہودیوں سے مصالحت کی، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شہریت ایک عمومی حق ہے اور یہ کہ تمام مذاہب کے پیروکاروں کا احترام کرنا، ان کے حقوق ادا کرنا اوران کی عزت وآبرو کی حفاظت

☆ پروفیسر اسلامک اسٹڈیز کلیۃ الآداب المنوفیہ یونیورسیٹی، مصر۔

کرنالازم ہے،اس طرح تمام گروہوں اور جماعتوں کے لئے عمومی نقطہ اتحاد واجتماعیت دراصل وہ شہریت ہے جس کا سرچشمہ نص شرعی ہے، جو ہر زمانہ اور ہر علاقہ کے موافق حکومت کی تشکیل کی بنیادوں کا لحاظ کرنے والی ہے،اور جس کا مطلب صرف شہریت کے حقوق وفرائض ہی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب وہ عمومی فرائض وذمہ داریاں بھی ہیں جو ہر شہری کے کندھے پر ڈالی گئی ہے،اور جب اسلام کے رو سے شہریت کا یہ مطلب ہے کہ جس کے نتیجہ میں ہر شہری کے ذمہ حقوق کے ساتھ ایسے فرائض بھی ہیں جو معاشرہ میں انسانی تعلقات اور رابطوں کو مستحکم کرتے ہیں، ہر ایک کے حقوق اور عزت وآبرو کی حفاظت کرتے ہیں،امن وامان اور عدل وانصاف فراہم کرتے ہیں، میں زیر تحریر اس مقالہ کی تیاری میں اللہ تعالی سے خیر کی توفیق مانگتا ہوں ''شہریت جس کے حقوق وفرائض: قرآن وسنت کی روشنی میں''۔

موضوع کے انتخاب کی اہمیت:

اس موضوع کی اہمیت کا خلاصہ اس طرح ہے:

شہریت ایک وطن کے تمام باشندوں کے حقوق وفرائض پر مشتمل ہوتی ہے،اس لئے اس مقالہ میں ان بہت سے مسائل کا حل پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو آج معاشرہ پر چھائے ہوئے ہیں،جن میں سیاسی،ثقافتی ومعاشرتی حالات کی دشواریاں بھی ہیں جن سے آج عام طور پر پورا معاشرہ گزر رہا ہے،اور خاص طور پر مصری معاشرہ دوچار ہے،اور وہ چیلنجز بھی ہیں جن کا سامنا معاشرہ کررہا ہے، کیونکہ شہریت کے فقہ کی غیر موجودگی کی وجہ سے یہ حالات ملک کی سالمیت اور اس کی داخلی وحدت سے متعلق ہیں۔

آج اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ معاشرہ کی داخلی وحدت کو مضبوط کیا جائے، یہ بات یقینی ہے کہ شہریت کے حقوق وفرائض کی فعالیت اس میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے، کیونکہ شہریت اس رابطہ وتعلق کی نمائندگی کرتی ہے جو حکومت وملک کو اس کے شہریوں اور باشندوں سے جوڑتا ہے۔

یہ مقالہ مندرجہ ذیل اجزاء پر مشتمل ہے:

تمہید،مقدمہ، چار مقاصد، خاتمہ:

تمہید میں مقالہ کا خاکہ، منہج وانداز اور اس کے انتخاب کے اسباب پر گفتگو کی گئی ہے۔

مقدمہ میں شہریت کے لغوی واصطلاحی معنی کی وضاحت کی گئی ہے۔

مقصد اول میں قرآن وسنت کی روشنی میں شہریت کی بنیادوں اور خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔

مقصد دوم میں قرآن وسنت کی روشنی میں شہریت کے شرعی اصول بیان کئے گئے ہیں۔

مقصد سوم میں قرآن وحدیث کی روشنی میں شہریت کے فرائض کی وضاحت کی گئی ہے۔

مقصد چہارم میں قرآن وحدیث کی روشنی میں شہریت کے حقوق کی وضاحت کی گئی ہے۔

خاتمہ میں اس بحث کے نتائج اور تجاویز پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس بحث کے اولین نتائج حسب ذیل ہیں:

۱۔اسلام فرد مسلم کو وطن سے مربوط رہنے اوراس کے لئے وفاداری پر آمادہ کرتا ہے۔

۲۔شہریت صرف اس بات کا تقاضہ نہیں کرتی ہے کہ انسان وطن پر عائد ہونے والے اپنے واجبی حقوق کو حاصل کرے بلکہ اس پر یہ بھی لازم کرتی ہے کہ وہ وطن سے متعلق اپنے اوپر عائد ہونے والے حقوق بھی ادا کرئے۔

شہریت کے حقوق میں سے حفاظت کا حق،عقیدہ کی آزادی کا حق،انصاف میں مساوات کا حق،وطن کے اندر ایک جگہ سے دوسری جگہ پوری آزادی کے ساتھ آنے جانے کا حق،کانفرنسوں،اجتماعات وجلسےاورانتخابات میں شرکت کی آزادی کا حق جیسے حقوق شامل ہیں۔

اسی طرح شہریت کے فرائض میں بھلائی کے کاموں میں امیر (ولی امر) کی اطاعت،وطن کا دفاع اورحفاظت،وطن کے قانون کا احترام اوردوسروں کی آزادی اوران کی خصوصیات کا احترام شامل ہے۔

مقدمہ:

مواطنہ (شہریت) کی لغوی اوراصطلاحی تعریف

مواطنہ (شہریت) کی لغوی تعریف:

مواطنہ (شہریت) لغت میں مفاعلہ کے وزن پر ہے جوموطن بروزن مفعل سے ماخوذ ہے،موطن اوروطن دونوں کے ایک ہی معنی ہیں،لسان العرب میں مذکور ہے:

وطن وہ جگہ ہے جہاں آدمی رہتا ہے وہی اس کا جائے قیام اورٹھکانہ ہوتا ہے،وطن بالمکان اوراُوطن دونوں اُقام کے معنی میں ہیں،یعنی قیام کرنا،وطن بنانا،کہا جاہے أوطنه أي اتخذه وطنا یعنی اس نے فلاں قام کووطن بنایا،اورموطن جنگ کے میدان کوبھی کہا جاتا ہے،اس کی جمع مواطن ہے،قرآن کریم میں یہ لفظ آیا ہے،اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**لقدنصر كم الله في مواطن كثيرة**"(سورہ توبہ:۲۵)"أوطنت الارض ووطنتها واستوطنتها" یہ فعل مختلف ابواب سے استعمال ہوتا ہے، اورسب کے معنی ہیں 'میں نے اس سرزمین کووطن بنایا' اسی طرح توطین بات تفعیل سے آمادہ کرنے کے معنی میں آتا ہے، مثلا"توطين النفس على الشئي"،یعنی نفس کوکسی چیز کے لئے آمادہ کرنا(لسان العرب،ناشر دارصادر بیروت،ج ۱۳،ص:۴۵۱)۔

وطن اصلی اس شہراورجگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان پیدا ہوااور جہاں وہ رہتا ہے،اوروطن اقامت اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان پندرہ دن یااس سے زیادہ ٹھہرنے کی نیت کرتا ہے،البتہ اس جگہ مستقل رہائش اختیار نہیں کرتا(التعریفات،باب

۵؍ج ا، ص:۳۲۷)۔

چنانچہ مواطنہ (شہریت) دراصل وطن کی نسبت ہے، اس کا مطلب اس جگہ کی طرف نسبت کرنا ہے جس کو اس نے وطن بنایا ہے، اور جب مفاعلۃ کا صیغہ عربی زبان میں طرفین (یعنی دو شخصوں یا چیزوں) کے درمیان اشتراک فعل کا فائدہ دیتا ہے، جیسے دو شریک (پارٹنرز) کے درمیان شرکت کا معاملہ، کسان اور مالک زمین کے درمیان بٹائی کا معاملہ، تجارت میں صاحب مال اور محنت وعمل کرنے والے کے درمیان مضاربت کا معاملہ، تو اسی طرح مواطنہ (جو مفاعلہ کے وزن پر ہے) کے معنی ہوں گے: ملک کے باشندوں اور وطن کے درمیان اشتراک عمل کا معاملہ۔

اس اعتبار سے مواطنہ (شہریت) کا معنی ہے وہ بھروسہ مند اور معتبر جذبات واحساسات جو شہری اور وطن کے درمیان پائے جاتے ہیں، بسا اوقات بعض احساسات فطری وتکوینی ہوتے ہیں جو دو شخصوں کے درمیان مختلف ہو سکتے ہیں، کیونکہ شہری کے اعتبارات اس کی شخصی، روحانی، جذباتی، لسانی، قومی، مادی اور تاریخی اعتبار سے یا اس کی تعلیم وثقافت کے معیار اور اس کی شخصیت کے لوازمات کے اعتبار سے مختلف ہوتے ہیں۔

لوگوں کی تعلیم وثقافت اور ان کے اعتبارات کے اختلاف کی وجہ سے ان کی قسمیں مختلف ہیں، اور ان کے نزدیک وطن اور موطن کے مفہوم کا دائرہ اور اس کے متعلق ہونے والے الفاظ اور صیغوں کے مفہوم کا دائرہ بھی مختلف ہے، چنانچہ جو اپنے قومی ترانہ میں قومی احساس وشعور میں ڈوبنا چاہتا ہے وہ یہ ترانہ گاتا ہے:

"بلاد العرب أوطانی" سارا ملک عرب میرا وطن ہے

اور جس کو اپنی قومیت سے زیادہ اپنے دین کی فکر ہوتی ہے وہ یہ شعر گنگناتا ہے:

اضحی لنا الاسلام دینا

وجمیع الکون لنا وطنا

اسلام ہمارا دین ہے اور ساری کائنات ہمارا وطن ہے۔

بہرحال 'وطن' کے لغوی معنی ہیں وہ منزل یا ٹھہرنے کی جگہ جہاں آدمی قیام کرے، اس مفہوم کے دائرہ میں مواطنہ (شہریت) کا مطلب ہے کسی حکومت یا ملک کی مکمل رکنیت جس میں شہریوں کو بعض حقوق حاصل ہوں، جیسے اجتماع کرنے کا حق، ووٹ دینے کا حق، عام مناصب پر فائز ہونے کا حق، اسی طرح بعض ذمہ داریاں اور فرائض بھی عائد ہوتے ہیں مثلاً ٹیکس ادا کرنے اور اپنے ملک کے دفاع کے ساتھ دیگر بہت سی ذمہ داریاں۔

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں مواطنہ (شہریت) کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

مواطنہ (شہریت) فرد اور حکومت کے مابین ایک ایسا تعلق ہے جس کا تعیین اس ملک کا قانون کرتا ہے اور جس کے

ضمن میں بعض حقوق حاصل ہوتے ہیں اور ساتھ ہی بعض ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں (الموسوعۃ العربیۃ العالمیۃ، ص:۱۱۰)۔

اس تعریف میں اگرچہ مواطنہ (شہریت) کے لغوی اور عرفی معنی کے بعض عناصر کا لحاظ رکھا گیا ہے، جیسے وہ جگہ جہاں آدمی قیام کرے، اور یہی وطن اور موطن کا لغوی اور اصطلاحی مدلول ہے، اسی طرح شہری اور اس کے وطن کے درمیان اشتراک عمل جو مواطنہ کے صیغہ کا مدلول ہے، مگر یہ تعریف ان تمام معانی سے مختلف ہے، علاقہ کے دائرہ اور وہاں پر قائم حکومت کے اعتبار سے، شہری اور حکومت کے درمیان اشتراک عمل کی نوعیت کے اعتبار سے اور وہاں کے نظام وقانون کے مطابق اس پر مرتب ہونے والے حقوق وفرائض کے اعتبار سے۔

ماہرین سیاست کی ایک جماعت کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ مواطنہ (شہریت) صرف فرد اور حکومت کے مابین تعلق ہی کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک عملی اور تجرباتی کردار ہے جس کا اثر تمام شہریوں پر پڑتا ہے، اور جس کے نتیجہ میں تمام لوگوں کو دین ومذہب، رنگ ونسل اور جنس کی تفریق کے بغیر تمام شہریوں کے مساوات کی اہمیت کا ادراک ہوتا ہے۔

چنانچہ اس تعریف کے اعتبار سے مواطنہ (شہریت) مساوات کی بنیاد پر قائم ہونے والی کی حکومت میں شہریوں کے درمیان ایک عملی وتجرباتی کردار ہے، یہ صرف ایک قانونی تعلق کا نام نہیں ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ مواطنہ (شہریت) ایک اصطلاح ہے جو کسی قوم یا وطن کی جانب نسبت کرنے کی طرف اشارہ کرتی ہے، اس طور پر کہ وہ معاشرہ میں ایک کامل ومساوی رکنیت ہے جس پر بہت سے حقوق وفرائض مرتب ہوتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام ابنائے قوم جو وطن کی سرزمین پر زندگی گزارتے ہیں، بلا کسی امتیاز کے سب کے سب برابر ہیں، خواہ وہ امتیاز کسی بھی تحکیمی معیار پر ہی کیوں نہ قائم ہو، جیسے دین یا جنس یا رنگ یا اقتصادی معیار یا سیاسی وابستگی یا فکری موقف (المواطنۃ فی زمن العولمۃ، مصنف: السید یاسین، ناشر: الدار المصریۃ، قاہرہ، سن اشاعت ۲۰۰۲ء، ص:۲۲، المواطنۃ والوطنیۃ: انتماء ووعی، مصنف: دکتور حسن طوالبۃ، ص:۱۲)۔

مواطنہ اسلامی فقہ کی روشنی میں:

سیاسی مواطنہ (شہریت) کی اس کے آخری معنی کے اعتبار سے فقہ اسلامی کے معیار میں کوئی صحیح جگہ نہیں ہے کیونکہ فقہ اسلامی نے اپنی تشریع میں تمام انسانوں کے درمیان پائے جانے والے بہت سے فروق کو مٹایا اور باطل قرار دیا، چہ جائیکہ وہ ایک ہی وطن کے تمام باشندوں کے درمیان ہو، اور کسی بھی معنی کے اعتبار سے ہو، البتہ اس نے ایسے فروق کو مانا ہے جو عقلاء کے نزدیک بھی معتبر ہے، نیز اپنے مخصوص پیمانے سے دیگر فروق کو بھی وضع کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

”لایستوی القاعدون من المؤمنین غیر أولی الضرر والمجاهدون فی سبیل الله بأموالهم وأنفسهم

فضل الله المجاهدين بأموالهم وأنفسهم على القاعدين درجة وكلا وعدالله الحسنى وفضل الله المجاهدين على القاعدين أجرا عظيما"(سورہ نساء:۹۵)۔

(جن مسلمانوں کو کوئی معذوری لاحق نہ ہو اور وہ (جہاد میں جانے کے بجائے گھر میں) بیٹھ رہے وہ اللہ کے راستے میں اپنے مال وجان سے جہاد کرنے والوں کے برابر نہیں ہیں، جو لوگ اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں ان کو اللہ نے بیٹھے رہنے والوں پر درجے میں فضیلت دی ہے، اور اللہ نے سب سے اچھائی کا وعدہ کر رکھا ہے، اور اللہ نے مجاہدین کو بیٹھے رہنے والوں پر بڑی فضیلت دے کر بڑا ثواب بخشا ہے)۔

نیز اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**الرجال قوامون على النساء بمافضل الله بعضهم على بعض وبماانفقوامن أموالهم**"(سورہ نساء:۳۴)۔

(مرد عورتوں کے نگراں ہیں، کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے، اور کیونکہ مردوں نے اپنے مال خرچ کئے ہیں)۔

نیز اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**يأيهاالناس انا خلقناكم من ذكروأنثى وجعلناكم شعوباوقبائل لتعارفوا ان أكركم عندالله أتقاكم ان الله عليم خبير**"(سورہ حجرات:۱۳)۔

(اے لوگو! حقیقت یہ ہے کہ ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تمہیں مختلف قوموں اور خاندانوں میں اس لئے تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کی پہچان کر سکو، درحقیقت اللہ کے نزدیک تم سب سے زیادہ عزت والا ہے وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہو، اللہ سب کچھ جاننے والا اور ہر چیز سے باخبر ہے)۔

نیز اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**ولاتتمنواما فضل الله به بعضكم على بعض**"(سورہ نساء:۳۲)۔

(اور جن چیزوں میں ہم نے تم کو ایک دوسرے پر فوقیت دی ہے، ان کی تمنا نہ کرو)۔

شارع حکیم نے رنگ ونسل اور وطن کے فرق کو مٹایا ہے، لیکن ساتھ ہی اس نے بعض دیگر فروق کو قائم کیا ہے، جیسا کہ ان مذکورہ آیات اور ان کے علاوہ دیگر آیات میں ان کا ذکر ہے، اور وہ بہت ہی زیادہ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے، یہاں اس وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ سیکولر نظریہ انسانوں کے درمیان پائی جانے والی برتری وفوقیت میں دین اور دین سے وابستگی کے کسی کردار کا قائل نہیں ہے، جیسا کہ آسمانی مذاہب اور آسمانی شریعتوں میں ہے۔

پہلا مقصد: شہریت کی بنیادیں اور خصوصیات۔قرآن وحدیث کی روشنی میں:

شہریت انسان کی کسی متعین علاقہ اور ملک کی طرف نسبت ووابستگی کا نام ہے، چنانچہ یہ چند باتوں کا تقاضہ کرتی ہے، جن میں سے کچھ اس طرح ہیں:

۱۔نئے معنی کے اعتبار سے ملک یا حکومت کا وجود ہو۔

۲۔ایسے وطن کا وجود ہو جس میں تمام سرگرمیاں جاری ہوں یا وہ ایسا علاقہ ہو جس کی سرحدیں متعین ہوں۔

۳۔فرد اور حکومت کے درمیان اجتماعی تعلق قائم ہو۔

۴۔معاشرہ کے افراد کے درمیان پرامن بقائے باہم کے ضابطہ کا التزام ہو۔

۵۔حقوق وفرائض میں باہمی اشتراک ہو۔

۶۔حکومتی نظام کا احترام ہو، اور دستوری، قانونی، سیاسی، معاشرتی، اقتصادی، اور تہذیبی سطح پر حاکم سے اس کا تعلق ہو۔

چنانچہ شہری مقررہ ضمانتوں کے سایہ میں پوری آزادی کے ساتھ اپنی رائے اور اپنی مصلحتوں کا اظہار کرسکتا ہو۔

شہریت کی بنیادیں:

معاشرہ میں شہریت اچھی شکل میں فروغ پاسکے اس کے لئے دو بنیادوں کا پایا جانا ضروری ہے:

پہلی بنیاد: آزادی اور حاکم کی طرف سے ظلم واستبداد کا نہ ہونا

دوسری بنیاد: دین، مذہب اور عرف سے قطع نظر حقوق وفرائض میں تمام شہریوں کے درمیان مساوات وبرابری کا پایا جانا، یہ دونوں بنیادیں اسی وقت پائی جاسکتی ہیں جب مندرجہ ذیل نظام موجود ہو۔

۱۔سیاسی نظام: جس کا مقصد جمہوریت کی خدمت ہے، جو دراصل قوم کی حکومت قوم کے ذریعہ اور قوم کے لئے ہے۔

۲۔قانونی نظام: جس کا مقصد شہریوں کے حقوق اور اس کے فرائض کا جاننا ہے۔

۳۔اجتماعی نظام: اس نظام کا دارومدار وطن کی محبت اور وطن کے حقوق کی معرفت پر ہے، اور اس عملی کردار پر ہے جس کے ذریعہ ابناء وطن پر عائد ہونے والے حقوق کا احترام ظاہر ہوتا ہے، جیسے وطن اور وطن کے باشندوں کا دفاع، اسی طرح ان کے حقوق اور حکومت کے حقوق کا دفاع وغیرہ۔

شہریت کی خصوصیات:

اسلام میں شہریت کا سیاسی وشہری مفہوم کے علاوہ ایک دینی مفہوم بھی ہے، جیسے اسلامی اخوت کا مفہوم، یہی وجہ ہے کہ اسلام میں شہریت نے نسلی، دینی، تہذیبی تنوع کے باجود اعتدال اور توازن پیدا کیا ہے، جبکہ دوسرے معاشرہ میں شہریت

نسلی، دینی، اور ثقافتی کشمکش کے راستہ پر چل پڑی، اور مغرب تو ان مقابلہ آرائیوں کی انتہاء پر پہونچ گیا ہے، اس لئے کہ اس نے شہریت کو نسلی رجحان سے ہم آہنگ کر دیا، جیسا کہ بیسویں صدی میں دو عالمی جنگوں نے اس کا آشکارا کر دیا، اسلام میں شہریت امت اسلامیہ اور اس کی وحدت کے ساتھ ولاء وفاداری کے تعلق سے معارض نہیں ہے، کیونکہ شہریت اسلامی تناظر میں ایک انسانی مفہوم ہے نہ کہ نسلی، اور وہ تمام مسلمانوں کو شامل ہے، چنانچہ اسلام میں شہریت تمام شہریوں کے لئے ان حقوق کی ضمانت دیتی ہے جن کو حقوق انسانی کے نام سے جانا جاتا ہے، کیونکہ یہ رواداری کے قاعدہ پر قائم ہیں، چنانچہ یہ صرف نعرہ ہی نہیں ہے بلکہ تعمیر واستحکام کا ذریعہ بھی ہیں، اس لئے کہ اس کی بنیاد آزادی ومساوات پر ہے، چنانچہ اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے جامع انسانی وحدت کی طرف بلایا تا کہ لوگ محبت وتعاون اور امن وسکون کے سایہ میں زندگی گزار سکیں، قرآن کریم اور احادیث نبویہ میں اس موضوع پر دلالت کرنے والے نصوص کثرت سے ہیں، چنانچہ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

”**يأيهاالناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة**“(سورہ نساء:۱)۔

(اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا)۔

اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

”**يأيهاالناس إن ربكم واحدوان أباكم واحد كلكم من آدم وآدم من تراب ان أكرمكم عندالله أتقاكم ليس لعربى على عجمى فضل إلا بالتقوى**“(شرح مسلم للنووی، ج۱۱ص:۱۶۷)۔

دوسرا مقصد: مواطنہ (شہریت) کے شرعی اصول، قرآن وحدیث کی روشنی میں:

اسلامی شریعت نے متعدد مواقع پر شہریت کے حق کی تائید کی ہے، جن میں چند اس طرح ہیں:

۱۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے بارے میں اللہ تعالی کا فرمان ہے:

”**قالو اياشعيب مانفقه كثير مماتقول انا لنراك فيناضعيفا**“(سورہ ہود:۹۱)۔

(وہ بولے اے شعیب! تمہاری بہت سی باتیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں، اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ تم ہمارے درمیان ایک کمزور آدمی ہو)۔

یہاں لفظ ’فینا‘ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کے کفر کے باوجود ان کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، اور وطنیت وشہریت میں ان کے ساتھ شریک تھے۔

۲۔ یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر سے کہا:

”**اجعلنى على خزائن الارض انى حفيظ عليم**“(سورہ یوسف:۵۵)۔

(آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کردیجئے، یقین رکھئے کہ مجھے حفاظت کرنا خوب آتا ہے اور میں پورا علم رکھتا ہوں)۔

حالانکہ اس وقت بادشاہ کافر تھے، یعنی مصر کے بادشاہ اوران کی قوم۔

۳۔اسلام نے یہ ثابت کیا ہے کہ تمام لوگ اپنی اصل ،جنس اور فطری میلان ورجحان میں یکساں اور برابر ہیں، اس کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنی شہریت اور وطن کی محبت پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہے۔

مذکورہ باتوں کو ہم درج ذیل سطور میں تلاش کرتے ہیں:

(الف) اللہ تعالی نے وطن سے نکالنے کو صراحت کے ساتھ قتل نفس کے برابر قرار دیا ہے، ارشاد خداوندی ہے:

"ولوانا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم او اخرجوامن دیارکم مافعلوہ الا قلیل منھم" (سورہ نساء:۶۶)۔

چنانچہ وطن کے ساتھ یا وطن کی نسبت کے ساتھ مضبوط تعلق ووابستگی انسانی طبیعت ومزاج میں شامل ہے، اورنفس انسانی میں چھپی ہوئی فطرت ہے، خلیفہ دوم حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے: **"لولاحب الاوطان لخرب بلدالسوء"**، یعنی وطنیت انسان کے لئے ایک لازمی ضرورت ہے، گرچہ وہ ملک غریب ہی کیوں نہ ہو، اوروہاں کے باشندہ برے اور بدمعاش ہی کیوں نہ ہوں۔

(ب) جب اللہ تعالی نے اپنے نبی ﷺ کو مکہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کا حکم فرمایا تو آپ ﷺ نے اپنے اس وطن کی طرف دیکھا جس میں آپ پیدا ہوئے یعنی مکہ اور فرمایا:

"واللہ انک لأحب البلاد الی ولولاأن قومک اخرجونی منک ماخرجت"

(خدا کی قسم اے مکہ تو مجھے تمام شہروں سے سب سے زیادہ محبوب ہے، اگر تیری قوم نے مجھے تجھ سے نہ نکالا ہوتا تو میں نہ نکلتا)۔

اس کے بعد اللہ تعالی نے آپ کی تسلی خاطر کے لئے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی:

"ان الذی فرض علیک القرآن لرادک الی معاد" (سورہ قصص:۸۵)۔

(ج) قرآن کریم وطن کے دفاع کو جہاد فی سبیل اللہ قرار دیا ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالی کا ارشاد گرامی ہے:

"ولیعلم الذین نافقوا وقیل لھم تعالوا قاتلوا فی سبیل اللہ او ادفعوا......" (سورہ آل عمران:۱۶۷)۔

اوپر بیان کردہ آیات واحادیث سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ وطن کی محبت انسان کو وطن کے دفاع کے لئے راستہ میں جان دینے پر آمادہ کرتی ہے، اور یہ بالکل اسی طرح مشروع وجائز ہے جس طرح اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے

جہاد کرنا مشروع ہے۔

۴۔اسلام میں شہریت کا دائرہ وطن اسلامی کے جغرافیائی وعلاقائی حدود سے زیادہ وسیع ہے،اوروطن کا ہرفرد خواہ مسلمان ہو یا معاہداس وطن کا شہری ہوتا ہے،اس لئے کہ وہ امت مسلمہ کا ایک رکن ہے، جسے ہرطرح کے حقوق حاصل ہیں،اوراس پرتمام قسم کی ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں، چنانچہ مسلمانوں کا کوئی ایک مخصوص وطن نہیں ہوتا ہے، بلکہ سارے اسلامی ممالک اس کا وطن ہیں،اورعلاقائیت کے تنگ مفہوم میں وطن سے اس کی محبت بالعموم پوری امت مسلمہ سے اس کی محبت مانع نہیں ہوتی، چنانچہ تمام شہری وطن کے تنگ دائرہ میں غنیمت وتاوان اورنفع ونقصان میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، اوریہی پہلا دائرہ ہے، پھراس کا دائرہ مزید وسیع ہوتا ہے، تاکہ تمام مسلمانوں کے اندروحدت وقوت پیدا کی جائے،ان کی عزت وکرامت کی حفاظت کی جائے،اوراس میں پوری امت مسلمہ شامل ہوں۔

اس کا تقاضہ ہے کہ مسلسل آپسی تعاون کوفروغ دیا جائے،اورتعاون کے حلقے قائم کئے جائیں جوایک دوسرے کوتقویت پہونچائیں، چنانچہ اجتماعی زندگی کی حفاظت تو دفاع کے پے درپے اقدام سے کی جاسکتی ہے، جوایک کے بعدایک ہو،اورآخر میں اس سب کا فائدہ اور بھلائی پوری امت کے مفاد کے لئے ہو، کیونکہ یہ ایک امت ہے، جسے چھوٹی چھوٹی مصلحتیں ٹکروں میں نہیں بانٹ سکتیں اورجس کے مضبوط وجامع رابطہ کومعمولی وجزئی مسائل نہیں توڑ سکتے،اسی وجہ سے اس آیت کے لئے ایک امت کی تعبیر اختیار کی گئی ہے نہ کہ ایک قوم کی، چنانچہ اس امت کی عمارت کسی بھی اسلامی مملکت کے ایسے معاشرہ کی بنیاد پرکھڑی ہوتی ہے جس کے اندرمتعدد نظریات اورمختلف رنگ ونسل کے لوگ رہتے ہوں،ان کے مقاصدواغراض بھی مختلف ہوں، مگروہ سب ایک ہی عقیدہ پرایمان رکھتے ہوں،ایک ہی شریعت کے سایہ میں زندگی گزارتے ہوں،اورایک ہی اخوت وبھائی چارگی ان سب کوایک لڑی میں پروتی ہو، جیسا کہ اللہ رب العزت کا ارشاد ہے: ''انماالمومنون اخوۃ''(سورہ حجرات:۱۰)۔

۵۔مدینہ منورہ کے معاہدوں میں شہریت کامفہوم:

موجودہ زمانہ کی حکومت کے مفہوم کے ظاہرہونے سے پہلے اوردسمبر ۱۹۴۸ء میں انسانی حقوق کے عالمی اعلان پراتفاق سے بھی پہلے ہی اسلام نے عہدنبوی ہی میں شہریت کے اصول وضوابط کو بیان کردیا۔

شہریت کے اصول بیان کرنے میں اسلام کی یہ سبقت اس معروف معاہدہ نامہ میں بھی ظاہرہوتی ہے جوصحیفہ مدینہ کے نام سے معروف ہے، یہ معاہدہ نبی کریم ﷺ نے مدینہ ہجرت کرنے کے بعداور بعثت نبوی کے ۱۳ سال بعد ۶۲۲ھ میں کیا تھا،اس معاہدہ نے دوباتیں نمایاں کیں:

اول: نئے وطن میں اسلامی حکومت کا آغاز ہوا۔

دوم: تہذیبی واعتقادی تنوع (یعنی مسلمانوں ، یہودیوں اوراوس وخزرج کے مشرکین جوایمان نہیں لائے تھے)اورنسلی تنوع (مکہ سے ہجرت کر کے آنے والے مہاجرین جومتعدد عدنانی قبائل سے تعلق رکھتے تھے،نصار جوقحطانی قبائل سے تعلق رکھتے تھے،اور یہود جوسامی قبائل سے تعلق رکھتے تھے) کے باوجود مدینہ کا معاشرہ ایک امت میں ڈھل گیا۔

صحیفہ مدینہ یامعاہدہ نامہ کے دفعات جن سے شہریت ثابت ہوتی ہے،اور جسے ہمارے زمانہ میں دستورمملک کہاجاتا ہے:

نبی کریم ﷺ نے اس وقت جب آپ کی عمرشریف ۵۳ سال کی تھی ،یعنی ہجرت کے پہلے سال بعثت کے تیرہویں سال مطابق ۶۲۲ ھ مسلمانوں اور مدینہ کے دیگر گروہوں اور باشندوں کے درمیان ایک معاہدہ کیا، یہ پہلا سیاسی معاہدہ تھاجو ۴۸ دفعات یافقروں پر مشتمل تھا،اس معاہدہ کی بعض دفعات اس طرح ہیں:

یہ تحریر محمد نبی ﷺ کی جانب سے ایمان والوں اورقریش ویثرب کے اطاعت گزاروں کے درمیان اوران لوگوں کے درمیان جنھوں نے مسلمانوں کی تبعیت اختیار کی،ان سے مل گئے اوران کے ساتھ جہاد میں شامل رہے:

۱۔ یہ سب لوگ (دیگرلوگوں کوچھوڑکر)ایک ہی امت ہیں۔

۲۔کوئی مشرک کسی مسلمان کے خلاف قریش کے مال یاان کے افراد کو پناہ نہیں دے گا،اورنہ ان کے درمیان حائل ہوگا۔

۳۔یہودیوں میں سے جنھوں نے ہماری تبعیت اختیار کی ہے ان لئے مدداورحمایت ہے،ان کے ساتھ ظلم نہیں کیاجائے گا،اورنہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی،ان کے موالی بھی ان کے ساتھ ان کی طرح ہیں،سوائے اس کے جوظلم کرے یاکسی جرم کاارتکاب کرے،اس وقت وہ خوداپنے کواوراپنے گھر والوں کوہلاک کرنے والا ہوگا۔

۴۔بنی عوف کے یہودایمان والوں کے ساتھ امت ہیں، یہود کے لئے ان کا دین ہےاورمسلمانوں کے لئے ان کا دین ہے۔

۵۔ یہودبھی مسلمانوں کےساتھ خرچ کریں گے جب تک حالت جنگ میں ہوں گے۔

۶۔ یہود کے ذمہ خودان کاخرچ ہے،اورمسلمانوں کے ذمہ ان کاخرچ ہے۔

۷۔بنی حارث کے یہود کے لئے اس جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہیں۔

۸۔بنی نجار کے یہود کے لئے اسی جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہیں۔

۹۔بنی حبشہ کے یہود کے لئے اسی جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہیں۔

۱۰۔بنی ثعلبہ کے یہود کے لئے اسی جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہیں۔

۱۱۔ بنی اوس کے یہود کے لئے اسی جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے لئے ہیں۔

۱۲۔ ثعلبہ کا بطن (شاخ) جفنہ بھی خود ان کی طرح ہے (یعنی ثعلبہ کی طرح)

۱۳۔ بنی شطیبہ کے لئے بھی اسی جیسے حقوق ہیں جو بنی عوف کے یہود کے لئے ہیں۔

۱۴۔ یہ معاہدہ بھلائی و نیکی کے کاموں میں ہے، نہ کہ گناہ کے کاموں میں۔

۱۵۔ ثعلبہ کے موالی بھی خود ثعلبہ کی طرح ہیں۔

۱۶۔ یہ کہ اس معاہدنامہ یا میثاق پر اتفاق کرنے والوں سے جو جنگ کرے گا اس کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد لازم ہوگی۔

۱۷۔ یہ کہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ خیر خواہی و خیر اندیشی اور بھلائی کا معاملہ کیا جائے گا، برائی اور گناہ کے کاموں میں ساتھ نہیں دیا جائے گا۔

۱۸۔ کوئی شخص اپنے حلیف کے ساتھ مخالفانہ کاروائی نہیں کرے گا۔

۱۹۔ مظلوم کی مدد و نصرت کی جائے گی۔

۲۰۔ مدینہ کے اندر کشت و خون کرنا اس معاہدہ پر اتفاق کرنے والوں پر حرام ہوگا۔

۲۱۔ اس معاہدہ پر اتفاق کرنے والوں کے درمیان اگر کوئی نئی بات یا جھگڑا پیدا ہو جائے جس میں فساد کا خوف ہو تو اس کا فیصلہ خدا اور اللہ کے رسول محمد رسول اللہ ﷺ کے حوالہ کیا جائے گا۔

۲۲۔ قریش کو پناہ نہیں دی جائے گی، نہ ہی اس کے مددگار و معاونین کو پناہ دی جائے گی۔

۲۳۔ یثرت (مدینہ) پر جو بھی چڑھائی کرے گا اس کے خلاف آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنا لازم ہوگا، اور یہ کہ معاہدہ ظالم و گنہگار کے درمیان حائل نہیں ہوگا۔

اس معاہدہ نے مدینہ کے تمام باشندوں، مہاجرین، انصار، یہود اور اس کے علاوہ دیگر لوگوں کو ان کے عقیدہ سے صرف نظر کرتے ہوئے شہریت کا حق دیا ہے، اور یہی وہ حقوق ہیں جو آج شہری یا مدنی حقوق کے نام سے معروف ہیں، اسی طرح اس معاہدہ نے مدینہ کی حکومت میں غیر مسلموں کو شہری قرار دیا اور اس حکومت میں ان کے حقوق بھی مسلمانوں کے حقوق جیسے قرار دئے گئے، اور ان پر بھی وہی ذمہ داریاں اور فرائض عائد کئے گئے جو مسلمانوں پر عائد کئے گئے، البتہ تشریع احکام سے متعلق مسلمانوں کے بعض مخصوص مسائل میں دیگر لوگوں سے الگ تھے۔

بعض اوقات بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام میں شہریت کا تصور صرف مسلمانوں کے درمیان ہے، ہم کہتے ہیں کہ ایک سے زیادہ مواقع پر رسول اللہ ﷺ اور یہودیوں کے درمیان مصالحت ہوئی، جو اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ

شہریت کا تصور عام ہے، اسی طرح میثاق مدینہ کے دفعات بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں، اس کے علاوہ بہت سی آیات واحادیث اہل ذمہ کے احترام، ان کے حقوق کی ادائیگی اوران کی عزت وآبرو کی حفاظت کا حکم دیتی ہیں، اس سلسلہ کی سب سے نمایاں آیت اللہ تعالی کا یہ فرمان ہے:

"لاینھاکم اللہ عن الذین یقاتلونکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین"(سورہ ممتحنہ:۸)۔

(جن لوگوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں لڑی ہواور تمہیں جلاوطن نہیں کیا ہو، ان کے ساتھ سلوک واحسان اور منصفانہ بھلے برتاؤ کرنے سے اللہ تمہیں نہیں روکتا، بے شک اللہ تعالی توانصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے)۔

اس بنیاد پر یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ وہ مسلمان جواپنے دینی اقداراوردینی احکام کی روح سے آشنا ہوں، ان سے اس کے علاوہ کسی اور بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ وہ ایک اچھا شہری ہوگا، ذمہ داری کا احساس رکھنے والا، اپنے ہم وطنوں کے ساتھ تعاون وہم آہنگی رکھنے والا اور اپنے وطن کے تعلق سے غیریت وحمیت رکھنے والا ہوگا، کیونکہ اسلام انسان کو اپنے وطن سے مربوط رہنے اوراپنے دین اور پھر اپنے وطن کے ساتھ وفاداری پر آمادہ کرتا ہے۔

یہ دستوری معاہدہ نامہ دشمنوں کے خلاف مدینہ کے تمام گروہوں اور باشندوں کے درمیان ایک فوجی وعسکری معاہدہ وجود میں لانے اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین کے ساتھ کسی بھی طرح کے تعاون سے روکنے پر اتفاق کے ساتھ ساتھ شہریت کے مسائل اور شہریوں کے حقوق وفرائض پر مشتمل ہے۔

چنانچہ دفعہ ۱ / تمام شہریوں کے درمیان شہری وحدت کی بنیاد کو مستحکم کرتا ہے، اور یہ ثابت کرتا ہے کہ مدینہ کے تمام گروہ اور باشندے حکومت کی رعایا ہیں، اورعصر حاضر کے مفہوم کے اعتبار سے حکومت کی عوام ہیں، یاامت کے مفہوم کو وجود میں لانے والی جماعتیں ہیں۔

اس کا دفعہ ۲ / مکہ میں قریش کے مشرکین کے ساتھ مدینہ والوں کی طرف سے تعاون پر پابندی عائد کرتا ہے، خواہ یہ تعاون جان کے تحفظ سے متعلق ہو یا مال کے تحفظ سے متعلق یا عام اقتصادیات سے متعلق۔

دفعہ ۳/ یہودیوں کے ساتھ باہمی نصرت وتعاون کی ضرورت کا اعلان کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ مسلمانوں پر یہودیوں کا حق ہے کہ وہ ان کے دشمنوں کے خلاف ان کی مدد وحمایت کریں۔

دفعہ ۴ /مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ظلم وزیادتی کو چھوڑ کر عدل وانصاف کے دائرہ میں رہتے ہوئے شہری وطنی وحدت کا اعلان کرتا ہے، ظلم کی صورت میں ظالم اپنے ظلم کے انجام کا خود ذمہ دار ہوگا۔

دفعہ ۵ / دشمنوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہونے کی صورت میں حکومت کو اقتصادی طور پر مضبوط کرنے میں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان مساوات کی بنیاد کو مستحکم کرتا ہے، اور یہ بتاتا ہے کہ حالت جنگ میں حکومت کے ساتھ وفاداری کا تعلق رکھنا اور اس کی نصرت وحمایت کا اعلان کرنا واجب ہے۔

دفعہ ۶ / مسلمانوں اور یہودیوں میں سے ہر ایک پر اقتصادی ذمہ داری اور بوجھ کو تقسیم کرتا ہے۔

دفعہ ۷ / تا دفعہ ۱۵ / (یہ اصل معاہدہ نامہ میں دفعہ ۲۶ سے دفعہ ۳۵ تک ہے) مسلمانوں اور یہودیوں کے نو قبائل کے درمیان (بنی عوف کے یہودیوں کو شامل کر کے) حقوق وفرائض میں برابری ومساوات کی بنیاد کو وضع کرتے ہیں۔

دفعہ ۱۶ / اور دفعہ ۱۷ / یہ دونوں دفعات اہل معاہدہ اور ان کے دشمنوں کے درمیان جوان سے برسرِ پیکار ہوں، باہمی نصرت وتعاون کی ترجیحات کو متعین کرتے ہیں، اور یہی عسکری ودفاعی مفہوم ہے، اس کے ساتھ ساتھ رائے، مشورہ اور نصیحت وخیر خواہی کے اظہار میں باہمی تعاون کی ضرورت کو بیان کرتے ہیں، اور یہی شہریت کا بنیادی واجتماعی مفہوم ہے۔

دفعہ ۱۸ / شخصی وانفرادی ذمہ داری کے اصول کو بیان کرتا ہے، کیونکہ ہر انسان اپنے خاص تصرفات اور اپنے ظالمانہ کردار کا خود ذمہ دار ہے، اور یہ اسلام کا قابل فخر ضابطہ ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

"ولا تزر وازرة وزر أخرى" (سورہ انعام:۱۶۴) (اور کوئی کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے)۔

"كل أمرى بما كسب رهين" (سورہ طور:۲۱) (ہر شخص اپنے اپنے اعمال کا گروی ہے)۔

"كل نفس بما كسبت رهينة" (سورہ مدثر:۳۸) (ہر شخص اپنے اعمال کے بدلے میں گروی ہے)۔

دفعہ ۱۹ / حاکم کے پاس مقدمہ لے جانے کے اصول کی وضاحت کرتا ہے اور قضاء وفیصلہ کا مفہوم بیان کرتا ہے۔

دفعہ ۲۰ / شہریت کے جغرافیائی مفہوم کے دائرہ کی تحدید کرتا ہے۔

دفعہ ۲۱ / باہمی نزاع یا قانونی لڑائی کو ختم کرانے کی حالت میں اس کے مرجع وسرچشمہ کی وضاحت کرتا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہے، یعنی حاکمیت اللہ اور اس کے رسول کے لئے ہے، اس لئے کہ اسلامی شریعت ایک زمینی دائرہ رکھتی ہے۔

دفعہ ۲۲ / قریش اور ان کے حلیفوں کے ساتھ عسکری وفوجی تعاون کے تمام تعلقات کو ختم کرنے کی تاکید کرتا ہے۔

دفعہ ۲۳ / اس بات کا عام اعلان کرتا ہے کہ مدینہ کا دفاع کرنا واجب ہے، اور یہ کہ حق اور انصاف کی حالت میں مدد کی جائے گی، نہ کہ ظلم وزیادتی کی حالت میں، چنانچہ ظلم وزیادتی اور گناہ کی حالت میں شہریت اس کو بے گناہی اور امتیازی برتاؤ کا حق نہیں دے گی، کیونکہ اسلام حق کی مدد کرتا ہے نہ کہ باطل کی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمام شہریوں کے ساتھ مساوات کی واضح بنیاد پر معاملہ کیا جائے گا، چنانچہ یہاں ایسا نہیں ہے کہ کچھ لوگ درجہ اول کے شہری ہوں اور دوسرے لوگ درجہ دوم یا درجہ سوم کے، کہ قانون کے سامنے سب برابر ہیں، اور کسی کو نظام قانون کی پکڑ سے معافی نہیں دی جاسکتی خواہ اسکا تعلق جنائی قانون سے ہو یا دیگر دستوری، انتظامی یا ملکی قوانین سے۔

تیسرا مقصد: شہریت کے فرائض، قرآن وحدیث کی روشنی میں

شہریت ہر شہری پر کچھ فرائض عائد کرتی ہے، جن کو انجام دینا اور اس کے تقاضے کو پورا کرنا وطن کے حق اور اس کی سلامتی کا لحاظ کرتے ہوئے ضروری ہے، اس لئے کہ اگر وطن کے فرزندان وطن کے تئیں خود پر عائد ہونے والے حقوق کو پورے طور پر ادا نہیں کریں گے تو ان کے شہری حقوق بھی ضائع ہوجائیں گے جن کے وہ مستحق ہیں۔

شہریت کے بعض فرائض درج ذیل ہیں:

پہلی بات: حکومت اور وطن کے تئیں اخلاص ووفاداری اور ان لوگوں سے محبت وہمدردی جو وطن میں ایک ساتھ زندگی گزارتے ہیں خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اسی طرح وہ ساتھ مل کر ہر مصیبت وتکلیف اور خطرات واندیشے کا سامنا کرتے ہیں اور وطن کے منافع سے ایک ساتھ فائدہ اٹھاتے ہیں، جس کے نتیجہ میں وطن سب کے لئے خیر وبھلائی اور لطف ودلچسپی کا ذریعہ بن جاتا ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر أن الأرض یرثھا عبادی الصالحون ان فی ھذا لبلاغا لقوم عابدین"(سورہ انبیاء:۱۰۵)۔

(ہم زبور میں پند ونصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث میرے نیک بندے ہی ہوں گے، عبادت گزار بندوں کے لئے اس میں ایک بڑا پیغام ہے)۔

جہاں تک دشمنوں سے ولاء ووفاداری کی بات ہے تو یہ ایک واقعی اور حقیقی نقصان ہے، اور اس سے سوائے شر اور برائی کے اور کوئی چیز حاصل نہیں ہوسکتی، اسی لئے اللہ تعالی نے دشمن کے ساتھ موالات وفاداری سے منع فرمایا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"یأیھا الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم أولیاء تلقون الیھم بالمودة وقد کفروا بما جاء کم من الحق"(سورہ ممتحنہ:۱)۔

(اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو، میرے اوپر اور خود اپنے اوپر دشمنوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، تم دوستی سے ان کی طرف پیغام بھیجتے ہو اور وہ اس حق کے ساتھ جو تمہارے پاس آچکا ہے کفر کرتے ہیں)۔

نیز اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ومن یتولھم منکم فانه منھم ان الله لایھدی القوم الظالمین"(سورہ بقرہ:۱۹۰)۔

(تم میں سے جو بھی ان میں سے کسی سے دوستی کرے وہ بے شک انہی میں سے ہے، ظالموں کو اللہ ہرگز راہ راست نہیں دکھاتا)۔

اور جو شخص اپنے ملک کے مفاد اور اپنے وطن کی مصلحت کے خلاف دشمنوں سے معاہدہ کرتا ہے تو وہ اپنے ملک اور وطن کے حقوق میں خیانت کرنے والا اور کوتاہی کرنے والا شمار کیا جاتا ہے، اور ہر خائن کو تاریخ باہر نکال دیتی ہے، اور وہ سزا کا مستحق قرار پاتا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"یأیھاالذین آمنوا لاتخونوا الله والرسول وتخونوا أماناتکم وأنتم تعلمون"(سورہ انفال:۲۷)۔

(اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے حقوق میں جانتے ہوئے خیانت مت کرو، اور اپنی قابل حفاظت چیزوں میں بھی خیانت مت کرو)۔

دوسری بات: وطن کا دفاع ایک مقدس فریضہ ہے، کیونکہ وطن ہر ایک کا ہے، اور بھلائی و برائی سب کو عام ہے، یہ دفاع جان و مال اور کائنات کی سب سے قیمتی شئی کی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے، اس وجہ سے ضروری ہے کہ جو شہری ہتھیار اٹھانے پر قادر ہو وہ جماعت پر فدا ہوجائے، اور سب کے لئے قربانی پیش کرے تاکہ تاریخ اسے معزز لوگوں کی صفحات میں جگہ دے، اور جب وہ تکلیف و مصیبت یا موت سے دوچار ہو تو زندہ وجاوید لوگوں میں شمار کیا جائے، شہداء کے مقام و مرتبہ کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ولاتحسبن الذین قتلوا فی سبیل الله أمواتابل أحیاء عندربھم یرزقون فرحین بمااتاھم الله من فضله"(سورہ آل عمران:۱۶۹۔۱۷۰)۔

(جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کئے گئے ہیں ان کو ہرگز مرہ نہ سمجھیں بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس، ان کو روزیاں دی جاتی ہیں)۔

دشمن کا مقابلہ یا تو جان سے ہوگا یا مال سے یا زبان سے یعنی (ذرائع ابلاغ کی جنگ) کیونکہ نبی پاک علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"جاھدوا المشرکین بأموالکم وأنفسکم وألسنتکم"(سنن ابی داؤد، مسند احمد، سنن بیہقی، صحیح ابن حبان)۔

(مشرکین سے اپنے مال، جان اور زبان سے جہاد کرو)۔

اور جب شہری دفاع کے فریضہ سے دستبردار ہوجائے گا تو اسی پر فدیہ یا ٹیکس دینا لازم ہوگا جسے قرآن کریم میں جزیہ کا نام دیا گیا ہے، اور جو سال میں ایک دینار ہے، چنانچہ اگر وہ خود جہاد کرے گا یا جہاد سے عاجز ہوجائیگا تو اس صورت میں اس

سے اور اس جیسے لوگوں سے یہ فدیہ یا جزیہ ساقط ہوجائے گا۔

تیسری بات: حکومت کے نظام ودستور کا احترام:

اسلام نے ہر شہری پر عہد و پیمان اور حاکم کی بیعت کا لحاظ کرنا ضروری قرار دیا ہے، اسی طرح امت کے مفاد کا تحفظ کرنا اور اپنی دینی، اجتماعی، حفاظتی، اقتصادی، صحت اور ثقافت سے متعلق ذمہ داریوں کا ادا کرنا لازم ہے، کیونکہ اس سے امن وامان قائم ہوتا ہے، آپسی برتاؤ کے نظام کی حفاظت ہوتی ہے، اور اس کے نتیجہ میں امت کی اقتصادی ترقی ہوتی ہے، اور خوشحالی آتی ہے، لاقانونیت وبدنظمی کا خاتمہ ہوتا ہے، فساد وانتشار کی بیخ کنی ہوتی ہے، اور پسماندگی وتخریب کے تمام اسباب ومظاہر کا ازالہ ہوجاتا ہے۔

چوتھا مقصد: شہریت کے حقوق، قرآن وحدیث کی روشنی میں:

شہریت کے حقوق قرآن وسنت کی روشنی میں شہریت کے فرائض سے کہیں زیادہ ہیں، اور یہ حقوق بڑی حد تک عالمی معاہدہ نامے میں دئے گئے شہریت کے بنیادی وضمنی حقوق سے بڑھ کر ہیں، ان میں سے بعض اہم حقوق درج ذیل ہیں:

پہلا حق: مذہبی وغیر مذہبی آزادی:

اسلام نے کسی کو اسلام میں داخل ہونے پر مجبور کرنے سے منع کیا ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”**لاإکراہ فی الدین قدتبین الرشدمن الغی**“(سورہ بقرہ:۲۵۶)۔

(دین میں کوئی زبردستی نہیں ہے، ہدایت گمراہی سے روشن ہوچکی ہے)۔

اللہ تعالی اپنے رسول ﷺ کو تبدیلی مذہب پر کسی بھی طرح دباؤ ڈالنے یا زبردستی کرنے سے منع کرتے ہوئے مخاطب فرمایا ہے (اس اعتبار سے کہ آپ امت کے قائد ہیں، اور آپ کو خطاب کرنا پوری امت کو خطاب کرنا ہے) چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”**ولوشاء ربک لآمن من فی الارض کلھم أجمعین أفانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین**“(سورہ یونس:۹۹)۔

(اگر آپ کا رب چاہتا تو روئے زمین کے سب ایمان لے آتے، تو کیا آپ لوگوں پر زبردستی کرسکتے ہیں، یہاں تک کہ وہ مومن ہی ہوجائیں)۔

ایسا اس لئے ہے کہ ہدایت اور اسلام کے بارے میں شرح صدر کا ہونا اللہ کی توفیق پر موقوف ہے، کیونکہ اللہ کو معلوم ہے کہ کس کے اندر حق قبول کرنے اور باطل کو رد کرنے کی کتنی استعداد ہے، چنانچہ اللہ سبحانہ وتعالی کا ارشاد ہے:

”**وألف بین قلوبھم لوانفقت مافی الارض جمیعاماالفت بین قلوبھم ولکن اللہ ألف بینھم**“(سورہ

انفال:۶۳)۔

(ان کے دلوں میں باہمی الفت بھی اسی نے ڈالی ہے، زمین میں جو کچھ ہے اگر تو سارا کا سارا بھی خرچ کر ڈالتا تو بھی ان کے دل آپس میں نہ ملا سکتا، یہ تو اللہ نے ان کے دلوں میں الفت ڈال دی)۔

قرآن کریم نے آزادی مقرر کرنے میں صرف عقیدہ کی آزادی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اسلام نے اپنے سیاسی طریقہ کار میں عام نظام کے قواعد کو چھیڑ چھاڑ کئے بغیر تمام قسم کی آزادی کو شامل کیا ہے، مثلاً تنقید واعتراض کی آزادی، نقل وحرکت کی آزادی، کام کاج کی آزادی، دینی شعائر کو بجالانے کی آزادی، حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

"وإنمابذلوا الجزية لتكون أموالهم كأموالنا ودمائهم كدمائنا" (صحیح البخاری، ج۲، ص:۸۷)۔

(ان لوگوں نے تو جزیہ اس لئے دیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح اور ان کی جانیں ہماری جانوں کی طرح ہو جائیں)۔

اور فقہاء معاہدہ کرنے والے اہل ذمہ کے حقوق کے بارے میں فرماتے ہیں:

"لهم مالنا وعليهم ماعلينا"۔

ان کے بھی وہی حقوق ہیں جو ہمارے ہیں، اور ان کی بھی وہی ذمہ داریاں ہیں جو ہماری ہیں۔

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے تمام معاہدے اس بات کی صراحت کرتے ہیں کہ بغیر کسی اعتراض اور چھیڑ چھاڑ کے غیر مسلموں کو اپنے دینی امور ومعاملات انجام دینے کی اجازت ہوگی، اور ان کی آزادی کو تسلیم کیا جائے گا، جیسے نجران کے نصاری سے رسول اللہ ﷺ کا معاہدہ ہوا، جن کو آپ نے مسجد نبوی میں ٹھہرایا، جب وہ آپ ﷺ کے مہمان بنکر آئے، اس معاہدہ نامہ میں درج ہے:

نجران اور اس کے اطراف والوں کے لئے اللہ کی پناہ اور محمد جو اللہ کے رسول ہیں، ان کا ذمہ ہے، ان کے مال وجان، زمین وملت، غائب وحاضر، خاندان وعبادت خانے اور ہر قلیل وکثیر کی حفاظت پر جو ان کے زیر ملکیت وزیر تصرف ہیں، کسی پادری کو اس کے عہدہ سے، کسی راہب کو اس کی رہبانیت سے، اور کسی کاہن کو اس کی کہانت سے برخاست نہیں کیا جائے گا، ان پر زمانہ جاہلیت کی نہ تو دیت ہوگی نہ خون ہوگا، نہ ان کو نقصان پہونچایا جائے گا، اور نہ ہی تنگی میں مبتلا کیا جائے گا، نہ ہی ان کی سرزمین پر کوئی لشکر چڑھائی کرے گا، ان میں جو بھی کوئی حق مانگے گا تو ان کے درمیان برابر تقسیم کیا جائے گا، نہ ان کو ظلم کرنے دیا جائے گا اور ان پر ظلم کیا جائے گا (اخبار عمر، از علی طنطاوی، ص:۱۵۵)۔

اسی طرح بیت المقدس کے فتح ہونے کے بعد حضرت عمر اور بیت المقدس کے باشندوں کے درمیان مقام جابیہ میں طے ہونے والا معاہدہ عمریہ ہے جس میں ان کے مال وجان اور کنیسہ وصلیب کی حفاظت وامان سے متعلق ضمانت دی گئی

ہے،اسی طرح حضرت خالد بن ولید کے حیرہ اورحمص کے باشندوں سے اورحضرت عمرو بن عاص نے شہنشاہ مقوقس اور مصر کے قبطیوں سے اسی طرح کے معاہدوں پر صلح کی۔

اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے حقوق میں سے یہ ہیں کہ وہ اپنے خاندان وعائلی مسائل جیسے شادی بیاہ، فسخ وطلاق وغیرہ کو اپنے دین کے مطابق انجام دینے میں آزاد ہوں گے،اورجس چیز کو وہ حلال سمجھتے ہیں جیسے شراب اور خنزیر توان چیزوں کے استعمال پر ان کو سزا نہیں دی جائے گی۔

ان بلندوعالی مثالوں میں وہ نوآیتیں بھی ہیں جوحقوق انسانی اورزرہ چرانے کے الزام سے ایک یہودی کی براءت کے بارے میں نازل ہوئیں، جسے اطعمہ بن ابیرق نے اپنے ایک پڑوسی قتادہ نعمان کے گھر سے چرایا تھا،اوراس نے اوراس کے خاندان والوں نے اس زرہ کی چوری کا الزام زید بن سمین نامی یہودی کے سرتھوپنا چاہا، یہ آیتیں درج ذیل ہیں:

"**اناانزلناالیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بماأراک الله ولاتکن للخائنین خصیما**"(سورہ بنا:۲۴)۔

(یقیناً ہم نے تمہاری طرف حق کے ساتھ اپنی کتاب نازل فرمائی ہے تاکہ تم لوگوں میں اس چیز کے مطابق فیصلہ کرو جس سے اللہ تعالی نے تم کوشناسا کیا ہے،اورخیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بنو)۔

اوراگر غیر مسلم معاہدافراد ہم مسلمانوں کے پاس اپنے مقدمات لے کرآنا چاہیں توان کواسلامی عدالتوں میں مقدمات لے جانے اورفیصلہ کرانے کی آزادی حاصل ہے،اوران کے تعلق سے حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا واجب ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**فان جاؤک فاحکم بینھم أو أعرض عنھم وان تعرضواعنھم فلن یضروک شیئاوان حکمت بینھم فاحکم بینھم بالقسط ان الله یحب المقسطین**"(سورہ مائدہ:۴۲)۔

(اگر یہ تمہارے پاس آئیں توتمہیں اختیار ہے خواہ ان کے آپس کا فیصلہ کردیا کرو یاان کوٹال دو،اگرتم ان سے منہ پھیروگے توبھی یہ تم کو ہرگز کوئی ضرر نہیں پہونچاسکتے،اوراگر فیصلہ کروتوان میں عدل کے ساتھ فیصلہ کرو، یقیناً عدل کرنے والوں کے ساتھ اللہ محبت رکھتا ہے)۔

دوسرا حق: انسانی عزت وکرامت کا حق

اللہ تعالی نے ہرانسان کوخواہ مسلمان ہو یاغیر مسلم مکرم وباعزت بنایا ہے،اس لئے کہ وہ بھی اللہ کی صناعت اوراس کی مخلوق ہے، اللہ تعالی انسان کے وصف کو بیان کرتے ہوئے ارشادفرماتے ہیں:

"**لقدخلقناالانسان فی أحسن تقویم**"(سورہ تین:۴)۔

(ہم نے انسان کو بہترین صورت میں پیدا کیا)۔

حق تعالی نے جنس بشر وانسان کی تکریم کو قرآن کریم میں اس طرح واضح کیا ہے:

"ولقد کرمنابنی آدم وحملناهم فی البروالبحرورزقناهم من الطیبات وفضلناهم علی کثیرممن خلقناتفضیلا" (سورہ اسراء:۷۰)۔

(یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی، انہیں خشکی وتری کی سواریاں دیں، اور انہیں پاکیزہ چیزوں کی روزیاں دیں اور اپنی بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا فرمائی)۔

اسی تکریم الٰہی کے مظاہر میں سے یہ ہے کہ اللہ نے تمام فرشتوں کو ہمارے باپ حضرت آدم کے لئے سجدہ کرنے کا حکم دیا، ارشاد باری تعالی ہے:

"واذقلناللملائکة اسجدوالآدم فسجدواالاابلیس أبی" (سورہ طہ:۱۱۶)۔

(اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کیا، اس نے انکار کیا)۔

قرآن کریم میں یہ اور اس طرح کی دیگر آیتیں انسانی جان کے احترام کے وجوب پر مطلقا دلالت کرتی ہیں، خواہ زندگی کی حالت ہو یا مرنے کے بعد کی حالت ہو، اور ہم اوپر جان چکے ہیں کہ اسلام نے ایک آیت میں انسانی وحدت کی دعوت دی ہے:

"یأیهاالناس اتقواربکم الذی خلقکم من نفس واحد" (سورہ نساء:۱)۔

(اے لوگو! ڈرو اپنے اس پروردگار سے جس نے تم کو ایک اکیلی جان سے پیدا کیا)۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالی نے مختلف قبائل اور قوموں کی آپسی ملاقات کو تعارف کی غرض سے واجب قرار دیا ہے، نہ ناپسندیدگی، باہمی اختلاف اور کشمکش کی غرض سے:

"یاأیهاالناس انا خلقناکم من ذکروأنثی وجعلناکم شعوباوقبائل لتعارفوا" (سورہ حجرات:۱۳)۔

(اے لوگو! بے شک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کردیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو)۔

حجۃ الوداع کے خطبہ نے اس کی مزید تائید کردی:

"یاأیهاالناس ان ربکم واحدوان أباکم واحد" (مسند احمد بن حنبل، ج ۱۲، ص:۲۲۶)۔

(اے لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ بھی ایک ہے)۔

قرآن کریم نے غیر مسلموں کے ساتھ بحث ومناظرہ کرنے میں اس بات کو لازم قرار دیا ہے کہ یہ جدال ومناظرہ

اچھے انداز میں ہو، ارشاد باری ہے:

"ولاتجادلوا أهل الكتاب الابالتی هی أحسن" (سورہ عنکبوت:۴۶)۔

(اور اہل کتاب کے ساتھ بحث ومباحثہ نہ کرو، مگر اس طریقہ پر جو عمدہ ہو)۔

قرآن کریم نے جھگڑے واختلافات اور مسائل ومشکلات پیدا کرنے اور کشمکش برپا کرنے سے روکنے کی خاطر مشرکوں اور بت پرستوں کے معبودوں کو برا بھلا کہنے کی اجازت نہیں دی ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

"ولاتسبوا الذین یدعون من دون الله فیسبوا الله عدوا بغیر علم" (سورہ انعام:۱۰۸)۔

(اور گالی مت دو ان کو جن کو یہ لوگ اللہ تعالی کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہیں، کیونکہ پھر وہ جہل کی وجہ سے حد سے گزر کر اللہ تعالی کی شان میں گستاخی کریں گے)۔

تکریم انسانیت اور احترام آدمیت کے واقعات میں سے ایک واقعہ یہ ہے کہ جب ایک یہودی کا جنازہ جا رہا تھا تو رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوگئے، آپ سے کہا گیا کہ یہ تو ایک یہودی کا جنازہ ہے، تو آپ نے فرمایا: ألیست نفسا کیا وہ انسانی جان نہیں ہے۔

اور جب بھی رسول اللہ ﷺ کسی میت کی نعش کے پاس سے گزرتے تو تکریم انسانی کی خاطر اس کو دفن کرنے کا حکم دیتے۔

حضرت عمر بن الخطاب نے حضرت عمرو بن العاص کے بیٹے اور خود حضرت عمرو بن العاص سے صرف اسی لئے قصاص لیا کہ اول الذکر نے ایک قبطی کو جب اس کا گھوڑا آگے بڑھ گیا تھا یہ کہتے ہوئے کوڑا مارا کہ "انا ابن الاکرمین" میں معزز باپ کا بیٹا ہوں، پھر انہوں نے حضرت عمرو بن العاص حاکم مصر کے سر پر کوڑے مارے، اس لئے کہ بیٹے نے باپ کے اثر ورسوخ کا فائدہ اٹھایا تھا، اور پھر قبطی سے مخاطب ہوکر حضرت عمر بن الخطاب نے کہا: "یہ درہ لو اور معزز باپ کے بیٹے کو مارو" پھر حضرت عمر نے کہا "یہ درہ عمرو بن العاص کے سر پر مارو" کیونکہ خدا کی قسم ان کے بیٹے نے تمہیں ان ہی کے دبدبے کی وجہ سے مارا، پھر حضرت عمرو بن العاص سے مخاطب ہوکر کہا:

"یاعمرو متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا"

(اے عمرو! تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنالیا ہے، حالانکہ ان کی ماؤں نے تو انہیں آزاد جنا تھا)۔

قرآن کریم میں دوسروں کی رائے کے احترام اور ان کو حق جاننے اور اس کے رائے کو سمجھنے کے لئے غور وفکر کی دعوت دینے اور انسان کی عزت وکرامت کی حفاظت کی خاطر گفتگو اور مباحثہ کے آداب کو ملحوظ رکھنے کی بلند مثالیں اور عمدہ نمونے وآداب موجود ہیں، جن کو قرآن نے اس آیت میں بیان کیا ہے:

"قل من یرزقکم من السموات والارض قل الله واناوایاکم لعلی هدی أو فی ضلال مبین"(سورہ سبا:۲۴)۔

(اے نبی ﷺ پوچھئے کہ تمہیں آسمان وزمین سے روزی کون پہونچاتا ہے،خود جواب دیجئے کہ اللہ تعالی،سنو ہم یا تم یاتو یقیناً ہدایت پر ہیں یا کھلی گمراہی میں ہیں)۔

علامہ زمخشری کہتے ہیں:

یہ ایسا منصف کلام ہے کہ ہر شخص جو اس کو سنے گا خواہ وہ دوست یا دشمن وہ اس کلام کے مخاطب سے کہہ پڑے گا: تمہارے دوست نے تمہارے ساتھ انصاف کیا،جیسے کوئی آدمی اپنے دوست سے کہے: اللہ جانتا ہے کہ ہم میں سے اور تم میں سے سچا کون ہے اور بے شک ہم میں سے ایک جھوٹا ہے۔

تیسرا حق: نجی اور ذاتی ملکیت کا حق

انسانی جان ومال (ملکیت) کی حفاظت کا حق مقاصد شریعت کا ایک بنیادی مقصد ہے،چنانچہ ملک ووطن میں رہنے والے کسی بھی انسان پر زیادتی حرام ہے،خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم،ملک کا شہری ہو یا کسی اور ملک سے آنے والا،اس لئے کہ اسلام میں خون کی حرمت کو بڑی عظمت حاصل ہے،سوائے اس کے کہ کوئی کسی خیانت کا مجرم ہو،جیسے قصاص یا حد نافذ کرنا،اس کا مقصد بھی امن وسلامتی اور استقرار کی حفاظت ہے،اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وماکان لمومن أن یقتل مومناالاخطا"(سورہ نساء:۹۲)۔

(کسی مومن کے لئے یہ درست نہیں ہے کہ وہ دوسرے مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے)۔

اس میں آیت میں لفظ 'مومنا' سے صرف مومن ہی نہیں غیر مومن بھی مراد ہے، پھر اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ومن یقتل مومنامتعمدا فجزاء ه جهنم خالدا فیهاوغضب الله علیه ولعنه وأعدله عذاباعظیما"(سورہ نساء:۹۲-۹۳)۔

اور جو کوئی کسی مومن کو قصداً قتل کر ڈالے اس کی سزا دوزخ ہے،جس میں وہ ہمیشہ رہے گا،اس پر اللہ تعالی کا غضب ہے،اور اسے اللہ تعالی نے لعنت کی ہے،اور اس کے لئے بڑا عذاب تیار کیا ہے۔

نیز اللہ تعالی کا یہ بھی فرمان ہے:

"من أجل ذلک کتبناعلی بنی اسرائیل أنه من قتل نفسا بغیرنفس أو فساد فی الارض فکأنماقتل الناس جمیعاومن أحیاهافکانماأحیاالناس جمیعا"(سورہ مائدہ:۳۲)۔

(اسی وجہ سے ہم نے بنی اسرائیل پر یہ لکھ دیا کہ جو شخص بھی بغیر اس کے کہ وہ کسی کا قاتل ہو یا زمین میں فساد مچانے

والا ہو قتل کر ڈالے، تو گویا اس نے تمام لوگوں کو قتل کر دیا، اور جس شخص نے کسی ایک کی جان بچائی اس نے گویا تمام لوگوں کو زندہ کر دیا)۔

ہم نے اسلام کی طرح کسی مذہب کو ایسا نہیں پایا جو ایک جان کے قتل کو تمام انسانوں کے قتل کے برابر قرار دیتا ہے، اور ایک جان بچانے کو تمام لوگوں کی جان بچانے کے برابر قرار دیتا ہے، اور مال بھی روح کا قرین اور ساتھی ہے، حجۃ الوداع کے خطبہ میں بھی اس کا ذکر ہے جو خطبہ ایک عام اور دائمی میثاق ہے:

"إن دمائكم وأموالكم وأعراضكم عليكم حرام كحرمة يومكم هذافی بلدكم هذافی شهركم هذا" (صحیح البخاری، ج ۲،ص:۱۹۱)۔

(بے شک تمہارا خون، تمہارے مال، تمہاری آبرو اسی طرح تم پر حرام ہے جس طرح آج کے اس دن کی حرمت ہے، تمہارے اس شہر میں تمہارے اس مہینہ میں)۔

غیر مسلموں کا خون، ان کی عزت وآبرو اور ان کے مال بھی مسلمانوں کی طرح ہیں، چنانچہ ان پر زیادتی اور دست درازی جائز نہیں ہے، یہ بات سنت نبویہ کے عین مطابق ہے اور تاریخ میں ثابت شدہ حقیقت ہے، محدثین نے روایت کیا ہے کہ ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا، رسول اللہ ﷺ کے پاس اس کا مقدمہ لایا گیا، تو آپ ﷺ نے فرمایا: 'ان أحق من أوفى بذمته' میں اس کا زیادہ حق دار ہوں جو اپنے عہد کو پورا کرے، پھر آپ ﷺ نے اس کے قتل کا حکم دیا چنانچہ اس مسلمان قاتل کو قتل کر دیا گیا، خلفاء راشدین بھی اسی راستہ پر گامزن رہے، بطور خاص حقیقی اور واقعی صورت میں حضرت عمر اور حضرت علی کے عہد میں۔

البتہ جہاں تک جہاد کا تعلق ہے تو وہ بھی زیادتی وجارحیت کا جواب دینے کے لئے ایک استثنائی قانون وشریعت ہے، جس طرح قدیم وجدید زمانہ میں قانونی جنگ کے بقیہ اصول وقواعد رہے ہیں۔

جہاد کی مشروعیت کے حالات درج ذیل ہیں:

۱۔ زیادتی وجارحیت کا جواب دینا: چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وقاتلوا فی سبيل الله الذين يقاتلونكم ولاتعتدوا ان الله لايحب المعتدين" (سورہ بقرہ:۱۹۰)۔

اور لڑو اللہ کی راہ میں ان سے جو تم سے لڑتے ہیں، اور زیادتی نہ کرو، اللہ تعالی زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔

۲۔ کمزوروں اور مظلوموں کی مدد کرنا: اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"ومالكم لاتقاتلون فی سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنساء والولدان" (سورہ نساء:۷۵)۔

(بھلا کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ناتواں مردوں اور عورتوں اور ننھے منھے بچوں کے چھٹکارے کے لئے جہاد نہ کرو)۔

۳۔دعوت کی آزادی سلب کرلی جائے یا داعیوں کو قتل کردیا جائے، یا مسلمانوں کو ان کے دین سے ہٹا دیا جائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وأن الله على نصرهم لقدير**"(سورہ حج:۳۹)۔

(جن مسلمانوں سے کافر جنگ کررہے ہیں انہیں مقابلے کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ مظلوم ہیں اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے)۔

اسلامی حکومت میں امان مسلمانوں، دائمی طور پر معاہدہ کرنے والے ذمیوں اور امان حاصل کرکے اسلامی ممالک میں داخل ہونے والے مستامن کو یکساں طور پر حاصل ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**وان أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مامنه ذلك بأنهم قوم لايعلمون**"(سورہ توبہ:۶)۔

(اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ طلب کرے تو اسے پناہ دے دے، یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے، پھر اسے اپنی جائے امن تک پہونچا دے، یہ اس لئے کہ یہ لوگ بے علم ہیں)۔

چوتھا حق: عدل وانصاف کا حق:

اسلام نے لوگوں کے درمیان حق، انصاف اور عدل کے ذریعہ بغیر کسی جانب داری اختیار کئے ہوئے یا ذمی کے خلاف مسلمانوں کی طرف مائل ہوئے یا مسلمان کے خلاف اہل ذمہ کی طرف مائل ہوئے فیصلہ کرنا واجب قرار دیا ہے، اس لئے کہ اسلام حق اور عدل کا مذہب ہے، اور عدل وانصاف کی بدولت آسمان وزمان کا نظام قائم ہے، عدل وانصاف حکومت کی بنیاد ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

"**إن الله يأمركم أن تودوا الامانات الى أهلهاواذا حكمتم بين الناس أن تحكموابالعدل ان الله نعمايعظكم به ان الله كان سميعا بصيرا**"(سورہ مائدہ:۴۲)۔

(اللہ تعالی تمہیں تاکیدی حکم دیتا ہے کہ امانت والوں کی امانتیں انہیں پہونچادو، اور جب لوگوں کا فیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے فیصلہ کرو، یقیناً وہ بہتر چیز ہے جس کی نصیحت تمہیں اللہ تعالی کررہا ہے، بے شک اللہ تعالی سنتا ہے دیکھتا ہے)۔

کسی بھی حال میں قاضی کے لئے عدل وانصاف کے قاعدہ سے ہٹنا جائز نہیں ہے، یہانتک کہ دشمنوں کے ساتھ بھی نہیں، اللہ سبحانہ وتقدس کا ارشاد ہے: "**ياأيهاالذين آمنوا كونوا قوامين لله شهداء بالقسط ولايجرمنكم شنان**

قوم علی الا تعدوا اعدلوا ھوأقرب للتقوی واتقوا اللہ ان اللہ خبیر بماتعملون" (سورۂ مائدہ:۸)(اخبارالقضاۃ، از وکیع، ج ۲،ص:۲۰۰)۔

منصفانہ وعادلانہ فیصلے کے واقعات میں سے ایک وہ واقعہ ہے جو حضرت علیؓ اور ایک یہودی کے درمیان ایک زرہ کی ملکیت کے سلسلہ میں قاضی شریح کے سامنے پیش آیا، جب اثبات ملکیت کے شواہد پورے نہ ہوسکے، چنانچہ قاضی شریح نے حضرت حسن کی شہادت کوان کے باپ حضرت علی کے حق میں قبول کرنے سے انکار کردیا اور یہودی کے حق میں زرہ کا فیصلہ کیا، یہ دیکھ کراس یہودی نے برجستہ کہا کہ امیرالمومنین نے مجھے اپنے قاضی شرع کے سامنے پیش کیا اورانہی کے قاضی نے ان کے خلاف فیصلہ کردیا، میں گواہی دیتاہوں کہ یہ دین دین حق ہے، اور میں شہادت دیتاہوں کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبودنہیں اور یہ کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، اوراے امیرالمومنین یہ زرہ آپ ہی کا ہے، جورات میں آپ سے گرگیا تھا (اخباردمشق، از:ابن عساکر، ج ۵،ص:۳۵۸)۔

غیرمسلموں کے ساتھ عدل وانصاف کی بہت سی مثالیں ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب عباس بن ولید بن عبدالملک نے اہل حمص کی ایک معاہد (ذمی) کی زمین پر غاصبانہ قبضہ کرلیا تھا جسے ولید نے عباس کوقانونی طور پر دے دیا تھا، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز نے اس زمین کے بارے میں معاہد کے حق میں فیصلہ کیا اور کہا "اللہ کی کتاب ولید بن عبدالملک کی تحریر سے زیادہ حق رکھتی ہے کہ اس کی پیروی کی جائے، اے عباس! اٹھواوراس ذمی کی جائیداداس کوواپس کرو، چنانچہ انہوں نے وہ زمین اس ذمی کوواپس کردی۔

اسی طرح حضرت عمر بن عبدالعزیز نے سپہ سالارقتیبہ بن مسلم کوحکم دیا کہ وہ سمرقند کے علاقے سے اپنے لشکر کے ساتھ باہرآجائیں، کیونکہ وہ بغیرجنگی وارننگ واطلاع کے وہاں داخل ہوگئے تھے، چنانچہ اس کے نتیجہ میں سمرقند کے بہت سے باشندے مسلمان ہوگئے (الکامل، از:ابن الاثیر، ج ۵،ص:۴۴، فتوح البلدان، از:بلاذری)۔

اسی طرح قرآنی طرزعمل اورعملی کردارکوجوچیزمزید موکدکرتی ہے وہ سنت نبویہ میں موجودعدل وانصاف کے اصول کی پابندی سے متعلق قطعی تعلیمات ہیں، ان میں سے ایک وہ روایت ہے جس کی تخریج امام داؤدوامام بیہقی نے رسول اللہ ﷺ سے کی ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ألا من ظلم معاھداأو انتقصہ أوکلفہ فوق طاقتہ أوأخذ شیئابغیرطیب نفس منہ فاناحجیجہ یوم القیامۃ"۔

(خبردارجوکوئی کسی معاہد پرظلم کرے گایااس کی تنقیص کرے گایاس کواس کی طاقت سے زیادہ کامکلف بنائے گایااس کی طیب نفس کے بغیراس سے کوئی چیز لے گاتومیں قیامت کے دن اس پرحجت قائم کروں گا)۔

پانچواں حق: مساوات وبرابری کا حق:

عام عہدوں اور ملازمت میں معاہدہ کے ساتھ رہنے والے غیر مسلموں کو مسلمانوں کے ساتھ یکساں حقوق حاصل ہیں، البتہ اکثریت کے رجحان کی ترجمانی کرنے والے بعض مخصوص حالات کے پیش نظر بعض اہم عہدوں جیسے صدر مملکت کا عہدہ یا انتہائی حساس عہدے جیسے فوج کی قیادت کا عہدہ اس سے مستثنیٰ ہیں، جیسا کہ موجودہ دنیا کی حکومتوں اور سلطنتوں میں متعارف ہے۔

مذکورہ عہدوں کے علاوہ دیگر تمام عہدوں میں معاہد غیر مسلم باشندوں کے حقوق وفرائض میں مساوات کے حق سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، خواہ کسی قسم کی زیادتی سے مکمل تحفظ کا حق ہو، یا زندگی گزارنے، مذہبی آزادی کے ساتھ رہنے، اپنے مخصوص شعائر کو انجام دینے اور دیگر کسی بھی نوعیت کی آزادی کا حق ہو، قانون کے سامنے انہیں مساوات کا حق حاصل ہے، ملک کی قومیت سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے، اسی کے ساتھ انہیں اپنی خاص زبان استعمال کرنے میں آزادی کا حق حاصل ہے، اور انہیں یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کے ساتھ مدغم نہ ہوں، اور عائلی مسائل جیسے نکاح، طلاق، وغیرہ میں اپنے مخصوص احکام اور طریقے کو نافذ کرنے اور ان پر عمل کرنے میں انہیں پوری آزادی حاصل ہے۔

علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں:

اگر وہ لوگ جزیہ دینے کو قبول کرلیں (اور وہ دفاع کا ٹیکس ہے جس کی تعداد قدرت رکھنے والے افراد پر ایک دینار ہے) تو ان کے لئے بھی وہ حقوق ہوں گے جو ہمارے لئے ہیں، اور ان کے اوپر بھی وہ ذمہ داریاں ہوں گی جو ہمارے اوپر ہیں، یعنی دوسروں کے ساتھ عدل وانصاف کرنا اور دوسروں سے عدل وانصاف کو حاصل کرنا، اس کا مطلب ہے کہ ہمارے اوپر بھی ان کے حقوق ہیں، اور ان کے اوپر بھی ہمارے حقوق ہیں، اگر ہم ان کے خون اور مال کے درپے ہوں یا وہ ہمارے خون اور مال کے درپے ہوں تو اس تعرض کے وقت ہم میں سے ایک دوسرے پر کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی۔

علامہ ماوردیؒ لکھتے ہیں:

جزیہ دینے کے نتیجہ میں انہیں دو طرح کے حقوق حاصل ہوں گے، ایک تو ان سے ہاتھ روک لینا (یعنی ان سے تعرض نہ کرنا) دوسرے ان کی حفاظت کرنا تاکہ وہ ہاتھ روک لینے کی وجہ سے مامون ہوجائیں اور حفاظت کی وجہ سے محفوظ ہوجائیں، حضرت نافع نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا: "**كان آخر ماتكلم به النبى ﷺ ان قال احفظوا فى ذمتى**" (الاحکام السلطانیۃ، از ماوردی، ص: ۱۳۸)۔

رسول اللہ ﷺ نے سب سے آخر میں جو بات ارشاد فرمائی وہ یہ کہ: "میری ذمہ داری کے بارے میں میری حفاظت کرنا"، یعنی میرے معاہدے کا پاس ولحاظ کرنا۔

مسلمانوں کے ساتھ ذمیوں کو جو مساوات و برابری کا حق دیا گیا ہے اس کی مثالوں میں سے ایک وہ ضابطہ ہے جو دیگر فقہاء کرام نے مقرر کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"إن أصل الحرب إذا أسروا أهل الذمة من دارالإسلام لايملكونهم لأنهم أحرار" (الاموال، از: ابو عبید، ص:۱۹۱)۔

(جنگ کا ضابطہ یہ ہے کہ جب مسلمان لشکر دارالاسلام کے ذمیوں کو گرفتار کریں گے تو وہ ان کے مالک نہیں ہوں گے، یعنی وہ ان کو غلام نہیں بنا سکیں گے کیونکہ وہ آزاد ہیں)۔

ان حقوق کی بنیاد رسول اللہ ﷺ کی عملی سنت ہے جیسا کہ طائف میں قبیلہ ثقیف کے لئے آپ ﷺ کے معاہدہ نامہ میں درج ہے، کہ اگر کوئی ثقیف کے خلاف کوئی اکسائے یا کوئی ظالم ان پر ظلم کرے، تو ان کے مال و جان کے سلسلہ میں ان کی بات نہیں مانی جائے گی، اور پیغمبر ﷺ اور تمام مومنین اس ظالم کے خلاف ان کی مدد کریں گے، اور لوگوں میں سے جنہیں یہ بات پسند ہو کہ وہ ان کے پاس جائے تو وہ ان پاس نہ جائے، اور بے شک بازار اور خرید و فروخت گھروں کے باہر صحنوں میں ہوگا، اور انہی میں سے بعض کو امیر بنایا جائے گا، بنو مالک کے لئے ان کے امیر ہوں گے، اور ان کے حلیفوں کے لئے ان کے امیر ہوں گے (اختلاف الفقہاء، از طبری، ص:۲۴۱)۔

یہ معاہدہ نامہ آج کے خودمختارانہ نظام حکومت سے بڑی مشابہت رکھتا ہے۔

جہاں تک ان کی جان و مال پر کسی بھی قسم کی زیادتی کے خلاف ان کے دفاع کا تعلق ہے تو یہ متفق علیہ حکم ہے (شرح البخاری از: قسطلانی، ج۵، ص:۲۲۵)۔

جویریہ بن قدامہ نے روایت کی ہے فرماتی ہیں کہ میں نے حضرت عمر بن خطاب کو فرماتے ہوئے سنا، اس وقت جب ہم نے امیر المومنین سے وصیت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا "میں تمہیں اللہ کے ذمہ (عہد) کے بارے میں وصیت کرتا ہوں، بے شک وہ تمہارے نبی کا بھی ذمہ ہے، اور تمہارے بچوں اور زیر پرورش لوگوں کی روزی ہے (شرح البخاری از: قسطلانی، ج۵، ص:۲۲۵)۔

بخاری کی روایت میں ہے کہ حضرت عمر بن خطاب نے اپنی وفات کے وقت جو گفتگو فرمائی ان میں سے یہ بات بھی تھی کہ "میں اپنے بعد ہونے والے خلیفہ کو رسول اللہ ﷺ کے ذمہ کی وصیت کرتا ہوں کہ ان کے عہد کو پورا کیا جائے، ان کے مقابل لوگوں سے قتال کیا جائے اور ان کو ان کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف نہ بنایا جائے (عمدۃ القاری، از عینی، ج۱۵، ص:۸۶، شرح البخاری از: قسطلانی، ج۵، ص:۲۲۵)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص کسی معاہد کو ناحق قتل کرے گا وہ

جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے محسوس کی جاتی ہے(تفسیر المنار، از شیخ رشید رضا، ج ۴، ص: ۴۷-۸۱)۔

معاہد کو بعض اوقات کسی عام عہدے سے روکنے کا معاملہ ایسا ہی ہے جیسے کسی مسلمان کو روکنا اور یہ مفاد عامہ کے پیش نظر اور با اختیار حاکم یعنی سربراہ مملکت یا مقنّنہ یعنی قانون ساز اداروں کے سربراہوں کے فیصلہ سے کیا جاتا ہے۔

حضرت عمر بن خطابؓ نے اپنے انتظامی دفاتر کے لئے روم کے نصاریٰ کو مقرر کیا تھا، اور ان کے بعد دونوں خلیفہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ اور ان کے بعد شاہان بنوامیہ اسی پر قائم رہے، یہاں تک کہ عبدالملک بن مروان نے ان دفاتر کو رومیوں سے عربوں کی طرف منتقل کیا، عباسی حکمرانوں اور دیگر مسلمان بادشاہوں نے حکومت کی بہت سی خدمات کو یہودیوں، عیسائیوں اور صابیوں کے سپرد کر رکھا تھا جن میں سے طبی خدمات اور تجرباتی سائنسی خدمت، اسی طرح سلطنت عثمانیہ نے اجنبی ممالک میں اپنے اکثر سفراء اور نمائندے عیسائیوں میں سے مقرر کئے تھے(الرسالۃ الخالدہ، از: پروفیسر عبدالرحمٰن عزام، ص: ۱۰۸)۔

اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلامی ممالک میں مستقل طور پر رہنے والے معاہد اور ذمی افراد دوسرے درجہ کے شہری نہیں ہیں جیسا کہ بعض کینہ پرور مستشرقین خیال کرتے ہیں، بلکہ وہ سب ایک ہی درجہ کے شہری ہوتے ہیں، اسی طرح یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی ممالک میں غیرمسلموں کے ساتھ طے پانے والے معاہدہ کا موجودہ زمانہ کے سامراجی نظام سے کسی طرح کا کوئی تعلق یا مشابہت نہیں ہے، اس لئے کہ اسلامی نظام آزادی، مساوات اور انسانیت کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے، جبکہ سامراجی نظام مغلوب اقوام سے آزادی سلب کرنے اور ان تمام چیزوں کو اپنے لئے مباح سمجھنے کی بنیاد پر قائم ہوتا ہے جو ان اقوام کی ملکیت ہیں اور جن پر سامراج کو فتح حاصل ہوتا ہے، غیرمسلموں کے ساتھ اس سلوک و برتاؤ کی بنیاد دراصل اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان ہے:

"لاینهاکم الله عن الذين لم يقاتلونكم فی الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطواالیهم ان الله يحب المقسطين، انماینهاكم الله عن الذين قاتلوكم فی الدين وأخرجوكم من دياركم وظاهروا على اخراجكم أن تودوهم ومن يتولهم فأولئک هم الظالمون"(سورۂ ممتحنہ:۸،۹-الاسلام ومسٹر سکوٹ، از محمد عبدہ، ص: ۳۰)۔

یہ بات قابل غور ہے کہ مستشرق مسٹر سکوٹ جو شیخ محمد عبدہ کے معاصر ہیں، ان کا خیال ہے کہ ذمہ کو مخصوص رہائش، لباس، اسباب معیشت اور طرز زندگی میں وہ آزادی حاصل نہیں تھی جو مسلمانوں کو حاصل تھی، لیکن اوپر جو وضاحت کی گئی ہے کہ ذمیوں کو مسلمانوں کے ساتھ مساوات کی بنیاد پر تمام حقوق حاصل تھے، اس سے ان کے اس دعویٰ کی تردید ہوجاتی

ہے،البتہ جہاں تک لباس میں یا اسلام کے معروف طریقہ پر سلام کرنے میں جو نہ اس کے سلام کا طریقہ ہے اور نہ ہی ان کا عرف ہے، جو بعض ظاہری فرق نظر آتا ہے وہ دراصل زمانہ ماضی کے خاص وقتی حالات اور عرفی احوال کے پیش نظر تھا۔

فقہائے حنفیہ کہتے ہیں کہ اہل ذمہ معاملات میں مسلمانوں کی طرح ہیں،اسلامی ممالک میں جو کام مسلمانوں کے لئے کرنا جائز ہے وہ ان کے لئے بھی جائز ہیں اور جو کام مسلمانوں کے لئے ناجائز ہیں وہ ان کے لئے بھی ناجائز ہیں (الفتاوی الخیریہ، ج۱ص:۹۲)۔

اوپر کی باتوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ذمی حکومت کے عام فیصلہ کے تابع ہوں گے،اوران پر بعض استثنائی معاملات جیسے عقائد، پرسنل لاء کے علاوہ میں اسلامی قانون نافذ ہوگا،ایسا اس لئے ہوگا کہ قانونی مرجع ہونے کی حیثیت تو اکثریت ہی کے قانون کو حاصل ہوگی، کیونکہ اسلامی شریعت کا نفاذ علاقہ پر ہوتا ہے نہ کہ کسی شخصیت پر،اور ذمی افراد بھی کامل درجے کے شہری شمار کئے جاتے ہیں،نہ کہ صرف سیاسی معاملات کے اعتبار سے رعایا،لہذا ان معاملات میں سے اسلامی قومیت بھی ہے (المدخل للفقہ الاسلامی،از: ڈاکٹر محمد سلام مدکور،ص: ۳۷۹)۔

چھٹا حق: حفاظت کا حق:

اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی سرزمین میں کسی بھی خارجی دشمن سے غیر مسلموں کو تحفظ فراہم کرے،اس لئے کہ ان کو ہر قسم کی ایذارسانی اور تکلیف پہنچانے والی چیزوں سے حفاظت ودفاع کا حق حاصل ہے،جس طرح مسلمانوں کو حاصل ہے،جیسا کہ اوپر بیان کیا جاچکا ہے۔

اس کی بہت سی مثالیں ہیں،جن میں سے ایک یہ ہے کہ حضرت ابوعبیدہ بن جراح نے ملک شام فتح کرتے وقت جزیہ دینے پر شام والوں سے صلح کی (جیسا کہ امام ابویوسف نے کتاب الخراج میں ذکر کیا ہے) تو جب اہل ذمہ نے اپنے ساتھ مسلمانوں کی وفاداری اور حسن سلوک دیکھا تو وہ مسلمانوں کے دشمنوں پر سخت ہوگئے،اوران کے خلاف مسلمانوں کے معاون ومددگار بن گئے، چنانچہ وہی لوگ رومیوں اوران کے بادشاہوں کے حالات اوران کی خبروں کی جاسوسی کرتے تھے،اور جب مسلمانوں پر رومیوں کی جانب سے خطرہ بڑھ گیا تو ابوعبیدہ بن جراح نے حمص اور دیگر علاقہ کے نصاری سے لیا گیا جزیہ وخراج واپس کرنے کا حکم دیا،لہذا مسلمانوں نے ان سے وصول کیا گیا مال ان کو واپس کردیا،یہ دیکھ کران لوگوں نے کہا''اللہ آپ لوگوں کو ہمارے پاس دوبارہ واپس لائے اوران پر آپ کو فتح دے،کیونکہ اگر وہ لوگ ہوتے (یعنی رومی ہوتے) تو وہ ہمیں کچھ بھی واپس نہیں کرتے، بلکہ دیگر باقی ماندہ مال بھی لے جاتے،اور ہمارے لئے کچھ بھی نہیں چھوڑتے''،اور حمص اور دیگر علاقے کے باشندوں کو صلیبیوں کی حکومت کے زوال سے دوبارہ یہ خوشی حاصل ہوئی۔

اگر دشمنوں کی طرف سے بعض ذمیوں کو قید کرلیا جائے تو مسلمانوں پر ان کا چھڑانا واجب ہے،اس کی بھی بہت سی

مثالیں ہیں،جن میں سے ایک یہ ہے کہ جب تا تاریوں کو ملک شام پر غلبہ حاصل ہوا تو شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے قیدیوں کی رہائی کے بارے میں قطلوشا سے گفتگو کے لئے خود تشریف لے گئے، تا تاری سپہ سالار نے ذمی قیدیوں کو چھوڑ کر مسلمان قیدیوں کی رہائی پر اتفاق کیا تو علامہ ابن تیمیہ نے کہا''ہم یہود و نصاری کے تمام قیدیوں کو چھڑائے بغیر راضی نہیں ہو سکتے، کیونکہ وہ ہمارے اہل ذمہ ہیں،اور ہم کسی بھی قیدی کو نہیں چھوڑے گے، چاہے وہ اہل ذمہ میں سے ہوں یا اہل ملت میں سے ،چنانچہ اس نے شیخ الاسلام کے اصرار اوران کی شدت کو دیکھ کر سب قیدیوں کو رہا کر دیا (غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی،از: ڈاکٹر یوسف القرضاوی،ص:۱۰)۔

یہ دراصل اہل ذمہ کے تعلق سے رسول اللہ ﷺ اور خلفاء راشدین کی وصیتوں سے حاصل ہونے والی روشنی ہے جیسا کہ اوپر گزرا،اس کا تقاضہ یہ ہے کہ ذمیوں کوایذا پہونچانے اوران کے ساتھ ظلم وزیادتی کرنے سے باز رہنا چاہیے،رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

''من آذى ذميافقدآذاني ومن آذاني فقدآذان الله'' (آثار الحرب فی الفقہ الاسلامی، دراسہ مقارنہ،ص:۷۰۸)۔

(جس نے کسی ذمی کو تکلیف پہونچائی اس نے مجھے تکلیف پہونچائی،اور جس نے مجھے تکلیف پہونچائی اس نے اللہ کو تکلیف پہونچائی)۔

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

''من آذى ذميافأناخصمه ومن كنت خصمه خصمته يوم القيامة'' (اس روایت کو خطیب نے اور علی القاری نے الاسرار المرفوعہ میں بیان کیا ہے، یہ ضعیف ہے)۔

جو کسی ذمی کو تکلیف پہنچائے گا تو میں اس کا فریق ہوں گا اور میں جس کا فریق ہوں گا تو قیامت کے دن اس کو مغلوب کر دوں گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا:

''ألا من ظلم معاهداأو كلفه فوق طاقته أو أخذشيئابغيرطيب نفسه منه فأنا حجيجه يوم القيامة'' (سنن البیہقی وغیرہ)۔

(خبردار! جو کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف بنائے گا یا اس کی طیب نفس کے بغیر اس کی کوئی چیز لے گا تو میں قیامت کے دن اس کا مدمقابل ہوں گے)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی بھی قسم کی تکلیف وایذاء سے غیر مسلم کی حفاظت ونگرانی کرنا اسلامی حکومت کی ایک بنیادی ذمہ داری ہے،علامہ قرافی فرماتے ہیں:

ذمہ اور عہد کا معاملہ ذمیوں کے تعلق سے ہم پر کچھ حقوق لازم کرتا ہے، کیونکہ وہ ہماری پناہ اور ہماری حفاظت میں ہیں، اور اللہ تعالی کے عہد اور اس کے رسول ﷺ کے عہد دین اسلام کے عہد میں ہے، چنانچہ جو بھی ان پر زیادتی کرے گا گرچہ زبان سے کسی تکلیف دہ بات کے ذریعہ یا ان میں کسی کی آبرو کے سلسلہ میں غیبت کے ذریعہ، یا کسی بھی قسم کی تکلیف کے ذریعہ، تو اس نے اللہ تعالی کے ذمہ، اس کے رسول کے ذمہ اور اسلام کے ذمہ کو ضائع کیا (کتاب الفروق، ج ۳، ص: ۱۴)۔

ساتواں حق: خصوصیات کے احترام کا حق:

مسلمان اپنے دین وشریعت کی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے اس قاعدہ کے مطابق کہ ''ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ ہم ان کو ان کے دین پر چھوڑ دیں'' غیر مسلموں کے ساتھ بہت بلند برتاؤ کرتے ہیں، چنانچہ اسلامی ملکوں میں مسلمان ان کو اپنے عقائد، مذاہب اور معاملات میں پوری طرح آزادی کے ساتھ رہنے کا حق دیتے ہیں، ان کو کسی بات پر تنگ نہیں کرتے ہیں، عقیدہ اور دینی ومذہبی شعائر ورسومات ادا کرنے میں یعنی عبادت وریاضت اور دیگر معاملات میں ان کے حقوق کا احترام کرتے ہیں، ان کو اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ وہ جن چیزوں کو مباح وجائز سمجھتے ہیں ان کو کھائیں اور پیئیں، جیسے نشہ آور اشیاء اور خنزیر کا گوشت کھانا، اپنے تہواروں اور مقدس ایام میں خوشی منانا، جنازہ میں شرکت ومشایعت کرنا، ایک دوسرے کی تعزیت کرنا، اس کے علاوہ دیگر تقریبات کا انعقاد کرنا اور اس میں ایک دوسرے کو تہنیتی پیغام اور مبارکبادی پیش کرنا، اسی طرح جن جن باتوں پر ان سے معاہدہ کیا گیا ہے ان اس کے علاوہ کسی اور بات پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، اور ان کاموں کا مکلّف نہیں بنایا جاسکتا ہے۔

وہ بقدر ضرورت اپنے کنیسوں اور عبادت خانوں کی مرمت وتعمیر کرنے میں بھی آزاد ہیں اور یہ تمام کام اسی دائرہ اور حدود میں کرسکتے ہیں جن کی اجازت موجودہ زمانہ کے مختلف قوانین میں طے شدہ آداب اور نظام عدل کے اصول وقواعد دیتے ہوں، چنانچہ انہیں اسلام کے بنیادی اصول اور مقدسات یعنی قرآن وحدیث، عقیدہ وعبادت، اخلاقی وتاریخی مسلمات میں سے کسی چیز کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے اور ٹھیس پہونچانے کا حق حاصل نہیں ہوگا، اسی طرح ان میں سے کسی چیز کے بارے میں بدزبانی یا استہزاء اور تمسخر کرکے دینی فتنہ وفساد بھڑکانے یا اسلامی اقدار، اس کی تاریخ وتہذیب پر زبان طعن دراز کرنے اور عزت وآبرو اور حرمت وکرامت پر دست درازی کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

آٹھواں حق: تعلیم وتعلم کا حق:

غیر مسلموں کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے دین اور اپنی تاریخ سے متعلق احوال وواقعات کو خود سیکھیں اور اپنے اسکولوں، گھروں اور کنیساؤں میں اپنے نوخیز بچوں کو اس کی تعلیم دیں، اس لئے کہ اسلام اس بات کی ترغیب دیتا ہے کہ مختلف قسم کے علوم وفنون حاصل کئے جائیں، ثقافتوں کو فروغ دیا جائے، تہذیب وتمدن اور بیداری ان تمام چیزوں کو فروغ

دیا جائے، جو معاشرہ کے لئے نفع بخش اور مفید ہوں، اس لئے کہ اس کا فائدہ پوری قوم کو پہونچے گا، اور پسماندگی کے حالات کو ختم کرنے میں اس کا اہم رول ہوگا، اس سے عزت ووقار میں اضافہ ہوگا، اور کرامت وشرافت کی حفاظت ہوگی، اس سے داخلی اور خارجی برائیوں اور زیادتیوں کو دور کیا جاسکے گا۔

اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ تعمیری، سنجیدہ اور بامقصد ڈائلاگ کیا جائے، اور بہتر طریقہ سے ان سے بحث ومباحثہ کیا جائے، جبکہ فتنہ بھڑکانا یا کشمکش برپا کرنا، کینہ، تعصب اور نفرت کی بیج بونا، یا وطن کی کرامت کے خلاف دشمنوں کی مدد اور ان کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کرنا مقصود نہ ہو، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"أدع الی سبيل ربک بالحكمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن" (سورہ نحل:۱۲۵)۔

بلکہ قرآن کریم نے اہل کتاب، یہود اور نصاری کے ساتھ ڈائیلاگ اور بات چیت کے مسئلہ پر صراحت کے ساتھ روشنی ڈالی ہے، چنانچہ ارشاد خداوندی ہے:

"ولاتجادلوا أهل الكتاب الابالتی هی أحسن إلا الذين ظلموا منهم وقولوا آمنابالذی أنزل الیناوأنزل إليكم وإلهناوإلهكم واحد ونحن له مسلمون" (سورہ عنکبوت:۴۶)۔

یہ بات بدیہی ہے کہ ان کو الحاد وزندقہ کی ترویج، مذہب پسندی کے مظاہر سے آزادی، یا اصول دین اور وحی الہی میں کسی بھی چیز پر طعن کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی، اور یہی بات خود مسلمانوں کے لئے بھی ہے، کیونکہ اسے مفید اور نفع بخش تعلیم شمار نہیں کیا جائے گا، بلکہ یہ تو تخریب وتفریق اور مشکلات ومسائل پیدا کرنا ہوگا، امن وامان کو عام کرنا اور استحکام برقرار رکھنے کے لئے وطنی وحدت کے تقاضے کی حفاظت کرنا ان کا بھی ضروری ہے، اس لئے کہ قوم کی ترقی اس بات پر منحصر ہے کہ آپس میں اعتماد واطمینان کی فضاء قائم کی جائے، اور آپسی گروہ بندیوں اور دھڑے بندیوں سے اوپر اٹھا جائے، جو جذبات کی یکسانیت اور قوم ووطن کی مصلحت کی حفاظت کو نقصان پہونچانے والی ہوں۔

نواں حق: اچھے برتاؤ اور حسن معاملہ کا حق:

حسن ظن اور اعتماد کی راہ ہموار کرنے کا تقاضہ یہ ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی اعتبار سے مشترک فضاء قائم کرنے کی جدوجہد کی جائے، اور دونوں ہی کے مشترک مفاد میں یہ بات ہوگی کہ دونوں جانب سے حسن سلوک اور اچھا برتاؤ ہو، یعنی دوستانہ ملاقات ہو، ہدیے تحفے کا تبادلہ ہو، اجتماعی عرف وعادت کے مناسب خوشگوار سلام ودعاء ہو، بیماروں کی عیادت کی جائے، ایسے تہواروں اور خوشی کے مواقع پر مبارکبادی پیش کی جائے جس میں بنیادی عقائد پر آنچ نہ آتی ہو، مصائب وآلام اور رنج وغم پر ہمدردی ومحبت کا معاملہ کیا جائے اور ایک دوسرے کی تعزیت کی جائے، کیونکہ یہ بھی حسن سلوک کا ایک حصہ ہے، اور معاملات میں اعتماد کا پختہ ماحول بنانے اور قوم ووطن کے لئے مشترکہ

بھلائی پیش کرنے کا حیات بخش فائدہ پوشیدہ ہے۔

اس کا سر چشمہ قرآن کریم کی وہ دو آیتیں ہیں جن کو اوپر بیان کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہیں:

"لاینھاکم الله عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم أن تبروھم وتقسطوا الیھم ان الله یحب المقسطین انماینھاکم الله عن الذین قاتلوکم فی الدین وأخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم أن تولواھم ومن یتولھم فأؤلئک ھم الظالمون" (سورہ ممتحنہ:۸۔۹)۔

اور یہ انتہائی اہم دو اجتماعی بنیادوں کی وضاحت ہے، اول نیکی و بھلائی، الفت ومحبت اور اچھے کام اور اعتماد کو عام کرنا، دوم: دشمنوں کے ساتھ تعاون وخیر خواہی کرنے اور ان سے مدد طلب کرنے کی بہر صورت مذمت کرنا۔

'بر' یعنی نیکی و بھلائی ایک مثبت قدم ہے جو اچھے برتاؤ کی فضیلت سے بڑھ کر ہے، بنی کریم ﷺ اہل کتاب کے مریضوں کی عیادت اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتے تھے، ان کے قرض کا لین دین کرتے تھے، اور ان کے تجار کے ساتھ تجارت کرتے تھے، ان کا استقبال کرتے تھے، ان کو اپنی مسجد میں بطور مہمان ٹھہراتے تھے، جیسا کہ آپ ﷺ نے نجران اور حبشہ کے عیسائیوں کے وفد کے ساتھ کیا۔

لفظ 'بر' کے معنی ومقصود کی تعین کرتے وقت بعض قدیم علماء نے اس کی کتنی عمدہ اور خوبصورت وضاحت کی ہے، چنانچہ علامہ قرافی فرماتے ہیں:

بر کا مطلب ہے کمزوروں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرنا، ان کے ضرورت مندوں کی حاجت پوری کرنا، ان کے بھوکوں کو کھانا کھلانا، ان کے ننگوں کو کپڑا پہنانا، ان کے ساتھ لطف ومہربانی کے طور پر نہ کہ خوف وذلت کے طور پر نرمی سے پیش آنا، اگر وہ پڑوس میں ہوں تو ان کی اذیت کے ازالہ پر قدرت کے باوجود ان کی اذیت کو برداشت کرنا، یہ سب کچھ ان کے ساتھ بطور مہربانی کے ہو نہ کہ خوف وطمع میں ہو، ان کے لئے ہدایت کی دعاء کرنا اور اس بات کی بھی دعا کرنا کہ وہ اہل سعادت میں بنا دیئے جائیں، ان کے تمام امور میں خواہ دینی ہو یا دنیوی ان کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرنا، جب کوئی ان کو اذیت پہونچانے کے درپے ہو تو اس کی حفاظت کرنا، ان کے مال وعیال، ان کی عزت وآبرو، اور ان کے تمام حقوق ومصالح کا خیال کرنا، ان سے ظلم کو دفع کرنے پر ان کے ساتھ تعاون کرنا، اور ان کو ان کے تمام حقوق تک پہونچانا (کتاب الفروق، ج۳، ص:۱۵، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: استوصوا باھل الذمة خیرا)۔

پوری تاریخ میں دائمی عمل کی صورت میں یہی رجحان برقرار رہا، اور مسلمان خلفاء اور حکام اور عامۃ المسلمین کے درمیان یہ ایک عام اور معمولی طریقہ کار اور طرز عمل بن گیا، خواہ مشرقی مما لک ہوں یا مغربی مما لک، اس وقت بھی مسلمانوں نے یہودیوں کے ساتھ اچھا معاملہ کیا جب وہ خود اندلس سے بھگائے جا رہے تھے، اور ان کا خاتمہ کیا جا رہا تھا، یعنی ان کے

ساتھ حفاظت وحمایت کا معاملہ کیا، اوران کوکسی قسم کا نقصان یا ضرر پہونچنے نہ دیا، آرنولڈ نے اپنی کتاب 'دعوت اسلام' (The Preaching of Islam) میں ذمیوں کے بارے میں لکھا ہے:

وہ لوگ یعنی ذمی حضرات اسلامی حکومت میں اطمینان وسکون اورخوش دلی کے ساتھ اسی طرح رہے جس طرح مسلم حکمرانوں نے اپنی قدیم عادت کے مطابق ہمیشہ دیگر مذاہب کے ماننے والوں کے ساتھ رواداری وکشادہ قلبی کا معاملہ کیا۔

یہ بات معلوم ہے کہ اسلام شہریت ووطنیت کے اصول کی حفاظت کرنے کی وجہ سے نفرت وکراہیت اورنسل پرستانہ تہذیب وثقافت کومسترد کرتا ہے، اوردوسروں کے ساتھ خیرخواہی وبھلائی کی چاہت پرمسلمانوں کی تربیت کرتا ہے۔

دسواں حق: ضمان یا اجتماعی کفالت کا نظام:

اسلامی ممالک میں غیرمسلموں کوبھی طبی سہولیات، اجتماعی کفالت اورمحتاجوں کی اعانت کے دائرہ میں شامل کیا گیا تھا، ان کے لئے بھی دائمی وظیفہ مقررکیا گیا تھا، خواہ وہ بوڑھے ہوں یا کام کاج سے عاجزہوں، یا بے روزگارہوں، اوران کے پاس مناسب وجائزکوئی ذریعہ معاش نہ ہو، تاریخ میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں، جوعملی صورت میں غیرمسلموں کےتعلق سے اس اصول کی رعایت پردلالت کرتی ہیں۔

ان میں سے ایک مثال حضرت عمرؓاورایک عیسائی بوڑھےشخص کے درمیان کا قصہ ہے، ایک مرتبہ حضرت عمرؓ ایک بوڑھے آدمی کے پاس سے گزرے جومسجدوں کے دروازوں پرجاجاکر جزیہ اداکرنے کی غرض سے اپنی ضرورت اوربڑھاپے کی وجہ سے بھیک مانگتا تھا، ان کو دیکھ کرحضرت عمرؓ نے کہا ہم نے تمہارے ساتھ انصاف نہیں کیا، ہم تم سے تمہارے اس بڑھاپے میں بھی جزیہ لیتے رہے پھرہم نےتمہیں تمہاری اس کبرسنی میں ضائع کردیا، پھرحضرت عمرؓ نے ان کے لئے بیت المال سے اتنا وظیفہ جاری کردیا جس سے ان کی حالت درست ہوجائے، اوران سے اوران جیسے لوگوں سے جزیہ ساقط کردیا (الخراج از: امام ابو یوسف، ص: ۱۲۶، منتخب کنزالعمال من مسند احمد، ج ۲، ص: ۳۰۹)۔

حضرت عمرؓ نے اس سلسلہ میں مصارف زکوۃ کی آیت "انماالصدقات للفقراء والمساکین" سے استدلال کیا (سورہ توبہ: ۶۰)۔

فقراء سے مرادتوخودمسلمان بھی ہیں اوریہ شخص اہل کتاب کے مساکین میں سے تھے۔

حضرت خالد بن ولیداورحیرہ والوں کا واقعہ:

حضرت خالد بن ولیدؓاورعراق میں واقع حیرہ کے باشندوں کے درمیان طے پانے والےصلح نامہ میں بھی یہ بیان کیا گیا ہے کہ "میں نے ان کوحق دیا ہے کہ جوبھی شخص بڑھاپے کی وجہ سے کام کاج سے عاجزہوجائے گا یا اسے کوئی آفت وپریشانی لاحق ہو یا وہ پہلے مالدارتھا پھرمحتاج ہوگیا ہواوراس کے مذہب والے اس کوصدقہ دیتے ہوں، ایسے شخص کا جزیہ اس

سے ساقط کر دیا جائے گا، اور بیت المال سے اس کی اور اس کے اہل وعیال کی کفالت کی جائے گی، جب تک وہ دار الہجرت اور دار الاسلام میں مقیم رہے گا'' (کتاب الاموال، از ابوعبید، ص: ۵۷)۔

حضرت عمر بن عبد العزیز اور بصرہ میں ان کے عامل کا قصہ:

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے بصرہ کے عامل عدی بن ارطاۃ کے نام فرمان جاری کیا جس میں لکھا کہ ''تمہارے پاس جو بھی اہل ذمہ ہیں ان میں سے جو بوڑھے ہوگئے، جن کے اعضاء کمزور ہوگئے، جن کے اسباب معیشت ختم ہوگئے، ان کی خبر گیری کرو اور مسلمانوں کے بیت المال سے ان کے لئے اتنا وظیفہ جاری کردو جس سے ان کی حالت درست ہوجائے'' (کتاب الاموال، از ابوعبید، ص: ۵۷)۔

اسلامی ممالک میں غیر مسلموں کے حقوق کے یہ چند نمونے ہیں جسے تاریخ نے بڑی خوبصورت انداز اور عمدہ اسلوب میں ہمارے لئے ریکارڈ کیا ہے، اور یہ سب کتاب وسنت اور اسلامی تاریخ سے مستفاد ہیں، اور یہی اسلام میں انسانی حقوق کی واضح قسمیں ہیں، اور انہی حقوق کے مطابق ہم دیکھتے ہیں کہ عالم اسلام میں غیر مسلم اقلیتیں اسلامی امت کا ایک حصہ ہیں، اور وہ شہریت ووطنیت، اسلامی قومیت اور اس پر مرتب ہونے والے بنیادی حقوق سے مستفید ہورہے ہیں، اور ناموں کے اختلاف کے باوجود وہ مسلمانوں کے ساتھ برابر درجہ کے شہری ہیں، چنانچہ زکوۃ مسلمانوں کے ذمہ ایک فریضہ ہے، یہ اس لئے فرض کیا گیا ہے تا کہ یہ اسلام میں اجتماعی کفالتی نظام کو بروکار لانے میں زبردست کردار ادا کرسکے، اور یہ پانچ قسم کے مالوں میں فرض کیا گیا ہے:

۱۔نقد رقومات پر ۲۔تجارتی اموال پر ۳۔کھیتی اور پھلوں پر ۴۔جانوروں پر ۵۔خزانے اور قیمتی معادن پر، اور یہ آمدنی کے بیس فیصد سے زائد ہے، جبکہ نقدی یعنی سونے چاندی اور رقومات میں زکوۃ کا تناسب ڈھائی فیصد ہے۔

اور جسے جزیہ کہا جاتا ہے اسے اگر آپ چاہیں تو زکوۃ کہہ لیں یا صدقہ یا ٹیکس، جیسے عرب کے نصاری بنی تغلب پر لاگو کیا گیا تھا، جنہوں نے جزیہ دینے سے انکار کردیا تھا اور صدقہ کے ضابطہ کو قبول کیا تھا، یا اسے جزیہ اس معنی میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ دراصل جنگوں میں شرکت کا بدل ہے، اور وہ بھی صرف سال میں ایک دینار ایسے لوگوں پر لازم کیا گیا ہے تو کمانے پر قادر ہوں، آج غیر مسلموں کی بھی موجودہ زمانے کی حکومتوں کے قانون میں مسلمانوں کی طرح مختلف قسم کے ٹیکس ادا کرنے ہوتے ہیں جو ایک دینار سے کہیں زیادہ ہے۔

عین اسی وقت ہم دوسری طرف دنیائے مشرق ومغرب کے چہار جانب مسلم اقلیتوں کو دیکھتے ہیں کہ وہ چھ سوملین سے زیادہ تعداد میں ہیں، پھر بھی انہیں صحیح شہریت کے حقوق حاصل نہیں ہیں، اور ان کے ساتھ ناروا سلوک کیا جاتا ہے، اگرچہ ان کو کسی حدتک اپنے دینی شعائر کی ادائیگی میں آزادی حاصل ہے، لیکن وہ قانونی اعتبار سے عائلی مسائل میں بھی اپنے

اوپر اسلامی شریعت نافذ کرنے سے محروم ہیں، اور حقیقی صورت حال کے اعتبار سے اقتصادی، سیاسی اور اجتماعی مسائل میں ان کے ساتھ دوسرے شہریوں کے برابر کا برتاؤ نہیں کیا جاتا ہے، غیر مسلموں کے ملکوں میں مسلمانوں کے ساتھ عام حساس واقعات کے رونما ہونے پر بہت برا سلوک کیا جاتا ہے، خواہ یہ معاملہ نظام حکومت میں ہو یا حقوق انسانی کی مختلف قسموں کو برتنے میں ہو، اور اس کی نئی اور پرانی بہت سی مثالیں ہیں، جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱-مورخہ ۳۰/۹/۲۰۰۵ءکو پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات گرامی کے استہزاء پر مشتمل کارٹون شائع کیا گیا اور یورپ کے اخبارات اور بعض عرب اخباروں نے اچھی یا بری نیت سے اسے مسلسل شائع کیا، اور اس کی توجیہ یہ پیش کی کہ اس معاملہ کا تعلق اظہار رائے کی آزادی سے ہے، اور اس میں حکومت کوئی مداخلت نہیں کر سکتی، یا دیگر بہت سے اخبارات میں یہ توجیہ پیش کی گئی کہ اس کا تعلق صحافت کی آزادی سے ہے۔

۲-اسی طرح حضرت عیسی مسیح علیہ السلام کی شخصیت کو مجروح کرنے والے ڈرامہ کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی، یہ جانتے ہوئے کہ ہم مسلمان تمام پیغمبروں کا احترام کرتے ہیں۔

۳-یورپ کے اسکولوں کے نصاب تعلیم میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں بعض جھوٹی اور مغالطہ آمیز معلومات شامل کی گئی ہیں، اور انہیں نصاب کی کتابوں میں اپنی جانب سے گڑھ کر اسلام کے نام پر پیش کیا گیا ہے۔

۴-قبرص میں ایک ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا ہے جس کا مشن ہی اسلام پر مسلسل حملہ کرنا اور اسلامی آثار کی صورت مسخ کرنا ہے۔

۵-مغرب کے بعض ذرائع ابلاغ کے پروگراموں کو اس لئے مخصوص کیا گیا ہے کہ تمام مسلمانوں کو جھوٹ، بہتان اور مغالطہ کے ذریعہ دہشت گرد کے طور پر مشہور کیا جائے۔

۶-مسجد اقصی کے نیچے سرنگیں کھودی گئی ہیں جن سے مسجد اقصی کو حقیقی خطرہ لاحق ہے۔

شہری حقوق کی پامالی اور بعض ناروا سلوک کی یہ چند مثالیں ہیں، جن کا غیر مسلم ملکوں میں مسلم اقلیتیں سامنا کر رہی ہیں، تو پھر عالمی استحکام اور امن قائم کرنے، دنیا سے دہشت گردی کا خاتمہ کرنے اور شہریت کے اصول کا احترام کرنے کی سوچ کہاں چلی گئی!

خاتمہ: بحث کے نتائج اور تجاویز:

اوپر جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان سے درج ذیل نتائج بطور خلاصہ پیش کر رہے ہیں:

۱۔اسلام ہی وہ پہلا مذہب ہے جس نے جامع انسانی وحدت کی دعوت دی تاکہ لوگ الفت ومحبت، تعاون وہمدردی اور امن واستحکام کے ساتھ زندگی گزاریں اور یہ کہ اسلام ہی نے وطن سے تعلق رکھنے اور وفاداری اختیار کرنے پر مسلمانوں

کو آمادہ کیا ہے۔

۲۔اسلام میں شہریت ایک تمدنی وسیاسی مفہوم ہے جبکہ اسلام کے علاوہ میں یہ ایک دینی مفہوم ہے، یہی وجہ ہے کہ شہریت نسلی، مذہبی اور ثقافتی تنوع کے باوجود معاشرہ میں اعتدال وتوازن پیدا کرتی ہے۔

۳۔وطنیت وشہریت صرف اس بات کا تقاضہ نہیں کرتی کہ انسان وطن کے ذمہ اپنے لازمی حقوق کا مطالبہ کرے بلکہ اس پر یہ بھی لازم ہے کہ وطن کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کو بھی ادا کرے۔

۴۔شہریت کے حقوق میں سے مذہبی آزادی، ایک دوسرے کی خصوصیات کا احترام اور نجی ملکیت کا حق ہے، اسی طرح انسانی کرامت کا حق، حمایت وحفاظت کا حق، اور عقیدہ کی آزادی کا حق ہے، عدل وانصاف اور مذہبی مساوات کا حق اور اچھے برتاؤ کا حق ہے۔

۵۔شہریت کے فرائض میں سے اچھے کاموں میں ولی امر یعنی حاکم وامیر کی اطاعت، وطن کا دفاع، قانون کا احترام اور دوسرے کی خصوصیات وآزادی کا احترام ہے۔

بعض تجاویز درج ذیل ہیں:

الف۔صحیح اسلام کو سمجھنے، اسلام کے بارے میں مسخ شدہ خیال کو ترک کرنے، حق وانصاف اور عدل ومساوات کی باتوں پر کان دھرنے اور عمدہ اخلاق کے اصولوں پر عمل کرنے کی دعوت دی جائے۔

ب۔ثقافتی وتہذیبی ڈائیلاگ اور دوسری تہذیبوں کے احترام کو فعال بنانے کی کوشش کی جائے۔

ج-اسلام کی رواداری ہی امن واستحکام کی فضاء قائم کرسکتی ہے، اور دوسروں کے تعلق سے ہر قسم کے تعصب وکراہیت اور نفرت وحسد کو ختم کرسکتی ہے، اور اسی سے انتہا پسندی، غلو وزیادتی کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔

د- جذبہ خیر سگالی، دوستانہ بقائے باہم اور حقوق وفرائض کے احترام پر قائم پرامن بین الاقوامی تعلقات کے اصولوں کے احترام کی دعوت دی جائے، خواہ مسلموں کے ملک میں ہو یا غیر مسلموں کے ملکوں میں۔

☆☆☆

ملکی آئین اور بین الاقوامی معاہدات کی پابندی کا مسئلہ

عبداللہ بن علی سالم

مختصر تعریف:

آئین سے مراد ہر ملک کا دستور ہے، چونکہ ہر ملک کے دستور کی بنیادیں مختلف ہوتی ہیں، اس لئے ہر ملک کا دستور وآئین مختلف ہوتا ہے، دستوروں کے تنوع اور ان کو بنانے والے اداروں پر یہاں گفتگو نہیں کی جاسکتی، اور اس وقت اس کا موقعہ اور گنجائش بھی نہیں ہے۔

بین الاقوامی معاہدات مختلف ممالک کے درمیان تعلقات کو طرح طرح کے متون کے ذریعہ منظّم کرتے ہیں۔

اور خود بین الاقوامی معاہدات کو بین الاقوامی قانون منظّم کرتا ہے۔

بین الاقوامی قانون کے سلسلہ میں ماہرین کا یہ اختلاف بہت پہلے سے چلا آرہا ہے کہ کیا اسے واقعی قانون مانا جاسکتا ہے؟

اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ اس قانون کے قواعد نہیں پائے جاتے ہیں جو اسے قانونی قاعدہ کی خصوصیات سے بہرہ ورہ کریں۔

قانون کے سلسلے میں ایک بالکل بنیادی اور اولین درجہ کی بات یہ ہے کہ قانونی قاعدہ عام، مجرد اور لازمی ہوتا ہے، جبکہ بین الاقوامی قانون میں عام طور پر لازمی ہونے کی صفت نہیں پائی جاتی ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اگر کوئی ملک اس قانون کو نافذ نہیں کرتا ہے تو اسے اس کا پابند نہیں کیا جاپاتا ہے۔

بڑی تعداد میں ممالک نے اپنے دستوروں میں بین الاقوامی قوانین بالخصوص حقوق انسانی کے عالمی منشور کے احترام کی بات کہی ہے۔

مثلاً موریٹانیا کے دستور کی تمہید میں لکھا گیا ہے: ''قوم اپنی روحانی وتہذیبی اقدار کی بنیاد پر دین اسلام، ۱۰/۱۲/۱۹۸۱ء کو جاری ہونے والے عالمی حقوق انسانی منشور میں مذکور جمہوریت کے اصولوں، ۲۸/۶/۱۹۸۱ء کو ہونے والے افریقی معاہدہ بابت حقوق انسانی اور ان تمام بین الاقوامی معاہدات کی پاسداری کا اعلان کرتی ہے جن میں موریٹانیا بھی شریک ہے۔

ملکی قوانین کی بین الاقوامی معاہدات و بین الاقوامی قانون سے ہم آہنگی

تمہید:

بین الاقوامی معاہدات بین الاقوامی قانون کا ایک اور بنیادی حصہ ہیں، تمام ممالک اس بین الاقوامی نظام کا ایک حصہ ہیں، اور اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں و پابندیوں سے چھٹکارا حاصل کرنا ان کے لئے ممکن نہیں ہے، اسی طرح دنیا کے مختلف ممالک بین الاقوامی تعاون کے تحت ایک دوسرے سے استفادہ کرتے ہیں، یہ ممالک اپنے بہت سے بنیادی حقوق ومصالح کو بین الاقوامی تعاون کے ذریعہ ہی حاصل کر پاتے ہیں۔

بین الاقوامی قانون کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ وہ خودمختار ممالک کے باہمی تعلقات کو منظّم کرنے والے قواعد کا ایک ایسا مجموعہ ہے جو باہمی معاہدہ واتفاق، عرف اور بین الاقوامی برادری کی خواہشات سے اپنی طاقت حاصل کرتا ہے، یہ قانون بین الاقوامی برادری کی خواہشات کا عکاس ہوتا ہے، یہ قانون بین الاقوامی تنظیموں کے ذریعہ مختلف ممالک کے تعلقات منظّم کرتا ہے، اور چند معاہدات پر مشتمل ہوتا ہے۔

ملکی قوانین کی بین الاقوامی معاہدات اور بین الاقوامی قانون سے ہم آہنگی چند اسباب کی بنا پر اہمیت کی حامل ہے، جن میں سے چند یہ ہیں: اس کا اظہار کہ ممالک کے درمیان کچھ بین الاقوامی معاہدات ہیں، اور یہ ممالک تمام انسانیت کو درپیش مشترک مسائل کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں تمام ممالک کے ساتھ تعاون کرتے ہیں، اور اس طرح بین الاقوامی سطح پر اپنی موجودگی درج کراتے ہیں۔

یہ معاہدے بین الاقوامی سطح پر حقوق انسانی کی قانونی حفاظت کا کام کرتے ہیں، انہیں معاہدات، اور پروٹوکول بھی کہتے ہیں، یہ معاہدات متعلقہ ممالک کے درمیان قانونی پابندیوں سے عبارت ہوتے ہیں، معاہدہ کا متن متعلقہ ممالک کے نمائندگان کی موجودگی میں ترتیب دیا جاتا ہے، بہت سے طریقے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں انجام دے کر ممالک کسی معاہدہ کو قبول کرنے یا اس میں شامل ہونے کا کام کرتے ہیں، تصدیق وشمولیت ان طریقوں کو ہی وسعت دیتے ہیں۔

معاہدات کو منظّم کرنے کا قانون:

مختلف ممالک کے درمیان ہونے والے معاہدات کو منظّم کرنے کے لئے ایک مستقل قانون ہے، یہ قانون ایک ایسے بین الاقوامی معاہدہ کے تحت بنایا گیا ہے جو ممالک کے درمیان ہونے والے معاہدات کو منظّم کرتا ہے، یہ قانون قانونِ معاہدات ہے، یہ قانون ایک بین الاقوامی معاہدہ کے تحت بنا تھا جسے ''ویانا'' معاہدہ کہا جاتا ہے، یہ مئی ۱۹۶۹ء میں ہوا تھا، اور جنوری ۱۹۸۰ء سے نافذ ہوا ہے۔

''معاہدۂ ویانا'' نے مختلف ممالک کے درمیان ہونے والے معاہدات کے تمام پہلوؤں کو منظّم کیا ہے، یہ معاہدے

بین الاقوامی قانون کا ایک سرچشمہ شمار ہوتے ہیں۔

بین الاقوامی تعلقات کی تاریخ میں چونکہ ان معاہدات کا نہایت اہم کردار رہا ہے، اور چونکہ ان معاہدات کی بین الاقوامی قانون کے ایک سرچشمہ اور مختلف ممالک کے درمیان پر امن تعلقات کو ترقی دینے کے ایک طریقۂ کار کے طور پر اہمیت میں مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے اس لئے تمام ممالک نے اس ''معاہدۂ ویانا'' پر دستخط کئے ہیں۔

یہ معاہدہ مندرجہ ذیل امور کو منظم کرتا ہے:

۱-کسی ملک کی رضامندی کے وسائلِ تعبیر۔

۲-تحفظات۔

۳-معاہدات کا نفاذ۔

۴-معاہدات کا احترام۔

۵-معاہدات اور دیگر ممالک۔

۶-معاہدات کی ترمیمات۔

۷-معاہدات کا خاتمہ اور ان پر عمل کا رک جانا۔

ملک کے اندرونی قانون سے بین الاقوامی قانون کا اختلاف:

اس سلسلے میں ماہرین کی آرا مختلف ہیں، یہ آرا دو طرح کی ہیں

۱-وحدت قانون کا نظریہ:

اس نظریہ کے حاملین کی رائے یہ ہے کہ بین الاقوامی قانون داخلی قانون سے بےتعلق نہیں ہے، ان لوگوں کے نزدیک قانون چند لازمی قواعد پر مشتمل ایک اکائی ہے، خواہ یہ قواعد حکومت کے لئے ہوں، افراد کے لئے یا دیگر اکائیوں کے لئے، یہ رائے اُس قانون کے حقیقی تصور سے ہم آہنگ ہے جو کسی معاشرہ میں سماجی سرگرمی کے بنیادی تنظیمی امور پر مشتمل ایک ڈھانچہ مانا جاتا ہے، اس قانون کا سرچشمہ انسان کی سماجی ومعقول فطرت میں ہوتا ہے، اسی لئے زمانی وعلاقائی طور پر یہ قانون اپنی اس فطرت سے مختلف نہیں ہوسکتا ہے، اس لئے ہم قانون کی ایسی قسموں کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو ایک دوسرے سے بالکل بےتعلق ہوں، اس لئے کہ سرچشمہ کی یگانگت ان تمام قسموں کو ایک جیسا بنا دیتی ہے۔

اس نظریہ کے حاملین میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے کہ ان دونوں قسموں میں سے کون سی قسم دوسری قسم کے مقابلہ بالاتر ہے، بعض حضرات کے نزدیک داخلی قانون بالاتر ہے، جبکہ دیگر حضرات کے نزدیک بین الاقوامی قانون، اس لئے کہ وہ بین الاقوامی معاہدات جن کی تصدیق ہوچکی ہے ان کے زیر اثر دائرہ داخلی قوانین سے زیادہ ہے، بشرطیکہ دوسرا فریق بھی اسی

معاہدہ کو نافذ کرے، لہذا معاہداتی قاعدہ کا مرتبہ داخلی قانونی قاعدہ سے زیادہ ہے، دو قاعدوں کے درمیان تعارض کی صورت میں معاہداتی قاعدہ زیادہ اہم ہے۔

۲-قانون کی دوئی کا نظریہ:

اس نظریہ کے حاملین کے نزدیک بین الاقوامی قانون اور داخلی قانون دو بالکل مستقل اور باہم دیگر مختلف نظام ہیں، اس لئے کہ ان دونوں میں یہ فرق پائے جاتے ہیں:

(۱) موضوع کے اعتبار سے: داخلی قانون کا موضوع فرد ہے، جبکہ بین الاقوامی قانون کا موضوع حکومت ہے۔

(۲) سرچشمہ کے اعتبار سے: داخلی قانون کا سرچشمہ حکومت کا ارادہ ہے تو بین الاقوامی قانون کا سرچشمہ متعدد ممالک کا اجتماعی ارادہ ہے۔

(۳) قانونی قواعد کے ذریعہ منظّم روابط کی نوعیت کے اعتبار سے: داخلی قانون ملک کے اندر افراد کے درمیان باہمی تعلقات کو منظّم کرتا ہے، جبکہ بین الاقوامی قوانین صلح یا جنگ کے حالات میں ممالک کے درمیان تعلقات کو منظّم کرتے ہیں۔

اس نظریہ کے مندرجہ ذیل نتائج ہیں:

الف- دونوں قوانین کے قواعد اپنے موضوع اور اپنی ساخت کے اعتبار سے الگ الگ ہوتے ہیں، بین الاقوامی قانونی قواعد داخلی قانون میں لازمی ہونے کی صفت سے اس وقت تک متصف نہیں ہوتے ہیں جب تک وہ داخلی قوانین کی تشکیل کے لئے مروجہ طریقہ ہائے کار کے مطابق داخلی قانونی قواعد کی صورت نہ اختیار کرلیں۔

ب- ملکی عدالتیں صرف داخلی قوانین کی ہی تشریح وتنفیذ کرسکتی ہیں، وہ بین الاقوامی قوانین کی تنفیذ اس وقت تک نہیں کرسکتی ہیں جب تک وہ داخلی قوانین نہ بن جائیں۔

اسی طرح بین الاقوامی عدالت اس وقت تک داخلی قوانین کی تشریح وتنفیذ نہیں کرسکتی ہیں جب تک وہ بین الاقوامی قواعد کی صفت نہ حاصل کرلیں۔

ان دونوں نظریات کے درمیان تقابل:

یہ بات صحیح ہے کہ تاریخی طور پر مقامی معاشرہ تنظیم میں بین الاقوامی معاشرہ سے مقدم ہے، لیکن بین الاقوامی معاشرہ کے تاریخی طور پر اس بچھڑے پن کو داخلی قانون پر بین الاقوامی قانون کی بالاتری سے کم کیا جاسکتا ہے، اس لئے کہ اس معاشرہ کی ترقی میں یہ معاون ہے، اسی طرح بین الاقوامی معاشرہ کو انتشار ولاقانونیت سے بچانے کے لئے بھی یہ ضروری ہے کہ ہم ممالک کی بے سروپا آزادی کو روکیں۔

لہذا عملی پہلو اس بات کو لازمی قرار دیتے ہیں کہ ہم بین الاقوامی قانون کو داخلی قانون پر بالاتر قرار دیں، اور ان دونوں میں نزاع کی صورت میں بین الاقوامی قانون کو داخلی قانون پر ترجیح دیں۔

ملکی قوانین کو بین الاقوامی معاہدات سے ہم آہنگ کرنا:

ہم آہنگ کرنے سے مراد داخلی (یا ملکی) قوانین اور ان بین الاقوامی معاہدات ومنشورات کے درمیان پائے جانے والے تعارض کو دور کرنے کے لئے کوششیں کرنا ہے جن پر ملک نے دستخط کئے ہوں۔

بین الاقوامی معاہدات اور بین الاقوامی قانون کے متصادم قوانین کا پایا جانا کوئی صحیح بات نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تعارض وتصادم کسی ایسے ملک کے قوانین کے نفاذ میں ایک رکاوٹ بن جاتے ہیں جس نے ان بین الاقوامی معاہدات پر دستخط کئے ہوں، یہ معاہدات بین الاقوامی قانون کا بنیادی اور اہم حصہ ہوتے ہیں، اس کے علاوہ آج تمام ممالک ایک بین الاقوامی نظام کا حصہ بن گئے ہیں، اور اپنی بین الاقوامی پابندیوں سے چھٹکارا نہیں پاسکتے ہیں۔

بعض ممالک میں ان بین الاقوامی معاہدات کے احکام ملکی داخلی قانون کی بہ نسبت راجح ہوتے ہیں جن پر اس متعلقہ ملک نے دستخط کردی ہوتی ہے، جب کہ دیگر ممالک میں ایسے بین الاقوامی معاہدات کے احکام کو قانون کی صورت میں پاس کرنا ضروری ہوتا ہے، اس سے صرف نظر بین الاقوامی قانون کے قواعد کے مطابق تمام ممالک کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے ملکی قوانین اور اپنے بین الاقوامی معاہدات کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے کا کام ضرور کریں۔

تمام ممالک پر بین الاقوامی قانون کی پابندی لازم ہے، اس لئے کہ یہ قانون ممالک کے لئے لازمی قواعد پر مشتمل ایک ایسا نظام ہے، جو ان ممالک کے لئے یہ لازمی قرار دیتا ہے کہ وہ اس قانون کے قواعد سے براہ راست اپنے قانونی نظام اخذ کریں، بلکہ ملکی قوانین میں اس کا تذکرہ نہ ہونا ایک بین الاقوامی مخالفت کا سبب بن رہا ہے، اس کے نتیجہ میں ایک بین الاقوامی ذمہ داری وجود میں آسکتی ہے، یہ ذمہ داری بین الاقوامی غیر قانونی طرز عمل کے نتیجہ میں وجود میں آتی ہے، اور یہ صورت حال بین الاقوامی ذمہ داری کی مخالفت ہے......

عصر حاضر میں ملکی سسٹمس بین الاقوامی قانون کے تصور سے بہت متأثر ہوئے ہیں، اس قانون نے ممالک کے ذمہ یہ لازم کیا ہے وہ اپنے ان قوانین اور انتظامی طرز ہائے عمل کو منسوخ کردیں جو بین الاقوامی معاہدات کے اہداف سے معارض ہوں۔

بین الاقوامی قانون مکمل طور پر داخلی سسٹمس سے مربوط ہے، یہ سسٹمس بین الاقوامی قانون کے ان مظاہر میں سے ایک ہے جو ہر علاقہ کے افراد کے حقوق اور ان کی آزادیوں کا تحفظ کرکے بین الاقوامی معاشرہ پر بہت توجہ دینے کے سلسلے میں اس بین الاقوامی قانون کے کردار کو مستحکم کرسکتے ہیں۔

معاہدہ ممالک کے لئے کب لازمی ہوتا ہے؟
اور کب ممالک کے لئے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ ان کے قوانین معاہدہ سے ہم آہنگ ہوں؟

قانونِ معاہدات کی بابت ہونے والے ''معاہدۂ ویانا'' کی دفعہ ۲۶ میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ معاہدہ معاہدین کے مابین قانون کی سی حیثیت رکھتا ہے، ہر معاہدہ پر عمل تمام فریقوں کے لئے لازمی ہے، ہر فریق کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ حسن نیت کے ساتھ معاہدہ کو جاری کرے۔

''معاہدۂ ویانا'' کی دفعہ ۱۰ کے مطابق معاہدوں کے جس متن پر دستخط کی جائے گی وہی معاہدہ شمار ہوگا۔

قانون معاہدات کی دفعہ ۱۱ کے مطابق کسی ملک کے ذریعہ معاہدہ پر دستخط کرنے، معاہدہ کی انجام دہی کی دستاویزات کے تبادلہ، ان کی تصدیق کرنے، ان سے اتفاق کرنے، ان کو قبول کرنے یا کسی اور طریقہ سے ان میں شامل ہونے کو ملک کی جانب سے معاہدہ کے پابند رہنے کا اظہار واعتراف مانا جائے گا۔

معاہدہ کی پابندی کی بابت اپنی رضامندی کے اعتراف واظہار کے وسائل کے ساتھ ممالک معاہدہ کی دفعات پر عمل کے پابند ہوجاتے ہیں، ان وسائل کے ذریعہ اعتراف واظہار کے بعد معاہدہ قانونی وحتمی ہوجاتا ہے، اور ممالک حسن نیت کے ساتھ اپنی بین الاقوامی ذمہ داریوں کی ادائیگی کے پابند ہوجاتے ہیں، اس کے لئے ممالک کو اپنے ملکی قوانین اور اپنے بین الاقوامی معاہدات کے درمیان ہم آہنگی قائم کرنی ہوتی ہے، نیز ان کے نفاذ کو یقینی بنانے کے لئے انتظامات کرنے ہوتے ہیں۔

''معاہدۂ ویانا'' کی دفعہ ۲۷ میں ہے کہ معاہدہ کا کوئی فریق اپنے داخلی قانون کے متون کو دلیل بنا کر معاہدہ کے نفاذ میں کسی طرح کی کوتاہی کو جائز نہ قرار دیں۔

''معاہدۂ ویانا'' کی دفعہ ۴۶ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کوئی بھی ملک معاہدہ کے تئیں اپنی رضامندی کے اظہار کے بعد داخلی قانون کے کسی حکم کے ساتھ اس کے تضاد کو اس رضامندی کے خاتمہ کا سبب نہ بتائے، الا یہ کہ یہ تضاد بالکل واضح ہو، کسی تضاد کو واضح اس وقت مانا جائے گا جب وہ موضوعی طور پر کسی ایسے ملک کے لئے واضح ہو جو اس سلسلے میں معمول کے تعاون کے مطابق حسن نیت کے ساتھ طرز کار اختیار کرے۔

اسی طرح بعض بین الاقوامی معاہدات نافذ کرنے کے سلسلہ میں اقدامات نہ کرنے کے بارے میں کئے جانے والے استدلالات بھی بہانے ہی مانے جائیں گے اور یہ عمل کوتاہی شمار ہوگا۔

بین الاقوامی قانون اور داخلی قانون کے درمیان تعارض کا حکم شرعی کیا ہے؟

خاص طور پر اسلامی ممالک میں یہ بحث بہت زوروں میں چھڑی ہوئی ہے کہ بین الاقوامی قانون کا کوئی عنصر (مثلا

عالمی منشور بابت حقوق انسانی) اگر اسلامی شریعت کے نا قابل تغیر احکام اور مسلمانوں کے لئے مقدس تعلیمات سے متعارض ہوتو ایسی صورت میں کیا ہوگا ؟ اس بابت بہت سی باتیں کہی گئی ہیں، جن کے تذکرہ کی اس وقت گنجائش نہیں ہے، لیکن یہاں پر یہ بتانا مناسب ہوگا کہ ’’ عالمی منشور برائے حقوق انسانی ‘‘ پر دستخط کرنے والے اسلامی ممالک نے خود اسی منشور کے اندر سے اپنے لئے ایک گنجائش ڈھونڈ لی ہے، اس لئے کہ اس کی دفعہ ۲۹ کی شق: ۲ میں یہ لکھا گیا ہے کہ: فرد اپنے حقوق اور اپنی آزادیوں کے استعمال میں اس قانون کی عائد کردہ پابندیوں کا پابند صرف دوسروں کے حقوق اور ان کی آزادیوں کو یقینی بنانے، ان کا احترام کرنے اور عام نظام، مصلحت عامہ واخلاق کے انصاف پسندانہ تقاضوں کو حاصل کرنے کے لئے ہے‘‘۔

شرعی پہلو سے بھی صلح حدیبیہ کے اسوہ کی بنیاد پر علماء امت میں یہ اختلاف ہے کہ کیا احکام شریعت کے خلاف امور پر کفار سے صلح کی جاسکتی ہے۔

نزهةالأفكار شرح قرة الابصار (از: علامہ مجدد عبدالقادر بن محمد بن محمد سالم مجلسی شنقیطی جلد اول، صفحہ: ۳۰۲) میں صلح حدیبیہ پر گفتگو کے آخر میں لکھا گیا ہے:

فائدہ: علماء کا اس بابت اختلاف ہے کہ کیا کفار کے ساتھ اس بات پر صلح (معاہدہ) جائز ہے کہ مسلمانوں کے پاس جو شخص مسلمان ہو کر آئے گا وہ اسے کفار کو واپس کردیں گے، بعض لوگوں کے نزدیک یہ جائز ہے، اس لئے کہ ابوجندل اور ابو بصیر کے قصہ سے یہی معلوم ہوتا ہے، بعض حضرات کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ اس قصہ سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ ابوداؤد و ترمذی کی روایت کردہ اس حدیث نبوی سے منسوخ ہے جس میں ہے: ’’ میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان قیام پذیر ہو، لوگوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ ایسا کیوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ان دونوں کی آگ ایک دوسرے کو نہ دیکھ پائے۔

☆☆☆

اسلام میں شہریت کی حیثیت اور اسلامی ممالک میں رہنے والے غیر مسلموں کے شہری حقوق
قرآن وحدیث کی روشنی میں ایک تحقیقی مطالعہ

پروفیسر ڈاکٹر علی محی الدین قرہ داغی☆

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيدنا وحبيبنا وقدوتنا محمد المبعوث رحمة للعالمين وعلى اخوانه من الانبياء والمرسلين وعلى آله الطيبين وصحبه الميامين ومن تبعهم باحسان الى يوم الدين۔

امابعد!

دورحاضر میں ہمارے سامنے بہت سی سیاسی، سماجی اور اقتصادی اصطلاحات ہیں جن کا ایک خاص مفہوم ہے، اور جن کے ابعاد اپنے اصلی اور لغوی ابعاد سے مختلف ہیں، جیسے مواطنہ (شہریت)، قومیت، وغیرہ، اس لئے ان اصطلاحات کے نئے مفاہیم کی تحدید اور شریعت کے اصول اور مقاصد کی روشنی میں ان پر حکم لگانا ضروری ہے، تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کو مکمل قبول کرنا ہے یا انہیں رد کرنا ہے یا ان میں کچھ تفصیل ہے۔

قرآن کریم نے واضح کیا ہے کہ اصطلاحات کی اہمیت ہوتی ہے، اور اس کا اعتبار کیا جاتا ہے، اسی لئے زمانہ جاہلیت میں رائج اصطلاح 'راعنا' کی ممانعت آئی، کیونکہ یہودی اس اصطلاح کو اچھے معنی میں استعمال نہیں کرتے تھے، جبکہ عربی لغت اور عربی اسلوب میں اس کے اچھے معانی آئے ہیں، قرآن نے صرف ممانعت پر اکتفاء نہیں کیا، بلکہ اس کی جگہ دوسری اصطلاح 'انظرنا' بیان فرمایا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''یا یھاالذین آمنوا لا تقولوا راعنا وقولوا انظرنا و اسمعوا و للکافرین عذاب ألیم'' (سورہ بقرہ: ۱۰۴)۔

☆ جنرل سکریٹری الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین، ونائب صدر المجلس الاوروبی للافتاء والبحوث۔

اصطلاحات کے تعلق سے قرآن کریم کا یہ اسلوب اور تعامل اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اس امت پر واجب وضروری ہے کہ وہ بھی اصطلاحات کو اختیار کرنے ، بلکہ اس کے استعمال کرنے میں بھی اور اپنے افراد کو اسے برتنے کی تربیت کرنے میں غایت درجہ بیداری اور شعور کا ثبوت دے۔

انہی جدید مروج اصطلاحات میں جن کا اصطلاحی مفہوم اپنے لغوی مفہوم سے الگ ہے، ایک مواطنہ (شہریت) ہے، جو انقلاب فرانس کے ساتھ ہی مشہور ہوا اور پھر اسلامی مما لک تک پہونچا۔

اس تحقیقی مقالہ میں ہم مواطنہ کے لغوی واصطلاحی معنی بیان کریں گے، پھر اس کی تفصیل اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کا حکم، نیز اس بارے میں اسلامی فکر کے موقف کو واضح کریں گے، اس ضمن میں اسلامی حکومت میں غیر مسلموں کو حاصل حقوق کو بھی بیان کریں گے، نیز میثاق مدینہ کی مختصر تشریح کریں گے ، جو کہ حقوق کی تاریخ میں پہلا دستور مانا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح بات کی رہنمائی فرمائے، اور عقیدہ، قول اور عمل میں لغزش اور گمراہی سے بچائے! آمین

مواطنہ (شہریت) کی تعریف:

لغوی اعتبار سے 'مواطنہ' لفظ 'واطن' کا مصدر ہے، جس کی اصل ''وطن بالمكان يطن وطنا ''ہے، یعنی کسی جگہ قیام کرنا، کہا جاتا ہے، ''اتطن البلد''، یعنی اس شہر کو وطن بنایا، اور ''استوطن البلد''، یعنی اس شہر کو وطن بنالیا، ''ووطن الشخص''، یعنی وہ شہر جہاں وہ رہتا ہے (القاموس المحیط، لسان العرب، المعجم الوسیط مادہ 'وطن')۔

مواطنہ کو واطن سے مانتے ہوئے یہ مفہوم لینا کہ کسی ملک میں وہاں کے باشندوں کے ساتھ رہنا تو اس بارے میں ''المعجم الوسیط'' کی رائے یہ ہے کہ یہ لفظ محدثہ (جدید) ہے، (واضح رہے کہ المعجم الوسیط مجمع اللغۃ قاہرہ کی نمائندگی کرتا ہے) کیونکہ اہل عرب نے اس لفظ کو اس جدید معنی میں استعمال نہیں کیا ہے۔

فقہاء نے وطن الاقامۃ کا لفظ بلد السفر کے مقابلہ میں استعمال کیا ہے، یعنی وہ جگہ جہاں مسافر اتنی مدت تک ٹھہرے کہ جس مدت میں مسافر سفر کے احکام سے خارج ہوجاتا ہے، یعنی کم سے کم پندرہ دن (التعریفات للجرجانی ص ۳۴۷)۔

اسی طرح موجودہ عرف میں وطنی اس کو کہتے ہیں جو وطنیت پر مبنی فکر کو اوڑھ لے، اس کا دفاع کرے اور حقوق وواجبات کے سلسلہ میں جملہ شہریوں کے درمیان اس لفظ کو ذریعہ کے طور پر استعمال کرے، اور مواطن اس شخص کو کہتے ہیں جس کے پاس اس ملک کی نیشنلیٹی ہو، بعض لوگ شہریوں کے درمیان اس طرح فرق کرتے ہیں:

مواطن اصلی: ان کے حقوق زیادہ ہوتے ہیں (ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے اپنے مقالہ 'مفہوم المواطنة فی المنظور الاسلامی' میں یہ بات لکھی ہے)۔

مواطن متجنس: ان کے حقوق کم ہوتے ہیں، یا ایسے شہری جو دوسری جگہ سے یہاں آ کر رہ رہے ہیں، اس طرح اور بھی لوگوں نے وطن کی قسمیں بیان کی ہیں، لیکن قرآن وحدیث میں اس بارے میں کوئی دلیل نہیں ہے، اللہ تعالی نے قومیت اور وطنیت کو محض تعارف کیلئے بنایا ہے نہ کہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ اختلاف پیدا ہو اور آپس میں فخر وغرور کا سبب بنے، اسی طرح قدیم عربوں نے بھی لفظ 'وطن' اس جدید معنی میں استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ انہوں نے وطن کو منزل اور مکان کے لئے استعمال کیا ہے جہاں انسان رہتا ہے، ''لسان العرب'' میں ہے:

''الوطن: هو المنزل الذی یقیم به و هو موطن الإنسان ومحله'' (لسان العرب، مادہ 'وطن')۔

فیروز آبادی لکھتے ہیں:

''الوطن: منزل الاقامة ومربط البقر والغنم وجمعه أوطان......وموطن مكه: مواقفها، ومن الحرب مشاهدها وتوطين النفس: تمهيدها......وواطنه على الامر: وافقه'' (القاموس المحیط مادہ 'وطن' ص: ۱۵۹۸)

اس معنی میں عربوں نے اشعار بھی کہے ہیں، ابن رومی اپنے گھر کے بارے میں کہتا ہے:

ولی الوطن ألیت أن لا أبیعه
وألا أری غیری له الدهر مالکا
اذا ذکروا أوطانهم ذکرتهم
عهود الصبا فیها فحنوا لذلکا

خلاصہ کلام یہ کہ وطن اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان پیدا ہوا ہو، بچپن سے جوانی تک وہاں رہا ہو، اور اس جگہ سے اور وہاں کے لوگوں سے اس کو محبت ہو، نہ یہ کہ معینہ حقوق حاصل ہوں، یا کوئی ایسا معاہدہ ہو جس کا سیاسی معاہدات کی دنیا میں کوئی خاص مفہوم ہو۔

اہل عرب جب وطن کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس سے وہ جگہ مراد لیتے ہیں جہاں وہ پیدا ہوا ہے اور جہاں اس کی نشو ونما ہوئی ہے، یا وہ جگہ جہاں اس نے قیام کیا اور اس جگہ سے اس کا وجدانی اور جذباتی تعلق ہو گیا ہو۔

قرآن کریم نے لفظ 'مواطن' استعمال کیا ہے اور اس سے جگہیں مراد لیا ہے، جائے پیدائش سے وابستگی نہیں، اللہ تعالی فرماتا ہے: ''ولقد نصرکم الله فی مواطن کثیرة'' (سورۃ توبہ: ۲۵) ہم نے بہت سے مقامات پر تمہاری مدد کی ہے، جیسے بدر اور حنین سے پہلے کے غزوات، کہ یہ مسلمانوں کی پیدائش کی جگہ تھی اور نہ ان کے نشو ونما کی جگہ (تفسیر ابن کثیر، ج ۲، ص: ۱۳۳۶)۔

ایسا لگتا ہے کہ لفظ ''الوطنی''، ''الوطنیة'' اور ''الوطن'' کو اس کے سیاسی معنی میں سب سے پہلے عالم عرب میں

طہطاوی (۱۸۰۱۔ ۱۸۷۳ء) نے استعمال کیا ہے، ان کے بعد بطرس البستانی (۱۸۱۰۔ ۱۸۸۳ء) کی کتاب میں استعمال ہوا ہے، طہطاوی لکھتے ہیں: ملک کا باشندہ اصلی باشندہ ہے یا وہاں کمائی کی غرض سے آیا اور اس میں اقامت اختیار کر لی اور اسی کو اپنا وطن بنایا ہو، اور اسی کی طرف نسبت کرتا ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ملک کے حقوق سے مستفید ہو رہا ہے، لہذا ملک کے قوانین کو ماننا وطن کی طرف سے اس بات کی ضمانت ہے کہ شہری حقوق سے مستفید ہو، اور شہری خصوصیات کو اپنانا چاہتا ہے، اس معنی میں وہ وطنی اور بلدی ہے، یعنی وہ شہر کا ایک جزو اور ممبر شمار ہوتا ہے، گویا وہ شہر کے جسم کے ایک عضو کی طرح ہے ، متمدن قوموں کے نزدیک یہ سب سے بڑی خصوصیات میں سے ہے'' اس کے بعد وہ کہتے ہیں'' وطنیت (شہریت) کا وصف صرف اس بات کی متقاضی نہیں کہ انسان اپنے واجب حقوق کا مطالبہ کرے، بلکہ اس کی یہ بھی ذمہ داری ہے کہ وطن کے تئیں جو حقوق اس پر ہیں ان کو بھی ادا کرے، چنانچہ اگر کوئی شہری ملک کے حقوق ادا نہیں کرتا ہے تو وہ بھی ملک کے تئیں اپنا شہری حقوق کا استحقاق نہیں رکھے گا (رفاعۃ الطہطاوی، ج ۲، ص ۴۳۳۔ ۴۳۴)۔

بطرس البستانی نے بھی الوطن، الوطنی اور الوطنیۃ کی تعریف میں اسی سے ملتی جلتی بات کہی ہے۔

میری رائے یہ ہے کہ طہطاوی نے وطن کا یہ مفہوم موجودہ مغربی فکر سے لیا ہے، کیونکہ انہوں نے فرانس میں زندگی گزاری، جامع ازہر مصر نے ان کو وہاں مبعوث کر کے بھیجا تھا، پھر یہ اصطلاح مسلمانوں میں عام ہوگئی، بلکہ بعض مسلمانوں نے مغرب سے زیادہ اس اصطلاح کو استعمال کیا، یہاں تک کہ ۱۹۷۹ء میں کامب ڈیفیڈ معاہدہ کے بعد یہ نعرہ بلند ہوا: ''مصر للمصريين'' یعنی مصر مصریوں کیلئے ہے، اس زمانے کے مصری مجلّات و رسائل کو میں پڑھتا رہتا تھا، مجھے محسوس ہوتا تھا کہ بعض رسائل بغض، کینہ، عداوت اور تعصب کو ہوا دے رہے تھے، اور عرب اور مسلمانوں کے شیرازہ کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے، گویا کہ قومیت جس نے امت اسلامیہ کو مختلف جماعتوں میں تقسیم کیا اور خلافت عثمانیہ کے زوال میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اب تک اپنا کردار ادا نہیں کر پائی، کیونکہ عرب اب تک متحد تھے، چنانچہ اسی منفی طرز پر یہ فکر سامنے آئی، تاکہ عربوں کو بھی قومیت کے نام پر مختلف حصوں میں تقسیم کردے۔

مواطنہ (شہریت) کا تاریخی پس منظر:

مواطنہ کا اولین تصور اس حکومت کے ذریعہ آیا جو دشمنوں اور مخالف چیلنجز کے سامنے اپنی قوت اور وحدت ثابت کرنے کیلئے اپنے پیروکاروں کو ایک جامع نظام پر لانا چاہتی تھی، اسی لئے ان حکومتوں میں اس کی بعض نشانیاں ملتی ہیں جن کی بنیاد قومیت وعصبیت پر ہے، جیسے آشور پین، فارس اور روم وغیرہ، لیکن جب ان قوموں نے ایک خاص دین کو اپنا لیا تو اب یہ دین ہی ان کے درمیان رابطہ کا ذریعہ بن گیا۔

پچھلی تہذیبوں نے اور خاص طور پر اسلامی تہذیب نے بھی ان شہریوں کے حقوق و واجبات کو واضح کیا ہے جو اس

ملک یا سلطنت میں رہتے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ اسلامی تہذیب نے شہریت کا کچھ الگ مفہوم بھی متعین کیا تھا، جو غیر محدود تھا، متنوع تھا، اور جو جدید مفہوم کے قریب بھی تھا اور دور بھی (تفصیل کے لئے دیکھئے: ڈاکٹر راشد غنوشی کا مقالہ بعنوان 'المواطنۃ'، ڈاکٹر خلیفہ کواری کا مقالہ بعنوان: المواطنۃ فی الدولۃ القومیۃ مطبوع مجلّہ المستقبل العربی، ۲۰۰۱ء، ڈاکٹر محمد سلیم عوا کا مقالہ بعنوان: فکرۃ المواطنۃ وتطورہا، دکتور محمد عمار کا مقالہ بعنوان: حقوق المواطنۃ فی الاسلام، اور ڈاکٹر سامر مؤید عبداللطیف کا مقالہ وغیرہ)، یہاں تک کہ یوروپی انقلاب کا دور آیا، جس نے مواطنہ کے مفہوم کو محدود کر دیا اور اس کو بڑی حد تک قومیت سے جوڑ دیا، ہم اس مقالہ میں اسی موضوع پر گفتگو کریں گے۔

شہریت عصر حاضر میں:

موجودہ سیاسی افکار کے مطابق شہریت سے مراد کسی ایسے معاشرہ میں شامل ہونا ہے جس کا سیاسی، سماجی اور ثقافتی ڈھانچہ ایک ہو، (موسوعۃ ویکیپیڈیا الحرۃ، اصطلاح 'مواطنہ') جس کی بنیاد پر حقوق وواجبات مرتب ہوتے ہوں، لہذا شہریت کی موجودہ تعریف متعین حکومت کی ارتباط ہے، لہذا جو ان حقوق سے مستفید نہ ہو وہ وہاں کا شہری نہیں کہلائے گا، چنانچہ شہری اس سماجی معاہدہ میں داخل ہوگا جو شہریوں اور حکومت کے درمیان ربط پیدا کرتا ہے، اسی وجہ سے اکثر دستور شہریوں کے حقوق اور ان کے فرائض مرتب کرتا ہے، اس روشنی میں شہریوں کے فرائض اس طرح ہیں:

۱- ملک سے وفاداری کا تعلق رکھنا۔

۲- مالی واجبات کو برداشت کرنا، جب مطالبہ ہو تو ٹیکس ادا کرنا، فوج میں شامل ہونا، دستور اور عمومی نظام کا احترام کرنا، عوامی سرمایہ کی حفاظت کرنا، وطن کے ساتھ خیانت نہ کرنا، اشتعال انگیز افواہوں کو روکنا، ملک کی حفاظت میں لوگوں کے شانہ بشانہ رہنا۔

۳- عوامی زندگی میں شریک ہونا، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں میں حصہ لینا۔

۴- تمام شہریوں کو اس کے شہری ہونے کی بنیاد پر قبول کرنا، چاہے ان کا عقیدہ اور مذہب کچھ بھی ہو۔

ملک کی ذمہ داریاں درج ذیل ہیں:

۱- ملکی حقوق کی حفاظت کرنا، شہریوں کے حقوق، ان کی آزادی، عزت، انسانیت اور ان کی زندگی کی حفاظت کرنا۔

۲- عدل وانصاف اور مساوات کے ساتھ سیاسی، سماجی، اقتصادی، صحت، ثقافت، تعلیم، قانون اور عدالت کے امن وامان کو فراہم کرنے کیلئے سنجیدہ کوشش کرنا۔

۳- حقوق وواجبات اور مواقع فراہم کرانے میں شہریوں کے درمیان برابری کا معاملہ کرنا۔

۴- دستور اور انصاف پر مبنی قانون کے مطابق دولت کی تقسیم عادلانہ طور پر ہو، عادلانہ قوانین کی حفاظت، اس کے

نفاذ اور ہر شہری کو ایک پر امن زندگی فراہم کرنے کے لئے سنجیدہ کوشش کرنا (حوالہ سابق)۔

وطنیت (شہریت) کی اصطلاح کا استعمال وطنی فکر کو اپنانے اور اس کو ایک محور کے طور پر ماننے میں ہوتا ہے، لہذا وطنی وہ ہے جس نے اس ملک کی فکر کو اپنا لیا ہو اور وطن سے جذبۂ محبت کا اظہار کرتا ہو۔

موجودہ زمانہ میں شہریت کا تحقق قومیت سے ہوتا ہے، اس طور پر کہ وہی شخص اس ملک کا شہری ہوسکتا ہے جو اس ملک کے کسی آدمی کا بیٹا ہو یا اس نے قانونی طور پر اس ملک کی شہریت حاصل کرلی ہو، اس لحاظ سے شہریت کے بنیادی ڈھانچہ میں حکومت، قوم، زمین اور وہ جامع تعلق جو قومیت کی نمائندگی کرے، شامل ہیں، اس لئے کہ شہریت کا یہ نظریہ اس کلیسا کے نظریہ کے مقابلہ میں ظاہر ہوا جو قوم پرست انقلابیوں کے خلاف اپنے لوگوں کو سمیٹے ہوئے تھی۔

پروفیسر علی کواری لکھتے ہیں: یورپ میں تین بڑی بڑی تبدیلیاں ہوئیں، انہی تبدیلیوں نے موجودہ جمہوری حکومت میں شہریت کی بنیاد کو راسخ کیا ہے، وہ تین تبدیلیاں اس طرح ہیں:

۱-کلیسا اور بادشاہوں کے درمیان کشمکش کے نتیجے میں جمہوری حکومت کا ظہور۔

۲-سیاست میں شہریوں کی شرکت۔

۳-ایسے قوانین کی ترتیب جو شہریت کی بنیاد پر تعلقات استوار کرتے ہیں، لیکن گلوبلائزیشن کے پروپیگنڈہ کے دور میں شہریت مراجعت کے مرحلہ سے گزر رہی ہے جو ہر طرح کی قومی پابندیوں سے آزاد ہونا چاہتی ہے، جیسا کہ موجودہ دور میں یورپی یونین کا حال ہے، کہ جس نے شہریت کے سارے حدود کو توڑ دیا ہے (دیکھئے، مقالہ: علی الکواری)۔

یورپ اپنے سیاسی اور اقتصادی اتحاد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے امریکا اور چین کے بعد دوسری یا تیسری اقتصادی طاقت بن گیا ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو بعض ملکوں کو اقتصادی افلاس سے بچانا ممکن نہ ہوتا، جیسے یونان، اسپین اور اٹلی وغیرہ، اسی طرح اگر یہ اتحاد نہ ہوتا تو یورپ کے بعض ممالک اتنی زبردست سیاسی قوت حاصل نہ کرپاتے جس سے وہ اپنا اور اپنے مفاد کا دفاع کرسکیں، اسی طرح عالمی اور علاقائی سطح پر ایسی سیاسی قوت حاصل ہوئی جو قذافی جیسی حکومت کو گرانے کا ذریعہ بنی، اور اس کی فوجی قوت یہاں تک پہونچ گئی کہ اس نے امریکا کے تعاون سے ناٹو کی فوجی قوت کے ذریعہ تمام بڑی فوجوں کو اکٹھا کرنے کیلئے زبردست مال بینک کو فراہم کیا۔

اس تفصیل سے میرا مقصد اس پہلو کو سامنے لانا ہے کہ قومیت یا شہریت کے تنگ دائرہ میں رہنے کے منفی پہلو بھی بہت ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے مثبت پہلو سے فائدہ اٹھائیں اور منفی پہلوؤں کو چھوڑ دیں جس کو ہم آئندہ بیان کریں گے، بلکہ مغرب کا معاملہ اس کے ساتھ منافع کو لینے اور مفاسد کو چھوڑنے کا ہے، جب اس نے دیکھا کہ یورپی اتحاد، بلکہ یورپی امریکی اتحاد میں اس کے مصالح ہیں تو اس نے قومیت اور وطنیت کے تئیں جوش کا اظہار نہیں کیا۔ اسلامی مفکر پروفیسر راشد غنوشی کہتے ہیں:

نئے سیاسی نظریہ میں شہریت کا مفہوم ایک جہت سے قومی حکومت سے جڑا ہوا ہے اور دوسری جہت سے اس کا تعلق جمہوری حکومت سے ہے، اور زیادہ تعلق لادینیت سے ہے، اسلئے کہ عہد کلیسا میں حکومت دین مسیحی سے منسلک تھی جو بہت سی قوموں اور نسلوں کو جمع کرنے کا ذریعہ تھی، ان سب کو جوڑنے والا دین ہی تھا، لیکن جب یورپ نے مذہب کا قلادہ اپنی گردن سے اتار پھینکا تو اس نے قومی وطنیت کو اپنالیا، لیکن اس نے شہریت کو مساوات سے نہیں جوڑا (حوالہ سابق)۔

یہ حقیقت ہے کہ ریڈ انڈین (اصلی باشندے) اور جن امریکیوں نے امریکہ کو وطن بنایا ان دونوں کے درمیان امریکہ میں وطنیت کی بنیاد پر مساوات نہیں برتا گیا، جیسے ماضی قریب تک سیاہ فاموں کے ساتھ بھی مساوات کا تحقق نہیں ہوا، جس طرح المانیا نے نازی حکومت کے دور میں یہودی شہریوں کے ساتھ ہالوکاسٹ کیا، اسی طرح آج یورپ کے دائیں بازو کے انتہاء پسندانہ افکار وہاں کے پشتینی مسلمان اور دوسرے لوگوں کے درمیان مساوات کا قائل نہیں ہے، بلکہ ان کا مطالبہ ہے کہ ان کو یورپ سے بھگا دیا جائے اور ان کی مذہبی آزادی پر پابندی لگا دی جائے، اسی ضمن میں بعض ممالک میں نقاب اور بعض میں حجاب پر پابندی عائد کی گئی ہے۔

جنسیت اور شہریت کے درمیان فرق کے ابعاد:

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہریت کی بنیاد جنسیت پر ہے، جس کے پاس کسی ملک کی جنسیت (نیشنلیٹی) ہو وہ اصولی طور پر دستور میں دئے گئے تمام حقوق سے مستفید ہوگا، اس طرح اس پر کچھ فرائض بھی عائد ہوں گے، اس بنیاد پر اکثر محققین یا عالمی انسائیکلوپیڈیا نے ان دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے، گویا دونوں ایک ہی معنی میں ہیں، یا دونوں کا حاصل ایک ہی ہے (الموسوسۃ الدولیۃ، موسوعۃ کولیر)۔

لیکن ''انسائیکلوپیڈیا بریطانیہ'' نے دونوں کے درمیان اس طرح فرق کیا ہے کہ جنسیت میں شہریت کے علاوہ کچھ دوسرے حقوق بھی شامل ہیں، جیسے باہر سے پشت پناہی وغیرہ (دائرۃ المعارف بریطانیہ، مصطلح 'المواطنہ')۔

میری رائے یہ ہے کہ یہ فرق جوہری نہیں ہے، اسلئے کہ ملک کے تئیں ہر شہری کا یہ حق ہے کہ ملک کا دفاع کرے اور ہر طرح کے وسائل سے اس کی حفاظت کرے، یہاں تک کہ ملک سے باہر رہنے کی صورت میں بھی یہ فرض عائد ہوتا ہے۔

عالمی شہریت:

بیسویں صدی کے اواخر اور موجودہ صدی کے اوائل میں مغربی مفکرین نے محسوس کیا کہ شہریت کے موجودہ مفہوم کو مشکلات اور عالمی چیلنجز کا سامنا ہے، جیسے انسانی حقوق کے میدان میں سماج و اقتصاد، ٹکنالوجی، عمل وغیرہ میں مساوات کا فقدان، چنانچہ مؤثر تہذیب و مذہب پر مبنی قومیں، مختلف ثقافتیں، گلوبلائزیشن کا ظہور اور اقوام متحدہ کی جانب سے انسانی حقوق وغیرہ کی وجہ سے شہریت کے مفہوم میں وسعت دینے اور اسے عالمی بنانے کی ضرورت پڑی، تا کہ ایک نئی اصطلاح

سامنے آئے اور وہ ہے ''بین الاقوامی شہریت''، لہذا اب اس کا دائرہ وسیع تر ہوگیا ہے، جس کی صفات درج ذیل ہیں:

۱- ملک کے اندر غیر ملکیوں کے حقوق اور ان کی آزادی کا احترام کرنا۔

۲- ملک کی اپنی تہذیب اور مذہب کے علاوہ دوسرے مذاہب وثقافت کو تسلیم کرنا۔

۳- مختلف سیاسی واقتصادی آئیڈیالوجی کو سمجھنا اور اس کو عمل میں لانا۔

۴- بین الاقوامی معاملات (امور) کا خیال رکھنا۔

۵- پرامن زندگی پر لوگوں کو ابھارنا اور بین الاقوامی امن وسلامتی کے فروغ میں شریک ہونا۔

۶- اختلاف وکشمکش کے ماحول میں تشدد سے بچتے ہوئے ڈائیلاگ کی حوصلہ افزائی کرنا۔

بین الاقوامی شہریت کے مفہوم کی اس وسعت نے قومیت کے دائرہ کو کمزور کردیا ہے، یہ اصطلاح اسلامی شہریت کے مفہوم سے قریب تر ہے، اس لئے کہ وطن سے کسی ایک جماعت کا قومی وطن مراد لینا یا اس جماعت کے کسی چھوٹے یا بڑے جزء کی جنس سے اس کی تحدید کردینا اگرچہ اس کے بعض حقوق اسلام میں ہیں (جیسا کہ ہم آگے بیان کریں گے) لیکن یہ مناسب نہیں ہے کہ اس کا دائرہ اتنا محدود اور تنگ ہو کہ حقوق وواجبات اس تنگ دائرہ میں منحصر ہو کر رہ جائیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تلخ تجربات کے بعد دنیا اسلام اور اس کے عظیم اصول کی طرف لوٹنے پر مجبور ہورہی ہے، چاہے فوراً لوٹے یا کچھ تاخیر سے، اللہ تعالی فرماتا ہے:

''سنريهم أياتنا فى الأفاق وفى أنفسهم حتى يتبين لهم أنه الحق أو لم يكف بربك أنه على كل شئيى شهيد'' (سورہ فصلت: ۵۳)۔

موجودہ شہریت کے نظریہ کے سلسلے میں اسلام کا موقف

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام معاشرہ، امت اور حکومت کو عقیدہ اور دین کی بنیاد پر قائم کرتا ہے، اسلام اس بات کی پوری کوشش کرتا ہے کہ اصولی، نظریاتی، تطبیقی اور عملی ہر اعتبار سے حقیقی اخوت ومحبت قائم ہو، اللہ تعالی حصر کے ساتھ فرماتا ہے: ''**إنما المؤمنون إخوة**'' (سورہ حجرات: ۱۰) اور تمام مسلمانوں پر اخوت کے حقوق کو لازم قرار دیتا ہے، یعنی آپس میں ایک دوسرے سے دوستی، تعاون کرنا، کفالت کرنا اور ضمانت لینا وغیرہ، اللہ تعالی فرماتا ہے:

''والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر و يقيمون الصلوة ويؤتون الذكاة ويطيعون الله ورسوله أولئك سيرحمهم الله إن الله عزيز حكيم'' (سورہ: توبہ: ۷۱)۔

بلکہ اللہ تعالی نے ایمان کی حفاظت اور دشمنوں کو روکنے کیلئے اس جامع ولایت کی ضرورت کو بھی بیان کیا ہے جس کی

بنیادایمان پر ہو،اس جامع ولایت کے مقابلہ میں جوکفر ونفاق پر قائم ہو،اورجس کا مقصداسلام اورمسلمانوں کی بیخ کنی ہو:

”والذین کفروابعضهم أولیاء بعض الا تفعلوه تکن فتنة فی الأرض وفساد کبیر“ (سورہ أنفال :۷۳)۔

حدیث میں اس ایمانی اخوت اور اس کے حقوق وآثارکو بڑی وضاحت سے بیان کیا گیا ہے ۔(اس موضوع پرحدیث کی کتابیں اوربطورخاص ریاض الصالحین دیکھی جاسکتی ہے)۔

اسلام شہریت میں مثبت اورانسانی دونوں پہلوؤں کی رعایت کا داعی:

اس جامع ایمانی اخوت کے ساتھ ساتھ اسلام نے اس کے اس مثبت پہلو سے اعراض نہیں کیا ہے جوتعصب اورقومیت ووطنیت کو پارہ پارہ کرنے والا نہ ہو،اس کی تفصیل درج ذیل ہے:

(۱)اسلامی مفہوم میں وطن سے مرادامت اسلامیہ کاوطن کبیر ہے، چنانچہ خلافت راشدہ سے دولت عثمانیہ کے زوال تک اسلامی حکومت میں شہری (چاہے مسلمان ہو یا کافر)عالم اسلام کے طول وعرض میں بغیرکسی قیدوشرط کے گھوم سکتا تھا، گویااس کی جنسیت جنس اسلام ہے،لہذاوہ جہاں بھی قیام کرے وہ اس کا وطن ہے،اس کواس کے حقوق حاصل ہوں گے،اسی طرح وطن کے تئیں اس کے واجبات بھی ہیں، چنانچہ مسلمان کاولاءوسیع اسلامی ملک ہے۔

(۲)اسی کے ساتھ اسلام نے انسان کے فطری پہلو کی رعایت کی ہے، کیونکہ انسان کواپنی جائے پیدائش سے محبت ہوتی ہے، بلکہ اس علاقہ سے اس کومحبت ہوتی ہے جس کی طرف خودکومنسوب کرتا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اورصحابہ کرام کو مکہ مکرمہ سے حددرجہ محبت تھی،صحیح روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کومخاطب کر کے فرمایا:

”ما أطیبک من بلد وأحبک إلی ولولا أن قومک أخرجونی منک ما سکنت غیرک“ (سنن الترمذی،حدیث نمبر:۳۹۲۶)۔

اورصحابہ کرام نے جس وقت مکہ سے مدینہ ہجرت کی اس وقت انہیں مکہ سے والہانہ تعلق تھا،حضرت بلالؓ فرماتے تھے:

ألا لیت شعری هل أبیتن لیلة   بواد و حولی اذخر وجلیل
وهل أردن یوما میاه مجنة   وهل یبدون لی شامة وطفیل

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جب یہ سنا توانہوں نے رسول اللہ ﷺ کواس کی خبردی،آپ ﷺ نے فرمایا:

”اللهم حبب إلینا المدینة کحبنا مکة أوأشد، اللهم بارک لنا فی صاعنا وفی مدنا وصححها لنا وانقل حماها إلی الجحفة“ (صحیح البخاری،کتاب فضائل المدینة،حدیث نمبر:۱۷۹۰)۔

اللہ نے آپ ﷺ کی دعاءقبول فرمائی،اوران کے دلوں میں مدینہ کی محبت پیدافرمادی۔

اسی طرح مسلم شعراء نے بھی وطن کی محبت میں اشعار کہے ہیں، ابن رومی کہتے ہیں:

ولي وطن أليت ألا أبيعه ولا أرى غيرى له الدهر مالكا

(نہر الآداب وثمر الالباب للحصیری، ج۱، ص: ۲۸۳)

اور شاعر ابن الأبار اپنے شاندار قصیدہ کے ذریعہ وطن پر اس طرح آنسو بہاتا ہے:

أنين واشتياق وارتياع لقد حملت ما لا يستاع

فلعبرات بعدهم انحدار وللزافرات إثرهم ارتفاع

نأوا حقا ولا أدرى أيقضى تلاق أو يباح لنا اجتماع

(ڈاکٹر علی دباب، فی الشعر العربی الاندلسی، ص: ۲۲۶)

اندلس کے اموی خلیفہ عبد الرحمان الداخل نے جب کھجور کے درخت کو دیکھا تو مشرق اور شام سے ان کی محبت بھڑک اٹھی، انہوں نے کہا:

فقلت شبيهى فى التغرب والنوى وطول اكتئابى عن بنى وعن أهلى

ان جسمى كماتراه بأرض وفؤادى و مالكيه بأرض

(حوالہ سابق، ص: ۵۰)

لیکن مسلم شعراء کی محبت اپنے ملک سے ان مقامات سے متأثر ہو کر تھی جن کا اسلام میں بڑا مقام ہے، چنانچہ تمام مسلم شعراء مکہ، مدینہ اور بیت المقدس سے دوسرے مقامات کے مقابلہ میں زیادہ محبت رکھتے ہیں، اسلامی شاعر علامہ اقبال کہتے ہیں:

أشواقنا نحو الحجاز تطلعت كحنين مغترب الى الأوطان

(فلسفۂ اقبال، ط: دراحیاء الکتب العربیۃ، قاہرہ، ص: ۹۱)

ب: اسلام یہ کہتا ہے کہ انسان کو اس ملک سے نکالنا جہاں وہ پیدا ہوا ہے یا اس علاقے سے نکالنا جہاں سے اس کا تعلق ہے جہاد اور قتال کے اہم وجوہات میں سے ہے، جہاد کے سلسلے میں جو پہلی آیت نازل ہوئی اس میں اللہ تعالی فرماتا ہے:

" أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وان الله على نصرهم لقدير الذين اخرجوا من ديارهم بغير حق الا أن يقولوا ربنا الله ولو لا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومسجد يذكر فيها اسم الله كثيرا ولينصرن الله من ينصره ان الله لقوي عزير" (سورۂ حج: ۳۹:۴۰)۔

یہاں اللہ تعالی نے جہاد کی مشروعیت کا پہلا سبب ملک بدر کرنا بتایا ہے، اس کے ذریعہ اس حکم کی تاکید ہے جو اللہ نے

دوسرے انبیاء کو دئے ہیں، چنانچہ اللہ تعالی طالوت وجالوت کے قصہ میں اس حقیقت کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"ألم تر الى الملأ من بنى اسرائيل من بعد موسى اذ قالوا لنبي لهم ابعث لنا ملكا نقاتل فى سبيل الله قال هل عسيتم ان كتب عليكم القتال ألا تقاتلوا قالوا وما لنا ألا نقاتل فى سبيل الله وقد أخرجنا من ديارنا وأبناء نا فلما كتب عليهم القتال تولوا الا قليلا منهم و الله عليم بالظالمين" (سورہ بقرۃ:۲۴۶)۔

ج: قرآن کریم نے ایسے مسلمان جو اسلامی حکومت کے زیر سایہ رہتے ہیں اور وہ مسلمان جو اس حکومت کے زیر سایہ نہیں رہتے دونوں کے درمیان فرق بیان کیا ہے، پہلے طبقہ کا حق اسلامی حکومت پر یہ ہے کہ اس کی پوری پوری حمایت ونصرت کی جائے اور دوسرے طبقہ کے لئے ولایت ونصرت کا حق ہے، البتہ اگر کسی قوم یا کسی اسلامی حکومت سے اس کا معاہدہ ہو تب یہ حق نہیں ہوگا، اللہ فرماتا ہے:

"ان الذين أمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئک بعضهم اولياء بعض والذين أمنو ولم يهاجروا ما لكم من ولايتهم من شيي حتى يهاجروا وإن استنصروكم فى الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم وبينهم ميثاق والله بما تعملون بصير" (سورۃ أنفال:۷۲)۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو اسلامی حکومت کے زیر سایہ زندگی گزارتے ہیں ان کو زیادہ حقوق حاصل ہوتے ہیں بمقابلہ اس شخص کے جو اس حکومت سے باہر ہے، اگر چہ وہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو، چنانچہ اس حالت میں اسلامی حکومت ان کے ساتھ معاہدہ وصلح نامہ اور مصالح کے مطابق معاملہ کرے گی۔

د۔ مدینہ کے دستاویز یا دستور نے صرف عقیدہ کے رباط کو ذکر کر کے شہریت اور ایک مشترک ملک میں زندگی گزارنے کے رباط کو چھوڑ نہیں دیا، بلکہ رباط کی دونوں قسموں کو اس کی حیثیت اور اہمیت کے ساتھ سے ملایا۔

اول عقیدہ میں یکسانیت کا رباط: اس دستاویز کی عبارت ہے: "أن اليهود أمة و المسلمون أمة"، یعنی یہود ایک امت ہیں اور مسلمان ایک امت ہیں، یعنی عقیدہ، مذہب اور شعائر واقدار کے لحاظ سے امت۔

دوم ملک میں شرکت کا رباط: عبارت یہ ہے: "وأن يهود بنى عوف أمة مع المؤمنين، لليهود دينهم، وللمسلمين دينهم" (بنی عوف کے یہود مسلمانوں کیساتھ ایک قوم ہیں، یہود کیلئے ان کا اپنا مذہب ہے اور مسلمان کیلئے ان کا اپنا مذہب)۔

پھر اس کے بعد یہود کے دوسرے قبائل، مثلا بنو نجار وغیرہ کا ذکر کیا، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اور یہود ایک امت ہیں، لیکن ان دونوں کی وحدت ایک رباط کے ذریعہ ہی ممکن ہے، جو دونوں کو شامل ہو، اسی چیز کو ہمارے زمانہ میں رباط

شہریت سے تعبیر کرتے ہیں، شیخ راشد غنوشی کہتے ہیں:

نئی اصطلاح میں اس کو سیاسی یا شہری امت کہہ سکتے ہیں، یعنی ایک سیاسی نظام میں شریک ہیں جو ان کو اہل کتاب اور اہل ذمہ ہونے کے اعتبار سے برابر کے حقوق عطا کرتا ہے، یعنی ایسے شہری جس نے اسلامی حکومت کی جنسیت حاصل کی ہو (الاسلام والمواطنۃ، مؤلف: شیخ راشد غنوشی)۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی ملک میں رہنے والے غیر مسلموں کو شہریت کے جملہ حقوق حاصل ہوگے، اس بنیاد پر کہ وہ ملک کے حصہ دار ہیں، چنانچہ ان پر شہریت کے فرائض اور ذمہ داریاں بھی ہوں گی اور اس کے حقوق بھی، اس سلسلے میں ان کی حالت مسلمانوں جیسی ہے، اس لئے مذکورہ دستاویز میں حقوق وفرائض کے سلسلہ میں مدینہ کی حفاظت کی بھی صراحت ہے۔

یہاں تک کہ جزیہ کا مسئلہ غیر مسلم کے لئے ضمانت کی طرح مالی واجبات میں سے ہے، جیسے اس مقصد کے لئے مسلمان زکوۃ دیتے ہیں، جب نام کے سلسلے میں مشکل پیش آئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دونوں اصطلاح کو ایک کر دیا اور بنی تغلب پر ان کے مطالبہ کے مطابق زکوۃ متعین فرمایا (الأموال لأبی عبید، نیز دیکھئے: فقہ الذکاۃ لشیخ القرضاوی) جبکہ زکاۃ کے مقابلہ میں جزیہ کی مقدار بہت کم ہے، موجودہ زمانہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ رائے ہمیں یہ راہ بتاتی ہے کہ ہم ٹیکس اور اس کے مصرف کے عملی کاز کو یکساں کرنے کی اہمیت کو اختیار کریں (تفصیل کے لئے دیکھئے: الأموال لأبی عبیدہ اور شیخ قرضاوی کی فقہ الذکاۃ)۔

اس کی مزید تفصیل دستاویز مدینہ کی دفعات میں آئے گی۔

اختصار کے ساتھ خلاصہ اور موازنہ:

سابقہ تفصیل کے مطابق یہ بات واضح ہوگئی کہ موجودہ سیاسی عرف میں شہریت کی اصطلاح یورپ میں پروان چڑھی ہے، دو اہم پہلوؤں کی تکمیل کیلئے، یہ دونوں پہلو اس طرح ہیں:

اول: شہریت کی یہ اصطلاح جس میں قومیت بھی شامل ہے، بلکہ اس کے لوازمات میں سے ہے دوسرے رابطہ کی جگہ پر آجائے خاص کر دین یا کلیسا کے رابطہ کی جگہ لے لے جس نے بہت سر اٹھایا اور مذہبی جنگوں کا سبب بنی، اسی طرح یہ قوانین، حقوق اور علوم وفنون کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنی، اسی لئے یورپ نے اس رابطہ کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا اور اس کی اتنی قدردانی کی، تاکہ وہ دینی تقدس کی جگہ لے لے۔

دوم: ضروری فرائض اور ذمہ داریوں کی ادائیگی کے ساتھ ہر شہری کو انسانی، سیاسی، اقتصادی، سماجی، علمی اور ثقافتی حقوق فراہم کرنا، شہری ہونے کی بنیاد پر ہر ایک کے ساتھ مساوات کا برتاؤ کرنا۔

ان دونوں امور کو اگر اسلامی شریعت اور اس کے عام اصول پر پرکھیں تو ہم آسانی سے اس نتیجہ پر پہونچ سکتے ہیں کہ

دوسرا معاملہ قابل قبول، بلکہ اصولی اعتبار سے مطلوب ہے، کیونکہ اسلام عدل ومساوات کا مذہب ہے اور برابری کا حق دیتا ہے اور ہر ایک شہری کو چاہے وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم جو اس کی سرزمین میں رہتا ہے اس کو پورا حق دیتا ہے۔

اعتراض پہلے پہلو پر ہوتا ہے، وہ یہ کہ شہریت کو عقیدہ (اسلام) کے درجہ میں رکھا جائے، یہ شرعاً ناجائز ہے، کوئی بھی مسلمان اس کو قبول نہیں کرسکتا، کیونکہ کتاب وسنت کے دلائل اس کی حرمت وممانعت پر دال ہیں:

(۱) اللہ تعالی فرماتا ہے: ”ورضیت لکم الاسلام دینا“ (سورہ مائدۃ:۳۰)۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ مکمل طور پر ہمارا حقیقی تعلق اسلام سے ہونا چاہئے۔

(۲) اللہ تعالی کا یہ ارشاد: ”إنما المؤمنون اخوۃ“ (سورہ حجرات:۱۰)۔

لہذا جو اخوت، اخوت کی تمام قسموں پر فوقیت رکھتی ہو وہ ایمانی اخوت ہے، جو ہمیں جوڑے ہوئے ہے، دسیوں قرآنی آیات اور احادیث نبویہ امت اسلامیہ کی وحدت، امت اسلامیہ کی جانب نسبت کرنے اور یہ کہ مسلمان ایک جسم کی طرح ہے، بلکہ ایک ہاتھ ہے پر توجہ مرکوز کراتی ہیں (ان احادیث کے لئے دیکھئے: ریاض الصالحین)۔

(۳) بہت سی آیات اور احادیث اس پر دال ہیں کہ ولاء صرف اللہ، اس کے رسول اور مسلمانوں کیلئے ہے، مثال کے طور پر قرآن کی یہ آیت:

” قل ان کان أباؤ کم وأبناؤکم وإخوانکم وأزواجکم وعشیرتکم وأموال ن اقترفتموھا وتجارۃ تخشون کسادھا ومساکن ترضونھا أحب الیکم من اللہ ورسولہ وجھاد فی سبیلہ، فتربصوا حتی یأتی اللہ بأمرہ واللہ لایھدی القوم الفاسقین“ (التوبہ:۲۴)۔

واضح طور پر یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام، اللہ، اس کے رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے پہلے کسی قوم، خاندان، اعزہ واقارب، وطن اور مال سے تعلق رکھنا جائز نہیں ہے، اسی طرح اس کی تاکید اس آیت سے بھی ہوتی ہے:

”لا تجد قوما یؤمنون باللہ والیوم الاخر یوادون من حاد ا للہ ورسولہ ولو کانوا أبائھم وأبناھم أو اخوانھم أو عشیرتھم اولئک کتب فی قلوبھم الایمان أیدھم بروح منہ ویدخلھم جنات تجری من تحتھا الأنھر خلدین فیھا رضی اللہ عنھم ورضواعنہ أولئک حزب اللہ ألاحزب اللہ ھم المفلحون“ (المجادلۃ:۲۲)۔

یہ مسئلہ تمام مسلمانوں کے درمیان متفق علیہ ہے کہ ولاء اور تعلق صرف اللہ، اس کے رسول، اسلام اور مسلمانوں کیلئے ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس ولاء کے علاوہ اور کوئی ولاء نہیں ہے، اور اس نسبت کے علاوہ اور کوئی نسبت نہیں ہے۔ قرآن کریم، سیرت نبوی اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر غور کرنے پر ہم اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ اسلام ہر طرح کی ولاء

اور نسبت کو قبول کرتا ہے اور بہت دقت اور حکمت کے ساتھ ان کا احاطہ کرتا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ ولاء کی تمام قسمیں پہلے والے ولاء کے ضمن میں ہوں، یا اس سے تعارض نہ ہو، اسی طرح اسلام خود بھی شہریت، قرابت اور قومیت وغیرہ کے ذریعہ ایسی ولاء کو وجود میں لاتا ہے جو مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے درمیان جامع ہو، اس بنیاد پر شہریت اور اس طرح کے افکار کو قبول کرنا شریعت اسلامی کی روشنی میں جائز ہے، البتہ ایسا دو دائروں میں رہ کر ہوگا:

پہلا دائرہ جو مسلمانوں کیلئے خاص ہے: یہ ہے کہ مسلمان اپنی قوم، خاندان اور قبیلہ سے محبت و نصرت اور خدمت کا تعلق رکھے، بلکہ وہ ان کے حقوق دوسروں کے مقابلہ میں پہلے ادا کرے، اس بابت کوئی چیز مانع نہیں ہے، البتہ شرط یہ ہے کہ اس کا بنیادی رشتہ اور تعلق اسلام اور مسلمانوں کیلئے ہو، اور یہ چیز عصبیت اور عنصریت تک نہ پہونچنے پائے، دوسرے کے حقوق پامال نہ ہوں، بلکہ یہ صرف نیکی اور تقوی کی بنیاد پر تعاون کے جذبہ سے ہوا اور اس بنیاد پر کہ قرابت دار حسن سلوک کے زیادہ مستحق ہیں، جیسے قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ نیکی اور احسان میں الاقرب فالاقرب کو مقدم رکھنے پر دلالت کرتی ہیں:

حضور ﷺ نے جب معاذ بن جبل کو یمن بھیجا تو ان سے فرمایا: "**خذها أى الصدقات من أغنياء هم وردوها على فقراء هم**" (صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۱۳۹۵، صحیح مسلم، حدیث نمبر: ۱۹، سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۱۵۸۴)۔

یہ حدیث اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ کسی خاص ملک کے غریب شہری وہاں کے اغنیاء کے صدقات کے زیادہ مستحق ہیں، لیکن یہ جائز نہیں کہ کسی خاص ملک یا قوم کے اغنیاء کسی دوسرے ملک یا قوم کے فقراء کا خیال نہ رکھیں، اس بات کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، بلکہ یہ اسلام کے رحمت عامہ اور اخلاقیات کے خلاف ہے، مثلاً اس میں کوئی حرج نہیں کہ ایک مسلمان کہے کہ میں عربی مسلمان ہوں، میں قطری ہوں، میرا تعلق فلاں قبیلہ سے ہے، اس شرط کے ساتھ کہ اس کا ولاء، اس کی نصرت اور محبت سب سے پہلے اللہ، اس کے رسول، اسلام اور مسلمانوں کیلئے ہو، اس کے بعد اسلام کے پاکیزہ اصول کے ضمن میں دوسرے فروعی تعلقات آئیں گے، اور یہ تعلق ظلم و زیادتی اور فخر و تکبر سے پاک ہو، یا اس سے کسی کی تحقیر شان مقصود نہ ہو۔

اس اصول کی رو سے حضور ﷺ ان فروعی نسبتوں کی اجازت دیتے تھے، جبکہ یہ نسبتیں مہذب و مثقف ہوں اور ہر اس چیز سے پاک ہوں جنکی اسلام میں گنجائش نہیں۔

نسبت کے اجزاء ترکیبی:

اگرچہ ہم نے نسبت کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ ایک نظریہ ہے، یا شعور و احساس ہے، یا نفسانی ضرورت ہے، یا ایک رجحان ہے، لیکن کوئی بھی انسان اس سے خالی نہیں، بلکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی عقل مند انسان نسبت سے خالی ہو، آج کے عرف میں ملکی نسبت مندرجہ ذیل اجزاء سے مرکب ہوتا ہے: شخصیت، قومیت (یعنی جس قوم کی طرف منسوب ہو) ولاء، یہ

تعلق کی اصل ہے، محبت، نرمی، ملک اور جمہوریت کے حاکم دستور وقوانین اور معیار کو لازم پکڑنا۔

اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ نسبت اپنے اجزاء کے ساتھ اگر وہ اسلامی نسبت کا بدل نہ ہو اور عقیدہ کی جگہ نہ لے تو اس میں کوئی حرج نہیں، بلکہ یہ ممکن ہے کہ اس ملکی رابطہ کو ایک قومیت اور ایک زبان بولنے والے متحدہ شہریوں کے تعلقات کو بڑھانے کا ذریعہ بنالیا جائے اور حقوق وواجبات کی پابندی مزید بڑھ جائے، لسانی یکسانیت اور قرابت کے ذریعہ محبت وقربت میں مضبوطی آئے، اس طرح یہ نسبت ایجابی ہوگی نہ کہ سلبی، نفع بخش اور طاقتور ہوگی نہ کہ نقصان دہ اور تفریق پیدا کرنے والی۔

دوسرا دائرہ جو مسلم اور غیر مسلم دونوں کو شامل ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام نے خود شہریت کا استعمال کیا ہے، تاکہ اس بڑے اسلامی ملک میں رہنے والے تمام شہریوں کے درمیان رابطہ کا کام کرے، جیسے گذشتہ صفحات میں مذکور دستاویز مدینہ کے ذیل میں بیان ہوا، اس بارے میں مزید ہم آئندہ بحث کریں گے۔

غیر مسلموں کو حکومت اور ملک سے جوڑنے کے لئے، اور ان کے ولاء اور نصرت کو مؤکد کرنے کے لئے مختلف اہم روابط کو مضبوط کرتا ہے، جس کا مقصد مسلمان اور غیر مسلم مثلاً اہل کتاب کے درمیان زندگی گزارنے کو یقینی بنانا ہی نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصد شہریت کے حقوق اور فرائض کی تکمیل بھی ہوتا ہے، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام درج ذیل طریقہ سے مشارکت کی تاکید کرتا ہے:

۱) جامع انسانی اشتراک: اس دائرہ میں بہت سی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تمام انسان درج ذیل چیزوں میں مشترک ہیں:

الف: سارے انسان کی اصل ایک ہے، سب کے سب آدم اور حواء کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں، قرآن کی ایک سے زائد آیت میں اس بات کی تاکید دراصل تمام انسانوں میں حقیقی مساوات کے اصول کو ذہن نشین کرانا ہے، پھر اس پر ترکیز کہ ہماری اصل مٹی اور زمین ہے، اس سے بھی وطن کی اہمیت ثابت ہوتی ہے، میں ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ حوا سے پہلے زمیں ہماری ماں ہے اور یہی ہماری آغوش ہے، جس میں مرنے کے بعد ہمیں جانا ہے، یہ ہماری بوسیدہ ہڈیوں کی حفاظت کرے گی، یہاں تک کہ اسی سے ہم کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا، اللہ تعالی فرماتا ہے:

"منها خلقنا كم وفيها نعيد كم ومنها نخرجكم تارة أخرى" (سورہ طہ:۵۵)۔

ب۔ رحم انسانیت کا تعلق تمام انسانوں کو جوڑے ہوئے ہے، چنانچہ ایک باپ اور ایک ماں (آدم وحواء) کی اولاد ہونے کی بناء پر سب آپس میں بھائی بہن ہیں، اسلئے قرآن تمام انسانوں سے اس قرابت اور تعلق کی رعایت کرنے کا مطالبہ کرتا ہے:

"يايها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة وخلق منها زوجها وبث منها رجالا كثيرا ونساء واتقوا الله الذى تسائلون به والأرحام إن الله كان عليكم رقيبا"(سورہ نساء:۱)۔

یہاں اس رحم کی وضاحت رحم بشریت کے ذریعہ کی گئی ہے۔

ج۔حضرت آدم علیہ السلام پوری انسانیت کے باپ (ابوالبشر) ہیں، وہ صرف مسلمانوں یا اہل کتاب کے باپ نہیں ہیں، تمام انسانوں کے اس باپ کے بارے میں اللہ نے فرمایا کہ ہم نے ان کو اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا اور پھر ان میں اپنی روح پھونکی اور فرشتوں سے ان کو سجدہ کروایا، ارشاد باری ہے:

"فاذا سويته ونفخت فيه من روحى فقعوا له ساجدين"(سورہ حجر:۲۹)۔

ان تین مفاہیم کی تاکید انسان کے بحیثیت انسان اس کی اہمیت اور اس کے بلند مرتبہ پر دلالت کرتی ہے۔

د۔اللہ تعالی نے انسان کو انسان ہونے کی حیثیت سے سرفراز فرمایا ہے، اللہ فرماتا ہے:

"ولقد كرمنا بنى آدم وحملنهم فى البر و البحر و رزقناهم من الطيبت وفضلنا هم على كثير ممن خلقنا تفضيلا"(سورہ اسراء:۷۰)۔

یہ انسانی اشتراکات آپسی تعلقات ومحبت کو تقویت دیتے ہیں۔

۲) مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان جامع اشتراکات اس طور پر ہیں کہ اسلام نے ان سب کو ایک خصوصیت دی ہے، اہل کتاب کو اہل کتاب ہونے کے اعتبار سے اور مسلمانوں کو اہل ایمان ہونے کے اعتبار سے، اسی لئے ان کی پاکدامن عورتوں سے نکاح کی اجازت دی ہے اور ان کے ذبیحہ کو جائز بتایا ہے، یہ وہ اشتراکات ہیں جو مسلمانوں اور اہل کتاب کے درمیان تعلقات کو پہلے سے زیادہ مضبوط بناتے ہیں، اس لئے کہ کتابی کبھی ان کی بیوی کا باپ ہوسکتا ہے یا دادا، یا ماموں ہوسکتا ہے۔

۳) انسانی اشتراکات اس طور پر بھی ہیں کہ انسان کو اللہ نے پیدا کیا اور مدنی الطبع بنایا ہے، وہ سماج، مدنیت اور تمدن سے محبت رکھتا ہے، اسی لئے اللہ نے مسلمانوں سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ جو بھی چاہے اس سے تعاون حاصل کرے، اس کے ساتھ تعاون کا معاملہ کرے، اس کے دین اور مذہب کو دیکھے بغیر، اللہ فرماتا ہے:

"وتعاونوا على البر و التقوى ولاتعاونوا على الإثم والعدوان واتقواالله إن الله شديد العقاب"(سورہ مائدۃ:۲)۔

یہاں اللہ تعالی نے جس کے ساتھ تعاون کیا جائے اس کا ذکر نہیں کیا ہے، اس لئے کہ یہ کوئی اہم چیز نہیں ہے، اصل ہے تعاون کا محل، اگر محل تعاون بہتر ہے تو تعاون ضروری ہے، اگر برا ہے تو تعاون حرام ہے۔

اسی طرح اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ سب کے ساتھ بیٹھیں، ان سے گفتگو کریں، اگر بحث ومباحثہ ہو تو اچھے طریقے سے ہو، کیونکہ حقیقت کی تلاش میں سب برابر کے شریک ہیں، اللہ فرماتا ہے:

"وانا أو اياكم لعلى هدى أوفى ضلل مبين قل لاتسألون عما أجرمنا ولا نسأل عما تعملون" (سبا:۲۴۔۲۵)۔

اللہ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا کہ اسی اسلوب میں غیر مسلموں، حتی کہ مشرکین وملحدین کو بھی مخاطب کریں۔

یہ تمام اشتراکات ایجابی تعلق اور عدل وانصاف کے ساتھ حقوق کی ادائیگی میں مدد کرتے ہیں۔

دارالاسلام اور دارالحرب (دارالمواطنۃ):

فقہاء کے دور میں جو دار کی تین تقسیم: دار اسلام، دار حرب یا دار عہد مروج ہے، اس میں درحقیقت وطن اور شہریوں کی رعایت مقصود ہے، اسلئے کہ دارالاسلام میں رہنے والے تمام افراد چاہے وہ مسلمان ہوں یا ذمی، اس ملک کے شہری ہیں اور حکومت کے ذمہ ان کے شہری حقوق ہیں، اسی لئے ان افراد پر ملک کے تئیں کچھ ذمہ داریاں اور فرائض بھی ہیں، فقہاء نے لکھا ہے کہ مسلمانوں اور ذمیوں کے درمیان ان کی حفاظت کے واجب ہونے اور دفاع کے سلسلہ میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا، خواہ وہ دار اسلام کے اندر ہوں یا قید میں ہوں، فقہاء کہتے ہیں کہ مملکت اسلامی کی ذمہ داری ہے کہ مسلمان اور ذمی قیدیوں کو آزاد کرانے کی یکساں کوشش کرے، علامہ ابن حزم نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ کوئی ذمی اگر ہمارے ملک میں ہے اور دشمن اس پر حملہ کرنا چاہتا ہے تو اس سے جنگ کیلئے نکلنا فرض ہے، یہاں تک کہ ہم اس شخص کی حفاظت میں اپنی جان دے دیں، جو اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ میں ہے، اس لئے اس کو دشمن کے سپرد کرنا ذمہ کے عقد میں کوتاہی کرنا ہے (السلوک لمعرفۃ دول الملوک لابن الأزرق۔ص:۸۰)۔

اور جہاں تک مستامن کا تعلق ہے جو تجارت یا دوسرے مقصد سے دارالاسلام میں داخل ہوا ہے اور اس نے حکومت یا شہریوں سے امان لے رکھا ہے، تو ایسا شخص شہری نہیں ہوگا، لیکن اس کو بعض حقوق حاصل ہوں گے۔

خلاصہ کلام یہ کہ اسلام مسلمانوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ ایک مؤثر، فعال اور صحیح عقیدہ رکھیں جو اسے ہر اس شخص کے ساتھ بھلائی واحسان کرنے پر آمادہ کرے جو احسان کے مستحق ہیں، اور یہ کہ اس کا عقیدہ اور اس کی شریعت اس پر لازم کرتی ہے کہ وہ اپنے دین، علاقے اور وطن کا دفاع کریں اور ہر اس شخص کا دفاع کریں جو دفاع کے مستحق ہیں حتی کہ حیوانات اور ماحول کا بھی۔

اسلامی نظریہ میں شہریت عقیدہ کے بعد وطن اور شہریوں سے محبت کا مطالبہ کرتا ہے، اور یہ کہ ملک کی خدمت اور اس کی عظمت وشان کیلئے پوری کوشش کرے، اور مثبت طور پر ہر اس سرگرمی میں حصہ لے جس سے ملک کی خدمت اور اس کی ترقی

مقصود ہو، اور ہر طرح کے مطلوبہ وسائل سے وطن کا دفاع کرے (حوالہ سابق)۔

مدینہ کا دستاویز وہ پہلا دستور ہے جو شہریت کے حقوق عطا کرتا ہے:

پہلی اسلامی حکومت مدینہ منورہ میں تشکیل پائی تو یہ حکومت مسلمان اورمہاجرین وانصار کے درمیان بھائی چارہ (مواخات) کی بنیاد پر قائم ہوئی، اوراس بنیاد پر کہ دوسروں کے مقابلہ وہ سب ایک امت ہیں، اوران کی مثال ایک جسم کی سی ہے، اور یہ کہ دشمن کے مقابلہ میں وہ سب متحد ہیں اوراس کی بنیاد غیر مسلموں (یعنی یہود، اہل کتاب اورمشرکین جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے) کے ساتھ عدل وانصاف، شہریت اور برابر کے حقوق وواجبات پر تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک وثیقہ لکھا جس کے اکثر دفعات یہودیوں اور دوسرے مشرکین کے حقوق سے متعلق تھے، یہ دستاویز تقریباً ۴۷ دفعات پر مشتمل تھا، ان میں سے چند اس طرح ہیں:

(۱) اللہ کا ذمہ ایک ہے، ایک ادنیٰ شخص کو بھی اس پر مجبور کیا جائے گا، اور مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ذمہ دار ہیں۔

(۲) جو یہودی ہمارے ماتحت ہیں ان کی مدد کرنا، ان پر ظلم نہ کرنا اوران کے خلاف کسی کا ساتھ نہ دینا ہماری ذمہ داری ہے۔

(۳) مسلمانوں کی امن وسلامتی ایک ہے، چنانچہ جہاد فی سبیل اللہ میں ایک مسلمان کو چھوڑ کر دوسرے مسلمان سے مصالحت نہیں کی جائے گی، مگر عدل وانصاف اور برابری کے ساتھ۔

(۴) جو حملہ آور ہوگا ہم اسے سزا دیں گے۔

(۵) تمہارے درمیان آپس میں چاہے جتنا بھی اختلاف ہو ان سب کو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا۔

(۶) جب تک حالت جنگ میں رہیں مسلمان کے ساتھ یہود بھی خرچ کریں گے۔

(۷) یہودیوں پر یہودیوں کا نفقہ ہے اور مسلمانوں پر مسلمانوں کا نفقہ ہے، اوراس معاہدہ میں شامل افراد میں جو بھی جنگ کرے گا ان کے دشمن کے خلاف مدد کرنا ہر ایک پر ضروری ہے اوران کے درمیان خیر خواہی، نصیحت اور نیکی کا معاملہ ہوگا۔

(۸) کوئی شخص اپنے حلیف کی وجہ سے مجرم نہیں ہوگا اور مظلوم کی مدد کی جائی گی۔

(۹) گھر والوں کی اجازت کے بغیر کسی حرمت کو پامال نہیں کیا جائے گا۔

(۱۰) اس صلح نامہ والوں کے درمیان جو بھی جھگڑا یا اختلاف تھا جس سے فساد کا اندیشہ ہے اس کو اللہ اوراس کے

رسول کی طرف لوٹا یا جائے، اس وثیقہ میں جو اچھی اور بہتر بات ہے، اللہ تعالی اس کے ساتھ ہے۔

(۱۱) یثرب پر حملہ کی صورت میں سب ایک دوسرے کی مدد کریں گے۔

(۱۲) جب مصالحت کے لئے بلایا جائے تو وہ مصالحت کریں گے۔

(۱۳) ہر شخص کو پہلے والوں کے اعتبار سے اس کا اپنا حصہ ملے گا۔

(۱۴) اہل وثیقہ میں سے اوس کے یہود، ان کے غلام اور وہ خود بھی اسی حکم پر ہوں گے جو وثیقہ میں مذکور ہے، بھلائی کے ساتھ جو بھی کوئی گناہ کرے گا وہ اپنے اوپر کرے گا، اللہ اس وثیقہ کی سچی اور نیک باتوں کے ساتھ ہے۔

(۱۵) ظالم اور مجرم کے علاوہ کوئی اس وثیقہ کو نہیں بدل سکتا، جو نکل گیا وہ مامون ہے اور جو مدینہ میں بیٹھا رہا وہ بھی مامون ہے، سوائے ان کے جو ظلم کرے، اللہ نیکی کرنے والے اور متقیوں کے ساتھ ہے (مجموعۃ الوثائق السیاسیۃ۔ص ۴۱۔۴۷)۔

اسی طرح اس وثیقہ میں مذہبی آزادی کی بات پوری وضاحت سے کہہ دی گئی ہے کہ مسلمانوں کیلئے ان کا مذہب، یہود کیلئے ان کا مذہب، یہاں تک کہ بعض انصار صحابہ نے اپنے خاندان کے بعض لوگوں کو جو یہود بن گئے تھے اسلام کی طرف لوٹنے پر مجبور کیا تو یہ آیت نازل ہوئی: ''**لا اکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغیی**'' (سورہ بقرۃ: ۲۵۶) اس دستاویز کے ایک دفعہ میں اس کی صراحت ہے کہ یہود کیلئے ان کا مذہب ہے اور مسلمانوں کیلئے ان کا مذہب، ان کے غلام اور وہ دونوں برابر ہیں، ہاں جو ظلم وزیادتی کرے گا وہ اپنے خلاف کرے گا، اس طرح اس وثیقہ میں شخصی اور انفرادی ذمہ داری کی تاکید کی گئی ہے، اس آیت کی وجہ سے ''**ولا تزر وازرۃ وزر أخری**'' (سورہ انعام: ۱۶۴)۔

لیکن یہود نے اس دستاویز اور اس کے مشمولات کی پابندی نہیں کی اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کئے گئے عہد کو توڑ دیا تو ان کے ساتھ وہ معاملہ ہوا جو ان کے ظلم اور بدعہدی پر ہونا چاہئے۔

دستاویز میں مرقوم دفعات کا خلاصہ:

دستاویز کے دفعات میں سے ہم نے بہت سے عمومی احکام اور اصول کو چھانٹا ہے، ان میں سے چند اہم کا ذکر کر رہے ہیں:

الف۔ مدینہ میں شہریت کی بنیاد پر اہل کتاب کے حقوق کا اعتراف، اسلئے کہ شہریت، سیاست اور ملک کے دفاع ونصرت کے معاملہ انہیں مسلمانوں کے ساتھ ایک امت بنا دیا گیا ہے۔

ب۔ مختلف ادیان، مثلاً مشرک، یہود ونصاری سب کو تسلیم کیا جائے گا۔

ج۔ عقیدہ کے سلسلے میں دو مختلف قوموں مثلاً مسلمان اور یہود شہریت کی بنیاد پر باہم ایک دوسرے کی مدد کی پابندی، اور اس ملک کے تئیں حقوق وواجبات میں شرکت کا التزام۔

یہ پابندی ملک کی طرف سے ہے، نہ کہ دین کی طرف سے، اسلئے کہ ہرایک کا مذہب دوسرے سے جدا ہے، یہاں شہریت کا مفہوم، اوراس کے حقوق وفرائض پوری وضاحت کے ساتھ ظاہر ہوجاتی ہیں، اسی بنیاد پرآج غیرمسلموں کے ساتھ ہمارا معاملہ شہریت کی بنیاد پر ہونا چاہیے، کیونکہ ان کے لئے ان کا مذہب ہوگا اور ہمارے لئے ہمارا مذہب۔

د۔ پناہ اورامان دینے کے سلسلے میں حقوق وواجبات میں برابرای، البتہ محارب مشرکین اس سے الگ ہوں گے۔

ھ۔تمام لوگوں کے لئے دینی آزادی۔

و۔حقوق کی حفاظت اور کسی کے لئے اس کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں۔

ز۔ ذمہ داری انفرادی ہوگی، لیکن دستاویز میں دئے گئے حقوق کی حفاظت سب کی ذمہ داری ہوگی، اوران حقوق کی پامالی سے ہرایک کو روکا جائے گا، قریش کے دشمن کی پشت پناہی سے بھی روکا جائے گا، اوراس بارے میں اجتماعی ذمہ داری کی رعایت کی جائے گی۔

ح۔وطن کی تحدید، جیسے دستاویز مدینہ میں یثرب کی تحدید ہے۔

ط۔حقوق اللہ تعالی کی طرف سے عطیہ ہیں، اس لئے کسی کواس کی بے حرمتی کی اجازت نہیں ہوگی، یہ صرف اسلامی حقوق کی خصوصیت ہے، اسی لئے مسلمانوں کے لئے یہ جائزنہیں ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کی پامالی کریں، گرچہ وہ ان حقوق کا پابند نہ ہو۔

ی۔اسلام میں حقوق ذمہ داریوں کے مقابلہ میں ہیں، ان میں بعض حقوق مقدس ہیں، ان کا دفاع کرنالازم ہے، مثلا دستاویزظلم وزیادتی، فساد کے خلاف تعان اورکمزوروں کی پشت پناہی پرزوردیتا ہے۔

حق وعدالت پرمبنی حکومت کی خشت اول:

اس طرح اسلام نے حق وعدل پرمبنی حکومت کی داغ بیل ڈالی جس میں کسی پرظلم وزیادتی کی قطعا اجازت نہیں ہے، وہ ایک ایسی حکومت تھی جس میں حقوق وواجبات کے قوانین واضح تھے، لیکن قبائل اورخصوصا قریش اوراہل ادیان باطلہ نے اسے پسندنہیں کیا، بلکہ ظلم وزیادتی کے تمام تروسائل کو اختیارکرتے ہوئے اس کے مقابلہ کیلئے میدان میں آگئے اوراسے صفحۂ ہستی سے مٹانے کی ہرممکن کوشش کی، اس وجہ سے اسلامی حکومت اوران لوگوں کے تعلقات میں محبت والفت کے بجائے عداوت ونفرت تھی، ان سب کے باوجود اسلام نے اپنے متبعین کوعدل وانصاف کا درس دیا، چنانچہ اسلامی حکومت کا اپنی جانب سے دفاع کرنا ایک فطری بات تھی اوراس نے ایسا کیا، اس کا دفاعی پہلو جہاد سے متعلق نازل ہونے والی پہلی آیت میں ہم محسوس کرتے ہیں:

”أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وإن الله على نصرهم لقدير“(سورہ حج:۳۹)۔

پھر دوسری آیت واضح کرتی ہے کہ جہاد وقتال کے وجوہات یہ تھے کہ مسلمانوں پر ظلم کیا گیا اور وہ اپنے گھروں سے نکالے گئے، چنانچہ اس کے فوراً بعد مسلمان اپنی مدافعت، ظلم وستم کو ختم کرنے، اور اپنے عقیدے وعبادت کی جگہوں، یہاں کہ غیر مسلم کے مقامات عبادت کا دفاع کرنے لگے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''**الذين أخرجوا من ديارهم بغير حق إلا أن يقولوا ربنا الله ولولادفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيرا و لينصر الله من ينصره إن الله لقوى عزيز**''(سورہ حج: ۴۰)۔

اس وجہ سے اسلام کی نظر میں جنگ ایک ضرورت ہے، جس کی اجازت مجبوری اور اضطراری حالت کی صورت میں اس وقت دی جاتی ہے جب قبول اسلام اور دعوت وتبلیغ کی راہیں مسدود ہوجائیں، یا پھر جزیہ کی ادائیگی کے ذریعہ اسلامی حکومت کو قبول کرلیا جائے، جزیہ غیر مسلموں سے امن اور شہریت کی ذمہ داری کے طور پر لیا جاتا ہے، جیسے مسلمان اپنے زکوۃ وصدقات کے ذریعہ اس سے کہیں زیادہ ادا کرتے ہیں، لہذا مسلمان اپنے مدمقابل سے جنگ کرنے میں پہل نہیں کرتے ہیں، پہلے انہیں دعوت دیتے ہیں اگر وہ قبول کرلیں تو ٹھیک، ورنہ ان پر جزیہ کی ادائیگی لازم ہوتی ہے، یعنی مسالمت اور صلح۔

جنگ کا یہ اسلامی پہلو صلح حدیبیہ میں مکمل طور پر نمایاں نظر آتا ہے، جس میں نبی ﷺ نے ایسے شرائط کو قبول فرمایا جن میں بے جا طرفداری اور ظلم وستم تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے فرمایا:

''**و الله لاتدعونى قريش إلى خطة يسألونى فيهاصلة الرحم إلااعطيتهم إياها**''(صحیح البخاری مع الفتح ج ۵ ص: ۳۲۹)۔

اللہ کی قسم! قریش جو بھی تجویز پیش کریں گے اور اس میں صلہ رحمی ہو تو اسے بخوشی قبول کرونگا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اس صلح کو فتح مبین سے تعبیر فرمایا اور اس سلسلہ میں سورہ فتح نامی سورت نازل ہوئی۔

قرآن کریم نے بہت سی آیات میں اس منہج وطریقے کی وضاحت کی ہے: ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''**وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله**''(سورہ انفال: ۶۱)۔

فقہی اعتبار سے دیکھیں تو فقہائے احناف وشوافع، حنابلہ اور مالکیہ (مجمع الانہر ج ۱ ص: ۶۳۵، الشرح الکبیر مع الدسوقی ج ۲ ص: ۱۷۶، روضۃ الطالبین ج ۱۰ ص: ۲۳۹، المغنی مع الشرح الکبیر ج ۱۰ ص: ۳۷۹) ایک قول کے مطابق اس کے قائل ہیں کہ جنگ کی ابتداء سے قبل دعوت دیناواجب ہے، ان حضرات کا مستدل قرآن کی آیت: ''**وماكنا معذبين حتى نبعث رسولا**'' (سورہ اسراء: ۱۵) ہے، نبی کریم ﷺ جب کسی کو کسی مہم پر روانہ فرماتے تو اس بارے صحابہ کرام کے لئے آپ کی وصیت یہ تھی:

''......**وإذا لقيت عدوک من المشركين فادعهم إلى احدى ثلاث أو خلال فايهن أجابوک**

إليهافاقبل منهم و كف عنهم ثم ادعهم إلى الإسلام"(صحیح مسلم،کتاب الجہاد،ج ۳،ص:۱۳۵۷)۔

(جب تم کسی دشمن سے ملو تو انہیں تین چیزوں میں سے کسی ایک کی دعوت دو،وہ جسکو بھی قبول کرلیں تم ان سے راضی ہوجاؤ،ان سے اپنے ہاتھوں کو روک لو،پھر انہیں اسلام کی دعوت دو)۔

ترجمان قرآن اور حبر الامۃ حضرت ابن عباسؓ نے اس حکم کو حصر کے ساتھ بیان فرمایا ہے،آپ نے فرمایا:

"**ما قاتل رسول الله ﷺ قوما قط حتى يدعوهم إلى الاسلام**"(مسند احمد ج ا،ص:۲۳۱،السنن الکبری، ج ۹،ص:۱۰۷)۔

جہاں تک نبی کریم ﷺ کے بنی مصطلق پر حملہ کرنے کا تعلق ہے تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے مدینہ پر حملہ کی تیاری کرنے کے لئے آپ سے قتال شروع کر دیا(دیکھئے:صحیح مسلم کتاب الجہاد،ج ۳،ص:۱۳۵۶،سیرت ابن ہشام ۲۲۸/۳)اور اس طرح ان تک دعوت بھی پہونچ گئی۔

نبی کریم ﷺ کے زمانے میں یہود و نصاری کی کچھ مثالیں:

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں اور قوم یہود کے مابین تعلقات کا ایک دستاویز تیار کروایا تھا جو صلح کی تمام کیفیات اور شہریت کے تمام جائز حقوق کی بہترین مثال ہے،اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں اور یہود و نصاری کے درمیان بعض معاملات اور معاہدے تحریر فرمائے تھے،جن میں چند اس طرح ہیں:

۹ھ میں غزوہ تبوک سے لوٹنے کے بعد آپ ﷺ نے نجران کے نصاری سے معاہدہ فرمایا،جو عدل وانصاف،عالی ظرفی،رواداری اور شخصی آزادی کی بہترین مثال ہے،اس معاہدہ میں انہیں دینی آزادی،ان کی حفاظت ونگرانی،اور نصرت کی بات کہی گئی ہے،اوران پر معمولی جزیہ جو متعین تھا لازم کیا گیا،معاہدہ کی عبارت یوں تھی:

"......**ولنجران وحاشيهم جوار الله......ومن سأل منهم حقا فبينهم النصف غير ظالمين ولامظلومين......ولايوخذ أحد منهم بظلم آخر وعلى ما فيه هذه الصحيفة جوار الله وذمة النبى ﷺ أبدا حتى يأتى الله بأمره إن نصحوا و أصلحوا عليهم**"(الطبقات الکبری لابن سعد ج ۲،ص:۳۶،فتوح البلدان للبلاذری،ج ا،ص:۶۷،تاریخ الیعقوبی ج ۲،ص:۷۱)۔

(نجران اور اس کے گرد و پیش کے لوگوں کے لئے اللہ کی پناہ ہے،ان میں سے جو کوئی اپنا حق طلب کرے تو اس کو اس کا نصف بغیر کسی ظلم و جبر کے دیا جائیگا،نہ ان پر ظلم کیا جائے گا اور نہ ان کی طرف سے ظلم برداشت کیا جائے گا،اور نہ ان میں کسی ایک کے ظلم کے بدلہ دوسرے سے مواخذہ کیا جائیگا،اس صحیفہ میں جو کچھ مذکور ہے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ضامن ہیں،یہ حکم ہمیشہ کے لئے ہے،یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے)(الطبقات الکبری ج ۲،ص:۳۶،تاریخ الیعقوبی

،ج ۲،ص:۱۷)۔

اسی طرح رسول ﷺ نے یہودیوں کے ساتھ بھی معاہدہ کیا، حالانکہ مدینہ میں کچھ یہودیوں کی طرف سے احزاب کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف بھی پہونچی تھی، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جزیرۃ العرب کے شمال میں بعض یہودی کمیونیٹیوں کے خلاف لشکر بھی روانہ فرمائے، اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی جنبۃ جو خلیج عقبہ میں ایلۃ سے قریب مقنعہ مقام پر آباد تھا اس کو معاہدہ نامہ لکھ کر بھیجا اس میں مذکور ہے:

امابعد! میرے پاس تمہارے کچھ نمائندے تمہاری غلطیوں کا عذر لے کر آئے، تو جب تم تک میرا یہ عہد نامہ پہنچ جائے تو تم سب کو امان ہے، اللہ اور اس کے رسول کی ضمانت ہے تم سب پر، اللہ کا رسول تم سب کی غلطیوں کی مغفرت کیلئے دعاء گو ہے، تم پر کوئی ظلم نہیں ہوگا اور نہ کوئی زیادتی ہوگی، رسول اللہ تمہاری ان چیزوں میں ضامن ہیں جن میں وہ خود باز رہے ہیں، کھجور کی پیداوار میں سے تمہارا چوتھائی حصہ ہوگا، اگر تم سنتے رہو اور اطاعت کرتے رہو، رسول اللہ ﷺ تمہارے معزز فرد کا خیال رکھنے والے ہیں اور تمہارے گناہوں کو معاف فرمادیں گے، تمہارا رہبر تمہاری قوم کا کوئی فرد ہوگا یا پھر رسول اللہ ﷺ کی جانب سے بھیجا گیا فرد تمہارا رہبر ہوگا (طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۲۸)۔

اسی طرح کا معاملہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عادی، اہل حرباء اور آذرح کے یہودیوں کے ساتھ بھی کیا۔

اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودی قبائل کو اسلامی حکومت کے شہریوں کی جماعت میں مدغم کرنے میں کامیابی ملی، وہ اسلامی ریاست کی جانب سے متعین کردہ ٹیکس نقد یا عین کی شکل میں ادا کرتے، اس کی طاقت اور وہاں کے بادشاہ کی حفاظت کرتے، اور وہاں کے عدل وانصاف کا بھرپور فائدہ اٹھاتے، ایسے بہت سے تاریخی حقائق ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خیبر کے بعد بھی یہودیوں سے معاملہ فرمایا، آپ نے اپنے گورنر معاذ بن جبلؓ کو یہ ہدایت دی تھی کہ وہ یہودیوں کو ان کے مذہب سے نہ پھیریں، اسی طرح بحرین کے یہودیوں کے ساتھ بھی معاملہ کیا گیا، انہیں صرف ٹیکس اداء کرنا پڑتا تھا اور وہ ہمیشہ اپنے اجداد کے مذہب پر قائم رہے (مقالہ دکتور عماد الدین خلیل، بعنوان: المسلم والآخر رویۃ تاریخیۃ)۔

صحیح بات یہ ہے کہ اسلام کا مزاج ہمیشہ دوسروں کو قبول کرنے اور ان کی حفاظت کی کوشش کا رہا ہے، ٹیکس کی حقیقت ہی یہی ہے کہ دوسروں کو قبول کرلیا گیا ہے اور اس کی حق شہریت تسلیم کر لی گئی ہے اور ان کو امن وامان کے بدلہ میں اپنی طرف سے یہ مالی حقوق اداء کرنے پڑتے ہیں، سرٹامس آرنلڈ نے اپنی مشہور کتاب 'دعوت اسلام' (Preaching Of Islam) میں لکھا ہے کہ جب اہل حیرہ نے ٹیکس پیش کیا تو انہوں نے اس ٹیکس کی ادائیگی کے وقت صراحت کے ساتھ یہ شرط رکھی کہ ان کی اور ان کے امراء کی ہر طرح کی زیادتی سے حفاظت کی جائے گی، خواہ یہ زیادتی مسلمانوں کی طرف سے ہو یا کسی اور کی طرف سے، اسی طرح حضرت خالد بن ولید نے بھی حیرہ کے پڑوسی علاقہ والوں سے ہوئے ایک معاہدہ میں لکھا تھا کہ اگر ہم

تمہاری حفاظت کرینگے تو ہمارے لئے جزیہ جائز ہوگا، ورنہ نہیں، مسلمانوں نے اس کا ہمیشہ خیال رکھا ہے اور جہاں ان سے یہ نہ ہو سکا انہوں نے جزیہ بھی ترک کر دیا۔

اس شرط پر مسلمانوں کا عمل کرنا صراحت ووضاحت کے ساتھ اس وقت ظاہر ہوا جب حضرت عمرؓ کے زمانہ خلافت میں یہ واقعہ پیش آیا، ہرقل نے ایک بڑی فوج جمع کی، تاکہ مسلمانوں کی طاقت روک سکیں اور ادھر مسلمان بھی اس معرکہ سے نبرد آزما ہونے کے لئے پورے طور پر سرگرم تھے، جب اس کا علم حضرت ابوعبیدہؓ کو ہوا تو انہوں نے شام کے مفتوح شہروں کے گورنروں کو لکھا کہ وہ ان شہروں سے حاصل ہونے والے جزیہ کو انہیں لوٹا دیں اور لوگوں کو بتا دیں کہ ہم نے تم کو تمہارا مال واپس کر دیا ہے، اس لئے کہ ہمیں معلوم ہوا کہ دشمنوں نے ایک بڑا لشکر جمع کیا ہے اور تمہاری یہ شرط تھی کہ ہم تمہارا تحفظ کریں گے، لیکن اس وقت ہم اس پر قادر نہیں ہیں، اس لئے ہم نے تم سے وصول کردہ ٹیکس تم کو واپس کر دیا، اگر اللہ نے ان دشمنوں پر ہمیں غلبہ عطا کیا تو ہم نئے سرے سے اپنے معاہدہ اور شرط پر عمل کریں گے۔

اس طرح ملک کی ایک بڑی دولت لوگوں کو واپس کر دی گئی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عیسائیوں نے مسلم بادشاہوں کے حق میں دعائیں کیں کہ اللہ تعالی آپ کو ہم پر دوبارہ سردار مقرر کرے اور آپ کے دشمنوں کو شکست عطا فرمائے، اگر آپ لوگوں کی جگہ رومی ہمارے حاکم ہوتے تو وہ ہمیں کچھ بھی واپس نہیں کرتے، بلکہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ بھی لے لیتے۔

اسلامی حکومت کے زیر سایہ رہنے والے غیر مسلموں کے حقوق:

ہم نے جس منہج کو اختیار کیا ہے وہ ''فقہ المیزان'' کہلاتا ہے، جنگ کی حالت میں غیر مسلموں کے حقوق حالت امن کے حقوق سے مختلف ہوتے ہیں، اس تناظر میں ہم کہتے ہیں:

اول: اس زمانہ میں جو غیر مسلم طویل عرصہ سے مسلم ملکوں میں رہتے ہیں وہ اس ملک کے شہری ہوں گے، اور انہیں شہریوں کے جملہ حقوق حاصل ہوں گے، اسی کے ساتھ ان پر کچھ ذمہ داریاں بھی ہوں گی، اور ان حقوق وواجبات سے صرف وہی چیز مستثنی ہوگی جس کا استثناء صریح اور قطعی الدلالۃ نص کرتی ہو، یا جو اقلیت واکثریت کے مذہب کی بنیاد پر کسی خاص حقوق کا استثناء ہوگا۔

یہ استثناء معقول ہے، جدید نظام میں بھی بعض افراد اس شرط کے قائل ہیں اور یورپ اور مغرب میں تو اکثر افراد اس کے قائل ہیں کہ ملک کا صدر یا سربراہ وہاں کی اکثریت کے مذہب کا ہو، یعنی مثلاً عیسائی ہو، لہذا یہ شرط لگانا کہ صدر اکثریت کے مذہب کا ہو معقول بھی ہے اور مروج بھی، جو ممالک جمہوریت کے علمبردار ہیں وہاں بھی یہ بات رائج ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے حقوق وواجبات میں مساوات کا مسئلہ متاثر نہیں ہوتا ہے، اور نہ ہی شہریت کے حقوق میں کوئی بنیادی فرق آتا ہے۔

اس کے دلائل یہ ہیں:

۱۔وثیقہ یا صحیفہ یا جنہیں ملک کا دستور کہا جاتا ہے،وہ شہریت ،دینی آزادی اور تحالف کا حق دیتا ہے،البتہ یہ تحالف دشمنوں سے نہیں ہوگا (دلائل النبوۃ للبیہقی ج ۴ص:۹۹،عارضۃ الاحوذی ،ج ۲ص:۸۶،مزید دیکھئے:احکام الذمیین والمستامنین فی دارالاسلام ، ص:۶۳،مقالہ ڈاکٹر جعفر عبدالسلام:علاقۃ الدول الاسلامیۃ بالدولۃ الاخری) گذشتہ صفحات میں یہ بات آچکی ہے۔

۲۔اہل ذمہ کے حق میں یہ عام قاعدہ ہے کہ جوحقوق ہمارے لئے ہیں وہ ان کے لئے بھی ہوں گے اور جو ذمہ داریاں ہم پر عائد ہوتی ہیں وہ ان پر بھی عائد ہوں گی،حضرت علیؓ کا قول ہے:اگر وہ جزیہ قبول کر لیتے ہیں تو ان کا مال ہمارے مال کی طرح ہے، اور انکا خون ہمارے خون کی طرح محترم ہوگا (بدائع الصنائع ج۶ص:۱۱۱،القوانین الفقہیۃ ص:۱۰۵،الاحکام السلطانیۃ للماوردی،ص:۲۴۷)۔

غیر مسلموں کے حقوق اور تحفظ پر بے شمار نصوص ہیں، جو درج ذیل ہیں:

۳۔اسلام نے اہل ذمہ پر جو جزیہ اور خراج لازم کیا وہ دراصل شہریت کے حقوق میں سے ہی ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ لفظ ''اھل ذمہ'' کا مطلب اللہ اور رسول کا ذمہ ہے۔

دوم:قدیم وجدید تمام علماء نے ان حقوق کی تفصیل بیان کی ہے،معتبر مذاہب کی کتب فقہ میں تفصیلات موجود ہیں،اس موضوع پر براہ راست قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلی بحث لکھنے والے معاصر علماء میں پروفیسر ڈاکٹر عبدالکریم زیدان، علامہ شیخ یوسف القرضاوی (غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی،ص:۹) قابل ذکر ہیں،ان حضرات نے کتاب وسنت کی بہت سی نصوص پر اعتماد کیا ہے،ان کو مختصراً بیان کرتے ہیں:

۱۔خارجی ظلم وستم سے ان کو بچانا، انکا دفاع کرنا اور انکے قیدیوں کو رہا کرنا حکومت پر واجب ہے، بلکہ جو ان سے جنگ کرے ان سے قتال پر اجماع نقل کیا گیا ہے، اگر چہ کسی شہر میں وہ علاحدہ رہتے ہوں (مطالب اولی النہی ،ج ۲ص:۲۰۳)۔

علامہ قرافی لکھتے ہیں:

ذمیوں کا معاہدہ انکے حقوق کو ہم پر واجب کرتا ہے، کیونکہ وہ ہمارے پڑوسی ہیں، ہماری نگرانی میں ہیں، اللہ تعالی، اس کے رسول اور دین اسلام کے ذمہ میں ہیں، لہذا اگر کوئی ان پر زیادتی کرے، خواہ برے الفاظ کے ذریعہ ہو، یا ان کے عزت پر حملہ کیا جائے، یا کسی طرح کی کوئی تکلیف پہونچائی جائے، یا ایسا کرنے والوں کی کوئی مدد کرے، تو اس نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور ان کے دین کے ذمہ کو ضائع کیا۔

اسی طرح علامہ ابن حزم ''مراتب الاجماع''میں تحریر کرتے ہیں:اگر حربی ہمارے شہر میں گھس آئے اور ان ذمیوں کو پکڑنا چاہے تو ہمارے اوپر واجب ہے کہ ہم ان اہل ذمہ کی جانب سے پورے اسلحہ کے ساتھ نکلیں اور ان سے قتال کریں،

خواہ ان کے حفاظت میں اپنی جان دینی پڑے، کیونکہ یہ ایسے لوگوں کی حفاظت ہوگی جو اللہ اور رسول اللہ کے ذمہ میں ہیں (الفروق ج ۳،ص: ۱۴)۔

تاریخ میں ایسا بارہا ہوا ہے کہ اسلامی حکومت نے مسلمان قیدیوں کی رہائی کو اس وقت قبول کیا جب اہل ذمہ قیدیوں کی بھی رہائی ہوئی (غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی،ص:۹)۔

۲- چھ ضروریات اور حاجیات کا تحفظ:

اس بارے میں ان کی حالت مسلمانوں کی طرح ہے، اس طور پر کہ فقہاء کا اس پر اتفاق ہے، فقہاء نے اسکی علت یہ بتائی ہے کہ وہ معاہدہ کی وجہ سے دار الاسلام کے شہری ہوگئے، اس لئے ان کی جانوں و مالوں اور عزتوں کی مکمل طور پر حفاظت کرنا اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے، چنانچہ اسلامی حکومت پر ان چیزوں کی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے جنہیں وہ مال شمار کرتے ہیں، مثلاً ان کی شرابیں، خنزیر، جبکہ یہ چیزیں اگر کسی مسلمان کے پاس ہوں تو اس کو ضائع کرنا واجب ہے، لیکن اگر کوئی مسلمان اہل ذمہ کے خمر، خنزیر کو ہلاک کردے تو فقہائے احناف کے نزدیک اس پر اس کی ضمان واجب ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: بدائع الصنائع ج ۵،ص: ۱۴۳، جواہر الاکلیل ج ۱،ص: ۴۰۷، حاشیۃ الجمل ج ۳،ص: ۴۸۱، الاحکام السلطانیہ ص: ۱۴۵، الاحکام السلطانیۃ لابی یعلی،ص: ۱۴۳، المغنی ج ۵،ص: ۲۲۳)۔

لہذا اسلامی حکومت پر انکی دینی آزادی، ان کے اموال اور ان کی عزتوں کی حفاظت کرنا واجب ہے، اس سلسلہ میں ان کا حکم مسلمانوں کی طرح ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "**من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة، وأن ريحها توجد من مسيرة أربعين عاما**" (صحیح البخاری، کتاب الجزیہ مع فتح الباری ۶،ص: ۲۶۹، مسند احمد ۵/۲۷۷)۔

جس نے کسی معاہد کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائیگا، گرچہ اس کی خوشبو چالیس سال کی مسافت سے آتی ہے۔

اسی بنیاد پر فقہاء کی جماعت جن میں فقہائے حنفیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ مسلمان ذمی کے قتل کے بدلہ قتل کیا جائیگا، یہی رائے شعبی، نخعی، ابن ابی لیلی، عثمان البتی کی ہے، اور یہ اصلا حضرت علی بن ابی طالب اور عمر بن عبد العزیز سے مروی ہے، خلافت عباسیہ اور دولت عثمانیہ میں عموما اسی رائے پر عمل ہوتا رہا ہے، فقہائے مالکیہ فرماتے ہیں کہ دھوکہ سے قتل کی صورت میں ذمی کے بدلے مسلمان کو قتل کیا جائیگا (دیکھئے: حاشیہ ابن عابدین ۳/ ۲۴۹، بدائع الصنائع ۷/۲۳۶، المذہب ۲/۱۸۵، الخرشی ۸/ ۳، المغنی ۷/ ۶۵۲)۔

۳۔ ان کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کرنا، اور ہر طرح کے ظلم سے انہیں بچانا، ان باتوں پر تمام نصوص عمومی طور پر دلالت کرتے ہیں جن میں عدل کی بنیاد پر فیصلہ اور معاملہ کرنے کو ضروری کہا گیا ہے، اور جو نصوص ظلم کے حرام ہونے

سے متعلق ہیں، ان کے علاوہ اہل ذمہ سے متعلق خاص نصوص بھی ہیں، انہی نصوص میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

"ألامن ظلم معاهدا أو انتقصه حقه أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئا بغير طيب نفسه فأنا حجيجه يوم القيامة" (سنن ابی داؤد، ج ۳، ص: ۴۳۷، عراقی کہتے ہیں: اس کی سند جید ہے، جیسے تنزیہ الشریعہ میں ہے، دیکھئے: ج ۲، ص: ۱۸۲، السنن الکبری للبیہقی ج ۵، ص: ۲۰۵)۔

(جو کوئی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حق کو مارے گا یا اسکی استطاعت سے زیادہ کام کا اس کو مکلّف بنائے گا یا اس کی خوش دلی کے بغیر کوئی اس کا سامان لے گا، میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا)۔

اس وجہ سے خلفاء راشدین اور ان کے بعد کے خلفاء نے اہل ذمہ سے ظلم کو دور کرنے پر پوری توجہ دی، حضرت عمر تو مختلف شہروں سے آنے والوں سے اہل ذمہ کے بارے دریافت کرتے رہتے، عموماً ان کا جواب ہوتا کہ ہم ان کے بارے میں وفا ہی جانتے ہیں (تاریخ الطبری، ج ۴، ص: ۲۱۸)۔

امام بخاری حضرت جویریہ بن قدامہ تمیمی کے حوالہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عمر سے سنا، ہم نے کہا اے امیر المومنین: ہمیں وصیت کیجئے! آپ نے فرمایا: **"أوصيكم بذمة الله فإنه ذمة نبيكم"** (صحیح البخاری مع الفتح ج ۶، ص: ۲۶۷) اور عمرو بن میمون کی روایت کے الفاظ ہیں:

" و أوصيه بذمة الله وذمة رسوله، أن يوفى لهم بعدهم وأن يقاتل من ورائهم وأن لا يكلفوا إلا طاقتهم" (فتح الباری ج ۶، ص: ۲۶۷)۔

۴۔ فقر وفاقہ، عاجزی وپریشانی اور بڑھاپے کی حالت میں ان کے لئے تکافل اجتماعی کا انتظام کرنا، لہذا جب غیر مسلم شہری تنگدست، عاجز اور بالکل بوڑھا ہوجائے تو اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ اس کو ذلیل ورسوا ہونے کے لئے نہ چھوڑے، بلکہ ان کے ساتھ انصاف کرے اور ان کی حفاظت کرے اور اس کے اچھی زندگی کیلئے انتظام کرے، یہ کوئی نیا حکم نہیں ہے، بلکہ حضرت ابوبکر کے زمانہ میں بھی ایسا تھا، حضرت خالد بن ولید نے عراق میں مقیم حیرہ والوں کے نام ایک خط لکھا جو نصاری تھے، اس میں لکھا تھا: جو سن رسیدہ کام کرنے سے عاجز ہوجائے، یا انہیں کوئی مصیبت آجائے، یا وہ مالدار تھا، لیکن اتنا ضرورت مند ہوگیا کہ ان کے مذہب کے لوگ ان پر صدقہ کریں ایسے لوگوں کے بارے میں یہ طے کیا جاتا ہے کہ اس کا جزیہ معاف کر دیا جائیگا، اور جب تک وہ شخص دارالاسلام اور دارالھجرۃ میں رہے، اس وقت تک مسلمانوں کے بیت المال سے اسکی اور اس کے بیوی بچوں کی کفالت کی جائے گی (الخراج لابی یوسف، ص: ۲۹۰)۔

حضرت امام ابو یوسف اور دیگر حضرات سے روایت ہے کہ حضرت عمر کسی قوم کے دروازہ کے پاس سے گذر رہے

تھے، وہاں ایک شخص لوگوں سے مانگ رہا تھا، وہ بہت بوڑھا تھا، نگاہ کمزور ہو چکی تھی، آپ نے پیچھے سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا اور پوچھا تم کون سے کتابی ہو؟ اس نے جواب دیا: یہودی، آپ نے فرمایا، تمہیں اس حال پر کس نے پہونچایا، اس نے جواب دیا، میں جزیہ کی ادائیگی کے لئے مانگ رہا ہوں، بڑھاپا ہے اور ضرورت مند بھی ہوں، حضرت عمر نے اس شخص کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے گئے، پھر بیت المال کے خازن کو بلوایا، جب خازن آیا تو ان سے کہا: اس شخص کو دیکھو، اور اس کی بینائی کو دیکھو، خدا کی قسم ہم نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا، اس کی جوانی سے فائدہ اٹھایا، اور حالت ضعیفی میں اس کو ذلیل ہونے کے لئے چھوڑ دیا (الخراج لابی یوسف، ص: ۲۵۹)۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے عہد میں اس طرح کا معاملہ بارہا پیش آیا، جس کو ہم اجماع سے تعبیر کر سکتے ہیں، اجماع اس بات پر کہ ضمان اجتماعی ایک عام اصول ہے، جس میں سماج کے تمام افراد شامل ہیں، خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، لہذا یہ درست نہیں ہے کہ سماج کا کوئی فرد اپنی زندگی کی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر ہو (غیر المسلمین فی المجتمع الاسلامی، ص ۹)۔

فقہائے شوافع نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ مسلمانوں سے مصیبتوں کو دور کرنا فرض کفایہ ہے، اور اس کی بھی صراحت کی ہے کہ اس حکم میں اہل ذمہ بھی شامل ہیں، لہذا ان سے نقصان کو دور کرنا واجب ہے، دفع ضرر سے مراد ان کی معیشت، رہائش، دواء اور غذا کا انتظام کرنا ہے، نہ کہ صرف اتنی ذمہ داری جو سد رمق کیلئے کافی ہو، اس بارے میں دو اقوال ہیں، لیکن ان کے نزدیک صحیح قول یہی ہے (نہایۃ المحتاج شرح المنہاج ۸، ص: ۴۶)۔

۵۔ مسلمانوں کے ساتھ ان کے معاہدوں اور معاملات کا احترام:

امام ابو یوسف (م: ۱۸۲ھ) نے ذکر کیا کہ حضرت ابو عبیدہؓ نے شام کے باشندوں سے چند شرطوں کے ساتھ مصالحت کی، جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ انہیں امن و سلامتی فراہم کیا جائے گا، اور دشمنوں سے ان کی حفاظت کی جائے گی، اس زمانہ میں ہوا یہ کہ روم نے ایک بڑا لشکر تیار کیا، حضرت ابو عبیدہ کو یہ خوف ہوا کہ وہ ان کی حفاظت نہیں کر سکیں گے، چنانچہ آپ نے مختلف شہروں کے گورنروں کو خط لکھا کہ ان علاقوں سے جو جزیہ اور خراج وصول کیا گیا ہے، وہ ان کو لوٹا دیا جائے، اور ان سے کہہ دیا جائے کہ ہم نے تمہارا مال تم کو لوٹا دیا، کیونکہ ہمیں یہ خبر ملی ہے کہ ہمارے لئے ایک بڑا لشکر جمع کیا گیا ہے اور تم نے اپنے معاہدہ میں یہ شرط لگائی تھی کہ ہم تمہاری حفاظت کرینگے، لیکن اب صورت حال یہ ہے کہ اس پر ہم قادر نہیں...... اگر اللہ نے ان کے خلاف ہمیں فتح عطا فرمائی تو ہم انہیں شرطوں پر قائم ہونگے جو ہمارے اور تمہارے درمیان طے پایا ہے، جب ان تک یہ پیغام پہونچا اور ان کا مال ان کو لوٹا دیا گیا جو ان سے لیا گیا تھا تو انہوں نے کہا: اللہ تمہیں پھر سے لوٹائے اور ان پر فتح عطا فرمائے، اگر وہ ہمارے حاکم ہوتے تو کچھ بھی نہ دیتے، بلکہ تمام چیزیں لے لیتے اور کچھ نہ

چھوڑتے (الخراج لابی یوسف ص ۲۸۲)۔

حضرت امام ابو یوسف رحمۃ اللہ فرماتے ہیں: جب اہل ذمہ نے ان کے مسلمانوں کی وفاداری دیکھی اوران کی حسن سیرت کا مشاہدہ کیا تو وہ مسلمانوں کے دشمنوں پر خود مسلمان سے بھی زیادہ سخت ہو گئے، چنانچہ جن سے مسلمانوں کا معاہدہ تھا ان میں سے ہر شہر کے لوگوں نے اپنے لوگ کو دشمن کے علاقہ میں بھیجے، تا کہ روم کی خبریں لائیں اوران کی سرگرمیوں کا پتہ لگائیں (حوالہ سابق)۔

۶-ان کے دینی آزادی کا تحفظ:

قرآن کریم نے متعدد آیات میں غیر مسلموں کی دینی آزادی اورانہیں اسلام قبول کرنے پر مجبور نہ کرنے کی تاکید کی ہے،ارشاد ہے:

"**لاإكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي**"(سورہ بقرہ:۲۵۶)۔

"**فمن شاء فليومن ومن شاء فليكفر**"(سورہ کہف:۲۹)۔

"**أ فانت تكره الناس حتى يكونوا مومنين**"(سورہ یونس:۹۹)۔

اس سلسلہ میں مزید تفصیل پیچھے گزر چکی ہے، لیکن یہاں جس چیز کا تذکرہ کرنا ہم چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ عہد ومواثیق جو مسلمان اور غیر مسلم کے درمیان صلح کے وقت مکمل ہوئے اور جو شرطیں رکھی گئیں ان سب کا مقصد یہ تھا کہ غیر مسلم مسلمانوں کے جذبات کا، ان کے دین کے تقدس کا خیال رکھیں، اوراستعال انگیزی نہ کریں اور فتنہ نہ پیدا کریں (کتاب الخراج لابی یوسف ص ۲۸۱)۔

خود منصف مزاج مغربی مفکرین اور مستشرقین نے اس دینی آزادی کا صراحت کے ساتھ اعتراف کیا ہے، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، غوستاف لوبوں لکھتے ہیں:

ہم نے قرآن کریم کی آیتوں میں دیکھا جسکا ذکر ابھی ہم نے کیا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ نرم دلی کا معاملہ حد سے آگے کا تھا، اور انکی طرح دوسرے ادیان کی کسی شخصیت نے کبھی ایسا معاملہ نہیں کیا، خواہ وہ یہودیت ہو یا نصرانیت کے مذہبی افراد ہوں، ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خلفاء نے آپ کے طریقہ پر کیسے عمل کیا، اس بات کا اعتراف یورپ کے بعض اہل علم نے بھی کیا ہے (حضارۃ العرب، ص:۲۸)۔

۷-ان کے عقیدہ ومذہب کے مطابق عقود ومعامالات اور نکاح وغیرہ کی آزادی:

ایک عام قاعدہ یہ ہے کہ معاملات، کام اور حصول رزق کی آزادی میں اہل ذمہ مسلمان کے طرح ہیں۔ حنفی فقیہ امام جصاص کہتے ہیں:

"إن الذميين فی المعاملات والتجارات كالبيوع وسائر التصرفات كالمسلمين" (الاحکام للجصاص ۲،ص:۳۴۶، حاشیہ ابن عابدین ج ۳،ص:۲۷۶)۔

معاملات اور تجارت، مثلاً بیوع اور دیگر تصرفات میں ذمی مسلمانوں کے مثل ہیں۔

علامہ کاسانی لکھتے ہیں: بیوع کی جو شکلیں مسلمانوں کے لئے جائز ہیں وہ تمام شکلیں اہل ذمہ کے لئے بھی جائز ہیں، اور بیوع کی جو شکلیں مسلمانوں کے لئے فاسد ہیں وہ اہل ذمہ کے حق میں بھی فاسد ہیں، سوائے خمر وخنزیر کے (بدائع الصنائع ج ۴،ص: ۱۷۴)۔

فقہائے احناف کے نزدیک خمر وخنزیر کا استثناء اس صورت میں ہے جب اس طرح کا عقد ان کے درمیان باہم طے پایا ہو، لیکن اگر عقد مسلمان اور اہل ذمہ کے درمیان ہے تو یہ عقد باطل ہو یا فاسد ہوگا (المبسوط ج ۱۰،ص: ۸۴)، جبکہ جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ خمر اور خنزیر میں بھی مسلمانوں اور ذمیوں کے درمیان کوئی استثناء نہیں ہے (جواہر الاکلیل ج ۲،ص: ۵۲، حاشیۃ الجمل ، ج ۳،ص: ۴۸۱، الاحکام السلطانیۃ للماوردی،ص: ۱۴۵، المغنی ج ۵،ص: ۲۲۳)، امام شافعی فرماتے ہیں: بیوع کی جو شکلیں مسلمانوں کے درمیان باطل ہیں وہ ذمیوں کے درمیان بھی باطل ہوں گی، البتہ اگر عقد ہو جائے اور مبیع استعمال ہو جائے تو بیع باطل نہیں ہوگی، اگر اہل ذمہ میں سے دو شخصوں نے شراب کی خرید وفروخت کی، اور ابھی قبضہ نہیں ہوا ہے، تو ہم اس بیع کے باطل ہونے کا حکم لگائیں گے، لیکن اگر ان دونوں نے عوض پر قبضہ کر لیا تو ہم اس کے جائز نہ ہونے کی بات نہیں کہیں گے، کیونکہ بیع تو منعقد ہو چکی ہے (الام ج ۴،ص: ۲۱۱)۔

فقہاء حنفیہ کے علاوہ تمام فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر شراب وخنزیر سے متعلق عقود اگر اہل ذمہ کے درمیان ہو تو اسلامی حکومت تعارض نہیں کرے گی، کیونکہ غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا تقاضہ یہ ہے کہ جن معاملات کو وہ جائز سمجھتے ہیں ان میں تعارض نہ کیا جائے (حوالہ سابق، مزید دیکھئے، ج ۷،ص: ۱۳۲)۔ جمہور فقہاء اور فقہائے احناف کے درمیان اختلاف اس مسئلہ میں ہے کہ خمر وخنزیر ان کے حق میں مال متقوم ہے، لہذا اس بنیاد پر مسلمان ان کی شراب اور خنزیر کو ہلاک کر دے تو اس کا عوض اور ضمان واجب ہوگا، یہ حضرات کا مستدل حضرت عمر کا وہ مکتوب ہے جو آپ نے شام کے گورنروں کو لکھا تھا، اس مکتوب میں آپ نے میتہ، خنزیر اور شراب لینے سے منع کرتے ہوئے مزید فرمایا:

" لا تفعلوا ولكن ولوا أربابها بيعها ثم خذوا الثمن منهم" (الخراج لابی یوسف ص: ۲۶۰، کتاب الاموال لابی عبید، ص: ۶۱)۔

اسی طرح فقہائے احناف ان کے نکاح کو ان کے عقائد کے مطابق باقی رکھتے ہیں، مزید وہ اس کے قائل ہیں کہ مسلمان کا کتابیہ سے نکاح جائز ہے، دلیل یہ آیت ہے: "......والمحصنات من الذين أوتوا الكتاب من قبلكم" (سورہ

مائدہ:۵)۔

۸-حکومت کی ذمہ داری قبول کرنا:

اہل ذمہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ حکومت سے متعلق ذمہ داری قبول کرے، البتہ اس سے دینی شعبہ مستثنی ہوگا، اسی طرح ایسے شعبے بھی مستثنی ہوں گے جو اکثریت کے مذہب سے متعلق ہوں، فقہاء نے وزارت تنفیذ کی ذمہ داری قبول کرنیکی اجازت دی ہے، یہ اصطلاح وزارت تفویض کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے، تفویض کا مطلب یہ ہے امیرالمومنین احکام صادر کرنے کا اختیار کسی وزیر کو سپرد کردیں، تاکہ وزیر اپنی صوابدید سے معاملات انجام دیں، یہ حکومت کے مشابہ ہے، جہاں تک وزارت تنفیذ کا تعلق ہے تو اس سے مراد احکام کو نافذ کرنا ہے، اس تفصیل کی روشنی میں موجودہ وقت کی تمام وزارت اسی ضمن میں آتے ہیں، بلکہ وزیر اعظم کے منصب کو بھی یہ شامل ہے، اس کیلئے اس زمانہ میں یہ منصب بھی ان قوانین وضوابط کے تابع ہوتا ہے جسے حکومت کے ادارے متعین کرتے ہیں، نیز قوانین کا مرجع ملک کے صدر ہوتے ہیں، ماوردی کہتے ہیں:

جہاں تک وزارت تنفیذ کا تعلق ہے تو اس کا حکم ضعیف ہے، اور اس کے شرائط بہت کم ہیں، کیونکہ ان مسائل میں غور وفکر کرنا امام کی رائے اور تدبیر پر منحصر ہے، یہ وزیر اپنے امام، رعایا اور گورنروں کے درمیان بیچ کا واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے، امام کے حکم کے مطابق معاملات کو انجام دیتا ہے، ان کے احکامات کی تنفیذ کرتا ہے، گورنروں کو مقرر کرنے کی اطلاع دیتا ہے، لشکر تیار کرتا ہے، اہم معاملات ومسائل ان پر پیش کرتا ہے،......۔اس کے بعد ماوردی مزید کہتے ہیں کہ اس طرح کا وزیر ذمی بن سکتا ہے (الاحکام السلطانیۃ، ص:۲۷)۔

اسلامی تاریخ میں اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں کہ غیر مسلم وزارت اور عمومی منصب پر فائز ہوئے، عہد عباسی میں وزارت کے منصب پر بہت سے عیسائی فائز ہوئے، جیسے نصر بن ہارون (م: ۳۶۹ھ)، عیسی بن قسطور (م: ۳۸۰ھ) وغیرہ، مشہور مؤرخ آدم منیز لکھتے ہیں: تعجب خیز امور میں سے ایک یہ ہے کہ اسلامی حکومت میں بڑے بڑے عہدے اور مناصب پر غیر مسلم فائز ہوئے، عیسائیوں نے متعدد شہروں میں مسلمانوں پر حکومت کی ہے، اور اہل ذمہ کو منصب دینے کے تعلق سے مسلمانوں کا شکوہ پرانی بات ہے (الحضارۃ الاسلامیۃ ۱/۱۱۸)۔

امام سیوطی کہتے ہیں: ابوسعد تستری یہودی سلطنت عبیدیہ میں امور حکومت انجام دیتا تھا، چنانچہ بعض شعراء نے کہا:

یہود ھذا الزمان قد بلغوا — غایة آمالھم وقد ملکوا

المجد فیھم والمال عندھم — ومنھم المستشار والملک

یا أھل مصر إلی نصحت لکم — تھودوا قد تھود الفلک

(حسن المحاضرۃ ج۲، ص:۲۰۱)۔

امام سیوطیؒ نے اسلامی ممالک (مصر اور اس جیسے عبیدیہ سلطنت) میں متعدد وزراء کا تذکرہ کیا جو اپنے مذہب، یعنی

یہودیت ونصرانیت پر باقی تھے، مثلا بہرام ارمنی عیسائی وغیرہ ، یہ لوگ حکومت پر قابض تھے،اورانہوں نے سیرت کو بگاڑا (حوالہ سابق)۔

آدم میز لکھتے ہیں: اسلامی قانون میں کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس کا دروازہ ذمیوں کے لئے بند ہو،صنعت وحرفت پران کا قبضہ تھا،جس سے نفع کی ندیاں بہتی ہیں، وہ صراف تھے،تجار تھے،اہل حرفت تھے، ڈاکٹر تھے،انہوں نے اپنی ذات کو اتنا منظّم کیا تھا کہ ملک شام کے اکثر صراف یہودی تھے،جبکہ اکثر ڈاکٹر اور کاتب عیسائی تھے، بغداد میں عیسائیوں کے سردار بادشاہ کے طبیب خاص تھے، یہودیوں کے سرداراور ناقدین اسی کے پاس رہتے ہیں۔

آگے مزید لکھتے ہیں: حیرت انگیز امور میں سے ایک اسلامی حکومت میں غیر مسلم عمال ،ولاۃ،اورافسران کی کثرت ہے،گویا عیسائی ہی اسلامی حکومت میں مسلمانوں پر حکومت کررہے ہیں،البتہ ذمیوں کو حاکم بنانے کے بارے میں مسلمانوں کا شکوہ پرانا ہے۔

اسلامی ممالک میں رہائش پذیر غیر مسلموں کی ذمہ داریاں:

گذشتہ سطور میں ہم نے غیر مسلموں (ذمیوں) کے تئیں حکومت اور مسلمانوں کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کیا ہے،اب ہم غیر مسلموں کی ذمہ داریاں بیان کرنا چاہتے ہیں:

ان کی ذمہ داریاں درج ذیل ہیں:

اول: مالی واجبات کی ادائیگی: اس میں افراد پر جزیہ، زمین کا ٹیکس اور تجارت کا عشر شامل ہے،ان چیزوں کو ہم ٹیکس یا زکوۃ سے تعبیر کرسکتے ہیں (مزید دیکھئے:عبدالکریم زیدان کی کتاب،حوالہ سابق،ص:۱۵۵)۔

درج ذیل صورتوں میں جزیہ ساقط ہوسکتا ہے:

۱- جب حکومت ذمیوں کی حفاظت سے معذور ہو۔

۲- جنگ اور وطن سے دفاع میں عملی شرکت ہو، ڈاکٹر یوسف القرضاوی تحریر فرماتے ہیں: اگر ذمی اسلامی حکومت میں مسلمانوں کے ساتھ جنگ اور ملک کی حفاظت میں شریک رہیں تو ان سے جزیہ ساقط ہوجائے گا،حضرت عمر کے دور میں مسلمان اور اہل ذمہ کے درمیان ہوئے بعض معاہدوں میں اس کی صراحت ملتی ہے،اس طرح کہ جب ابوعبیدہؓ کے قاصد نے مسیحیوں کی ایک جماعت (الجراجمۃ) کے ساتھ مصالحت کیا تو معاہدہ میں یہ بھی مذکور تھا کہ وہ مسلمانوں کے معاون ہوں گے، اور دشمنوں کے درمیان جاسوسی کا کام کریں گے،اس کے بدلے ان سے جزیہ نہیں لیا جائے گا (شیخ قرضاوی کی کتاب،حوالہ سابق،ص:۳۵)۔

لہذا آج بھی اگر عیسائی اسلامی ممالک میں وطن سے دفاع کی ذمہ داری ادا کریں گے تو ان لوگوں سے جزیہ ساقط

ہوجائے گا۔

دوم: اسلامی ممالک سے صادر اسلامی قوانین کی پیروی: اس حکم سے ان کے عائلی مسائل اور خنزیر وشراب مستثنی ہیں، جس کی بحث پیچھے گذر چکی ہے۔

اس اصول کو' اقلیمیۃ القانون' کا نام دیا گیا ہے، یہ قانون آج پوری دنیا میں نافذ ہے، بلکہ جدید حکومتیں اس قانون کو سیادت اور قوت کے ارکان میں شمار کرتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہر ملک میں اس کے ملکی قوانین کے علاوہ کسی اور قانون کو منطبق کرنے کی اجازت نہیں ہوتی، یہاں تک کہ احوال الشخصیہ اور عائلی مسائل میں بھی ملکی قوانین کی پابندی ہوتی ہے، اسی بناء پر اکثر غیر مسلم ممالک میں عائلی مسائل میں سخت پریشانی ہوتی ہے، کیونکہ ان مسائل میں ملکی قوانین کی پابندی لازم ہوتی ہے، حالانکہ یہ قوانین شریعت کے مطابقت نہیں ہوتے ہیں۔

لیکن اس کے برعکس اسلامی شریعت غیر مسلموں کو ان کے مذہبی احکام، یعنی حلال وحرام، عبادات اور احوال شخصیہ (عائلی مسائل) پر عمل کی پوری اجازت دیتی ہیں، اور بعض فقہاء نے تو ان کے تمام دینی احکام پر عمل کی اجازت دی ہے، بشرطیکہ وہ اپنے دینی قوانین پر عمل کرنا چاہیں، ان فقہاء نے اللہ تعالی کے اس ارشاد سے استدلال کیا ہے: ''**فإن جاؤک فاحکم بینهم أو أعرض عنهم**'' (سورہ مائدہ: ۴۲)۔

حضرت امام شافعی تخییر کی آیت کو ان لوگوں پر محمول کیا جن سے رسول اللہ ﷺ نے مصالحت کی تھی، جیسے مدینہ کے یہود کہ جن سے جزیہ نہ دینے پر مصالحت ہوئی تھی، حالانکہ انہوں نے اس بات کا اقرار نہیں کیا تھا کہ ان پر وہی احکام جاری کئے ہیں، جیسے درج ذیل آیت میں صراحت ہے: ''**وکیف یحکمونک وعندهم التوراة......**'' (سورہ مائدہ: ۴۹) اسی طرح اس آیت کی شان نزول اس پر دلالت کرتی ہے، آیت نمبر ۴۹ اہل ذمہ سے متعلق ہے، امام شافعی فرماتے ہیں: جب معاہدین اللہ تعالی کے حد کے بارے میں کوئی معاملہ لے کر امام کے پاس آئے تو امام کو کوئی اختیار نہیں ہے، ان پر حد قائم کرنا ضروری ہے، اسی طرح جب کوئی دوسرے کے حق کا انکار کرے، اور حق کا طالب امام کے پاس اپنے حق کے لئے آئے تو امام کے لئے ضروری ہے کہ وہ جس عقیدہ کا حامل ہو اس کے مطابق فیصلہ کرے، گرچہ دوسرا فریق اس حکم پر راضی نہ ہو، یا وہ اس حکم پر ناراضگی کا اظہار کرے،...... اور جو فیصلہ کو نہ مانے ان کے لئے دارالاسلام میں رہنا جائز نہیں ہے،...... لہذا آیت کریمہ: ''**وإن احکم بینهم بما أنزل الله**'' (سورۃ المائدۃ ۴۹) کا مطلب ''**وأن یحکم بینهم**'' ہے، اس کے بعد امام شافعیؒ نے اس آیت سے بہت سے جزوی مسائل کا استنباط کیا ہے، وہ فرماتے ہیں: اگر کوئی عورت یہ دعوی کرے کہ شوہر نے اس کو طلاق دیدیا ہے، تو مسلمانوں کے مطابق ہی اس کا فیصلہ کیا جائے گا، اور جو بیوع مسلمانوں کے درمیان باطل ہیں وہ ان

ذمیوں کے درمیان بھی باطل ہوں گے (احکام القرآن للشافعی، ج۲،ص:۸۷)۔

ابن العربی کہتے ہیں: اگر اہل کتاب اپنے مسائل ہماری عدالت میں دائر کریں تو اگر ان کا پیش کردہ معاملہ ظلم پر مبنی ہے، جو خود ان کی شریعت میں جائز نہیں ہے، مثلاً غصب، قتل اور اس جیسے دوسرے احکام......تو ان پر وہی احکام نافذ ہوں گے جو مسلمانوں پر ہوتے ہیں، اور اگر معاملہ ایسا ہے جس میں شریعتیں مختلف ہیں تو ایسے معاملہ میں امام کو اختیار ہوگا (احکام القرآن لابن العربی، ج۲،ص:۶۱۷)۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس مسئلہ میں فقہاء کرام کی آراء مختلف ہیں، جمہور فقہاء، یعنی فقہاء احناف (سوائے امام ابوحنیفہ کے) شوافع، ایک روایت کے مطابق امام احمد اور ظاہریہ کا مسلک یہ ہے کہ ان کے حق میں اسلامی شریعت کی تنفیذ ہوگی، اور قاضی ان پر حکم کو نافذ کرے گا، یہ رائے حضرت ابن عباس، مجاہد، عکرمہ سے مروی ہے، جبکہ امام ابوحنیفہ اور فقہاء مالکیہ اور ایک قول کے مطابق امام احمد کی رائے یہ ہے کہ امام کو اختیار ہوگا، البتہ امام مالک نے تخییر کو ان مسائل کے ساتھ خاص کیا ہے جن کی حرمت مذاہب میں متفق علیہ نہ ہو، اور اگر مسئلہ متفق علیہ ہے، مثلاً زنا، تو ایسے مسئلہ میں مذکورہ جرم کا ارتکاب کرنے والے پر امام اسلامی شریعت کا حکم نافذ کرے گا، ان دونوں میں راجح پہلا قول ہے، کیونکہ ذمیوں کو امام ان کی طرف سے اس بات کی رضا مندی پر دی گئی ہے کہ ان پر اسلامی احکام نافذ ہوگا، اور ان دونوں آیتوں میں کوئی تضاد نہیں، بایں طور کہ آیت تخییر ان معاہدین کیلئے ہے جن سے صلح ہوئی تھی، جزیہ ادا کرنے کا معاملہ نہیں ہوا تھا، جیسے یہود کہ ان سے رسول اللہ ﷺ نے اس وقت مصالحت کی جب آپ مدینہ تشریف لائے، اور آیت کا حکم ان تمام معاہدین کو شامل ہے جو جزیہ ادا کرنے پر رضامند تھے، اس بنیاد پر جب حاکم کے پاس ذمییوں کی طرف سے ایسے جرم سے متعلق معاملہ آئے جس میں سزا واجب ہوتی ہے، تو قاضی ان پر سزا کے حکم کو نافذ کرے گا، البتہ نکاح اور بعض معاملات جو ان کے دین میں حلال ہیں مستثنیٰ ہوں گے، صحیح حدیث میں موجود ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں دو یہودیوں کو رجم کیا تھا جن پر زنا ثابت ہوا، یہ روایت بخاری و مسلم میں موجود ہے (دیکھئے: احکام القرآن للشافعی، ج۲،ص:۸۷، احکام القرآن للجصاص، ص:۴۳۴، تفسیر الطبری، ج۴، ص:۱۷۷، الام للشافعی، ج۴،ص:۱۳۰، فتح القدیر ج۲،ص:۵۰۲، بدایۃ المجتہد ج۲،ص: ۴۳۵، القایۃ القصوی، ۲، ص:۹۲۷، المغنی لابن قدامہ، ج۸،ص:۲۱۴)۔

ابن حزم اندلسی (ت:۴۵۶ھ) فرماتے ہیں: جس نے ذمیوں کو اور ان کے احکام کو چھوڑ دیا، انہوں نے خواہشوں کی پیروی کی، اور اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی (المحلی، ج۱۳،ص:۶۹)۔

سوم- مسلمانوں کے جذبات کا احترام اور اسلامی حکومت کی ہیبت:

لہذا ان کو اسلام، حضرت محمد ﷺ، قرآن مجید، اور اس کے احکام کے بارے میں اعلانیہ بدزبانی،

عقائد وافکار کو پھیلانے ،شراب پینے،خنزیر کھانے ،مسلمانوں کے درمیان اسلام کے خلاف اخلاق کی ترویج وشاعت سے روکا جائے گا(فقہاء نے ان ذمہ داریوں کو اپنے اجتہاد کے ذریعہ بیان کیاہے، لہذا ان کے ساتھ عرف اور ہرعہد کی خصوصیات کو بھی دیکھا جانا چاہیے،البنایہ علی الھدایہ ج ۴،ص:۸۴۰،البدائع ج۷،ص:۱۱۳،جواہرالاکلیل ج۱،ص:۲۶۸،مغنی المحتاج،ج ۴،ص:۲۵۶،کشفاف القناع ،ج ۳،ص:۱۲۶،الاحکام السلطانیہ للماوردی،ص:۱۴۴،الاحکام السلطانیہ لابی یعلی،ص:۱۴۴،الموسوعۃ الفقہیہ ج ۷،ص:۱۳۵،شیخ یوسف القرضاوی کی کتاب،حوالہ سابق،ص:۴۱)۔

غیر مسلموں کے ساتھ معاملات میں بلند اسلامی آداب:

اسلام مسلمانوں اور غیر مسلموں کے مابین حقوق وواجبات کی تنفید میں صرف لازمی قوانین پر ہی اکتفاء نہیں کرتا ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ اخلاقی اور معاملاتی آداب بھی اختیار کرتا ہے،اس طور پر کہ وہ ایک مسلمان کے دل میں حسن اخلاق،شریں گفتار،خوش روئی،نرمی، رحمدلی،آسانی،حلم وبردباری،شفقت،محبت،حسن سلوک،معافی،علم ناآشنا افراد سے اعراض،تکلیف کو گوارہ کرنے ، بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ اس کا جواب دینے ، برائی کو اچھائی سے بدلنے جیسے اوصاف کو تمام لوگوں کے حق میں پیدا کرتا ہے،اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"**ادفع بالتی هی أحسن فإذا الذی بینک وبینه عداوة كأنه ولی حميم، وما يلقاها إلا الذين صبروا وما يلقاها إلا ذو حظ عظيم**" (سورہ فصلت:۳۴)۔

اسی طرح اسلام اس اجر عظیم پر ابھارتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے رحم اور احسان کرنے والوں کے لئے طے کر رکھا ہے:

"**والكاظمين الغيظ والعافين عن الناس والله يحب المحسنين**" (سورہ آل عمران:۱۳۴)۔

یہ باتیں ہر چیز میں عدل کے واجب ہونے کے علاوہ ہیں(تفصیل کے لئے دیکھئے: ریاض الصالحین،اس میں ان ابواب سے متعلق احادیث کثرت سے موجود ہیں)۔

واضح رہے کہ یہ اخلاقیات اور عدل صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص نہیں ہیں، بلکہ یہ حکم تمام لوگوں کے لئے یکساں ہے، یہاں تک کہ جانوروں اور تمام حیوانات کے بارے میں حسن سلوک کا حکم ہے، صحیح شرعی نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک بیوہ عورت نے بلی کو باندھے رکھا اور وہ مرگئی،اس وجہ سے اس کو جہنم میں ڈالا گیا(صحیح البخار مع الفتح،ج ۶،ص:۳۵۶،صحیح مسلم،حدیث نمبر:۳۶۱۹)اور ایک بدکار عورت پیاسا کتا کو پانی پلانے کی بناء پر جنت میں داخل ہوئی (صحیح البخاری مع الفتح ،ج ۵،ص:۱۱۳ صحیح مسلم،حدیث نمبر:۲۲۴۵)۔

باہم نرمی اور رحمدلی کے محرکات:

الف: نرمی اور رحمدلی کے معاون ذرائع میں سے ایک یہ ہے کہ اسلام ایک مسلمان کو اہل کتاب کی عورت سے نکاح کی اجازت دیتا ہے، اہل کتاب خاتون مسلمان کی بیوی ہوسکتی ہے، ان کی اولاد کی ماں ہوسکتی ہے، بیوی کا بھائی ،یعنی سالہ

اور بچوں کا ماموں بن سکتا ہے، اس کی ماں اپنی ماں کے درجہ میں ہے اور وہ بچوں کی نانی ہے، اور اس کے باپ بچوں کے نانا ہوتے ہیں، اس طرح مسلمان اور اہل کتاب کے درمیان مصاہرت اور قرابت کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے، جس کے حقوق ہیں، نفقہ ہے اور ضمانت ہے، قرآن کریم نے والدین کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے، گرچہ وہ اپنی اولاد کو گمراہ کرنے کی کوشش ہی کیوں نہ کریں، ارشاد ہے:

"وإن جاهداک علی أن تشرک بی ما لیس لک به علم فلا تطعهما و صاحبهما فی الدين معروفا و اتبع سبيل من أناب إلی، ثم إلی مرجعکم فأنبئکم بما کنتم تعلمون" (سورہ لقمان:۱۵)۔

ب: اسلام نے غیر مسلم پڑوسیوں کے حقوق کو لازم کیا ہے، چنانچہ پڑوسیوں کے حقوق سے متعلق جملہ نصوص میں غیر مسلم پڑوسی بھی شامل ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: ریاض الصالحین، ص:۱۲۶)۔

ج: مباحثہ کے وقت بلند اخلاق کا التزام کرنا، اللہ تعالی نے اہل کتاب کے ساتھ مباحثہ بہتر انداز اور بہترین اسلوب میں کرنے کو خاص طور پر ذکر کیا ہے:

"ولاتجادلوا أهل الکتاب إلابالتی هی أحسن إلا الذين ظلموا منهم وقولوا آمنا بالذی أنزل إلينا و أنزل إليکم وإلهنا و إلهکم واحد و نحن له مسلمون" (سورہ عنکبوت:۴۶)۔

د: معاملات میں بلند اخلاق کا برتاؤ، رسول اللہ ﷺ نے معاملہ اور ان کے ساتھ مباحثہ میں اچھے اخلاق کا برتاؤ کیا، آپ ﷺ ان سے ملاقات فرماتے، ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے، ان کے بیماروں کی تیماری کرتے، بلکہ انہیں اپنی مسجد نبوی میں نماز پڑھنے کی بھی اجازت تھی، سیرت نگار لکھتے ہیں کہ جب نجران کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، تو وہ لوگ سیدھے مسجد میں آئے، مغرب کا وقت قریب تھا انہوں نے مسجد نبوی میں مغرب کی نماز پڑھی، صحابہ نے چاہا کہ انہیں منع کردیں، مگر رسول اللہ ﷺ نے اس سے روکا، آپ نے فرمایا آنے والوں کا استقبال کرو، اس درمیان ان لوگوں نے اپنی نمازیں پوری کرلیں (سیرت ابن ہشام، ج۱ ص:۵۷۳)۔

اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد علامہ ابن قیم لکھتے ہیں:

اس واقعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اہل کتاب کا مسلمانوں کی مسجد میں داخل ہونا جائز ہے، نیز اسی واقعہ میں انہیں مسلمانوں کی موجودگی میں اپنی نمازیں پوری کرنے پر قدرت دینا بھی ہے، جبکہ یہ عارضی ہو (زادالمعاد ج۳ ص:۲۳۸)۔

اس کے بعد فرماتے ہیں:

مقصود یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کفار سے مستقل جدال کی کیفیت میں رہنا نہیں چاہتے تھے، یہی حال آپ کے بعد آپ کے صحابہ کا بھی تھا، اللہ تعالی نے مکہ اور مدینہ دونوں جگہ ان کے ساتھ بہتر انداز میں مباحثہ کا حکم دیا ہے، اسی طرح

دین کی اشاعت ہوئی، اوراللہ تعالی نے تلوار کو دلیل کا معاون بنایا ہے (حوالہ سابق)۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے اہل کتاب کا ہدیہ قبول فرمایا، اوران کا احترام فرمایا، یہاں تک کہ جب ان میں سے ایک فرد کا جنازہ جا رہا تھا تو آپ کھڑے ہوگئے، اس بارے میں پوچھا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا کیا وہ انسان نہیں تھا؟ بخاری ومسلم کی روایت ہے کہ حضرت جابر بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ ہمارے سامنے سے جنازہ گزرا، یہ دیکھ کر رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوگئے، چنانچہ ہم لوگ بھی کھڑے ہوگئے، صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ! یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: جب تم جنازہ دیکھو تو کھڑے ہوجایا کرو (صحیح البخاری ج ۳،ص:۱۷۹، صحیح مسلم، کتاب الجنائز ج ۲، ص:۶۵۹)۔

اسی طرح سہیل بن حنیف اور قیس بن سعد سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے سے ایک جنازہ گزرا، آپ سے کہا گیا کہ یہ ایک یہودی کا جنازہ ہے، آپ نے فرمایا: ’’الیست نفسا؟‘‘ کیا اس میں جان نہیں ہے (حوالہ سابق)۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں: ’’الیست نفسا؟‘‘ کو بطور علت بیان فرمایا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جنازہ کو دیکھ کر کھڑا ہونا مستحب ہے (فتح الباری ج ۳،ص:۸۱) فقہاء کا ایک گروہ اس کے وجوب کا بھی قائل ہے، کیونکہ صحیحین کی متعدد روایات میں یہ لفظ امر کے ساتھ آیا ہے، راجح قول استحباب کا ہے، اس کی دلیل حضرت علی کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے تھے، پھر بیٹھ گئے (صحیح مسلم، ج ۲، ص:۲۶۶) یہاں بیٹھنے کو بیان جواز پر محمول کیا گیا ہے (فتح الباری، ج ۳، ص:۱۸۱)۔

غیر اسلامی ممالک میں مسلم اقلیت کے اپنے ہم وطنوں سے تعلقات:

اس موضوع پر بہت سی کتابیں اور قیمتی مقالات لکھے گئے ہیں، جن شخصیات نے شریعت کے بنیادی مآخذ کی روشنی میں تفصیل سے لکھا ہے ان میں ان میں شیخ یوسف القرضاوی، شیخ فیصل مولوی، ڈاکٹر جابر علوانی، ڈاکٹر جمال الدین عطیہ اور دیگر حضرات کے اسماء قابل ذکر ہیں، اس لئے جو باتیں یہ حضرات لکھ چکے ہیں ان کے اعادہ کے بجائے ہم چند عمومی اصول اور کلی قواعد بیان کریں گے، ان اصول وقواعد کو ایک سطر میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے:

’’إقرار الحقوق المتقابلة بين الأقلية الإسلامية والدولة الأكثرية‘‘۔

یہ بات پہلے گزر چکی ہے کہ اس اصول کو ہم نے مسلمانوں اور غیر مسلم کے درمیان ہر طرح کے تعلقات میں بنیاد قرار دیا ہے، یہ اصول خود رسول اللہ ﷺ نے اللہ کے فضل وکرم سے ثابت فرمایا: یہاں تک کہ مسلمان اور اللہ تعالی کے مابین بھی یہی اصول کارفرما ہے۔

بہت سے حقوق وواجبات اس جامع اصول سے متفرع ہوتے ہیں، ان کی دو جہتیں ہیں:

(ا) غیر اسلامی ملک میں رہنے والے مسلمانوں پر عائد اہم حقوق وواجبات، جن کی تلخیص درج ذیل ہے:

الف: ان تمام عہد و پیمان اور معاہدوں کو پورا کرنا ضروری ہے جو غیر اسلامی ملک کی طرف سے عائد ہوتی ہیں، البتہ اس پابندی سے ایسے معاہدے مستثنیٰ ہوں گے جو قطعی الدلالۃ اور قطعی الثبوت نصوص سے متعارض ہوں، جنہیں ''ثوابت'' کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان عہد و پیمان اور معاہدوں کے لازم ہونے پر دلائل اس کثرت سے ہیں کہ حدشمار سے باہر ہیں، انہی دلائل میں ایک اللہ تعالی کا یہ ارشاد ہے: **''یایھا الذین آمنو أوفوا بالعقود''** (سورہ مائدہ:۱)۔

''وأوفوا بالعھد إن العھد کان عنه مسئولا'' (سورہ اسراء:۳۴)۔

اور یہ ارشاد: **''یایھا الذین آمنوا لم تقولون مالا تفعلون کبر مقتا عند الله أن تقولوا مالا تفعلون''** (سورہ صف:۲-۳)۔

اللہ تعالی نے رسول اللہ ﷺ کو اس عہد کو بھی پورا کرنے کا حکم دیا جو رسول اللہ ﷺ اور ان قبائل کے کے درمیان طے پائے تھے، جن کی طرف سے وقتاً فوقتاً مسلمانوں پر ظلم ہوتا رہتا تھا، اللہ کا ارشاد ہے:

''وإن استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر إلاعلی قوم بینکم وبینھم میثاق و الله بما تعملون بصیر'' (سورہ انفال:۷۲)۔

یہ آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ عہد و پیمان کی پاسداری ہجرت نہ کرنے والے مومنین کے حقوق سے بھی بالاتر ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: جامع البیان للطبری، ج ۲۰، ص:۷۰)۔

علامہ ابن کثیر تحریر فرماتے ہیں:

اگر وہ دینی جنگ میں تم سے مدد چاہیں تو تم مدد کرو، یہ تم پر ضروری ہے کیونکہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، سوائے اس کہ وہ ان کفار کے مقابلے میں مدد چاہیں جن سے تمہارے عہد و پیمان ہیں...... تو اپنا عہد و پیمان مت توڑو، یہ حضرت ابن عباس سے مروی ہے (تفسیر القرآن العظیم، ج ۲، ص:۱۳۱۸)۔

اسی طرح مشرکین کے حقوق کے بارے میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم إن الله یحب المتقین'' (سورہ توبہ:۷)۔

علامہ ابن کثیر اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: تم نے ان سے جنگ بندی کا جو معاہدہ کیا ہے اس پر جمے رہو، اللہ تعالی پاکبازوں کو پسند فرماتا ہے، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام نے اسی حکم کے مطابق عمل کیا، ...... یہاںتک کہ قریش نے خود ہی

عہد شکنی کی اور اپنے حلیف بنی بکر کو اللہ کے رسول ﷺ کے حلیف نبی خزاعہ پر آمادۂ جنگ کیا اور ان کے ساتھ مل کر حرم میں بھی قتال کیا (تفسیر القرآن العظیم، ج۲، ص:۱۳۱۸)۔

اس بارے میں جو احادیث ہیں وہ بھی حد شمار سے باہر ہیں، انہی میں سے ایک متفق علیہ حدیث یہ ہے:

"**أية المنافق ثلاث إذا حدث كذب وإذا وعد أخلف وإذا أؤتمن خان**" (صحیح البخاری مع الفتح، ج۱ص:۸۳، صحیح مسلم، حدیث نمبر:۵۹)۔

مسلم کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے: "**وإن صام وصلى وزعم انه مسلم**" (صحیح مسلم، حدیث نمبر:۵۹)۔

اسی سلسلہ میں یہ روایت بھی ہے، جسے بخاری ومسلم نے بیان کیا، روایت کے الفاظ اس طرح ہیں:

"**أربع من كن فيه كان منافقا خالصا ومن كانت فيه خصلة منهن كانت فيه خصلة من النفاق حتى يدعها: إذا أؤتمن خان، وإذا حدث كذب وإذا عاهد غدر وإذا خاصم فجر**" (صحیح البخاری مع الفتح، ج۱، ص:۸۴، صحیح مسلم حدیث نمبر:۵۸)۔

ب: ملک کے تئیں دھوکہ، جھوٹ، مکر سے اجتناب، یہی حکم ملک کے علاوہ کے لئے بھی ہے، کیونکہ دھوکہ، جھوٹ، مکروفریب، تلبیس، بدعہدی حرام ہے۔

اکثر محدثین نے دھوکہ، خیانت، مکروفریب اور جھوٹ کی حرمت کے بارے میں مستقل علاحدہ علاحدہ ابواب قائم کئے ہیں، جن میں ان موضوعات سے متعلق بہت سی احادیث ذکر کی جاتی ہیں، ان احادیث میں یہ متفق علیہ حدیث بھی ہے، جس کے الفاظ اس طرح ہیں:

"**لكل غادر لواء يوم القيامة يقال هذه غدرة فلان**" (صحیح البخاری مع الفتح، ج۱۰، ص:۴۶۴، صحیح مسلم، حدیث نمبر:۱۷۳۵)۔

اسی موضوع سے متعلق ایک روایت جسے امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ کی سند سے مرفوعا نقل کی ہے، اس طرح ہے:

"**قال الله تعالى ثلاثه أناخصمهم يوم القيامة: رجل أعطى بى ثم غدر......**" (صحیح البخاری مع الفتح، ج۴، ص:۳۴۶)۔

دھوکہ کے بارے میں اسلام کا موقف بہت سخت ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"**من حمل علينا السلاح فليس منا ومن عشنا فليس منا**" (صحیح مسلم، حدیث نمبر:۱۰۱)۔

یہ حدیث صاف صاف اعلان کر رہی ہے کہ دھوکہ باز اس امت محمدیہ کا فرد نہیں ہے جس امت کو رسول اللہ تیار کرنا چاہتے ہیں، بلکہ اگر مشرکین وکفار بدعہدی کریں تب بھی قرآن نے رسول اللہ ﷺ کو ان معاہدوں کے تئیں دھوکہ اور بدعہدی

کی اجازت نہیں دی، ارشاد ہے:

"وإن يريدوا أن يخدعوك فإن حسبك الله هو الذى أيدك بنصره وبالمومنين"(سورہ انفال:۶۲)۔

اور جہاں تک جھوٹ کا تعلق ہے تو ہم نے بعض صحیح احادیث ذکر کی ہیں جو اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جھوٹ نفاق کی علامت ہے، بلکہ اس کا شمار تو کبیرہ گناہوں میں ہے، اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے جہنم کا راہبر قرار دیا ہے، ارشاد ہے:

"إن الصدق يهدى إلى البر وإن البر يهدى إلى الجنة، وإن الرجل ليصدق حتى يكتب عند الله صديقا، وإن الكذب يهدى إلى الفجور وإن الفجور يهدى إلى النار، وإن الرجل ليكذب حتى يكتب عند الله كذابا"(صحیح البخاری مع الفتح ج۱۰،ص:۴۳۲،صحیح مسلم، حدیث نمبر:۲۶۰۷)۔

یہ حقوق گرچہ بندوں سے متعلق ہیں، لیکن ان کا شمار حقوق اللہ میں بھی ہے، لہذا بندوں کے حقوق میں تعدی اللہ کے حقوق میں تعدی سمجھی جائے گی، اس پر مستزاد یہ کہ اسلامی اخلاقیات کی پابندی نہ کرنے سے غیر مسلموں کے سامنے اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ خراب ہوتی ہے، اور ایسی بری تصویر سامنے آتی ہے جو اسلام سے دوری کا سبب بنتی اور اسلام میں داخل ہونے میں رکاوٹ بنتی ہے، تجربات سے ثابت ہے کہ عمدہ اخلاق دخول اسلام کے لئے بہت بڑا محرک ہوتا ہے، اللہ تعالی حضرت ابراہیم کی دعا نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں: **"ربنا لا تجعلنا فتنة للذين كفروا"** (سورہ ممتحنہ:۵)۔

اور بلند اخلاق سے متصف نہ ہونے کی وجہ سے ان کے دخول اسلام کی راہ میں مانع بننا بھی تو ایک فتنہ ہے۔

ج۔ ملک میں نافذ تمام قوانین کی پابندی، بشرطیکہ وہ اسلامی اصولوں سے متعارض نہ ہوں، اور اسی زمرہ میں سے وہ قوانین بھی ہیں جو ٹیکسوں سے متعلق ہیں، کہ ٹیکسوں سے حاصل مال بھی عموما رفاہ عام میں ہی خرچ کیا جاتا ہے۔

د۔ معاشرہ کے اندر امن وآشتی کی حفاظت۔

ھ۔ غیر مسلموں کو بہتر طریقہ سے حق، عدل اور اسلام کی دعوت دینا، دعوت کے لئے سنجیدہ طریقہ اختیار کرنا، اشتعال سے احتراز کرنا۔

و۔ اسلام اور مسلمانوں کی مثبت اور حقیقی تصویر پیش کرنا اور باہم ہم آہنگی، تعاون اور آپسی بھائی چارہ کی روح کو تقویت دینا۔

دوم: مسلم اقلیت کے حقوق حکومت پر جس کے زیر سایہ وہ رہتے ہیں:

غیر مسلم ملک کو اپنی اقلیتوں کے تئیں جن حقوق کی پاسداری لازم ہے ان میں اہم اس طرح ہیں:

۱۔قانون کے دائرہ میں عدل ومساوات اورآزادی کو یقینی بنانا اور ایسے افکار کو روکنا جن سے مسلمانوں کے مصالح کو نقصان پہنچ سکتا ہو،مسلمانوں کے جذبات کی رعایت کرنا،انہیں مشتعل نہ کرنا اور تمام مذاہب کی بنیادی باتوں کے ساتھ گستاخی وتوہین کو روکنا،خواہ وہ کسی بھی نام سے ہو،اور ایسے قوانین نافذ کرنا جو مسلمانوں کے حقوق اور ان کی دینی آزادی کی حفاظت کی ضامن ہو۔

۲۔ان اہم حقوق میں ایک یہ بھی ہے کہ ایسی شرعی عدالتیں قائم کرنے کی اجازت ہو جہاں عائلی مسائل،معاشرتی مسائل اور مسلمانوں سے متعلق دینی مسائل حل کرنے کی اجازت ہو،جیسا مذکورہ مسائل کے حل کے لئے ممالک اسلامیہ میں خاص عدالتیں قائم ہیں۔

اس معاملہ میں برطانیہ کی حکومت واقعی قابل تعریف ہے جس نے مسلمانوں کے عائلی اور معاشرتی مسائل کے حل کے لئے شرعی عدالت قائم کرنے کی اجازت دینے میں پہل کی ہے،لندن کے اخبار سنڈے ٹائمز'' کا کہنا ہے کہ حکومت کی آمادگی اس کی سنجیدگی کو بتاتی ہے،حکومت نے شرعی قاضیوں کو طلاق اور گھریلو مسائل سے متعلق مالی جھگڑوں کے بارے میں فیصلے کرنے کا حق دیا ہے،حالانکہ اس سے قبل برطانیہ میں ان عدالتوں کے لئے کوئی تجویز نافذ کرنا بھی ممکن نہیں تھا،اب یہ واضح ہو چکا ہے کہ اس طرح کی شرعی عدالتیں لندن برمنگھم،براڈفورڈ،مانچسٹر میں قائم ہیں،اس کا صدر مقام نونیتوں اور واروکشیر میں قائم ہے،جبکہ گلاسکو اور اڈبرہ میں دو عدالتوں کا قائم ہونا بھی طے ہے (دیکھئے:ویب سائٹ القدس اخبار: node/10269http://web.alqluds.com/)۔

اسی طرح ہم ان حکومتوں کو بھی سلام پیش کرتے ہیں جنہوں نے اسلامی بینکوں کے قیام کی جازت دی یا سودی بینکوں ہی میں اسلامی ونڈوز کے قیام کی اجازت دی۔

۳۔اقلیت کے تشخص اور اس کی خصوصیتوں کی حفاظت دراصل تنوع اور رنگارنگی کی حفاظت ہے جو مطلوب ہے،لہذا کسی بھی حکومت کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ مسلم اقلیت کو ہضم کرنے اور اسے یورپی یا مغربی یا غیر اسلامی معاشرہ میں مکمل مدغم کرنے کی کوشش کرے،کیونکہ اس کا مطلب ہے تعدد اور تنوع کا خاتمہ،اور یہ دراصل دین،شناخت اور تشخص کو بدلنے کی جانب ایک خطرناک قدم ہوگا۔

اس موقعہ پر ہم یہ کہتے ہیں کہ تاریخ پورے فخر،سچائی اور صراحت کے ساتھ اسلامی حکومتوں کی رواداری کا اعلان کرتی ہے،زمانہ نبوت سے لے کر آج تک کبھی کسی مسلم اقلیت کو اپنے اندر ضم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی،اس کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ جن ممالک میں مسلمانوں کی حکومت قائم رہی وہاں آج بھی اقلیتیں عزت کے ساتھ موجود ہیں،بلکہ جب یہودیوں کو یورپ چھوڑنا پڑا تو انہیں اسلامی ممالک کے علاوہ اور کوئی جائے پناہ نہیں ملی،ہم مثبت شمولیت کے قائل ہیں،جو ایک مسلمان

کے دین وعقیدہ کی حفاظت کی ضمانت ہے، ساتھ ہی وہ اپنے نئے وطن سے محبت، سنجیدہ محنت اور فائدہ پہونچانے کا تعلق رکھے، اور یہ چیز وطن اور اس ولاء کے درمیان ہو جو ولاء اللہ تعالی اور تمام مسلمانوں کے ساتھ خاص ہے۔

سوم: حکومت اور اقلیت کے مابین مشترک حقوق:

مسلم اقلیت اور غیر اسلامی ملک کے مابین اہم مشترک حقوق جو بقاء باہم، آپسی ہم آہنگی، اجتماعی امن وآشتی، اور معاشرہ کی ترقی اور استقرار میں دونوں طرف کے کردار کا ضامن ہو حسب ذیل ہیں:

ا۔قریب سے تعارف اور ایک دوسرے کا اعتراف، اللہ کا ارشاد ہے:

"یایها الناس إنا خلقنا کم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا إن أکرمکم عند الله اتقاکم" (سورہ انعام: ۱۶۴)۔

اس آیت میں اللہ تعالی مومن اور کافر تمام لوگوں سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں کہ وہ سب ایک اصل سے ہیں، اور یہ بات ایک دوسرے کے اعتراف کا تقاضہ کرتی ہے، ایک دوسرے سے تکبر نہیں کرنا چاہئے، بلکہ دوسرے کو بھائی سمجھنا چاہئے: **"کلکم من آدم وآدم من تراب"** تو پھر یہ تفاخر، بڑائی کا اظہار، یہ خوں ریزی اور قتل وقتال کیوں؟

اس کے بعد اللہ تعالی نے بیان فرمایا کہ اس ایک جڑ سے کئی شاخیں نکلیں، یہی اقوام اور قبائل ہیں، اور اللہ تعالی ہر قوم اور ہر قبیلہ کو چند صفات، کمالات اور خصائص کے ذریعہ ایک دوسرے سے ممتاز کیا ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ ان صفات وخصائص، مذاہب وادیان کو جانا جائے، ان کے احساسات وجذبات سے واقف ہوا جائے، جب ہر ایک، ایک دوسرے سے متعارف ہوگا، ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے متعارف ہوگا، ہر مذہب والے دوسرے مذہب والے سے متعارف ہوں گے تبھی وہ حقیقی تعاون شرمندۂ تعبیر ہوسکتا ہے جس پر باہمی ہم آہنگی کا دارومدار ہے، اور تمام خصائص وصفات وعناصر سے استفادہ ممکن ہو سکے گا، اسی وقت تہذیب مکمل ہوگی اور ترقی کی شاہراہ کو طے کرے گی۔

اس کے پیش نظر غیر مسلم حکومتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمانوں کو ان کے دین، قوم اور ماحول کے اعتبار سے صحیح طور پر سمجھنے کی کوشش کریں، اور ان کی خوبیوں اور اچھائیوں سے فائدہ اٹھائیں، اسی کا پاس ولحاظ مسلم اقلیت کو بھی رکھنا ضروری ہے، اس طرح کہ مسلم اقلیت مغربی ماحول، وہاں کی خصوصیات، ایجادات، تہذیب وتمدن اور اس کے طریقۂ کار کو اچھی طرح سمجھے، اور ان چیزوں سے بھرپور طریقہ سے فائدہ اٹھائے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک مثبت پہلو سامنے آئے گا۔

اور وہ مسلمان جو یورپ میں سکونت اختیار کئے ہوئے ہیں ان کے لئے ضروری ہے کہ مغربی معاشرہ کے تعلق سے عمومی طور سے اپنے نظریہ کو درست رکھیں، کہ مغربی معاشرہ گرچہ لادینی ہے، لیکن مسلمانوں کے لئے دین پر عمل کرنے کی راہ قطعی طور پر موجود ہے، جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا، اسی وجہ سے یورپ کے معاشرتی ڈھانچہ میں کسی نئی تبدیلی کے بغیر اسلامی

ثقافتی سرگرمیوں کی اجازت دی گئی ہے، ساتھ ہی ساتھ دوسرے علاقوں پر بھی نظر رہے جو اپنے یہاں اسلامی رجحان رکھنے والی یا مستقل اسلامی ڈھانچہ رکھنے والی تنظیم کو قائم کرنے کی اجازت نہیں دیتے، اسی وجہ سے اشتعال انگیزی کے مقابلہ میں سنجیدگی بہتر ہے، کیونکہ مقصود ومطلوب ایسا ٹھوس عمل ہے جو ہادی ورہنما ہو اور ایسی حکمت عملی پر قائم ہو جو مغرب کو اس کے اعتبار سے دیکھتا ہو، کسی ایک پہلو سے نہ دیکھتا ہو، اور ساتھ ہی ساتھ ایک حد تک اس کے سیاسی تنوعات سے بھی فائدہ اٹھائیں، قانونی اعتبار سے اس کے اقدار ورجحانات کو بھی دیکھیں کہ یورپ ایک علمی اور ثقافتی ترقی اور جدید ٹکنالوجی والا معاشرہ ہے، اسی طرح یہاں قائم ان دینی مراکز کو بھی دیکھیں جس کی اہمیت برابر بڑھتی جارہی ہے، اور یہ بات بھی ذہن نشیں رہے کہ مغربی معاشرہ کے افراد کے ذہنوں میں صلیبی جنگوں اور بعد کے دور میں امریکہ اور یورپ میں ہونے والے دہشت انگیز واقعات سے اسلام کے تئیں خوف اور ڈر پیدا ہو گیا ہے، اور بعض ان شدت پسند تنظیموں کی وجہ سے جو عراق میں انتقام کے نام پر قائم ہیں، اس کی غلط شبیہ ان کے ذہنوں میں پیدا ہو گئی ہے۔

۲۔ ایک دوسرے کا تعاون کرنا نیکی اور تقوی کی بنیاد پر ہو، یا اس طریقہ پر تعاون کیا جائے جس میں تمام انسانوں کی خیرخواہی اور بھلائی مضمر ہو، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**وتعاونوا على البر والتقوى ولاتعاونوا على الإثم والعدوان**'' (سورۂ مائدہ: ۲)۔

چنانچہ اللہ تعالی نے واضح کر دیا ہے کہ تعاون وہمدردی کی جگہ نیکی، احسان، خیرخواہی اور تقوی ہے، اور تعاون کا معاملہ کس سے کریں اور کس سے نہ کریں؟ اس کو مطلق بیان کیا ہے، کہ مسلمان کے لئے روا ہے کہ ان سبھوں کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کریں جہاں نیکی اور تقوی پایا جائے، اس کی کوئی تحدید نہیں فرمائی کہ کس کے ساتھ تعان کا معاملہ ہو، نبی کریم ﷺ نے تعاون وخیرخواہی کی اہمیت کو بیان فرماتے ہوئے یہاں تک فرمایا کہ زمانۂ جاہلیت میں عبداللہ بن جدعان کے گھر ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوا جو مجھے سو سرخ اونٹوں سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے، اگر زمانہ اسلام میں مجھے اس طرح کے کسی معاہدہ کے لئے بلایا جاتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا، اس معاہدہ کی نوعیت یہ تھی کہ قریش کے بڑے بڑے لیڈران نے دیکھا کہ لوگ ظلم وزیادتی کا معاملہ کر رہے ہیں اور محتاج لوگ حاجت براری نہ ہونے کی وجہ سے موت کا نوالہ بن رہے ہیں، اور کمزور ولاچار انسانوں کا کوئی مددگار بھی نہیں ہے، ان حالات کو دیکھ کر زعمائے قریش کی رگ حمیت بھڑک اٹھی، اور وہ ''حلف الفضول'' کے لئے جمع ہوئے اور یہ معاہدہ کیا کہ ہم کمزوروں کی مدد کریں گے، فریادیوں کی فریاد سنیں گے، مہمانوں کی مہمان نوازی کریں گے، اور اس طرح مکارم اخلاق کے قبیل کے کام کریں گے۔

مسلم اقلیت کے لئے قرآن وسیرت کے یہ دونوں نمونے موجود ہیں، جو ہمیشہ بطور نمونہ ومثال باقی رہیں گے۔

قرآن وسنت میں مسلم اقلیت کے لئے دونمونے:

جب ہم قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ قرآن میں ان مسلمانوں کے لئے جو کسی ضرورت اور خاص حالات کے سبب کسی غیر اسلامی سوسائٹی میں زندگی گزار رہا ہوتا ہے، کتنا عمدہ اور قیمتی نمونہ موجود ہے، ان نمونوں میں سے ایک نمونہ ہمارے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات وشخصیت کا ہے اور دوسرا نمونہ جو سیرت کی کتابوں میں مذکور ہے کہ اصحاب رسول ﷺ میں سے ایک بڑی تعداد جو مرد وخواتین پر مشتمل تھی حبشہ ہجرت کی اور وہاں امن وسکون اور اطمینان وخوشی کے ساتھ رہے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان دونوں مثالوں کو ذرا تحلیل وتجزیہ کے ساتھ ساتھ مختصرا بیان کریں۔

پہلا نمونہ: مصر میں اللہ کے نبی حضرت یوسف علیہ السلام کا نمونہ

قرآن کریم میں حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ہمارے موضوع سے متعلق اس کی کچھ باتیں یہاں بیان کی جارہی ہیں:

(۱) حضرت یوسف علیہ السلام نے مصر میں اخلاق وکردار اور دین وعقیدہ کی حفاظت کے ساتھ ایک مثالی زندگی گزاری، وہ نفسانی لذت اور خواہشات سے دور رہے، باوجودیکہ عزیز مصر کی بیوی اور دیگر عورتوں کی طرف سے گناہ کے ارتکاب کے لئے ان پر زبردست دباؤ ڈالا گیا، پھر معاملہ یہاں تک پہونچ گیا جس کو قرآن شریف میں یوں بیان کیا گیا ہے:

”......وغلقت الأبواب وقالت هيت لک قال معاذ الله إنه ربی أحسن مثوای إنه لايفلح الظالمون“(سورہ یوسف: ۲۳)۔

(اس عورت نے جس کے گھر میں حضرت یوسف تھے، دروازہ بند کر کے ان سے کہنے لگی تو آ جاؤ تو حضرت یوسف نے کہا اللہ کی پناہ! وہ میرا رب ہے، مجھے اس نے بہت اچھی طرح رکھا ہے، بلاشبہ ظلم کرنے والوں کا بھلا نہیں ہوتا)۔

اسی طرح حضرت یوسف نے اپنے کردار کی حفاظت کی خاطر بہت سی قربانیاں دی ہیں، حتی کہ اس کردار کے تحفظ کی خاطر کئی سالوں تک قید وبند کی زندگی گزاری ہے۔

چنانچہ مسلم اقلیت کو چاہئے کہ وہ اپنے دین وعقیدہ اور اخلاق وکردار کی حفاظت میں حضرت یوسف کو اپنا آئیڈیل اور نمونہ بنائیں، اس مقصد کے حصول کے لئے ہر قسم کی مادی، روحانی، تربیتی اور عملی اسباب وذرائع اختیار کئے جائیں، تب ہی اپنے تشخص کی حفاظت کی جاسکتی ہے، ورنہ دنیوی مقصد چاہے جتنا عظیم اور بڑا ہو، اگر دین وکردار کی پامالی ہورہی ہو تو اس کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی، حضرت یوسفؑ کے اس نکتہ کو قرآن شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”رب السجن أحب إلی مما تدعوننی إليه“(سورہ یوسف: ۳۳)۔

اے میرے پروردگار! جس گناہ کی دعوت یہ عورتیں مجھے دے رہی ہیں اس کے مقابلہ میں مجھے جیل خانہ بہت پسند ہے۔

اس جگہ لفظ'' السجن ''مطلق بیان کیا گیا ہے، وقت کی کوئی قید نہیں ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایسی معصیت جو اللہ کے عتاب اور ناراضگی کا سبب ہو اس سے بچنے کے لئے تمام عمر کی قید و بند برداشت کرنا بہتر اور لائق تحسین ہے، کفر و شرک اور الحاد و دہریت اختیار کرنا اور اس رنگ اور سانچہ میں ڈھلنا تو بہت دور کی بات ہے۔

(۲) احسان کرنے والوں کے ساتھ وفاداری کرنا، خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو، عزیز مصر نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا تو اس وقت اپنی بیوی سے کہا کہ:

''أکرمی مثواہ عسی أن ینفعنا أو نتخذہ ولدا''(سورہ یوسف:۲۱)۔

''اسے بہت عزت واحترام کے ساتھ رکھو، بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں فائدہ پہونچائے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں''

اللہ تعالی کے خوف وڈر کے بعد یہی وفاداری ان کے پیش نظر تھی، جس کی وجہ سے انہوں نے عزیز مصر کی بیوی کی درخواست کو رد کردیا، حضرت یوسف نے کہا:''إنہ ربی أحسن مثوای''(سورہ یوسف:۲۳)۔

''وہ میرا رب ہے، مجھے اس نے بہت اچھی طرح رکھا ہے''

بعض مفسرین نے''انہ'' کی ضمیر کا مرجع قرینۂ حال مان کر عزیز مصر کو قرار دیا ہے، اگر اس کا مرجع اللہ تعالی کو قرار دیا جائے تو بھی درست ہے، کیونکہ آیت کا تکملہ اسی پر دلالت کررہا ہے، ارشاد ہے:''إنہ لایفلح الظالمون''(سورہ یوسف:۲۳)۔

(۳) شہریوں پر عدم تشدد: اگر مہاجرین، اقلیت یا مسلم ملکوں پر ارکان مملکت اور حکام وقت میں سے کسی کی طرف سے استعمار کے ذریعہ ظلم وتشدد کیا جائے، تو ظلم کا مقابلہ ظلم سے نہیں ہوتا، عزیز مصر کی بیوی نے جب حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ گناہ کے ارتکاب کی کوشش کی تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا:''إنہ لایفلح الظالمون''(سورہ یوسف:۲۳) کہ بیشک ناانصافی اور ظلم وتشدد کرنے والوں کا بھلا نہیں ہوتا۔

اس آیت میں بعض مسلم مہاجرین کی زبردست تردید ہے جو یورپی ممالک اور امریکہ کے مال میں زیادتی کو جائز قرار دیتے ہیں، اس دلیل کی بنیاد پر کہ یہ ایسے استعماری ممالک ہیں جنہوں نے مسلمانوں کے مال کو غصب کررکھا ہے، لہذا یہ ان کے غصب کرنے کے عوض ہوگا، یہ استدلال کمزور اور شریعت کے منافی ہے، اس تشدد اور ظلم کا سیدھا جواب یہ ہے کہ یہ ایک قسم کا ظلم ہے، اس کے دلائل بہت سے ہیں، بعض اوپر ذکر کئے جاچکے ہیں، ان میں ایک یہ آیت بھی ہے:''ولاتزر وازرۃ وزر أخری''(سورہ انعام:۱٦۴)، دوسری دلیل یہ ہے کہ یہ مسلمان ان مظلوم مسلمانوں کے نمائندہ نہیں ہیں۔

(۴) توطن: جس ملک میں بھی بود و باش اختیار کی جائے اس کو اپنا ملک سمجھا جائے اور اس سے محبت کی جائے، غور فرمایئے کہ جب مصر میں ان عورتوں کی جانب سے یوسف علیہ السلام کا جینا دوبھر ہو گیا تو انہوں نے یہ نہیں کہا کہ یہاں سے نکل جانا بہتر ہے، اس گناہ سے جس کی دعوت یہ عورتیں دے رہی ہیں، بلکہ فرمایا: ''**رب السجن أحب إلى مما يدعوننى إليه**'' (سورہ یوسف: ۳۳)۔

(اے میرے پروردگار! جس گناہ کی دعوت یہ عورتیں مجھے دے رہی ہیں اس کے مقابلہ تو مجھے جیل خانہ ہی زیادہ پسند ہے)۔

یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ مصر کو اپنا وطن سمجھتے تھے، اسی لئے انہوں نے مصر سے نکل جانے کے بجائے وہیں جیل میں رہنے کو ترجیح دی، بلکہ انہوں نے اپنی اس خواہش کا اظہار بھی کیا کہ انہیں مصر کا وزیر خزانہ بنا دیا جائے، تاکہ وہ اپنے عوام کی خدمت اور مدد کر سکیں، بلکہ انہوں نے اپنے والدین اور تمام بھائیوں کو مصر بلا لیا، باوجودیکہ اہل مصر حضرت ابراہیم کے مذہب کے پیروکار نہیں تھے۔

(۵) اچھے اسلوب و انداز اور حکمت و دانشمندی کے ساتھ دعوت کا کام انجام دینا: حضرت یوسف علیہ السلام نے مشکل ترین حالات میں بھی فریضۂ دعوت کو ترک نہیں کیا، ذرا اندازہ کیجئے وہ کتنے بے بس تھے، ان کو ظلماً بیچا گیا، پھر غلام بنا کر رکھا گیا، ابتداء میں ان کی سماجی حالت بھی کس قدر کمزور تھی، اس کے باوجود دعوتی مشن کو قید خانہ میں بھی ترک نہیں کیا، بلکہ قید خانہ کا زمانۂ قیام ان کی کامیابیوں کا پیش خیمہ بنا اور بے انتہا مفید اور ثمر آور ثابت ہوا، جب حضرت یوسف علیہ السلام کے دو قیدی ساتھیوں نے ایک شب عجیب وغریب خواب دیکھا جس کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ کے فضل وکرم سے بتانے کا وعدہ کیا اور اسی بہانے دین ابراہیمی کی تعبیر وتشریح، اس کی خصوصیت اور شرک سے اس کی بیزاری وغیرہ ان کے سامنے بیان کی، اور شرک کے خطرناک انجام، معبودان باطل کی بے توقیری اور بے بسی کو بھی بیان کیا، اور یہ بتایا کہ حکومت وسرداری اور عبادت کے لائق بس ایک اللہ کی ذات ہے جس کا شریک وسہیم کوئی اور نہیں ہے، اس کے بعد ان دونوں کو خواب کی تعبیر بتائی (سورہ یوسف: ۳۶)۔

بعینہ اسی طرح مسلم اقلیت کو چاہیے کہ وہ حکمت ودانشمندی اور بہتر اسلوب میں غیر مسلموں کو دعوت دیں، اس لئے کہ دعوت کا کام تمام مسلمانوں پر حسب استطاعت ضروری ہے، چاہے ایک ہی آیت کیوں نہ ہو، حدیث شریف میں ہے: ''**بلغوا عنى ولو آية**'' (صحیح البخاری) ''میری طرف سے پہونچا دو اگر چہ ایک ہی آیت کیوں نہ ہو'' بلکہ اللہ تبارک وتعالی نے داعی الی اللہ کو کامیاب وکامران قرار دیا ہے:

''**ولتكن منكم أمة يدعون إلى الخير ويأمرون بالمعروف ونهون عن المنكر و أولئک هم المفلحون**'' (سورہ آل عمران: ۱۰۴)۔

(تم میں سے ایک جماعت ایسی ہونی چاہیئے جو بھلائی کی طرف بلائے، نیک کاموں کا حکم کرے اور برے کاموں سے روکے، اور یہی لوگ فلاح ونجات پانے والے ہیں)۔

(۶) غیر مسلم (کفار) سب کے سب برابر نہیں ہوتے ہیں، ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو دنیوی معاملات میں انصاف پسند، صاف دل اور اچھے کردار کے حامل ہیں، کچھ ایسے ہیں جو اپنے ہی ملک میں مسلمان کو اپنے لئے بطور حاکم تسلیم کرتے ہیں، پھر یہی مسلم حاکم ان کو اچھی تنخواہ اور ملازمت دیتا ہے، اور کچھ لوگ اس کے بالکل برعکس ہیں، تو سب پر ایک ہی حکم لگانا صحیح نہیں ہے چنانچہ عزیز مصر عدل وانصاف اور باہمی معاملات میں بہت اچھے تھے، اس نے شروع ہی میں اپنی بیوی سے کہا تھا: "**اکرمی مثواہ**" (سورہ یوسف:۲۱) اور جب اس نے اپنے اہل خانہ میں سے ایک گواہ کی موجودگی میں حضرت یوسف اور اپنی بیوی کو دروازے کی طرف دوڑتے ہوئے دیکھا تو اس وقت اس نے معذرت کے انداز میں کہا: "**یوسف اعرض عن ھذا**" (سورہ یوسف:۲۹) اور اپنی بیوی سے کہا: "**واستغفری لذنبک**" (سورہ یوسف:۲۹) کہ "اے عورت! تو اپنے گناہ سے توبہ کر" اور اس نے اپنی بیوی کی اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا جب اس نے کہا کہ: "**ما جزاء من أراد بأهلک سوء ا إلا أن يسجن أو عذاب عليم**" (سورہ یوسف:۲۵)۔

(جو شخص تیری بیوی کے ساتھ برا ارداہ کرے اس کی سزا بس یہی ہے کہ اسے قید کر دیا جائے یا اور کوئی دردناک سزا دی جائے)۔

بلکہ عزیز مصر نے اس پر زبردست پھٹکار لگائی اور اس کے اس کرتوت کو سراسر سازش قرار دیا، قرآن مجید اس کو بیان کرتا ہے:

"**فلما رأى قميصه قد من دبر قال إنه من كيد كن إن كيد كن عظيم يوسف أعرض هذا واستغفري لذنبک إنک كنت من الخاطئين**" (سورہ یوسف:۲۸)۔

(خاوند نے جو دیکھا کہ یوسف کا کرتا پیٹھ کی جانب سے پھاڑا گیا ہے تو صاف کہہ دیا کہ یہ تم عورتوں کی طرف سے چالبازی ہے بیشک تمہاری چالبازی بہت بڑی ہے، یوسف! اس بات کو جانے دو اور اے عورت تو اپنے گناہ سے توبہ کر، بیشک تو ہی قصوروار ہے)۔

یہ سچ ہے کہ اگر بعینہ ایسا واقعہ آج کی تاریخ میں کسی ظالم وجابر بادشاہ کے ساتھ پیش آجاتا تو وہ یوسف کو اپنی عزت وشرف کی خاطر ہلاک کر ڈالتا یا پھر ان کو پھانسی کی سزا سنائی جاتی یا کوئی اور دردناک سزا کا مژدہ سنایا جاتا، اور وہ اپنی بیوی کو ایک اجنبی کے سامنے درست قرار دے دیتا، لیکن عزیز مصر کی خودداری اور جاہ وحشمت نے انہیں کوئی غلط فیصلہ پر آمادہ نہیں کیا اور انہوں نے اپنی بیوی کو سچ ماننے سے انکار کر دیا، بلکہ اس مسئلہ میں انہوں نے ایک گواہ کی بات بغور سنی اور اسے درست

مانتے ہوئے اپنی بیوی کو مجرم قرار دیا اور اس کے اس کرتوت کو زبردست سازش سے تعبیر کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام سے معافی مانگتے ہوئے کہا ''یوسف! اب اس بات کو جانے دو'' ''أعرض عن هذا'' (سورہ یوسف:۲۹)۔

اس دنیا میں اس طرح کے بھی صاف دل، صاف ذہن، دوراندیش اور اعلی کردار کے حامل بادشاہ ہوتے ہیں جو اپنے عوام کی ترجیحات کو پیش نظر رکھتے ہیں اور علم اور اہل علم کی خوبیوں، ان کے کارناموں اور ان کے مقام و مرتبہ کو فراموش نہیں کرتے ہیں، حضرت یوسف نے جب اس کے خواب کی تعبیر بتادی اور اس کے نمائندہ کو یہ کہتے ہوئے پوری تفصیل بتادی: ''تزرعون سبع سنین دأبا فما حصدتم فذوره فی سنبله إلا قلیلامما تأکلون'' (سورہ یوسف:۴۷)۔

(تم لوگ سات سال تک پے در پے حسب عادت غلہ بویا کرنا اور فصل کاٹ کر اسے بالیوں سمیت ہی رہنے دینا، سوائے اپنے کھانے کی تھوڑی سی مقدار کے)۔

لیکن ان کی زبانی سننے کے لئے بادشاہ نے انہیں طلب کیا، اگر واقعہ ہمارے اس زمانہ کا ہوتا تو ہوسکتا تھا کہ بادشاہ اس تعبیر کو اپنی طرف منسوب کر لیتا اور اس اجنبی بے خانماں ملزم اور بے قصور قیدی کے اس مرتبہ کا قائل نہ ہوتا، کہ کیسے وہ ایک اجنبی اور غلام شخص کی بات مان لیتا اور مقام و مرتبہ کو اس کی طرف منسوب کرتا، ہم آج دیکھتے ہیں کہ کتنے ہی امیر و وزیر ہیں جو عمدہ افکار و خیالات اپنے مشیر کار سے لیتے ہیں، لیکن اس کی نسبت اپنی جانب کرتے ہیں۔

جب یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے پاس جانے کی درخواست یہ کہتے ہوئے رد کردیا کہ ان عورتوں کے ساتھ غیر جانبدارانہ تحقیق ہونی چاہئے جو ان کے جیل جانے کا سبب بنی ہیں، اس وقت بھی بادشاہ کی عظمت اور شان و شوکت نے اس کو کسی غلط فیصلہ پر آمادہ نہیں کیا، بلکہ بخوشی اس درخواست کو قبول کرلی اور غیر جانبدارانہ تحقیق کے بعد یوسف کو بے قصور قرار دیا۔

پھر اس کے بعد بادشاہ نے ان کو یہ کہتے ہوئے طلب کیا کہ وہ انہیں اپنا مشیر اور راز داں بنانا چاہتا ہے: ''ائتونی به استخلصه لنفسی'' (سورہ یوسف:۵۴) 'اسے میرے پاس لاؤ کہ میں اسے اپنے خاص کاموں کیلئے مقرر کرلوں' لیکن جب ان سے بات چیت کی تو اسے محسوس ہوا کہ یوسف تو نظیر پیش کرنے، تجزیہ اور تنقید کے معاملہ میں بلند مرتبہ کے حامل ہیں، تو اس نے یوسف علیہ السلام سے کہا: ''إنک الیوم لدینامکین أمین'' (سورہ یوسف:۵۴) یعنی آپ کو جو علم اور امانت کی دولت حاصل ہے اس کی وجہ سے قیادت اور تنفیذ کا جو عہدہ چاہیں وہ آپ کے لئے ہے، اس وقت حضرت یوسف نے اپنے لئے ایک مناسب عہدہ کا اظہار کیا، فرمایا: ''اجعلنی علی خزائن الأرض إنی حفیظ علیم'' (سورہ یوسف:۵۵) ''آپ مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کردیجئے، میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں'' یہ عہدہ آج کے لحاظ سے چار وزارتوں پر مشتمل تھا: وزارت مالیات، وزارت زراعت و کاشتکاری، وزارت تجارت و اقتصادیات اور وزارت اجتماعی امور و ترقی، اس خواب

کے ایک اور پہلو پر غور کیجئے کہ اللہ تعالی نے ایک کافر بادشاہ کو بالکل سچا اور حقیقی خواب دیکھایا جو اس بات پر دلیل ہے کہ کافر بھی صاف دل ودماغ ہوتے ہیں، چنانچہ ان کے خواب سچے ہو سکتے ہیں۔

(۷) اقلیت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بڑی وزارتوں اور عہدہ ومناصب کو اختیار کرے، یہ بحث ابھی اوپر گزری ہے۔

(۸) مسلمان خواہ کہیں بھی ہو وہ زندگی کی تعمیر وترقی کا مکلّف اور ذمہ دار ہے، نہ کہ قتل وغارت گری اور تخریب کاری کا، حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک ایسی عوام کے لئے جو مسلمان نہیں تھے ان کی تعمیر وترقی کے لئے کام سرانجام دیا، انہیں بھوک مری، قحط سالی اور ہلاکت سے بچایا اور ان کے سامنے اپنے افکار کو پیش کیا، بلکہ وحی والہام اور نبوت کی برکت عطا کی ،جس کے ذریعہ انہیں ہلاکت سے نجات ملی، لہذا مسلم اقلیت کو چاہئے کہ اپنے وطن کی تعمیر وترقی کے لئے تمام قسم کے علوم وایجادات اور گراں قدر خدمات پیش کریں، حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ایسا ہی کیا تھا جب انہوں نے مصر اور اس کے پڑوسی ممالک جو قحط سالی اور مشکلات سے جوجھ رہے تھے اور قریب تھا کہ سب کے سب تباہ وبرباد ہو جائیں تو اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے علم وہنر کی روشنی میں ایک جامع اور مکمل لائحہ عمل تیار کیا اور اسے عملی طور پر نافذ کیا جس سے لوگوں کی پریشانیاں ختم ہوگئیں۔

(۹) مادر وطن کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہئے، اس کی محبت اور جذبات کو ہمیشہ دل میں زندہ رکھنا چاہئے اور وہاں کے باشندوں کو حسب استطاعت اپنی خدمات پیش کرتے رہنا چاہئے، کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی ایسا کیا تھا، انہوں نے اپنے بھائیوں کا تعاون کیا تھا اور ان کی خدمت میں اشیاء خوردنی اور مزید کچھ سامان تحفتاً پیش کیا تھا، بلکہ انہوں نے اپنے تمام بھائیوں اور والدین سے درخواست کی تھی کہ وہ مصر تشریف لائیں:" وقال ادخلوا مصر إن شاء الله آمنين" (سورہ یوسف:۹۹)۔

(۱۰) اگر ہم وطنوں کی طرف سے بدسلوکی ہوئی ہو تو اس کو بھلا دینا چاہئے، انتقام کے جذبہ سے خالی ہو کر زندگی گزارنا چاہیے۔

مسلم مہاجر کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے باشندوں کی زیادتی کو برداشت کریں، خواہ عوام کی طرف سے زیادتی ہو یا حکام کی طرف سے، جبکہ اللہ تعالی انہیں ایک دوسرا وطن بھی عطا کر چکا ہے، چنانچہ انتقام کے جذبہ کے ساتھ نہیں زندگی گزارنا چاہیے، اور ملک کی منفی چیزوں کو ساتھ نہیں لے جانا چاہیے، اس لئے کہ اب وطن بدل چکا ہے، حضرت یوسفؑ نے بھی اپنے بھائیوں کے ساتھ ایسا ہی کیا تھا، جنہوں نے حضرت یوسف کو قتل کرنے کی کوشش کی اور کنواں میں ڈالنے کی تدبیر کی تھی، کہ یہی واقعہ ان کی فروختگی، ان کی غلامی اور ان کی عزت وآبرو کے لئے چیلنج بن گیا تھا، پھر ان بھائیوں نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے بعد بھی ان کے دل حسد وبغض سے بھرے رہے، اس کا اظہار اس وقت ہوا جب بادشاہ کا پیالہ ان کے

سگے بھائی بنیامین کے پاس ملاتو اس وقت انہوں نے اپنے اس پوشیدہ بغض وعناد کا اظہار کرتے ہوئے کہا:

”**قالوا إن يسرق فقد سرق أخ له من قبل فأسرها يوسف فی نفسه ولم يبدها لهم**“(سورہ یوسف:۷۷)۔

’اگر اس نے چوری کی ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں، اس کا بھائی بھی پہلے چوری کر چکا ہے، یوسف علیہ السلام نے اس بات کو اپنے دل میں رکھ لیا اور ان کے سامنے بالکل ظاہر نہ کیا‘۔

یہ جھوٹ ان کے کینہ وحسد، بغض وعناد اور حضرت یوسف سے بے انتہا نفرت پر صاف دلالت کر رہی ہے، ان سب کے باوجود حضرت یوسف نے اس کا بدلہ نہیں لیا، بلکہ اس کے جواب میں ان کو اشرار کہنے کے بجائے صرف انکی جانب ’شر‘ کی نسبت کی اور کہا:”**انتم شر مکانا والله اعلم بما تصفون**“(سورہ یوسف:۷۷) یہاں تک کہ اس وقت حضرت یوسف کے لئے ممکن تھا کہ ان کی اس چوری کو ثابت کر دیتے، یا ثبوت کے بغیر ان کو سزا دیتے لیکن آپ نے ایسا کچھ نہیں کیا، لیکن جب تاریکی چھٹ گئی اور یہ راز ان پر منکشف ہو گیا اور ان کے بھائیوں کو کافی شرمندگی اور پشیمانی ہوئی، اس وقت بھی حضرت یوسف نے ان کے ساتھ مالی اور قلبی ہر طرح کا بہترین سلوک کیا اور کہا:

”**قال هل علمتم ما فعلتم بيوسف وأخيه إذ أنتم جاهلون قالوا إنک لأنت يوسف قال انا يوسف وهذا أخی قد من الله علينا إنه من يتق و يصبر فإن الله لا يضيع أجر المحسنين قالوا تالله لقد آثرک الله علينا و إن كنا لخاطئين قال لا تثريب عليكم اليوم يغفر الله لكم وهو أرحم الراحمين اذهبوا بقميصی هذا فألقوه علی وجه أبی يأتی بصيرا وآتونی بأهلكم أجمعين**“(سورہ یوسف:۸۹۔۹۳)۔

”اے بھائیو! تم جانتے بھی ہو کہ تم نے یوسف اور اس کے بھائی کے ساتھ اپنی نادانی کی حالت میں کیا کیا؟ انہوں نے کہا (واقعی) تو ہی یوسف ہے، جواب دیا: ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے، اللہ نے ہم پر فضل وکرم کیا، بات یہ ہے کہ جو بھی پرہیزگاری اور صبر کرے گا اللہ تعالی کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں کرتا، انہوں نے کہا کہ اللہ کی قسم! اللہ تعالی نے تم کو ہم پر برتری دی ہے اور یہ بھی بالکل سچ ہے کہ ہم خطاکار تھے، جواب دیا آج تم پر کوئی ملامت نہیں ہے، اللہ تمہیں بخشے، وہ سب مہربانوں سے بڑا مہربان ہے، میرا یہ کرتا لے جاؤ اور اسے میرے والد کے منہ پر ڈال دو کہ وہ دیکھنے لگیں اور اپنے تمام خاندان کو میرے پاس لے آؤ“۔

آیت بالا سے مندرجہ ذیل نقاط واضح ہوتے ہیں:

(ا) حضرت یوسف نے ان کے اس کرتوت کو جہالت ونادانی قرار دیا اور یہ نہ کہا کہ تم لوگوں نے عمداً وقصداً ایسا کیا، جبکہ یوسف علیہ السلام اس بات کو اچھی طرح سے جان رہے تھے:”**قال هل علتم ما فعلتم بيوسف وأخيه إذ**

أنتم جاهلون"(سورہ یوسف:۸۹)۔

انہوں نے فرمایا: اے بھائیوں! تم جانتے بھی ہو کہ تم نے یوسف اوراس کے بھائی کے ساتھ اپنی نادانی میں کیا کیا؟

(۲) حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ کی نعمتوں کا تذکرہ کیا اور یہ نہ کہا کہ تم لوگوں نے جو میرے ساتھ کیا وہ کافی تکلیف دہ اور دردناک واقعہ تھا، بلکہ فرمایا: "**انا یوسف وهذا أخی قد من الله علینا إنه من یتق ویصبر فإن الله لا یضیع أجر المحسنین**"(سورہ یوسف ۹۰)۔

'ہاں میں ہی یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی بنیامین ہے، اللہ نے مجھ پر فضل وکرم کیا ہے، بات یہ ہے کہ جو بھی پرہیزگاری اور صبر اختیار کرے تو اللہ تعالی کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے'(سورہ یوسف: ۹۲)۔

اس اندازِ گفتگو کا مقصد حضرت یوسف علیہ السلام کا اپنے بھائیوں کی شرمندگی کو ختم کرنا اور انہیں یہ بتانا تھا کہ جو کچھ تم لوگوں نے میرے ساتھ کیا ہے اس سے مجھے بڑا فائدہ ملا اور آج اسی کی بدولت میں ارض مصر پر فرمانروائی کر رہا ہوں۔

(۳) حضرت یوسف نے اپنے بھائیوں پر ملامت کرنے کے بجائے ان سے یہ کہا: "**لاتثریب علیکم الیوم**"(سورہ یوسف: ۹۲) آج تم سب کا کوئی مؤاخذہ نہیں ہے، یعنی ہماری طرف سے تم کو کوئی لعنت وملامت نہیں ہے، حالانکہ وہ وقت گناہ عظیم سے مغفرت کا تھا، گویا ان کی طرف سے نفسیاتی تکلیف کو کم کرنا تھا کہ کوئی اہم بات نہیں ہے، کوئی لعنت وملامت نہیں۔

(۴) حضرت یوسف کا کہنا: "**یغفر الله لکم**"(سورہ یوسف: ۹۲) دراصل حضرت یوسف کی اپنے بھائیوں سے محبت کو بتاتا ہے کہ انہوں اللہ تبارک وتعالی سے دعا کی، اور یہ بتاتا ہے کہ معاملہ اللہ تعالی کے سامنے ہے، اس لئے میں اللہ سے تمہاری مغفرت چاہتا ہوں، اور اللہ تعالی ارحم الراحمین ہے، لہذا وہ تمہاری مغفرت فرمادیں گے۔

(۵) ان کے اس قول: "**هو أرحم الراحمین**"(سورہ یوسف: ۹۲) میں یہ اشارہ ہے میں تمہارے ساتھ شفقت ورحم کا معاملہ کر رہا ہوں تو وہ جو ارحم الرحمین ہے وہ ضرور تم سب کو معاف کردیگا۔

(۶) ان کے والدین اور بھائیوں کے عرش کے سامنے جھکنے (سجدہ تعظیمی) کے بعد اللہ کا یہ ارشاد: "**هذا تأویل رویاء من قبل قد جعلها ربی حقا وقد أحسن بی إذ أخرجنی من السجن وجاء بکم من البدو من بعد ان نزع الشیطان بینی وبین إخوتی إن ربی لطیف لما یشاء إنه هو العلیم الحکیم**"(سورہ یوسف: ۱۰۰)۔

" ابا جان! یہ میرے پہلے کے خواب کی تعبیر ہے، میرے رب نے اسے سچا کردکھایا، اس نے میرے ساتھ بڑا احسان کیا جبکہ مجھے جیل خانہ سے نکالا اور آپ لوگوں کو صحراء سے لے آیا، اس اختلاف کے بعد جو شیطان نے مجھ میں اور میرے بھائیوں میں ڈالا دیا تھا، میرا رب جو چاہے اس کے لئے بڑی تدبیر کرنے والا ہے اور وہ بہت علم حکمت والا ہے'۔

اپنے پہلو میں متعدد سہولتیں رکھتا ہے، بلکہ اپنے بھائیوں کے لئے دل داریاں کرتا ہے، اوراس سے آگے بڑھ کر ذیل کے نکات کی روشنی میں شکرو امتنان کو ضروری قرار دیتا ہے، جو درج ذیل ہیں:

الف۔حضرت یوسف علیہ السلام نے اس پورے واقعہ کے ذریعہ انجام کو بتایا اوران کے لئے اورتمام بھائیوں کے جو خیر حاصل ہوا صرف اسی کو بتایا، اوراس سلسلہ میں جو مصائب وآلام اٹھائے ان کو بیان نہیں کیا۔

ب۔انہوں اس پورے واقعہ کی نسبت اپنے خواب کی تعبیر کی طرف کی جسے اللہ تعالی نے سچ کر دکھایا تھا، فرمایا: ''**هذا تاويل روياى من قبل قد جعلها ربى حقا**'' (سورہ یوسف:۱۰۰) اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالی کی تدبیر اور حکمت کی وجہ سے ہی یہ بلند مقام حاصل ہوا ہے۔

ج۔انہوں نے اچھے نتائج کو بیان کیا اوراللہ کے شکرو احسان کو کاذکر کیا، فرمایا: ''**وقد أحسن بى إذ أخرجنى من السجن وجاء بكم من البدو**'' (سورہ یوسف:۱۰۰) گویا ماضی کی تلخ یادوں کی طرف نہیں گئے، بلکہ جیل سے نکلنے اوراور مصر کی فرمانروائی جیسی نعمتوں کا تذکرہ کیا۔

د۔اپنے بھائیوں کی طرف سے جو کچھ ہوا اس کی نسبت شیطان کے فریب اور چالبازی کی طرف کی: ''**من بعد ان نزع الشيطان بينى وبين إخوتى**'' (سورہ یوسف:۱۰۰)۔

ہ۔اپنے بھائیوں سے پہلے اپنی طرف نزع شیطان کی نسبت کی، حالانکہ وہ چھوٹے تھے، گویا اس کے ذریعہ یہ بتانا تھا کہ سب لوگ شیطان کے فریب کے شکار ہوئے۔

و۔لفظ ''**إخوتى**'' اضافت کے ساتھ استعمال کیا، عربی میں نسبت اس وقت کی جاتی ہے جب کسی چیز سے اپنے بے پناہ تعلق ومحبت اور غایت درجہ جذبات کا اظہار مقصود ہو۔

پوری دنیا کی مسلم اقلیات کے لئے حضرت یوسف کا نمونہ اسوہ اور مثال کی حیثیت رکھتا ہے، وہ یہ کہ جس وطن میں قیام پذیر ہو اوروطن اول جہاں پریشانیاں برداشت کرنی پڑی، ان دونوں سے معاملہ اورسلوک حضرت یوسف کی طرح کرنا چاہیے، خدا کی قسم اگر ہمارا سلوک حضرت یوسف کی طرح ہو جائے تو دنیا کا بڑا حصہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے، جیسے مسلم تجار کے اخلاق، حسن سلوک، اوران کی دعوتی کوششوں کے نتیجہ میں مشرقی ایشیا کی قومیں مشرف بہ اسلام ہوئیں۔

دوسرا نمونہ: حبشہ کے مہاجرین:

سیرت نگاروں نے لکھا ہے کہ جب قریش نے اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا مکۃ المکرّمہ میں جینا دوبھر کر دیا اوران پر ظلم وستم کی انتہا کر دی تو اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کمزور مسلمانوں کو حبشہ ہجرت کرنے کی اجازت دی، تاریخ ابن کثیر میں ہے کہ جب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے مسلمانوں کی حالت زار نہ دیکھی گئی، آپ اللہ تعالی کی طرف سے عافیت میں تھے، اوراپنے چچا ابو طالب کی وجہ سے بھی راحت تھی، لیکن صورت حال یہ تھی کہ آپ اپنے اصحاب پر ہونے والے ظلم

کونہیں روک سکتے تھے، چنانچہ اس وقت آپ ﷺ نے ان مسلمانوں سے فرمایا کہ تم لوگ حبشہ چلے جاؤ بہتر ہوگا، کیونکہ وہاں کا بادشاہ نیک اور صالح ہے، وہ ظلم وتشدد کو سخت ناپسند کرتا ہے، وہ سرزمین صدق وصفا کی علامت ہے، یہاں تک کہ اللہ تعالی اس پریشانی کا حل پیدا فرمادے، یہ سنتے ہی اکثر مسلمان فتنہ کو چھوڑ کر اپنے دین کے ساتھ ارض حبشہ ہجرت کر گئے، تاریخ اسلامی کی یہ سب سے پہلی ہجرت تھی، اولین مہاجرین میں حضرت عثمان بن عفان اوران کی زوجہ محترمہ حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کا نام آتا ہے(البدایہ والنہایہ، ج۴،ص:۱۶۶) پھر حضرت جعفر بن ابی طالب نے اپنی زوجہ اسماء بنت عمیس کے ساتھ ہجرت کی، اس وقت حضرت اسماء بنت عمیس حمل سے تھیں، چنانچہ حضرت عبداللہ بن جعفر وہیں حبشہ میں پیدا ہوئے، اس کے بعد مسلمان پے در پے ارض حبشہ ہجرت کرنے لگے اور اس طرح حبشہ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد جا بسی (تفصیل کے لئے دیکھئے: سیرت ابن اسحاق،ص:۲۰۸، سیرت ابن ہشام، ج۱،ص:۳۲۳)۔

حضرت امام احمد حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی سند سے روایت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سب کو نجاشی کے پاس بھیج دیا، اس وقت ہم لوگوں کی کل تعداد اسی تھی، جس میں عبداللہ بن مسعود، حضرت جعفر، حضرت عبداللہ بن عرفطہ، حضرت عثمان بن مظعون اور حضرت موسی رضی اللہ عنہم اجمعین شامل تھے، یہ لوگ نجاشی کے پاس آئے، دوسری طرف قریش نے عمرو بن العاص اور عمارۃ بن الولید کو پیش قیمت تحفہ وتحائف لے کر نجاشی کے پاس بھیجا، یہ سب نجاشی کے پاس سجدہ تعظیمی کرتے ہوئے دربار میں داخل ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے چچا کی اولاد میں سے کچھ سر پھرے نوجوان اپنے مذہب وملت کو چھوڑ کر یہاں آپ کے پاس قیام پذیر ہیں، نجاشی نے پوچھا وہ کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا: آپ کی سرزمیں میں، انہیں ہمارے پاس دوبارہ واپس کر دیجئے، بادشاہ نجاشی نے ان سب کو بلوایا، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے کہا آج میں آپ لوگوں کا ترجمان ہوں، آپ لوگ میری اتباع کریں، چنانچہ وہ لوگ سلام کرتے ہوئے داخل ہوئے، انہوں نے سجدہ نہیں کیا، درباریوں نے اعتراض کیا کہ انہوں نے بادشاہ کو سجدہ کیوں نہیں کیا؟ اس پر حضرت جعفر نے کہا کہ ہم لوگ ایک اللہ کے سوا کسی کو سجدہ نہیں کرتے ہیں، ان لوگوں نے کہا یہ کیا ہے؟ حضرت جعفر نے کہا: اللہ تعالی نے ہمارے پاس رسول بھیجا، اس نے ہمیں بتایا کہ ہم صرف اللہ کو سجدہ کریں، نیز اس نے حکم دیا کہ نماز ادا کریں اور زکوۃ دیں، اس پر عمرو بول پڑے کہ بادشاہ سلامت! یہ لوگ تو عیسی بن مریم کے بارے میں آپ کے خلاف رائے رکھتے ہیں، بادشاہ نے پوچھا تم لوگ عیسی بن مریم اوران کی ماں کی شان میں کیا کہتے ہو؟ انہوں نے کہا کہ ہم وہی کہتے ہیں جو اللہ تعالی نے کہا ہے کہ عیسی بن مریم اس کا کلمہ اور اس کی روح ہیں جو اس نے مریم میں ڈالا تھا، مریم کو کسی انسان نے نہیں چھوا تھا، یہ سنتے ہی بادشاہ نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا کہ اے حبشہ والو، اے راہبو! خدا کی قسم ان کا عقیدہ حضرت عیسی کے سلسلہ میں بعینہ وہی ہے جو ہمارا عقیدہ

ہے،تم لوگ اورتمہارے نبی بڑے مبارک لوگ ہیں، میں گواہی دیتا ہوں کہ وہ اللہ کے رسول اور پیغمبر ہیں، ان کے سلسلہ میں میں نے انجیل میں پڑھا ہے اورعیسی مسیح نے ان کی بشارت بھی دی ہے، اس ملک میں تم جہاں چاہو وہاں رہو، خدا کی قسم اگر میرے پاس ملک کی یہ ساری ذمہ داریاں نہ ہوتی تو میں ان کے پاس سفر کرکے جاتا اور ان کی جوتی اٹھانے کو اپنے لئے باعث شرف سمجھتا، اس کے بعد ان دونوں کے تحفہ کو واپس کردیا، پھر حضرت عبداللہ بن مسعود نے جلدی کی یہاں تک کہ بدر میں شریک ہوئے، ان کا خیال ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کو نجاشی کے انتقال کی خبر پہونچی تو آپ نے ان کے حق میں استغفار کیا، ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس روایت کی سند قوی ہے، بہتر ہے، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ سے حبشہ ہجرت کرنے والوں میں ابوموسی بھی شامل ہیں، گرچہ بعض راویوں نے ان کا نام ذکر نہیں کیا ہے (مسند احمد ۱/۴۶۱)۔

اس موقعہ پر ہم حبشہ کی جنگ اوراس بارے میں صحابہ کرام کا موقف بھی بیان کرنا چاہتے ہیں، حضرت ام سلمہؓ جوان مہاجرین میں شامل ہیں، بیان کرتی ہیں کہ ہم لوگ بہتر سرزمین میں اچھے پڑوسی کی طرح رہتے تھے، کچھ ہی عرصہ گزرا کہ حبشہ ہی کے ایک شخص نے بادشاہ حبشہ کے خلاف علم بغاوت بلند کردیا، اس واقعہ سے ہم لوگوں کو جو تکلیف پہونچی وہ بیان سے باہر ہے، ہمیں یہ خوف تھا کہ کہیں وہ بادشاہ پر غالب نہ ہوجائے اوراس طرح کوئی ایسا بادشاہ نہ آئے جو ہمارے حقوق کا اتنا لحاظ نہ کرے جتنا یہ بادشاہ کرتے ہیں، چنانچہ ہم لوگ اللہ تعالی سے دعا کرتے تھے اور بادشاہ کی نصرت طلب کرتے تھے، ایک بار وہ باغی غصہ کی حالت میں نکلا، صحابہ نے ایک دوسرے سے کہا کہ اس واقعہ کو دیکھنے کون جائے گا، تاکہ معلوم ہوسکے کہ کون غالب آتا ہے، حضرت زبیرؓ ان میں سب سے چھوٹے تھے، انہوں نے کہا میں جاؤں گا، چنانچہ ایک مشکیزہ میں سوراخ کیا گیا، جس کو انہوں نے اپنے گلے میں باندھ لیا، اوردریائے نیل میں تیرتے ہوئے اس پار سے اس پار چلے گئے، جہاں لوگ جمع تھے، انہوں نے واقعہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھا، اللہ نے اس باغی کو شکست دی، اورنجاشی اس پر غالب آگئے، اوراس کو قتل کردیا، پھر حضرت زبیر ہمارے پاس آئے، وہ اپنی چادر لہرا رہے تھے اور کہہ رہے تھے: بشارت ہو، اللہ تعالی نے نجاشی کو کامیابی عطا فرمائی، ام سلمہؓ کہتی ہیں: خدا کی قسم! نجاشی کی کامیابی سے ہمیں جتنی خوشی ہوئی اتنی کسی چیز سے نہیں ہوئی، اس کے بعد ہم لوگ وہیں رہے، یہاں تک کہ ہم میں سے بعض افراد مکہ مکرمہ ہجرت کرگئے، جو باقی رہے وہ وہیں آباد رہے (البدایہ والنہایہ ج ۴، ص: ۱۸۵)۔

اس پورے واقعہ کا ماحصل:

۱) دوسروں کے دلوں میں جگہ پانے کا طریقہ یہ ہے کہ مشترک عقائد اور متفق علیہ باتوں سے بات شروع کی جائے اور اچھے اوصاف کا تذکرہ کیا جائے، کیونکہ حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی ابتدائی آیات کی تلاوت کی، جس میں حضرت عیسی اور حضرت مریم علیہا السلام کے اچھے اوصاف بیان کئے گئے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ نجاشی آبدیدہ ہوگئے، اس موقعہ

پر تثلیث کو بیان نہیں کیا، جیسا کہ قرآن نے بعض عیسائیوں کا عقیدہ نقل کیا ہے، اسی طرح عیسائیوں کی مذمت سے متعلق کوئی آیت نقل نہیں کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلم اقلیت کو ہمیشہ مشترک اور متفق علیہ عقائد اور محبت آمیز باتیں کرنی چاہیے۔

۲) حالات جیسے بھی ہوں، ہمیشہ دین کی قطعی باتوں کی پابندی کرنی چاہیے، اس بات کی تائید حضرات صحابہؓ کے اسی واقعہ سے ہوتی ہے کہ انہوں نہایت صبر آزما اور سنگین حالات میں بھی بادشاہ کے سجدہ کو گوارا نہ کیا، حالانکہ اس وقت حالات کا تقاضہ یہی تھا کہ سجدہ کیا جائے، کیونکہ ان کے آنے سے پہلے قریش کا ایک وفد قیمتی ہدایا کے ساتھ مسلمانوں کو واپس لے جانے کے لئے دربار شاہی میں حاضر ہو چکا تھا، اور انہوں نے آداب شاہی کی قدیم روایات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بادشاہ کے سامنے سجدہ بھی کیا تھا، لیکن ان سب کے باوجود مسلمانوں نے بادشاہ کو صرف سلام کیا، سجدہ تعظیمی نہیں کیا، جس کی وجہ سے بادشاہ نے پوچھا کہ جس طرح تمہاری قوم کے کچھ افراد نے آداب بجالا یا اس طرح تم نے نہیں کیا، حضرت جعفرؓ نے فرمایا:

جہاں تک سلام کی بات ہے تو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں بتایا کہ جنتیوں کے تحیہ کا طریقہ السلام ہے، اور ہمیں اسی طرح سلام کرنے کا حکم ہے، چنانچہ ہم لوگ ایک دوسرے کو اسی طرح سلام کرتے ہیں، ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ خدائے واحد کے سوا کسی اور کے سامنے سجدہ نہ کریں (مسند احمد، ج ۱ ص: ۴۶۱، نیز دیکھئے: معجم الکبیر طبرانی، ج ۲ ص: ۱۴۷۸)۔

اس واقعہ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مسلم اقلیت پر واجب ہے کہ دین کے قطعی احکام سے تنازل اختیار نہ کرے، اور کوئی ایسی چیز قبول نہ کرے جو اس کے دین کے قطعی احکام یا عقیدہ کے متعارض ہو، یا جو اسے ضم کر لے یا اس کے تشخص کو ختم کر دے، یہ معاملہ نہایت اہمیت کا حامل ہے، ورنہ اس خوش حال زندگی کا کیا فائدہ جب دین کے قطعی احکام اور عقیدہ ہی خطرہ میں ہو، اس لئے مسلم اقلیت کے لئے ضروری ہے کہ اس راہ میں ہر قربانی کے لئے تیار رہے، اور اپنے اسلامی تشخص کی حفاظت کے لئے اپنی قیمتی سے قیمتی متاع خرچ کرے۔

۳) دارالکفر کی جانب ہجرت کرنا اور وہاں رہنا جائز ہے، کیونکہ صحابہ کرام فتح خیبر تک حبشہ میں قیام پذیر رہے، حضرت جعفر کی روایت میں ہے: ہم لوگ حبشہ سے نکلے اور مدینہ پہونچے تو رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی، آپ نے مجھے گلے لگا لیا، پھر فرمایا: مجھے نہیں معلوم کہ خیبر کی فتح سے زیادہ خوشی ہوئی یا جعفر کی آمد سے (البدایہ والنہایہ ج ۴ ص: ۱۷۹)۔

۴) دوسرا وطن جہاں وہ مقیم ہو اس سے محبت، دشمن پر اس کی کامیابی سے خوشی، اس کی کامیابی کے لئے دعاء، حادثہ کے موقعہ پر کسی کا جانا اور اس کی کامیابی کی مبارکباد دینا (البدایہ والنہایہ ج ۴ ص: ۱۸۵، سیرت ابن اسحاق ص: ۱۹۷)۔

اس واقعہ میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ اوپر کی تفصیلات اور اللہ و رسول اللہ اور مسلمانوں کے ولاء کے درمیان کوئی

تعارض نہیں ہے۔

۵) وفاداری: امام بیہقی اور دیگر محدثین ابوامامہ سے روایت کرتے ہیں انہوں نے بیان کیا کہ جب نجاشی کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ بنفس نفیس ان کی خدمت کے لئے کھڑے ہوگئے، صحابہ نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! ہم لوگ آپ کی طرف سے کافی ہیں، آپ نے فرمایا: ان لوگوں نے ہمارے اصحاب کا اکرام کیا، ہم چاہتے ہیں کہ اس کا بدلہ دیا جائے (دلائل النبوۃ للبیہقی، ج ۴، ص: ۱۹۴)۔

اس وفد کے افراد غیر مسلم تھے، اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کا اکرام کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمانوں پر اپنے محسنوں کی وفاداری اور اللہ کا شکر ادا کرنا ضروری ہے، خواہ احسان کرنے والا کسی بھی مذہب کا ماننے والا ہو۔

اس واقعہ اور حضرت جعفر اور ان کے ساتھیوں کے نمونہ سے مستنبط یہ چند مسائل ہیں۔

بعض مسخ شدہ اسلامی اصطلاحات:

اسلام میں غیر مسلم رعایا پر عائد ہونے والے مالی حقوق کی صحیح حیثیت واضح کرنے کے لئے چند اصطلاحات استعمال کئے گئے ہیں، جیسے جزیہ، ذمہ وغیرہ جن سے ان کے سلسلہ میں اسلامی ریاست کی ذمہ داری واضح ہوتی ہے، لیکن گمراہ کن پروپیگنڈوں کے ذریعہ ان اصطلاحات کو مسخ کر دیا گیا ہے، اس لئے ہم ان کا صحیح مفہوم واضح کرنے کی کوشش کریں گے:

جزیہ کے معنی لغت میں بدلہ اور عوض کے ہیں (القاموس المحیط، لسان العرب، المصابیح المنیر مادہ 'جزی')۔

فقہاء کے نزدیک جزیہ اس مال کو کہتے ہیں جو ذمیوں سے وصول کیا جائے، حضرت امام شافعی نے جزیہ کی تعریف یہ کی ہے کہ جزیہ ایسا مال ہے جو ان سے اسلامی ریاست میں رہنے، یا ان کی جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت یا ان سے جنگ نہ کرنے کے بدلہ ان کی رضامندی سے لیا جائے (حاشیۃ القلیوبی علی حاشیۃ المحلی، ج ۴، ص: ۲۲۸)۔

اسی طرح یا اس کے قریب قریب جمہور فقہاء نے بھی تعریف کی ہے (دیکھئے: الفتاوی الہندیہ ج ۲، ص: ۲۴۴، جواہر الاکلیل ج ۱، ص: ۲۶۶، المغنی ج ۸، ص: ۴۹۵) اور یہ معنی اس کے لغوی معنی کے قریب ہے۔

ان تعریفات کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ مال اسلامی ملک میں رہنے والے غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے، انہیں امن وامان پہونچانے کے عوض لیا جاتا ہے، یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مال حقوق شہرت کے عوض کے طور پر لیا جاتا ہے، جیسے افراد کے اعتبار سے زکوۃ اور صدقۂ فطر مسلم شہریوں سے وصول کیا جاتا ہے، ویسے ہی غیر مسلموں سے فی نفر جزیہ وصول کیا جاتا ہے، اور خراج زمین کا ٹیکس ہے جو غیر مسلموں سے لیا جاتا ہے، قبیلہ بنوتغلب کے بعض عیسائیوں نے جزیہ کے نام سے حکومت کو تاوان دینے سے انکار کیا، لیکن زکوۃ یا اس کے دوگنا ادا کرنے پر راضی ہوئے تو خلیفہ وقت حضرت عمرؓ نے اسے قبول کیا (تفصیل کے لئے دیکھئے: الاموال لابی عبید ص: ۵۴۱، الخراج لابی یوسف ص: ۱۴۳، فقہ الزکوۃ شیخ قرضاوی، ج ۱، ص: ۱۸۱)۔

دوسرے پہلو سے دیکھیں تو جزیہ ادا کرنا اسلامی حکومت کو تسلیم کرنے کی واضح دلیل ہے، بایں طور اس میں دونوں فریق کی جانب سے اطمینان کا پہلو ہے۔

جزیہ کی مشروعیت کب ہوئی؟ اس بارے میں علماء کی رائے مختلف ہے، بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ جزیہ کی مشروعیت سن ۸ ھ میں ہوئی، جبکہ بعض ۹ ھ کے قائل ہیں (زاد المعاد، ج ۲ ص: ۸۸، تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص: ۵۴۷) جب نجران کے عیسائیوں، ہجر کے آتش پرست، اس کے بعد ایلیہ، آزرج اور تبوک کے بعض یہودی قبائل سے لیا گیا، جزیہ کی مقدار ایک درہم ہے (چار گرام اعشاریہ چار سونا) یہ سالانہ ہر بالغ عاقل پر لازم ہے، بچے، مجنون، راہب، عورتیں اس سے مستثنی ہیں، ابو عبید اور دیگر حضرات سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یمن والوں کے نام جو مکتوب لکھا اس کی عبارت یہ تھی:

''من محمد إلى أهل اليمن...... وأنه من أسلم من يهودي أو نصراني، فإنه من المومنين له ما لهم وعليه ما عليهم ومن كان على يهوديته أو نصرانيته، فإنه لايفتن عليه وعليه الجزية'' (الاموال ص: ۳۷)۔

جزیہ تاوان ہے یا حق شہریت؟

حکومت، خواہ دینی ہو یا سماجی، اس کے کچھ حقوق ہوتے ہیں اور کچھ فرائض و واجبات، مثلاً امن و امان کا تحقق، تکافل داخلی وغیرہ، اسی طرح حکومت کا شہریوں پر یہ حق ہے کہ وہ افرادی اور مالی وسائل کے ذریعہ حکومت کا تعاون کریں، تاکہ اس کے ذریعہ ایسے مقاصد حاصل کئے جائیں جن کا فائدہ تمام لوگوں کو پہونچے، امن، سیاست اور اقتصادیات میں بگاڑ ہر چیز کو ڈھا دیتی ہے، اور کوئی چیز باقی نہیں رہتی، یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، جس کا مشاہدہ آج ہم عراق میں کر رہے ہیں۔

دیگر قدیم و جدید تمام حکومتوں کی طرح اسلامی حکومت نے بھی مالی حقوق متعین کئے ہیں، تاکہ فرد اور جماعت کا امن اور شہریوں کی کفالت کی تکمیل ہو سکے، لیکن اسلامی ریاست نے ان مالی حقوق کو دو خانوں میں تقسیم کیا ہے، ایک وہ مالی حقوق جن میں اصولی طور پر عبادت کا مفہوم شامل ہے، جیسے زکوۃ، اسلام نے مسلمانوں پر زکوۃ بطور عبادت اور بطور تکافل فرض کیا ہے، اس لئے اس میں اصول اور عام قواعد کے مطابق نیت اور دل کا ارادہ لازمی ہے، اسلامی شریعت کی طرف سے اسکا مطالبہ صرف مسلمانوں سے ہے، کیونکہ اس کی ادائیگی کا مستحق ہونے کیلئے دائرہ اسلام میں داخل ہونا ضروری ہے، مذکورہ خصوصیت کے پیش نظر فطری طور پر اس مال کی مقدار، اس کا مصرف متعین ہوگا باوجود اس کے اگر کوئی غیر مسلم شہری جزیہ کے بدلہ زکوۃ دینے پر اصرار کرے تو اسلامی حکومت اس کا استقبال کرے گی، کیونکہ زکوۃ کی رقم جزیہ کی رقم سے زیادہ ہوتی ہے۔

دوسرے وہ مالی حقوق جس میں اصولی طور پر عبادت کا مفہوم شامل نہیں ہوتا، اس لئے یہ مصرف اور مقدار کے لحاظ مختلف ہوتا ہے، اس میں دو باتوں کو ملحوظ رکھا گیا ہے:

اول یہ کہ غیر مسلم شہری اسلامی ریاست کو اس طور پر تسلیم کرے کہ دونوں کے حقوق اور ذمہ داریوں کا تحقق ہو سکے۔
دوسرے یہ کہ ریاست کے کندھے پر اپنی رعایا کے امن وامان اور ریاست کے داخلی وخارجی دشمنوں سے جانی ومالی تحفظ فراہم کرنے کے تعلق سے جو ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان میں شرکت ہو،یعنی امن اور جنگ سے متعلق جو کوششیں ہوں ان میں شرکت، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ترقی، تکافل اور اجتماعی ضمان جو ضرورت مندوں کے لئے ہوتا ہے ان سب میں شرکت ہو، جزیہ کا مصرف بیت المال ہوتا ہے،اور اسے عمومی ترقیات، تکافل، اور ضمان اجتماعی میں خرچ کیا جاتا ہے، تاکہ اس کا فائدہ ان تمام لوگوں کو پہونچے جو اسلامی حکومت میں موجود تمام باشندوں کو پہونچے، خواہ وہ مسلم یا غیر مسلم۔
اس تفصیل کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ جزیہ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے بدلہ کو شامل ہے جس کی تفصیل اوپر گزری، اور اس لفظ میں دوسرے کی تحقیر یا تذلیل کا کوئی پہلو نہیں ہے، لیکن میڈیائی پروپیگنڈوں نے اس سلسلہ میں ذہنوں کو پراگندہ کر دیا ہے، اس لئے اس میں کوئی حرج کی بات نہیں کہ غیر مسلموں سے جو وصول کیا جائے اسے ٹیکس یا اس طرح کوئی اور نام دیا جائے، بلکہ اگر اس کو زکوۃ کہا جائے تب بھی شرعی اعتبار سے کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ حضرت عمر کے دور خلافت میں تو اس کی نظیر بھی ملتی ہے، جب بنو تغلب نے جزیہ کے نام سے کوئی مالی ٹیکس ادا کرنے سے انکار کیا، انہوں نے کہا کہ ہم لوگ جزیہ کا دوگنا دیں گے، لیکن اسے جزیہ کے بدلے زکوۃ کہا جائے، حضرت عمرؓ نے اس سے اتفاق فرمایا تھا، اس لئے نام میں کوئی مسئلہ نہیں ہے، یہ حق غیر مسلموں سے وصول کیا جائے گا اور حکومت، ملک اور اس کے باشندوں کی فلاح کے لئے خرچ کیا جائے گا۔

ذمی کی اصطلاح:

جزیہ کی طرح ذمی جیسے عمدہ لفظ کے بارے میں حساسیت پیدا کی گئی، حالانکہ یہ لفظ اہم معانی اور انسانیت کے متعدد پہلو پر دلالت کرتا ہے، اس کے معنی لغت میں گردن، آدمی، یا عہد کے ہیں، شرعی نصوص میں اسکی تفسیر اللہ اور رسول اللہ کی پناہ سے کیا گیا ہے، اللہ تعالی اور رسول اللہ ﷺ نے اہل ذمہ کو عہد وامان اور پناہ عطا فرمایا ہے، سب سے پہلے اس لفظ کا استعمال دستاویز میں ہوا، اور اس معاہدہ میں ہوا جو نجران کے عیسائیوں کے ساتھ ہوا تھا۔
لفظ ذمی استعمال کرنا ضروری ہو ایسا نہیں ہے، اس پر کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ اس کی جگہ دوسری اصطلاح مثلاً شہری وغیرہ استعمال ہو سکتا ہے۔
حقیقت یہ ہے کہ اسلام دوسرے مذہب اور دوسرے مذہب والوں کے ساتھ رہنے کو بغیر کسی جبر وتشدد کے قبول کرتا ہے، اور اس کو جملہ حقوق عطا کرتا ہے، اسلام کا یہ موقف سابقہ دور کے تناظر میں ایک انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے، تاریخ

اس کی کوئی مثال پیش نہیں کرسکتا ہے کہ ایک مذہب دوسرے مذہب کو قبول کرتا ہو، خواہ اسی کی قوم سے کیوں نہ ہو، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ یہودیوں نے دین مسیح کو قبول نہیں کیا، بلکہ حضرت مسیح، ان کے پیروکاروں پر ظلم وبربریت کی المناک داستان رقم کی، یہاں تک کہ انہوں نے حضرت مسیح کو قتل کرنے تک کی کوشش کی لیکن اللہ تعالی نے ان کے ساتھ خاص شفقت ومحبت کا معاملہ فرمایا، انہیں ان جیسے لوگوں سے نجات دیا اور اوپر اٹھالیا، اسی طرح جب عیسائیوں کی قسمت کا ستارہ چمکا اور انہیں حکومت واقتدار حاصل ہوا تو انہوں نے یہودیوں کے ساتھ ظلم وستم کی انتہاء کردی، ایسا اسلام سے پہلے بھی ہوا اور اسلام آنے کے بعد بھی، انہوں نے یہوں کو مارا، اذیت ناک تکلیفیں دیں، اور دھتکارتے رہے۔

☆☆☆

شہریت کا مسئلہ

شہریت، حقوق انسانی اور بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں

ڈاکٹر عرشی خان☆

انسانی تاریخ میں معاشرتی علوم بالخصوص علم سیاست ہمیشہ سے ہی گفتگو کا موضوع رہا ہے۔مقدونیائی فلسفی ارسطو نے اسے تمام علوم کا مرکز کہا ہے۔بقول ارسطو' سیاست ایک ایسا عملی سائنس ہے جو ریاست کے متفرق گوشوں کا احاطہ کرتا ہے' ۔دیگر علوم کی طرح اسکی نظر بھی انسان کامل پر رہتی ہے۔جسے بعض مقامات پر کبھی بادشاہ، تو کبھی خدا، کبھی صوفی اور کبھی معتقدین کا درجہ حاصل ہوتا ہے۔

یہ کبھی یونانی شاعری، مجسمہ سازی اور فن کا موضوع بنتا ہے تو کبھی کلام الٰہی میں اسکا ذکر آتا ہے۔قران کریم نے تو اسے وہ مقام عطا کر دیا ہے کہ کائنات کی دوسری مخلوق کا اس سے موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔قران نے اسے اشرف المخلوکات کے منصب پر بٹھا دیا ہے۔انھیں اس سرزمین پر اللہ اور کائنات کے تئیں انکے فرائض و ذمہداری کا احساس دلانے کے مقصد سے بھیجا گیا ہے۔

مغرب میں پلیٹو، ارسطو، سسرو جیسے فلسفیوں اور رومن سلطنت کے اکابرین نے بھی اس راز کو جاننے کی کوشش کی ۔قرون وسطٰی کے علمائے کرام نے عوام الناس کو سلاطین کے جبر و ظلم کے خلاف علم بغاوت بلند کرنے کی آزادی تو دی، لیکن زندگی کے تمام شعبوں میں چرچ اور پوپ کی مداخلت و تسلط کو نہ صرف جائز ٹھہرانے کی کوشش کی بلکہ زیادتیوں کی مخالفت اور اسکے خلاف آواز اٹھانے کا حق بھی ان سے چھین لیا۔مذہبی اور حکمراں طبقہ دونوں خود کو خدا اور مسیح کا نمائندہ گردانننے لگے۔انکا دعویٰ تھا کہ وہ زمین پر اسکے نائب ہیں۔اسے لیکر دونوں کے مابین تنازعہ بھی ہوا جسکا نتیجہ چودھویں عیسوی صدی میں چرچ کے زوال کی شکل میں سامنے آیا۔نشاۃ ثانیہ، مطلق العنانی، سامراجیت، سلطنتیں مادیت پرستی سبھی ایک دوسرے میں ضم ہو کر ترقی کرتی رہیں۔جدید طرز فکر نے انہیں نئی جہت عطا کی۔اس آمیزش سے پہلے جمہوریت اور بعد میں ریاست کا وجود عمل میں آیا۔

☆ ڈپارٹمنٹ آف پولیٹیل سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

پلیٹو کے دور میں انسانی اقدار کی شناخت اسکے اخلاقی کرداراور تعلیمی معیار سے طے کی جاتی تھی۔حقوق انسانی کی اہمیت نہیں تھی،انسانی فرائض اسکی بنیادی ذمہ داری میں شامل تھے۔وہ ایک ایسی جماعت تیار کرنے پر توجہ مرکوز کئے رہتا ہے جسے حکومت،معاشیات اور حفاظتی معاملات کی ذمہ داری سونپی جا سکے۔وہ اقتصادی امور سے جڑے لوگوں کو سیاسی حقوق دینے کی سفارش نہیں کرتا۔انہیں عوامی معاملہ کے ماہرین کے لئے چھوڑ دیا جاتا ہے۔رومن جمہوریہ کے دور میں لوگوں کو انتخابی عمل میں بھی شامل کیا جانے لگا۔قونصل کے انتخاب میں انہیں حق رائے دہی کا اختیار دیا گیا۔

پلیٹو کے شاگرد اور یونان کے شہر ایتھنس میں واقع اسکی درسگاہ کے وارث ارسطو نے پہلی دفعہ حکومت کا اصول وضع کیا۔عملی طور پر حکومت کا فلسفہ اشرافیہ اور جمہور کے اختلاط سے ہی ممکن تھا۔اس میں درمیانی طبقہ کے پروان چڑھنے کے بھرپور مواقع تھے۔بعد میں سسرو اور سنیسا جیسے مفکر سیاسی میدان سے باصلاحیت افراد کی کم ہوتی قدر و قیمت اور رومی سلاطین کی مطلق العنانی سے بیحد مایوس تھے۔

کلاسیکی عہد کے دوران مغرب میں فطرت کو عقلی اور سائنسی بنیاد پر سمجھنے کا زور رہا۔عہد وسطیٰ میں جبکہ مسیحی طرز فکر کے زیر اثر تھومزم کا زور تھا،ایک ایسا اصول وضع کیا گیا جہاں آدمی کو فرائض کا پابند رکھا جائے۔حکومت کے حقوق طاقت کے مظہر نہیں تھے بلکہ متعلقہ صلاحیت کے اعتبار سے اسکی اخلاقی ذمہ داری تصور کی گئی۔انصاف،نیکی اور مسرت کی حصولیابی کے لئے اخلاقیات سب سے موثر ذریعہ سمجھا گیا۔معمولات زندگی میں مذہب کی مداخلت میں اضافہ ہوتا رہا۔قانون کے نفاذ اور ترقیاتی عمل میں اسکی برتری تسلیم کی جانے لگی۔اسطرح اخلاقی دعویٰ،مذہب سے وابستگی اور مالکانہ بالادستی سے انکار کے جذبے نے سیاسی اداروں کی نگرانی کا کام کیا۔

سلطنت عثمانیہ کے تاریخی دستاویزات سے بخوبی واقف ترکی کے ایک مورخ کا کہنا ہےکہ' دولت عالیہ عثمانیہ دراصل حکومت نہیں ، بلکہ ایک ریاست تھی،جسکا نصب العین انصاف قائم کرنا اور حق کو فروغ دینا تھا۔عثمانیہ حکومت اپنے دور میں ملت کے طور پر جانی جاتی تھی۔جو غیر مسلموں کے حقوق کی بھی ایمانداری سے پاسداری کرتی تھی۔عثمانی دور میں انہیں ذاتی و مذہبی آزادی حاصل تھی۔

ترکی کے مورخین نے مغرب کے ان مورخین کی تنقید کی ہے جنہیں نہ تو ترکی زبان کا علم ہے اور نہ ہی تحقیق کے دوران جنھوں نے ماہرین زبان سے رابطہ کیا۔برعکس اسکے جمہوری بنیاد پر قائم سیکولر ریاستوں کےان مورخین نے نہ تو مذہبی آزادی اور نہ ہی کرد نسل کے جائز حقوق کو توجہ طلب سمجھا۔ ۱۹۲۳ میں جب سلطان و خلافت مخالف رجحان رکھنے والے افراد کے ہاتھوں میں باگڈور آئی تب ترکیوں کے لئے شریعت،انکی زبان اور انکے اپنے لباس ہی انکے لئے اجنبی ہو گئے۔ان اسباب کے پیش نظر کہہ سکتے ہیں کہ' حکومت کی نوعیت اور اسکے طور طریقوں سے شہریوں و عوام کے حقوق متاثر ہوتے ہیں۔

سیکولرزم کے آغاز سے ہی اسکے آثار نمایاں ہونے لگے تھے، جہاں انسان خود اپنی مرضی کا مالک ہوتا تھا۔الٰہی اصول وضابطے ذاتیات تک ہی محدود رہتے۔انگلینڈ، فرانس اور امریکہ کے سیاسی انقلاب نے حقوق انسانی اور انسانی وقار کی حفاظت کا نعرہ دیا جس نے آگے چلکر جمہوریت کو جلا بخشی۔سیاسی منظرنامہ کی تبدیلی کے بعد صنعتی انقلاب رونما ہوا۔دونوں کا مقصد ایک ایسی ریاست وایک ایسی حکومت کا قیام ہے جو سرمایہ داری کو فروغ دے سکے۔جہاں قانون اور حقوق کا تصور آزادی، مساوات اور انصاف پر مبنی ہو۔

اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ شہری کے حقوق اور قوانین کا تعین مغربی سیاق وسباق میں کیا جاتا ہے۔واضح ہو کہ مغرب نے ہمیشہ ہی معاشی حقوق وقومی وسائل پر حکومت کی اجارہ داری کو مسترد کیا ہے۔کمیونسٹ ریاستوں میں عموما ایسا ہی ہوتا تھا۔بعض ممالک میں یہ دستور اب بھی رائج ہے۔لبرل اور کمیونسٹ دونوں جب سیاسی اور معاشی حقوق کی بات کرتے ہیں تو انکی نظر سماجی وتہذیبی پس منظر کو سرے سے نظرانداز کردیتی ہے۔سماج میں مساوات اور سرحدی قید وبند سے آزاد ریاست کا خواب دیکھنے والے کمیونسٹوں کا سفر بالآخر پارٹی پر آکر ہی تھم جاتا ہے۔اسٹیٹ اور سماج انکے لئے ثانوی درجہ کی چیز ہوجاتی ہے۔روس کے بکھراؤ کے بعد عالمگیریت کے دعوے دار کھلے بازار، جمہوریت اور حقوق انسانی کی بات کرنے لگے۔اب حقوق کا مسئلہ کثیر الثقافتی، نسوانیت اور ماحولیاتی تناظر میں دیکھا جانے لگا۔

شہریت کا جدید تصور:

شہریت کی جامع مثال مشکل ہے، لیکن اسکی کردار سازی میں میانہ روی کا عنصر غالب ہے۔یہ عوامی فوائد، جذبے، سیاسی شمولیت، شخصی وذاتی حقوق اور نجی فائدے کی وکالت کرتا ہے۔اس طبقے نے جو عورتوں اور کام گاروں کی حمایت کرتا ہے، شہریت کی اس تعریف کی تنقید کی اس کے مطابق یہ خصوصیت کے حامل افراد کی ہی نمائندگی کرتا ہے۔سول سوسائٹی کا اصول وضع کرنے والے دانشوروں نے بھی اسکی نکتہ چینی کی اور تبدیلی کا مطالبہ کیا۔لیکن شہریت کی بنیاد پر صرف اسلامی نظریے اور اسلامی تعلیمات نے ہی سوال اٹھائے۔سیکولر اسٹیٹ کے نظریے کی بنیاد اس بات پر تھی کہ انسان خود اپنا مالک ہے۔انسان اسٹیٹ کو شہری کی تحفظ آزادی کے لئے ذریعہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔جمہوری آلات انسان کو قانونی دائرے کے اندر آزادی دیتے ہیں۔یہ قانون سبھی شہری پر لاگو ہوتے ہیں، لیکن اس سے ایک غیر فعال شہریت کا تصور ابھرتا ہے۔اسکا مطلب ہیکہ عوامی معاملات اور حکومتی بندوبست میں شامل ہوئے بغیر ہی ایک شخص ریاست کا شہری ہوسکتا ہے۔

شہریت کا جدید فلسفہ دراصل ایک غیر فعال نظریہ ہے۔اسمیں عام اختیارات شہری کی بنیادی تشویش کا باعث بن جاتی ہے۔شہریت کا غیر فعال نظریہ انسان کو تحفظ ودفاعی اختیارات کا طلبگار بنا دیتا ہے۔'ہوبس' جسمانی زندگی کے دفاع کی بات کرتا ہے۔'لوکے' جائداد کے حق کی بات کرتا ہے اور 'بینتھم' شخصی خوشی کے تعین کی۔انیسویں اور بیسویں صدی میں سیاسی

مساوات وشہری حقوق کے نعرہ میں شہریت کا نظریہ پروان چڑھا۔ جدید جمہوری ممالک نے برابری اور عالمگیریت کوفروغ دیا۔ اسکے تحت سیاسی برادری میں سبھی ممالک ایک جیسے وہم پلہ ہیں۔

اسکا مطلب یہ ہیکہ برابری کا یہ فلسفہ سیاسی برادری کے ممبر ممالک کے درمیان درجہ بند نابرابری کی مخالفت کرتا ہے، نیز انضمام کی یہ بنیاد شہریت کے دائرے کی توسیع کی بھی مظہر ہے۔ جومزید لوگوں کو اپنے ساتھ جوڑنے کی راہ ہموار کرتا ہے۔ سیاسی برادری میں برابری اور اسکی مکمل رکنیت شناخت، ریاست سے تعلق، قومی ثقافت وساجی وراثت میں حصہ داری کے تیقن کا مظہر ہوتا ہے۔ لیکن شہریت کی بنیاد ان درجہ بند نابرابری کے اثرات کونظرانداز کر دیتی ہے جو اکثریتی، فرقہ وارانہ، ذات، مذہب، نسل اور جنس پر منحصر سیاست کرتے ہیں۔

'ڈیوڈ لاکووڈ' دلیل دیتاہیکہ برابری وحقوق کا اصلی مزہ نابرابری کے دومحور سے منسلک ہے۔ قانون ونوکرشاہی کی موجودگی یا غیر موجودگی اوراخلاقی یا مادی وسائل پر قبضہ جوکہ عام طور پر رسمی طور پر ہی کام کرتے ہیں۔ قانونی حق اوراخلاقی و مادی محور کا مطلب ہیکہ شہری اور غیر شہری کے تعلق سے مجموعی ناانصافی کا خاتمہ ہو۔ دراصل حقوق انسانی نابرابری کی پیچیدگیوں کوادارہ جاتی شکل دینے میں مدد کرتا ہے۔ قانونی طور پر دعوی کیا جاتاہیکہ حقوق انسانی کے کارکن یہ مانتے ہیں کہ جہاں میٹرو یا کلی سیاسی کلچر ہوتا ہے، وہ نئے طرز کی رسمی اوراہم نابرابری کی صورت پیدا کرتی ہیں، یقیناً کچھ معاملوں میں دیکھا گیاہیکہ حقوق انسانی کی حفاظت میں انسان خودکوایسے حالات سے گھراپاتا ہے جہاں اسکے بنیادی حقوق کی مزید پامالی کا خطرہ ہوتا ہے۔

'کیٹ ناش' ریاست میں رہنے والے شہری اور غیر شہریوں پر بین الاقوامی حقوق انسانی کی قانونی حیثیت کے اثرات مرتب ہوتے ہیں، اسکی تفتیش کرتا ہے۔ دریافت کے لئے وہ ساجی طریقہ کار کا استعمال کرتا ہے۔ اسمیں یہ واضح ہوتا ہیکہ یورپ تک میں عالمی اخوت پر مبنی قانون بھی انصاف اور مساوات کے تقاضوں کو پورا کرنے میں ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ دراصل حقیقی معنوں میں کلی شہریت کا کردار اس درجہ گروپ کا پھیلاؤ ہے جو نئے طرز کی نابرابری کے زمرے میں آتی ہے۔ مثلاً اعلیٰ شہری، حاشیہ بردار شہری، برائے نام شہری، ذیلی اور غیر شہری۔ شہریت کے یہ اقسام نابرابری کی ہی تصویر ہے۔ حقیقی معنوں میں عالمی حقوق انسانی کے اس عہد میں عالمگیریت کا قانون ایسے ضوابط مرتب کرتا ہے جو انسان کے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔

ایسی ریاستیں جو جمہوری اور غیر جانبداری کے اصول پر کاربند ہیں، وہ منصفانہ رکنیت کی حواشی مروّجہ تعریف اور عارضی قانون کوبرابری کے حقوق اور ایک جیسا تحفظ فراہم کرتی ہیں۔ جمہوری اور جدید ریاستیں ساجی وثقافتی صفات کی اندیکھی کرتی ہیں۔ اسلئے وہ تمام شہریوں کو برابری کا درجہ دیتی ہے اورتمام رشتوں کے لئے ایک جیسا معیار اور قانون مرتب

کرتی ہے۔ امتیازی سلوک، علیحدگی اور اپنے دائرے میں حد سے زیادہ لوگوں کی شمولیت جمہوریت کے اس نقطہ نظر کو ناکام بناتی ہے۔ ان لوگوں کو جنھیں نوکری، ترقی، تعلیم، رہائش، سرکاری منصوبہ بندی اور دیگر فوائد میں سیاسی تحفظ حاصل ہوتا ہے، وہ حد سے زیادہ شمولیت کے برے اثرات سے محفوظ رہتے ہیں۔ جہاں پر سیاسی تحفظ اور تناسبی نمایندگی نہیں ہوتی ہے ان جگہوں پر یا تو کچھ مخصوص جماعتوں کا یا پھر مذہبی، نسلی یا ذات پات پر مبنی سیاست کرنے والی پارٹیوں کا غلبہ ہوتا ہے۔

ہندو اکثریت اقلیتوں پر اپنا زور چلاتے ہیں:

جہاں تک ہندوستان کا سوال ہے اسٹیٹ پاور (قومی وصوبائی حکومت) پر ہندو اکثریتی فرقے کا غلبہ ہے۔ یہ طاقتیں اقلیتی طبقے بالخصوص مسلمانوں پر، جو ملک کی مجموعی آبادی کا سرکاری اعداد و شمار کے مطابق چودہ اور غیر سرکاری ذرائع کے مطابق اٹھارہ فیصد ہے، اپنا زور چلاتے ہیں۔ اسکے اثرات واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ سماجی اخراج، امتیازی سلوک، محرومی، منظّم تشدد (مسلمانوں کے خلاف) نسل کشی، وقار کا مجروح ہونا، تحفظ و انصاف کی عدم دستیابی اور دہشت گردی کا الزام (باوجود اسکے کہ دہشت گردی کے کچھ معاملوں میں آر ایس ایس کارکنان کی شمولیت ثابت ہو چکی ہے) ان تمام معاملوں میں وفاقی اور صوبائی حکومتیں باضابطہ طور پر یا تو مسلمانوں کے خلاف کاروائی کرتی ہیں، یا پھر براہ راست یا بالواسطہ مسلم مخالف طاقتوں کی حمایت کرتی ہیں۔ ایسے معاملوں میں جہاں مسلم مخالف دہشت گرد انسانیت کے خلاف جب کوئی کاروائی کرتے ہیں تو بارہا یہ دیکھا گیا ہیکہ مسلمانوں کے تحفظ و حفاظت کے سلسلے میں حکومتیں محض تماشائی بنی رہتی ہیں۔

اسطرح شہریت کے حقوق جو انفرادی صلاحیت کی بات کرتے ہیں موروثی طور پر سماجی وثقافتی درجہ اور سیاسی و تعلیمی حالت سے منسلک ہوتے ہیں۔ شہریت کا آزاد جمہوری نظریہ سیاسی برادری کی مکمل و مساعی رکنیت کی وکالت تو کرتا ہے، لیکن اسے یقینی بنانے کی سعی نہیں کرتا۔ اقلیتی فرقے اور مین اسٹریم سے خارج طبقے کے مسائل حل کرنے میں قانون نافذ کرنے والی ایجنسیاں، سیاسی جماعتیں، شہری سماج اور بین الاقوامی برادری سبھی بری طرح ناکام ثابت ہوئے ہیں۔ یہی وجہ ہیکہ تمام متعلقہ شعبوں کے مبصرین و مشاہدین اس نقطہ نظر کی تنقید کرتے ہیں۔ جہاں تک شہریت سے متعلقہ قانون کا سوال ہے اسکے متن کی سیاسی و علاقائی وجوہات اور قانونی بنیاد پر وضاحت اور تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ گذشتہ چھ دہائیوں میں حکومت کو مزید طاقتور بنانے کے لئے اس قسم کے قوانین سرعت سے وضع کیے گئے ہیں۔ حکومتیں یہ طاقت اپنے شہریوں، یا پھر ان لوگوں کے خلاف استعمال کرتی ہیں جو متعلقہ حکومت کا حصہ بننا چاہتے ہیں۔

علمی پیرامیٹر اور قانون شہریت کا معیار:

جہاں تک لفظ شہریت کا تعلق ہے وہ انگریزی لفظ سیٹیزن کا اردو ترجمہ ہے۔ اسکا اختراع لاٹن زبان کے لفظ سیوکس سے ہوا ہے، جسکے لغوی معنی (شہر سے متعلق) ہوتا ہے۔ قدیم یونانی عہد اور سلاطین رومن کے عہد میں شہریت کا تصور

شہری کی عوامی وسیاسی معاملات میں شمولیت سے تعبیر کی جاتی تھی۔حکومت کا برابری اور منصفانہ رویہ اصولی طور پر شہری اور اسٹیٹ کے درمیان ایک ایسا رشتہ استوار کرتا ہے جو سیاسی ترقی اور آزاد ریاست کے قیام کا ضامن ہوتا ہے۔شہریت عوام کے ان حقوق کا نام ہے جن کے ذریعہ وہ خود کو ریاست سے جڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔اس سے اسمیں برابری وکلی رکنیت کا احساس پیدا ہوتا ہے۔دوسرے لفظوں میں ایک انسان جو شہری کے زمرے میں آتا ہے وہ خود بخود سیاسی برادری کا حصہ بن جاتا ہے۔اسطرح شہریت کے نظریہ کو ہم شہری کے سیاسی برادری میں انضمام سے سمجھ سکتے ہیں۔ایسا لگتا ہیکہ برابری اور اختلاط کا جذبہ حکومت کے غیر تفریقی رویہ اور ذمہ داری کے احساس سے معمور ہے۔آگے چلکر یہی رویہ شہریت کا قانونی جواز بنتا ہے۔

دنیا ریاستوں میں منقسم ہے۔جو اقوام متحدہ کے ضوابط کے مطابق اپنے قومی قوانین ملکی ضرورتوں ومقصدوں کی حصولیابی کے لئے وضع کرتی ہیں۔ہر ممالک کے اپنے قوانین اور شہریت کے اپنے اصول ہوتے ہیں۔شہریت عوام اور ریاست کے قانونی رشتوں کا نام ہے جہاں اسے اپنی تمام زندگی بسر کرنی ہوتی ہے۔اسٹیٹ کی علاقائی اور جمہوری شناخت نوع انسانی کو مختلف قومیت میں تقسیم کرتی ہے۔انسان کی قومیت اور شہریت عموماریاستی نظام کی عکاسی ہے۔نظام کی صفات اسکی شخصیت کا اہم حصہ ہوتی ہے۔عام طور پر شہریت ریاست کے وضع کردہ معیار کی تکمیل کا نام ہے۔یہ معیار بالعموم جمہوری ہوتے ہیں' اسرائیل کو اس سے مستثنیٰ رکھا جا سکتا ہے' جہاں اسرائیلی کو مذہب کی بنیاد پر شہریت عطا کی جاتی ہے۔مختلف ریاستوں کے علاقائی اصول وتاریخی تجربات بنی نوع انسان کو مخصوص قومیت کے زاویہ سے دیکھتے ہیں۔۱۹۴۵اور دیوار برلن کے مسمار ہونے کے بعد مختلف ممالک میں شہریت سے متعلق قوانین میں تبدیلی آئی ہے۔تقسیم اور اشتراک کے بعد ریاستی سرحدوں میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔معاشی اصلاح وترقی، بین الاقوامی ہجرت اور سرحدی دراندازی نے جہاں شہریت کے لئے مسائل پیدا کئے ہیں وہیں اسے ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچایا ہے۔اسی لئے مختلف ممالک میں آج شہریت کا عنوان انکے پالیسی ایجنڈے میں شامل ہے۔

دوہری شہریت:

کئی ممالک میں دوہری شہریت پسندیدہ نہیں ہے، کیونکہ دوہری شہریت رکھنے والے شہری بعض اوقات الٰہی صورتحال سے دوچار ہوجاتے ہیں کہ ان کی ایک ملک سے متعلق ذمہ داریاں دوسرے ملک کے قوانین سے متصادم ہوتی ہیں، اس کی ایک مثال فوجی صف آرائی کے دوران اس کی ذمہ داریوں کی ہے، ایسی صورت میں اگر ایسا شخص ملک سے باہر ہے تو اسے سفارتی یا قونصل کی جانب سے حفاظتی اقدام میں رکاوٹ پڑ سکتی ہے، اکثر ممالک دوہری شہریت کو تسلیم نہیں کرتے ،یعنی ان کی حکومتیں کسی شخص کے اس اختیار یا مراعات یا مصون (محفوظ) ہونے کو تسلیم نہیں کرتیں جو کسی دوسرے ملک کا خصوصی اختیار ہو۔

دوہری شہریت فطری انداز میں بھی حاصل کی جاسکتی ہے کوئی ملک ایسے افراد کو جو کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کر لیتے ہیں اپنی اصل شہریت برقرار رکھنے کی اجازت دے سکتا ہے وہ ملک جہاں ایسے لوگ دوہری شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ اس پر اصرار نہ کرے کہ یہ شخص اپنی سابقہ شہریت سے دستبردار ہوجائے، بعض ممالک دیگر ممالک سے ایک معاہدہ کے ذریعہ اپنے شہریوں کے درمیان دوہری شہریت کا معاملہ کر لیتے ہیں اور یہی کاروائی غیر حاضری میں بھی ہوسکتی ہے، ایک شخص جو کسی دوسرے ملک میں پیدا ہو وہ اپنے اصل ملک کی منظوری کے بغیر بھی اسے اصل ملک کی شہریت برقرار رکھنے والا سمجھا جاسکتا ہے اگر اصل ملک نے یہ اعلامیہ جاری نہ کیا ہو کہ دوہری شہریت حاصل کر لی گئی ہے، یہ ممکن ہے کہ دونوں ممالک سرکاری طور پر اس کا اندراج کریں شہریت کے عالمی قوانین - آئی ایس یکم مارچ ۲۰۰۱ء اہل کاروں کے نظم کا امریکی دفتر۔تفتیشی سروس۔

دونوں میں کوئی بھی شخص شہریت سے محروم ہوسکتا ہے، رضا کارانہ یا غیر رضا کارانہ طور پر شہریت سے محرومی، اکثر ممالک میں ایسے قوانین موجود ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ کوئی شخص کس طرح شہریت ترک کر سکتا ہے، اکثر معاملات میں ایک شخص سفارت خانہ یا قونصل خانہ کے ذریعہ کاغذی کاروائی کر کے ایسا کر سکتا ہے، بعض ممالک کے قوانین کے تحت شہریت ترک کرنے والے شخص کو اپنے ملک میں واپس آ کر یہ کاروائی پوری کرنی ہوگی، بعض ممالک میں شہریوں کو رضا کارانہ طور پر شہریت ترک کرنا بہت دشوار عمل ہوتا ہے، غیر رضا کارانہ طور پر شہریت ترک کرنے کے زمرے کے تحت کوئی ملک اپنے کسی شہری کو شہریت سے محروم کر سکتا ہے، اکثر ممالک میں کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کر لینے والے شخص کی شہریت کو ختم کر دیا جاتا ہے، ''رضا کارانہ'' اصطلاح کی تعبیر وتشریح ہر جگہ ایک جیسی نہیں ہے، بعض ممالک میں جب تک کوئی شہری واضح طور پر اس کا اعلان نہ کرے کہ اس نے کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کر لی ہے اسے رضا کارانہ نہیں سمجھا جاتا، مثال کے طور پر آسٹریا میں اگر کوئی شخص آسٹریائی یونیورسٹی میں پروفیسر کے منصب پر فائز ہوجائے تو وہ خود بخود آسٹریا کا شہری بن جائے گا، بعض ممالک میں اسے غیر رضا کارانہ شہریت قرار دیا جاتا ہے اور قانون کے تحت شہریت باطل نہیں ہوتی بعض ممالک کا کہنا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کر لے اور اسے ترک کرنے کی کوشش نہ کرے تو وہ شہریت سے محروم ہوجائے گا، فطری شہریت اس حالت میں باطل ہوجاتی ہے، جبکہ وہ شہری کسی معینہ مدت تک کسی غیر ملک میں رہا ہو۔

فریب یا غلط بیانی سے دوسرے ملک کی شہریت حاصل کی ہو۔

اس نے پہلی شہریت ترک نہ کی ہو۔

خواہ کسی ملک کا قانون یہ کہے کہ بعض حالات میں شہریت خود بخود ختم ہوجاتی ہے، لیکن جب تک سرکاری اہلکاروں

یا سفارت خانہ کو مطلع نہ کیا جائے تب تک سفارت خانہ اس شخص کا نام اپنے شہریوں کی فہرست میں برقرار رکھ سکتا ہے (ایضا)۔

دوہری شہریت کی بابت پیچیدہ قوانین:

بعض ممالک عموما دوہری یا تکثیری شہریت کی اجازت نہیں دیتے یا اسے ممنوع قرار دیتے ہیں، لیکن اس بارے میں ان کے قوانین پیچیدہ ہیں، بعض ملکوں میں دوہری شہریت کی اجازت ہے، لیکن دوہری شہریت کا حق محدود ہے، مثلاً آسٹریلیا اور مصر میں دوہری شہریت کے حامل افراد پارلیمنٹ کا الیکشن نہیں لڑ سکتے، ریاستہائے متحدہ امریکہ میں شہریت حاصل کرنے والے افراد صدر یا نائب صدر کا الیکشن نہیں لڑ سکتے، اس کے لئے متعلقہ شخص کو امریکہ میں پیدا ہونے والا فطری شہری ہونا لازمی ہے، تاہم وہ کسی دیگر عہدے پر فائز ہو سکتے ہیں، جرمنی اور آسٹریا میں عموما دوہری شہریت کی اجازت نہیں دی جاتی سوائے ایسے لوگوں کے جنہوں نے پیدائش کے وقت دوہری شہریت حاسل کرلی ہو، جرمنی اور آسٹریائی شہری دوہری شہریت اختیار کرتے وقت اپنی پہلی شہریت برقرار رکھنے کے لئے درخواست دے سکتے ہیں، مثلا وہ آسٹریائی اور امریکی شہریت کے لئے ایسا کرسکتے ہیں دونوں ممالک آسٹریائی شہری آرنلڈ کو اپنا شہری سمجھیں گے، ورنہ عام حالات میں اگر آسٹریائی شہری کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے، تو وہ آسٹریائی شہریت سے خود بخود محروم ہو جائے گا، اگست ۲۰۰۷ء سے جرمنی میں دوہری شہریت کو منظور کیا گیا ہے، بشرطیکہ متعلقہ شخص یورپی یونین کے کسی ملک یا سوئزرلینڈ کی شہریت اختیار کرلے۔

دوہری شہریت کی اجازت والے ممالک:

اگر کوئی شخص پیدائشی طور پر اسپین کا شہری ہے تو یہ بات اسے لاطینی امریکہ کے کسی ملک کی شہریت سے محروم کردینے کی کافی وجہ نہیں ہوگی، وہ انڈورا، فلپین، ایکواڈور، گویانا، یا پرتگال کا شہری ہوسکتا ہے، اسپین ارجنٹینا، بولیویا، چلی، کولمبیا، کوسٹاریکا، ڈومینکن ری پبلک، ایکواڈور، ہونڈورس، گواٹی مالا، نکاراگوا، پیراگوئے اور پیرو سے دوہری شہریت کے معاہدے کرر کھے ہیں۔

اگر اسپین کے شہری ان ملکوں کی شہریت اختیار کرلیتے ہیں تو وہ بھی اسپین کی شہریت سے محروم نہیں ہوتے، دیگر ممالک کے تعلق سے اگر کوئی اسپینی شہری دیگر ملک کی شہریت اختیار کرلے تو تین سال بعد اس کی اسپینی شہریت ختم ہو جائے گی، بشرطیکہ ایسے شخص سرکاری طور پر اس کا اظہار نہ کریں کہ وہ اپنی اسپینی شہریت برقرار رکھنا چاہتے ہیں (شہریت سے متعلق اسپینی قوانین) پورٹوریکو کے شہریوں کی درخواست پر اسپین نے انہیں اسپینی شہریت اختیار کرنے کی اجازت دے دی، ۲۰۱۱ء تک جنوبی کوریا میں بھی ۲۱ سال کی عمر کے بعد دوہری شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی، لیکن اب محدود تعداد میں لوگوں کو اس کی اجازت دے دی گئی ہے، جرمنی اور آسٹریائی اسی طرح جنوبی افریقہ میں بھی اگر کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی شہریت

اختیار کرتا ہے تو اسے جنوبی افریقہ میں اپنی شہریت برقرار رکھنے کے لئے درخواست دینی ہوگی، ورنہ وہ شہریت سے محروم ہوجائے گا۔

ترکی قانون کے تحت اگر کوئی ترک کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو اسے اس بارے میں متعلقہ ترکی حکام کو اطلاع دینی چاہئے یعنی قریبی ترکی سفارت خانے یا قونصل کو مطلع کرنا چاہے اسی کے ساتھ اسے فطری شہری ہونے کا اصل سرٹیفکٹ کو پیش کرنا چاہئے، نیز اگر وہ شادی شدہ ہے تو اس کا سرٹیفکٹ فوجی خدمت (اگر مرد ہے) اور چار فوٹو بھی ان تمام کاغذات کے ساتھ پیش کرتے جائیں، دوہری شہریت کے افراد کو ترکی میں آنے یا وہاں سے جانے کے لئے ترکی پاسپورٹ پیش کرنا ضروری نہیں، پاکستان میں دوہری شہریت کی اجازت ہے، لیکن یہ صرف ۱۶ رممالک کے لئے ہے آسٹریلیا، بیلجیم، کناڈا، مصر، فرانس، آئس لینڈ، آئرلینڈ، اٹلی، اردن، نیدر لینڈ، نیوزی لینڈ، سوئڈن، سوازی لینڈ، شام، برطانیہ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔

یورپی یونین اور ای ایف ٹی اے کے ممالک میں دوہری شہریت کے بارے میں متفرق قوانین ہیں، کیونکہ ہر ملک اپنے قوانین بنا سکتا ہے، صرف ایک قانون یہ ہے کہ یورپی یونین کا کوئی شہری یوروپی یونین کے کسی ملک میں غیر متعینہ مدت کے لئے قیام کرسکتا ہے اور چار ایف ٹی اے ممالک میں ان ملکوں کے شہری یوروپی یونین کے ممالک میں غیر معینہ مدت کے لئے قیام اور کام کرسکتے ہیں، فی الوقت یوروپی یونین کے ۱۴ ممالک دوہری شہریت کو محدود کرتے ہیں۔ یا ممنوع قرار دیتے ہیں، آسٹریا، بلغاریہ، کروشیا، زیک ری پبلک، ڈنمارک، ایسٹونیا، جرمنی، آئرلینڈ، لاتیویا (یکم اکتوبر ۲۰۱۳ء سے یورپی یونین ناٹو اور ای ایف ٹی اے کے متعدد ممالک کے ساتھ لاتیویا کی دوہری شہریت کی اجازت دے دی جائے گی)، آئس لینڈ، لائکٹن سین، ناروے، سوئٹزرلینڈ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، وینی زولا، برازیل، لیتھوانیا، نیدرلینڈ، اسپین، سلووک رو پبلک، سلووانیا، پولینڈ اور جنوبی قبرص۔

پولینڈ کے قانون میں دوہری شہریت کی بابت کچھ نہیں کہا گیا ہے، لیکن دوہری شہریت کو برداشت کیا جاتا ہے، کیونکہ ایسا کرنے پر کوئی جرمانہ نہیں ہے، تاہم اگر کوئی شخص اپنی دوہری شہریت کا مظاہرہ کرنے کے لئے شناختی دستاویزات دکھائے، پولیس یا فوجی حکام کی اجازت کے بغیر غیر ملکی فوج میں ملازمت کرے تو وہ تعزیر کا مستوجب ہوگا، دوہری شہریت رکھنے والے افراد کو پولینڈ کے شہری کی حیثیت سے اپنے فرائض کی انجام دہی سے مستثنی قرار نہیں دیا جاتا (جنوبی) قبرص اور شمالی قبرص کا معاملہ دلچسپ ہے، جنوبی قبرص میں دوہری شہریت کی اجازت ہے۔

شمالی قبرص کو عالمی برادری کے بہت سے ممالک تسلیم نہیں کرتے، (یوروپی یونین کے ممالک قبرص کو ناقابل تقسیم سمجھتے ہیں اور شمالی قبرص کو ایک ''مخصوص خطہ'' مانتے ہیں، آزاد مملکت کے طور پر اسے تسلیم نہیں کرتے) ترکی ہی وہ اہم اور

واحد ملک ہے جو شمالی قبرص کو تسلیم کرتا ہے، اکثر ممالک میں شمالی قبرص کے پاسپورٹ کو سفر کے لئے جائز دستاویز نہیں مانا جاتا (ماسوائے آسٹریلیا، شام، برطانیہ، فرانس، متحدہ امریکہ اور ترکی) ترکی میں شمالی قبرص کے باشندوں کو انہی شرائط پر قیام اور کام کی اجازت ہے، جیسا کہ ترکی کے دیگر شہریوں کو ہے، جنوبی قبرص کی حکومت شمالی قبرص کو غیر قانونی قرار دیتی ہے (شمالی قبرص کی مملکت شمالی قبرص کی ترک جمہوریہ کا وجود ۱۹۸۳ میں عمل میں آیا جبکہ جزیرہ قبرص کی تقسیم ۱۹۷۴ء میں ہوئی تھی)۔

یکم مئی ۲۰۰۴ء کو جنوبی قبرص نے یوروپی یونین میں شرکت کرلی، یہ تقسیم شدہ یوروپی یونین کا حصہ سمجھا جاتا ہے، لیکن شمالی قبرص کا علاقہ جس پر جنوبی قبرص کا کنٹرول نہیں ہے وہاں یوروپی یونین کے قوانین معطل سمجھے جاتے ہیں، یہ معاہدہ الحاق ۲۰۰۳ء کے پروٹوکول ۱۰ کے ماتحت کیا گیا ہے، یعنی یہ علاقے مثال کے طور پر یوروپی یونین کے مالیاتی اور کسٹم ضابطوں سے باہر ہیں، تاہم معطل رکھے جانے کے باوجود شمالی قبرص کے باشندوں کے حقوق جو یوروپی یونین کے شہری ہونے کے ناطے انہیں حاصل ہیں وہ اس سے متاثر نہیں ہوتے وہ یوروپی یونین کے ایک ممبر ملک کے شہری ہیں، حالانکہ قبرص ترکی جمہوریہ پر حکومت کا کنٹرول نہیں ہے۔

یوروپی یونین کے ممالک شمالی قبرص کی جمہوریہ کے پاسپورٹ اور ویزا کو تسلیم نہیں کرتے یونان اور یونانی جنوبی قبرص کے لوگ یوروپی یونین کی آسانیاں شمالی قبرص تک نہیں پہنچنے دیتے۔

یوروپی یونین کے ممبر ممالک مقدونیہ، مونٹی نیگرو سربیا اور ترکی صرف مخصوص کیسوں میں ہی دوہری شہریت کی اجازت دیتے ہیں، مانتی ہنگرو میں دوہری شہریت ممنوع ہے، لیکن اخلاف کے شہریوں کو اس سے محروم نہیں رکھا جاسکتا، لہذا عملا وہ یہ شہریت حاصل کرلیتے ہیں، سربیا میں دوہری شہریت کی اجازت ہے، ترکی میں بھی دوہری شہریت کی اجازت ہے، لیکن جو شخص دوہری شہریت حاصل کرنا چاہتا ہے اسے سب سے پہلے ترکی حکام کو اس بارے میں مطلع کرنا چاہئے، سابق ترکی شہریوں کے لئے نیلا کارڈ) ماوی کارٹ) بنایا گیا تھا اس کے حامل شخص کو ترکی میں رہنے، کام کرنے، زمین جائداد رکھنے اور وراثت میں حصہ حاصل کرنے کا حق ہے، لیکن اسے ووٹ دینے کا حق نہیں ہے، بوسنیا ہرزوگوینا اور کوسوو میں بھی دوہری شہریت کی اجازت ہے، لیکن تمام ممالک چار بہت چھوٹی ریاستوں سے گھرے ہوئے ہیں انڈورا، مناکو سان مارینو، اور ویٹی کن سٹی، صرف ویٹی کن سٹی میں ہی محدود مدت کے لئے دوہری شہریت دی جاتی ہے، جبکہ اندورا، ساکو اور سان مارینو میں دوہری شہریت ممنوع ہے، پوپ کے ہوم گارڈوں کو اجازت ہے کہ وہ سوئیزرلینڈ اور ویٹی کن سٹی کی دوہری شہریت اختیار کرسکتے ہیں جبکہ وہ ملازمت سے سبکدوش ہوں۔

ہندوستان میں دوہری شہریت کا قانون:

ہندوستان کے دستور میں دوہری شہریت یا دوہری قومیت کی اجازت نہیں ہے، ماسوائے نابالغوں کے جو غیر ارادی

طور پر اسے حاصل کرتے ہیں، ہندوستانی حکام کا کہنا ہے کہ کوئی شخص جو ہندوستانی پاسپورٹ کا حامل ہے وہ کسی دوسرے ملک کا پاسپورٹ حاصل نہیں کرسکتا،خواہ وہ نابالغ ہو جسے کوئی دوسرا ملک اپنا شہری قرار دیتا ہو، حالانکہ وہ بیرونی سفر کے لئے یہ دستاویز استعمال کرسکتا ہے، (جیسے کوئی بچہ جو امریکہ میں پیدا ہوا ہو اور اس کے والدین ہندوستانی ہوں) ہندوستانی عدالتوں نے اس بارے میں حکام کو امتیازی اختیار دیا ہے، ۲۰۰۵ء میں ہندوستان نے شہریت قانون ۱۹۵۵ میں ترمیم کی جس کے تحت سمندر پار رہنے والے ہندوستانیوں کو اس طرح کی شہریت دی گئی ہے تو دوہری شہریت سے کچھ ہی کم ہے اور ایک طرح سے مستقل سکونت کے انداز کی ہے، اسے سمندر پار شہریوں کو دوہری شہریت کی ممانعت کے قانون سے مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔ وہ ووٹ نہیں دے سکتے کسی منصب کے امیدوار نہیں ہوسکتے، فوج میں ملازمت نہیں کرسکتے اور سرکاری عہدہ پر بھی فائز نہیں ہوسکتے، علاوہ ازیں پاکستان اور بنگلہ دیش کے شہریوں کو ان سمندر پار رہنے والے ہندوستانیون جیسی شہریت نہیں دی جاسکتی کناڈا، امریکہ، یوروپی یونین کے ممالک اور سوئزرلینڈ، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ میں غیر ملکیوں کو مستقل سکونت کی اجازت ہے یعنی وہ ان ممالک میں غیر معینہ مدت تک قیام اور کام کرسکتے ہیں، لیکن انہیں بعض مراعات حاصل نہیں ہوسکتیں، یعنی وہ نہ ووٹ دے سکتے ہیں، نہ انہیں ووٹ دیا جاسکتا ہے، نہ انہیں دوسرے ملک میں مامور کیا جاسکتا ہے، نہ ان پر مملکت کے دیگر شہریوں جیسی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، ان ملکوں میں مستقل سکونت رکھنے والے افراد کئی سال کی سکونت کے بعد شہریت حاصل کرنے کی درخواست دے سکتے ہیں، کچھ ممالک نے سفر اور ملازمت حاصل کرنے سے متعلق معاہدے بھی کررکھے ہیں (وہ غیر سرکاری اور غیر فوجی اداروں میں کام کرسکتے ہیں) یوروپی یونین کے کسی ملک کا شہری کسی دیگر یوروپی ملک اور چاروں ای ایف ٹی اے ممالک میں غیر معینہ مدت تک رہ سکتا ہے، اسی طرح (ای ایف ٹی اے کے چاروں ممالک کے باشندے بھی یوروپی یونین کے ممالک میں سکونت اختیار کرسکتے ہیں) ماورائے تسمانیہ معاہدہ جو آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے درمیان نافذ ہے اس کے تحت ان دونوں ملکوں کے باشندے ان دونوں ملکوں میں قیام اور کام کرسکتے ہیں، جی سی سی ممالک (بحرین، قطر، کویت، عمان، سعودیہ) اور عرب امارات کے شہری ان ممالک میں سکونت اختیار کرسکتے ہیں، لیکن دوہری شہریت کی اجازت نہیں ہے، ہندوستانی باشندوں کو نیپال اور بھوٹان جانے کے لئے ویزا کی ضرورت نہیں، لیکن ان تینوں ممالک میں دوہری شہریت ممنوع ہے۔

ریاست ہائے متحدہ امریکہ جس سولی لاطینی اصطلاح حق شہریت کو تسلیم کرتا ہے اسے عام طور پر شہریت کا پیدائشی حق کے طور پر جانا جاتا ہے، لاطینی امریکہ کے اکثر ممالک جس سولی کی اصطلاح کو تسلیم کرتے ہیں ان میں کینڈا، میکسکو (جو پیدائش کی بنیاد پر قومیت کو تسلیم کرتے ہیں)، نیز وسطی اور افریقی ممالک اور اصطلاح کو مشکل سے ہی قبول کیا جاتا ہے، اسے جس سنگیس رس سے مخلوط کردیا جاتا ہے، یوروپ ایشیا اور اکثر افریقی ممالک میں جس سنگوریس (لاطینی اصطلاح خون کا حق)

کو مانا جاتا ہے یہی شہریت کا معیار ہے کسی شخص کی شہریت سے متعلق پالیسیوں میں وسیع اختلاف ہے، حالیہ دہائیوں میں متعدد ممالک نے ان قوانین میں ترمیم کی ہے، ۱۹۸۶ء میں آسٹریلیا نے ایک ایسا نظام وضع کیا جس کے تحت صرف اس خود بخود شہریت حاصل ہوگی جس کے ماں باپ میں سے کوئی ایک آسٹریلیائی ہو، یا قانونی طور پر وہاں کی مستقل سکونت رکھتا ہو، بہر حال آسٹریلین بچے جو خود بخود اس ملک کے شہری نہیں ہیں وہ دس گیارہ سال کی عمر کو پہنچ کر وہاں کے شہری بن سکتے ہیں بشرطیکہ وہ زیادہ تر آسٹریلیا میں ہی قیام پذیر رہے ہوں، پہلے فرانس میں جس سولی شہریت کے اصول کو تسلیم کیا جاتا تھا، لیکن ۱۹۹۳ء میں قانون میں ترمیم کی گئی جس کے مطابق غیر ملکی افراد کے جو بچے فرانس میں پیدا ہوئے انہیں دس سال کی عمر کے بعد یا بلوغت کی عمر کو پہنچنے پر فرانس کی شہریت کے لئے درخواست دینی ہوگی۔

جرمنی میں جس سنگوریس پر سختی سے عمل کرتے ہوئے ۲۰۰۰ء تک صرف انہی بچوں کو خود بخود شہریت حاصل ہوئی تھی جن کے والدین جرمن شہری ہوں اس کے بعد اس قانون میں ترمیم کر دی گئی اب ان بچوں کو جو غیر جرمن والدین کے ہاں پیدا ہوئے ہوں اسی وقت شہریت دی جائے گی جب والدین میں سے کوئی ایک جرمنی کی مستقل قانونی سکونت کم از کم تین سال کی ہو یا وہ سال سے جرمنی میں قیام پذیر ہو، ایسے بچوں کو ۲۳ سال کی عمر تک پہنچنے تک جرمن شہریت کے لئے درخواست دینا ضروری ہے، برطانیہ نے جس سولی سسٹم کو ۱۹۸۱ء میں ختم کر دیا اب صرف ان ہی بچوں کو خود بخود شہریت حاصل ہوگی جن کے والدین میں سے کوئی ایک برطانیہ کا شہری ہو یا وہاں قانونی طور پر مستقل سکونت حاصل کر چکا ہو، جب ۲۰۰۵ء میں پیرس میں فسادات ہوئے تو جو دو افریقن نسل کے نوعمر کی حادثاتی طور پر بجلی کا کرنٹ لگنے سے موت کی وجہ سے ہوئے ان فسادات میں فرانس کی سابق افریقی کالونیوں کے نوجوان شامل تھے تو اس وقت یہ کہا گیا کہ شہریت کا دو مرحلہ ایک ایسا نظم بنایا جائے جس کے تحت فرانس میں پیدا ہونے والے دیگر جوانوں کو پیدائشی شہریت کا حق دیا جائے (ان جوانوں کو نہیں) جس کے تحت معاشرتی علاحدگی کا عنصر بھی ہو۔

کسی بھی ملک کا شہری نہ ہونا:

ایک دوسرا موضوع کسی ملک کا شہری نہ ہونا بھی ہے، بہت سے بچے جو غیر ممالک میں پیدا ہوتے ہیں انہیں اس ملک کا شہری سمجھا جاتا ہے جہاں کے ان کے والدین شہری ہیں ایسا جس سنگوریس کے تحت ہوتا ہے (جس پر امریکہ میں عمل ہوتا ہے) لیکن معاملہ ایسا نہیں ہوتا، ادارہ پالیسی برائے مہاجرین کی رپورٹ ۲۰۰۶ء میں بتایا گیا ہے کہ دنیا بھر میں کسی بھی ملک سے تعلق نہ رکھنے والے افراد (اسٹیٹ لیس) کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے، اقوام متحدہ نے اسٹیٹ لیس افراد کی تعریف یوں کی ہے کہ وہ لوگ جو کسی بھی ملک کے شہری نہیں ہیں جس سنگوریس کی سخت پالیسی کے سبب اسٹیٹ لیس افراد کی تعداد بڑھ سکتی ہے، دیگر کیسوں میں ایک بچہ جو ایک قومیت سے محروم باپ کے وہاں ایک ملک میں قومیت کی حامل ماں کے بطن سے

پیدا ہوتا ہے، صنفی تحدید کی بنیاد پر قومیت سے محروم رکھا جاسکتا ہے، کسی بھی ملک سے بے تعلق ہونے کی کیفیت (اسٹیٹ لیس نیس) اس حال میں بھی پیش آسکتی ہے جب طویل عرصہ سے سکونت پذیر نسلی آبادی کو شہریت سے محروم کردیا جائے یا نسلی بنیاد پر ان کی شہریت منسوخ کردی جائے۔

جس سولی کو ماننے والے دیگر ممالک میں جو شہریت سے متعلق اپنی پالیسیوں میں سخت گیری اختیار کرنا چاہتے ہیں، دنیا کے ۱۹۴ ممالک میں سے صرف ۳۰ ایسے ہیں جو غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکیوں کے بچوں کو خود بخود شہریت کا حق عطا کرتے ہیں، ترقی یافتہ ممالک میں کناڈا اور امریکہ ایسے ممالک ہیں جو غیر قانونی طور پر مقیم افراد کے بچوں کو خود بخود شہریت عطا کرتے ہیں، (دیکھئے یکم جنوری ۲۰۱۴ کو شہریت کے پیدائشی حق تک رسائی) کچھ ممالک شہریت کے پیدائشی حق کو تسلیم کرتے ہیں کچھ نہیں کرتے، مثال کے طور پر بارباڈوس کو اپنی وسعت سے بھی زیادہ قانونی اور غیر قانونی مہاجرین کے مسئلہ سے الجھنا پڑ رہا ہے اور وہاں غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکیوں کے بچوں کو پیدائشی حق شہریت نہ دینے کی بات سوچا جارہا ہے، پچھلے سال وہاں غیر ملکی جو غیر قانونی طور پر مقیم تھے انہیں رعایت دینے کا فیصلہ کیا گیا، ان غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکیوں کو چھ ماہ کی مدت میں اپنے قیام کو قانونی طور پر تسلیم کرانا تھا، جو شخص یکم دسمبر ۲۰۰۹ء کے بعد غیر قانونی طور پر مقیم پایا جائے گا اسے ملک سے خارج کردیا جائے گا، اس رعایت کے ساتھ متعدد شرائط بھی تھیں، سوئی غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکی جس کے تین یا زیادہ متعلقین ہوں وہ خود بخود شہریت کے مستحق نہیں ہوسکتے، لہذا غیر قانونی طور پر مقیم غیر ملکیوں کے بچوں (جو وہاں پیدا ہوئے) کا مسئلہ سیاسی بحث کا خصوصی موضوع بن گیا، ملک کے محکمہ برائے مہاجر امور نے متعدد تبدیلیوں کا مشورہ دیا ہے، ان میں سے ایک تبدیلی پیدائشی حق شہریت کو ختم کرنا بھی ہے، وہ ممالک جنہوں نے نہ فاقی حق پیدائش برائے شہریت کو ۱۹۸۰ سے ختم کردیا ان میں برطانیہ ہندوستان، مالٹا، آئرلینڈ، نیوزی لینڈ اور حال ہی میں ڈومی نکن ری پبلک شامل ہیں جہاں غیر قانونی طور سے مہاجرت ان ملکوں میں اس قدم کا اہم سبب ہے۔

اس بات کی ضرورت ہے کہ پیدائش کی بنیاد پر شہریت کے حصول پر ایک تقابلی جائزہ پیش کیا جائے، شہریت کا یہ حق، خواہ وراثت میں ہو یا اس ملک میں پیدائش کی بنیاد پر، تاکہ متعلقہ اصولوں پر معلوماتی بحث کو سمجھا جاسکے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی سے یوروپ میں پیدائشی حق شہریت کے بارے میں دو وسیع رجحانات ابھرے ہیں، اکثر ممالک نے موروثی حق شہریت کے بارے میں صنفی مساوات کے اصول کو تسلیم کرلیا ہے، وسطی اور مشرقی یورپ میں یہ رجحان جنگ کے بعد سویت یونین کے قانون سے متاثر ہو کر ایسا ہوا، جبکہ مغربی یوروپ میں، چند دہائیوں کے بعد یہ عمل مکمل ہوا، ۱۹۹۰ء کی دہائی کے بعد مساوات کا یہ عمل ایسے بچوں پر خصوصی طور پر مرکوز ہوگیا، جنہیں گود لیا گیا، یا جو ملک سے باہر پیدا ہوئے موخر الذکر زمرے سے متعلق جس سنگوریس (خون کا رشتہ) کو محدود کرنے پر کچھ مخالف تحریکیں بھی چلی ہیں۔ جس سولی اور جس سنگوریس کے بارے میں ان

ملکوں میں ایک واضح اتفاق پایا جاتا ہے۔

خبس سولی اور جس سنگوریس پر عامل ہیں (بیلجئم، جرمی اور یونان) انہوں نے دوسری اور تیسری نسل کے مہاجرین کے لئے جس سولی کو شروع کردیا ہے یا اس میں توسیع کردی ہے، جبکہ جس سولی ماننے والے قدیم ملک (برطانیہ اور آئرلینڈ) نے ان دفعات کو محدود کردیا ہے، اتفاق کے اس رجحان کے باوجود تکثیری شہریت کے حوالے سے اس پر تنقید بھی ہوتی ہے، نہ صرف بالٹک ممالک میں جہاں قومی اقلیتوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، بلکہ مغربی یوروپ (آسٹریا، ڈنمارک، ناروے) میں بھی ایسا ہوتا ہے، ۱۹۸۰ء سے اکثر یوروپی ریاستوں نے یکطرفہ نظم کو جس کے تحت بیوی شوہر کی شہریت کی تابع ہوتی ہے، تبدیل کردیا ہے، اس جگہ دوطرفہ نظم جاری کیا ہے جس کے تحت عورت اپنے شوہر سے الگ بھی شہریت حاصل کرسکتی ہے اور شادی، شہریت حاصل کرنے یا اس سے محروم ہونے کا خود بخود ذریعہ نہیں بنے گی) دکھئے: (جیرالڈ رینے ڈی گروٹ، قومیت سے محرومی، ایک تفصیلی تنقید، ذی کارٹن اور ہیل بروز کے ایڈیشن دوہری قومیت کے حامل افراد کے فرائض اور حقوق، ارتقا اور امکانات ولی ہیگ، کلوور لاء انٹرنیشنل ۲۰۳ء، ۲۶۸، ۲۷)، بہر حال اکثر یوروپی ممالک نے ۶۰-1950 کی دہائی میں اپنے شہریت سے متعلق دفعات میں مطابقت پیدا کرلئے ہیں، پرتگال (۱۹۸۱) یونان (۱۹۸۴)، بلجیئم (۱۹۸۳) لکسمبرگ (۱۹۸۶)، ۱۹۸۰ تک ان قوانین کو منسوخ کیا جن کے تحت اگر کوئی عورت کسی غیر ملکی سے شادی کرے تو وہ شہریت سے محروم ہوجائے گی، بچوں کو شہریت دیئے جانے سے متعلق صنفی امتیاز (مرد وعورت) قانون کو بھی ۱۹۸۰ء کے وسط سے پہلے مکمل نہیں کیا جاسکا۔

شہریت سے متعلق قوانین کے مسائل:

سوئزرلینڈ میں امتیازی قانون نافذ تھا جس کی دفعات کو صرف ۲۰۰۶ء میں ختم کیا گیا، وہ یہ تھا کہ جو عورت شادی کے ذریعہ سوئزرلینڈ کی شہریت حاصل کرلیتی ہے اس کے بچے کو خود بخود شہریت حاصل نہیں ہوجائے گی، آسٹریا کے قانون کے آرٹیکل ۷(۳) میں کہا گیا ہے کہ صرف اسی بچے کو شہریت عطا کی جائے گی جس کی ماں آسٹریائی شہری ہو، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ باپ کے بارے میں یہ قانون امتیاز کرتا ہے، یوروپی ممالک میں جس سنگوریس کا جو قانون نافذ ہے وہ اس سلسلہ میں اچھا ہے، جس سنگوریس پر لکھی گئی کتاب میں ماں اور باپ کے حوالے سے خون کے رشتہ کی بنیاد پر شہریت کے قوانین پر گفتگو کی گئی ہے، جو لوگ غیر ملک میں پیدا ہوئے ان کے بارے میں مختلف یوروپی ممالک میں شہریت کے مخصوص تقاضوں کی بابت قومی قانون میں درج ذیل دفعات ہیں۔

آسٹرین دستور کی دفعہ آرٹیکل ۷(۱)، ۷(۳) جسے ۱۹۸۳ میں پیش کیا گیا اس میں کہا گیا ہے کہ اگر ماں باپ بلجیئم میں پیدا نہیں ہوئے ہیں تو بچے کی پیدائش کے ۵ سال بعد اس کا رجسٹریشن کرانا ہوگا، بشرطیکہ وہ بچہ کسی بھی ملک کا باشندہ

(سٹیٹ لیس) نہ ہو، بلغاریہ میں ۱۹۴۸ء میں نافذ قانون کے آرٹیکل ۸ کے تحت بغیر کسی خصوصی ضرورت کے جس سنگوریس پر گفتگو کی گئی ہے۔

کروشیا جو پہلے یوگوسلاویہ کا ایک حصہ تھا وہاں ۱۹۴۵ کے آرٹیکل ۴ اور ۵ کو برقرار رکھا گیا ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ اگر والدین میں سے کوئی ایک اس ملک کا شہری ہے تو ۱۸ سال سے قبل یا کروشیا میں سکونت اختیار کرنے کے بعد رجسٹریشن ضروری ہے (جنوبی) قبرص میں آرٹیکل ۱۰۹(۱) اور ۱۰۹(۲) جسے ۱۹۹۹ء میں نافذ کیا گیا، اس میں کہا گیا ہے کہ اگر والدین میں سے کوئی ایک اس ملک کا باشندہ ہے تو وہ قبرص سے باہر رہتا ہے تو بچہ کی پیدائش کے دو سال کے اندر جسٹریشن کرانا ہوگا اگر اس کے بعد رجسٹریشن کرایا جائے تو تاخیر کے خصوصی حالات بیان کرنے ہوں گے، زیک ری پبلک کے آرٹیکل ۳(اے) جو پہلے ہی زیوسلواکیہ کے دستور ۱۹۴۹ کا حصہ ہے اس میں ان متعلقہ امور کا تذکرہ کیا گیا ہے، ڈنمارک کے آرٹیکل ۱(۱) جسے ۱۹۷۸ء میں نافذ کیا گیا بچہ (لڑکا رلڑکی) کی شہریت کے حصول کی بابت کہا گیا ہے کہ اگر صرف باپ اس ملک کا باشندہ ہے اسٹونیا جو پہلے اشترا کی روس (سوویت یونین) کا حصہ تھا، اس کے آرٹیکل ۵(۱)، ۱۹۴۵، ۱۹۱۸ر(سوویت یونین) اس میں بہت کچھ پہلا ہی موجود ہے، یہی حال فرانس کے آرٹیکل ۱۸ کا ہے جسے ۱۹۴۵ء میں نافذ کیا گیا، یونان کا آرٹیکل (۱) ۱۹۸۴، ہنگری کا ۳(۱) ۱۹۵۷ء، اٹلی کا آرٹیکل ۱(۱)(اے) ۱۹۸۳، لتھوانیا کا آرٹیکل ۸(۱) اور (۹) ۱۹۴۵، ۱۹۱۸ (سوویت یونین)، مالا بویا کا آرٹیکل ۱۱(۱)(اے)، لگسمبرگ کا ۱۹۸۷، نیدرلینڈ کا آرٹیکل ۳(اے)، ۱۹۸۵ء ناروے کا آرٹیکل ۴(۱) ۱۹۷۹ فرانس کا آرٹیکل (۱)، (۱) آرٹیکل ۱۹ اور ۲۶(۱)(۲) جو ۱۹۸۴ء میں نافذ کئے گئے اس میں غیر ملک میں پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ اسی حالت میں شہری مانا جائے گا اگر اس کا باپ یہاں کا باشندہ ہے، جرمنی میں ۱۹۷۵ء کے آرٹیکل ۴(اے) ۴(۴) کہا گیا ہے کہ اگر والدین میں سے کوئی ایک جرمنی میں پیدا نہیں ہوا ہے تو بچہ کی پیدائش کے ایک سال کے اندر اس کا رجسٹریشن کرانا ہوگا، بشرطیکہ بچہ اسٹیٹ لیس نہ ہو، یہ ضابطہ ۲۰۰۰ء سے نافذ ہے۔

پولینڈ کے دستور کے آرٹیکل ۱(۱) جسے ۱۹۵۱ء نافذ کیا گیا اس میں غیر ملک میں پیدا ہونے والے اشخاص کے بارے میں خصوصی مطلوبات کا ذکر کیا گیا ہے، ایسے بچے جن کے والدین میں سے کوئی ایک پولینڈ کا باشندہ ہے اس نے اس ملک کی شہریت حاصل کر لی ہے بشرطیکہ والدین بچے کی پیدائش کے تین ماہ کے بعد مطلع کریں کہ بچہ دیگر والدین کی شہریت حاصل کرے گا سلووانیا کے آرٹیکل ۴(۱) ۴(۲) ۱۹۴۵ (یوگوسلاویہ) میں کہا گیا ہے کہ اگر والدین میں سے کوئی ایک اس ملک کا باشندہ ہے یا ساکن ہے تو ۱۸ سال کی عمر سے پہلے یا ۳۰ کی عمر تک (۲۰۰۲-۲۳ سے قبل) رجسٹریشن کرانا ہوگا،

سوئیڈن میں ۱۹۷۹ میں نافذ کئے گئے آرٹیکل (۱) میں کہا گیا ہے کہ اگر باپ سوئڈن کا باشندہ ہے اور بچہ شادی سے پیدا ہوا ہے تو ڈیکلریشن دینا ہوگا، سوئزرلینڈ میں آرٹیکل ۱ (۱) (اے) (۱) (بی) جو ۱۹۸۵/۲۰۰۶ء میں نافذ ہوا ان لوگوں کی بابت بنا ہے جو غیر ملک میں پیدا ہوئے، ۲۰۰۶ء تک کسی بچے کو خود بخود سوئزرلینڈ کی شہریت حاصل نہیں ہوسکتی تھی جس کی ماں نے شادی کے ذریعہ سوئس شہریت حاصل کی ہو، برطانیہ کے قومی قانون میں ۱۹۸۳ میں نافذ کیا گیا اس کے آرٹیکل میں کہا گیا ہے کہ اگر ماں باپ میں سے کوئی برطانیہ میں پیدا نہیں ہوا (یا) بچہ بصورت دیگر سٹیٹ لیس ہے تو بچہ کی پیدائش کے ایک سال کے اندر رجسٹریشن کرانا ہوگا اگر بعض شرائط پوری کی جائیں بشرطیکہ والدین میں سے کوئی ایک سرکاری ملازمت میں غیر ملک میں ہو۔

شہریت کے حصول سے متعلق تمام ممالک اصولی طور پر مانتے ہیں کہ اگر بچے کی ماں بچہ کی پیدائش کے وقت اس ملک کی شہریت کی حامل ہے تو اسے شہریت ملے گی، صرف بلجیئم، قبرص، جرمنی، آئرلینڈ، مالٹا، پرتگال اور برطانیہ غیر ملک میں پیدا ہوئے بچے کے سلسلہ میں اس ضابطہ سے استثنیٰ دیتے ہیں، کروشیا، لاتیویا اور سلووانیہ صرف اسی حالت میں استثنیٰ دیتے ہیں جبکہ والدین میں سے کوئی ایک ان کے ملک کا شہری ہو اور بچہ باہر پیدا ہو (ذیل میں دیکھئے) اصولی طور پر ماں وہ عورت ہے جو کسی بچے کو جنم دیتی ہے (مثلاً دیکھئے نیدرلینڈ (۱) ا-سی برطانیہ ۵۰ (۹) اور ۱۹۶۲ کے کنونشن بچوں کی مادری ولدیت کی بابت کمیشن انٹرنیشل (سی آئی ای سی) کے قیام کو فروغ دیتا ہے، لہٰذا اصولی طور پر کسی عورت کو کسی بچہ سے متعلق جو شادی سے پیدا ہوا ہو، اس کے اور اس بچہ کے درمیان خاندانی رشتہ کو تسلیم کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن بعض قوانین میں اب بھی شادی سے پیدا ہونے والے بچے کے درمیان رشتہ کو تسلیم کئے جانے کی دفعات موجود ہیں اور یہ بھی کہ مادریت کو عدالت کے ذریعہ ثابت کیا جائے، مارٹن بی اور جیرالڈ رینے ڈی گروٹ، شہریت کا پیدائشی حق یوروپ میں رجحانات اور ضوابط ای یو ڈی او شہریت کے مشاہدہ کو تقابلی رپورٹ ای یو ڈی او شہریت کی مشاہداتی رپورٹ شومن سنٹر برائے اعلی مطالعات ایڈنبرا یونیورسٹی لاء اسکول کے تعاون سے آر ایس سی اے ایس-ای یو ڈی او (۲۰۱۰/۸) (مارکس وی بلجیم ای سی ایچ آر ۱۳ جون ۱۹۷۹ ای سی ایچ آر سیریز اے جلد ۳۱)۔

ہر ایک خصوصی کیس میں مثلاً محرمات سے جنسی تعلق کے ارتکاب سے پیدا ہونے والے بچے، بعض قوانین میں کہا گیا ہے کہ بچے اور ماں کے خاندانی رشتہ ثابت کرنے کو ممنوع قرار دیا جائے، تاہم ایسے کیس میں بھی بچے کی پیدائش کی رجسٹریشن کی جائے گی، اس سلسلہ میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے یوروپ اٹلی کا قانون شہریت ۲ (۳) یوروپ میں منفرد ہے، اس میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ عدالتی ثبوت کو تسلیم کرنے کے ضوابط اس شخص پر بھی لاگو ہوں گے جس کی مادری یا پدری ولایت کا اظہار نہیں کیا جاسکتا، بشرطیکہ ان کے اخراجات کا حق قانونی طور پر تسلیم کرلیا گیا ہو، اگر کسی بچہ کی پیدائش کے معاملہ

میں کوئی تیسرا شخص بھی ملوث ہے تو اس میں خصوصی وراثتی شہریت کے مسائل بھی سامنے آسکتے ہیں، خصوصا کوئی شخص ان بچوں کے قتل کے بڑھتی تعداد کے بارے میں سوچ سکتا ہے جو مصنوعی ماں کے بطن سے پیدا ہوتے ہوں، ایسے کیسوں میں یہ امکانی تنازعہ پیدا ہوتا ہے کہ بچے کی اصلی فطری ماں کون ہے اس کا تعین نہ ہونے کی صورت میں یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ بچہ سٹیٹ لیس (کسی ملک کا شہری نہیں) قرار دے دیا جائے اگر اس مصنوعی ماں کی شہریت بچہ کی شہریت سے مناسبت نہیں رکھتی اور اس ماں کی حیثیت اس کی شہریت سے نسبت نہیں رکھتی خواہ اس وجہ سے کہ اس عورت نے اس بچہ کو جنم نہ دیا ہو (دیکھئے مارٹن پی ونک اور جیرالڈ رینے ڈی گروٹ، پیدائشی حق شہریت یوروپ میں رجحان اور قوانین ص ۸)۔

بعض کیسوں میں ایسے بچے کو شہریت حاصل ہوجاتی ہے جبکہ یہ اس شوہر یا شخص کی جانب سے اس بچے کی ولایت تسلیم کئے جانے کی صورت میں ہوسکتا ہے، لیکن ہر کیس میں ایسا نہیں ہوتا مختلف ممالک میں مختلف طریقے ہیں، لہذا یوروپین کونسل نے اپنی سفارش ۱۳/ ۲۰۱۲ء ضابطہ ۱۲ کے تحت سفارش کی کہ ریاست کو خون کے رشتہ کی بنیاد پر بچہ کو شہریت دینے کے اصول پر عمل کریں اگر بچہ کسی طبی تکنیک کے ذریعہ پیدا ہوا ہو یا ایسے بچے کا خاندانی رشتہ قانونی طور پر ثابت یا تسلیم کیا گیا ہو (ایضا)۔

باپ کے معاملہ میں تمام ممالک اصولی طور پر اس کی شہریت کو مانتے ہیں بشرطیکہ اس بچہ کی پیدائش کے وقت وہ شخص اس ملک کا شہری تھا، جس سنگوریس کے تحت یہ فیصلہ کر کے کہ بچہ کسی حد تک شہریت کا مستحق ہے، بلاشبہ یہ تعین کرنا ہوگا کہ کوئی شخص کسی نہ کسی باپ کا بیٹا ہے، یعنی متعلقہ ضوابط کے تحت یہ طے کیا جائے گا، تمام ممالک میں یہ ضابطہ ہے کہ جو بچہ شادی سے پیدا ہوا ہے وہ اپنی ماں کے شوہر (باپ) کی شہریت کا حامل ہوتا ہے۔

مثلاً آسٹریا ۷(۱) (اے) جنوبی قبرص ۴(۱) ۱۰اے) اور ۲ (اے) ڈنمارک ۱ (۱) فن لینڈ ۹ (۲) آئرلینڈ ۱ (۱) سوئڈن ۱ (۳)، سوئزرلینڈ ۱ (اے) ایس ڈبلو، علاوہ ازیں شہریت باپ سے حاصل ہوتی ہے، خواہ بچہ کی پیدائش کے وقت اس (باپ) کی موت ہوبھی گئی ہو، آسٹریا ۷ (۱) (بی) بلجیم ۸ (۲)، استوینا ۵ (۱) ۲ سوئیڈن ۱ (۳) فن لینڈ ۹ (۳)، بندرلینڈ ۳ (۱) ناروے ۴ (۲) سوئڈن ۱ (۴) اور (۵) لکسمبرگ ۱ (۱) (ایضا)، بلجیم اور جرمنی نے پیدائش کے وقت جس سولی شہریت کا ضابطہ لاگو ہوتا ہے جو عموما ۱۸ سال کی عمر سے ہوتا ہے علاوہ ازیں شہریت حاصل کرنے کے طریقوں میں اکثر بڑا واضح اختلاف ہوتا ہے، ایکس پیچ (جرمن میں) ڈیکلریشن کے ذریعہ (بلجیم میں) یا قومیت کے ایک سہل طریقہ سے (جیسا کہ آسٹریا میں) یوڈی ایچ آر کے دیباچہ میں کہا گیا ہے کہ بنی نوع انسان کے وقار اور ناقابل بغیر مساوات عدل اور امن عالم ہی آزادی کی بنیاد ہیں اس میں کہا گیا ہے کہ ان اصولوں کی نفی اور ناقدری ہی بربریت کے ارتکاب کا سبب بنتی ہے جس سے انسانی ضمیر تڑپ اٹھتا ہے، ایک ایسی دنیا کا وجود جہاں انسانوں کو اظہار رائے کی آزادی اپنے عقائد پر عمل کرنے کا

حق خوف اور احتیاج سے چھٹکارا عام انسان کی سب سے بلند آرزوئیں ہیں، میں تسلیم کرتا ہوں کہ اقوام متحدہ کے چارٹر میں عوام نے بنیادانسانی حقوق کی بابت اپنے یقین واثق کا اظہار کیا ہے، اسی کے ساتھ انسان کے وقار اور وزن، مردوں، عورتوں کے مساوی حقوق پر بھی ان کا یقین ہے، اور وہ سماجی ترقی کو فروغ دینے اور وسیع تر آزادی کے ساتھ بہتر معیار زندگی کے حصول کا بھی عہد کرتے ہیں۔

یوڈی ایچ آر میں کہا گیا ہے کہ ہر فرد اور سماج کی ہر تنظیم اس اعلامیہ کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہوئے ان حقوق اور آزادیوں کو فروغ دینے اور لوگوں کو بنانے رسکھانے کی کوشش کرے، اور ترقی پسند ذرائع سے قومی اور بین الاقوامی پیمانے پر ان کو تسلیم کئے جانے اور عمل کرنے کے جذبہ کو عام کرنے کے لے کوشش کرے، اپنے عوام کے درمیان اور ان علاقوں میں جو ان کے دائرۂ عمل میں آتے ہیں، اقوام متحدہ کے ممبر ممالک ان اقدار کو فروغ دینے کے لئے موثر اقدام کریں، آرٹیکل ا کے تحت کہا گیا ہے کہ تمام انسان پیدائشی طور پر وقار اور انسانی حقوق کے حامل ہوتے ہیں، آرٹیکل ۲ میں کہا گیا ہے کہ اس ڈیکلریشن میں جن حقوق اور آزادیوں کی بات کہی گئی ہے تمام انسان ان کے مساوی طور پر مستحق ہیں، اس میں کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں ہے، رنگ ونسل، مذہب، زبان، جنس پیدائش قوم سماجی مرتبہ سیاست یا فکر ررائے کوئی بھی امتیاز نا قابل قبول ہے۔

آرٹیکل ۳ کے تحت کہا گیا ہے کہ ہر فرد کو زندگی، آزادی، شخصی تحفظ کا حق حاصل ہے، آرٹیکل میں یہ کہا گیا ہے کہ کسی شخص کو ظلم وتعذیب کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا، قانون کی نگاہ میں سب برابر ہیں، اور قانون کے تحت تحفظ کے معاملے میں کسی کے ساتھ کوئی امتیاز نہیں کیا جائے گا، ہر ایک کو اس کا حق ہے کہ اگر اس ڈیکلیریشن کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان کے ساتھ امتیاز کیا گیا ہو یا اشتعال انگیزی تو وہ اس سے تحفظ حاصل کریں، آرٹیکل ۹ میں بلا جواز گرفتاری قید یا ملک بدر کئے جانے کو ممنوع قرار دیا گیا ہے، آرٹیکل ۱۳ میں کہا گیا ہے کہ ہر شخص کو ملک کی حدود میں نقل وحرکت سکونت کا حق حاصل ہے۔

ہر شخص کو اپنا یا دوسرا کوئی ملک چھوڑنے اور پھر واپس آجانے کا حق ہے، آرٹیکل ۱۵ کہتا ہے کہ ہر شخص کو قومیت کا حق ہے اور کسی شخص کو بلا جواز اس کی قومیت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ اسے اپنی قومیت تبدیل کرنے کے حق سے محروم کیا جائے گا (ایضا)۔

ہیکل العاد اسرائیل میں ایسوسی ایشن برائے سول حقوق (اے سی آر آئی) کے ایگزیکیٹیو ڈائریکٹر ہیں، اے سی آر آئی اسرائیل میں رہنے والے عربوں کو شہریت کے حقوق دیئے جانے کے دعویداروں میں سے ایک ہے۔

انہوں نے اسرائیلی ہائیکورٹ کے ایک حالیہ فیصلہ کا جائزہ لیا جو نسلی بنیاد پر دیا گیا ہے، اسرائیلی ہائی کورٹ نے اسرائیل کے شہریت قانون کے خلاف عرضداشت کو مسترد کردیا اس قانون کے تحت اسرائیل شہریت کے فلسطینی جوڑوں کو اسرائیل میں کوئی حیثیت دینے کی ممانعت کرتا ہے، اسے ایک بہت اہم فیصلہ بتایا گیا ہے، اسرائیلی سپریم کورٹ کے جج

جسٹس آشیر گرونس نے مماثلت پر قائم رہتے ہوئے صاف گوئی اور اختصار کے درمیان اپنی رائے کو کافی مختصر رکھا، انہوں نے اسرائیلی شہریت قانون کے خلاف عرضداشت کو رد کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے ایک حالیہ فیصلہ میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ واضح اقتباس نقل کیا کہ قومی خودکشی کے لئے انسانی حقوق کوئی نسخہ نہیں ہیں۔

یہ اقتباس عدالت کے ایک سابق صدر جسٹس اہارون بارک کے ایک سابقہ فیصلے سے نقل کیا گیا ہے، جیسا کہ گرونس نے وضاحت کی جسٹس بارک کے یہ الفاظ امریکی سپریم کورٹ کے ۱۹۴۹ء کے فیصلے پر مبنی ہیں تو ٹرمی نیلو بنام شکاگو شہر کے فیصلہ میں لکھے گئے جس میں جسٹس رابرٹ جیکسن نے اس فیصلہ میں جو اقلیت ججوں کی اکثریت کی رائے سے مختلف فیصلہ تھا اپنے ساتھی ججوں کو متنبہ کیا جن کی اکثریت تھی۔

انہوں نے لکھا کہ اگر ججوں نے تھوڑی عملی سوجھ بوجھ کے ذریعہ اپنی منطق کو ترک نہ کیا تو یہ خطرہ ہے کہ حقوق سے متعلق دستوری بل خودکشی کا عمل بن جائے گا، گرونس نے جسٹس جیکسن کے ۶۳ سال قبل کے فیصلے کے برخلاف اکثریتی رائے سے اپنا فیصلہ دیا جسٹس مدیر جو کہ اس اکثریتی فیصلہ کے شریک جج تھے وہ تو اس حد تک گئے کہ انہوں نے ایٹمی توانائی اور ایٹمی فضلہ آب وہوا کی تبدیلی اور اسی قسم کے دیگر خطرات کا حوالہ دیا، ہر ایک جج نے اس خوفناک منظر نامے کو پیش کرنے کے لئے اسی حوالے سے تقویت حاصل کی (ہیکل العباد شہریت کا قانون انسانی حقوق کے معاملے میں امتیاز کو ترجیح دیتا ہے، ۲۴/جنوری ۲۰۱۲ء ایچ آر ٹی ی ۹۷۲/حبک کوم شہریت کے قانون نے ہمیں قانونی فیصلہ کے خلاف حقوق انسانی کی حفاظت پر مجبور کیا/ ۷۲۳ ۳۳ (ایضا)۔

ان ججوں نے متنازعہ عبوری قانون کے پس پشت تحفظ کے مسئلہ کی قانونی حیثیت پر اچھی طرح غور کرتے ہوئے اصل معاملہ کو نظر انداز کر دیا، تحفظ کو بھی نہیں صرف آبادی کے مسئلہ کو سامنے رکھا، جیسا کہ ایک جج لیوی نے کہا کہ حقوق کے اتلاف کی غیر حساسیت اس نتیجہ کی روشنی میں اور بھی نمایاں ہوجاتی ہے کہ اس قانون میں سیکورٹی (تحفظ) کے علاوہ دیگر مقاصد بھی شامل ہیں۔ اور عبوری نوعیت کے بارے میں کیا کہا جائے، شہریت اور اسرائیل میں داخل ہونے کا قانون عبوری نوعیت کا قطعی نہیں ہے، بلکہ اس کے حوصلہ مندانہ عنوان کے باوجود سالوں تک ہمارا تحفظ اس کا مقصد ہے، اس مسئلہ کے قانونی پہلو کی جانچ کرنا ہمیں دلدل میں پھنسا دے گا، اس پر غور کرنے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوگا (ایضا)۔

جج لیوی کے الفاظ میں ''ایک حقیقت جس کا نمایاں نتیجہ ان بعض اسرائیلی باشندوں کے حقوق کا دائرہ تنگ کرنا ہے جو کہ عرب ہیں، اس کے لئے اضافی قانون سازی کی راہ نکلے گی جس کی اس جمہوری نظریہ میں کوئی گنجائش نہیں ہے، یہ ایک ایسی اہم قانون سازی ہوگی جس کی اسرائیل کی جمہوری تاریخ میں کوئی مثال نہیں، اس کے اسرائیلی جمہوریت کے امکانات پر ایسے اثرات مرتب ہوں گے جو موجودہ چیلنجوں کا مقابلہ کر سکیں، وہ غلطی پر ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ جب یہ قانون بنے گا تو

اکثریت اس کے نقاصانات کو برداشت کر سکے گی، حالانکہ اس میں وہ بنیاد ہی خطرے میں پڑ جائے گی جس کے ہم موید اور حامی ہیں اور شانہ بشانہ کھڑے ہیں (ایضا)۔

اب جبکہ قانون شہریت ایک ایسا داغ بن گیا ہے جو کبھی زائل نہیں ہوگا اسے ہمارے سب سے زیادہ سینئر قانون دانوں نے دستوری منظوری عطا کی ہے۔

بعض اسرائیلیوں کے لئے شہریت کا دائرہ تنگ کرنا، کیونکہ وہ عرب میں کوئی نئی بات نہیں جب سے اس ریاست کا قیام عمل میں آیا ہے تب ہی سے ایسا ہو رہا ہے، یہ وہ حقائق ہیں جنہیں سب جانتے ہیں اور ان کی تفصیل بھی واضح ہے، جج لیوی مزید لکھتا ہے کہ محض اس بات پر اہلیت سے امتیاز کرنا کہ وہ کون لوگ ہیں یہ ہمارے بنیادی تصور کے خلاف ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جج کے یہ خوبصورت الفاظ بدنما حقائق کے سامنے اپنی کشش کھو بیٹھے ہیں، بہر کیف خواہ لکھنے والا اپنے الفاظ میں جس قدر بھی عقیدہ اور یقین رکھنے کی کوشش کرے، لیکن الفاظ حقائق کے سامنے اپنا حسن کھونے لگتے ہیں (ایضا)، اس فیصلے کا اہم اثر کسی اور جگہ ہی ہے اس کا وسیع سایہ اسرائیل کی جمہوریت کے امکانات ہیں نہیں جس کے چیلنجوں کا وہ اب تک سامنا کرتا آیا ہے، کیونکہ ایسا نہیں ہے، لیکن سایوں کے باوجود جو کہ سمٹتے جا رہے ہیں، کیونکہ پر کشش الفاظ مایوس کن حقائق کے درمیان چیلنج تنگ ہوتی جا رہی ہے، حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ میں کہا گیا ہے کہ قانون کی عمل داری سے انسانی حقوق کا تحفظ کیا جانا چاہئے، جبکہ ہائی کورٹ نسلی امتیاز پر مبنی اپنے فیصلہ سے انسانی حقوق کے اتلاف کی علانیہ منظوری دی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ لازمی کیا ہے، وہ یہ ہے کہ انسانی حقوق کو قانون کی عملداری کے ذریعہ نقصان پہنچائے جانے سے بچایا جائے اور ان کا تحفظ کیا جائے (ایضا)۔

ہندوستان پر ایک نظر:

ہندوستان کی آبادی دو طبقات میں تقسیم ہے، ملک کے شہری اور غیر ملکی اول الذکر کو تمام سیاسی اور شہریت سے متعلق حقوق حاصل ہیں موخر الذکر کو ان میں سے تمام حقوق حاصل نہیں ہیں ملک کے شہری ایک سیاسی طبقہ ہیں جن کے ذریعہ ریاست/قوم/مملکت کا وجود عمل میں آتا ہے، دستور ہند (۱۹۵۰) کے تحت ہندوستان کے شہریوں کو مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہیں، ان میں سے بعض بنیادی حقوق صرف ہندوستانی شہریوں کو ہی اصل ہیں جن کے تحت وہ ایسے عہدہ پر فائز ہوتے ہیں جیسے صدر جمہوریہ ہند، نائب صدر جمہوریہ ہند، سپریم کورٹ کے جج، ہائی کورٹ کے جج، اٹارنی جنرل، کسی صوبی یا وفاقی یونٹ کے گورنر، ایڈوکیٹ جنرل بن سکتے ہیں، انہیں الیکشن میں ووٹ دینے اور پارلیمنٹ یا ریاستی اسمبلی کا ممبر بننے کا بھی حق حاصل ہے، دستور ہند میں غیر ملکی کے دو زمرے بتائے گئے ہیں:

دوست ملک کے غیر ملکی اور دشمن ملک کے غیر ملکی، موخر الذکر زمرہ کے شہریوں کو بعض رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے

انہیں آرٹیکل ۲۲ کی کلاز (۱) اور (۲) جو گرفتاری اور حراست کے بارے میں ہیں) کے تحت تحفظ حاصل نہیں ہے، دشمن ملک کے یہ غیر ملکی وہ ہو سکتے ہیں جن کا ملک ہندوستان سے برسر پیکار ہے یا وہ ہندوستانی شہری جو رضا کارانہ طور پر ایسے ملک میں رہتا ہے یا اس سے کاروبار کرتا ہے۔

دستور ہند میں ہندوستانی شہریت کے بارے میں واضح طور پر مبسوط قانون نہیں ہے، یہ معاملہ پارلیمنٹ پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ اس بارے میں قانون اور متعلقہ ضوابط بنائے، ہندوستان میں شہریت یا قانون قومیت ایک عمومی طور پر رائج معیار پر ملتی ہے جس سنگوریس (خون کا رشتہ) (دستور ہند کے حصہ دوم آرٹیکل ۵ تا ۱۱) کسی شخص کے ہندوستانی شہریت کا حامل ہونے سے متعلق ہیں، دستور میں صرف اس زمرہ کے ہندوستانیوں کی بات کہی گئی ہے جو دستور ہند کے نفاذ کے وقت اس ملک کے شہری سمجھے جائیں گے (ایم پی جین دستوری قانون نئی دہلی ودھوا اینڈ کمپنی ناگپور ۲۰۰۷ء ص ۸۰-۹۲ ڈی ڈی باسو ہندوستانی دستور کا پیش لفظ گورگاؤں لیکس فیکس بٹر ورتھ ودھوا اگست ۲۰۱۲ء ص ۸۷-۴۷، اس سی کشیپ، ہمارا دستور نئی دہلی نیشنل بک ٹرسٹ انڈیا ۲۰۱۱ء ص ۹۳-۸۵)۔

آرٹیکل ۱۵ تا ۸ کے تحت ہر اس شخص کو شہریت کا حق عطا کیا ہے جو دستور ہند کے نفاذ کے وقت مندرجہ معیار پر پورا اترتا ہو۔

جو ہندوستان میں پیدا ہوا اور ہندوسان میں سکونت رکھتا ہو۔

یہاں سکونت پذیر، لیکن یہاں پیدا نہیں ہوا، مگر اس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔

یہاں سکونت پذیر یہاں پیدا نہیں ہوا مگر پانچ سال کے عرصہ سے زائد وہ یہاں قیام پذیر ہے۔

ہندوستان میں مقیم، لیکن یکم مارچ ۱۹۴۷ کے بعد پاکستان چلا گیا، پھر رہائشی پرمٹ حاصل کر کے واپس آ گیا۔

پاکستان کا ساکن، مگر یکم جولائی ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کو ہجرت کی، یا جو اس تاریخ کے بعد آیا ۶ ماہ سے زیادہ مقیم رہا، پھر مقررہ طریقہ کار کے مطابق رجسٹریشن کرایا۔

ہندوستان سے باہر مقیم، مگر خود وہ یا اس کے والدین یا اجداد میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوا۔

دستور کے نفاذ کے وقت سکونت، پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والے اور غیر ممالک میں مقیم ہندوستانیوں کے لئے بھی شہریت کی گنجائش رکھی گئی ہے، دستور کے آرٹیکل کے تحت کسی شخص کا مستقل قیام سکونت ہے، کوئی شخص سکونت کے بغیر ہو سکتا ہے اور نہ کسی شخص کے پاس ایک سے زیادہ عملی سکونت ہو سکتی ہے، اپنی سکونت کا انتخاب کرنے کے لئے قومی سرحدی حدود کسی شخص کے لئے رکاوٹ نہیں بن سکتیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مرد/عورت کسی ایک ملک میں قیام پذیر ہے، لیکن اس کی قومیت کسی دوسرے ملک کی ہے، دستور کے آرٹیکل ۶ میں دستور کے نفاذ سے قبل پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کو شہریت کا حق دیا گیا ہے، ایک شخص جو ۲۹/جولائی ۱۹۴۸ء سے قبل پاکستان سے ہجرت کر کے ہندوستان آ گیا

اسے ہندوستانی شہری سمجھا جائے گا، بشرطیکہ اس کے والدین یا اس کے اجداد میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوا ہو، جیسا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں کہا گیا ہے اور اس تاریخ سے وہ سکونت پذیر ہے اور ہجرت کی تاریخ کو بھی وہ مقیم تھا، ۱۹/جولائی ۱۹۴۸ کے بعد ہجرت کرنے والے اشخاص کو حکومت ہند کے کسی اہل کار کے ذریعہ بطور ہندوستانی شہری اپنا رجسٹریشن کرانا چاہئے۔

لیکن رجسٹریشن کرانے والے شخص کو رجسٹریشن کی درخواست پیش کرنے کی تاریخ سے کم از کم ۶ ماہ پہلے سے ہندوستان میں سکونت پذیر ہونا چاہئے۔

دستور کے آرٹیکل ۷ کے تحت ان اشخاص کے لئے خصوصی گنجائش رکھی گئی ہے جو یکم مارچ ۱۹۴۷ کو پاکستان ہجرت کر گئے تھے، مگر بعد کو واپس آ گئے، ایسے لوگ ہندوستان کے شہری ہو سکتے ہیں بشرطیکہ وہ ان شرائط کو پوری کرتے ہوں جو دستور کے آرٹیکل ۶ کے تحت پاکستان سے ہجرت کر کے آنے والوں کے لئے درج کی گئی ہیں، آرٹیکل ۸ میں کہا گیا ہے کہ وہ شخص جس کے والدین یا اجداد میں سے کوئی ایک یا وہ خود ہندوستان میں پیدا ہوا ہو، جیسا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں مذکور ہے، اور وہ کسی دیگر ملک میں مقیم ہے تو اگر وہ اس ملک میں واقع ہندوستانی سفارت خانے یا قونصل کے وہاں مقررہ فارم پر درخواست دے کر اپنے آپ کو بطور ہندوستانی شہری رجسٹریشن کرا لیتا ہے تو اسے ہندوستانی شہری سمجھا جائے گا، یہ عمل خواہ دستور ہند کے نفاذ سے قبل کیا جائے یا بعد کو اسے درست سمجھا جائے گا، آرٹیکل ۹ میں کہا گیا ہے کہ کوئی شخص آرٹیکل ۵ کی مندرجات کے تحت ہندوستانی شہری نہیں سمجھا جائے گا نہ آرٹیکل ۶ اور ۸ کے تحت اس کی یہ حیثیت تسلیم کی جائے گی، اگر اس نے اپنی مرضی سے کسی ملک کی شہریت حاصل کر لی ہے، آرٹیکل ۱۰ میں کہا گیا ہے کہ جسے آرٹیکل ۵ تا ۱۰ کی مندرجات کے تحت ہندوستانی سمجھا جائے تو پارلیمنٹ کے ذریعہ شہریت سے متعلق کوئی قانون بنائے جانے کی صورت میں بھی اسے ہندوستانی شہری تسلیم کیا جاتا رہے گا، بالفاظ دیگر پارلیمنٹ کی جانب سے واضح قانون سازی کے بغیر کسی شخص کو اس کی شہریت سے محروم نہیں کیا جا سکتا (وکی بکس-کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا ۱۲/جنوری ۲۰۱۲ء کو ہندوستانی شہریت کے ضابطے)، پارلیمنٹ نے قانون شہریت ۱۹۵۳ بنایا جس میں شہریت ترمیمی ایکٹ ۱۹۸۶ء کے ذریعہ ترمیم کی گئی، پھر ۱۹۹۲ء کے ترمیمی ایکٹ ۲۰۰۳ء کے شہریت ایکٹ اور ۲۰۰۵ء کے ترمیمی ایکٹ کے ذریعہ ترامیم کی گئیں، اصل ایکٹ میں کہا گیا ہے جو شخص ۲۶/جنوری ۱۹۵۰ کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوا اسے بعض مستثنیات کے ساتھ پیدائشی ہندوستانی سمجھا جائے گا۔

جو شخص ۲۶/جنوری ۱۹۵۰ء کے بعد ہندوستان سے باہر پیدا ہوا ہو تو اگر اس کی پیدائش کے وقت اس کا باپ ہندوستانی شہری تھا تو وہ بھی ہندوستانی شہری سمجھا جائے گا۔

بعض شرائط کے تحت بعض زمروں کے تحت آنے والے افراد بھی مقررہ فارم پر رجسٹریشن کی درخواست پیش کر کے

ہندوستانی شہریت حاصل کر سکتے ہیں۔

بعض شرائط کے تحت غیر ملکی بھی قومیت کے لئے درخواست پیش کر کے شہریت حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر کوئی سرزمین (علاقہ) ہندوستان کا حصہ بن جائے تو حکومت ہند ایک حکم نامہ کے ذریعہ اس علاقہ کے باشندوں کو ہندوستانی شہری قرار دے گی۔

بعض بنیادوں کے تحت شہریت منسوخ کی جاسکتی ہے، ختم کی جاسکتی ہے، یا کسی شخص کو شہریت سے محروم کیا جاسکتا ہے۔

دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) ملک کے کسی شہری کو ہندوستان کا کامن ویلتھ ہندوستانی شہری کا درجہ دیا جائے گا، حکومت ہند جوابی اقدام کے طور پر اس بارے میں قانون بنا سکتی ہے۔

جو شخص ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ یا اس کے بعد پیدا ہوا ہو، لیکن ۱۹۸۶ء کے ایکٹ کے نفاذ سے قبل جو یکم جولائی ۱۹۸۷ کو نافذ ہوا ایسے شخص کو بھی پیدائشی ہندوستانی سمجھا جائے گا، کوئی شخص جو یکم جولائی ۱۹۸۷ء کو اس کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوا تو اگر اس کے والدین میں سے کوئی ایک اس کی پیدائش کے وقت ہندوستانی شہری تھا تو ایسا شخص بھی ہندوستان کا شہری قرار پائے گا۔

جو شخص ۳ دسمبر ۲۰۰۴ء کو مارچ کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوا تو اسی حالت میں اسے ہندوستانی سمجھا جائے گا، جب اس کے والدین ہندوستانی ہوں یا ان میں سے ایک اس کی پیدائش کے وقت ہندوستانی ہو اور دوسرا غیر قانونی طور پر ہندوستان میں مقیم نہ ہو۔

وہ شخص جو ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ کو یا اس کے بعد لیکن ۱۰ ردسمبر ۱۹۹۲ سے پہلے غیر ممالک میں پیدا ہوا تو اگر اس کی پیدائش کے وقت اس کا باپ ہندوستانی شہری تھا تو اسے بھی وراثت کے طور پر ہندوستانی شہری مانا جائے گا، ۱۰ ردسمبر ۱۹۹۲ کو اس کے بعد غیر ممالک میں پیدا ہونے والے شخص کو بھی ہندوستانی شہری سمجھا جائے گا، بشرطیکہ اس کی پیدائش کے وقت اس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندوستانی شہری ہو ۳ ردسمبر ۲۰۰۴ء کے بعد جو شخص ہندوستان سے باہر پیدا ہوا ہو تو اگر اس کی پیدائش کے ایک سال کے اندر اس ملک میں موجود ہندوستانی قونصل کے وہاں اس کی رجسٹریشن نہیں کرائی گئی تو اسے ہندوستانی شہری نہیں سمجھا جائے گا، بعض حالات میں اگر رجسٹریشن ایک سال کی مدت کے بعد کرا جاتا ہے تو مرکزی حکومت کی اجازت سے اسے بطور ہندوستانی شہری تسلیم کیا جائے گا، لیکن نابالغ کے بطور ہندوستانی شہری رجسٹریشن کے لئے ہندوستان قونصل خانے میں دی گئی درخواست کے ساتھ یہ تحریری حلف نامہ بھی داخل کیا جانا چاہئے کہ نابالغ (لڑکا رلڑکی) کے پاس کوئی غیر ملکی پاسپورٹ نہیں ہے، اگر کوئی غیر ملکی بارہ سال تک ہندوستان میں رہتا ہے تو اسے فطری طور پر ہندوستانی شہری

سمجھا جائے گا، درخواست دہندہ کو ۱۴ سال کی مدت میں پورے ۱۲ سال تک ہندوستان میں مقیم ہونا چاہئے، اور کم از کم ۱۲ ماہ تک اس کا قیام مسلسل ہونا چاہئے تب وہ شہریت کے لئے درخواست دے سکتا ہے، دستور کے شہریت قانون ۱۹۵۵ کے شیڈول ۸ میں دست برداری کے بارے میں بتایا گیا ہے اگر کوئی بالغ شخص ہندوستانی شہریت ترک کرنے کا ڈیکلریشن (اعلان) پیش کرتا ہے تو وہ اپنی شہریت سے محروم ہوجائے گا اور اس کے نابالغ بچے بھی ڈیکلیریشن دینے کی تاریخ سے ہندوستانی شہریت سے محروم ہوجائیں گے، تاہم ۱۸ سال کی عمر کو پہنچنے پر یہ بچے ہندوستانی شہریت دوبارہ حاصل کرسکتے ہیں، ہندوستانی شہریت سے دستبرداری کے ضوابط میں کہا گیا ہے کہ دستبرداری کا ڈیکلریشن دینے والا شخص پوری عمر اور صحت وصلاحیت کا حامل ہونا چاہئے، شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ کی دفعہ ۹ شہریت ختم کرنے سے متعلق ہے، شہریت ختم کئے جانے کے ضابطے ہندوستانی شہریت سے دستبرداری کے ضوابط سے علاحدہ اور واضح ہیں، دفعہ ۹(۱) میں کہا گیا ہے کہ کوئی ہندوستانی شہری جو فطری یا رجسٹریشن ایکٹ کے ذریعہ کسی غیر ملک کی شہریت حاصل کرتا ہے تو وہ ہندوسانی شہریت سے محروم ہوجائے گا، واضح طور پر شہریت ختم کرنے والے ضوابط شہریت سے دستبرداری کے ضوابط سے مختلف ہیں، کیونکہ ان کا اطلاق کسی بھی ہندوستانی شہری پر ہوتا ہے اور صرف بالغ شخص تک ہی محدود نہیں ہیں، بچے بھی ہندوستانی شہریت سے خود بخود محروم ہوجائیں گے اگر پیدائش کے بعد کسی وقت بھی وہ غیر ملکی شہریت اختیار کرلیتے ہیں مثال کے طور پر رجسٹریشن یا فطری طور پر شہریت حاصل کرنے پر خواہ یہ شہریت ان کے والدین نے ہی کیوں نہ حاصل کی ہو۔

کسی دیگر ملک کا پاسپورٹ حاصل کرنا بھی شہریت ضوابط ۱۹۵۶ کی مندرجات کے تحت اپنی مرضی سے دوسرے ملک کی قومیت حاصل کرنے کا عمل سمجھا جائے گا۔

شہریت رولز ۱۹۵۶ء کے شیڈول III کے رول (ضابطہ) ۳ میں کہا گیا ہے کہ یہ حقیقت کہ کسی ہندوستانی شہری نے کسی بھی تاریخ کو کسی غیر ملک کی حکومت سے پاسپورٹ حاصل کیا، اس بات کا پورا ثبوت ہوگا کہ اس شخص نے اس تاریخ سے قبل اس ملک کی شہریت اپنی مرضی سے حاصل کرلی ہے، مزید یہ کہ اس رول (ضابطہ) کا اطلاق اس پر بھی ہوتا ہے کہ بچے کے والدین نے اس لڑکے/لڑکی کا غیر ملکی پاسپورٹ حاصل کیا ہو اور خواہ اس پاسپورٹ کا رکھنا اس غیر ملک کے قانون کے تحت مطلوب ہو جو اس بچے کو اپنے ملک کا شہری سمجھتا ہے (مثلاً ہندوستانی والدین کا بچہ جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پیدا ہوا ہو اور امریکی قانون کے تحت اسے پاسپورٹ کا حامل ہونا ضروری ہے، تاکہ وہ باہر کے ملک کا سفر کرسکے، کیونکہ قانون کے تحت وہ امریکی شہری ہے) اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کسی شخص کے پاس ہندوستانی پاسپورٹ بھی ہے، اگر پیدائش کی بنیاد پر غیر ملکی قومیت خود بخود حاصل ہوگئی ہو اور پیدائش کے بعد یہ اپنی مرضی سے حاصل نہ کی گئی ہو ایسے معاملہ پر بھی اس ضابطہ کا اطلاق ہوگا، جو لوگ کسی دوسرے ملک کی شہریت حاصل کرلیتے ہیں وہ جس تاریخ سے اس ملک کی شہریت یا پاسپورٹ حاصل

کرتے ہیں ہندوستانی شہریت سے محروم ہوجائیں گے۔

گوا دمن اور دیو سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی شہریوں کے لئے خصوصی ضوابط موجود ہیں، شہریت رولز ۱۹۵۶ کے شیڈول III کے رول (ضابطہ) ۱۳اے میں کہا گیا ہے کہ جو شخص گوا، دمن، دیو (شہریت) حکم نامہ ۱۹۶۲ کے تحت ہندوستانی شہری قرار پاتا ہے یا دادر نگر حویلی (شہریت) حکم نامہ ۱۹۶۲ (شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ کے سیکشن ۷ کے تحت جاری کئے گئے تو اگر ایسے شخص کے پاس غیر ملکی پاسپورٹ ہو اور اس نے ۱۹/جنوری ۱۹۶۳ کو یا اس سے قبل اسے واپس نہ کر دیا ہو تو یہ اس بات کا پکا ثبوت ہوگا کہ اس شخص نے اپنی مرضی سے اس تاریخ سے قبل اس غیر ملک کی شہریت اختیار کر لی ہے، ۱۶/فروری ۱۹۶۲ کو سپریم کورٹ آف انڈیا کی دستوری بنچ نے ایک مقدمہ اظہار احمد خاں بنام یونین آف انڈیا میں فیصلہ صادر کیا کہ اگر یہ ظاہر ہوجائے کہ شخص مذکور نے قومیت یا رجسٹریشن کے ذریعہ کسی دیگر ملک کی شہریت حاصل کر لی تھی تو اس میں کوئی شک نہیں رہ جائے گا کہ اسی قومیت یا رجسٹریشن کے بعد وہ ہندوستانی شہریت سے محروم ہوجائے گا (انڈین سٹی زن شپ ۱۲/ ۲۰۱۲ء)۔

دوہری شہریت:

اگست ۲۰۰۵ء میں شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ میں ترمیم کر کے سمندر پار کر کے ہندوستانی شہری (اوسی آئی) اسکیم شروع کی گئی، یہ اسکیم پرسار بھارتی دوس کنونشن منعقدہ حیدرآباد ۲۰۰۶ء کے دوران شروع کی گئی، ہندوستانی حکام کے قول کے مطابق قانون یہ کہتا ہے کہ کوئی شخص ہندوستانی پاسپورٹ کا حامل ہوتے ہوئے کسی دیگر ملک کا پاسپورٹ نہیں رکھ سکتا، یہ ضابطہ اس بچے پر بھی لاگو ہوگا جو کسی دیگر ملک میں پیدا ہوا اور وہ ملک اس بچے کو اپنے ملک کا شہری قرار دیتا ہے، اور قانون کے تحت اسے پاسپورٹ رکھنے کا حق ہے، تاکہ وہ غیر ملک کا سفر کر سکے (مثلاً ہندوستانی والدین کے وہاں کوئی بچہ امریکہ یا سنگاپور میں پیدا ہوا) ہندوستانی عدلیہ نے اس معاملہ میں انتظامیہ کو وسیع اختیارات عطا کئے ہیں، لہذا سمندر پار رہنے والے ہندوستانی افراد کی شہریت واقعی طور پر ہندوستانی شہریت نہیں ہے، لہذا یہ دوہری شہریت یا دوہری قومیت کے دائرے میں نہیں آتی علاوہ ازیں اوسی آئی کارڈ ہندوستانی ویزے کا متبادل نہیں ہے، اس لئے اوسی آئی کارڈ کے حامل شخص کو ہندوستان کا سفر کرنے کے لئے پاسپورٹ رکھنا چاہئے جس میں سفر کے لئے ویزا لگا ہوتا ہے۔

سمندر پار رہنے والے ہندوستانی کے حقوق اور مراعات غیر مقیم ہندوستانیوں، جیسے ہی ہوں گے، سمندر پار مقیم ہندوستانی کا موجودہ غیر ملکی پاسپورٹ جس میں وہ ویزا بھی شامل ہونا چاہئے جسے یو ویزا کہا جاتا ہے اور جو کثیر المقاصد اور کثیر زیارتی تاعمر کام آنے والا ویزا ہے، اس کے ایک سمندر پار مقیم ہندوستانی کسی بھی وقت کتنی ہی مدت کے لئے اور کسی مقصد کے لئے ملک میں آ سکتا ہے، وہ سمندر پار مقیم ہندوستانی مندرجہ ذیل حقوق سے مستفید نہیں ہوسکتا، خواہ وہ ہندوستان میں ہی مقیم کیوں نہ ہو، (ا) ووٹ ڈالنے کا حق، (II) صدر نائب صدر سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج کے منصب پر فائز ہونے

کا حق ،لوک سبھا راجیہ سبھا یا کسی صوبائی اسمبلی یا کونسل کا ممبر بننے کا حق (۱۱۱) سرکاری نوکری میں تقرر، معاشی، مالیاتی اور تعلیمی امور میں اوسی آئی کارڈ ہولڈرز زراعتی اراضی خریدنے کا حق یا پودے لگانے کی اراضی حاصل کرنے کا حق نہیں ہوگا یا کوئی سرکاری منصب حاصل کرنے کے مجاز بھی نہیں ہوں گے۔

ہندوستان آنے پر انہیں غیر ملکیوں کے علاقائی رجسٹریشن آفیسر (ایف آر آر او) کے وہاں رجسٹریشن کرانے سے بھی چھوٹ حاصل ہوگی اور وہ جب تک چاہیں ملک میں قیام کر سکتے ہیں، اوسی آئی کارڈ رکھنے والے مختصر وقفہ کے نوٹس پر سفر کر سکتے ہیں، اور ہندوستان میں کوئی ذمہ داری قبول کر سکتے ہیں، جبکہ دیگر لوگ ملازمت کے ویزا پر آئیں انہیں دفتری تاخیر میں الجھنے کا اندیشہ رہتا ہے، متعدد کمپنیاں اپنے کاروبار کی وسعت کے لئے بی آئی او ہندوستان بھیجنے کی پالیسی تیزی سے اختیار کر رہی ہیں، غیر ممالک میں ہندوستان کے قونصل قانون میں اوسی آئی کی بہت ہی زیادہ درخواستیں موصول ہو رہی ہیں۔ پوری دنیا میں ان قونصل قانون نے اوسی آئی کے جو کارڈ جاری کئے ہیں، ان کی تعداد بتدریج بڑھ رہی ہے اور متعدد قونصل خانے پچھلی درخواستوں پر کاروائی میں مصروف ہیں اوسی آئی کارڈ رکھنے والے ہندوستان میں ذمہ داریاں سنبھالنے کے بہت خواہش مند ہیں، اکانومک ٹائمز ۱۵ر نومبر ۲۰۰۹، انڈیا غیر مقیم ہندوستانیوں میں سمندر پار ہندوستانی بننے کا رجحان بڑھ رہا ہے، آئی اے این ایس ۲۴ر مارچ ۲۰۰۹)، پاکستان، بنگلہ دیش اور بعض دیگر ممالک کے شہری جن کی تفصیل مرکزی سرکار کی جانب سے کی جائے گی، یہ شہری ہندوستانی نسل کا فرد کارڈ رکھنے کے مستحق نہیں ہیں، انہیں ایسے کارڈ کی منظوری نہیں دی جاسکتی ہندوستان کے کسی پورٹ (ساحل رہوائی اڈہ) پر آنے یا گذرنے پر غیر ملکی پاسپورٹ کے ساتھ پی آئی او (ہندوستانی نسل کا فرد) کا کارڈ بھی پیش کرنا ضروری ہے، غیر ملکی پاسپورٹ اور بی آئی او کارڈ میں تمام تبدیلیوں نام، پاسپورٹ کی تجدید وغیرہ کو دکھایا جانا چاہئے، بی آئی او کارڈ عموما تاریخ اجراء سے پندرہ سال تک کے لئے جائز ہوتا ہے، ۲۰۱۱ء کے اوائل میں وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ نے بتایا کہ بی آئی او کارڈ کو سمندر پار ہندوستانی کے کارڈ کے ساتھ ضم کر دیا جائے گا اس مجوزہ کارڈ کو انڈین اوورسیز کارڈ کہا جائے گا۔

آسام میں قومیت کے بارے میں امتیازی تفریق:

آسام ہندوستان کا وہ نمایاں مشرقی صوبہ ہے جہاں مسلم اقلیت کو وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے مسلم مخالف تعصب کے سبب قومیت کے مسئلہ سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے، اور اس صوبہ کی ایک وسیع مسلم آبادی کو اس معاملے میں امتیازی تفریق کے تحت قومیت سے محروم کیا جا رہا ہے، یہ نہ صرف اپنی نوعیت کے اعتبار سے متنازعہ ہے، بلکہ سیاسی طور پر پھیلایا گیا منصوبہ ہے، تاکہ مذہبی اور فرقہ وارانہ جذبات کو ابھار کر اس اقلیت کے خلاف غیر دوستانہ ماحول کو ابھارا جائے، آسام میں شناخت کی جو تحریک چلائی گئی وہ غیر ملکیوں کے خلاف تحریک میں بدل گئی اور جلد ہی اس نے بنگالی زبان بولنے والے مسلمانوں کے خلاف

تشدد، نفرت اور امتیاز کا ایک منصوبہ بند رخ اختیار کرلیا، مذہبی جذبات کو بھڑکا کر چلائی جانے والی یہ نفسیاتی اور سیاسی مہم اقلیت کو خارج کرنے اور یکطرفہ شرائط پر انہیں حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کی دھکمیاں دیئے جانے پر منتج ہوئیں، آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ پر عدلیہ کا جو رویہ ہے اس کے سبب اقلیت میں غیر یقینی عدم تحفظ خوف اور احساس کمتری پیدا ہوئی ہے، انہیں ہندوستانی قومیت سے محروم کئے جانے کے سوال کے نتیجہ میں ان ہندوستانیوں کی ایک بڑی تعداد ایسے پناہ گزینوں میں بدل گئی ہے جو بے حال ہیں اور ریاستی و مرکزی حکومتوں کے رحم وکرم پر حیران و پریشان جی رہے ہیں، قومیت عطا کرنے سے انکار کے سبب انہیں روز مرہ کی زندگی، روزی کمانے اور بطور شہری اور انسان اپنے وقار کو برقرار رکھنے میں شدید دشواریاں پیش آ رہی ہیں، کچھ چھوٹی پارٹیوں کے ماسوا کوئی بڑی سیاسی پارٹی اس اقلیت کے مسئلہ اور مصائب کے بارے میں سنجیدہ نہیں نظر آتی، بڑی پارٹیاں جو سیکولر ہونے کا دعوی کرتی ہیں وہ انہیں ووٹنگ مشین کے طور پر استعمال کرتی ہیں، ان کے مسائل سے بیگانہ ہیں اور موجودہ صورت حال کو ہی برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بنگلہ زبان بولنے والوں کو تین زمروں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اصل باشندے جیسے کچھار، وہ لوگ جو برطانوی عہد کے دوران ملک کے مختلف حصوں سے آ کر آسام میں آباد ہوگئے، وہ جو ۱۹۴۷ء میں مشرقی پاکستان سے ہجرت کر کے یہاں آئے، یہ علاقہ پاکستان سے آزاد ہوکر اب بنگلہ دیش کے نام سے جانا جاتا ہے، بہرکیف اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ یہ ہجرت کرنے والے مسلم غلبہ والے مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) میں اکثریتی غلبہ کے اصل یا مفروضہ خوف کے سبب یہاں آئے، اس سیاسی مہم کا سب سے افسوسناک پہلو یہ ہے کہ وہ آسامی تحریک جو آسامیوں کے ثقافتی اور لسانی تحفظ کے لئے شروع کی گئی تھی وہ بتدریج آسامی مسلمانوں کے خلاف مہم میں بدل گئی اور انہیں بنگلہ دیشی کہہ کر حق رائے دہندگی سے محروم کرنے کی دھمکیاں دی جانے لگیں، سیاسی طور پر ایجنڈا یہ ہے کہ آسامی مسلمانوں کی وسیع آبادی کو غیر ملکی قرار دے دیا جائے، خواہ انہیں ہندوستانی شہریت رقومیت ملے یا نہ ملے میڈیا انہیں غیر ملکی کے طور پر ہی پیش کرتا ہے اور انہیں ان کے حقوق سے عملاً محروم رکھا جاتا ہے، غیر قانونی طور پر ہجرت کرنے والوں کا مسئلہ ہندوستان کی آزادی کے وقت سے ہی اٹھایا گیا اور اب یہ ریاست کی سیاست کا سب سے اہم موضوع ہے (محمد حبیب الرحمٰن، غیر قانونی طور پر ہجرت کرنے والے اور ہندوستانی مسلمان، ہی گزٹ ۱۶ تا ۳۱رجنوری ۲۰۰۵ء)۔

دوسری طرف آسام کے بنگلہ بولنے والے باشندے اس الزام سے انکار کرتے ہیں اور اسے ایک ایسا سیاسی ہتھکنڈا بناتے ہیں، جو انہیں پریشان کرنے کے لئے استعمال کیا جارہا ہے، علاوہ ازیں بنگلہ دیش کی حکومت بھی ایسے دعووں کو تسلیم نہیں کرتی جو ہندوستان میں کئے جارہے ہیں ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے ایک مسلم اکثریتی ملک کی حیثیت سے وجود میں آنے پر وہاں کے ہندو باشندوں نے آسام اور شمالی مشرق کے دیگر صوبوں میں ہجرت کر کے سکونت اختیار کی، ۱۹۷۱ء

میں مشرقی پاکستان آزاد ہوکر بنگلہ دیش بنا بہت سے ہندو اور مسلمان ۱۹۷۱ء کی ہند پاک جنگ کے دوران ہجرت کر کے آسام آ گئے اس کے بعد بہت سے ہندو ہجرت کر کے آسام اور دیگر صوبوں میں آ گئے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، ۱۹۷۰ء کی دہائی کے اوائل میں مہاجرین سے متعلق ہند بنگلہ دیش معاہدہ کے باوجود علاقائی عصبیت رکھنے والے عناصر بنگلہ دیشی قومیت کا سوال اٹھا کر مسلم آبادی کو پریشان کر رہے ہیں، یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہندو پناہ گزینوں کی کل تعداد میں سے جس نے بنگلہ دیش آزادی کی جنگ کے دوران پناہ لی تھی، ۱۵ سے ۲۰ لاکھ تک افراد یہاں رکے رہے اور ریاست میں آباد ہو گئے، اگر چہ یہ حقیقت سب کو معلوم ہے پھر بھی ایسے افراد کی شناخت کر کے انہیں جلا وطن کرنے کی کوئی کاروائی نہیں کی گئی، بس ریاست میں رہنے والے ہندوستانی مسلمانوں کو ہی منصوبہ بند طریقے سے نشانہ بنایا جا رہا ہے (ایضا)۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ غیر ملکی مسلمانوں کی غیر قانونی آمد ۷۱-۱۹۶۱ میں بہت تیزی سے گھٹ کر صرف ۲۷۰۰۰ رہ گئی جبکہ ۶۱-۱۹۵۱ یہ تعداد ۲۲۰۰۰۰ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۷۱ء کے بعد مشکل سے ہی بنگلہ دیشی مسلمان غیر قانونی طور پر ریاست میں داخل ہوئے، ان ۱۷۵۷۰۰ غیر ملکیوں میں سے جو ۱۹۷۱ء میں آسام میں داخل ہوئے مسلمانوں کی تعداد صرف ۴۷۰۰۰،۲ تھی، دراصل انہیں غیر ملکی قرار نہیں دیا جا سکتا، کیونکہ یہ وہ مسلمان ہیں جو ۵۰-۱۹۴۸ کے فسادات کے دوران ۵۰۰۰۰ سے ۶۰۰۰۰ تک ہندوستانی مسلمان بے گھر ہو کر آسام چھوڑ کر مشرقی پاکستان میں پناہ لینے پر مجبور ہونے اور یہاں وہ اپنی ساری جائداد اور املاک چھوڑ گئے جب ۱۸/اپریل ۱۹۵۰ کے نہرو لیاقت ایکٹ کے بعد ان میں کچھ واپس آئے تو انہیں فوراً غیر ملکی درانداز (گھس پیٹھیے) قرار دے دیا گیا، ۱۹۵۲ سے ۲۰۰۲ء کے دوران کم از کم ۳۳۷۰۰ ہندوستانی مسلمانوں کو غیر ملکی ناپسندیدہ اور وطن دشمن غیر ملکی کہہ کر نکال دیا گیا (۲۰۰۲-۱۹۸۵ کے دوران یہ تعداد ۱۵۰۳ تھی) (ایضا)۔

فرقہ وارانہ یکجہتی کے ریکارڈ کے باوجود (یہاں برطانوی عہد کے بنگال اور شمالی ہند کے مقابلہ میں ہندو مسلم تعلقات بے حد خوشگوار رہے ہیں) تقسیم ہند کے نتیجہ میں ۱۹۴۷ء میں یہاں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جس کے باعث آسام کے نشیبی علاقہ میں رہنے والے ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان بے گھر ہو گئے، ممتاز آسامی پارلیمنٹرین ہیم بروا نے اعتراف کیا کہ ۵۳۰۰۰ مسلمان خاندان بے گھر ہوئے تھے (ہیم بروا-سرخ دریا اور نیلی پہاڑی-گومائی لائبریری بک اسٹال ۱۹۶۲ ص ۴۶، یہ منیر الحسن کی کتاب، ریاست، شناخت کی تحریک اور شمالی مشرق میں اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے، میں بنایا گیا ہے، ای پی ڈبلو ۱۹۴۵)۔

۱۹۵۰ء میں ہندو پاک کے درمیان نہرو لیاقت پیکٹ ہوا اس میں یقین دلایا گیا تھا کہ ایسے لوگوں کی بحفاظت واپسی اور باز آبادکاری کی جائے گی، دو سال بعد بہت سے لوگ گھر لوٹ آئے، ۱۹۶۲ کی ہند چین جنگ کے بعد ریاستی

اسمبلی اور میڈیا میں پاکستانی دراندازوں کو نکالنے کا مطالبہ کیا گیا، آسام حکومت نے پاکستانی دراندازوں کو روکنے کی اسکیم (پی آئی پی) کا نفاذ کیا جس کے تحت بہت سے آسامی مسلمانوں کو ان کے اقلیتی حقوق سے محروم کر دیا گیا۔

ہیرن گوہین نے کہا کہ آسام کے دانشوروں نے اس ظلم وستم سے آنکھیں بند کر لیں جو آسامی پولیس غیر آسامی مسلمانوں پر ڈھائے، ہیرن گوہین ہیرن، اسمیا مسلمان آئی اور وایاسات، اسمیا اڈستارل، آسام۔ گوہاٹی شانتی پرکاشن ۱۹۸۸/ص ۴۴، ۳۴، ۳۲، منیر الحسن کی کتاب شمال مشرق میں، ریاست شناخت کی تحریک اور اندرونی طور پر بے گھر ہونے والے/ص ۴۵۱۹)۔

پی آئی پی اسکیم کے تحت کاروائی سے غیر منظم اور بے سہارا دیہی مسلمان کسان خاص طور سے غیر آسامی مسلمان پوری برہم پتر وادی میں خوف زدہ ہو کر رہ گئے، ۶۷-۱۹۶۱ کے دوران آسامی پولیس نے صرف نوگاؤں ضلع سے ہی ۵۶۹۱۷ افراد کو جلاوطن کر دیا، نوگاؤں ڈسٹرکٹ گریٹر گورنمنٹ آف آسام ۱۹۷۸ منیر الحسن-آسام کی تحریک طبقہ وادی نظریہ اور شناخت نئی دہلی مانک پبلیکیشن ۱۹۹۳/ص ۲۱۶)، آسام کے سابق وزیر اعلی ہتیشور سیکیہ نے اعتراف کیا کہ ۶۷-۱۹۶۱ کے دوران ۱۹۲۰۷۹ مسلمانوں کو آسام سے مشرقی پاکستان میں جلاوطن کر دیا گیا (منیر الحسن آسامی تحریک طبقہ داری نظریہ اور شناخت نئی دہلی مانک پبلیکیشن ۱۹۹۳/ص ۲۱۹-۲۱۵)، اس طرح سیاسی اور حقیقی طور پر جلاوطن اور بے گھر کئے جانے کے خوف نے ان مصیبت کے سالوں میں آسام کی اس اقلیت کو سہار رکھا ہے، اگر چہ یہ لوگ مشرقی بنگال (مشرقی پاکستان سے نہیں) سے تقسیم کے بعد سے بہت پہلے یہاں آکر آباد ہوئے تھے، آزادی کے بعد یہ لوگ آسامی قومیت سے ہم آہنگ ہو گئے اور آسامی بن گئے (منیر الحسن موجودہ آسام کے مسلمان، ایک سماجی تعارف، نارتھ ایسٹ انڈیا کونسل، فار سوشل سائنس ریسرچ جلد ۱۱ نمبر ۲/اکتوبر ۱۹۸۷ء حسین ہندوستانی ریاست آسام کے مسلمان، جنرل انسٹی ٹیوٹ برائے مسلم اقلیت کے مسائل لندن جلد ۸-۱۹۸۷ حسین ہندوستان میں مسلمانوں کا مسئلہ جرنل برائے عصری ایشیا جلد ۳۰ نمبر ۳(۱۹۸۹) حسین آسامی تحریک طبقاتی نظریہ اور شناخت ۱۹۹۳)۔ ۲/لاکھ سے زیادہ ایسے افراد نشیبی آسام میں ایک طویل مدت سے پناہ گزین کیمپوں میں رہ رہے ہیں بہت سے ۱۹۹۳ سے ان کیمپوں میں رہنے پر مجبور ہیں۔

آسامی تحریک آل آسام اسٹوڈنٹ یونین (آسو) اور آسام گن پریشد (اے بی پی) نے شروع کی تھی یہ اتحاد ۲۷/اگست ۱۹۷۹ کو تشکیل دیا گیا اس میں آسو آسام ساہیتہ سبھا اور جاتیہ وادی دل شامل تھے، یہ ان کا ''پرامن'' پرامن، مگر پرتشدد ایجی ٹیشن تھا جسے آسامی ایجی ٹیشن کے نام سے جانا جاتا ہے، اور غیر ملکیوں کے خلاف تھا، یہ آسامی بولنے والے اعلی ذات کے ہندوؤں کی جذباتی مہم میں تبدیل ہو گیا جس نے پوری ریاست کو اپنے حصار میں لے لیا ان کا اہم مطالبہ یہ تھا کہ غیر ملکیوں کی شناخت کی جائے اور ۱۹۵۱ کے شہریوں کے پرسنل رجسٹر اور شناختی کارڈ برائے ووٹرز کی بنیاد پر شناخت کر کے

انہیں رائے دہندگی کے حق سے محروم کیا جائے ،نومبر ۱۹۷۰ کے آغاز میں اسٹوڈنٹ یونین نے گوہاٹی میں ایک بڑی ریلی (اجتماع) نکالی، ان کے نزدیک بنگلہ بولنے والے مسلمان ایک سیاسی خطرہ اور بنگلہ بولنے والے ہندو ایک اقتصادی خطرہ تھے، انہوں نے بنگلہ زبان بولنے والے لوگوں کے خلاف قبائیلوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش بھی کی، انہیں بنگلہ زبان بولنے والے اعلی ذات کے ہندووں کے اختلاط پر بھی تشویش تھی یہ تحریک عموما بنگالیوں اور دیگر نسلی اور لسانی طبقات کے خلاف تھی، ۱۹۴۷ سے پہلے غیر ملکیوں کو میمن سنگھیا کہا جاتا تھا، اب انہیں بنگلہ دیشی کہا جانے لگا، سنڈے کلکتہ ۱۹/اپریل ۱۹۸۳، ۱۹۴۷ سے پہلے (جو کہ ہندوستان کی آزادی کا حال ہے) یہ لوگ اکثر مسلمان تھے، لیکن بعد میں ان میں سے ہندو بھی بڑی تعداد میں شامل ہو گئے۔

آر ایس ایس نے اس تحریک کی حمایت کی، تا کہ وہ آسام کی صورتحال کو فرقہ واریت کا رنگ دے سکے، اگر آر ایس ایس کو اس طرح اس کا کھیل کھیلنے دیا جائے تو اصلی مسلم باشندوں کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جائے گی (شاہد مسعود۔ ہندوستانی سیکولرزم کے مظلوم، نظام آباد، پاکستان، المعارف اکیڈمی ۱۹۸۳ر ص ۱۱۸)، آر ایس ایس شروع سے مسلم مہاجرین کے خلاف نفرت پھیلانے اور دشمنی کو ابھارنے میں مصروف تھیں، ان تیس سالوں کے دوران حکومت یا قومی لیڈر شپ نے سیکولر نظریات کی تلقین میں بہت کچھ نہیں کیا (حمید نسیم رفیع آبادی- آسام ایجی ٹیشن سے معاہدہ تک، نئی دہلی جنوین پبلیکیشن اینڈ میڈیا لمیٹیڈ ۱۹۸۸، رص ۷) اس وقت مرکز میں جو سرکار تھی اس میں بی جے پی، آر ایس ایس کے لیڈر بھی شامل تھے اور وہ اپنے ایجنڈے پر عمل کرنے میں مصروف تھے، آسامی مسلمانوں کے خلاف ایجی ٹیشن کو آر ایس ایس نے پوری طرح کنٹرول کیا، قبائیلوں کو یقین دلایا گیا کہ جب مسلمان چلے جائیں گے تو ان کی چھوڑی ہوئی جائدادیں قبائیلوں کو دے دی جائیں گی، آر ایس ایس کو آسام میں تیس شاکھائیں قائم کرنے کی اجازت دی گئی (ہبرن گوہین- آسام ایک جلتا ہوا سوال گوہاٹی ۱۹۸۵، رص ۱۱۶)۔

یونائیٹڈ مائنارٹی فرنٹ آف آسام نے بتایا کہ ۱۹۸۱ء میں آسام میں مردم شماری نہیں ہوئی، ان کا کہنا کہ ہندوستان کے لاکھوں اصلی باشندوں کو غیر ملکی بتا کر انہیں اذیت دی جارہی ہے، سجان راما چندرن، آپریشن پشپک، سنگھ پریوار اسٹیٹ، نئی دلی میں سلم اور غیر قانونی طور پر مقیم بنگلہ دیشی، ای پی ڈبلیو جلد ۳۸، نمبر ۷ (۲۰۰۳ء)، رص ۶۴ - ۶۳۴) فرنٹ کو غیر ملکیوں کی شناخت پر کوئی اعتراض نہیں تھا، لیکن اس عمل میں دستور اور ملک کے قانون کی خلاف ورزی تو نہیں کی جانی چاہئے تھی، فرنٹ نے ۸ سیاسی قتل پر بھی صدمہ کا اظہار کیا اس میں یونائیٹڈ مائنارٹی فرنٹ (یو ایم پی) کے صدر کالی پداسین کا قتل بھی شامل ہے، اسی طرح کنونشن آف دی مائنارٹی کورڈی نیشن کمیٹی ۱۹۸۵ نے اکارڈ کی پیچیدگیوں پر اپنی تشویش ظاہر کی، ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق آسام کی کل آبادی میں مسلم آبادی کا تناسب ۳۱ فیصد سے زیادہ ہے، اس ۳۱ فیصد

آبادی میں ۵۷ فیصد سے زیادہ لوگ بنگلہ بولتے ہیں جنہیں آسام کے اصل باشندے عموماً بنگلہ دیشیوں کی طرح سمجھتے ہیں، ملک کے شمالی حصہ میں میڈیا اور نام نہاد قوم پرستوں نے ایک نیا پروپگنڈہ شروع کیا کہ ملک کے بہت سے حصوں میں بنگلہ دیشی مقیم ہیں۔

۱۹۹۲ میں ایک سخت گیر پولیس اور تفتیشی ایجنسیوں کی مشترکہ مہم شروع کی گئی، تاکہ نئی دہلی میں غیر قانونی طور سے رہنے والے بنگلہ دیشیوں کی شناخت کر کے انہیں ملک سے نکالا جائے اس مہم میں بہت سے ایسے لوگ بھی شکار ہوئے جن کا کہنا تھا کہ وہ ہندوستان کے اصلی باشندے ہیں (وان ڈبلوشنڈل دی بنگال بارڈر لینڈ، جنوبی ایشاء میں ریاست اور قوم سے ماورا لندن انتھم پریس ۲۰۰۵ء ص ۲۱۱)۔

آسام میں مسلمانوں کو جو سیاسی سہولت حاصل ہے وہ ہندوؤں کو پسند نہیں ہے، انہیں اندیشہ ہے کہ ایک دن آسام میں مسلمانوں کا غلبہ ہو جائے گا، ان خدشات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے بی جے پی نے ریاست میں ہندو ووٹ اپنے حق میں کر لئے، رام جنم بھومی تحریک کے دور سے ہی اس نے اپنے انتہائی جذباتی فرقہ پرست نعروں سے ہندو ووٹروں کو اپنی طرف راغب کرنا شروع کر دیا، اسی دوران پارلیمنٹ کے الیکشن کی تاریخ کا اعلان ہو گیا، اس اعلان کے ساتھ ہی ملک کے مختلف حصوں میں آئی ایس آئی کے ایجنٹوں کی گرفتاری اور ان کے پاس سے آر ڈی ایکس کے دھماکہ خیز مادہ سے بھرے ہوئے تھیلے برآمد ہونے کی خبریں بھی شائع ہوئیں۔ آسام میں بھی سیکورٹی فورسیز (فوجی عملہ) نے دعوی کیا انہوں نے ریاست میں آئی ایس آئی کے جال کو توڑ دیا ہے اور آئی ایس آئی کے چار سب سے بڑے ایجنٹوں اور ۲/۷ دیگر ایجنٹوں کو گرفتار کیا ہے، علاقائی اخبارات نے یہ خبریں شائع کیں کہ ریاست میں ایک درجن سے زیادہ اسلامی گروپ کام کر رہے ہیں، جنہیں آئی ایس آئی سے مدد ملتی ہے، خود آسام کے وزیر اعلی پرفل کمار مہنتا اس پریس کانفرنس کی صدارت کر رہے تھے جس میں آئی ایس آئی کے جال کو منتشر کرنے کا اعلان کیا گیا، انہوں نے علانیہ طور پر یہ الزام لگایا کہ آسام کے سرحدی اضلاع میں مدرسہ اور علماء آئی ایس ائی کے تحت چلنے والی تنظیموں کے لئے مسلم نوجوانوں کو بھرتی کر رہے ہیں، یہ اچھی طرح جانتے ہوئے بھی کہ اس قسم کے بیان کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا، انہوں نے اسمبلی انتخابات میں اپنی جیت کے لئے آسامی ہندوؤں کو رجھانے کی کوشش کی، جسونت سنگھ، شہریت کے بارے میں آسامی کرائسس - سیاسی غلطیوں کا ایک جائزہ - ایشین سروے جلد ۲۴ نمبر ۱۰/ اکتوبر ۱۹۸۴، ص ۱۰۵۹)، ۲۰۰۸ء میں آسام میں کئی جگہ بم دھماکے ہوئے جس کے نتیجہ میں وہاں کے مسلمانوں کو پریشان کیا گیا، یہ ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی، تاکہ انہیں دشمن اور غیر ملکی کہہ کر بدنام کیا جائے، ۲۰۰۸ء کے آخر تک آسامی پولیس کے بعض اعلی افسران نے جو دہشت گردی کے خلاف محکمہ میں تھے ایسے فسطائی لیڈروں اور تنظیموں کے ناموں کو ظاہر کر دیا جن کا تعلق اکثریتی فرقہ سے تھا، یہ لوگ ایسے متعدد معاملات میں ملوث پائے گئے جنہیں اس سے پہلے یا تو ہندوستانی

مسلمانوں یا پاکستان کو ملوث بتایا گیا تھا (ج مل شمال مشرق میں آبادی کا حملہ، آگنائزر، والتیر ۲۰۰۴ ہندو نیشنلسٹ تعبیر کے مطابق آسام میں بنگلہ دیشی سے مراد مسلمان ہوتے ہیں، ان میں ہندو شامل نہیں ہیں، انہیں (ہندوؤں کو) ایسا سمجھا جاتا ہے جیسے وہ اپنے گھر واپس آرہے ہیں، ہندوستانی سیاست میں یہ ذہن فروغ پا رہا ہے کہ بنگلہ دیش کے غیر قانونی مہاجرین صرف مسلمان ہیں وہ اس بات کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ ان مہاجرین میں خاصی بڑی تعداد ہندوؤں کی ہے، سنجیو بروا- تقسیم کا طویل سایہ آسام میں شہریت کی بابت الہام-انڈیا رص ۵۹۸)۔

اخبارات میں آسام کے سابق وزیر اعلی ہتیشور سیکیہ کا انتہائی متنازعہ بیان شائع کیا، انہوں نے ۱۰/اپریل 1992 کو ریاستی اسمبلی میں کہا کہ آسام میں ۲۰ سے ۳۰ لاکھ تک بنگلہ دیشی درانداز ہیں جب اس بنا پر وہ شدید تنقید کا نشانہ بنے تو انہوں نے وضاحت کی کہ ریاست میں ایک بھی غیر قانونی مہاجر نہیں ہے (ایضا ر ۶۰۲)، سیکیہ نے اپنے بیان میں بنگلہ دیشیوں کو عوام کا دشمن بھی کہا، ایم ایس پربھاکر، سراب کا تعاقب فرنٹ لائن چنئی، ۱۳، ۲۰، ۴رجولائی ۲۰۰۳ء رص ۴۲)۔

یہ بات بڑی المناک ہے کہ آسام کے گورنر لفٹنٹ جنرل ایس کے سنہا نے صدر جمہوریہ کو جو رپورٹ ارسال کی اس میں بھی حکومت کی سطح پر ایسے ہی تعصب کا اظہار کیا گیا، اس کے ساتھ جو خط مورخہ ۸رنومبر 1998 منسلک ہے اس میں کہا گیا ہے کہ کئی دہائیوں سے مشرقی پاکستان ربنگلہ دیش سے بڑی تعداد میں جو غیر قانونی طور پر درانداز آرہے ہیں ان کی وجہ سے ریاست میں آبادی کا تناسب بدل رہا ہے، اس کی وجہ سے آسامیوں کی شناخت اور سماجی قومی سیکورٹی کو شدید خطرہ لاحق ہے، اس رپورٹ کے پوائنٹ ۴ میں کہا گیا ہے کہ بنگلہ دیش سے تری پورہ اور مغربی بنگال میں ہندو ریفوجیوں کی آمد جاری ہے۔

آسام میں بنگلہ دیش سے غیر قانونی طور پر جو لوگ آتے ہیں ان میں تقریبا تمام لوگ مسلمان ہیں، رپورٹ کے پوائنٹ ۱۰ میں کہا گیا کہ نسلی، زبانی اور مذہبی یکسانیت جو ان لوگوں کو ہماری سرحد میں رہنے والوں سے ہے اس کی وجہ سے ان غیر قانونی دراندازوں کو یہاں پناہ مل جاتی ہے اس کی وجہ سے ان کی شناخت میں بھی مشکل پیش آتی ہے (آسام میں غیر قانونی طور پر داخل ہونے والوں کی بابت رپورٹ، جو صدر جمہوریہ ہند کو پیش کی گئی، راج بھون، گوہاٹی ۸رنومبر 1998)۔

رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ایسی کوئی شہادت موجود نہیں ہے کہ بنگلہ دیشی حکام آبادی کی اس نقل وحرکت کو بڑھاوا دے رہے ہیں، لیکن انہوں نے اسے روکنے کی بھی کوشش نہیں کی، اور دراصل وہ اس سے خوش ہوں گے کہ اس طرح ان کے وہاں بڑھتی آبادی کا جو دباؤ ہے وہ کم ہو رہا ہے، اس طرح اب اس نقل وحرکت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے، وزیر اعظم شیخ حسینہ نے یقین دلایا ہے کہ ہندوستان میں غیر قانونی طور پر مقیم کوئی بنگلہ دیشی نہیں ہے (ایضا)، اس میں مزید کہا گیا ہے کہ ان غیر ملکی دراندازوں کی تعداد معلوم کرنے کے لئے کوئی مردم شماری نہیں کی گئی ہے۔ صحیح اور قطعی اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں، تاہم اندازے اور قیاس کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں میں ہے (ایضا)، رپورٹ میں یہ بھی

کہا گیا ہے کہ بنگلہ دیش کے اخبارات نے ہندوستان کی ہندو بنیاد پرست حکومت پر سخت تنقید کی تھی کہ وہ ہمارے معصوم ہندوستانی مسلمانوں کو نکالنے اور انہیں بنگلہ دیش میں پھینکنے کی کوشش کررہی ہے، ایک اخبار نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ بنگلہ دیش کو ہندوستان سے نمٹنے کے لئے امریکہ سے مدد لینی چاہئے، وزیراعظم شیخ حسینہ جو ہندوستان کی دوست مانی جاتی ہیں انہوں نے ایک بیان میں کہا کہ ہندوستان میں کوئی بنگلہ دیشی غیر قانونی طور پر مقیم نہیں ہے (ایضا)۔

فروری ۲۰۰۵ء میں آسام کے گورنر نے کہا کہ ہرروز قریبا ٦ ہزار بنگلہ دیشی ہندوستان میں داخل ہوتے ہیں، یہ لوگ کام کی تلاش میں یہاں آتے ہیں، پھر یہیں رک جاتے ہیں اور ہمارے یہاں تقریباً ۲۰ لاکھ غیر قانونی طور پر مقیم مہاجرین ان میں شامل ہوجاتے ہیں۔

مہاجرین کا مسئلہ زور پکڑ رہا ہے (ٹری بیونل چنڈی گڑھ ۴ مئی ۲۰۰۵ء) اس کے برعکس آسام کے وزیراعلی ترن گوگوئی نے سنگھ کے اس بیان کو قطعی بے بنیاد بتایا اور کہا کہ یہ سطحی بیان ہے جو حقائق اور اعداد وشمار پر مبنی نہیں ہے (گوگوئی نے گورنر کی رپورٹ پر اعتراض کیا، نارتھ ایسٹ انکوائرر، جلد ۳ نمبر ۲۸، ۲۲ مئی سے ٦ جون ۲۰۰۵ یہ بات بھی تکلیف دہ ہے کہ ہندوستانی عدلیہ نے اعلی سطح پر غیر قانونی مہاجرین ٹری بیونل کے ذریعہ شناخت ایکٹ ۱۹۸۳ پر رائے دی جسے مرکزی پارلیمنٹ نے پاس کیا تھا جو غیر قانونی طور پر دراندازوں کی شناخت اور انہیں ملک بدر کرنے کے بارے میں ہے جن پر عدالت میں مقدمہ چل رہا ہے۔

سیاسی مقاصد کے تحت بنی سیاسی ایجنسیوں کے لئے یہ مشکل تھا کہ وہ آئی ایم ڈی ٹی کو گمراہ کرسکیں، ۱۲/جولائی ۲۰۰۵ء کو سپریم کورٹ آف انڈیا نے آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ ۱۸۸۳ کو غیر دستوری قرار دے کر مسترد کردیا، کیونکہ آسامی تحریک کے دعووں سے ہم آہنگ تھا، تعجب انگیز طور پر عدالت نے کہا کہ اس ایکٹ کی وجہ سے آسام میں بنگلہ دیش سے غیر قانونی طور پر آنے والوں کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے، اور غیر قانونی طور پر آنے والے افراد کی شناخت میں یہ ایکٹ ایک رکاوٹ ہے، عدالت نے یہ فیصلہ ۲۰۰۲ء میں سربنداساموواکی رٹ پٹیشن پر دیا تھا، بنچ نے ہدایت کی کہ (غیر ملکی) ایکٹ آرڈر ۱۹٦۴ کے تحت نئے ٹربیونل قائم کئے جائیں (سپریم کورٹ نے کہا کہ آئی ایم ڈی ایکٹ جلاوطن کرنے کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے (دی ہندو ۱۴/جولائی ۲۰۰۵ء) فسطائی میڈیا اس فیصلہ کا خیر مقدم کیا (سپریم کورٹ کے فیصلہ کو نافذ کیا جائے، جے جی اروڑا- آرگنائزر ۲۱/اگست ۲۰۰۵ء) دوسری جانب ایک مشہور وکیل نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا، ان تمام ۳۰ سالوں کے دوران میں نے سپریم کورٹ کا مشاہدہ کیا ہے، میں نے کبھی ایک ایسا فیصلہ نہیں دیکھا جو اس قدر تنگ دلی پر مبنی آمرانہ ہو، یہ درحقیقت فسطائی اور ذہن کے اعتبار سے فرقہ وارانہ ہے، اس میں دستور کی ایسی انوکھی تشریح کی گئی ہے، جو بنیادی قانونی اصولوں سے عدم واقفیت کو ظاہر کرتی ہے اور حقوق انسانی، نیز بنیادی انسانی قدروں سے اس درجہ

بے حسی کی مظہر ہے (شانتی بھوشن- آئی ایم ٹی ڈی آسام یہ فیصلہ انسانی حقوق اور اصولوں کے خلاف ہے، سہ ماہی ہیومن رائٹ ٹوڈے (نئی دہلی) جولائی ستمبر ۲۰۰۵ء)۔

۱۹۸۳ سے قبل، غیر ملکی دراندازوں کی شناخت اور انہیں نکالنے کا کام غیر ملکیوں کی بابت ایکٹ ۱۹۴۶ء کے تحت کیا گیا تھا جس میں حکام خصوصاً پولیس کو غیر محدود اختیارات دیئے گئے تھے کہ وہ کسی کو بھی غیر ملکی قرار دے کر اسے نکال دے، اس ایکٹ کے تحت اگر کسی شخص کو غیر ملکی قرار دے دیا جائے تو یہ ثابت کرنا اس شخص کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ وہ غیر ملکی نہیں ہے، ایسے لوگ جن کے پاس پیدائش کے سرٹیفکٹ یا زمین کی ملکیت کے کاغذات نہیں ہوتے تھے، یہ ثابت کرنا عملاً ناممکن ہو جاتا تھا ان پریشانیوں کو دیکھتے ہوئے پارلیمنٹ نے ۱۹۸۳ء میں غیر ملکی مہاجرین (ٹربیونل کے ذریعہ شناخت) ایکٹ (آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ) بنایا، اس کے تحت غیر ملکیوں کی بابت ایکٹ کے تحت شہریت سے متعلق تنازعات ان عدالتی ٹربیونل کے ذریعہ کئے جاتے تھے، اگرچہ یہ ایک ایکٹ پورے ملک کے لئے تھا، لیکن شروع میں اس کا نفاذ صرف آسام پر کیا گیا، اس کے بعد اگر گورنمنٹ ملک کے دیگر علاقوں میں اس کا نفاذ کرے تو نوٹی فیکشن کے ذریعہ ایسا کر سکتی ہے، سرکاری اعداد و شمار کے مطابق آئی ایم ڈی ٹی کی ۲۰ سالہ کارکردگی کے دوران ٹربیونل میں جو ۶۲۲۸۷ معاملات پیش کئے گئے ان میں سے ۲۰۰۳ تک ٹربیونل نے صرف ۲۱۱۶۹ معاملات کا فیصلہ کیا، ان میں ۱۱۶۳۸ لوگ غیر ملکی مہاجر قرار دیئے گئے ان میں سے بھی صرف ۱۵۱۷ کو ہی نکالا جا سکا (ایضاً)۔

اس کیس کی سماعت زیر التوا ہونے کے دوران پولیس دہلی میں، غیر ملکی ایکٹ کے تحت کاروائی کے نام پر جھگی جھوپڑی علاقوں میں رہنے والے غریب بنگالی مسلمانوں سے غیر قانونی طور پر روپیہ وصولتی رہی، شہریوں کے ایک بے حد ممتاز گروپ نے جو خود جمہوریت کی بقاء کے لئے شہریوں کی مہم کے نام سے معروف تھا اپنی ایک جانچ رپورٹ میں بتایا کہ ان غریب بنگالی مسلمانوں کو مقامی پولیس غیر ملکی ایکٹ کے تحت پکڑ کر لے جاتی اور میونسپل کارپوریشن کے نظر بندی کیمپ میں رکھا جاتا پھر گاڑی کے ڈبوں میں انہیں روانہ کر دیا جاتا تھا، یہ لوگ بنگلہ دیش کی سرحد پر لے جائے جاتے، ان کے پاس جو کچھ ہوتا وہ چھین لیا جاتا اور ان سے کہا جاتا کہ بھاگ جاؤ، رپورٹ کے الفاظ ہیں: ''جب ان لوگوں کو جبراً سرحد پار اتارا جاتا ہے تو ان سے ہر وہ چیز چھین لی جاتی ہے جس کے ذریعہ وہ یہ بتا سکیں کہ وہ ہندوستانی ہیں، انہیں دھمکی دی جاتی ہے کہ اگر وہ واپس آئے تو انہیں درانداز قرار دے کر گولی ماردی جائے گی، رخصتی ہدایت کے طور پر ان سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر بنگلہ دیش رائفلز کے سپاہی انہیں سرحد پر پکڑیں تو کہہ دیں کہ ہم کسی خاص گاؤں سے کام یا شادہ میں شرکت کے بعد واپس آ رہے ہیں۔

اپنی شناخت اور شہریت سے جبراً محروم کئے جانے پر یہ غریب لوگ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں دیکھتے کہ پھر غیر قانونی طور پر آنے کی کوشش کریں، تاکہ کسی طرح وہ زندہ رہ سکیں (ایچ سیکنتھ، آسام کے مسئلہ کو فرقہ واریت کا رنگ دینا، اے جی پی کا

نقصان بی جے پی کا فائدہ، جلد ۳۴ نمبر ۳۹، دسمبر ۱۰-۴ /۱۹۹۹، ص ۱۳-۳۴)۔

درحقیقت سپریم کورٹ سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ جسے دستور کے تحت شہریوں کے بنیادی حقوق کی ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ وہ غیرملکیوں سے متعلق ایکٹ کو غیر دستوری قرار دیتی جس کے تحت حکام کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ عدالت کی جانچ کے بعد شہریوں کو غیرملکی قرار دے کر نکال دیں، کسی بھی شہری کو عدالت کے ذریعہ اس کا حق ثابت ہونے تک نکالا نہیں جاسکتا، لہذا غیرملکی ایکٹ کے تحت حکام کو شہریوں کو جلاوطن کرنے کا جو اختیار دیا گیا ہے وہ نامناسب ہے اور آزادی کے بنیادی حق کی خلاف ورزی کرنا ہے اس کے جواب میں عدالت نے کہا کہ اگر غیر قانونی طور پر داخل ہونے والے کسی شخص کو ملک سے نکالا جاتا ہے تو اسے بنیادی حق کی خلاف ورزی نہیں مانا جائے گا، کچھ سال پہلے تک اکثر لوگوں کے پاس ایسے دستاویز نہیں ہوتے تھے جن سے ان کی ہندوستانی شہریت ثابت ہوسکے، ابوحنیف کے پاس پاسپورٹ تھا، الیکشن کا شناختی کارڈ اور راشن کارڈ بھی تھا، پھر بھی پولیس نے اسے بنگلہ دیشی قرار دیا، لیکن بیشتر لوگوں کے پاس ایسے کاغذات یا سرکاری دستاویز نہیں ہوتے جس کی بنیاد پر وہ اپنی ہندوستانی شہریت ثابت کرسکیں، کیا ایسے حالات کے تحت انہیں ہندوستان سے نکالا جاسکتا ہے؟ اس فیصلہ سے ایسا ہی ظاہر ہوتا ہے (ایضا)۔

جمہوریت کی بقاء کے لئے شہریوں کی مہم (سی سی پی ڈی) کے تحت منعقدہ ایک سمینار میں بولتے ہوئے وکیلوں اور جرنلسٹوں نے سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلہ پر اپنی تشویش کا اظہار کیا، سپریم کورٹ وکیل پرشانت بھوشن نے کہا کہ یہ دلائل سنے بغیر کہ کس طرح دلی پولس نے غیرملکی ایکٹ کا غلط استعمال کرتے ہوئے غریب لوگوں کو پریشان کیا اور انہیں غیر قانونی درانداز قرار دے دیا، سپریم کورٹ نے اس ایکٹ کو قلم زد کردیا، جبکہ آئی ایم ڈی ایکٹ کے تحت (جو کہ عدالت کے ذریعہ قلم زد کئے جانے سے قبل صرف آسام کی حدود میں نافذ تھا) یہ ثابت کرنا کہ متعلقہ شخص غیرملکی نہیں ہے، اس شخص یا گورنمنٹ کی ذمہ داری تھی جو ایسا دعوی کرتی ہے یہ غیرملکی افراد کی بابت ایکٹ جو بقیہ ملک میں نافذ ہے اس کے تحت اب یہ ثابت کرنا کہ مذکورہ شخص غیرملکی نہیں ہے خود اس شخص کی ذمہ داری ہوگئی ہے، اس فیصلہ پر تنقید کرتے ہوئے کہ عدالت نے اس کی بنیاد دستور کی دفعہ ۳۵۵ پر رکھی ہے جو مرکز کی یہ ذمہ داری قرار دیتا ہے کہ وہ ملک کو خارجی حملوں اور اندرونی بدامنی سے بچائے، مسئلہ پر پرشانت بھوشن نے کہا کہ یہ پہلی بار ہے کہ انہوں نے دستور کی اس دفعہ کی یہ تشریح دیکھی ہے، انہوں نے کہا کہ عدالت نے خارجی جارحیت کو بنگلہ دیشیوں کی غیر قانونی درآمد کے مساوی بنادیا ہے (آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ کو منسوخ کئے جانے پر شہریوں کی تنظیم نے تنقید کی، دی ہندو ۱۱/ اگست ۲۰۰۵ء) وہ قوانین جن کے تحت مسلمانوں کو آسام سے نکالا گیا وہ یہ ہیں:

۱- غیرملکیوں سے متعلق ایکٹ ۱۹۴۶ مہاجرین (آسام سے نکالنے) ایکٹ ۱۹۵۰ (۳) غیرملکیوں سے متعلق (ٹربیونل) آرڈر ۱۹۶۴ (۴) پاکستان سے ہونے والی دراندازی روکنا، پلان ۱۹۶۴ جسے بی آئی بی پلان کے نام سے

معروف ہے، (۵) غیر ملکی دراندازِ (ٹریبونل کے ذریعہ شناخت) ایکٹ ۱۹۸۳ء موخر الذکر کو چھوڑ کر دیگر تمام قوانین فرقہ وارانہ رنگ کے ہیں اور ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف عصبیت کو ظاہر کرتے ہیں، ہندوستانی مسلمانوں کو درانداز ناپسندیدہ عناصر قوم دشمن قرار دے کر نکالنے سے ثابت ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو آسام سے نکالا جار ہا ہے، کیونکہ مشرقی پاکستان/بنگلہ دیش سے بہت ہی کم تعداد میں غیر ملکی مسلمان غیر قانونی طور پر ہندوستان میں داخل ہوئے، کیونکہ اب ہندوستانی مسلمانوں کو درانداز کہہ کر نکال دینا ممکن نہیں ہے، تو اب یہ کوشش کی جارہی ہے کہ انہیں مشکوک شہری قرار دیا جائے، اس کے نتیجہ میں ۲۷۵۰۰۰۰ مسلمانوں کو مشکوک شہری قرار دے کران کے نام ۱۹۹۷ کے ووٹر لسٹ سے حذف کر دیئے گئے (محمد حبیب الرحمٰن ملی گزٹ ۳-۱۶/جنوری ۲۰۰۵ء)۔

آل آسام اسٹوڈنٹ یونین نے ایک اشتہاری مہم چلائی کہ ۲۰۰۱ء کی مردم شماری میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی ۸۲۴۰۶۱۱ میں سے ۵۰۰۰۰۰۰ نام حذف کردیئے جائیں، بالفاظ دیگر یہ لوگ دنیا کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آسام کے مسلمانوں کی اکثریت غیر ملکی ہے، ۱۹۵۱ میں ریاست میں مسلمانوں کی مجموعی آبادی ۱۹۹۵۹۶۳ تھی، اس کا مطلب یہ ہے کہ ۱۹۵۱ سے ۲۰۰۱ء کے پچاس سالوں کے دوران مسلمانوں کی مجموعی آبادی میں صرف (۳۲۴۰۶۱۱ منفی ۱۹۹۵۹۶۱ جو برابر ہے ۱۲۴۴۶۵۰) کا اضافہ ہوا، لیکن آسام میں مسلمانوں کی آبادی ۱۹۴۱ء میں ۳۴۲۸۹۶۹، ۱۹۶۱ء میں ۲۷۶۵۵۰، ۱۹۷۱ء میں ۳۵۹۲۱۲۴ اور ۱۹۹۱ء میں ۶۳۷۳۲۰۴ تھی۔ ایم ایس یو کے ایجی ٹیشن کے سبب بے مثال بدامنی کے سبب ۱۹۸۱ء میں مردم شماری نہیں ہوسکی، ریاست میں مسلمانوں کی آبادی میں کوئی غیر معمولی اضافہ نہیں ہوا ہے، ایم ایس یو اور اس کے ممبران کے دعوے درست نہیں ہیں، یہ سب فرقہ وارانہ اور سیاسی مفاد اور مقاصد سے کیا جارہا ہے۔ آسام میں مسلمانوں کی آبادی ۱۹۴۱ میں ۳۴۲۸۹۶۹ تھی جو ۱۹۵۱ء میں گھٹ کر ۱۹۹۵۹۶۳ رہ گئی، کیونکہ سہلٹ ضلع مشرقی پاکستان میں چلا گیا پھر ۱۹۵۰-۱۹۴۸ میں بڑے پیمانے پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن کی وجہ سے لاکھوں مسلمان مشرقی پاکستان ہجرت کرنے پر مجبور ہوگئے (محمد حبیب الرحمٰن، دی ملی گزٹ ۱۶-۳۱/جنوری ۲۰۰۵)۔

مردم شماری کی رپورٹوں سے اس کی تائید نہیں ہوتی، اگر بنگلہ دیش سے آنے والوں کی تعداد اسی طرح بڑھی تو ملک اور خصوصا ملک کے شمال مشرق علاقوں میں آبادی کا تناسب بہت بڑھ جائے گا جبکہ اس کے خلاف آبادی کے تناسب میں گراوٹ پائی گئی ہے، ہندوستان میں آبادی میں اضافہ کا تناسب میں ۲۰۰۱-۱۹۹۱ کے دوران ۲۳.۶۶ فیصد سے گھٹ کر ۲۱.۳۴ فیصد کی گراوٹ آئی، شمال مشرقی علاقہ میں بھی آبادی کے تناسب میں گراوٹ آئی ہے، ۲۰۰۱-۱۹۹۹ء کی دہائی کے دوران شمالی مشرقی علاقہ میں آبادی کے تناسب میں جو اس قدر گراوٹ آئی ہے وہ یہ واضح کرتی ہے کہ اس علاقہ میں بنگلہ دیش سے کوئی غیر قانونی دراندازی نہیں ہوئی آسام جسے غیر قانونی دراندازوں کی پناہ گاہ بتایا جاتا ہے وہاں بھی آبادی کے تناسب

میں گراوٹ آئی ہے،۲۰۰۱-۱۹۹۹ میں یہ تناسب ۱۸٫۸۵ فیصد رہ گیا، جبکہ 1999-1981 کی دہائی کے دوران یہ ۲۴٫۲۴ فیصد تھا، ۱۹۴۱ء میں تری پورہ کی مجموعی آبادی ۵۱۳۰۱۰ تھی، ۱۹۹۱ میں اس میں بے حد اضافہ ہوا، اور یہ ۲۷۴۴۸۲۷۰، اور ۲۰۰۱ء میں ۳۱۹۱۱۶۸ ہوگئی، یہ اس وجہ سے ہو کہ بنگلہ دیش سے بڑی تعداد میں بنگالی ہندو دراندازریاست میں آگئے، ریاست میں مسلم آبادی ۱۹۴۱ء میں ۱۲۳۵۴۵ تھی، اس میں معمولی اضافہ ہو کر ۱۹۹۱ میں ۱۹۶۴۹۸ ہوگئی، ان حقائق کی بنیاد پر بلا شک وشبہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تری پورہ اور شمالی مشرق کی دیگر ریاستوں میں بنگلہ دیشی مسلمانوں کی غیر قانونی دراندازی نہیں ہوئی (ایضا)۔

آئی ایم ڈی ٹی ایکٹ ایک متوازن قانون سازی تھی، ہندوستانی مسلمان، غیر ملکیوں کی شناخت اور انہیں ملک سے نکالے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کرتے، ان کا موقف یہ ہے کہ غیر ملکیوں کی شناخت ان کی مذہبی اور لسانی شناخت کی بنیاد پر نہ کی جائے جو بھی غیر ملکی ہو اس کی شناخت کر کے عدالتی کاروائی کے تحت انہیں جلاوطن کیا جائے اس عمل میں ان کے انسانی حقوق کو بھی پامال نہیں کیا جانا چاہئے ہندوستانی مسلمان جو صدیوں سے آسام میں رہ رہے ہیں وہ ریاست کے سماجی، معاشی، سیاسی اور ثقافتی زندگی کا لازمی حصہ بن گئے ہیں وہ ریاست کی اقتصادی، صنعتی زراعتی، ترقی، سڑکیں، پل، عمارتیں بنانے، زبان، ادب امور ثقافت میں فروغ میں بنادی کردار ادا کر رہے ہیں (ایضا)۔

آسام میں مسلمانوں کی آبادکاری اور اس مذہب سے وابستگی پر تیرہ سو سال کا عرصہ گذر چکا ہے، آسام کے مسلمانوں کو دو زمروں کے تحت لایا جاسکتا ہے وہ مسلمان جو آسامی اصل کے ہیں اور بنگلہ بولنے والے مسلمان جو تاریخ کے مختلف ادوار میں وہاں آکر آباد ہو گئے، ان میں سے بہت سے وہ ہیں جنہیں انگریزوں نے یہاں لاکر آباد کیا اور اس کے بعد کانگریس کے اقتدار میں انہیں یہاں لایا گیا تاکہ وہ ریاست کی ترقی میں مدد کریں اور یہاں کی بنجر اور جنگلات کے تحت پڑی زمین کو زرخیز بنائیں۔

اس وقت ریاست میں نیشنل رجسٹر آف سٹیزنز (این سی آر) ۱۹۵۱ء کے پروجیکٹ کو مکمل کرنے کا کام جاری ہے جس کی وجہ سے ریاست کے بنگلہ بولنے والے مسلمان پریشان ہیں، آسام کے دو ضلعوں میں یہ کام بڑے پیانے پر ہو رہا ہے، بارپٹیا مالپائی علاقہ باربیٹیا ضلع کے تحت ہے اور چاپا گاؤں مالیاتی علاقہ جو کامروپ ضلع کے تحت ہے اس پروجیکٹ کے تحت شہریوں سے کہا گیا ہے کہ وہ اسٹینڈرڈ سرکاری فارم کے ساتھ اسے دستاویز بھی منسلک کریں جن سے ان کی ہندوستانی شہریت ثابت ہوتی ہو ان دستاویزیوں میں این آر سی 1951 کی فہرست ۱۹۶۶ اور ۱۹۷۱ کے الیکشن لسٹ کی نقل گورنمنٹ کا کہنا ہے کہ این سی آر کا مقصد ریاست کے ہندوستانی باشندوں کی شناخت اور ان کے نام فہرست میں درج کرنا ہے، بنگلہ بولنے والے مسلمان اور کچھ بنگلہ بولنے والے ہندوؤں نے اس پراجیکٹ پر شدید اعتراض کیا ہے، یہ احتجاج روز بروز شدت اختیار کرتا جارہا ہے، وہ عملا اس پراجیکٹ کا بائیکاٹ کر رہے ہیں، مثال کے طور پر پہلے مرحلہ میں ۷۴ ہزار فارم بنگلہ بولنے

والوں کو تقسیم کئے گئے تھے ان میں سے صرف ۷۴ فارم ہی خانہ پری کر کے واپس کئے گئے (محمد علی آسام میں ہندوستانی شہریوں کے سوال پر تنازعہ ابھر سکتا ہے، ۲ سرکل نیٹ ۱۷؍جولائی ۲۰۱۰ء)۔

عبدالرحیم خاں، سکریٹری، آل انڈین یونائٹیڈ فرنٹ کا کہنا ہے کہ حکام، اصلی ہندوستانی باشندوں کو بنگلہ دیشی ثابت کرنے کے لئے غیر قانونی ہتھکنڈے استعمال کر رہے ہیں، انہوں نے بتایا کہ بارپیٹا مالیہ سرکل کے تمام دولاکھ بنگلہ بولنے والے مسلمانوں کا مقام پیدائش میمن سنگھ ڈھاکہ بنگلہ دیش لکھا گیا ہے، سرکاری کاغذات میں اس اندراج کی بابت انہوں نے سوال اٹھایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ تمام دولاکھ افراد کا مقام پیدائش ڈھاکہ کا ہی ایک مقام ہو، سرکاری طور پر یہ پروپگنڈہ قطعی جھوٹ ہے، ایک اور معاندانہ بات ہے جو بنگلہ بولنے والی آبادی کے لئے ناقابل برداشت ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستانی باشندوں کا ایسا رجسٹریشن ملک میں کہیں اور نہیں ہو رہا ہے، ایسا صرف آسام میں ہو رہا ہے، انہوں نے مزید کہا کہ ملک میں کسی اور جگہ ایسا رجسٹریشن نہیں ہو رہا ہے اس سے این سی آر کے مشتبہ اور غیر قانونی ہونا ظاہر ہوتا ہے، یہ کارروائی ہمیں نشانہ بنانے اور ہمارے خلاف امتیاز کے مقصد سے کی جارہی ہے، انہوں نے بتایا کہ سرکاری حکام نے جو فہرستیں فراہم کی ہیں ان میں ۲۵ فیصد بنگلہ بولنے والی آبادی کو جو بارپٹیا کے ان علاقہ میں رہتی ہے، اسے مشتبہ ظاہر کیا گیا ہے اس کے ''ڈی'' کا حرف لکھا گیا ہے، جو فہرست میں نام کے ساتھ دکھایا گیا ہے (ایضا)۔

غالباً بنگلہ دیشی بنائے جانے کی بدنامی (اور کون جانے کب انہیں بنگلہ دیش میں ڈھکیل دیا جائے) سب سے بڑی وجہ ہے کہ بنگلہ بولنے والی آبادی این سی آر کی مخالفت کرتی ہے، اے آئی آئی یو ڈی ایف کے جنرل سکریٹری بہار الاسلام نے ۱۹۵۱ میں ۱۹۶۶ اور ۱۹۷۱ کی الیکشن فہرست اور ۱۹۵۱ کے این سی آر میں غلطیوں، بے ضابطگیوں اور غلط اندراج کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ۱۹۶۶ اور ۱۹۷۱ کی الیکشن و دیگر فہرستوں میں ہزاروں ناموں کا اندراج نہیں کیا گیا، بہت سے اصلی شہریوں کو غیر ملکی (بنگلہ دیشی) ہونے کے نوٹس بھیجے گئے ہیں (ایضا)، بار بٹیا مالیہ حلقہ کے گاؤں میں رہنے والے تمام بنگلہ بولنے والی آبادی نے اجتماعی طور پر فیصلہ کیا ہے، وہ رجسٹریشن کے عمل کا بائی کاٹ کریں گے اور فارموں کو پیش نہیں کریں گے، این سی آر ۱۹۵۱ء کو مکمل کرنے کی کارروائی ان کے نزدیک مشتبہ اور بداعتمادی پر مبنی ہے، ان کا اندیشہ ہے کہ جو غلطیاں اور بے ضابطگیاں ہیں ان کی آڑ میں، ان فارموں کی جانچ کرتے وقت ان کے ناموں کو حاشیہ پر کر دیا جائے گا اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست کے حکام این سی آر سے ان کے نام خارج کریں گے (ایضا)۔

اسحاق علی دیوانی صدر آسام کھلانچہ مسلم انابن پریشد نے کہا ہمیں پائلٹ پراجیکٹ نہیں ہے، این سی آر زہر پھیلاتا ہے، ہم ایسی لسٹ کا کیا کریں گے جس میں آخر کار ہمارے نام نہیں ہوں گے (ایضا)۔

اذبر جن خدشات کا اظہار آسام کی بنگلہ بولنے والی آبادی نے کیا ہے وہ بالکل بے بنیاد نہیں ہے، اس کی تصدیق

آسامی روزنامہ اگردوت کے صحافی نے بھی کی ہے اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتے وہ لکھتے ہیں ان سالوں کے دوران حکومت کی پالیسی یہ رہے کہ بنگلہ بولنے والی آبادی کو سرکاری طور پر کم کر کے دکھایا جائے۔اصل اعداد وشمار کو بدلنے کے لئے لاکھوں ہندوستانیوں کے نام ووٹرلسٹ سے خارج کردیئے گئے ہیں یا پھر انہیں مشتبہ شہری دکھایا گیا ہے(ایضا)۔

اوپر جو کچھ بیان کیا گیا ہے اس کے پیش نظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ شہریت کے قوانین کا معیار جس کی اوپر مثالیں دی گئی اس جدید خیال پر مبنی ہے کہ ملک کی مخصوص حدود میں رہنے والے افراد کی قومیت منظور اور رد کی جائے، یہ قوانین یا تو اس متعلقہ ملک کے دستور میں درج ہیں یا قانون سازی میں ہیں، یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ جنگ عظیم دوم کے بعد ان قوانین میں بکثرت تبدیلیاں عمل میں آئی ہیں، ان میں ان مسائل پر توجہ نہیں دی گئی ہے جو درج ذیل زمینی حقائق اور معاشرتی وثقافتی اور سیاسی پیچیدگیوں کے سبب پیش آرہے ہیں، ابھی تک بہت سے ممالک خود کو ان عالمی قانون سے ہم آہنگ نہیں کرسکے ہیں حالانکہ یہ قانون اقلیتوں پناہ گزینوں وطن سے نکالے گئے افراد ایسے افراد جو کسی ملک کے باشندے نہیں سمجھے جاتے (اسٹیٹ لیس) اور وہ فرقہ جو جمہوری اداروں کے ذریعہ دوسرے فرقہ کے کنٹرول میں ہے، وغیرہ کے مسائل حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا ہے۔

اسرائیل میں عرب شہریوں کو یہودی شہریوں کے مساوی حقوق حاصل نہیں ہیں، مقبوضہ یروشلم، مغربی کنارہ اور غزہ فلسطینیوں کو ان کے حقوق سے محروم کردیا گیا ہے، اسرائیل نے ان علاقوں کو ضمنی طور پر اپنی مملکت کا حصہ بنالیا ہے اور ان علاقوں کے باشندوں کے شہری حقوق غصب کر لئے ہیں، ۱۹۴۸ء میں فلسطین زمین پر اسرائیل کا غیر قانونی ملک وجود میں آیا، جو فلسطینی وہاں سے بے وطن ہو کر ادھر ادھر رہ رہے ہیں انہیں اپنے گھروں کو واپس آنے کی اجازت نہیں ہے، اسرائیل اسی غاصبانہ پالیسی پر عمل پیرا ہے، عالمی برادری، یوروپین یونین اقوام متحدہ، سیکورٹی کونسل کوئی بھی فلسطین کے مسئلہ پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتا، اسی طرح وہ ان افغان ریفیوجیوں کے مسئلہ پر دھیان نہیں دیتے جو عارضی طور پر پاکستان اور ایران میں پناہ لئے ہوئے ہیں، اسی طرح ان فلسطینیوں کا مسئلہ ہے جو ۲۰۰۳ء میں امریکہ کی جانب سے عراق پر بمباری کے سبب بے گھر ہوئے، اسی طرح دیگر مسائل میں جو بعض ممالک کی طرف سے پیسہ، ہتھیار اور منفی ذہن کے سبب مسلم اکثریت والے ممالک کے خلاف جارحیت سے پیدا ہوئے ہیں، ہندوستان میں ریاست آسام میں بنگلہ زبان بولنے والے جو لوگ بنگلہ دیش کے سرحدی علاقوں میں رہتے ہیں، وہ قومیت کے مسئلہ سے دوچار ہیں، یہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف تعصب کی پالیسی کا نتیجہ ہے، دوسری طرف متعدد ملکوں میں جو شہری حقوق ہیں وہ ثقافت اور کثرت آبادی کی بنیاد پر بنائے گئے ہیں اور ان میں اقلیتوں کے مسائل کو نظر انداز کردیا گیا ہے، لہذا جمہوریت کے مفاد میں یہ اہم ذمہ داری ہے کہ شہریت کے قوانین کو انسانی قدروں میں ڈھالا جائے۔

ہندوستان میں شہریت کا قانون-ایک جائزہ

پروفیسر اقبال علی خان☆

کسی بھی دوسرے جدید ملک کی طرح ہندوستان میں بھی دو قسم کے لوگ ہیں، ملک کے شہری اور غیر ملکی، ملکی عوام ہندوستان کے مکمل شہری ہیں اور ریاست کے وفادار ہیں انہیں جملہ شہری اور سیاسی حقوق حاصل ہیں، دوسری جانب دیگر مما لک کے لوگ ہیں، اس لئے انہیں تمام شہری اور سیاسی حقوق حاصل نہیں ہیں، یہ غیر ملکی شہری بھی، ان زمروں کے تحت آتے ہیں دوست مما لک کے شہری اور دشمن ملک کے شہری، یعنی وہ دوست مما لک جن کے ہندوستان سے خوشگوار تعلقات ہیں، دوسرے وہ ملک جو ہندوستان سے برسر پیکار ہیں، دوست مما لک کے شہریوں کے مقابلے میں دشمن ملک کے شہریوں کو کم حقوق حاصل ہوتے ہیں، انہیں گرفتاری اور نظر بندی سے بھی تحفظ حاصل نہیں ہوتا۔

شہریت سے مراد یہ ہے کہ ایک فرد کا ریاست سے تعلق یا جماعتوں کا مما لک سے ربط شہریت حاصل ہونے سے عموماً اس ملک میں رہنے اور کام کرنے کا حق ہوتا ہے جس مرد کو کسی ریاست میں شہریت حاصل ہو وہ اس ملک کا شہری کہلاتا ہے ایک شہری وہ ہے جو ریاست کی حکومت کا وفا دار ہو اور حکومت اسے تحفظ فراہم کرے (انسائیکلوپیڈیا امریکہ رص ۱، ۲-۲۵۷)، کسی مملکت کے شہری کو جملہ شہری اور سیاسی حقوق حاصل ہوتے ہیں، ان شہریوں کو ریاست کے دستور کے تحت بعض ایسے حقوق حاصل ہوتے ہیں، جو غیر ملکیوں کو حاصل نہیں ہوتے۔

مثلاً دستور کی دفعات ۱۵، ۱۶، ۱۹، ۲۹ کے تحت بنیادی حقوق، یہ حقوق صرف ریاست کے شہریوں کو حاصل ہوتے ہیں، صدر، نائب صدر، سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے جج اور اٹارنی جنرل کے منصب صرف ریاست کے شہریوں کو ہی حاصل ہوسکتے ہیں، صرف ریاست کے شہریوں کو ہی پارلیمنٹ اور صوبائی اسمبلیوں کے الیکشن میں ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے، دستور ہند کے تحت صرف ایک ہی شہریت عطا کی گئی ہے اور وہ ہے ہندوستانی شہریت، امریکی دستور کے برخلاف دستور ہند کے تحت صرف ایک ہی شہریت کو تسلیم کیا جاتا ہے، جبکہ امریکہ میں دوہری شہریت کا قانون ہے۔

☆ ڈین فیکلٹی آف لاء، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

قومیت اور شہریت:

قومیت اور شہریت دو اصطلاحات ہیں جنہیں بعض اوقات متبادل کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا ہے اور ہم معنی سمجھا جاتا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ ان میں کئی پہلوؤں سے اختلاف ہے، پہلے دیکھتے ہیں کہ قومیت سے کیا مراد ہے سادہ الفاظ میں یہ ہے کہ یہ اصطلاح اس ملک کے لئے استعمال کی جاتی ہے جہاں کوئی فرد پیدا ہوا، پھر شہریت سے کیا مراد ہے، یہ ایک قانونی درجہ یا حیثیت ہے، یعنی ایک وہ فرد جس کا کسی ملک میں قانون حکومت کے تحت اس حیثیت سے اندراج کیا گیا ہو۔

ایک شخص اپنی پیدائش کے تحت متعلقہ ملک کی قومیت کا حامل ہوتا ہے، قومیت والدین سے وراثت میں بھی حاصل ہوتی ہے اور اسے فطری واقعہ کہا جاتا ہے، دوسری جانب کوئی فرد صرف اسی صورت میں کسی ملک کا شہری کہلائے گا جبکہ وہ اس ملک کے سیاسی دائرہ عمل میں ازروئے قانون تسلیم کیا گیا ہو، ایک شخص جو ہندوستان میں پیدا ہوا اسے ہندوستانی قومیت حاصل ہوگی، لیکن اگر وہ امریکہ میں بطور شہری اپنا اندراج کرالے تو وہ وہاں کا شہری قرار پائے گا۔

کوئی فرد اپنی قومیت تبدیل نہیں کرسکتا، لیکن کوئی شخص مختلف شہریتوں کا حامل ہوسکتا ہے، مگر وہ اپنی قومیت تبدیل نہیں کرسکتا، دوسری مثال یہ ہے کہ یوروپی یونین کے لوگ یوروپی یونین کی شہریت حاصل کرسکتے ہیں، لیکن اس سے کسی کی قومیت تبدیل نہیں ہوگی۔

بعض اقوام افراد کو اعزازی شہریت بھی عطا کرتی ہیں، لیکن کوئی ملک کسی شخص کو اعزازی قومیت عطا نہیں کرسکتا، کیونکہ اس شخص کی جائے پیدائش کو تبدیل نہیں کیا جائے گا۔

قومیت کی اس طرح بھی تعبیر کی جاسکتی ہے کہ اس کا اطلاق کسی ایسی جماعت پر ہوتا ہے جس کی تہذیب، ثقافت، روایات، تاریخ، زبان اور دیگر عام مشابہت میں یکسانیت ہو، جبکہ شہریت کا اطلاق کسی ایک ہی قسم کی جماعت پر نہیں ہوگا، مثال کے طور پر ایک ہندوستانی امریکی شہری ہوسکتا ہے، لیکن وہ امریکن قومیت کے حامل افراد میں شامل نہیں ہوسکتا۔

دستور ساز اسمبلی میں شہریت:

دستور ساز اسمبلی کو دنیا کے دیگر ممالک میں رہنے والے ہندوستانی نسل کے افراد کی جانب سے مختلف عرضداشتیں پیش کی گئیں، لیکن دستور ساز اسمبلی میں دوہری شہریت کے سوال پر کوئی تفصیلی بحث نہیں ہوتی، اس خیال کو نہ قبول کیا گیا نہ رد کیا گیا، آرٹیکل ۹ کے تحت کسی دیگر ملک کی رضا کارانہ طور پر قومیت حاصل کرنے کے نتیجہ میں قومیت سے محروم ہوجانے کے سوال پر واضح طور پر غور کیا گیا، یہ غالباً تقسیم ملک اور اس کے نتائج کی وجہ سے شہریت کے مسئلہ پر الجھاؤ سے بچنے کے لئے کیا گیا ہو۔ اس آرٹیکل کے مسودہ پر دستور ساز اسمبلی میں جو بحث ہوئی اس سے ظاہر تھا کہ شہریت کا مسئلہ جو دستور

کے آغاز پر ہوگا وہ توجہ کا مرکز تھا جب ۱۰/اگست ۱۹۴۹ کو آرٹیکل ۵ اور ۶ کے اصل مسودہ کا ڈرافٹ زیر بحث آیا تو دستور ساز اسمبلی کے صدر ڈاکٹر راجندر پرشاد نے کہا کہ ان دونوں آرٹیکل سے معلق ۱۳۰ سے ۱۴۰ تک ترامیم پیش کی گئی ہیں۔

انہوں نے ڈاکٹر بی آر امبیڈکر سے کہا کہ وہ آرٹیکل کو اس شکل میں پیش کریں جسے انہوں نے قطعی طور پر مرتب کیا ہے، امبیڈکر نے بار بار وضاحت کی کہ اس آرٹیکل کا یہ مقصد نہیں ہے کہ ملک کے لئے شہریت سے متعلق کوئی مستقل قانون بنایا جائے، شہریت سے متعلق مستقل قانون بنانے کا کام پارلیمنٹ کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے، اور جیسا کہ ممبران آرٹیکل ۶ کے الفاظ دیکھیں گے جسے میں نے پیش کیا ہے شہریت سے متعلق مسئلہ پارلیمنٹ کے لئے چھوڑا گیا ہے جو کسی ایسے قانون کے مطابق اس کا تعین کرے گی جو وہ مناسب سمجھے۔

ڈاکٹر امبیڈکر نے مزید کہا کہ آرٹیکل ۶ کے تحت پارلیمنٹ ایسے افراد کی شہریت ضبط کرسکتی ہے جو دستور کے نفاذ کے وقت آرٹیکل ۵ کے تحت شہری قرار دیئے گئے تھے اور جو ان کے بعد آئے، بلکہ پارلیمنٹ اس بارے میں نئے اصول بھی مرتب کرسکتی ہے، انہوں نے زور دے کر کہا کہ دستور کی جو مندرجات ہیں وہ مستقل یا ناقابل ترمیم نہیں ہیں، اور ان آرٹیکل کے تحت جو کچھ کہا گیا ہے وہ عبوری اور وقتی نوعیت کی ہیں، دستور کی وہ مندرجات جو دفعہ ۱۱ میں دی گئی ہیں ان کا مقصد یہ ہے کہ دستور کے نفاذ کے وقت شہریت عطا کی جائے، ملک کی تقسیم کی وجہ سے یہ ضروری ہوگیا تھا کہ دستور کے نفاذ کے وقت شہریت کی تشریح کی جائے، تاکہ ایسے لوگوں کی شہریت کو خارج کردیا جائے جنہوں نے تقسیم کے بعد ہندوستان کے بجائے پاکستان کی شہریت اختیار کرلی تھی، باقی پارلیمنٹ پر چھوڑ دیا گیا ہے، جیسا کہ دستور ساز اسمبلی کے صدر نے ۱۱/اگست ۱۹۴۹ء کو بحث کے دوران کہا:

ڈاکٹر امبیڈکر نے دو اہم نکات کی طرف توجہ دلائی ہے: اول یہ کہ مسودہ دستور کے نافذ العمل ہونے پر شہریت کے محدود سوال سے متعلق ہے، دوسرا نکتہ یہ ہے کہ دیگر تمام امور بشمول ان کے جو اس مسودہ میں درج ہیں وہ پارلیمنٹ کے لئے چھوڑ دیئے گئے ہیں کہ وہ اپنے صوابدید کے مطابق فیصلہ کرے، اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ بحث کو کافی حد تک مختصر کردیا جانا چاہئے اور معاملہ تیزی سے طے کرلیا جانا چاہئے، ۱۹۴۹ کا آٹھواں مہینہ پہلے ہی شروع ہوچکا ہے اور دستور ساز اسمبلی اس بحث ومباحثہ کو ختم کرنا چاہتی ہے، بہر حال شہریت کا سارا مسئلہ دستور میں درج نہیں کیا جاسکتا، لہذا اس بات پر بار بار زور دیا گیا ہے کہ دستور میں شہریت سے متعلق دفعات عبوری ہیں اور شہریت سے متعلق امور کی قانون سازی پارلیمنٹ کے لئے چھوڑ دی گئی ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنی تقریر کے بیشتر حصہ میں ان لوگوں کے بارے میں کہا جو پاکستان چلے گئے تھے اور پھر حکومت ہند کے جاری کردہ پرمٹ کی بنیاد پر ہندوستان واپس آگئے، ایسے لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی، مگر بحث اسی

موضوع پر زیادہ ہوتی رہی۔

شری الادی کرشنا سوامی ائیر جو ایک ماہر قانون اور مسودہ تیار کرنے والی کمیٹی کے ممبر بھی تھے انہوں نے وضاحت کی کہ شہریت سے متعلق مسودہ آرٹیکل کا مقصد ایوان کے سامنے قومیت کا کوئی قانون پیش کرنا نہیں تھا اور کوئی بھی ملک اپنے دستور کے آغاز میں شہریت سے متعلق قانون مرتب نہیں کرتا، انہوں نے کہا، لہذا کسی دستور خصوصا ہمارے اس دستور میں جو اس وقت شہریت سے متعلق عبوری تجاویز بنا رہا ہے دوہری شہریت یا دوہری قومیت کے بارے میں کوشش سے کوئی فائدہ نہیں۔

پنڈت ہردے ناتھ کنزرو نے اپنی تقریر میں خاص طور پر ان لوگوں کو شہریت دینے کے بارے میں کہا جو پاکستان چلے گئے تھے، لیکن پھر ہندوستان لوٹ آئے۔شری گوپالا سوامی اینگر نے اس تجویز کی تائید کی۔

بحث کا جواب دیتے ہوئے ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی تقریر کے بڑے حصہ میں پاکستان سے آئے ہوئے تارکین وطن کے مسئلہ اور ان لوگوں کے بارے میں جو پاکستان جا کر ہندوستان لوٹ آئے ہیں پر مرکوز رکھا، انہوں نے اس بات کا اعادہ کیا کہ شہریت سے متعلق قانون پارلیمنٹ کو بنانا چاہئے۔

دستور ساز اسمبلی میں ہونے والی بحث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسمبلی کی اہم توجہ دستور کے نفاذ کے وقت شہریت کے حقوق عطا کرنا دوسرے ان افراد کو شہریت کے زمرے سے خارج کرنا تھا جو ہندوستان چھوڑ کر چلے گئے تھے اور دوسرے ملک کی قومیت اختیار کر لی تھی، (ان میں پاکستان جانے والے خاص طور پر شامل تھے) تیسرے وہ لوگ جو پاکستان ہجرت کر گئے تھے، مگر پھر ہندوستانی شہری کی حیثیت سے واپس آ گئے تھے، دیگر سوال جو قومیت اور دوہری قومیت کے بارے میں تھے پارلیمنٹ کے لئے چھوڑ دیئے گئے۔

اگر چہ دوہری قومیت کے سوال پر جزوی طور پر بعض ممبران نے اظہار خیال کیا ان میں پروفیسر کے ٹی شاہ اور پنڈت جواہر لال نہرو خاص طور پر شامل تھے اور یہ سوال برقرار رہا (ایضا)۔

دستور ہند کے تحت شہریت:

دستور میں آرٹیکل ۵ تا ۱۱ کے تحت یہ وضاحت کی گئی ہے کہ ہندوستان کے شہری کون ہیں؟ یعنی ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ کو جس دن یہ دستور نافذ العمل ہوا، شہریوں کو مندرجہ ذیل زمروں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱-سکونت کے اعتبار سے شہری۔

۲-ترک وطن کر کے آنے والے شہری۔

۳-اور رجسٹریشن کے ذریعہ شہریت حاصل کرنے والے۔

۱-سکونت کے اعتبار سے شہری: اس کے تحت ہر وہ شخص جو دستور ہند کے نفاذ کے وقت ملک میں سکونت پذیر تھا اور مندرجہ ذیل شرائط پوری کرتا تھا وہ ملک کا شہری ہے:

۱-وہ ہندوستان میں پیدا ہوا ہو، ۲-اس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوا ہو، ۳-وہ دستور کے نافذ ہونے سے کم از کم پانچ سال قبل سے ہندوستان میں سکونت پذیر تھا۔

مذکورہ بالا شرائط (۱، ۲، ۳) مجموعی نہیں، بلکہ متبادل ہیں، لہذا کوئی بھی شخص جو ان میں سے کسی ایک کو بھی پورا کرے اور ملک میں سکونت پذیر ہو وہ ہندوستان کا شہری شمار کیا جائے گا (عبد الستار ...... ریاست گجرات کے اے آئی آر ۱۷۶۵) سکونت سے مراد کسی شخص کی مستقل رہائش ہونا ہے، کوئی شخص سکونت کے بغیر اور نہ کوئی شخص ایک سے زیادہ سکونت کا حامل ہوسکتا ہے، قومی سرحدیں کسی شخص کے سکونت کے اختیار میں رکاوٹ نہیں سمجھی جائیں گی، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی ایک ملک کی قومیت کا حامل ہے، لیکن اس کی سکونت کسی اور ملک میں ہے۔

سکونت سے مراد یہ ہے کہ کسی شخص کا کسی علاقائی نظام قانون سے مربوط ہونا، دراصل شہریت سکونت سے حاصل ہوتی ہے اس کے برعکس نہیں، موخر الذکر شہریت سے قابل امتیاز ہے اس حد تک کہ یہ لازمی طور پر علاقائیت سے متعلق ہے کسی فرقہ سے منسلک ہونے سے متعلق نہیں ہے، یہی شہریت کے تصور کی بنیاد ہے۔

ہمارے یہاں صرف ایک ہی شہریت ہے یعنی انڈین یونین کی شہریت، یہاں امریکہ کی طرح کسی اور ریاست کا شہری ہونے کا دستور نہیں ہے، جیسا کہ سپریم کورٹ نے سنٹرل بینک آف اِیڈیا بنام رام نرائن (اے آئی آر ۱۹۵۵) میں فیصلہ دیا ''کسی ملک میں مستقل طور پر رہائش پذیر ہونے کا ارادہ جہاں کسی شخص نے سکونت اختیار کر لی ہو، وہ اس ملک میں اس کی سکونت کے واقع ہونے کا سب سے لازمی تشکیلی عامل ہے'' سپریم کورٹ نے یہ نظریہ لوئی ڈی رانڈی بنام یونین آف انڈیا میں واضح کیا۔

اپنے اختیار کی سکونت حاصل کرنے کے لئے یہ ظاہر ہونا چاہئے کہ متعلقہ شخص ایک قسم کے ذہن کا حامل ہے، اگر وہ یہ دعوی کرتا ہے کہ اس نے کسی خاص وقت ایک نئی سکونت حاصل کی تو اسے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اس سکونت والے ملک میں اپنی مستقل سکونت کا ارادہ رکھتا تھا، اس کے ایسے ذہنی ارادہ کے بغیر محض سکونت رکھنا کافی نہیں ہے۔

اپنی رہائش کے ملک میں مستقل مکان بنانے کا ارادہ اور وہاں مستقل رہائش برقرار رکھنا ضروری ہے، اس ارادہ کے بغیر محض رہائش اختیار کر لینا کافی نہیں ہے۔

ایک ہندوستانی جو ۳۰ سال تک انگلینڈ میں مقیم رہا اور وہیں فوت ہوا اس کی ہندوستان میں سکونت کو تسلیم کیا گیا، کیونکہ اس نے اپنے بعض خطوط میں ہندوستان واپس آنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا (شنکرن گووندن بنام لکشمن بھارتی اے آئی آر ۱۹۶۴)۔

لیکن اس فیصلہ کے خلاف اپیل پر سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا کہ متوفی کا ہندوستان واپس آنے کا مصمم ارادہ نہیں تھا اور وہ انگلینڈ میں سکونت رکھتے ہوئے ہی وہاں فوت ہوگئے (شنکرن بنام لکشمن اے آئی آر ۱۹۷۴)۔

لوئی ڈی رانڈی کے مقدمہ میں ایک غیر ملکی ۱۹۳۷ء سے ہندوستان میں سکونت پذیر تھا، یعنی دستور کے نافذ العمل ہونے سے پانچ سال سے بھی زیادہ عرصہ سے، اس نے دستور کے آرٹیکل ۵ (ای) کے تحت ہندوستانی شہریت حاصل کرنے کا دعوی کیا، لیکن سپریم کورٹ نے اپنے فیصلہ میں کہا کہ درحقیقت یہ نہیں کہا جاسکتا کہ دستور ہند کے نفاذ کے وقت وہ پانچ سال سے زیادہ سے سکونت پذیر تھا۔

محض رہائش اختیار کرلینا ہی کافی نہیں ہے:

سوال یہ تھا کہ آیا مدعی کا ہندوستان میں مستقل سکونت کا ارادہ تھا؟ اس کا ثبوت فراہم کرنا مدعی کی ذمہ داری تھی، لوئی ہندوستانی حکام کی اجازت سے غیر ملکی پاسپورٹ کی بنیاد پر یہاں مقیم تھا، کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے کسی طرح یہ ثابت ہوسکے کہ اس کا یہاں مستقل سکونت کا ارادہ تھا۔

ایک نابالغ اپنے باپ کی سکونت حاصل کرتا ہے (داؤد محمد بنام یونین آف انڈیا ۱۹۶۹) ایک عورت اپنے شوہر کی سکونت میں شریک ہوتی ہے (کریم النساء بنام یونین آف انڈیا، مدھیہ پردیش اے آئی آر ۱۹۵۵)۔

مہاجرت (ترک وطن) کے ذریعہ شہریت:

پاکستان سے ترک وطن آرٹیکل ۶ کے تحت دستور ہند کے نفاذ سے قبل پاکستان سے ہجرت کرنے والوں کے لئے شہریت عطا کی گئی ہے، ایک شخص جس نے ۱۹؍جولائی ۱۹۴۸ سے پہلے پاکستان سے ہندوستان کے لئے ترک وطن کیا اسے ہندوستان کا شہری سمجھا جائے گا بشرطیکہ اس شخص کے والدین یا دادا دادی میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوئے ہوں، جیسا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ کے تحت درج ہے، اور یہ کہ وہ ترک وطن کی تاریخ سے ہی وہاں مقیم تھا، جو لوگ ۱۹؍جولائی ۱۹۴۸ کے بعد ترک وطن کرکے آئے ایسے شخص کو حکومت کے حکام ہندوستانی شہری شمار کریں گے، لیکن رجسٹریشن کے لئے متعلقہ شخص کو درخواست دینے کی تاریخ سے چھ ماہ قبل ہندوستان میں سکونت پذیر ہونا چاہئے (وزارت قانون)۔

پاکستان کو ہجرت کرنے والے:

دستور کے آرٹیکل ۷ میں ایسے افراد کے لئے جو یکم مارچ ۱۹۴۷ کے بعد پاکستان ہجرت کرگئے تھے، مگر بعد کو واپس آگئے، خصوصی بندوبست کیا گیا ہے، ایسے افراد ہندوستانی شہریت حاصل کرنے کے حقدار ہیں، بشرطیکہ وہ ان شرائط کو پوری کرتے ہوں جو پاکستان سے آنے والوں کے لئے اور آرٹیکل ۶ کے تحت درج کی گئی ہیں، مگر ایسے کیسوں میں بھی ضروری ہے کہ ہجرت مختصر مدت کے لئے ہو یا عارضی نوعیت کی، کاروباری یا کسی دیگر مقصد کے لئے ہو (ایضا)۔

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ ایسے کیسوں میں مذکورہ آرٹیکل کے تحت عمل ہوگا، کیونکہ یہ دستور ہند کے نفاذ سے قبل کے ہیں اس کے بعد کے کیس شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ء کے تحت آئیں گے۔

۳-رجسٹریشن کے ذریعہ شہریت:

دستور کی دفعہ ۸ کے تحت مذکور ہے کہ کوئی شخص جس کے والدین یا دادا دادی میں سے کوئی ایک ہندوستان میں پیدا ہوا جیسا کہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں وضاحت کی گئی ہے اور وہ عام طور پر ہندوستان سے باہر کسی ملک میں مقیم ہے اسے ہندوستانی سمجھا جائے گا، بشرطیکہ وہ دستور کے نفاذ سے قبل یا بعد اگر ہندوستانی سفارت خانہ یا قونصل سے متعلقہ فارم حاصل کر کے ایسے درخواست پیش کر دیتا ہے (ایضا)۔

۴-رضا کارانہ طور پر کسی غیر ملک کی شہریت حاصل کرنا:

دستور کے آرٹیکل ۹ کے تحت مذکور ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے کسی غیر ملک کی شہریت اختیار کر لیتا ہے تو اسے آرٹیکل ۶ یا ۸ کی مندرجات کے تحت ہندوستانی شہری نہیں سمجھا جائے گا، لہذا ان مندرجات سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی ہندوستانی دہری یا تکثیری شہریت کا حامل نہیں ہوگا، بہر حال یہ آرٹیکل ۱۱ کے تحت یہ پارلیمنٹ کے اختیار میں ہے کہ دیگر امور کے علاوہ خصوصی شہریت کی بابت بھی کوئی فیصلہ کرے، لہذا آرٹیکل ۹ کا اطلاق صرف ان کیسوں پر ہوگا جہاں دستور ہند کے نفاذ سے قبل (اس کے بعد نہیں) غیر ملکی شہریت اختیار کر لی گئی تھی۔

اس کے بعد پیش آنے والے کیسوں پر ہندوستانی شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ کی دفعات کے مطابق کارروائی عمل میں آئے گی۔

۵-شہریت کا حق برقرار رکھنا:

آرٹیکل ۱۰/ میں مذکور ہے کہ کوئی بھی شخص اوپر مندرجہ آرٹیکل ۵-۱۰ کے تحت ہندوستان کا شہری ہے یا اسے ہندوستانی شہری سمجھا جاتا ہے وہ ہندوستانی شہری ہی سمجھا جاتا رہے گا، بشرطیکہ پارلیمنٹ کے ذریعہ بنائے گئے متعلقہ قوانین کے تقاضے پورے ہوتے ہوں، بالفاظ دیگر پارلیمنٹ کے ذریعہ واضح قانون سازی کے بغیر کسی شخص سے اس کی شہریت کا حق چھینا نہیں جا سکتا۔

۶-پارلیمنٹ قانون کے ذریعہ شہریت کے حقوق کا ضابطہ بنائے گی:

اوپر مذکورہ مندرجات پارلیمنٹ کے اس اختیار کو ظاہر کرتی ہیں کہ وہ شہریت اختیار کرنے یا منقطع کرنے، نیز دیگر متعلقہ امور کی بابت قوانین مرتب کر سکتی ہے۔

قانون شہریت ۱۹۵۵:

دستور ہند کی مندرجات کے تحت صرف اتنا ہی بتایا گیا ہے کہ دستور کے نفاذ کے وقت ہندوستانی شہری کون ہیں، مگر اس تاریخ کے بعد شہریت اختیار کرنے والوں کے مسئلے پر کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے اور نہ دستور میں شہریت منقطع کرنے (آرٹیکل ۷ اور ۹ کے علاوہ) یا شہریت سے متعلق دیگر امور کے بارے میں کچھ کہا گیا ہے، آرٹیکل ۱۱ کے تحت واضح طور پر کہا گیا ہے کہ پارلیمنٹ ان امور کے بارے میں قانون سازی کرسکتی ہے، لہذا پارلیمنٹ نے قانون شہریت ۱۹۵۵ وضع کیا جس کے تحت ہندوستانی شہریت اختیار کرنے اور شہریت کی تشریح وتعبیر کی گئی ہے۔

قانون شہریت ۱۹۵۵ء کے تحت دستور کے نفاذ کے بعد ہندوستانی شہریت حاصل کرنے یا اس سے محروم ہونے کے بارے میں مندرجات ہیں، اس ایکٹ میں مندرجہ ذیل ایکٹ کے ذریعہ وقتاً فوقتاً ترامیم کی جاتی رہی ہیں:

۱- قانون شہریت (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۸۶ء

۲- قانون شہریت (ترمیمی) ایکٹ ۱۹۹۲ء

۳- قانون شہریت (ترمیمی) ایکٹ ۲۰۰۳ء

۴- قانون شہریت (ترمیمی) ایکٹ ۲۰۰۵ء

ابتداء میں قانون شہریت ۱۹۵۵ء میں دولت مشترکہ (کامن ویلتھ) شہریت کی گنجائش رکھی گئی تھی، لیکن شہریت (ترمیمی) ایکٹ ۲۰۰۳ء کے ذریعہ اسے منسوخ کردیا گیا۔

حصول شہریت:

قانون شہریت ۱۹۵۵ کے تحت حصول شہریت کے لئے ۵ طریقے درج کئے گئے ہیں، یعنی پیدائش، وراثت، رجسٹریشن، قومیت کے تحت لینا اور کسی علاقہ کا انضمام۔

۱- بذریعہ پیدائش: کوئی شخص جو ۲۶ر جنوری ۱۹۵۰ کو یا اس کے بعد میں (لیکن یکم جولائی ۱۹۸۷ سے قبل) ہندوستان میں پیدا ہوا وہ پیدائش کے اعتبار سے ہندوستان کا شہری شمار ہوگا، خواہ اس کے والدین کی قومیت کوئی بھی ہو۔

کوئی شخص جو یکم جولائی ۱۹۸۷ء کو یا اس کے بعد ہندوستان میں پیدا ہوا اسے صرف اسی صورت میں ہندوستان کا شہری مانا جائے گا جب اس کی پیدائش کے وقت اس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندوستانی شہریت کا حامل ہو۔

مزید ۳ر دسمبر ۲۰۰۳ء کو یا اس کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کو محض اس صورت میں ہندوستانی شہری مانا جائے گا جب اس کے والدین ہندوستان کے شہری ہوں یا والدین میں سے کوئی ایک ہندوستانی شہری ہو، اور پیدائش کے وقت دوسرا (شوہر/بیوی) غیر قانونی طور پر ہندوستان میں نہ آیا ہو۔

ہندوستان میں تعینات غیر ملکی سفارت کار یا دشمن ملک کے غیر ملکی پیدائش کی بنیاد پر ہندوستانی شہریت حاصل نہیں کر سکتے۔

وراثت (اخلاف) کے ذریعہ شہریت:

جو شخص ۲۶ ؍جنوری ۱۹۵۰ء کو یا اس کے بعد، لیکن ۱۰ ؍دسمبر ۱۹۹۲ء سے قبل کسی غیر ملک میں پیدا ہوا ہو تو اگر اس کی پیدائش کے وقت اس کا باپ ہندوستانی شہری تھا تو وہ شخص بھی ہندوستانی مانا جائے گا۔

جو شخص ۱۰ ؍دسمبر ۱۹۹۲ کو یا اس کے بعد ہندوستان سے باہر کسی بھی ملک میں پیدا ہوا تو اگر اس کی پیدائش کے وقت اس کے والدین میں سے کوئی ایک ہندوستانی شہریت کا حامل تھا تو ایسا شخص بھی ہندوستانی شہری ہوگا۔

۳ ؍دسمبر ۲۰۰۴ء کے بعد اگر کوئی شخص ہندوستان سے باہر کسی ملک میں پیدا ہوا تو اسے وراثت کے ذریعہ ہندوستانی تسلیم نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس کی پیدائش کے ایک سال کے اندر اس کی پیدائش کا اندراج ہندوستانی قونصل کے یہاں نہیں کرالیا جاتا، یا اس مدت کے ختم ہو جانے پر مرکزی حکومت کی اجازت سے یہ کاروائی نہ کرالی گئی ہو، ایسے بچے کے رجسٹریشن کے لئے درخواست کے فارم پر جو قونصل کے وہاں پیش کی جائے گی اس بچے کے والدین کو تحریری طور پر یہ بیان بھی داخل کرنا ہوگا کہ ان میں سے کسی کے پاس غیر ملکی پاسپورٹ نہیں ہے۔

۳- رجسٹریشن کے ذریعہ (حصول شہریت) مرکزی حکومت ایک درخواست موصول ہونے پر کسی شخص کو بطور ہندوستانی شہری رجسٹریشن کر سکتی ہے (بشرطیکہ وہ غیر قانونی طور پر ہندوستان میں داخل نہ ہوا ہو) اور مندرجہ ذیل میں سے کسی ایک زمرہ کے تحت آتا ہو۔

(الف) ہندوستانی نسل کا کوئی شخص جو شہریت کی درخواست دینے کی تاریخ سے سات سال تک ہندوستان میں مقیم رہا ہو۔

(ب) ہندوستانی نسل کا وہ شخص جو غیر تقسیم شدہ ہندوستان سے باہر کسی ملک یا مقام پر مقیم ہو۔

(ج) جس شخص نے کسی ہندوستانی سے شادی کی ہو اور رجسٹریشن کی درخواست دینے سے قبل وہ سات سال تک یہاں مقیم رہا ہو۔

(د) ہندوستانی شہریوں کے نابالغ بچے۔

(ھ) پوری عمر اور صلاحیت کا وہ شخص جس کے والدین کا بطور ہندوستانی شہری رجسٹریشن ہوا ہو۔

(و) ایک بالغ اور باصلاحیت شخص جو یا اس کے والدین میں سے کوئی ایک پہلے آزاد ہندوستان کے شہری ہوں او رجسٹریشن کی درخواست دینے سے فوراً قبل وہ ایک سال تک یہاں مقیم رہا ہو۔

(ز) ایک بالغ اور با صلاحیت رصحت مند شخص جس کا پانچ سال تک بطور سمندر پار رہنے والے ہندوستانی کی حیثیت سے اندراج ہوا ور رجسٹریشن کی درخواست دینے سے قبل ایک سال تک یہاں مقیم رہا ہو۔

(الف) وہ رجسٹریشن کی درخواست دینے سے فوراً قبل پورے ۱۲ رمہینے تک یہاں مقیم رہا ہو۔

(ب) ان ۱۲ مہینوں سے قبل آٹھ سال کے عرصہ میں وہ یہاں مقیم رہا ہو اور یہ مدت کم از کم ٦ سال ہونی چاہئے۔

اس شخص کو ہندوستانی نسل کا سمجھا جائے گا جو یا اس کے والدین میں سے کوئی ایک متحدہ ہندوستان میں پیدا ہوئے یا اس علاقہ میں پیدا ہوئے ہوں جو ۱۵ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان کا حصہ بن گئے۔

مندرجہ بالا زمروں کے تحت درج تمام افراد کو بطور ہندوستانی رجسٹرڈ کئے جانے سے قبل وطن سے وفاداری کی بابت ایک حلف نامہ پر دستخط کرنا ہوں گے، حلف نامہ کے فارم کی عبارت درج ذیل ہے:

میں اے ربی.................صدق دل سے اقرار کرتا ہوں (قسم کھاتا ہوں) کہ میں دستور ہند میں جیسا کہ از روئے قانون ثابت ہے میں عقیدہ رکھوں گا اور اس کا وفادار رہوں گا اور یہ کہ میں ملک کے قانون کی پابندی کروں گا اور بطور ہندوستانی شہری اپنے فرائض کو پورا کروں گا۔

۴-قومیت دیئے جانے کے ذریعہ رجسٹریشن:

مرکزی حکومت کسی شخص کی جانب سے درخواست آنے پر بشرطیکہ وہ غیر قانونی پر یہاں مقیم نہ ہو، قومیت کا سرٹیفکٹ عطا کر سکتی ہے، اگر وہ مندرجہ ذیل شرائط پوری کرتا ہے۔

الف-کسی ایسے ملک کا باشندہ نہ ہو جہاں ہندوستانیوں کو قومیت کے ذریعہ اس ملک کا شہری یا باشندہ بنانے کی ممانعت ہو۔

ب-وہ جس ملک کا باشندہ ہے اسے اس کی درخواست منظور کئے جانے سے قبل یہ عہد نامہ پیش کرنا ہوگا کہ اس نے اس ملک کی قومیت کو ترک کر دیا ہے۔

ج-یہ کہ وہ یا تو ہندوستان میں مقیم ہے یا یہاں سرکاری ملازمت میں ہے یا جزوی طور پر ان میں سے کسی ایک پوزیشن میں قومیت کی درخواست پیش کرنے کی تاریخ سے ۱۲ ماہ تک وہ یہاں مقیم رہا ہے۔

د-یہ کہ ۱۲ رماہ کی مدت سے قبل ۱۴ رسال تک وہ یہاں مقیم رہا ہے یا حکومت ہند کی ملازمت میں رہا ہے یا ان میں سے کسی ایک پوزیشن میں رہا ہے، یہ اعلان شدہ مدت مجموعی طور پر ۱۱ سال سے کم نہیں ہونی چاہئے۔

ھ-یہ کہ وہ اچھے کردار کا حامل ہو۔

الف-یہ کہ اسے دستور ہند میں درج آٹھویں شیڈول کے تحت کسی زبان سے واقفیت ہونی چاہئے۔

ب- یہ کہ اسے قومیت کا سرٹیفکٹ دیئے جانے کی صورت میں وہ ہندوستان میں سکونت کا ارادہ رکھتا ہو، یا اگر وہ حکومت ہند کا ملازم ہے تو یہ ملازمت جاری رکھے یا سرکاری ملازمت اختیار کرے یا کسی ایسی بین الاقوامی تنظیم میں ملازم ہو جس کا ہندوستان ایک رکن ہے یا کسی ایسی سوسائٹی یا کمپنی کا ادارہ میں ہو جو ہندوستان میں قائم کی گئی ہو۔

بہرکیف اگر حکومت ہند چاہے تو وہ کسی ایسے شخص کے لئے جس نے سائنس، ادب، فلسفہ میں بیش بہا خدمات انجام دی ہوں امن عالم اور انسانی بہبود کے لئے اہم کام کیا ہو مذکورہ بالا شرائط میں سے کسی ایک یا جملہ شرائط سے مستثنیٰ قرار دے سکتی ہے۔

قومیت اختیار کرنے والے ہر شخص کو دستور ہند سے وفاداری کا عہد کرنا ہوگا۔

۵- کسی علاقہ کو شامل کئے جانے کے ذریعہ:

اگر کوئی بیرونی علاقہ ہندوستان کا حصہ قرار پاتا ہے تو حکومت ہند اس علاقہ کے انضمام کے ساتھ اس علاقہ کے باشندوں کو بھی ہندوستانی شہری قرار دے گی یہ لوگ مشتہر کئے جانے کی تاریخ سے ہندوستانی شہری تسلیم کئے جائیں گے، مثال کے طور پر جب پانڈیچیری ہندوستان کا حصہ بن گیا تو حکومت ہند نے شہریت (پانڈیچیری) آرڈر ۱۹۶۲ء جاری کیا جو شہریت ایکٹ ۱۹۵۵ء کے تحت جاری کیا گیا تھا، قانون شہریت ۱۹۵۵ء کے تحت شہریت منقطع کئے جانے کے طریقے بتائے گئے ہیں یہ شہریت خواہ ایکٹ کے تحت حاصل کی گئی ہو یا دستور کے تحت اس سے قبل لی گئی ہو، مثلاً شہریت ترک کرنا منقطع کرنا یا جلاوطن کر دینا۔

۱- شہریت ترک کرنا: کوئی بالغ باشعور ہندوستانی شہری اپنی ہندوستانی شہریت ترک کرنے کا اعلان کرسکتا ہے اس اعلان (ڈیکلریشن) کے رجسٹر کئے جانے کے بعد وہ شخص ہندوستان کا شہری نہیں رہے گا، لیکن اگر ایسا ڈیکلریشن کسی جنگ کے دوران کیا گیا جس میں ہندوستان ایک فریق ہو تو مرکزی حکومت ایسے ڈیکلریشن کو رد کرسکتی ہے۔

مزید یہ کہ جب کوئی شخص اپنی ہندوستانی شہریت ترک کرتا ہے تو اس کے نابالغ بچے بھی ہندوستانی شہریت سے محروم ہو جائیں گے، لیکن ۱۸/ سال کی عمر کو پہنچنے کے بعد یہ بچے ہندوستانی شہریت اختیار کرسکتے ہیں۔

۲- انقطاع کے ذریعہ:

اگر کوئی شخص رضا کارانہ طور پر اپنی مرضی سے بلا کسی جبر، دباؤ اثر یا جان بوجھ کر، شعوری طور پر ہندوستانی شہریت ترک کرتا ہے تو اس کی شہریت خود بخود ختم ہو جائے گی، لیکن اگر کسی جنگ کے دوران جس میں ہندوستان شریک ہو ایسا اقدام کیا جائے تو اس پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا۔

۳-محروم کئے جانے کے ذریعہ:

یہ مرکزی حکومت کی جانب سے جبری اقدام ہے

الف-اگر کسی شخص نے فریب کاری کے ذریعہ شہریت حاصل کی ہو۔

ب-شہری نے دستور ہند سے عدم وفاداری کا مظاہرہ کیا ہو۔

ج-اگر جنگ کے دوران شہری نے دشمن سے لین دین یا رابطہ قائم کیا ہو۔

د-اگر شہریت یا قومیت کے رجسٹریشن کے پانچ سال کے اندر اس شہری کو کسی بھی ملک میں دو سال کی قید ہوئی ہو۔

ھ-اگر وہ شہری سات سال سے زیادہ مدت تک عموماً ہندوستان سے باہر ہی مقیم رہا ہو (اس شرط کا اطلاق طالب علموں، حکومت ہند کے ملازمین اور کسی بین الاقوامی تنظیم میں کام کرنے والوں پر جس کا ہندوستان بھی ایک رکن ہے نہیں ہوگا، یا وہ ہر سال ہندوستانی قونصل کے دفتر میں اپنے اس ارادہ کی اطلاع دیتا ہے کہ وہ ہندوستانی شہریت پر برقرار رہے گا)۔

اکہری شہریت:

ہندوستان کا دستور وفاقی ہے، اس میں دوہرا نظام حکومت دکھایا گیا ہے (مرکزی اور ریاستی) لیکن شہریت صرف اکہری ہی ہے، یعنی ہندوستانی شہریت، ہندوستان کے شہری انڈین یونین کے وفادار ہیں، یہاں ریاستی شہریت کا تصور نہیں ہے۔

کوئی کمپنی یا کارپوریشن شہری کی حیثیت کی حامل نہیں: کوئی کمپنی رجسٹریشن کے بعد قانونی حیثیت حاصل کرلیتی ہے، جو ممبران سے ممتاز ہے، لیکن اس کی حیثیت شہری کی نہیں ہے نہ دستور ہند کے تحت نہ ہندوستانی شہریت ایکٹ کے تحت (سنگل ٹریڈنگ کارپوریشن آف انڈیا اے آئی آر ۱۹۶۳) جو کمپنی انڈین کمپنی ایکٹ ازروئے قانون قائم شدہ کارپوریشن ہو اسی کو بطور شہری تسلیم کیا جائے گا (ایضا)۔

انڈین کمپنی ایکٹ یا اسٹیچوئری کارپوریشن کے طور پر رجسٹریشن کے بعد وہ ان بنیادی حقوق کو نافذ کرسکتی ہیں جن کی شہری یا غیر شہری کو ضمانت ہے، لیکن یہ کمپنی یا کارپوریشن ایک شہری کی حیثیت نہ رکھنے کی صورت میں ان بنیادی حقوق کو نافذ نہیں کرسکتیں جن کی شہریوں کے لئے ضمانت دی گئی ہے (ایضا)۔

مگر اب رجحان یہ ہے کہ عدالتیں ایسی کمپنی یا کارپوریشن یا ان کے حصہ دار یا حصہ داروں کی طرف سے دائر کردہ ایسی عرضیاں بھی برائے سماعت قبول کرلیتی ہیں جن میں ان بنیادی حقوق کو چیلنج کیا جاتا ہے جن کی دستور میں شہریوں کو ضمانت دی گئی ہے (برٹش......اے آئی آر ۱۹۷۰)۔

اسٹیٹسمین بنام حقائق معلوم کرنے والی کمیٹی (اے آئی آر ۱۹۷۵) میں حکومت ہند نے اخباری صنعت کی

اقتصادیات کی بابت حقائق معلوم کرنے کے لئے ایک کمیٹی تقرر کی تھی، اسے اسٹیٹسمین کی جانب سے جو کہ ایک کمپنی اور کمپنی کا شیئر ہولڈر ہے عدالت میں چیلنج کرنے کی کوشش کی گئی، ہائی کورٹ نے فیصلہ دیا کہ کمپنی کو بنیادی حقوق حاصل نہیں ہیں، لیکن شیئر ہولڈر کو ہیں لہذا مقدمہ سماعت کے لئے منظور کیا جاسکتا ہے، پریس اخبارات کے ذریعہ عوام تک رسائی حاصل کرتا ہے اور شیئر ہولڈر ایڈیٹر کے ذریعہ اپنی بات کہتے ہیں (بی ٹی آئی بنام یونین آف انڈیا اے آئی آر ۱۹۷۴)۔

اس حقیقت کے باوجود کہ کمپنی نے عدالت میں مقدمہ دائر کیا تھا، عدالت نے شیئر ہولڈروں کو راحت عطا کی۔

جب ایک ریاستی حکومت نے ایک بجلی کمپنی کو قومیانے (نیشنلائزیشن) کے لئے اقدام کیا تو کمپنی اور اس کے ایک شیئر ہولڈر نے اس اقدام کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا، شیئر ہولڈر کی درخواست آرٹیکل (۱۹)(۱) اور (بی) کے تحت منظور کر لی گئی، کیونکہ اس کے تحت اسے کمپنی کے ذریعہ کاروبار چلانے کا حق حاصل تھا اور کمپنی کی جائداد میں بھی وہ جزوی طور پر حصہ دار تھا اور کمپنی کو ریاستی اختیار کے تحت جانے سے اس کا خسارہ تھا (گولڈن الیکٹرک کمپنی بنام ریاست گجرات اے آئی آر ۱۹۷۵)۔

حکومت ہند نے ورکنگ جرنلسوں کی تنخواہ مقرر کرنے کے بارے میں ایک حکم جاری کیا کمپنی کے ایک شیئر ہولڈر نے اس حکم کے خلاف • حلف استغاثہ دائر کیا جسے آرٹکل ۱۹ (۱) ایف) کے تحت برائے سماعت منظور کر لیا گیا۔

اگر کمپنی کے وسائل پر بھاری مالی بوجھ ڈالا گیا تو اس سے شیئر ہولڈر کا نقصان ہوگا اور یہ ان کے حقوق میں دخل اندازی ہے، لہذا ایک شیئر ہولڈر نے آرٹیکل ۱۹ کے تحت اس حکم کو جائز طور پر چیلنج کیا (بی ٹی آئی بنام یونین آف انڈیا اے آئی آر ۱۹۷۴)۔

ان عدالتی فیصلوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ ایک تسلیم شدہ روایت بن گئی کہ حکومت کی جانب سے کسی مخالف اقدام کو متعلقہ کمپنی اور شیئر ہولڈر عدالت میں چیلنج کرتے ہیں اور ان بنیادی حقوق کا حوالہ دیتے ہیں جو صرف شہریوں کو دیئے گئے ہیں اسی طرح عدالت کے ایسے احکام کے خلاف بچاؤ کا ایک طریقہ پالیا گیا ہے جن سے انہیں نقصان ہوسکتا تھا۔

امرتسر میونسپلٹی بنام ریاست پنجاب کے مقدمہ میں (اے آئی آر ۱۹۶۹) عدالت نے فیصلہ دیا کہ میونسپلٹی آرٹیکل ۱۹ کی مندرجات کے تحت شہری کی تعریف میں نہیں آتی۔

دستور کی مندرجہ بالا مندرجات اور ایکٹ کی بنیاد پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ شہریت سے متعلق قانون ہے، اچھا ہے، لیکن اس کا نفاذ امتیازی نوعیت کا ہے، گذشتہ کئی دہائیوں سے یہ دیکھا گیا ہے کہ ہندوستان کے مسلم شہریوں کو ان حقوق اور مراعات سے محروم رکھا جاتا ہے جو دیگر ہندوستانی شہریوں کو عطا کئے گئے ہیں۔

☆☆☆

کسی مسلم ریاست کی شہریت: مسائل وچیلنجز

ڈاکٹر سیف الدین عبدالفتاح

زیرنظرعنوان جن الفاظ سے مرکب ہے ان پرغور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہم جس مسئلہ پر اس وقت گفتگو کرنے جارہے ہیں وہ کئی عناصر سے مرکب اوران کا آمیزہ ہے، یہ عناصر ان تین الفاظ میں جلوہ گر ہیں:

۱-شہریت، ۲-ریاست، ۳-مسلم، اس پہلو سے غور کریں توان مسائل کی بنیاد یہ ہے کہ شہریت کا تصوران مغربی افکاروتصورات میں سے ایک ہے جن کو پوری دنیا میں تسلیم کرلیا گیا ہے، اوراب وہ اپنے مغربی تہذیبی پس منظر کے اسیر نہیں رہے ہیں، دوسرا لفظ بھی ایک مغربی صورت حال سے مربوط ہے، یہ صورت حال الگ الگ طرح کے ملکوں میں قومی ریاست ،اس کے تقاضوں اوراس کے مسائل سے متعلق ہے(۱)۔ تیسرے لفظ کا تعلق مسلم یا اسلامی کے وصف سے ہے، اس سیمینار کے منتظمین نے مسلم کی صفت کو اصل صفت کے طور پر ذکر کر کے بہت اچھا کیا کہ یہ صفت ایک بہت اہم کیفیت کی تعبیر ہے، یعنی عالم اسلام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس بات کا ادراک کرے کہ وہ اس وقت ایک ایسے زمانہ سے گزر رہا ہے جس میں رجحانات مسلسل تغیر پذیر ہیں، اس لئے ہمیں اس پہلو کو سامنے رکھتے ہوئے طرز عمل اختیار کرنا چاہئے اوراس کی روشنی میں ایک نقطۂ نظر طے کرنے کے بعد غوروفکر کا منہج ترتیب دینا چاہئے۔

یعنی ہمیں ایک ایسا بہت اہم مسئلہ درپیش ہے جس کے نتائج ہمیں اسلام ومغرب کے درمیان پائی جانے والی فکری کشمکش میں، قومی ریاست کے تصور میں اور مسلم دنیا کے موجودہ حالات میں نظر آتے ہیں، اس حوالہ سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ اصل مسئلہ کی نوعیت کی تعیین کرنا ہمارے لئے لازم ہے، اورتعیین کے اس عمل میں حالات ومسائل کے صحیح فہم کے ساتھ ساتھ تعیین مناط کا بھی کام کرنا ہے، کشمکش، قومی ریاست اور مسلم دنیا کے درمیان پائے جانے والا یہ ربط عملی طور پر ایسے مرکب مسائل وجود میں لاتا ہے جو ایک ایسے واضح منہجی نظریہ کے متقاضی ہیں جو غوروفکر اور عمل کے طریقہ ہائے کار کی تعیین کریں، اس حوالہ سے سب سے اہم بات یہ ہے کہ ہم مقاصدی اجتہاد کو اس مرکب مسئلہ پر غوروفکر کرنے کے لئے بنیادی طریقہ بنائیں(۲)، اس لئے کہ مقاصدی اجتہاد ظاہری امور سے آگے بڑھ کر حقیقی صورت حال اور متوقع انجام کے ہر پہلو پر غور کرتا ہے، اسی لئے یہ منہجی ، بنیادی مسئلہ ہمارے لئے یہ لازم کرتا ہے کہ ہم شہریت سے متعلق مسائل پر قومی ریاست کے پس

منظر میں اور مسلم دنیا کی اسلامی مرجعیت کا خیال رکھتے ہوئے غور کریں، اس کام کے لئے ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ہم موجودہ حالات و درپیش مسائل کے تئیں رویہ اختیار کرنے کی بابت غور وفکر کے مناہج ترتیب دیں، اس لئے کہ اس غور وفکر میں تمام حالات کے اجمالی حکم کے ساتھ ساتھ مقام، زمانہ یا فرد کے اعتبار سے وجود میں آنے والے گونا گوں جماعتوں پر نظر رکھی جاتی ہے۔

شہریت سے متعلق بہت سے گہرے مسائل واشکالات سامنے آتے ہیں، ان میں سب سے اہم مسئلہ کی بنیاد وطن کے لئے وفاداری خالص کرنے اور تمام دیگر جزوی نسبتوں وتشخصوں پر اس کو مقدم کرنے پر ہے، ایک ہی وطن کے اندر آباد افراد کی مختلف نسبتوں کی وجہ سے باہمی اختلاف پایا جاتا ہے، اسلامی طرز فکر ونظر نے ایسے مختلف رجحانات کے درمیان پائے جانے والے اختلافات سے نپٹنے کے لئے ایک زبردست توازن وہم آہنگی کو وجود بخشا ہے، اس طرح شہریت کے حقوق اور اس کی حدود کی بابت اسلامی نظریہ مسلسل جدید سے جدید تر ہونے والے آفاق کا حامل ہے، لیکن ہمیں عصر حاضر میں مسلمانوں کے اندر وہ طرز فکر نہیں نظر آتا ہے جو ریاست اور جدید سیاسی معاشرہ کی اقداری نظریہ سازی کی تہ میں جا کر شہریت پر کلام کرے۔

لہذا ہمارے لئے یہ واجب ہے کہ ہم رسول اکرم ﷺ کی قائم کردہ ریاست سے استفادہ کریں، اس لئے کہ یہ وہ اسوہ ہے جس کا اتباع کر کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو شہریت کی حدود طے کرنی چاہئیں، نیز اس کو درپیش مسائل و چیلنجس کو عصر حاضر کے مزاج کے مطابق اسلامی طریقہ ہائے کار اختیار کر کے حل کرنا چاہئے، اسی اسوہ سے سبق حاصل کرتے ہوئے ہمیں شہریت کی صفات، اس کے پہلوؤں اور اس کی حقیقت کی تعیین کرنی چاہئے، نیز اس کی اہمیت ثابت کرنی چاہئے۔

اس کی روشنی میں ہم یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ: ''اس منہج نے شہریت کا ایک ایسا متوازن نظریہ پیش کیا ہے جو مسلم افراد کی مختلف نسبتوں پر حاوی ہے، اور اس میں اسلامی تشخص ونسبت، نیز اس کے لوازم کی ترجیح پر آنچ بھی نہیں آئی ہے(۳)''۔

یہ کیفیت اس زندہ مسئلہ کی جانب اشارہ کرتی ہے جو شہریت اور دین، شہریت اور دیگر نسبتوں، شہریت اور اس کے سیاسی پہلو، شہریت اور ان مغربی افکار کے درمیان تعلق سے متعلق ہے جو شہریت کو خود ایک مستقل بالذات نظام کے طور پر دیکھتے ہیں، اب ہمیں اس اصطلاح کی ایک ایسی تعریف کرنی ہوگی جو اسلامی نظریہ کے مطابق ہو اور اس انسانی وتہذیبی پس منظر میں ہو جو قومی ریاست کو مختلف ممالک کے باہمی تعلق کی بنیاد کے طور پر دیکھتا ہے۔

اس موقع پر ہمیں عرب و مسلم دنیا میں ریاست کے مسئلہ پر بھی غور کرنا چاہئے،(۴) اس لئے کہ قومی ریاست کے موجودہ نظریہ وطریقہ ہائے کار نے بہت سے ماضی کے اجتہادات کو محل نظر بنا دیا ہے، فقہ واقع اور تحقیق مناط اس کے متقاضی

ہیں، اس سلسلے میں اصل بنیادی مسئلہ قومی ریاست کے تصور کا وہ منہجی مسئلہ ہے جو لازماً شہریت کے تصور اور اس کے نتائج پر اثر انداز ہوتا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ اس ریاست کے مسلم ہونے کا مسئلہ بھی سامنے آتا ہے جو شہریت اور قومی ریاست کے طرز عمل سے بیک وقت متعلق ایک منہجی مسئلہ کی تعبیر ہے، اس طرح یہ مسئلہ عالم اسلامی کو عصر حاضر میں درپیش ایک مسئلہ کی تعبیر ہے، یہ مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں عالم اسلامی میں دو نظریات پائے جاتے ہیں: ایک مغربی نظریہ، جو زمانہ کی غالب تہذیب کے زیر اثر غالب ہو رہا ہے، جبکہ دوسرا نظریہ تہذیب اسلامی کا ہے، اور وہ معاصر زندگی میں ان دونوں نظریات کے درمیان مشترک اقدار سے آگاہ ہونا چاہتا ہے (۵)۔

اسی لئے اس بابت ہمارا موقف چند ایسے حقائق سے عبارت ہونا چاہئے، جن کے ذریعہ ہم ایک ایسے منہجی طرز پر اشتراک کو ختم کرنے کے عمل کی بابت بنیادی موقف واضح کرسکیں جو اسلامی تہذیب میں شہریت کے تصور کی تشکیل کرسکے، اور پھر اسے قومی ریاست کے تصورات میں قابل عمل بنا سکے، نیز اس کے لئے ضروری اجتہادی وتجدیدی صلاحیتوں کو بروئے کار لا سکے، اس طرح ہم تین امور کی قید سے باہر آسکیں گے، ۱- مغربی افکار وتصورات کی نوعیت اور ان کے لازمے، ۲- وہ روایتی فقہ جو اپنے زمانوں سے متعلق تھی، ۳- ایسے حقیقی اسلامی نظریہ کے تحت شہریت کے تصور کو بروئے کار لانا جو جدید تصورات سے بے تعلق نہ ہو، اور ان تصورات کو مقاصدی اصولوں کی روشنی میں اسلامی طریقہ پر استعمال کرنے کے اصول بنانا، یہ مقاصدی اصول زندگی کے تغیرات اور اصول شریعت دونوں کی رعایت کرتے ہیں، یعنی یہ ایک مرکب (مختلف پہلوؤں کے حامل) کام کی انجام دہی اور ایک ایسے رویہ وموقف کی تشکیل ہے جو ان مسائل پر اصولی، سٹاٹیٹک اور ڈائینمک طور پر غور وفکر کرے، لہذا کسی مسلم ریاست میں شہریت کے مسئلہ پر صحیح وعمیق نظریہ کی تشکیل کے لئے متعدد موضوعات پر کلام ضروری ہے۔

درحقیقت ہمیں اس مرکب نظریہ پر گفتگو کرنے کے لئے شہریت کے مغربی تصور کو سامنے رکھ کر اس پر اسلامی یا غیر اسلامی نقطۂ نظر سے تنقیدی گفتگو کرنی ہوگی، دوسری بات یہ بھی ضروری ہے کہ ہم شہریت سے متعلق تمام تصورات کو معاصر سیاق میں اس طرح دیکھیں کہ وہ نبوی تجربہ سے ہم آہنگ اصول ومعانی کو مزید یقینی بنائیں، شہریت کی بابت صحیح نظریہ قائم کرنے اور سیاسی معاشرہ کی تعمیر کرنے کے لئے میثاق مدینہ ایک اہم بنیاد ہے، تیسری ضروری بات کلی مقاصدی نظریہ، قومی معاشرہ کے حقائق اور شہریت کے متعدد تصورات کی روشنی میں نظریۂ شہریت کی از سر نو تشکیل ہے، اس طرح ہم صرف اس نظریہ کی تشکیل کر کے اس کے تقاضوں کو روبہ عمل لا سکتے ہیں، اس کے عوامل کا استعمال کرسکتے ہیں، اور اس کے طریقہ ہائے کار کو برت سکتے ہیں، اس کلی نظریہ کے تحت شہریت کا تصور غور وفکر کے کلی مناہج، جزوی مناہج، درپیش حالات ومسائل کے تئیں رویہ اختیار کرنے کے مناہج کی بابت ایک امتحان وجانچ کی حیثیت رکھتا ہے، ساتھ ہی ان نظریات وان کے نتائج کو مستقبل کے

امکانات کے پس منظر میں دیکھنے کے چیلنجس سے بھی صرف نظر نہیں کرتے ہیں۔

۱-اجتہادی نظام اور تہذیبی فقہ کے اصول:

تہذیبی تعمیر، مقاصدی اجتہاد، اس کے عناصر وعمرانی وتہذیبی اصولوں پر توجہ دینا بھی بہت ضروری ہے، تاکہ امت کی جامعیت کی تجدید کا نظریہ قائم کیا جاسکے، تمام چیلنجس کا مقابلہ کرنے اور پالیسیز کو تشکیل دینے کے لئے امت کے متفق علیہ امور کے دائرہ میں امت کے اندر اتحاد پیدا کرنا نہایت ضروری ہے، امت کے درمیان انسانی وقومی بنیاد پر اتحاد قائم کرنے کا یہ کلی اصول ریاست کے نظام کو مستحکم کرنے کی ایک بنیاد ہے۔

شہریت کو معاصر اتحاد کا ایک اہم عنصر شمار کیا جاتا ہے، سسٹامیٹک اجتہاد جو طرز اجتہاد وجود میں لاتا ہے وہ شہریت کو ایک ایسے اجتہاد کے تحت لاتا ہے جو اتحاد، قومی معاشرہ، معاشرتی ہم آہنگی اور معاشرہ کو قابل اتحاد امور کے سلسلے میں متحد کرنے کی کوششوں کے سلسلے میں شہریت کو استعمال کرتا ہے۔

کلی وجزوی اور اصل وفرع کے درمیان تعلق قائم کرنا ایسے منہجی عمل ہیں جو جزوی کو کلی کے تحت رکھتے ہیں، اور اصل وفرع کے درمیان ربط قائم کرتے ہیں۔

فروع وجزئیات سے اعتنا اس طرح نہیں ہونا چاہئے کہ کلیات سے صرف نظر ہوجائے یا اصل میں نقص یا اس کا بطلان لازم آئے، کہ کلیات جزئیات پر حاکم ہیں اور فروع اصول سے وابستہ ہیں، یعنی اصول حاکم ہیں......لیکن تفصیلات کی حیثیت واجب کے مقدمات یا نتیجہ تک پہنچانے والے طریقوں کی ہے۔

اس طرح ہم اس اجتہاد پر غور کرسکتے ہیں جسے ہم منہجی اجتہاد کا نام دیتے ہیں، ''**ولكل جعلنا منكم شرعة ومنهاجا**......'' (سورۂ مائدہ:۴۸) منہج، منہاج، اور منہاجیت ایک عظیم کام ہے، اور اس کا مقاصدی اجتہاد سے ربط لازم ہے، کہ ہر مقصد اور ہدف کے حصول کا ایک طریقہ اور راستہ ہوتا ہے، ''**وإن هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله**'' (سورۂ انعام:۱۵۳) (یہ میرا سیدھا راستہ ہے، پس اس کا اتباع کرو، اور دیگر راستوں کا اتباع نہ کرو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹادیں گے)۔

ہمیں اس اجتہادی نظام کی سب سے زیادہ ضرورت اپنی زندگی ومعاصر دنیا کے ان پہلوؤں اور دائروں سے واقفیت کے سلسلے میں ہے: اشخاص، افکار، اشیاء، واقعات، رموز، سسٹمس، تصورات، مہارتیں، نمونے، طرز ہائے عمل، پیش قدمیاں، ادراکات، چیلنجس، جوابات، پالیسیاں، تہذیبی تشکیل، تہذیبی ڈھانچے، ثقافت اور عقل وفکر کے گوشے، ترقی، عزم، ذمہ داری کی ادائیگی، تیاری، خوش حالی وتنگ دستی، طاقت وکمزوری نیز غلبہ ومغلوبیت کے درمیان مشترکہ پہلو، تعلقات، پالیسیاں، ادارے، متبادل موقف، احکام، نظریات، اقدار، اخلاق، مناہج، منظم غور وفکر، سیاست، معیشت، سماجیات، تربیت،

ثقافت وفکر کے مختلف میدان، افراد، معاشرتی ڈھانچہ وفکر وتحریک۔

ان مذکورہ بالا امور سے اجتہاد سے وابستہ امور اور وہ تجدیدی اعمال مربوط ہوتے ہیں جو تہذیبی عمرانیات کی ترغیب دیتے ہیں، نیز یہ امور بھی متعلق ہوتے ہیں: اسباب ومسببات، وسائل، ذرائع، قواعد، ادارے، وسائط، رکاوٹیں، آسان بنانے والے امور، بین الاقوامی نظام، بین الاقوامی تعلقات، سیاسی نظام، داخل وخارج، شرکت، قانونیت، قیادت اجتماعی تحریکوں، سیاسی طاقتوں اور شہریت سے متعلق کارروائیاں، تاریخی، نفسیاتی اور فکری نمونے۔

یہ متنوع، پیچیدہ اور تغیر پذیر امور ہیں، کیا ہم ان تمام امور کو معتبر مان کر ان کی حقیقت، نوعیت، ان کے ارتقاء ان کے اثرات، انجام اور مستقبل کو سمجھیں گے، یہ تمام عناصر ان اسٹریٹیجک نظریات کے تحت آتے ہیں جو ہمیں مقاصدی اجتہاد تک پہنچاتے ہیں، یہ مقاصدی اجتہاد عمرانی، اسٹریٹیجک اور تہذیبی فقہ کے اصولوں کے تحت تہذیبی واسٹریٹیجک تعمیر کی ضروریات ہیں، یہ فقہ قومی ریاست اور عالمی سیاست کے منظرنامے میں امت کو متحد کرے گی اور اسے انتشار سے محفوظ رکھے گی (۶)۔

۲-شہریت کے مطالعہ کے لئے ایک محفوظ منہج ہے:

سیاق کے نظریہ اور شرعی احکام پر اس کے اثرات کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ ضرور جاننا چاہئے کہ سیاق کا اجتہادی عمل کی ایک اہم شرط ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ سیاق سے مراد صرف عبارت سے مراد وہ اسلوبی سیاق نہیں ہے جو لغوی واسلوبی سیاقوں کے تحت کسی عبارت کے علمی فہم کے اصولوں سے عبارت ہے، سیاق اس سے بہت زیادہ وسیع تصور ہے، یہ حالات ومسائل اور ان کے تمام دروبست سے متعلق سیاقوں سے عبارت ہے، اسی لئے سیاق اپنی دلالت کے تحت کلی واقعات سے متعلق فقہ پر دلالت کرتا ہے، جیسا کہ ابن قیم نے لکھا ہے۔ اسی لئے ہم اس تصور سیاق پر توجہ مبذول کرتے ہیں جسے ہم مقاصدی اصولوں کے سیاق کہہ سکتے ہیں، یہ تصور باہم مربوط مفردات کو منظّم کرکے نظریۂ سیاق کو مکمل کرتا ہے، اور ایسے متعدد سیاق تشکیل دیتا ہے جو باہم معاون ہوتے ہیں اور متعدد عناصر کی وضاحت کرتے ہیں، ان کے علاوہ کچھ اور سیاقوں کو تہذیبی فقہ کے اصولوں کے سیاقوں کا نظام تشکیل دیتا ہے، پھر یہ تمام سیاق مل کر تین عناصر کو وجود بخشتے ہیں، یہ عناصر اعتنا وتوجہ کے اس مثلث کو وجود میں لاتے ہیں جو سیاقوں کے نظریہ کو روبہ عمل لاتے ہیں، اور پیہم عمل کے ذریعہ ان کے ضامن ہوتے ہیں، یہ مثلث تین کاموں پر توجہ دیتا ہے:

۱-تاصیل، ۲-تفعیل، ۳-تشغیل۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ان تینوں کاموں کے درمیان ربط نظریہ سیاق کے وسیع ہونے سے پیدا ہوتا ہے، یہ نظریہ ان کاموں کے ذریعہ ایسے باہم معاون سیاق وجود میں لاتا ہے جو ایک دوسرے کا سبب بن کر ایک ایسا معیار بناتے ہیں جو علم

وآگہی کے عناصر اور محنت وکاوش کے مقاصد تشکیل دیتے ہیں، یہ عناصر ومقاصد درج ذیل ہیں:

۱- سیاق محل سے متعلق، ۲-سیاقِ ترجیح سے متعلق، ۳-سیاق حفاظت سے متعلق، ۴- سیاق معیارات سے متعلق، ۵۔ سیاق مناط سے متعلق، ۶۔ سیاق حال واعتدال سے متعلق، ۷- سیاق انجام سے متعلق، ۸- سیاق وسائل سے متعلق۔

یہ سات محکم عناصرِ علم ومقاصدِ کاوش ہیں، جو مذکورہ بالا باہم معاون سیاقوں سے وجود میں آتے ہیں، اور ان میں شریعت ایک سیاق میں اور ایک سطح پر ایک اکائی کی صورت میں نظر آتی ہے، یہ فقہ کے معانی کی تاصیل کرتے ہیں، اور مناط عمل کا پتہ دیتے ہیں۔

ان آٹھ امور کی دریافت شریعت کے درمیان وصل اصل سے ہوتی ہے، اس لئے کہ شریعت اپنے علمی ڈھانچہ کے اعتبار سے حکمت، اقداری نظام کے اعتبار سے عدل، اپنے سلوکی نظام کے اعتبار سے رحمت، اور ایسی مصلحت ہے جو مقاصد وغایات کے نظام کو مؤکد کرتی ہے، اس طرح شریعت ان کلیات کے ذریعہ سیاق کے اعتبار اور اس کی رعایت کو لازمی بناتی ہے (۷)۔

اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی احکام کے نفاذ کے لئے ایک دوسرے مختلف منہج کی ضرورت ہے، جو ایک ایسی تطبیقی فقہ پر مبنی ہو جس کا ہدف صرف دین کے حقائق پر لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے اس کی تشریح کرنا نہیں ہو، بلکہ اس کا ہدف ان حقائق کے لئے راہ ہموار کرنا ہو، تاکہ یہ لوگوں کی زندگی میں جاری نظر آئیں۔

۳-تصورِ شہریت کی تشکیل، اسلامی نقطۂ نظر:

اس عنوان کے تحت ہم بنیادی تصورات کی مختصر تشریح کر کے مقاصد کی روشنی میں ان کے باہمی ربط پر گفتگو کریں گے، یہ تصورات یہ ہیں: مناط (یا علت)، اس کے جیسے دیگر تصورات مثلاً حکمت، مصلحت، قدر، مقصد، نیت، مناطِ عمل کا تعارف: تخریج، تحریر، تنقیح، تحقیق، اس مناط کا نص وحکم شرعی سے تعلق۔

پھر ان امور کی وضاحت کی جائے گی: نظریۂ مناط اور مقاصد شریعت سے اس کا تعلق، مناط اور حکم کا سیاق سے تعلق، ان سب میں سب سے معتبر وغیر معتبر، ان دونوں کے درمیان پایا جانے والا سیاقِ مرسل، یہاں ہمارا مقصد مناہج ہیں مسائل نہیں، اسی طرح ہمارے مقصود بنیادی تصورات ہی ہیں، اس لئے کہ مناط نص کے دائروں کا مرکز ہے، اس کے بعد جزوی حکم کا نمبر آتا ہے، پھر سب پر حاوی سیاق کا، جو کہ شریعت کی حکمتوں، اس کے مقاصد واقدار، نیز مخلوق کے عام وخاص مصالح سے متعلق ہے، منہج یعنی واضح سیدھا راستہ وہ ہے جسے ان دائروں کے درمیان تعلق کو محکم کرنا چاہئے۔

ہم نے مناط (یا علت) کو الگ مانا ہے، سبب، شرط ومانع کو (بطور وضعی احکام کی بنیادیں) الگ مانا ہے، مقاصد کو

الگ مانا ہے، اسی طرح حکمت، مصلحت اور قدر کو بھی جداگانہ حیثیت دی ہے، ایسا ہم نے مطالعہ وتجزیہ کی سہولت، تشریح، ضابطہ بندی اور تمیز کرنے کے پیش نظر کیا ہے، لیکن یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ یہ تمام امور باہم مربوط ہوگئے ہیں، ہاں ایسا عام طور پر فقہی عمل میں ہوا ہے، اصولی مباحث میں کم ہی ایسا ہوا ہے، اس پہلو پر ''اصول فقہ تہذیبی'' کو نگاہ رکھنی چاہئے، یہ علم کلی پر مرکوز رہتا ہے، مسائل کو کلیات کے تحت لانے پر، ان عناصر سے منہجی تاسیس کے طور پر ایک ہمہ گیر منظّم نظریہ کی تشکیل پر اور زیادہ گوناگوں خصوصیات کی حامل، نیز عصر حاضر کی پیچیدگیوں پر زیادہ حاوی عقل کی تشکیل پر بطور خاص توجہ دیتا ہے۔

فقہ الواقع کے اس سیاق میں (اور جیسا کہ ہم نے بھی ''واقع'' کی تعریف، زمانی ومکانی اعتبار سے اس کی ہمہ گیری اس کی انفرادی واجتماعی سطحوں، اس کے تمام تہذیبی عناصر، اور مواصلاتی ومعلوماتی انقلاب کے عناصر کی وجہ سے زبردست رابطہ کا تذکرہ کیا) یہ ضروری ہے کہ ہم فقہ الواقع کے اہم مراحل سے واقف ہوں:

فقہ الحال: وہ فقہ جو زمان ومکان کے پیدا کردہ اسباب کی وجہ سے درپیش صورت حال سے متعلق راہ عمل طے کرنے کے عوامل طے کرتی ہے، بین الاقوامی مسائل کی کثرت اور پوری دنیا پر ان کے اثرات کی وجہ سے ان مسائل کی بات سرگرم کردار فقہ الحال کے ذریعہ ہی ادا کیا جاسکتا ہے، اس پر گفتگو کو ضرورت کے وقت کے بعد کے لئے اٹھا کے نہیں رکھا جاسکتا ہے، اس فقہ کو وقت کے اہم ترین فرائض میں شمار کیا جاسکتا ہے۔

فقہ المجال: داخل وخارج کے درمیان اور ''واقع'' کے مختلف دائروں کے درمیان رابطہ کے دائرہ میں یہ سب سے وابستہ مرکز ہے۔

فقہ المآل: انجام (مآل) کا اعتبار ان شرعی مقصودات میں سے ہے جو تہذیبی عمل کے عناصر کی منصوبہ بندی نیز اس کی بابت غور وفکر اور تدبر کو ضروری قرار دیتے ہیں، اس حوالہ سے ''واقع'' ایک بے سروپا شی نہیں ہے، بلکہ وہ ایسے تہذیبی افعال کا مجموعہ ہے جس کے اوپر متعدد آثار ونتائج مرتب ہوتے ہیں، فقہ مآل مستقبل کو سامنے رکھ کر کئے جانے والے غور وفکر کا اولین مرحلہ ہے، جو امور کے انجام کی بابت غور وفکر کرنے کے عناصر کو محرک کرتا ہے۔

سیاقِ مآلات: مناطوں کا مطالعہ ایک جانب جزوی حکم سے اور دوسری جانب ''واقع'' سے متعلق ہے، فقہ واقع سے وصفی وتحریکی طور پر متعلق سیاق ان نہایت اہم عناصر سے متعلق ہوتا ہے جو مآلی سیاقوں سے مربوط ہوتے ہیں، سیاق مآل کا مطلب فعل پر مرتب ہونے والے آثار ونتائج اور افعال کے متوقع نتائج کی بابت تحقیق ہے، یہ تحقیق اس لئے کی جاتی ہے، تاکہ علوم تدبیر کے سیاقوں سے وابستہ اور مستقبل کو پیش نظر رکھ کر ایک موقف بنایا جائے۔

یہ مآلی سیاقات مجتہد کو حکم شرعی وجزوی کے بیان تک محدود نہ رکھ کر اس کے لئے ایسے بنیادی مقدمات تشکیل دیتے ہیں جن پر مآلی غور وفکر مبنی ہوتی ہے، تاکہ مکلّف حرج ومشقت میں مبتلا نہ ہوجائے، اس مآلی سیاق کا کام یہ ہے کہ وہ مجتہد کے

اجتہادی عمل میں مسلسل حاضر و موجود رہے، اسی طرح یہ سیاق مجتہد کے اندر ایسے علوم مستقبلیہ کو وجود میں لانے کی ضرورت کا احساس پیدا کرتا ہے جو تہذیبی فقہ کے اصولوں کے اندر ایک بنیادی اصول تشکیل دیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ہمیں ایک ایسے مجتہد کی ضرورت ہے جو جزوی غور وفکر کے ذریعہ ایک گہری فقہ، تہذیبی غور وفکر کے ذریعہ ایک دقیق فقہ، اور ایک ایسی منظّم فقہ کو وجود میں لاسکتا ہو جس میں جزوی عمل کے عناصر تہذیبی عمل کے ساتھ اس تہذیبی فقہ کے کلی اصولوں کے ذریعہ منظّم اور مربوط ہوں، یہ تہذیبی فقہ مجتہد کی ذہنیت اور عقلی صلاحیت کو امور بالا کے قابل بناتی ہے۔

یہ کام افراد و معاشروں کو درپیش چیلنجوں سے متعلق فقہ سے مربوط ہے، یہ فقہ افراد و معاشروں کے درمیان تربیتی، ثقافتی و تعلیمی سرگرمیوں کے ذریعہ ربط پیدا کرتی ہے۔

یہ فقہ غور وفکر کا ایک ایسا منہج تشکیل دیتی ہے جس کے مضامین اور مقاصد باہم مربوط ہوتے ہیں، یعنی ہم اس کے ذریعہ سیاق اصغر کی حدود سے باہر نکل کر سیاقِ اکبر کو اختیار کرسکتے ہیں، یہ عمل ایک ایسے سیاقی نظام کے تحت ہوتا ہے جو ان کلیات کو متحرک کرکے ان کے درمیان باہمی ربط قائم کرتا رہے گا، تاکہ ان کلیات کے تحت جزئیات بحسن وخوبی آجاتی ہیں۔

یہ مسئلہ صرف منظّم اور مربوط طور پر سیاق اکبر کی اہمیت ہی نہیں بتاتا ہے، بلکہ ہمارے نزدیک تصور سیاق ایسا بلند و بالا ہے کہ وہ مجتہد کے اجتہاد کو بیک وقت کلی تہذیبی نقطۂ نظر اور فقہی اجتہادی نقطۂ نظر سے ایک عمیق عمل بناتے ہیں۔

ان دونوں نقطہ ہائے نظر کے ایک ساتھ جمع ہونے سے ایک ایسا منہج وجود میں آتا ہے جو ان تعلیمی و تربیتی سیاقات سے متعلق بھی ہونا چاہئے، جو قول و عمل میں ہم آہنگی اور منہجی دائروں میں باہمی تعاون کا سبب ہوتے ہیں، یہ منہجی دائرے جزوی و کلی احکام میں اجتہاد کو سرگرم کرتے ہیں، اس پوری گفتگو کا مسلم ریاست کی شہریت سے کیا تعلق؟

۴-شہریت کے ایک ایسے تصور کی تشکیل جو قومی و اسلامی اتحاد کی حفاظت کرے:

ایسے طریقے اور وسائل استعمال کرنا لازمی ہیں جو امت کے اتحاد کو قائم رکھیں، اس فقہ کی رو سے وسائل تہذیبی و عمرانی فقہ کا ایک ایسا اہم باب ہیں جو دو اہم مقدمات تشکیل دیتے ہیں۔

پہلا مقدمہ چیلنجس کا مقابلہ کرنے سے متعلق ہے، جبکہ دوسرے کا تعلق ایسے وسائل سے ہے جو امت کی تشکیل میں معاون ہوتے ہیں، وسائل کی یہ قسم پچھلی قسم کے ساتھ مل کر امت کے لئے خیر کا باعث ہوتے ہیں۔

جن وسائل سے اعتنا لازمی ہے ہم انہیں امت کی ترقی و بیداری کے منصوبہ کے تحت تین باہم مربوط و معاون قسموں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

پہلی قسم منہجی وعملی وسائل سے عبارت ہے۔

دوسری قسم کا تعلق ان بنیادی امور سے ہے جو اس اتحاد کو مفاسد سے محفوظ رکھ کر مصالح سے بہرہ ور کر سکتے ہیں۔

وسائل کی تیسری قسم کا تعلق امت کے ذریعہ اپنی جزوی پالیسیز اور اپنے کلی منصوبوں کی بتدریج تنفیذ کی بابت امت کی صلاحیت سے ہے، اس کے ذریعہ جزوی وکلی کے درمیان ہم آہنگی پیدا ہوتے ہیں، اور ایسے اصول تشکیل پاتے ہیں جو فقہ الحال اور فقہ المجال سے متعلق اصولوں کو مربوط طریقہ ہائے کار کے طور پر وجود میں لاتے ہیں۔

باہم معاون صلاحیتوں اور موقفوں کی تشکیل کے لئے کوشش کرنا یا پالیسی بنانا امت کو درپیش چیلنجس کے صحیح طور پر جواب دینے کا ایک مقدمہ ہے، اسی لئے فنون اختلاف واتحاد کی یکساں تربیت کے سلسلہ میں ثقافتی وتربیتی عمل نہایت اہم ہے، اس لئے کہ اس طرح یہ فنون امت کو باہمی اختلاف سے نجات دلا کر جمع مصالح کی راہ پر ڈال دیتے ہیں، ''تعمیر مصالح'' ان مشترکہ اہم اہداف میں سے ایک ہے جن کا ثقافتی، تربیتی، اجتماعی، اقتصادی اور سیاسی بنیادوں پر مبنی ہونا ضروری ہے، اس لئے کہ اس کے نتیجہ میں ایک سرگرم تجدید وجود میں آتی ہے، اور امت کے لئے خیر، ترقی اور بیداری کا سبب بنتی ہے۔

تصور شہریت کی اصول سازی اور اس کو سرگرم کرنے کی تمام تر کاوشیں ایک ایسے اسٹریٹیجک تصور کے تحت ہونی چاہئے جو امت کے اتحاد اور اس کے سرگرم کردار کو یقینی بنائے، اسے ان صفات سے متصف کرے جو امت کی بیداری میں معاون ہوں، اسے عمرانی کاموں کے قابل بنائیں، جو مشترکہ مصالح کو اس کام کے لئے اس طرح متحرک کرے کہ جیسے یہ زمانہ کی ایک بڑی ضرورت ہے، اور اس کی تکمیل میں تمام ثوابت وکلیات کا التزام کیا جائے، ان ہی امور کی وجہ سے دینی خطاب کی بنیاد اور اس کے ظاہری ڈھانچے کی تجدید میں کلی اصولوں میں سے مقاصدی اصول کا استعمال ضروری ہے (۸)، بشرطیکہ تجدید کا یہ عمل ایک اسٹریٹیجک مقصد کے حصول کے لئے ہو، مثلاً امت کے اتحاد اور اس کے سرگرم کردار کو یقینی بنانا، اس تہذیبی اسٹریٹیجک کردار کی ادائیگی کے لئے وہ اپنے تہذیبی کردار اور مقام کی از سر نو تشکیل کرے، اس سیاق کے تحت شہریت ایک مرجع، ایک دافع، ایک نقطۂ اتحاد اور ایک تجدیدی عمل ہے۔

۵- مرجعیت کی تعریف اور شہریت سے اس کا تعلق:

مرجعیت سے مراد وہ عام ثقافتی وفکری اصول ہیں جن کے قائل تمام فرزندان وطن ہوں، اور جو ایک انسانی جماعت وگروہ کی حیثیت سے ان کے اندر بنیادی صلاحیت اتحاد پیدا کرتے ہیں، یہ وہ ثقافتی اور فکری اصول بھی ہیں جن سے سیاسی جماعتی جیسی عام جماعت یا ان فروعی جماعتوں کے سیاسی واجتماعی ڈھانچے تیار ہوتے ہیں جن سے معاشرہ ترتیب پاتا ہے (۹)۔

انسان عالم کا نظریہ اور مرجعی دائرہ: مرجعی دائرہ ان بنیادی نظریات اور افتراضات کے مجموعہ پر مشتمل ہوتا ہے جو

زندگی کی نوعیت، اس کے بنیادی پہلوؤں اور اس کے طریقۂ کار کا پتہ دیتا ہے، ان امور پر انسان یقین رکھتا ہے، یا انہیں مختلف تہذیبی ظواہر کے سلسلے میں مرجع اور مرشد بناتا ہے۔

اسی لئے مرجعی دائرہ انسان کے طریقۂ کار اور ظواہر کی تشریح کرنے والے سلوکی، اقداری، فکری و علمی نظاموں کی تحدید کرتا ہے، مرجعی دائرہ ہی انسان کو یہ بتاتا ہے کہ تہذیبی ظواہر پر غور وفکر کے سلسلے میں کون چیزیں اہم اور دلالت والی ہیں، اور کن کو اس دلالت و اہمیت کی ضرورت ہے۔

اس سلسلے میں ایک بنیادی حقیقت یہ ہے کہ ہمیں مرجعیت کے سلسلے میں وہ گفتگو کرنی چاہئے جو متبادر ہو، لیکن یہ گفتگو ایسی ہونی چاہئے کہ وہ انسان، کائنات اور زندگی، نیز ان سے پیدا ہونے والے تعلقات کا مکمل نظریہ سامنے لائے۔

مرجعی جماعت امت کو خیریت'' کا وصف، ''وسطیت'' کا منہج اور ''شہادت'' کا منصب وکردار دیتی ہے، یہ دیگر فرعی مرجعی جماعات کے منافی نہیں ہے اور نہ ان کی نفی کرتی ہے، بلکہ انہیں پوری امت کے نظام میں مناسب مقام دیتی ہے، اور اس کے بنیادی عناصر ''خیریت'' ''وسطیت'' اور ''شہادت'' سے متعلق کرتی ہے، مرجعی دلائل کا نظام ان مراجع ومصادر میں شامل ہے جن سے اس طور پر استفادہ لازمی ہے کہ نہ ان پر اکتفا کیا جائے اور نہ ان سے صرف نظر کیا جائے، بلکہ یہ ضروری کہ یہ تمام مصادا اپنے اس اہم ترین وصف کے حصول کے لئے کوشاں رہیں جو تقابل کے دائرہ میں اپنے غیر محدود سیاق سے متعلق ہوتے ہیں، اسی طرح وہ اعمال لازمی ہیں جو علم نافع کے عناصر اور معانی حکمت کے درمیان تمام سیاقوں میں تعلقات کو محکم کریں۔

یعنی اجرائی ترجمہ کے عناصر کے مطابق ادراک، اقدار، سلوک ومصالح کے نظاموں کا مرجع ہونے کے اعتبار سے مرجعیت ایک ہمہ گیر اور سرگرم فکر کی تعبیر ہے۔

اسی لئے مرجعیت کے وہ عناصر جو تاسیسی نظریات اور واقع ومرجعی وطنی جماعت کے اعتبارات نظام عام کے قواعد واصولوں، نیز زبان، رموز اور تمام ثقافتی عناصر کے تشکیل کردہ ثقافتی سیاقوں کے جامع ہوتے ہیں وہ ایک ایسی عمارت کے ستونوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس مرجعیت کے اصول اس وقت تشکیل دیتی ہے، جب یہ عناصر ہم آہنگ ومعاون ہوتے ہیں، یہ ستون اپنی شکل وصورت اور اپنے نتائج کے اعتبار سے گونا گوں ہوتے ہیں، لیکن ان ستونوں کے ذریعہ ہی انسان کی تہذیبی وعمرانی عمارت کی چھت بلند وبالا ہوتی ہے۔

یہ ستون اگرچہ اپنے ظاہر اور اپنی بنیاد کے اعتبار سے مختلف وگونا گوں ہوتے ہیں، لیکن اپنی حقیقت اپنے جوہر اور اپنے کردار کے اعتبار سے یکساں ہوتے ہیں، افراد امت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ امت کے اس اختلاف کو رحمت کا وہ اختلاف بنادیں جو عظیم وصحت مند تہذیبی وجود کے عناصر تشکیل دیتا ہے۔

۶-شریعت اسلامی اور شہریت......وطنی جماعت کی تاسیس کی کوشش:

شریعت وشہریت کے درمیان تعلق کا مسئلہ مرکب مسائل میں شمار ہوتا ہے، ایسا ان دونوں کے ایک سطح پر جمع ہونے کے اعتبار سے نہیں ہے، بلکہ اس اعتبار سے ہے جس میں شریعت وشہریت کے مسئلہ پر وہ بوجھ ڈالا جاتا ہے، جو اس کے بس کا نہیں ہوتا ہے، اس کے نتیجہ میں اس تعلق کی حقیقت کو ایسے نظریات کے ضمن میں تصور کیا جاتا ہے جو شریعت وشہریت کے درمیان تصادم مانتے ہیں، حالانکہ شریعت کا مسئلہ مرجعیت کے دائرہ اور عام نظام سے متعلق قواعد سے وابستہ ہے، جبکہ شہریت کا مسئلہ اس مرجعیت کی بنیادوں سے مربوط ہے جو اس واقعہ سے متعلق ہے جو تمام شہریوں کو ایک وطن اور ایک جیسی شہریت کی لڑی میں پرو دیتا ہے، یہ مرجعیت حقوق وذمہ داریوں میں عام مساوات کے قاعدہ کے تحت باہمی تعلق کے اصول ترتیب دیتی ہے۔

باہمی الفت، منافست اور تصادم کے دائروں میں شہریت وشریعت کے درمیان تعلق پر غور وفکر کے منہج کی تعین کریں، بعض حضرات کا خیال ہے کہ شریعت وشہریت دونوں ہم آہنگ ہیں، بعض حضرات کا خیال ہے کہ سیاسی عمل ان دونوں پر مشتمل نہیں ہے، اور ان دونوں کے الگ الگ میدان ہیں، جبکہ تیسرے گروہ کا خیال ہے کہ شریعت وشہریت دو بالکل جدا جدا چیزیں ہیں، چوتھا فریق کہتا ہے کہ شریعت وشہریت باہم متصادم ہیں، یہ درحقیقت استبدادی نظام کے ذریعہ امت کے مختلف حلقوں کے درمیان اخلافات پیدا کرنے اور اس اختلاف کو اپنے استبدادی مصالح کے لئے استعمال کرنے کی پالیسی کا نتیجہ ہے، اختلافات پیدا کرنا اور تصادموں کو مدد پہنچانا سیاسی استبدادی کی ایک سوچی سمجھی پالیسی ہے، جس کے ذریعہ وہ شہریوں، اور لوگوں کو درپیش ان حقیقی مسائل سے توجہ دیتا ہے جو ان کے حقوق سے متعلق ہوتے ہیں۔

شریعت سے متعلق بنیادی مبادیات کو اس عام وکلی نقطۂ نظر کے تحت ہی جانا جاسکتا ہے جو سب سے پہلے شریعت کے عام کلی مقاصد سے مربوط ہو اور دین (شریعت) وسیاست (شہریت) کے درمیان، نیز شریعت کے مبادی اور شہریت کی سیاسی جماعت (وطن کے تمام شہریوں) کے درمیان تعلق کی نوعیت واضح کرے، یہ نظریہ حقیقتوں اور ملمع سازیوں کے درمیان امتیاز کرتا ہے، اس کے مختلف پہلو اور رجحانات ہوتے ہیں، جن میں بہت سے احکام پائے جاتے ہیں، متعدد تعمیمات پائی جاتی ہیں، ان احکام وتعمیمات پر نظر ثانی کی ضرورت ہوتی ہے، مثلاً یہ کہ دینی امور کا سیاسی امور سے کوئی تعلق نہیں ہے، انسانی سماجیات کے سلسلے میں حقیقی وجوہری دینی تاثیر اور دین کو سیاسی رنگ دینے کے درمیان خلط ملط کرنا، شریعت پر عمل فرض ہے، یا اسے درکنار کردینا چاہئے، اقلیت اور گروہ بندیاں شریعت کی نظر میں، دستور: میدان کی یکسانیت، وسائل کی کشمکش اور تصور موازنہ۔

یہ تمام مسائل (بالخصوص اپنے غیر منظم ہونے اور اپنی غلط نمائندگی کئے جانے کی صورت میں) عام سیاق میں منفی

تضمینوں سے دوچار ہیں، جو ان جیسے بہت سے خیالات کا باعث بنتی ہیں، یہ سیاق ان امور کے سیاق میں ایجابی یا سلبی طور پر مؤثر ہوتا ہے جو وطنی جماعت اس کے اندر اتحاد کا سبب بننے والے اوامر اور اس کا شیرازہ منتشر کرنے والے امور پر غور وفکر میں معاون ہوتے ہیں، یہ ایک ایسا تاریخی سیاق وجود میں لاتا ہے جس پر غور وفکر کرنا اور جس کو نہایت باریک بینی، حساسیت اور زیرکی کے ساتھ برتنا لازمی ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس میڈیا کے سیاق اور اس رائج زبان کو بھی قابل اعتنا مانا جائے جس پر تہذیب مشتمل ہوتی ہے، اسی طرح ان تربیتی وتہذیبی اصولوں کے سیاق پر غور کرنا بھی ضروری ہے جو وطنی جماعت کی تاسیس اور اس کے فہم ونظریہ کی تشکیل کی شرطیں وجود میں لانے والے اس عمل سے متعلق ہوتے ہیں۔

اس مسئلہ سے اعتنا کرنے والے کچھ لوگوں نے فرقہ پرستی کا ایک ایسا علاج تجویز کیا ہے جو اس مسئلہ کے رائج پرامن علاج سے کم خطرناک نہیں ہے، ابھی تک فرقہ پرستی کے فتنہ کے حل کے لئے یہ پرامن علاج ہی پایا جاتا تھا، لیکن اب کچھ لوگوں نے ایک پرفتن حل تجویز کیا ہے جو مزید اشتعال کا سبب بنتا ہے، اسی لئے ہمارے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم امور کو ان کے حقیقی مقامات پر ہی رکھیں، دین میں بے جا دخل اندازی نہ کریں، مدد کے لئے اس طرح نہ اپیل کریں کہ جیسے ہم مذہب کی وجہ سے ادھر ادھر ہونے والی حق تلفیوں پر واویلا کر رہے ہوں، بہت سے مسائل وحادثات کا حل اس طرح ڈھونڈھا جانے لگا ہے جسے ہم پرفتن حل کہہ سکتے ہیں، یہ حل سماجی ومعاشی تعلقات کے دائرہ سے متعلق ہوسکتا ہے، اس میں دین کو کم مدتی راہ عمل کے ذریعہ داخل کیا جاتا ہے(۱۰)۔

۷-قانون بنیاد عام نظام کے اصول اور عام میدان:

عام نظام کا تصور علم قانون کے اساسی افکار میں سے ایک ہے، لیکن یہ ایک خالص قانونی تصور نہیں ہے، کہ علم قانون نے ہی اسے وجود بخشا ہو، اور اس میں ہی وہ منحصر ہو، بلکہ علم قانون کے علاوہ دوسرے انسانی علوم میں بھی وہ ہمیں ملتا ہے، علم قانون، علوم سیاسات، سماجیات ومعاشیات کے مشترکہ دائرہ میں یہ تصور محسوس ہوتا ہے، یعنی یہ تصور ان علوم کے معاشرہ وریاست کے اندر ایک قوتِ تاثیر ہونے کے ان کے باہمی ربط کی ایک کڑی ہے، عام نظام کے معاصر تصور کی تشریح کی جاتی ہے: وہ ''کسی بھی سماجی نظام کو ان امور سے محفوظ رکھنے کا سامان ہے جو اس کی بنیادوں کے لئے خطرہ ہوں، نیز وہ معاشرہ کے ذریعہ اپنے اہدافت کے حصول کی کاوش کا ایک ذریعہ قانون بھی ہے''۔

یہ بات تو یقینی ہے کہ نظام عام کا تصور مغربی تصور قانون کی پیداوار ہے، لیکن اس کے کردار اور اس کے مضمون پر غور وفکر سے اسے مختلف پہلو واضح ہوجاتے ہیں، معاشرہ کی بنیادی اقدار اس کی عقائدی مرجعیت، اور اس کی نظریاتی بنیادوں (جنہیں اصول وکلیات کے نام سے جانا جاتا ہے، اور جن پر کوئی معاشرہ اپنے راہ عمل کی بنیاد رکھتا ہے) کی حفاظت کی ذمہ داری کا کام شریعت اسلامی کے تصورات ونظریات بھی کرتے ہیں۔

عام میدان اور قبطیوں کا مسئلہ: دینی اداروں کے غلبہ سے ایک سوال اٹھتا ہے:

کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ دینی ادارے سیکولر نظریہ کے تحت عام میدان سے مکمل طور پر دور رہیں، معاملہ ایسا نہیں ہے، بہت سے دینی اداروں (یہاں تک کہ مغرب میں بھی) عام میدان (چہ جائیکہ سیاسی میدان میں) دخل رکھنے والی یونٹس بنائی ہے، مثلاً پولینڈ اور لاطنی امریکا کا کلید، یعنی مسئلہ ان اداروں کے عام میدان میں براہ راست طریقہ پر دخل اندازی کا نہیں ہے کہ کلیسا بھی دیگر اداروں کی طرح عام میدان اور عام خطاب سے لازماً مربوط ہوجائے اس سب سے واضح نمونہ کلیسا کے شعبوں کے بارے میں بار بار گفتگو ہونا اور فرقہ وارانہ فسادات کو سیاسی رنگ دینے کی کوششیں ہیں۔ اسی وقت یہ بھی ہوا کہ ریاست نے عام میدان سے متعلق ایک گوشہ سے دستبرداری اختیار کرلی، اس کی وجہ سے ایک خلا پیدا ہوا، اور چونکہ یہ معاملہ ایک ایسے نقطۂ نظر سے متعلق تھا جو قبطیوں کو ایک فرقہ یا اقلیت کی صورت میں دیکھتا تھا، اس لئے بعض اداروں نے اس خلاف کو پر کرنے کی کوشش کی۔

اس مسئلہ کے سلسلے میں غور وفکر کے جدا جدا اسلوب پائے جاتے ہیں، نیز خود عام میدان کی بابت بھی طرح طرح کے نظریات پائے جاتے ہیں، اس لئے کہ عام میدان کی بابت متعدد طبقات کے درمیان اختلاف رہا ہے، کلیسا بھی ان ہی میں سے ایک ہے۔

اس سیاق میں دیکھئے تو مصر میں قبطیوں کی سرگرمیاں اس پس منظر سے ہی متعلق ہیں، مگر چند سوالات واضح جواب کے منتظر ہیں، یہ سوالات بار ہا پیش کئے جاتے ہیں یا ان کی بابت سکوت اختیار کیا جاتا ہے، ہمیں ان سوالات کی بابت ایسا شفاف رویہ اختیار کرنا چاہئے، جو امت کے سماجی تانے بانے کے عناصر کے درمیان تعلق کی حقیقت واضح کرتے، ایسا مرجعیت کی بابت مندرجہ ذیل دو اصولوں کے تحت ہی ہوسکتا ہے، ان سے واقف ہونا ضروری ہے:

وطنی جماعت کی مرجعیت اور عام نظام کے وہ قواعد جو اسلامی تہذیب کو ایک محکم اصول بناتے ہیں۔ (عام تہذیب اور متنوع فرعی تہذیبوں کا اعتراف)۔

سیاسی عمل عام معاملہ، نیز حقوق وواجبات کے مسائل کی بابت شہریت کی مرجعیت، جو پورے وطن میں قومیت پیدا کرے۔

۸- ریاست کا قیام اور دستور مدینہ: مسلم ملک میں شہریت:

میثاق مدینہ میں واضح طور پر مدینہ میں قائم ہونے والی جدید اسلامی ریاست میں شہریت کی بنیاد اسلام کو بتایا گیا ہے، اس دستاویز میں قبائلی رابطہ کی جگہ دینی رابطہ کو دی گئی ہے، اسی لئے مسلمانوں کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ: ''دیگر لوگوں سے ممتاز ایک امت ہیں'' (۲/۴) اس عبارت نے تمام مسلمانوں کو ان کے قبیلوں اور خاندانوں سے صرف نظر کرکے

ایک امت بتایا گیا ہے، عربوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا یہ ایک بالکل نایاب معاملہ تھا، اس سے پہلے تک لوگ رشتہ ونسب کی بنیاد پر ہی جمع ہوتے تھے۔

مسلمانوں کی شہریت مدینہ میں مقیم مسلمانوں (وہاں کے اصل باشندوں اور مہاجرین) تک ہی محدود تھی، دوسرے اس میں داخل نہ تھے، کہ اللہ تعالیٰ نے فرمادیا تھا: ''**والذین آمنوا ولم یهاجروا مالکم من ولایتهم من شيء حتی یهاجروا وإن استنصروا کم فی الدین فعلیکم النصر الاعلیٰ قوم بینکم وبینهم میثاق**'' (انفال:۷۲) (جو لوگ ایمان تو لے آئے، مگر ہجرت کر کے نہ آجائیں، وہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جن سے تمہارا معاہدہ ہو)۔

پہلی اسلامی ریاست میں شہریت صرف مسلمانوں کے لئے نہ تھی، بلکہ اس میثاق نے وضاحت کی ہے کہ مدینہ میں مقیم یہودی بھی ریاست کے شہری ہیں، اس میثاق میں ان کے حقوق وواجبات بھی متعین کیے گئے ہیں، مثلاً اس کی دفعہ ۲۵ر میں لکھا گیا ہے کہ بنوعوف کے یہودی امت کے ساتھ ایک قوم ہیں، یہودیوں کو اپنے دین کی آزادی ہوگی اور مسلمانوں کا اپنا دین ہوگا، ہاں ظالم کا معاملہ دیگر ہے''۔ یہ بات صرف بنوعوف کے یہودیوں تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ دفعہ ۲۶ر سے لے کر دفعہ ۳۶ر تک کے متن میں دیگر قبیلوں کے یہودیوں کے لئے بنی عوف کے یہودیوں والے حقوق ہی بیان کئے گئے ہیں، بلکہ اس میثاق کی بعض عبارتیں مدینہ کے مشرکین کی ذمہ داریاں بتاتی ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی نئی ریاست کی حکومت میں داخل ہیں، اور میثاق میں مذکورہ اس کے نظام کی بنیادوں کے پابند ہیں۔ اس طرح کی واضح ترین عبارت فقرہ (۲۰ب) ہے، جس میں کہا گیا ہے کہ: ''شرک کسی قریشی کے مال یا اس کے نفس کو پناہ نہیں دے گا، اور کسی مومن کو قریش کے مال ونفس سے نہیں روکے گا''۔ اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ریاست کے قیام کے وقت سے ہی ہم وطنی کے رشتہ نے یہودیوں اور مشرکین کو حق شہریت دیا تھا، اور ان کے لئے ان تمام حقوق سے بہرہ ور ہونے کی ضمانت دی تھی جن کا تذکرہ اس میثاق میں تھا۔

اس کے بعد قرآن وحدیث میں اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں کے احکام بیان کئے گئے، اہل ذمہ ذمہ کے موضوع پر لکھی گئی کتابوں نے اور تمام ابواب فقہ پر مشتمل کتابوں نے اہل ذمہ کے عنوان کے تحت ان احکام کو درج کیا، مسلم وغیر مسلم اصحابِ قلم کا اس سلسلے میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اسلام نے اہل ذمہ کے لئے ایک اچھی زندگی کی ذمہ داری لی ہے۔ جس کی بنیاد ان کے ساتھ انصاف، ان کے اور مسلمانوں کے درمیان متعین اسلامی احکام کے مطابق مساوات پر ہے، ان کے ساتھ ہر وہ نرمی اختیار کی جاتی ہے جس سے دین اسلام کے احکام اور اس کے نظام حکومت پر آنچ نہ آئے۔

اسلامی نظام شریعت اسلامی پر قائم نظام ہے، جس کی تفصیلات اجتہاد، استنباط، تفسیر وتاویل کی بابت اس کے قواعد

کے مطابق ہیں، اور مدینہ منورہ میں پہلی اسلامی حکومت کے قیام کے وقت سے ہی غیر مسلم مسلمانوں کے ہم وطن رہے ہیں، بعد کی تمام اسلامی حکومتوں میں بھی ایسا ہی رہا ہے۔

اس سلسلہ میں چند اہم اصول ہیں جن کا تذکرہ ذیل میں کیا جارہا ہے:

پہلا اصول: قرآنی اور صحیح احادیث کے نصوص شریعت کی بالادستی۔

دوسرا اصول: دار یا ہماری معاصر زبان میں وطن میں شرکت کے تقاضوں کو قبول کرنا۔

تیسرا اصول: انسانی اخوت سے صرف نظر نہ کرکے اس کا اعتبار، اس اخوف کے منافی قول، رائے اور عملی قرآنی وحدیث کے بیان کردہ ایک اصول سے دستبرداری ہے۔

''وہ دیگر لوگوں سے الگ ایک امت ہیں''۔

امت سے مراد یقینی طور پر ایک امتیازی سیاسی جماعت ہے، جس پر'' دیگر لوگوں سے الگ'' سے دلالت ہوتی ہے، یہ امتیاز ایک نئے اصول کی بنیاد پر ہے، جو نہ قبائلی ہے اور نہ خونی رشتہ، یہ ایک عقائدی اصول ہے،...... امت کا اتحاد ایک ثابت شدہ امر ہے، جس کی بابت کسی طرح کا شک کرنا ناممکن ہے اور جس میں خلل ڈالنا حرام ہے، لیکن امت کے متحد رہتے ہوئے بھی سیاسی معاشرہ گوناگوں ہوسکتا ہے، اور ایک ہی امت کے اندر سیاسی معاشرہ کے اعتبار سے ریاست بھی متعدد ہوسکتی ہیں۔(۱۱)...... اسلام ایک ہی ریاست اور نظام حکومت کے تحت ایک سیاسی معاشرہ کے قیام کے تصور کو قبول کرتا ہے، اسلام کی بنیاد پر سب لوگ ریاست کے اندر مکمل شہریت کے حقوق سے بہرہ ور ہوتے ہیں، حکومت کے قیام کے لئے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک خالص اسلامی معاشرہ کی ہو(۱۲)۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کرکے مدینہ منورہ پہنچتے ہی اولین اسلامی ریاست کے قیام اور نئے سیاسی تجربہ کا آغاز کیا، آپ کے سامنے ایک ایسا'' واقع'' تھا جسے مکمل طور پر کسی بھی صورت میں عقیدہ کی بنیاد پر محمول نہیں کیا جاسکتا تھا، یہاں تک کہ جو مسلمان عقیدہ کے اعتبار سے یکساں تھے وہ بھی مکمل طور پر یکساں نہیں تھے، انصار کے پاس زمینیں تھیں، معاشی امکانات تھے، وہ اسی خطہ کے باشندے تھے، جبکہ مہاجرین کا معاملہ دیگر تھا، یہ صورت حال ہی ان کے درمیان مواخات کا باعث ہوئی تھی، تاکہ اس فرق کو دور کیا جاسکے جو نئے تجربہ میں ان کی شمولیت میں مانع تھی، اس کے لئے آنحضرت ﷺ نے اوس وخزرج کے درمیان اختلافات دور کئے، وہ مسجد بنائی جو ریاست کا مرکز بنی، اس میں نمازیں پڑھی جاتی تھیں اور فیصلے کئے جاتے تھے، پھر آپ نے مہاجرین وانصار کے درمیان مواخات کرائی، اس بے نظیر اقدام نے تمام مسلمانوں کے احساسات یکساں کردئے اور انہیں عملی طور پر ایک جسم بنادیا۔

آپ کے سامنے ایک ایسا معاشرہ تھا جس میں غیر مسلم مشرکین ویہود بھی آباد تھے، اسی لئے مدینہ میں جس سیاسی

نظام کے قیام کا منصوبہ تھا اس کے لئے عقیدہ کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا تھا، کہ دینی اخوت اور عقیدہ کا اشتراک صرف مسلمانوں کے درمیان رابطہ کی بنیاد ہو سکتے ہیں، جبکہ مدینہ میں غیر مسلم بھی تھے، اسی لئے اس تجربہ میں جس سیاسی منصوبہ کا قیام مقصود تھا اس کا تقاضہ تھا کہ اس کے لئے اس سے زیادہ وسیع رابطہ کی بنیاد اختیار کی جائے جو مدینہ کے گوناگوں حالات اور متنوع سماجی وعقائدی پہلوؤں کے اعتبار سے صحیح ہو، ایسا ہی رسول اکرمؐ نے کیا، آپ نے ''صحیفہ مدینہ'' (میثاق مدینہ) کے نام سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ایک معاہدہ کیا، آپ یقیناً پہلے ایسے شخص تھے جنہوں نے اس ذمہ دارانہ شہریت کی حقیقی تشریح کی تھی جس کی حدود خود آپ نے ایسی علامتوں کے طور پر وضع کر دی تھیں جو اس کو نقصان پہنچانے والے حکومت اسلام کے دائرہ کے تحت اور اس کی مرجعیت کے تحت ذمہ دار قرار دیتی تھیں، ایسا میثاق مدینہ کے احکام کی مرجعیت کی بنیاد پر تھا، ان احکام کو ہم جدید اصطلاح میں اہالیان مدینہ کے لئے دستوری مرجعیت کہہ سکتے ہیں، اس میثاق میں ۴۷ دفعات ہیں، اور ان پر غور وفکر کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ یہ میثاق شہریت کے اصول کے ساتھ اقداری مشترک امور کی وضاحت کرتا ہے، اس سلسلہ میں تعدد کا اعتراف کیا جاتا ہے، اور مدینہ کے تمام مسلم وغیر مسلم باشندگان کے حقوق وواجبات کا احترام کیا جاتا ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرمؐ نے اس معاہدہ میں داخل ہونے والے مسلمانوں اور یہودیوں کو دیگر لوگوں سے الگ ایک ''امت'' (جماعت) کہا ہے، اور یہ بتایا ہے کہ اس جماعت کے مابین ایک ایسا معاہدہ ہے جو مدینہ سے باہر کی دیگر جماعتوں سے الگ صرف مدینہ کی جماعت (گروہ) کے لئے خاص ہے، اس کی وضاحت میثاق میں یوں کی گئی ہے: ''یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے لکھا گیا وہ معاہدہ ہے جو قریش ویثرب کے مسلمانوں اور بعد میں ان میں شامل ہونے والوں اور ان کے ساتھ جہاد کرنے والوں کے درمیان ہے''۔ میثاق میں مسلم وغیر مسلم اہالیان مدینہ کے درمیان باہمی مدد پر بھی زور دیا گیا ہے، (ملاحظہ ہو دفعہ ۱۶-۳۷)، ''یہودیوں پر اپنے خرچ کی ذمہ داری ہے، مسلمانوں پر اپنے خرچ کی ذمہ داری ہے، اس میثاق والوں سے کوئی جنگ کرے تو تمام میثاق والوں پر اس کے خلاف مدد کرنا لازمی ہے، ان کے درمیان باہمی تعلق خیر خواہی اور تعاون کا ہوگا بے تعاونی اور بدخواہی کا نہیں، اگر کوئی شخص اپنے حلیف کے ساتھ معاہدہ کے خلاف حرکت کرے گا تو مظلوم کی مدد کی جائے گی''۔ میثاق میں متعدد مقامات پر یہ لکھا گیا ہے کہ اختلاف کی صورت میں فیصلہ اللہ ورسول کا ہوگا، (دفعہ ۲۳-۴۲) اس سے قانونی بالادستی کی وضاحت ہوتی ہے۔

امت کی یہ وسیع تعریف سیاسی جماعت کا وہ دائرہ ہے جس کی بنیاد پر مدنی معاشرہ کو اس میثاق کی دفعات میں قائم کرنے کی کوشش کی گئی ہے، یہ میثاق مختلف انسانی جماعتوں اور دینیوں کے درمیان تعلق کا ایک وسیع دائرہ ہے۔

یہ صورت شہریت کے اس تصور سے ہم آہنگ ہے جو ریاست کے سیاسی معاشرہ کے افراد کے درمیان عضوی تعلق کے نظریہ پر قائم ہے، اور جو لوگوں کی گوناگونی کا تقاضا ہے، یہ صورت حال اس بات کی متقاضی ہے کہ ان لوگوں کے درمیان

ایک ایسا رابطہ وجود میں لایا جائے جو تمام لوگوں پر حاوی ہو۔

دوسری جانب اس میثاق نے جماعتوں اور افراد کے حقوق منظّم کئے ہیں، اس میں لکھا گیا ہے کہ تمام افراد امت جوار دینے کے حق میں یکساں ہیں، اس لئے کہ اللہ کا ذمہ ایک ہی ہے، ان کا ادنیٰ شخص بھی سب کی طرف سے جوار دے سکتا ہے، لیکن میثاق نے یہ حق مشرکین کو نہیں دیا ہے، اس میں کہا گیا ہے: ''کوئی مشرک قریش کے کسی مال اور کسی شخص کو جوار نہ دے گا اور کسی مسلمان سے اس کی آڑ نہ کرے گا''، ایسا اس لئے تھا کہ مشرکین قریش مسلمانوں کے ساتھ حالات جنگ میں تھے، اس میثاق نے غیر مسلموں کو دین کی آزادی دی ہے، اس میں کہا گیا ہے کہ: ''یہودیوں کا اپنا دین ہوگا، مسلمانوں کا اپنا دین ہوگا'' اس کی بنیاد اس ارشاد خداوندی پر ہے: ''لا إكراه في الدين'' (سورۂ بقرہ: ۲۵۶) (دین کے سلسلے میں کوئی جبر نہیں ہے)، رسول اکرمؐ نے بھی اہل یمن کو لکھے گئے اپنے گرامی نامہ میں لکھا تھا کہ: ''یہودیوں اور نصرانیوں کو ان کے دین کی وجہ سے تنگ نہیں کیا جائے گا، ان پر جزیہ عائد ہوگا، انہیں اپنے معبود دونوں کی عبادت کا حق حاصل ہوگا''۔

اسی طرح آپ نے غیر مسلموں کو اپنے مذاہب کے اعتبار سے اپنے ذاتی معاملات (نکاح وطلاق وغیرہ) انجام دینے کی اجازت دی، بلکہ حکومت ان کے لئے ان میں سے ہی ایک قاضی متعین کرتی تھی جو ان کے مقدمات دیکھتا تھا، اشیاء خورد ونوش اور ملبوسات کے سلسلے میں بھی وہ عام نظام کے تحت اپنے دین کے احکام کے مطابق عمل کرتے تھے، انتظام حقوق کی بات کریں تو مملکت کی تمام رعایا یکساں حق رکھتی تھی، ہاں دینی مناصب کا معاملہ مختلف تھا، ہر باصلاحیت مرد وزن کو (خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم) شعبہ کا ذمہ دار یا رکن ہونے کا حق حاصل تھا، اسلامی مملکت کی شہریت رکھنے والا ہر شخص (خواہ وہ کسی دین ونسل سے تعلق رکھتا ہو) مجلس شوری کا رکن ہوسکتا تھا، مسلم فقرا کی طرح حکومت غیر مسلم فقرا پر ابھی خرچ کرتی تھی، انہیں مسلمانوں کی طرح باعزت زندگی گزارنے کا موقع دیتی تھی، مسلمانوں کی طرح کرسکتا تھا، بے مصرف زمینوں کو بامصرف بنا سکتا تھا، ان کی شخصی عزت کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری تھی۔

خاص قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس میثاق مدینہ نے حقوق کو عطیہ خداوندی مانا تھا کہ کوئی انہیں فوت نہیں کرسکتا، اس میثاق نے ایک ذمہ دار اور بامقصد زندگی کو وجود میں لانے کے لئے حقوق وواجبات کو ایک دوسرے سے بدرجۂ کمال متعلق کردیا تھا، حقوق انسانی کو تقدس دیتے ہوئے ظلم، فساد اور سرکشی کے خلاف تعاون اور کمزوری کی حمایت پر زور دیا تھا، کسی فریق کو کوئی خاص امتیاز نہیں دیا تھا، اور تمام انسانوں کے درمیان ایمان، انصاف، مساوات وتعاون کا رشتہ محکم کیا تھا۔

اسلامی نصوص نے جس طرح جزائی ذمہ داری کو ہر مسلم فرد کے ساتھ خاص کیا تھا، اسی طرح یہ قاعدہ غیر مسلموں سے بھی متعلق تھا، میثاق میں کہا گیا ہے: ''جو ظلم کرے گا اس کی سزا اسے ہی دی جائے گی۔ میثاق نے غیر مسلموں (بالخصوص یہودیوں) کی ذمہ داریاں واضح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ قریش اور ان کے معاونین کو جوار نہیں دے سکتے ہیں، ان کی ایک

ذمہ داری یہ بھی بتائی گئی ہے کہ اگر کوئی مدینہ پر حملہ آور ہو تو وہ اس کے خلاف مسلمانوں کی مدد کریں گے، اسی طرح اس جغرافیائی حدود کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ جس کے اندر جرم کرنے پر کسی سے مواخذہ ہوگا (دفعہ ۳۹-۴۴) ان عبارتوں کے جائزہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام اپنی حکومت کے ماتحت رہنے والے تمام افراد کو گروہ وقبیلہ سے صرف نظر کر کے ایک اکائی مانتا ہے، اسلام کسی کو اقلیت نہیں مانتا، انسانی بنیاد پر تمام شہری یکساں ہیں، ریاست کی شہریت رکھنے والے تمام لوگ (مسلمان ہوں کہ غیر مسلم) شریعت کے مقرر کردہ تمام حقوق سے بہرہ ور ہوں گے، تمام رعایا پر اسلام بطور قانون نافذ ہوگا، مثلاً معاملات وسزاؤں کے احکام کے نفاذ کے وقت قانونی پہلو پر نظر کی جائے گی، دینی وروحانی پہلو پر نہیں۔

میثاق مدینہ کو ایسی پہلی قانونی دستاویز مانا جاتا ہے جس نے سیاسی جماعت کے افراد کے درمیان تعلق کو منظم کیا، اور دینی ونسلی اختلاف سے صرف نظر حقوق وواجبات کو یقینی بنایا، اس کو اپنے زمانہ کا ایک ممتاز شہریت کا عقد مانا جاتا ہے، جو کہ سربراہ ریاست، ان کے مسلمان ساتھیوں اور غیر مسلم اہالیان مدینہ کے درمیان ہوا تھا (۱۳)۔

۹-شہریت (المواطنۃ) (۱۴): اصطلاح لغوی، ثقافتی، تاریخی اور فکری پس منظر میں:

کچھ ماہرین لغت کا خیال ہے کہ یہ لفظ اپنے جدید اصطلاحی معنیٰ پر کسی طرح کی دلالت نہیں کرتا ہے، اس لئے کہ ''واطن'' کے لغوی معنی صرف موافقت کے ہیں، جبکہ بعض دیگر معاصرین کے خیال میں جدید اصطلاحی معنی کی قریبی دلالت ممکن ہے، یعنی ''مواطنہ'' کے لفظ کو ایک وطن میں ایک ساتھ رہنے کے معنی میں مانا جائے، اسے فعل ''واطن'' سے مستقل مانا جائے، فعل ''وطن'' سے نہیں۔

یہ اصطلاح citizenship کا انگریزی مترادف ہے، جس کے معنی انسائیکلوپیڈیا آف برٹانیکا میں یہ بتائے گئے ہیں: ''فرد وریاست کے درمیان ریاست کے قانون کی روشنی میں تعلق، یہ تعلق ریاست میں باہمی حقوق وذمہ داریوں پر اس طرح مشتمل ہوتا ہے کہ یہ فرد کو آزادی دینے کے ساتھ اس کی ذمہ داریاں بھی اسے بتاتا ہے (۱۵)۔

وطن، مواطن، اور وطنیۃ ایسی عام تعبیرات ہیں جن کے معنیٰ میں صفت قدرے مل گئی ہے، لیکن یہ سب تعبیرات بنیادی صورتوں پر مشتمل ہوتا ہے، جیسا کہ میں سمجھتا ہوں اس کا سرچشمہ عربی علمی دائرہ سے باہر کا ہے، اور اس زمانہ میں لوگوں کی بدلی ہوتی حاجات پر اسے نافذ کیا جارہا ہے۔

سترہویں صدی سے جب سے سیکولر فکر سامنے آئی ہے تصور شہریت اس کے ایک اہم تصورات ونظریات میں سے ایک ہے، اگلی دو صدیوں میں اسے فکر کو مغرب میں اقتصادی وسیاسی میدانوں میں نافذ کیا گیا، بیسویں صدی اور اس صدی کے آغاز میں اس کے اثرات سماجی نظاموں اور انسانی تعلقات میں بھی نظر آئے۔

چونکہ سیکولرزم کا محور اپنے آغاز سے انفرادی آزادی، عقل پسندی اور ایسے سیاسی معاشرہ میں فرد کی حیثیت کو محکم

کرنے پر ہے جس کی بنیاد محکم سماجی بنیادوں پر بیداری کے زمانہ کے قواعد پر ہو، اس لئے سیکولر نظریہ کے ارتقا کے ساتھ ساتھ شہریت کے تصور میں بھی ارتقا ہوا، اور عمل کے دائروں، متمدن معاشرہ، عام میدان اور فرصت کے وقت میں اس کے یومیہ سیاسی وحیاتی اختیارات کے سلسلے میں فرد کی خواہش کو مرجع کی حیثیت حاصل ہو اور فرد کے مطلق اختیارات اس تصور کا محور بنے۔ اور یہ ایک ایسا تصور بنا جس کے مختلف پہلوؤں اور اس کے جدید ارتقاءات کا احاطہ کئے بغیر سیکولرزم اور اس کی حقیقت کو سمجھنا ناممکن ہے، اس لئے کہ یہ تصور فرد، جماعت، سیاسی رابطہ، ریاست کے کردار، انسانی تعلقات، اقدار اور اخلاق کے تصور پر مشتمل ہے۔

اس اصطلاح کے مضمون، استعمال اور اس کی دلالت میں بہت تبدیلیاں ہوئیں، اب یہ اصطلاح سیاسی قانونی پہلو میں پہلے کی طرح صرف فرد ور یاست کے تعلق کو ہی بیان نہیں کرتا ہے، بلکہ جدید سیاسی مطالعات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی نظریہ میں شہریت کے تصور پر اب پھر توجہ دی جانے لگی ہے، جبکہ اسی کی دہائی کے اخر میں ''ریاست'' کے تصور پر بہت زیادہ توجہ دی جارہی تھی، اس کے متعدد عوامل ہیں، جن میں سب سے اہم اس قومی ریاست کے تصور کو درپیش بحران ہے جو ایک طویل عرصہ تک سیکولر نظریہ کا محور رہی ہے، یہ بیسویں صدی کے آخر میں ہونے والی تبدیلیوں کا نتیجہ ہے:

اول: دنیا کے بہت سے ممالک میں نسلی و مذہبی مسائل کا اضافہ، تشدد، بلکہ خونی تباہی کی کثرت، ایسا صرف تیسری دنیا کے ان ممالک میں ہی نہیں ہوا جن میں جدیدیت کا نظریہ نہیں پھیلا تھا، بلکہ ایسا مغرب کے قلب میں بھی اس کی بڑی طاقتوں کے ہاتھوں ہوا، اس کا آغاز جرمنی میں یہودیوں کے قتل عام سے ہو(جیسا کہ کہا جاتا ہے)ا، پھر ہیروشیما میں ایٹم بم نے تباہی مچائی، صربوں نے مسلمانوں، امریکہ نے عراقیوں و رافغانیوں کو تباہ کیا، اور فلسطینیوں کو تباہ کرنے کا کام جاری ہے۔

دوم: گلوبائزیشن کا نظریہ سامنے آیا جس کی بنیاد سرمایہ داری کے حدود نا آشنا فروغ، ٹیکنالوجی وذرائع اتصال کے انقلاب اور اس تصور پر نظر ثانی کی ضرورت پر تھی جس کی بنیاد وطن کے حدود، سیاسی جماعت اور قومی ریاست کی بالادستی کے تصور پر تھی، ان تمام سطحوں پر نوعیاتی تبدیلیاں دکھائی دیں۔

دوسری طرف سیکولرزم کی لیباریٹری کی حیثیت رکھنے والے ممالک میں بنیاد پرست وشدت پسند مسیحی نظریات کا اضافہ عرب ومسلم اقلیتوں کے وجود کی وجہ سے پیچیدہ مغربی سماجی وسیاسی صورت حال میں ان افکار اور ان کے اثرات کے مقابلہ کے لئے اس نظریہ پر نظر ثانی اور اس کی محوریت کو یقینی بنانے کا سبب ہوا، نیز فرد کی آزادی وعزت کے حصول کے لئے مثالی تصور کے طور پر انفرادیت سیکولر دنیا میں ایک خطرناک موڑ تک پہنچ گئی، اس لئے کہ اس کی عملی تطبیق میں انتہا پسندی اور افراد کے ذریعہ صرف اپنے محدود مصالح پر ہی توجہ دینے سے وہ سماجی باہمی تحفظ خطرہ میں پڑ گیا جو کسی بھی سیاسی معاشرہ کی بنیاد ہوتا ہے، اب ذاتی مصالح کے لئے عام امور پر توجہ دی جانے لگی، بعض حضرات کی اصطلاح کے مطابق ''سیاست کی

موت''، ہونے لگی اور'' یومیہ زندگی کی پالیسیز'' سامنے آنے لگیں۔

عرب و مسلم عقل کے سامنے اس سلسلہ میں جو مسئلہ درپیش ہے وہ یہ ہے کہ سیکولر نظریہ نے صرف مغربی دنیا میں جمہوری تجربات کے آغاز پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ اب وہ تیسری دنیا کے ان ممالک میں اکیلے فکری وسیاسی آپشن کے طور پر خود کو پیش کر رہا ہے، جیسا کہ مشہور صاحب قلم فوکویاما کی کتاب''The end of history'' میں یہ لکھا گیا ہے کہ سیکولرزم نے تمام نظریات کو شکست دی ہے، یا ہنٹنگٹن کی کتاب''clash of civizations'' میں مغربی تہذیب کو سب سے بالا و برتر ثابت کیا گیا ہے، شہریت کے تصور کو سیکولر سرمایہ دارانہ نظام غیر مغربی ممالک میں فروغ دے رہا ہے، اور آگے بڑھ کر اسے جنوب کے مسائل کے حل کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے، جس کے تحت وہاں کے معاشروں کے سیاسی رابطہ کی موجودہ بنیادوں (قبائل ورشتہ داریوں وغیرہ) کی جگہ پر شہریت کو بنیادی مقام دینے کی کوشش ہو رہی ہے، اور اسے ایک ایسے رابطہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے جو دین، نسل و نظریہ کے رابطوں کو ختم کر دیتا ہے، یہ صورت مزید غور وفکر اور تبدیلی کی متقاضی ہے۔

پچھلی دہائیوں میں بین الاقوامی سطح پر وقوع پذیر ہونے والی جس طرح کی تبدیلیوں کا اوپر تذکرہ آیا ہے ان کی وجہ سے بعض مطالعات میں ایسے واقعات ومظاہر پر خاص توجہ دی گئی ہے جنہوں نے شہریت کے تصور میں تبدیلی کر کے اسے نئے پہلوؤں پر محیط کیا ہے، لیبرل سیاسی نظریہ کی ابتدائی تحریروں میں عقل پسندی کا نظریہ فلسفیانہ اقدار سے مربوط تھا، پھر ان میں شخصی منفعت کا تصور آیا اور پھر مادی واقتصادی منفعت کا، ان تحریروں نے اجمالی طور پر سیاسی نظریاتی تصورات اور اقتصادی نظریات کو باہم مربوط کر دیا، اسکی بابت کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ سیاسی پہلو پر معاشی پہلو کو اور سیکولر فکر پر مادیت پرستی کو غالب کر کے لیبرل جمہوریت کو جموری لیبرلزم بنا دیا گیا ہے، لیبرل معاشیات نے لیبرالزم کے اس کلاسیکل نظریہ کے بجائے جو ریاست کی دخل اندازی کو ناروا سمجھتی تھی اس جدید نظریہ لیبرالزم کو اختیار کر لیا ہے جو خوشحالی لانے کے لئے ریاست کی دخل اندازی کا مؤید ہے۔ اس طرح شہریت کا رابطہ ایسے متعین مادی منافع وحقوق سے عبارت ہو گیا جس کا مطالبہ شہری صحت وتعلیم کے میدان میں کرتا ہے، یعنی تمام تر توجہ حقوق پر رہ گئی ہے، واجبات سے مکمل صرف نظر ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ گفتگو کا موضوع ریاست، متمدن معاشرہ اور کارکنان کے درمیان شرکت پر گفتگو کے ذریعہ گورننس ہو گیا۔

اس طرح شہریت کا تصور خالص ذاتی منفعت پسندی کا ہو گیا، اسی طرح اس کی بنیاد ایک ایسی پیچیدہ صورت حال پر ہو گئی جس کے اصل مطلوبہ ومثالی نتائج غلط ریاست کے وجود کی وجہ سے سامنے نہیں آرہے ہیں، اگرچہ یہ وجود بالکل تبدیل ہو کر رہ گیا ہے، جس کی وجہ سے بعض لوگوں کو یہ گمان ہونے لگا ہے کہ اب یہ نظریہ کمزور پڑ گیا ہے، اور اب اس کا کردار بس عالمی بازار کو فائدہ پہنچانا ہے، یہ صحیح گمان نہیں ہے۔

اس تضاد کے مساوی اور متضاد رجحانات سامنے آئے ہیں:

اول: حقیقت پسند، یہ براہ راست مصلحت پر بہت تاکید کرتا ہے، اوران عظیم اقدار وسماجی نیز مؤجل منافع کو آگے بڑھاتا ہے، جن پر پہلے سرمایہ دارانہ انقلاب کی بنیاد تھی۔

دوم: روشن خیال، یہ رجحان بعض ان تحریروں میں سامنے آتا ہے جن میں اقتصادی نظریہ میں اخلاقی پہلو کو داخل کرنے کی بات کہی جاتی ہے، یعنی ان میں مادیت پسند معاشیات کو انسانی اقدار سے قریب تر کیا جاتا ہے، اور معاشی نظریہ وتجزیہ میں انسانی، سماجی واخلاقی پہلوؤں کو واپس لایا جائے، اس کے نتیجے میں تصور شہریت کے تجزیہ کے وقت لبرل فکر میں اسے بڑے سوالات سے مربوط کرنا لازم آتا ہے، جن میں سب سے اہم بات یہ ہوتی ہے کہ تصور شہریت کے تجزیہ کے وقت لبرل فکر میں اسے بڑے سوالات سے مربوط کرنا لازم آتا ہے، جن میں سب سے اہم فرد کے تصورات، سیاست کی تعریف اوراس پر مرتب ہونے والا سیاسی معاشرہ کی نوعیت کا تصور ہے، اگرچہ بہت سی معاصر لبرل تحریروں میں ان تبدیلیوں پر توجہ دی گئی ہے جو اقتصادی وتکنیکی میدانوں اور جدید صطلاحات کے استعمال سے پیدا کی ہیں، لیکن ہمیں کسی بھی تحریر میں ان تبدیلیوں کی مکمل تشریح نہیں ملی ہے، عربی زبان کی ایسی تحریروں میں سب سے فائق تحریر مصری ماہر معاشیات مرحوم رمزی زکی کی تحریر ہیں۔

نئے میدان اور وسیع فکری مسافتیں:

سرمایہ داری کے گلوبائزیشن اور جدید لبرل نظریات کی بالاتری کی وجہ سے شہریت کا تصور کوئی سادہ تصور نہیں رہ گیا ہے، ترقی یا پچھڑاپن؟ یا تہذیب یا تہذیب کی مخالفت کی طرح یہ سوال نہیں ہے کہ شہریت یا بے شہریت؟ معاملہ اس سے بہت زیادہ پیچیدہ ہے اور یہ تصورات شدید گمراہ کن ہیں۔

کون سی شہریت: یہ ایک حقیقی سوال ہے، یعنی کیا وہ روشن خیال تصور شہریت جو فرد کا احترام کرتا ہے، معاشرہ کی بنیاد انسانی نظریہ پر رکھتا ہے، یا مابعد جدیدیت کا سرمایہ دارانہ تصور شہریت:

وہ ظاہری یکساں قانونی شہریت جس میں ایک ہی پہلو ہوتا ہے، یا انسانی تہذیبی منصوبہ کے تحت مرکب انصاف پسند، جمہوری اور ثقافتی شہریت؟

وہ شہریت جو آزادی، مساوات، سیاسی ڈھانچہ، عدل اور شوریٰ کی بات کرتی ہے، یا وہ شہریت جو سیاسی اقدار سے بے اعتنائی کرتی ہو کسی طبقہ اور تہذیب کے مفادات کے لئے معاشرہ کو تقسیم کرتی ہو، جسم ولذت کی پالیسیز کو انسانی اقدار، عام خیر اور سیاسی جسم پر بالاتر کرتی ہو۔

کسی علاقائی سیاق میں شہریت؟ سماجی شہروں میں ثقافی اور انسانی نوعیت کی روشن خیال اور لبرل شہریت، یا معاشرہ کی دشمن اور نفع خوری پر مبنی عالمی سرمایہ داری کے شہروں کی شہریت:

اورآخری بات یہ کہ انسانی اہداف، عام نفع، تاریخی اجتماعی ارتقاء کے سلسلہ میں تگ ودو والی شہریت؟ یا صرف ذات کو سامنے رکھ کر بنائی گئی سوچ، جس میں دوسرا اور اہم امر کا ذکر ہے، جو زمان ومکان کے تصورات کی تشکیل نو کرے، جو عام وخاص کی تعریفوں کی تشکیل نو کرے، اپنے جو تمام تصورات میں شہریت کے تصور کے لئے خطرہ بنے، یہ حقیقی سوالات اور اجتہادات وجہاد کے میدان ہیں (۱۶)۔

یہ تنقید کے میدان ہیں، واجب منہجی تقابل کے میدان ہیں، تصور شہریت اصول تنقید وتقابل کے مطابق تشکیل نو، ترمیم وتاویل کے اصول اور استعمال کے متقاضی امور کے ترتیب جدید کا محتاج ہے، تاکہ یہ تصور موقف کے تصورات کے تحت کی تعمیر نو کا ایک ماڈل بن سکے۔

شہریت کے اندر بیک وقت متعدد معانی پائے جاتے ہیں: شہریوں کے درمیان قانونی مساوات، رنگ، قوم، دین اور نسل سے صرف نظر قانونی مساوات، بغیر قانونی یا عرفی قیود کے سیاسی شرکت اور باعزت زندگی مغربی تجربہ اسی تسلسل پر رواں دواں ہے، اس میں شہری پہلے قانونی مساوات حاصل کرتا ہے، پھر سیاسی شرکت کا حق پاتا ہے اور پھر سماجی خوش حالی کا حق پاتا ہے، شہری کے سماجی رفاہ کے مطالبہ کو حکومت کے ذریعہ قبولیت ملنا اس تصور کی تکمیل کی دلیل ہے۔

۱۰-شہریت وطنی جماعت کے دائرہ میں ایک سسٹم کی اصطلاح ہے:

شہریت کا موضوع جو شہریت کے حقوق سے بہرہ ور ہونے اور اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے قانونی وسیاسی دائرہ کی تعبیر ہے، شہریت کی اصطلاح کا وجود چند مبادی کے اعتراف، چند اداروں کی پابندی، اور اس کے عملی نفاذ کو یقینی بنانے والے وسائل کے استعمال کا متقاضی ہے، اس تصور کے مطابق شہریت پابندیوں، فکری وقدری ڈھانچہ، قانونی ودستوری ڈھانچہ اور پالسیز وطریقہ ہائے کار کے ایک ڈھانچہ سے عبارت ہے۔

یہ ان ہمہ گیر تصورات واصطلاحات میں سے ہے جو دیگر قانونی وسیاسی تصورات کا متقاضی ہے، اس لحاظ سے یہ تصور ایک ایسے سسٹم کا تصور ہے جو بنیادی انسانی حقوق، تمدنی وسیاسی حقوق، نیز سماجی، معاشی وثقافتی حقوق سے متعلق ہے، یہ سسٹم انسانی سرگرمیوں کے تمام میدانوں (شخصی، خاص، عام وسیاسی) سے متعلق ہے۔

شہریت کے موضوع کی بابت ایک نص کے طور پر اقتدار ومعاشرہ کے خطاب کے مطالعہ کے وقت یہ امور کافی اہم ہیں۔

۱۱-عقیدہ، انسان اور تشخص:

(دینی) عقیدہ کی تجدید، انسان رفرد: دافعیت، رافعیت، سرگرمی: یعنی ریاست، معاشرہ، شہریت اور مرجعیت کے درمیان پایا جانے والا تعلق ان امور میں سے کسی کے قابل انحراف ہونے کے مسئلہ کے تحت آسکتا ہے، یہ انحراف کسی امر کے

حصول، اس کی بابت غور وفکر، اس کے نفاذ اور اس کا مناسب ہونے میں سے کسی کی بابت ہوسکتا ہے۔

اس سیاق میں دیکھیں تو بنیادی خیال یہ ہے کہ اچھا معاشرہ وہ معاشرہ ہے جو اپنے معاملات (بابت: فکر، اقدار اور اداروں) میں ریاست کی دخل اندازی سے مستغنی ہے، اور ریاست کا کام صرف اپنی خارجی وداخلی ذمہ داریوں کی تکمیل ہے، ایک مفکر اس بابت کہتے ہیں: معاشرہ ہماری خوبیوں کی دین ہے، اور ریاست ہمارے عیوب کی پیدا کردہ'' یعنی ریاست معاشرہ کے فساد کو کم کرتی ہے۔

یہ صورت حال ہمیں ان پہلوؤں کی طرف متوجہ کرتی ہے جو ایسے بے سروپا مظاہر کو مشترکہ طور پر وجود بخشتے ہیں جن میں سسٹمس اور معاشرے مبتلا ہیں، یعنی ریاست یا بالفاظ دیگر مقتدرہ ایسے بے ترتیب مظاہر کو وجود بخشتی ہے جو اس کے ظلم وفساد کے عناصر پر پردہ ڈال سکیں، یہ گمراہ جماعتیں گمراہ فرد وانسان کو وجود بخشنے کی فیکٹریاں ہیں، سماجی، اقتصادی اور سماجی طور پر محروم کرنے سے ایک ایسا انسان سامنے آتا ہے جو ان گونا گوں پہلوؤں کے درمیان تعلقات کو بگاڑ دیتے ہیں، اور اتحاد کے امکانات کے باوجود ان کو باہمی اختلاف کا اسیر بنادیتے ہیں۔

'' دافعیت'' سے مراد وہ امور ہیں جو فرد کو متعین سلوکی طرز اختیار پر آمادہ کرتے ہیں، اور اس سلوک کو وہ رخ دیتے ہیں جو کسی مقصد کے حصول کا باعث ہوتا ہے، اور اس مقصد کے حصول تک اس کے تسلسل کا ضامن ہوتا ہے، اس سے انسانی وجود کے وہ تصورات واہداف، نیز ان اہداف کے لئے کی جانے والی وہ کاوشیں مراد ہوتی ہیں جو انسان کی سرگرمیوں سے رکاوٹوں کے کردار اور ان کے سلبی وایجابی اثرات سے صرف نظر کئے بغیر ہوں، زندگی کی'' دافعیت سے مراد انسانی زندگی کے لئے راستہ ہموار کرنا اس کی حفاظت کرنا اور اس کو نقصان نہ پہنچانا ہے زندگی کی'' دافعیت'' کی بنیاد ضروریات کی حفاظت، حاجیات کی فراہمی، تحسینات کی تسہیل اور حصول ہدف کے لئے کی جانے والی کاوش کو منظم کرنے پر ہے۔

یہ'' دافعیت'' مؤثر عمل کے لئے کی جانے والی کاوش سے مربوط ہے، گویا کہ یہ اس'' کدح'' (رفتہ رفتہ جانے) کی ایک حالت ہے جس کا تذکرہ قرآن مجید میں یوں کیا گیا ہے: "**یا أیها الإنسان إنک کادح إلی ربک کدحا فملاقیه**'' (سورۃ انشقاق:۶) (اے انسان تو اپنے رب کی جانب کشاں کشاں جارہا ہے پھر اس سے ملے گا یا اس کے حضور حاضر ہوگا)۔

ہمتوں کو انگیز کرنے والے عمل پر آمادہ کرنے والے ایمانی دوافع میں بسا اوقات کمی اور کمزوری آنے لگتی ہے، ایسا اس وقت ہوتا ہے جب فرد تبدیلی کے عمل میں اور امت کی بیداری کے منصوبوں کے لئے تقویت کا باعث بننے والی پابندیوں سے خلاصی چاہتا ہے۔

اس نئی صورت حال میں امت کو بہت سے چیلنجز درپیش ہیں، کچھ اور اسباب بھی ایسے ہیں جو امت کی نشأۃ ثانیہ

کے لئے رکاوٹ بن رہے ہیں۔

شہری، وطنی جماعت اور تشخص: تشخص، عقیدہ، فرد ''میں''، جماعت ''ہم'' تربیت اور تشخص کا احساس، تشخص کی تربیت: تشخص کی بابت جاری بحث کو روکنا مجھے بہت مشکل لگتا ہے، اس لئے کہ یہ ایک صدی سے زائد عرصہ سے جاری بحث ہے، میرا ارادہ تشخص کے دو اسباق سے تعرض اور ان کی تحقیق ہے، اس مقام پر دو تصورات سامنے آتے ہیں: ایک کا تعلق تشخص کے احساس سے ہے، اور دوسرے کا تشخص کی تربیت سے۔ تشخص کا احساس تین عناصر پر مشتمل ہوتا ہے:

پہلا عنصر تشخص کے حقیقی اور غیر مصنوعی سوالات کی بابت ہے، حکماء کا کہنا ہے کہ صحیح سوال نصف جواب ہے، ہم کون ہیں؟ ہم کسی چیز کے مالک ہیں؟ ہم کیا لیتے ہیں اور کیا مسترد کرتے ہیں؟ کس زمین پر ہم کھڑے ہیں؟ باہم متعلق سوالات ایک دوسرے کے صحیح جوابات فراہم کرتے ہیں۔

دوسرا عنصر ان بنیادی عناصر کی فراہمی کا ضروری ہونا ہے جسے حکیم بشری نے اس ''بنیادی رجحان'' کا نام دیا ہے جو جو تشخص کے مسئلہ کی مضبوط بنیاد کے ادراک اور اہم تہذیبی مسائل کے مکالماتی اصولوں کی تحدید پر قادر ہے۔

تیسرا عنصر کشتی کی وہ ثقافت جو ایک مشترک وطن، مشترک انجام کی بنیاد پر قائم ہے، اور تشخص کی کشتی کی ان خرافات کی تحقیق جو بے شمار ہیں اور جو ہلاکت و بربادی کا سامان ہیں، تشخص کی کشتی میں چھوٹا سا سوراخ پوری جماعت کے لئے ایک وسیع قبر سے عبارت ہے، یہ معاملہ نہایت سنگین ہے۔

یہ تمام عناصر تشخص کی حفاظت کرنے والا بنیادی نظام تشکیل کرتے ہیں، اور اس طرح تشخص کے شعور کے عناصر کی بنیاد پڑتی ہے، (ذات کا شعور غیر کا شعور، موقف کا شعور)، اور یہ کام اس نظام کے تحت ہوتا ہے جو معاشرہ کی تعمیر اور اس کے سماجی وتہذیبی تانے بانے کی حفاظت میں معاون ہوتا ہے (۱۷)۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے شہریت مسلمان کی اپنے مخصوص معاشرے میں اسلامیت کے مفہوم میں نہیں ہے، بلکہ یہ ایک آزاد عمل ہے، دیندار مسلم معاشرہ کا قیام دیگر معاشروں کے تئیں ہدف رکھتا ہے، یہ معاشرہ تنوع کو معتبر مانتا ہے، یہ معاشرہ مسلم معاشروں کے ساتھ اتحاد کر کے ان کے غم کو اپنا غم بناتا ہے، اور دوسرے معاشرہ میں انسانی اقدار کو رائج کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے، تاکہ دینا پرامن زندگی گزار سکے، اور پورا معاشرہ ایک دوسرے سے تہذیبی استفادہ کر سکے اور اچھے ومفید انسانی تعارف کے ساتھ رہ سکے۔

اسلام انسانوں کے فطری تقاضوں کو روکنے کے لئے نہیں آیا ہے، بلکہ وہ ان تقاضوں کو صحیح رخ دیتا ہے، وہ خاندان کے سماجی انتساب کا اعتراف کرتا ہے (أدعوهم لآبائهم) (سورۂ احزاب:۵) (انہیں ان کے آباء واجداد کی جانب منسوب کرو) قبائل انتسب کو معتبر مانتا ہے (وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا) (سورۂ حجرات:۱۳) (اور ہم نے تم کو مختلف قوموں اور قبائل میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہنچا سکو) ملکی انتساب کو بھی اسلام صحیح مانتا ہے (وقال الذي اشتراه من

مصر لامرأته أكرمی مثواہ)(سورۂ یوسف:۲۱)(اور جس نے حضرت یوسف کو مصر سے خرید اتھا اس نے اپنی بیوی سے کہا کہ اس کو اچھی طرح رکھنا) ان امور اور فطری تقاضوں کو اسلام نے سماجی زندگی کا ایک مقصد بنا دیا، قرآن نے انسان کو اس کے ملک کی جانب منسوب کیا، لیکن ساتھ ہی اپنے رسول سے اللہ نے یہ بھی کہلوا دیا کہ: جو عصبیت (یا جاہلیت وقومیت دعوت دے وہ ہم میں سے نہیں ہے، اس طرح کے واقعات سے سیرت کے صفحات بھرے پڑے ہیں (۱۸)۔

ان تمام باہم معاون نظریات کے ضمن میں شریعت وشہریت کے درمیان کے اس تعلق کو سمجھنا ممکن ہے، تاکہ وطنی جماعت کی تشکیل میں ان دونوں میں سے ہر ایک کو اس کا واجب حق دیا جائے، اور شریعت کی بنیاد پر قائم وطنی جماعت کے تعاقدی تعلقات کو عام نظام کے قواعد کے طور پر پیش کیا جا سکے، جیسے سماجی تانے بانے کے اہم عناصر کی تشکیل کا قاعدہ۔

۱۲- غور وفکر کا منہج: شہریت کس طرح ان مسائل کو حل کرنے کا ایک اصول فراہم کرتی ہے جن کا تعلق شہریت کی جامعیت سے ہے؟

اس موقع پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ بعض لوگ شریعت کے خلاف حقوق انسانی سے استدلال کرتے ہیں، یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس سلسلے میں حقوق انسانی اصل مرجع ہیں، اور شریعت کی مرجعیت پر اصرار کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا کہنا اس وقت تو صحیح ہوسکتا تھا جب شریعت حقوق انسانی کا خیال نہیں رکھتی، یا اس کے خلاف ہوتی، جبکہ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ شریعت نے حقوق انسانی کو اپنی کلی فرعی مرجعیات میں سے ایک مانا ہے، لہذا حقوق انسانی شریعت کے منافی نہیں اس سے ہم آہنگ ہی ہیں۔

لہذا حقوق انسانی کو شریعت کے خلاف حجت بنانے کی کوئی معقول وجہ یا دلیل نہیں ہے، اس لئے کہ ہر طرح کے حقوق (سیاسی، تمدنی، فردی، سماجی، اقتصادی، جماعتی، ترقیاتی، علمی، حقوق وغیرہ) کو شریعت کی مرجعیت کے تحت ایک مناسب اہمیت ومقام حاصل ہے، یہ حقوق ان امور سیاست کے تحت آتے ہیں جن کا تذکرہ ابن قیم نے اس مکالمہ کو نقل کرتے وقت کیا ہے جو ایک شافعی اور ان کے استاذ ابن عقیل کے درمیان ''سیاست'' کی بابت ہوا تھا، اس کی بخوبی وضاحت شاطبی کے اس قول سے ہوتی ہے کہ وہ ''سیاست شرعیہ'' معتبر ہے جو مصلحت کو حاصل کرے اور اس کو یقینی بنائے، اسی طرح عز بن عبدالسلام نے قواعد الأحکام فی مصالح الأنام میں ان کلی قواعد کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ صرف مسلم دنیا کے لئے نہیں ہیں، بلکہ پوری نیا کے لئے ہیں۔

شہریت وجمہوریت بنیادی طور پر سیکولر اصطلاحات ہیں، یہ لوگ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ دین باہمی تعلق واتحاد کی تاکید کر کے شہریت کا وہ نظریہ پیش کرتا ہے جو حاکم ومحکوم کے درمیان تعلق کو منضبط کرنے کے قواعد کے تحت اس سیاسی رابطہ کے اصولوں کو وجود میں لاتا ہے، یہ تعلق اتحاد کو مزید تقویت پہنچاتا ہے، اگر اس سلسلہ میں سیکولرزم کو ایک شرط کے طور پر نہ پیش کیا جائے تو دین معاشروں کی تاسیس اور سماجی وسیاسی تعلقات کا نظام تشکیل دیئے جانے کے خلاف نہیں ہے۔

ہمیں ایک ایسے تعلق کا سامنا ہے جو بہت مرکب ہے اور ہمیں اس کے بارے میں یہ کہے بغیر چارہ نہیں ہے کہ شہریت کی اصطلاح اس سیاق میں تعلق کی بابت ایک بہت اہم علمی ایجاد ہوگئی ہے، اور اس سے بہت زیادہ مربوط ہوگئی ہے، ہمیں اس سیاق میں اسے ایک سسٹامیٹک اصطلاح ہی ماننا ہوگا، اس اصطلاح نے ایک نئی زبان ایجاد کی ہے جسے جاننا ہمارے لئے ضروری ہے، اس صورت حال نے ایسے بہت سے سوالات اٹھائے ہیں جو ہمیں لازماً متبادل نظام کی طرف لے جاتے ہیں۔

(شخص، خاص، عام اور سیاسی) میدانوں کے درمیان ترتیب قائم کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم صرف ''علوم اشباہ ونظائر'' کو ہی استعمال کر کے نہیں، بلکہ ''علم فروق کو بھی استعمال کر کے تعلقات، اشتراک وامتیازات کو منضبط کریں، ان اصولوں میں سے کس سے ہم اس سلسلہ میں استفادہ کر سکتے ہیں؟

کیا تمدنی ودینی کے درمیان صرف تصادم ہی کا تعلق ہے، یا یہ دونوں ایک دوسرے سے استفادہ کر سکتے ہیں؟ مختلف تبدیلیوں نے اس سوال کو بہت پیش کیا ہے۔

سیاسی امور کے سلسلے میں غور وفکر کی جانب وجود میں آنے والی تبدیلی کن تاثیرات کو ترک کر سکتی ہے، سیاسی امور اپنی وسیع دلالتوں کے ذریعہ سیاسی عمرانیات، یومیہ زندگی کے حقائق اور تحتی سیاست کے ڈھانچے سے متعلق اعمال کے دائرہ سے قریب ہو جاتے ہیں، ان سوالات نے ہمارے لئے یہ لازم کر دیا ہے کہ ہم متعدد ایسے متبادلوں پر غور کریں جن کے تحت تمام تعلقات آتے ہیں، اور جو نا قابل انکار تبدیلیوں کو ضرور معتبر مانیں۔

متبادل میدان اور شہریت:

شخص	شہریت	شہری-فرد (ڈھانچہ)
خاص	شہریت	شہری-خصوصیت (حقوق)
عام ''معاشرہ''	شہریت	شہری-عام (سماجی حقوق)
سیاست	شہریت	شہری-سیاسی (سیاسی حقوق)
دینی	شہریت	شہری-دینی (عقائدی حقوق)
گلوبلائزڈ	شہریت	شہری-گلوبلائزڈ (مشترک مستقبل)

ان مختلف متبادلات کے نظریہ کے تحت ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ تمدنی شہریت سے متعلق میدانوں میں سے ایک میدان ہے، لیکن چونکہ کلابلائزیشن اور سیکولر طرز زندگی کی مدد سے تمدن کا مفہوم مختلف دائروں پر اس طرح چھا گیا ہے کہ اب اس کا ایک ہی نمونہ رائج ہے، اس لئے اس سے واقفیت، اس کے مدلولات کی تلاش اور اس کے انجاموں سے تعارف، اور فعل،

تفعیل وفاعلیت میں تصور یا صفت کی صحت ومناسبت کا علم ضروری ہے۔

اس طرح ہمیں تصور شہریت ایسے باہم معاون ڈھانچوں کا ایک مجموعہ نظر آتا ہے جو ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں،:

تہذیبی، علمی، ثقافتی، فکری وفلسفی ڈھانچہ

حقوقی، قانونی ودستوری ڈھانچہ

پابندیوں اور سزاؤں کا ڈھانچہ (شہریت کا تحتی ڈھانچہ)

وہ عالمی ڈھانچہ جو تصورات کی تشکیل اور ان کی ترویج کی کوشش کرتا ہے

ادارتی ڈھانچہ اور انسانی حفاظت کے ادارے

فکری ڈھانچہ اور اقداری اصول۔

اجتماعی ڈھانچہ

شہریت اور حقوق وواجبات کے درمیان تعلق کا ڈھانچہ

سیاست کی بابت ڈھانچہ

اعمال سے متعلق ڈھانچہ

شہریت: ڈھانچوں اور میدانوں کے درمیان تعلقات، بنیادوں اور میدانوں کے درمیان تعاون کا ایک سسٹم۔

میدانوں تعلقات اور ڈھانچوں میں شہریت کی رسائی کے اصول

۱- رسائی کے چینلس کے درمیان وسائل کا انسداد۔

۲- کثافت، دباؤ اور آمیزش کی صلاحیت نہ ہونے کے سلسلے میں سیال اشیاء کا اختلاف۔

۳- تجربات کرنے والے کا شعور، وطن کے چینلس میں رسائی کے شہریاتی تجربہ کے اجرا کے لئے مناسب طریقہ کے مانع عناصر کا ادراک۔

۴- آمیزش کے حصول، علاحدگی کی ممانعت کی بنیادی شرط کے طور پر مناسب وقت کی کیفیت۔

شہریت ایک تعاقدی صورت ہے، جو تبادلہ کے مبادل حقوق وواجب کے تعلق کے اصول اور عقود کی کسوٹی تشکیل دیتی ہے۔

شہریت حکومت راشدہ کے نظام کے ان قواعد میں سے ایک قاعدہ ہے جو اس حکومت کے اقدار اور تقاضوں کو روبہ عمل لاتے ہیں (۱۹)، ان قواعد کا انصاف وظلم ہیں کفر وایمان نہیں، اس موضوع پر علامہ ابن تیمیہ نے اپنی کتاب الحسبۃ فی

الإسلام میں بہت اچھا کلام کیا ہے، انہوں نے لکھا ہے: ''اہل کتاب موت کے بعد جزا پر متفق ہیں، لیکن دنیوی جزا پر پوری دنیا متفق ہے، ان کا اس بابت کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ظلم کا انجام برا اور انصاف کا انجام اچھا ہوتا ہے، اسی لئے یہ روایت بیان کی جاتی ہے کہ: اللہ انصاف پسند حکومت کی مدد کرتا ہے خواہ وہ کافر ہو اور ظالم حکومت کی مدد نہیں کرتا خواہ وہ مسلم ہو'' (۲۰)۔

ابن تیمیہ کا یہ کلام سماجیات، سماجی فقہ، تہذیب وثقافت کے فہم کے سلسلے میں بہت بلند پایہ ہے، اسی طرح یہ کلام دنیا وآخرت کی کامیابی کی کامیابی کی بیک وقت کامیابی کی بنیادوں کو واضح کرتا ہے، تمام اعلیٰ اقدار اور ان کی تنقید کی چند شرطیں ہیں، جو ان کو پورا کرے گا وہ کامیاب ہوگا اور جو پورا نہیں کرے گا وہ ناکام ہوگا، (ان پر اللہ نے ظلم نہیں کیا تھا، بلکہ خود ہی انہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا تھا ''وما ظلمهم الله ولكن كانوا أنفسهم يظلمون'' (سورۂ نحل: ۳۳) اس طرح یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شہری جب بھی اپنا فریضہ ادا کرتا ہے زندگی کی تعمیر میں حصہ لیتا ہے۔

۱۳- انتساب کے دائرے اور تجزیہ کی اکائیاں: شہریت اور انتساب کے باہم دگر مربوط دائرے:

اس موقع پر یہ ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بشری حکیم نے منہج سے ایک ایسا وسیع اصول تشکیل دیا ہے جو لغوی مادہ ''نہج'' کے تمام معانی پر حاوی ہے، اس کا اہم ترین تعلق یہ ہے کہ منہج منزل تک پہنچانے والا راستہ، اور اسی لئے وہ بیک وقت ''واقع'' اور ''قصہ'' سے مربوط ہے۔

اس معنی میں منہج صرف نظریہ یا نظریہ سازی کا ایک منہج نہیں ہے، بلکہ وہ کلی نظریہ، تحقیقی وسائل واسالیب کی ایک تعبیر ہے، یہ کلی نظریہ بہر حال راہ عمل کی وضاحت کرتا ہے، اس کو برتنے اور مقصد کو حاصل کرنے کی کیفیت بیان کرتا ہے، اسی لئے بشری کے نزدیک منہج کا اہم ترین اصول یہ ہے کہ منہج ''واقع'' کے لئے ہے، اسی لئے انتساب کی اکائیوں کی بابت ان کی گفتگو ان کے اکثر مطالعات میں تجزیہ کی اکائیوں پر گفتگو کا ایک مقدمہ اور اس کی ایک بنیاد ہے۔

انہوں نے امت کو اپنے تجزیہ کی بنیادی اکائی بنا کر اور وطنی جماعت کو تجزیہ کی ''واقعی'' اکائی بنا کر وطنی جماعت میں امت کے معنی کی تحقیق کرنی چاہی ہے، یہ کام امت کی تجزیہ کی مرجعی اکائی ہونے کی حیثیت ختم نہیں کرتی ہے، لیکن یہ عمل اسے تجزیہ کی ان اکائیوں سے محفوظ رکھتا ہے جو مسئلہ کو سمجھنے اور اسے برتنے، نیز اسکو صحیح رخ دینے کے عمل کو نقصان پہنچاتی ہیں۔

اسی لئے انہوں نے لکھا ہے کہ علم سیاست وعلم سماجیات میں سے کوئی بھی صرف اس غور وفکر پر اکتفا نہیں کرسکتا ہے جو انتساب کی عام اکائی یا انتساب کی اس بنیادی اکائی پر مرکوز ہو جس پر ریاست کی بنیاد ہوتی ہے، اور جس سے نظام حکومت متعلق ہوتا ہے، یہ علوم نظام حکومت کے حالات اور ان کی نوعیت کے فہم کے لئے اکتفا نہیں کرتے ہیں، یہ فہم متعدد اداروں اور جماعتوں کا امکان کھلا رہتا ہے، یہ شہریوں کو صرف ایسے افراد نہیں مانتا ہے جنہیں پارٹیاں اور ریاست کے ادارے جمع کریں۔

ایسا اس لئے ہے کہ سیاست ومعاشرہ سے متعلق علوم صرف دائرہ بنادینے اور چیلنس کی تحدید کرنے پر اکتفانہیں کرتے ہیں، ان علوم میں غوروفکر اور بحث وتحقیق کا دائرہ اتنا وسیع ہوتا ہے کہ اس کے اندر افراد پر مشتمل فروعی جماعتیں اور ان جماعتوں کی بنیاد پر قائم ادارے وڈھانچے بھی آتے ہیں، غلطی کی ابتدا شہریوں کو بطور افراد دیکھنے، ان پر مشتمل فروعی، جماعتوں انتساب کی فروعی اکائیوں، نیز ان جماعتوں اور اکائیوں کے اداروں کا ادراک نہ کرنا ہے۔

معاشرہ انتساب کی بے شمار اکائیوں پر مشتمل ہوتا ہے، متعدد اعتبارات سے یہ اکائیاں مختلف انواع کی ہوتی ہیں، ان کی بنیاد دین، مسلک، صوفی طریقہ، ملت، ثقافی مشرب، زبان، لہجہ، تعلیم، پیشہ، کسی فوج، یونیورسٹی یا بڑی کمپنی سے وابستگی، علاقہ، محلّہ، گاؤں قبیلہ یا خاندان جیسے ایسے امور پر ہوتی ہے جن کی تعداد، انواع، اور اعتبارات تقسیم کا شمار ناممکن ہے، اعتبارات تقسیم کی گوناگونی کی وجہ سے ان کو انتساب کی جامع اکائیاں مانا جاتا ہے، لیکن ان کا مانع ہونا ضروری نہیں ہے، ایک اعتبار تقسیم کے تحت آنے والی اکائیوں میں سے کسی ایک کی جانب فرد کی نسبت اسی اعتبار تقسیم کے اندر دوسری اکائی کی جانب اس کے انتساب سے مانع ہے، لیکن دوسرے اعتبار تقسیم کے اندر فرد کسی اکائی کی جانب منسوب ہوسکتا ہے، مثلاً اہل سنت سے انتساب رکھنے والا شخص شیعوں سے انتساب نہیں رکھ سکتا، اس لئے کہ ایک اعتبار تقسیم نے ان دونوں کو علیحدہ علیحدہ کردیا ہے، لیکن یہ شخص اہل طریق کی جانب، قبیلہ وعلاقہ کی جانب انتساب رکھ سکتا ہے، اس لئے کہ اعتبار تصنیف جدا ہے، یعنی یہ اکائیاں باہم مربوط ہوتی ہیں اور ان کے دائرے ایسی کڑیوں کی حیثیت رکھتے ہیں جو جدا نہیں ہیں، ان اکائیوں کے تعدد، اور ان کے اعتبارات تقسیم کے تنوع کی وجہ سے یہ اکائیاں یکساں نہیں ہیں، اور ان میں پایا جانے والا اختلاف صرف تنوع اور تعدد کا نہیں ہے، یہ اختلاف عموم وخصوص کا بھی ہوتا ہے، اور جنس ونوع کا بھی ہوتا ہے، اصل وفروع کا بھی ہوتا ہے، دین کی اکائی اور دینی مسالک کی اکائی کے درمیان، اہل سنت کی اکائی اور ان کے مسالک کی اکائی کے درمیان، تصوف کی اکائی اور اس کے طریقوں کے قسموں کی اکائی کے درمیان، علاقائی کے تعلقات کی اکائیوں کے درمیان، پیشہ سے متعلق اکائیوں کے درمیان اور خونی رشتوں کی اکائیوں کے درمیان ایسا ہی اختلاف ہے۔

ان اکائیوں کے ذریعہ ہر تاریخی مرحلہ میں انتساب کی وہ عام اکائی سامنے آتی ہے جسے وہ بڑی اور بنیادی کڑی مانا جاتا ہے جو معاشرہ کی اپنے مطابق تشکیل کرتی ہے، اور جسے دیگر کڑیوں پر بالادست کڑی یا دیگر اکائیوں پر بالادست اکائی کی ماجانا جاتا ہے، اس کے علاوہ دیگر اکائیوں کو انتساب کی فرعی اکائیاں سمجھا جاسکتا ہے، انتساب کی عام اکائی ان دو بنیادی عاملوں کے مطابق سامنے آتی ہے:

وہ تاریخی اور سماجی حالات جو اسے بنیادی کردار ادا کرنے اور ان بنیادی چیلنجس کا جواب دینے کا اہل بناتے ہیں جن کا سامنا جماعت کی تمام اکائیوں کو کسی متعین تاریخی مرحلہ میں ہوتا ہے۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ انتساب کی عام اکائی کو ایک حد تک اضافی ثبات حاصل ہے، لیکن وہ اپنے اندر سے نوعیاتی اکائیوں اور باہر سے گردوپیش کے عام حالات سے متأثر ہوتی ہے، یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ ہر زندہ معاشرہ میں متعدد ذیلی اکائیاں پائے جانے کے باوجود کوئی ایک لفظ اتحاد ضرور پایا جاتا ہے، یعنی انتساب کی ایک عام اکائی ایسی ضرور پائی جاتی ہے جو معاشرہ پر اور اس معاشرے کے افراد کے ذہنوں پر غالب رہتی ہے، درپیش چیلنجس کا مقابلہ کرتی ہے، مصالح کی آخری حد کو یقینی بناتی ہے، معاشرہ کے مختلف طبقات کی عظیم مشترکہ مصالح کی رعایت کرتی ہے، یہ مختلف طبقات گوکہ مختلف اعتباراتِ تقسیم کے اعتبار سے مختلف اکائیوں سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن یہ اکائیاں باہم دگر مربوط ہوتی ہیں، اور عام اکائی ان کے لئے وجود، بقا اور مصالح کی ضامن ہے، اس وجہ سے عام وفرعی کے درمیان باہمی تعاون کے تعلقات ہوتے ہیں، اگر ان امور کی ضمانت نہ ہو تو پھر فرعی اکائیاں مصالح کے لئے متحد ہو کر کسی متعین مرحلہ کی اس عام اکائی کے خلاف ہو جائیں گی۔

میرا خیال ہے کہ معاشرہ کو درپیش چیلنج کی نوعیت اور مقدار انتساب کے وجود اور متعین تاریخی مرحلوں میں اکائیوں کے ایک دوسرے پر غلبہ کے سلسلے میں سلبی یا ایجابی طور پر مؤثر ہوتے ہیں، مغربی طاقتوں نے ہمارے ممالک پر قبضہ کر کے کیونکہ ان کو تقسیم کر دیا خلافت اسلامی کا سقوط ہو گیا تھا اور اس طرح نسبت کی ایک مشترکہ عام اکائی ختم ہو گئی تھی، اس لئے ایسا ہمارے یہاں بہت ہوا۔

ان حالات میں جو چھوٹے چھوٹے ممالک وجود میں آئے ہیں وہ اپنے اندر سے ایسی ترتیبات قائم کرتے ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے حالات سے نبٹ سکیں، وہ ایک زندہ عضو ہوتے ہیں، اور ان کی زندگی انہیں اس قابل بناتی ہے، پھر وہ اپنے اس ٹوٹے پھوٹے جغرافیہ کو ایک سیاسی اکائی اور عام انتسابی اکائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

یہ اکائی ان ممالک کے لئے ایسے اہداف، نظریات اور تصورات قائم کرتی ہے جس کے ذریعہ یہ ممالک سیاسی وسماجی زندگی کے حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔

پھر بیرونی خطرات ایسے ملک کے لئے مقابلہ کی طاقت پیدا کرتے ہیں، اور انتساب کی ایسی اکائیاں پیدا کرتے ہیں جو مطلوبہ سطح پر ان خطرات کے مقابلہ کی صلاحیت رکھتی ہیں، اسی طرح داخلی مسائل میں ان مسائل کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھنے والی صلاحیتیں جدید مسائل سے نبٹنے کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔

لیکن بعض ایسی عام اکائیاں بھی سامنے آتی ہیں جو معاصر مسائل سے نبٹنے کے لئے مقابلہ کی صلاحیت پیدا کرتی ہیں، اس کی ایک مثال صلیبیوں کے خلاف مسلمانوں کا اتحاد ہے۔

بشری نے لکھا ہے کہ وہ ان تمام اکائیوں کے وجود کے لئے سماجی وتہذیبی اہمیت کی وضاحت کرتے ہیں، اس لئے

کہ فرعی اکائیوں کا وجود عام اکائیوں کو غذا دیتا ہے اوران سے غذا حاصل کرتا ہے۔

یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ فروعی اکائیوں کا وجود عام اکائیوں کی حیثیت واہمیت میں کمی کرتا ہے، انسان مدنی الطبع ہے، کوئی بھی فرد بغیر جماعت کے نہیں پایا جاتا ہے، فرد کو بلا جماعت تصور کرنا ایک فرضی تصور ہے، اس لئے کہ فرد ہمیشہ ان جماعتی اکائیوں میں سے کسی ایک یا زائد اکائیوں کے تحت ہوتا ہے، نظام ان اکائیوں، ان کی سرگرمیوں اوران کے باہمی تعلقات سے اپنی زندگی حاصل کرتا ہے۔

معاشرہ کی زندگی، اپنی سرگرمی کو گوناگون بنانے کی اس کی صلاحیت، بدلتے حالات کے ساتھ اپنے آپ کو بدلنے پراس کی قدرت درپیش چیلنجس کا مقابلہ کرنے کی اس کی استطاعت، یہ سب چیزیں انتساب کی ان اکائیوں کی سرگرمی پر منحصر ہے جو معاشرہ کے لئے مضبوط بندھن کی حیثیت رکھنے والی باہم دگر مربوط جماعتوں کی ان قسموں میں افراد کو مربوط کرتی ہیں اگر مصریت کمزور ہوگی تو وہ ایک وسیع اسلامی اتحاد کے پارہ پارہ ہونے کی صورت میں انگریز جماعت کا مقابلہ نہ کرسکے گی، یعنی وہ ایک ایسی خاص اکائی تشکیل نہ دے سکے گی جو زندگی اور مقابلہ کی صلاحیت رکھتی ہو، اگر اسلامیت اور عربیت کمزور ہوگی تو ہم عظیم عالمی مقابلوں میں اپنا مطلوبہ ہدف حاصل نہیں کرسکیں گے، ہم نے معاصر تاریخ میں دسیوں برس تک زبردست استقامت ومقابلہ کی ایک زبردست مثال پیش کی ہے، مقابلہ کی ایک صورت کو چھوڑ کر دوسری صورت اختیار کرنے کی لچک وصلاحیت کا مدار ان اکائیوں کی زندگی اوران کی سرگرمیوں کی کیفیت پر موقوف ہے، ہرگز وہرگز ان اکائیوں میں سے کسی کو دوسری اکائیوں کی وجہ سے کمزور نہیں کرنا چاہئے، ہاں ہمیں ان کی ایسی ترتیب ازسرنو قائم کرنی چاہئے جس کے ذریعہ یہ ایک دوسرے کی تقویت کا باعث ہوجائیں۔

فرعی جماعتیں ہی عام جماعت کی زندگی وسرگرمی کا منبع ہوتی ہیں، اگر ہم انتساب کی عام اکائیوں کو ان بالیوں کے مثل سمجھیں گے جن میں مختلف دانے ایک دوسرے سے بالکل جدا ہوتے ہیں اور جن میں بالکل ایک جیسی اکائیاں ہوتی ہیں جن میں گوناگوں وباہم تعاون نہیں پایا جاتا ہے تو ہم غلط کریں گے، اور یہ غلطی ہم سے ہوئی ہے۔

قومیت براہ راست افراد پر مشتمل نہیں ہوتی ہے، اسلامیت بھی براہ راست افراد پر مشتمل نہیں ہوتی ہے، مصریت، عراقیت یا مغربیت بھی براہ راست افراد پر مشتمل نہیں ہوتی ہیں، بلکہ یہ براہ راست انتساب کی ایسی اکائیوں پر مشتمل ہوتی ہیں جن میں سے ہر ایک کی سرگرمی وزندگی کے اپنے سرچشمے ہوتے ہیں۔

اگر ہم اپنے معاشروں کو مغربی معاشروں کی بابت اپنے نظریات سے دیکھیں گے تو ہم غلطی کریں گے۔ حالات حاضرہ کے سیاق میں انتساب کے دائروں کو مطالعاتی تجزیہ کی اکائیاں مان کر کئے گئے بشری کی اس گفتگو سے دونقاط واضح ہوجاتے ہیں:

۱-فرعی انتساب کی بہت سی اکائیاں تباہ ہوگئیں، یا تو اس کا سبب یہ تھا کہ مغربی استعمال ہمیں برباد کرنا چاہتا تھا، یا اس لئے کہ ہم نے جب انہیں مغربی نقطۂ نظر کی پیروی کرتے ہوئے یا اس نقطۂ نظر سے دیکھا جو ہمارے نزدیک مغربی معاشرہ کا سمجھا تھا تو ہمیں اپنے ادارے انتساب کی ایسی اکائیاں محسوس ہوئے جو اصلاح وتجدید کے لئے رکاوٹ تھے، پس ہم نے ''تجدید'' و''اصلاح'' کو ہی ختم کر دیا۔

پھر جب ہم نے مغربی طرز پر یہ ڈھانچہ ترتیب دیا تو ہمیں ان فروعی تشکیلات سے وہ تعاون نہیں مل سکا جو نئے اداروں کے لئے مفید ہوتا۔

۲- ہم نے مغرب سے ماخوذ نظام پر اس کے اس فلسفی پس منظر میں غور کیا جو فرد سے آغاز کر کے براہ راست عام کلی تصور پر پہنچ جاتا ہے، مغرب میں فرد کی اہمیت کو بڑھایا گیا، تاکہ فرد کو ان اداروں سے نجات دلائی جاسکے جو اسے خود معاشرہ میں ہی پیدا ہونے والے دیگر اجتماعی اداروں سے وابستہ ہونے میں مانع تھے، اس طرح اسے غلامی سے نجات دلائی گئی، اور اسے اس بات کی آزادی دی گئی کہ وہ خود معاشرہ کی پیدا کردہ شہروں، کارخانوں، سوسائٹیوں وغیرہ کی انتساب کی اکائیوں سے قریب ہوسکے، یعنی وہاں فردیت پر توجہ اس لئے نہیں مرکوز کی گئی تھی کہ لوگ بکھر جائیں، بلکہ ایسا اس لئے ہوا تھا کہ ان کے سامنے وابستہ ہونے کے لئے دیگر اکائیوں کے امکانات آجائیں۔

جبکہ ہم نے معاشرہ کا تصور اس طرح قائم کیا کہ فرد کا تعلق براہ راست قومی جماعت، ریاست یا پارٹی سے ہو، اس طرح ہم نے بیچ کی کڑیوں کو نظر انداز کر دیا۔

اور جب پوری قوم افراد ہوگئی تو فرد بھی حاکم ہوگیا، اس لئے کہ اس کو قابو میں رکھنے کے ادارے پابند تھے، اور اس لئے کہ اس وقت انتساب کی بس ایک عام اکائی پائی جاتی تھی جو اسے دیگر افراد سے الگ مانتی تھی۔

حکیم بشری کا مقصود اس تصور کی تحدید کر کے شہریت کی تربیت تھی، اگر ہم تربیت کے اپنے نظام کو تشکیل اور سرگرم کرنا چاہیں تو ہم اس پروجیکٹ کے قواعد استعمال کر سکتے ہیں، بشری کے نزدیک شہریت کی تربیت ایسی متمدن تربیت کی شہریت نہیں ہے جو ایک ''عالمی شہری'' بنانا چاہتی ہے، اور اس طرح فرد کا تعلق وطن سے توڑ دیتی ہے، بشری کے نزدیک شہریت وطن کے ذریعہ ہی ہوتی ہے، یہ نظریہ استبداد اور بیرونی قبضہ کی ہر قسم کو روکتا ہے۔

۱۴-سیاسی جماعت کا جامع فقہی اصول:

یہ وضاحت بہت اہم ہے کہ فقہ اسلامی کا آغاز وارتقاء عرب ماحول میں ہوا، عراق، حجاز، شام ومصر میں جو مکاتب فکر سامنے آئے وہ بھی اسی بنیاد پر آئے، یعنی وہ فقہ ہے جسے عربوں کے لئے ترتیب دیا گیا ہے، یہ بتانا بھی بہت اہم ہے کہ یہ بات پہلے سنہوری نے بھی اپنے ایک مقالہ ''عرب سول قانون'' میں کہی ہے، اس فقہ پر عرب ممالک صدیوں عمل پیرا رہے

ہیں، اس لئے یہ ان عناصر میں سے ایک ہے جو عرب اتحاد و تاریخی رابطہ کا سامنا بہم پہنچاتے ہیں، سول قانون کے ماہر ڈاکٹر شفیق شمامۃ نے ۱۹۶۰ء میں لکھا تھا کہ ''عرب ممالک کے زمانۂ عروج میں وہاں ایک ایسا قانون نافذ تھا جو ان ممالک کے باشندگان کے عقیدہ کی دین تھا، یعنی شریعت اسلامی، صدیوں اسلامی شریعت عرب زندگی کے مختلف گوشوں میں نافذ رہی، اب اگر ہم عرب ممالک کو ان کے اصل عناصر کی طرف لے جانا چاہتے ہیں تو ہمارے لئے اس سرچشمہ سے استفادہ لازم ہوگا، تاکہ ہم اس سے حالات زمانہ کے مطابق نظام اخذ کرسکیں''۔

پھر عرب ممالک میں قانون سازی کے مصادر آج کل جیسے گوناگوں ہیں ان کے ہوتے ہوئے ان میں اتحاد پیدا کرنا بہت مشکل ہے، ان میں سے کچھ قوانین لاطینی قانونی سے مستفاد ہیں، جیسے مصر، شام ولبنان کے قوانین کچھ قانون سکیس قوانین سے مستفاد ہیں، جیسے سوڈان کا قانون اور عراق کے کچھ قوانین، بعض قوانین شریعت سے مستفاد ہیں، جیسے سعودی عرب و یمن کے قوانین، کچھ قوانین میں تشریع اسلامی کو مغربی قوانین سے ملا دیا گیا ہے جیسے عراق کا سول قانون، بعض قوانین شرعی قوانین سے ماخوذ ہیں، جیسے سعودی عرب و یمن کے قوانین۔

دوسرے پہلو سے دیکھیں تو اسلامی قانون عربوں اور عرب ممالک میں آباد غیر عرب اقلیتوں (بربر اور کرد وغیرہ) کے درمیان ایک نقطۂ اتحاد بھی ہوسکتا ہے (۲۱)۔

''اللہ شیخ عبدالوہاب خلاف کو غریقِ رحمت کرے، جنہوں نے یہ لکھا ہے کہ اس مسئلہ میں مسلمانوں کا قانون یا تو باہمی محبت پر مبنی ہوگا تو وہ وسعتوں والا ہوگا، یا پھر ٹکراؤ والا ہوگا تو تنگیوں کا باعث ہوگا، اس لئے کہ یہ ایک ایسی فرع ہے جو جماعت کے مصالح کی رعایت کرتی ہے اور ان امور میں اس کے تابع ہوتی ہے ......'' جدت و گوناگونی کی صلاحیت پائی جانے کی وجہ سے نفاذ شریعت کی بابت غور وفکر کرتے ہوئے تمام لوگوں کا یہ حق ہوگا کہ ان کے ساتھ اسلامی نقطہ ہائے نظر واضح کردیئے جائیں، قطعی احکام اور ان فقہی اجتہادات کے درمیان فرق کیا جائے جنہیں قبول ورد کیا جاسکتا ہے اور جن میں زمان ومقام کی رعایت سے تبدیلی کی جاسکتی ہے (۲۲)۔

۱۵- مقاصدی اصول اور شہریت کی از سرنو تعریف:

دین کلی مقاصد کے ایک نظام سے عبارت ہے جو دین کے اصولوں، نیز نفس، نسل، عقل و مال کی حفاظت کے لئے ہوتے ہیں۔

''دین اللہ پر ایسا ایمان پیدا کرتا ہے جو لوگوں کی دنیا حقیقی معنیٰ میں بناتا ہے، دین تہذیب ساز عقیدہ اور معاشرہ کی مربی عبادت بھی تشکیل دیتا ہے''۔ دین نام ہے: ایسی زندگی، طرز عمل اور قانون سازی کا جو صرف چند الفاظ روایات اور جامد مظاہر میں منحصر نہیں ہوتا ہے......'' وہ زندگی کا اور گرد و پیش کے حالات میں راہنما دین ہے۔

کوئی فی نفسہ صالح شخص اس وقت تک نجات نہیں پا سکتا جب تک وہ اجتماعی اصلاح کی کوشش نہ کرے، معاشرہ کی اصلاح میں اس کی بھلائی ہے، اس طرح وہ خود بھی صالح ہوگا، دوسروں کو، اپنی جماعت کو اور اپنے معاشرہ کو صالح بنائے گا۔

دین کو نافذ کرنے کی کوشش کرنا اور اسے حاشیہ پر ڈالنے کی کوشش کرنا، دینی سرگرمیوں کو بڑھانا یا انہیں کم کرنا یہ تمام امور دین کے اقتدار اور مقتدرہ کے دین کے درمیان کی کشمکش کے مظاہر ہیں (۲۳)۔

چونکہ عام کلی مقاصد ایک علمی، تحقیقی اور منہجی ڈھانچہ تشکیل دیتے ہیں اور استفادہ و برتنے کے میدان فراہم کرتے ہیں، اس لئے دین مقصد (حفاظتِ دین اہم تر مقصد ہے، اور دیگر مقاصد، یعنی حفاظت نفس، نسل، عقل و مال انسانی کی تعمیر کے عناصر ہیں، یہ قواعد ''انسانی گھر کے چار ستونوں پر تعمیر سے عبارت ہیں، ایسا ''انسانی ترقی'' یا ابن جلدوں کی تعبیر میں ''انسانی عمرانیات'' اور انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ رپورٹس کی زبان میں زندگی کی نوعیت کے عناصر کے تحت ہوتا ہے۔

دین کا یہ کلی مقاصدی نظریہ ان تمام میدانوں سے ماخوذ ہوتا ہے، اور یہ دین کے فعل، اس کی تفعیل اور اس کی فاعلیت سے متعلق ہوتا ہے: (وہ دین جس کی اتباع کی جائے، باعزت نفس، ایک سرگرم و مؤثر مضبوط نسل، مدبر سمجھ دار عقل، زمانہ کی سرسبزی اور عمرانیات رفتار بتانے والا مال)۔ یہ دین کے ہمہ گیری عام کلی مقاصدی نظریہ کا سسٹم ہے (۲۴)۔

مقاصدی نقطۂ نظر سے شہریت:

دین سے صرف نظر کئے بغیر شہریت کی سرگرمی:

شہریت کی مقاصدی تاسیس	مقاصد کے مراتب مقاصد کے میدان	دفع ضرر جلب مصلحت پر مقدم ہے۔	ضروری	حاجی	تحسینی	اہمیت جاننے کے عناصر
شہریت اور دین	حفاظت دین، پالسیز، ادارے تعلقات، صلاحیتیں امکانات اہداف	دفع ضرر۔ سلبی حفاظت	شہریت کی ضروریات (کفاف)	شہریت کی حاجیات (کفایت)		شہریت کی تحسینیات (تکمیل، احسان)
شہریت اور انسان کے بنیادی حقوق	حفاظت نسل					
شہریت اور نسانی ترقی انسانی کی عمرانیات	حفاظت نسل					

شہریت اور فہم وآگہی	حفاظت عقل					
شہریت اور معاشیات	حفاظت مال					

۱۶-سماجی تعلقات کے نظام کی تاسیس: ایک معاشرہ کی تشکیل:

فرد و معاشرہ کے درمیان تعلق کے سیاق میں (۲۵) اس تعلق کو ایک ایسے ماڈل کے تحت تشکیل دیا جاسکتا ہے جو جماعت اور جماعیت کے مقام کی حفاظت کے ساتھ فرد کا تحفظ کرنے والے تعلقات کو منظّم کرتا ہے، یہ نظام جہد فرد و جماعت کے درمیان مطلوبہ توازن پیدا کرتا ہے، وہیں وطنی جماعت اس ماڈل کی تشکیل کے لئے بہت اہم عناصر تشکیل دیتی ہے۔

اس نظام کو ہم کشتی والا ماڈل کہہ سکتے ہیں، اس سے مراد وہ ماڈل ہے جو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

''حدود خداوندی کا لحاظ کرنے والوں اور ان کا لحاظ نہ کرنے والوں کی مثال ایک ایسی قوم کی ہے جنہوں نے ایک کشتی پر سوار ہونے کے سلسلے میں قرعہ اندازی کی، بعض لوگوں کو اس کی بالائی منزل میں جگہ ملی تو کچھ کو زیریں میں، نیچے والوں کو پانی لینے کے لئے اوپر والوں کے پاس سے گزرنا پڑتا تھا، اس لئے انہوں نے کہا کہ اگر ہم اپنے ہی حصہ میں سوراخ کرلیں تو ہم اوپر والوں کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے، اگر اوپر والوں نے ان کو ان کے اس ارادہ سے باز نہ رکھا تو سب سوار ہلاک ہو جائیں گے، اور اگر انہوں نے ان کو ایسا کرنے سے روک دیا تو سب بچ جائیں گے (بخاری)۔

یہ حدیث موقفوں اور احکام کا ایک مکمل نظریہ و نظام پیش کررہی ہے، جس سے تحقیقی مقصد تک پہنچنے کے لئے چہ جائیکہ سماجی، تربیتی و تہذیبی اہداف تک پہنچنے کے لئے صرف نظر کرنا ممکن نہیں ہے۔

۱۷-تربیتی اصول: ایک مشترکہ زندگی:

اس بنیادی مقصد کے حصول کے لئے مکالمہ کے ذریعہ سماجی تانے بانے اور ایک زندگی کی اصول سازی کے مقصد سے شہریت کے ذریعہ وطنی جماعت میں داخلہ کے دائرہ میں ایک زندگی۔ ایک ایسے دائرہ میں جو مشترکہ زندگی اور باہمی تعارف کے اصول بناتا ہے۔

مشترکہ زندگی فردیت، جماعت، گروہ، انضمان اور علیحدگی جیسے افکار سے مختلف نہیں ہے، اسی طرح یہ مشترک کی تعظیم، کی تنظیم اور تنوع کی تکمیل کے امکانات سے بھی دور نہیں ہے، اس لئے کہ یہ تمام امور اختلاف کی جگہ اتحاد کا طریقہ اختیار کرنے سے عبارت سمجھے جاتے ہیں (۲۶)۔

۱۸-وطنی جماعت کی تاسیس کے اصول (اقلیت، تعدد، شہریت اور وطن):

وطن کے ذریعہ شہریت کے اتحاد کو جاننا بہت ضروری ہے، اس کے لئے یہ ضروری ہے کہ ہم وطنی جماعت کی تاسیس

کے اصول اس میں ضم ہونے کے قواعد، اور خود اس جماعت کے ذریعہ اپنی تاریخ، عرفوں اور اپنے عام نظام کے قواعد کی روشنی میں طے کردہ سرگرمیوں میں اضافہ کو جانیں، مثلاً حکیم بشری نے لکھا ہے: اگر مصر کی معاصر تاریخ سے کوئی قاعدہ وطنی جماعت کی تشکیل، اور اس کے اندر اس کے متعدد و گوناگوں عناصر کے انضمان کی بابت بنایا جاسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ اس وطنی جماعت کے عناصر بیرونی خطرات سے حفاظت، اور اپنی اراضی، اپنے فکری ثوابت، اور اپنی دورگامی معاشی وسیاسی مصلحتوں سے دفاع کے لئے اپنے اجتماعی شعور کے بعد وہی باہم معاون ہوتے ہیں۔

بیرونی خطرات اس اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، ہم وہ اقوام ہیں جن کی وطنی جماعت نے بیرونی خطرات سے اپنا اور جماعتی ورثہ کا دفاع اتحاد کے ساتھ کیا ہے، خارجی اثرات جس قدر بڑھتے ہیں علیحدگی کا رجحان اتنا ہی طاقتور ہوتا ہے، اور اس خارجی نفوذ کے وطنی مقابلہ کی طاقت کے ساتھ انضمان کا رجحان بڑھتا ہے (۲۷)۔

اس موقعہ پر چندان عناصر سے واقف ہوا جاسکتا ہے جن کی طرف یہ قانون اشارہ کرتا ہے:

۱- وطنی جماعت کی تشکیل، اور اس کے متعدد ومتنوع عناصر کا انضمان۔

۲- خارجی خطرات سے حفاظت کے سلسلے میں وطنی جماعت کا اتحاد

۳- وطنی جماعت، اس کی صلاحیت اور اس کے تسلسل کے کچھ بالادست عام قواعد ہیں۔

۴- خارج بسااوقات اتحاد توڑنے میں کردار ادا کرتا ہے۔

۵- خارجی نفوذ کے بڑھنے کے ساتھ علیحدگی کا رجحان بڑھتا ہے، اور وطن کو درپیش مسائل، خطرات و چیلنجس کے مقابلہ کے لئے وطنی اتحاد وقوتِ مقابلہ کے ساتھ انضمان کا رجحان بڑھتا ہے۔

اس پس منظر میں مسلمانوں اور قبطیوں کے درمیان اتحاد کا سررشتہ ڈھونڈا جاسکتا ہے، اہم ترین بات یہ ہے کہ مسلمان قبطیوں کو علیحدہ نہ کریں، وہ ان کو الگ تھلگ نہ کریں، یہ پوری وطنی جماعت کی مشترکہ ذمہ داری ہے، اس لئے کہ اس کی توجہ کا مرکز صرف وطن اور شہریت کو ہونا چاہئے، کہ یہ دونوں فرقہ وارانہ فتنہ کے عناصر سے حفاظت کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ کسی بھی معاشرہ و جماعت کو اس کے بقدر مالدار سمجھنا چاہئے کہ بقدر غنی نہیں سمجھنا چاہئے، بلکہ اسے اس کے سرگرم مثبت ومفید افکار کے بقدر مالدار سمجھنا چاہئے، اور افکار کی سرگرمی تعلقات کے نٹ ورک کے تابع ہوتی ہے، لہذا ان ضروری تعلقات کے بغیر اشخاص، افکار واشیاء کے ملتے جلتے عمل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، تعلقات جس قدر محکم ہوں گے عمل اتنا ہی مؤثر ہوگا، جب اشخاص اور نظام افراط کا شکار ہوں گے تو سماجی تعلقات فاسد ہوں گے، اور مشترکہ سماجی عمل مشکل یا ناممکن ہوجائے گا، کہ پھر مباحثہ مسائل کے حل کے لئے نہیں باہمی لڑائی جھگڑے کے لئے ہوگا، صحت مند صورت حال میں مسائل پر مباحثہ ان کے حل کے لئے ہوتا ہے، بصورت دیگر ان پر مباحثہ باہمی

اختلافات بھڑکاتا ہے، اور ایسی صورت میں ان کا حل مشکل ہوجاتا ہے، ایسا افکار واشیاء کے دیوالیہ پن کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ اس لئے ہوتا ہے کہ تعلقات کا نظام فطری رخ پر قائم نہیں ہوتا ہے۔

(۱) سیف عبدالفتاح، عواقب الدولة القومية، فی حولية أمتي والعالم، تحریر ونگرانی: ڈاکٹر نادیہ مصطفیٰ، سیف عبدالفتاح، قاہرہ۔

(۲) سیف عبدالفتاح، ہندسۃ الاجتہاد المقاصدی۔

(۳) سامر مؤید عبداللطیف، المعالجة الإسلامية لإشكاليات المواطنة: رؤية تحليلية معاصرة، عراق، جامعہ کربلاء کلیۃ القانون، ۲۰۰۹ء۔

(۴) نزیہ نصیف ایوبی ''العرب ومشكلة الدولة''۔

(۵) سیف الدین عبدالفتاح ''مقدمات أساسية حول عملية بناء المفاهيم''، ڈاکٹر علی جمعہ، ڈاکٹر سیف الدین عبدالفتاح (نگرانی) بناء المفاہیم دراسۃ معرفیۃ ونماذج تطبیقیۃ، المعہد العالمی للفکر الإسلامی، طبع اول ۱۹۹۸ء، ۱/ ۲۷۔

(۶) سیف عبدالفتاح، ہندسۃ الاجتہاد المقاصدی، حوالہ بالا۔

(۷) سیف عبدالفتاح، المدخل المقاصدی واعتبارات السیاق۔

(۸) سیف الدین عبدالفتاح، تجدید الخطاب الدینی من الحملۃ الفرنسیۃ إلی الحملۃ الأمریکیۃ۔

(۹) طارق بشری، الوضع القانونی بین الشریعۃ الإسلامیۃ والقانون الوضعی، قاہرہ: دارالشروق، طبع دوم، ۲۰۰۵ء ص: ۱۴۰۔

(۱۰) طارق بشری، المسلمون والأقباط فی إطار الجماعۃ الوطنیۃ، قاہرہ: دارالشروق، طبع دوم، ۱۹۸۸ء، ص: ۵۔

(۱۱) ''آیۃ اللہ'' مہدی شمس الدین، فی الاجتماع السیاسی الإسلامی، بیروت: المؤسسۃ الدولیۃ للدراسات والنشر، طبع دوم، ۱۹۹۹ء، ص: ۲۶۴-۲۶۵۔

(۱۲) ایضاً، ص: ۲۶۶۔

(۱۳) احمد قائد شعیبی، وثیقۃ المدینۃ المضمون والدلالۃ، کتاب الأمۃ، قطر: وزارۃ الأوقاف، شمارہ: ۲۰۰۶ء ۱۱۰۔

(۱۴) اگلی سطریں پڑھنے سے پہلے خیال رہے کہ عربی میں شہریت کو (المواطنۃ) کہتے ہیں، اس لئے لغوی بحث کرتے ہوئے اسی لفظ کے اعتبار سے گفتگو کی گئی ہے۔

(۱۵) سامر مؤید، المعالجۃ الإسلامیۃ لإشکالات المواطنۃ۔

(۱۶) اس سلسلے میں ملاحظہ ہو: ڈاکٹر ہبہ رؤوف کی تحریریں، بالخصوص ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ: دراسۃ لتطور المفہوم فی الفکر اللیبر الی، (غیر مطبوعہ) جامعہ قاہرہ: کلیۃ الاقتصاد والعلوم السیاسۃ، ۲۰۰۷ء۔

(۱۷) سیف عبدالفتاح، الفرد والعقیدۃ والدولۃ۔

(۱۸) حوالہ بالا المعالجۃ الإسلامیۃ للمواطنۃ۔

(۱۹) سیف عبدالفتاح، الحکم الراشد۔

(۲۰) ابن تیمیہ: الحسبۃ فی الإسلام۔

(۲۱) طارق بشری، فی المسئلۃ الإسلامیۃ المعاصرۃ......الوضع القانونی المعاصر بین الشریعۃ الإسلامیۃ والقانون الوضعی، قاہرہ: دارالشروق، طبع اول، ۱۹۹۶ء، ص: ۳۸۔

(۲۲) حوالہ بالا، ص: ۱۱۲۔

(۲۳) سیف عبدالفتاح، الزحف غیر المقدس، تأمیم الدولۃ للدین، ص: ۱۰۲۔

(۲۴) سیف الدین عبدالفتاح، نحو واقع سدید۔

(۲۵) مالک بن نبی، میلاد مجتمع۔(شبکۃ العلاقات الاجتماعیۃ)، ترجمہ: عبدالصبور شاہین، قاہرہ، مطبع دارالجہاد، ۱۹۶۲ء۔

(۲۶) سیف عبدالفتاح، التربیۃ المدنیۃ۔

(۲۷) طارق بشری، فی المسألۃ الإسلامیۃ المعاصرہ......الوضع القانونی المعاصر، ص: ۳۸۔

☆☆☆

شہریت اور پناہ گزینوں سے متعلق حقوق

سیرت نبوی کی روشنی میں، اور بین الاقوامی قوانین سے موازنہ کے ساتھ

ڈاکٹر رشید کھوس☆

مقدمہ

الحمد لله الذى جعل مدد النبوة مستمرة السريان فى الامة،وأبقى نورهادائم الاشراق فضلا منه ورحمة، وأشهد أن لااله الاالله خالق الارض والسموات ،وأشهد أن سيدناوحبيبناوشفيعنامحمدا المبعوث الى كافة البريات صلى الله عليه وعلى آله الطيبين وأصحابه المكرمين وأزواجه الطاهرات۔

امابعد!

اللہ تعالی فرماتے ہیں:

”**ولقدكرمنابنى آدم وحملناهم فى البروالبحر ورزقناهم من الطيبات وفضلناهم على كثيرممن خلقناتفضيل**“(سورہ اسراء:۷۰)۔

(اور یقیناً ہم نے اولاد آدم کو بڑی عزت دی ہے اور انہیں خشکی اور تری کی سواریاں دیں اور انہیں پاکیزہ چیزوں کی روزیاں دی اور اپنی بہت سی مخلوق پر انہیں فضیلت عطا فرمائی)۔

اللہ تعالی نے دین اسلام کو جوکہ تمام شریعتوں کا خاتم ہے،ان تمام تعلیمات کا حامل بنایا ہے جوانسان کی پوری

☆ پروفیسر: کلیۃ اصول الدین، جامعۃ القرویین،تطوان،مراکش
صدر: مرکز آل عمران للدراسات والبحوث فی فقہ الاسرۃ والتغیرات المعاصرۃ
صدر: مجموعۃ البحث فی السنن الالہیۃ فی القرآن والسنۃ والتاریخ،کلیۃ اصول الدین،تطوان
رکن: الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین
رکن: الہیئۃ العامۃ لفعالیۃ محمد رسول اللہ ﷺ الدولیۃ
رکن: اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا)۔
مترجم: منور سلطان ندوی (رفیق علمی دارالافتاء، دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ)

زندگی کے لئے کافی ہے، نیز جو ہر انسان کے لئے متعین حقوق کی ایسی وضاحت کرتا ہے جو شک اور اختلاف سے دور ہے، اور جو انسان کو مقام بلند عطا کرتا ہے، اور انسان کے لئے ایسے حقوق کو لازم قرار دیتا ہے جو کافی ہے اور بلندی کو پہونچا ہوا ہے۔

جن حقوق کو اسلام نے نظری اور تطبیقی دونوں اعتبار سے مقرر کیا، اور انہیں اس حد تک ترقی دی کہ انہیں دین کا لازمی اور ضروری حصہ قرار دیا جس میں خلل ڈالنا حرام ہے، انہی حقوق میں شہریت اور پناہ گزینوں کے حقوق بھی ہیں، یہ حقوق انسانیت کی تکریم، ان کے درمیان تعلق کو مضبوط کرنے اور سیاسی حد بندیوں سے قطع نظر عام انسانی بھائی چارہ کا احساس دلانے کے لئے ہیں۔

ان حقوق کا سرچشمہ اسلامی شریعت کے متعدد مصادر ہیں، اور ان کا مقصد مصالح کو بروئے کار لانا، مفاسد کو دور کرنا، انسان کے ساتھ ہمدردی اور زمین میں خلافت کو یقینی بنانا ہے۔

اس موضوع کی اہمیت اور ضرورت کے تناظر میں ہم نے اس کے اہم گوشوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، تاکہ شہریت اور پناہ گزینوں سے متعلق اسلامی تصور کے نقوش کو سامنے لایا جائے، کیونکہ یہ انسانی حقوق کے ان اہم مسائل میں سے ہیں جن کی طرف اس زمانہ میں ادارے، سرکاری وغیر سرکاری تنظیمیں اور حقوق سے متعلق جماعتیں خاص توجہ دے رہی ہیں، نیز یہ ان مسائل میں سے ہیں جن کے صحیح و مکمل اور جامع تصور کو اسلامی شریعت اور فقہ الواقع سے مستفاد رائے کی روشنی واضح کرنا ضروری ہے۔

اس مقالہ کو ہم نے دو مرکزی محاور میں تقسیم کیا ہے:

پہلا محور شہریت سے متعلق حقوق کے لئے خاص ہے، اس باب میں اسلام میں شہریت کے معنی اور معاہدۂ مدینہ کی روشنی میں شہریت کے حقوق ذکر کیا ہے، کیونکہ معاہدۂ مدینہ پوری شہریت کا عمدہ نمونہ ہے۔

آخری محور پناہ گزینوں کے حقوق پر مشتمل ہے، اس باب میں پناہ گزینی کے معنی اور اسلامی شریعت اور بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں پناہ گزینوں کے حقوق کو بیان کیا ہے، اور اخیر میں پناہ گزینی کے خاتمہ کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔

اس تمہید کے اختتام پر اسلامک فقہ اکیڈمی کا شکریہ ادا کرنا اور اسلامی شریعت کے تئیں ان کی گراں قدر خدمات پر مبارک باد پیش کرنا ضروری ہے، اور خاص طور پر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی، محترم مولانا امین عثمانی ندوی صاحب اور اکیڈمی کے تمام رفقاء کا شکریہ ادا کرتا ہوں، اور دست بدعا ہوں کہ اللہ عزوجل آپ تمام حضرات کی کوششوں کو آپ کے حسنات میں شامل فرمائے، آپ کے ذریعہ امت کو خوب خوب نفع پہونچے اور جہالت کے پردے چاک ہوں۔

اللہ تعالی سے ہم توفیق، راستی اور ہدایت طلب کرتے ہیں، بیشک وہی سب سے زیادہ سننے والا اور سب سے زیادہ

قبول کرنے والا ہے۔

پہلا محور: شہریت کا اسلامی تصور

ا۔ اسلام میں وطن کی حیثیت

لفظ 'مواطنۃ' عربی زبان میں وطن کی جانب انتساب میں شرکت اور وطن کے حقوق کی ادائیگی کو بتاتا ہے، لغوی اعتبار سے مفاعلت کا صیغہ دو یا دو سے زیادہ افراد کا کسی عمل کی ادائیگی میں شرکت کو بیان کرتا ہے، جیسے لفظ مجادلہ اور مناقشہ وغیرہ، 'مواطنۃ' کے تین عناصر ہیں، وطن، وطن میں رہنے والے، اور وطن کی طرف انتساب میں شعوری اور عملی شرکت، وطن سے متعلق حقوق کی ادائیگی، وطن کا دفاع اور اس کی ترقی کے لئے کوشش وغیرہ۔

شہریت سلامتی، امان اور باہم زندگی گزارنے کے اہم ترین قدروں میں سے ہے، جو وطن سے متعلق ذمہ داریوں، اور وطن کی طرف نسبت کی ذمہ داری کے احساس پر قائم ہے، یہ محض قیام کرنے یا کہیں رہنے کے مفہوم سے بڑھ کر ہے۔

اسلامی تناظر میں وطن اس جگہ کو کہتے ہیں جسے انسان وطن بنائے، جہاں رہے، قیام کرے، اور جس کی طرف نسبت کرے، کبھی اس لفظ کی وسعت میں قوم اور امت بھی شامل ہوتی ہے، اور کبھی یہ لفظ اس قدر تنگ ہوتا ہے کہ صرف ایک خاندان کے جائے قیام کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، ایک خاتون نے اپنے قبیلہ کی زمین کا دفاع کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

"**وهی وطنی وداری**" (سنن ابی داؤد، کتاب الخراج الفیئ والامارۃ، باب ماجاء فی أقطاع الأرضین، حدیث نمبر: ۳۰۷۰)۔

قرآن واحادیث میں لفظ 'موطن' متعدد بار آیا ہے، یہ لفظ عموماً ایسی جگہ کو بتاتا ہے جہاں انسان رہتا ہے اور جسے مستقر بناتا ہے یا جہاں واقعات پیش آتے ہیں، اسی مفہوم میں اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**لقد نصركم الله فی مواطن كثيرة**" (سورہ توبہ: ۲۵)

(بے شک اللہ تعالی نے بہت سے موقعوں پر تمہاری نصرت کی ہے)۔

اور اسی مفہوم میں اللہ کے رسول ﷺ کا یہ ارشاد گرامی ہے:

"**مامن امری یخذل امرا مسلما عند موطن تنهک فیه حرمته وینتقص فیه من عرضه إلا خذله الله عزوجل فی موطن یحب فیه نصرته ومامن امری ینصر امرا مسلمافی موطن ینتقص فیه من عرضه وینتهک فیه من حرمته إلا نصره الله فی موطن یحب فیه نصرته**" (مسند احمد بن حنبل، ج۲۶، ص: ۲۸۸)۔

(جو شخص کسی مسلمان کو ایسے وقت رسوا کرتا ہے جب اس کی بے عزتی کی جارہی ہو تو اللہ تعالی اس آدمی کو اس وقت

ذلیل وخوار کرتا ہے جب وہ اللہ کی مدد کا طالب ہوتا ہے،اور جو شخص کسی مسلمان کی ایسے موقعہ پر مدد کرتا ہے جب اس کے عزت سے کھلواڑ کیا جار ہا ہوتو اللہ تعالی اس شخص کی اس وقت نصرت فرماتے ہیں جب وہ اللہ کی نصرت کا طلبگار رہوتا ہے)۔

مزید یہ کہ وطن سے نکالنے کو قرآنی نصوص قتل سے کم تصور نہیں کرتا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"فالذین ھاجروا واخرجوامن دیارھم واوذوا فی سبیلی وقاتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیئاتھم ولأدخلنھم جنات تجری من تحتھاالانھارثوابا من عند الله والله عندہ حسن الثواب"(سورہ آل عمران:۱۹۵)۔

(جن لوگوں نے ہجرت کی اوراپنے شہر سے نکالے گئے اور بھی تکلیفیں انہیں میری راہ میں دی گئیں اوروہ لڑے اور مارے گئے ان کی خطائیں ضروران سے معاف کردی جائیں گی،اور میں ضرورانہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، اللہ کے پاس سے ثواب ملے گا اور اللہ ہی کے پاس تو بہترین ثواب ہے)۔

اور وطن سے نکالنے کو روح نکالنے کے مساوی قرار دیتا ہے:

"ولوانا کتبناعلیھم ان اقتلوا انفسکم أو اخرجوا من دیارکم مافعلوہ الا قلیل منھم"(سورہ نساء:٦٦)۔

(اور اگر ہم نے ان پر فرض کر دیا ہوتا کہ اپنے آپ کو مارڈالو یا یہ کہ اپنے وطن سے نکل جاؤ تو اس کو بس تھوڑے لوگ ہی کرتے)۔

اسی طرح دین کی نصرت کی خاطر زبردستی وطن سے نکلنے کو ایثار کا اعلی مرتبہ قرار دیتا ہے،اور یہ بات تاکید کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ جو اپنے وطن سے نکلتا ہے وہ اللہ کی نصرت کا مستحق ہوتا ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"الذین اخرجوا من دیارھم بغیرحق الا أن یقولوا ربنااللہ ولولادفع الله الناس بعضھم ببعض لھدمت صوامع وبیع وصلوات ومساجد یذکر فیھااسم الله کثیرا ولینصرن الله من ینصرہ ان الله قوی عزیز"(سورۂ حج:۴۰)۔

(یہ وہ مظلوم ہیں جو بغیر کسی حق کے اپنے گھروں سے نکال دئے گئے،ان کا کوئی جرم نہ تھا،اگر تھا تو صرف یہ کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار صرف اللہ ہے،اگر اللہ بعض آدمیوں کے ہاتھوں بعض آدمیوں کی مدافعت نہ کراتا تو کسی قوم کی عبادت زمین پر محفوظ نہ رہتی،خانقاہیں،گرجے،عبادت گاہیں،مسجدیں جن میں اس کثرت کے ساتھ اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے سب کبھی کے ڈھائے جاچکے ہوتے،جو کوئی اللہ کی حمایت کرے گا اللہ اس کی مدد ضرور فرمائے گا،بیشک وہ قوت رکھنے والا اور سب پر غالب ہے)۔

لفظ 'موطن' شہر کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے، اور وہ ایسی جگہ ہے جس سے انسان شعوری طور پر وابستہ ہوتا ہے اور اس کی طرف لوٹ کر آتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے ذہن میں وطن کی محبت پوری طرح راسخ تھی، چنانچہ جب آپ کی قوم آپ کی زندگی کے درپے ہوگئی اور آپ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے تو مکہ کو الوداع کہتے ہوئے فرمایا:

"ما أطيبک من بلد واحبک إلی ولولاأن قومی اخرجونی منک ماسکنت غیرک" (سنن الترمذی، کتاب المناقب، باب فی فضل مکۃ، حدیث نمبر: ۳۹۲۶)۔

اور مدینہ میں قیام پذیر ہونے کے بعد جب صحابہ کرامؓ کو وطن سے جدائیگی کا غیر معمولی احساس ہوا اور اپنے وطن مکہ کے لئے ان کا اشتیاق بڑھنے لگا تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے یہ دعا فرمائی:

"اللهم حبب إليناالمدينة كحبنامكة أو أشد" (صحیح البخاری، کتاب فضائل مدینۃ، باب کراہیۃ النبی ﷺ ان تعری المدینۃ، حدیث نمبر: ۱۷۹۰)۔

اسلام کا شہریت سے جو رشتہ ہے وہ اس بات کو لازم قرار دیتا ہے کہ اسے شریعت کے کلی مقاصد اور سماجی تعلقات کے تصور میں تلاش کیا جائے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اسے شرعی نصوص اور فرد کے سماجی نظام سے متعلق جزئی احکام میں تلاش کیا جائے۔

یہاں یہ ذکر ضروری ہے کہ شہریت کے فروغ کے سلسلہ میں اسلام کی کوششیں تمامتر اس کے اس خاص اسلوب سے ہم آہنگ ہیں جو اس نے اخلاقی قدروں کو ثابت کرنے میں اپنایا ہے، وہ اسلوب یہ ہے کہ جس بات کی رہنمائی کی جائے اسے عبادت کے لبادہ میں پیش کیا جائے، تاکہ اللہ کی اطاعت سمجھ کر فرد اسے قبول کرے، اور اس کی عدم ادائیگی اللہ کی معصیت قرار پائے، یہ بات شہریت سے متعلق احکام میں زیادہ لزوم پیدا کرتا ہے، بنسبت اس کے کہ اس میں سے عبادت کا مفہوم نکال دیا جائے، اور یہ اسلام کی امتیازی خصوصیت ہے جو اس نے معاشرہ کی اصلاح میں اختیار کیا ہے۔

شہریت سے اسلام کا تعلق اس سے بھی پوری طرح واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے "حلف الفضول" کو پسند فرمایا، اس معاہدہ میں آپ بذات خود اپنے عہد شباب میں شریک ہوئے، اسلام سے قبل قریش نے یہ معاہدہ کیا، اور اس کا نام حلف الفضول اور حلف المطیبین رکھا گیا، اس معاہدہ کا پس منظر یہ ہے کہ جب قریش کے بعض سربرآوردہ لوگوں نے دیکھا کہ ان کے بعض افراد اپنے سماجی مقام ومرتبہ کا غلط فائدہ اٹھاتے ہوئے لوگوں پر ظلم کرنے لگے ہیں، عاص بن وائل بھی ایسے لوگوں میں تھے، اس نے کسی پردیسی تاجر سے جو مکہ آیا ہوا تھا کچھ تجارتی سامان خریدا، اور پھر قیمت ادا کرنے سے انکار کردیا، چنانچہ قریش عبداللہ بن جدعان کے گھر جمع ہوئے اور تمام لوگوں نے یہ معاہدہ کیا کہ وہ ظالم کے

مقابلہ میں ہر مظلوم کے ساتھ متحد ہوں گے،ان لوگوں نے پردیسی تاجر کو قیمت دلوایا،اس معاہدہ میں ان کی روش سے مظلوموں کے ساتھ انصاف کرنے اوران کے حقوق کا مطالبہ کئے جائے کا اصول ثابت ہوا،خواہ یہ حق قوم کے چودھریوں اور رہنماؤں سے متعلق ہی کیوں نہ ہو،رسول اللہ ﷺ نے اس معاہدہ کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا:

"لقد شهدت فی دار عبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لی به حمر النعم ولوادعی به فی الإسلام لاحببت"(سنن البیہقی ۵/۵۹۶،حدیث نمبر:۱۳۰۸۰)۔

اور جن احکام سے شہریت کے حقوق اور معاشرہ سے تعلق پر اسلام کی توجہ اور خواہش ظاہر ہوتی ہے ان میں یہ بھی ہے کہ عبادت کا خاص تعلق معاشرہ اور اس معاشرہ کے افراد سے ہوتا ہے،گرچہ عبادت ایک ایسا عمل ہے جس کے ذریعہ بندہ اپنے رب اور خالق سے تعلق استوار کرتا ہے،عبادت کا معاشرہ اور سماج سے تعلق اس طرح بھی واضح ہے کہ بعض عبادات اسی وقت کامل طریقہ پر ادا ہوسکتی ہیں جب وہ لوگوں کی ایک جماعت کے ساتھ ادا کی جائیں،گویا لوگوں کا ساتھ ہونا اس عبادت کی شرائط میں سے ہے،چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"صلاة الجماعة تفضل صلاة الفذ بسبع وعشرين درجة"(صحیح البخاری،کتاب الاذان،باب وجوب صلاۃ الجماعۃ،حدیث نمبر:۶۱۹)۔

بعض عبادتوں کی ادائیگی دوسروں سے تعلق قائم کرنے پر موقوف ہے،اس کی مثالوں میں یہ ہے کہ اسلام میں توبہ،اللہ تعالی کی طرف یکسوئی اور بعض گناہوں کے ارتکاب کے بعد اللہ سے تعلق استوار کرنے کے لئے بعض کفارے متعین کیے گئے ہیں،اور یہ کفارے معاشرہ کے کچھ افراد کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی کے ذریعہ ہی ادا ہوسکتے ہیں،اس کا طریقہ ان کو کھانا کھلانا،کپڑا پہنانا اور غلامی کے طوق سے آزادی دلانا ہے،کفارہ کی حکمت سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ توبہ اور اللہ سے تعلق کا استوار ہونا معاشرہ کے بعض افراد کے ساتھ گھلنے ملنے اور ان کی تکالیف ومشکلات کو کم کرنے نیز ان کی لغزشوں کو معاف کرنے کے بغیر نہیں ہوسکتا،اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"لا يؤاخذكم الله باللغو فی أيمانكم ولكن يؤاخذكم بماعقدتم الأيمان فكفارته إطعام عشرة مساكين من أوسط ماتطعمون أهليكم أو كسوتهم أوتحرير رقبة"(سورہ مائدہ:۸۹)۔

(اللہ تم سے تمہاری بے معنی قسموں پر مواخذہ نہیں کرتا،لیکن جن قسموں کو تم مضبوط کرچکے ہوان پر تم سے مواخذہ کرتا ہے،تو اس کا کفارہ دس مسکینوں کو اوسط درجہ کا کھانا ہے جو تم اپنے گھر والوں کو کھانے کو دیا کرتے ہو،انہیں کپڑا دینا یا غلام آزاد کرنا ہے)۔

ان سب پر مستزاد یہ کہ متعدد عبادتوں،قربت کے اسباب اور طاعتوں میں دوسروں کو یاد رکھنے کا حکم

موجود ہے،مثلا زکوۃ،اورنفلی صدقات وخیرات وغیرہ،اس طرح کے احکام اتنے زیادہ ہیں کہ دوسرے مذاہب میں اس کی نظیر نہیں ملتی،اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"إنماالصدقات للفقراء والمساكين والعاملين عليهاوالمولفة قلوبهم وفى الرقاب والغارمين وفى سبيل الله وابن السبيل فريضة من الله والله عليم حكيم"(سورۂ توبہ:۶۰)۔

(صدقات توصرف غریبوں کااور محتاجوں اورکارکنوں کاحق ہے جوان پر مقرر ہے اور نیز ان کاجن کی دلجوئی منظور ہےاور گردنوں کے چھڑانے میں اورقرضداروں میں اوراللہ کی راہ میں اور مسافروں کی امداد میں اللہ کی طرف سے فرض ہے،اوراللہ بڑاعلم والااور بڑاحکمت والا ہے۔)

مزید یہ کہ اسلام معاشرہ کے تمام عناصر کے ساتھ اجتماعی تکافل کی دعوت دیتا ہے تاکہ معاشرتی ترقی ہو،اللہ تعالی کاارشادگرامی ہے:

"وتعاونوا على البروالتقوى ولاتعاونواعلى الاثم والعدوان واتقوا الله إن الله شديد العقاب"(سورہ مائدہ:۲)۔

(اورایک دوسرے کی مدد نیکی اورتقوی میں کرتے رہو،اورگناہ اورزیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو،اوراللہ سے ڈرتے رہو،بیشک اللہ سخت سزادینے والا ہے)۔

سماجی ومعاشرتی امورمیں شرکت لازم ہونے کی شکلوں میں سے قسامہ کامسئلہ بھی ہے،جیسا کہ ابن حمزہ نے بیان کیا ہے،قسامہ کی صورت یہ ہوتی ہے کہ جب کسی آبادعلاقہ کے کسی محلّہ میں کوئی مقتول پایاجائے اورقاتل معلوم نہ ہوتوحکم یہ ہے کہ وہاں کے باشندوں میں سے پچاس افرادمنتخب کئے جائیں گے جواس بات کی قسم کھائیں گے کہ انہوں نے مقتول کوقتل نہیں کیاہے،اوروہ لوگ قاتل کے بارے میں نہیں جانتے ہیں،اس وقت محلّہ کے تمام افراد پرقتل کی دیت لازم ہوگی،اگر یہ کہاجائے کہ جولوگ قتل کاذریعہ نہیں بنے وہ دیت کیوں اداکریں گے،تواس کاجواب یہ ہے کہ محلّہ کے لوگوں نے امن فراہم کرنے میں کوتاہی کی ہے،انہیں امن فراہم کرناچاہیے تھاخواہ پہرے دار رکھ کرہی ہو۔

اس سے ظاہرہوتاہے کہ امن فراہم کرنے میں پورے معاشرہ کی شرکت ضروری ہے،جس سے وہ سبکدوش نہیں ہوسکتے،موجودہ دورمیں امن قائم کرنے اورسکون فراہم کرنے کے سلسلہ میں بعض آلات بھی آچکے ہیں۔

اسلام جن احکام کے ذریعہ شہریت کی ثقافت اوراجتماعی ذمہ داری کوپختگی عطاکرتاہے ان میں یہ بھی ہے کہ اسلام میں فرائض کی دوتقسیم ہے،فرائض کفائی،اورفرائض عینی،فرائض عینی کاتعلق براہ راست افراد سے ہوتاہے،اورفرائض کفائی کاتعلق سماجی ڈھانچہ سے،اورجب بعض افراداس کوانجام دے دیتے ہیں توبقیہ افراد سے ذمہ ساقط ہوجاتاہے،لیکن جب

معاشرہ کے سارے افراد کوتاہی برتیں تو سب کے سب گنہ گار رہوں گے۔

اس بنیاد پر فرائض کفائی کی ادائیگی دراصل پورے معاشرہ کی طرف سے ادائیگی کے قائم مقام ہوتی ہے، اور اس میں وہ تمام سماجی امور شامل ہوتے ہیں جن کی ادائیگی معاشرہ کی ضرورت کے پیش نظر مطلوب ہوتی ہے، خواہ اس ضرورت کا تعلق امن سے ہو، صحت سے ہو، علم سے ہو، ترقی سے ہو، انصاف کے قیام سے ہو، یا اسلامی معاشرہ میں بہتر زندگی کے تقاضوں کی تکمیل سے ہو۔

اور جن احکام سے شہریت سے متعلق تعلیمات کے فروغ میں اسلام کی خصوصیت کا اظہار ہوتا ہے ان میں یہ بھی ہے کہ اسلام مسلمانوں کو اچھائی کی تلقین کرنے اور برائی سے روکنے کو لازم قرار دیتا ہے، قرآن کریم نے اس اہم فریضہ کو امت کی بہتری کا سبب قرار دیا ہے، اللہ عزوجل کا ارشاد گرامی ہے:

"كنتم خير امة أخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر وتومنون بالله" (سورہ آل عمران: ۱۱۰)۔

سید قطب شہیدؒ تحریر فرماتے ہیں:

امت مسلمہ کو اس ذمہ داری کا ادراک ہونا چاہیے، اسی صورت میں وہ اپنی حقیقت اور اپنی قدر و قیمت سے واقف ہوسکتی ہے، وہ اس لئے وجود میں لائی گئی ہے کہ وہ انسانیت کے لئے ہراول دستہ بنے، اور قیادت اس کے ہاتھ میں ہو، یہ اس لئے کہ وہ بہترین امت ہے، اور اللہ تعالی کا منشاء یہ ہے کہ اس زمین میں قیادت اچھے افراد کے ہاتھ میں ہو، برے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں، اس لئے یہ بات اس امت کے شایان شان نہیں کہ وہ جاہلی امتوں سے ہدایات اخذ کرے، بلکہ اس کی حالت تو یہ ہونی چاہے کہ وہ ہمیشہ دوسری امتوں کو دینے کی پوزیشن میں ہو، اور ہمیشہ ان کے پاس وہ رہنمائی ہونا چاہیے جو وہ دوسروں کو دے سکے، صحیح عقیدہ، صحیح فکر، صحیح نظام، اچھے اخلاق، صحیح کردار، صحیح معرفت، صحیح علم، یہ وہ فریضہ ہے جو اس کا مقام اور اس کا مقصد وجود اس پر عائد کرتا ہے۔

امت کی ذمہ داری ہے کہ وہ ہمیشہ سب سے آگے رہے، اور ہمیشہ قیادت کے مرکز میں رہے، مرکز قیادت میں رہنے کی کچھ ذمہ داریاں ہیں، یہ ذمہ داری محض دعووں سے حاصل نہیں ہوتی، اور نہ یہ منصب بغیر اہلیت کے ملتا ہے، بلاشبہ امت مسلمہ اپنے اعتقادی فکر اور اپنے اجتماعی نظام کے ذریعہ اس منصب کی اہلیت رکھتی ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ خلافت ارضی کا حق ادا کرتے ہوئے وہ علمی ترقیات اور زمین کی آبادکاری وتعمیر کے ذریعہ اپنی اہلیت قیادت ثابت کرے، یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ یہ امت جس نظام کی علمبردار ہے وہ اس سے زیادہ کا مطالبہ کرتی ہے اور اس سے ہر میدان میں آگے بڑھنے کا تقاضا کرتی ہے، بشرطیکہ وہ اس کی پابندی کرے، اور اس منصب کے تقاضوں اور اس سے

متعلق ذمہ داریوں کے احساس کا ادراک کرے۔

اس منصب کے اولین تقاضوں میں سے یہ ہے کہ امت مسلمہ زندگی کو شر اور فساد سے بچانے لئے اٹھ کھڑی ہو، اور اس کے پاس ایسی طاقت ہو جس کے ذریعہ اچھائی کا حکم اور برائی سے روکنے کا عمل انجام دے، کہ یہ خیر امت ہے جو لوگوں کی بہتری کے لئے مبعوث کی گئی ہے، امت کا اس منصب پر تقرر کسی رواداری یا اتفاق کی بنا پر نہیں ہوا ہے، اللہ تعالی ان چیزوں سے بہت بلند ہے، اور اللہ تعالی کے یہاں خصوصیات اور اعزازات کی تقسیم اس طرح نہیں ہوتی، جیسے اہل کتاب کہتے تھے: "**نحن ابناء الله واحباء ہ**" کہ ہم خدا کے بیٹے اور چہیتے ہیں، بلکہ امت مسلمہ کو خیر امت قرار دیا جانا ایک مثبت اور ایجابی عمل ہے، تا کہ امت کے ہاتھوں حیات انسانی کو منکر سے بچایا جائے اور معروف کے راستہ پر گامزن کیا جائے، اسی کے ساتھ ایمان لازمی ہے، کیونکہ ایمان سے ہی معروف اور منکر کی تحدید وتعیین ہوتی ہے "**تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ**" (آل عمران: ۱۱۰)۔

خیر امت کی یہ ذمہ داریاں ہیں، جن سے اسے عہدہ برآ ہونا ہے، حالانکہ یہ ذمہ داریاں اپنے ساتھ مصائب ومشکلات لاتی ہیں، یہ راہ کانٹوں سے بھری ہے، دراصل شر کو روکنا، خیر پر آمادہ کرنا اور معاشرہ کو بگاڑ کے اسباب سے روکنا گرچہ دشوار اور تھکا دینے والا ہے لیکن صالح معاشرہ کے قیام، اور اس کی صالحیت کے تحفظ کے لئے ان ذمہ داریوں کا ادا کرنا ضروری ہے، اور اسی طرح زندگی کی وہ شکل قائم وبرپا ہوسکتی ہے جسے اللہ تعالی پسند کرتا اور محبوب رکھتا ہے (فی ظلال القرآن، ۱/ ۴۴۷)۔

جس معروف کی طرف مسلمانوں کو دعوت دینا ضروری ہے اس میں ہر طرح کے انفرادی اور اجتماعی مصالح کی تکمیل شامل ہے، اور اسی میں ذمہ داری کو ادا کرنے کی دعوت، علم حاصل کرنے کی دعوت، وطن سے متعلق حقوق کی ادائیگی کی دعوت اور اخلاقی قدروں کی پابندی کی دعوت بھی ہے، اور منکر سے روکنے میں تمام دینی منکرات اور شرعی محرمات کے ساتھ دنیوی منکرات بھی شامل ہیں، اور انہی میں ہر طرح کے انتظامی، اخلاقی ومعاشی فساد وبگاڑ اور شعبہ کو نقصان پہونچانے کی ہر صورت اور ماحول کے اجزاء ترکیبی کو تباہ کرنے کی ساری شکلیں، اس کے علاوہ وہ تمام ناشائستہ حرکتیں اور فساد وبگاڑ کی شکلیں جن کا مسلمان اپنے رضا کارانہ اعمال کو انفرادی یا اجتماعی طور پر انجام دینے، بازاروں اور پیشوں کے لئے محتسب اور نگرانوں کی تقرری میں ارتکاب کرتے ہیں، شامل ہیں۔

خلاصہ یہ کہ شہریت سے متعلق اسلامی تصور اور مغربی تصور کے درمیان واضح فرق ہے، مغربی تصور میں شہریت کا مفہوم انفرادی فلسفہ پر منحصر ہے، جو فرد کو خاص اہمیت دیتی ہے، (بایں طور کہ مغربی قانون کی تشکیل میں فرد کو بنیادی حیثیت حاصل ہے) جبکہ شہریت کا اسلامی تصور جماعت کے اس مفہوم پر انحصار کرتا ہے جو دینی توجہ کی بنیاد اور اصل ہے، تمام عملی

اورفکری میدانوں میں فرد سے زیادہ جماعت پرتوجہ دی گئی ہے، گذشتہ صفحات میں بعض عبادات اور معاملات کی مثالیں گزری ہیں وہ اس کی بہترین مثال ہیں۔

۲- مدینہ کا معاہدہ نامہ اور شہریت:

معاہدہ نامہ، میثاق مدینہ، حضرت محمد ﷺ کا مکتوب گرامی، مدنی قانون، مدنی معاہدہ، ان تمام ناموں سے اس مدنی اور تاریخی دستاویز کا ذکر ملتا ہے جسے رسول اللہ ﷺ نے مدینہ ہجرت کرنے اور وہاں اسلامی معاشرہ اور اسلامی حکومت تشکیل دینے کے بعد مدینہ کے مختلف عناصر کے درمیان تعلقات مضبوط کرنے لئے اساسی طور پر وضع فرمایا تھا، یہ ڈھانچہ مہاجرین وانصار جو مدینہ میں مسلمانوں کی جماعت کے دو عظیم ستون تھے، اور یہود اور بقیہ بت پرستِ عرب پر مشتمل تھا، یہ دستاویز ایک ایسے معاہدہ، قانونی اور حقوقی دستاویز کی نمائندگی کرتا تھا جو مدنی معاشرہ کی مختلف جماعتوں کے درمیان معاشرتی تعلق، اس کے ضوابط اور اس کے حدود کو متعین کرتا تھا، نیز مدینہ کی ہر جماعت کے لئے حقوق اور ذمہ داریوں کی تشکیل کرتا تھا، اسی طرح یہ دستاویز شہریت کی بنیاد اور اس کی ذمہ داریوں اور مختلف عقائد اور قومیت کے احترام کو موکد کرتا تھا۔

اسی طرح مدنی دستاویز کی حیثیت ایک ایسے اصول کی ہے جس سے بین الاقوامی قانون سے متعلق نصوص کی بہت سے جزئیات نکلتی ہیں، نیز عقائد اور وطن کے فرق کے باوجود مختلف جماعتوں اور قوموں کے درمیان تعلقات کی تنظیم ہوتی ہے۔

اس معاہدہ کی مکمل عبارت اس طرح ہے:

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے، یہ دستاویز محمد (ﷺ) جو نبی ہیں کی طرف سے قریش اور اہل یثرب کے مومنین اور اطاعت گزاروں نیز ان لوگوں کے درمیان جو ان کے تابع ہوں یا ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہمراہ جہاد میں حصہ لیں، کے درمیان ہے۔

۱۔ دوسرے لوگوں کے بالمقابل وہ ایک امت (سیاسی وحدت) ہوں گے۔

۲۔ قریش کے مہاجر قبل اسلام کے دستور کے مطابق خون بہا ادا کریں گے، اور اپنے اسیروں کا فدیہ ادا کریں گے، تاکہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۳۔ اور بنی عوف کے لوگ اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کریں گے، اور ہر گروہ اپنے اسیروں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا، تاکہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۴۔ اور بنی حارث اپنے دستور کے مطابق خون بہا ادا کیا کریں گے، اور ہر گروہ اپنے اسیروں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا، تاکہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۵۔اور بنی ساعدہ اپنے دستور کے مطابق خون بہاادا کیا کریں گے،اور ہر گروہ اپنی قیدی خودفدیہ دے کر چھڑائے گا،تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۶۔اور بنی جشم اپنے دستور کے مطابق خون بہاادا کیا کریں گے،اور ہر گروہ اپنی قیدی خودفدیہ دے کر چھڑائے گا،تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۷۔اور بنی نجار اپنے دستور کے مطابق خون بہاادا کیا کریں گے،اور ہر گروہ اپنی قیدی خودفدیہ دے کر چھڑائے گا،تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۸۔اور بنی عمرو بن عوف اپنے دستور کے مطابق خون بہاادا کیا کریں گے،اور ہر گروہ اپنی قیدی خودفدیہ دے کر چھڑائے گا،تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۹۔اور بنی النبیت اپنے دستور کے مطابق خون بہاادا کیا کریں گے،اور ہر گروہ اپنی قیدی خودفدیہ دے کر چھڑائے گا،تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۰۔اور بنی اوس اپنے دستور کے مطابق خون بہاادا کیا کریں گے،اور ہر گروہ اپنی قیدی خودفدیہ دے کر چھڑائے گا،تا کہ مومنین کا برتاؤ باہم نیکی اور انصاف کا ہو۔

۱۱۔اور مسلمان کسی مفلس اور زیر بار کو مدد دئے بغیر نہیں چھوڑیں گے تا کہ اس کا فدیہ یا خون بہا بخوبی ادا ہو سکے۔

۱۲۔اور کوئی مومن کسی دوسرے مومن کی اجازت کے بغیر اس کے مولی سے معاہدہ نہیں کرے گا۔

۱۳۔اور متقی مومن ہر اس شخص کی مخالفت پر کمر بستہ رہیں گے جو ان میں سے سرکشی کرے، جو ظلم یا گناہ یا زیادتی کا مرتکب ہو، یا مسلمانوں کے درمیان فساد پھیلائے، ان سب کے ہاتھ ایسے شخص کی مخالفت پر ایک ساتھ اٹھیں گے خواہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

۱۴۔اور مومن کسی دوسرے مومن کو کافر کی خاطر قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی مومن کے خلاف کافر کی مدد کرے گا۔

۱۵۔اور خدا کا ذمہ ایک ہی ہے،مسلمانوں میں ادنی فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا،اور مومنین دوسرے لوگوں کے مقابلے میں باہم بھائی بھائی ہیں۔

۱۶۔اور یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا اسے مساوات حاصل ہوگی، نہ اس پر ظلم ہوگا اور نہ اس کے خلاف کسی کو مدد دی جائے گی۔

۱۷۔مومنین کی صلح ایک ہی ہوگی، اللہ کی راہ میں کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو چھوڑ کر دشمن سے صلح نہیں کرے گا جب تک کہ یہ صلح سب کے لئے برابر نہ ہو۔

۱۸۔وہ تمام لوگ جو ہمارے ساتھ ہو کر جنگ کریں گے وہ ایک دوسرے کے پیچھے ہوں گے۔

۱۹۔اور مومنین اس کا بدلہ لیں جو خدا کی راہ میں ان کے خون کو پہونچے۔

۲۰۔اور متقی مومنین سب سے بہتر راہ اور سب سے سیدھے راستے پر ہیں۔

۲۱۔اور کوئی مشرک قریش کے مال اور جان کو پناہ نہیں دے گا، اور نہ مومن کے لئے اس سلسلہ میں رکاوٹ بنے گا۔

۲۲۔اور جو شخص کسی مومن کو ناحق قتل کرے گا اور گواہوں سے اس کا ثبوت بھی مل جائے گا تو اس سے قصاص لیا جائے گا، بجز اس صورت کے کہ مقتول کا ولی خون بہا پر راضی ہو جائے اور تمام مومنین اس کی تعمیل کے لئے اٹھیں گے اور اس کے سوا ان کے لئے کوئی صورت نہ ہوگی۔

۲۳۔اور کسی مومن کے لئے جو اس دستاویز کے مندرجات کا اقرار کر چکا ہو، نیز خدا اور یوم آخرت پر ایمان لا چکا ہو، جائز نہیں ہے کہ کسی فتنہ اٹھانے والے کی مدد کرے، یا اسے پناہ دے، جو اسے پناہ دے گا قیامت کے دن اللہ کی لعنت اور غضب کا مستحق ٹھہرے گا، اور اس سے کوئی فدیہ یا بدلہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

۲۴۔اور جب تم میں کسی چیز کے متعلق اختلاف پیدا ہوگا تو اللہ تعالی اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف رجوع کیا جائے گا۔

۲۵۔اور یہود جب تک مومنین کے ساتھ مل کر جنگ کرتے رہیں مصارف بھی برداشت کرتے جائیں گے۔

۲۶۔اور بنی عوف کے یہودی مومنین کے ساتھ ایک امت تسلیم کئے جائیں گے، یہودی اپنے دین پر رہیں، مسلمان اپنے دین پر، خواہ موالی ہوں یا اصل، البتہ جو لوگ ظلم اور جرم کے مرتکب ہوں گے وہ اپنی ذات یا گھرانہ کے سوا کسی کو ہلاکت و فساد میں نہیں ڈالیں گے۔

۲۷۔اور بنی نجار کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۸۔بنی حارث کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۲۹۔اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۰۔اور بنی جشم کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۱۔اور بنی اوس کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو۔

۳۲۔اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو، البتہ جو ظلم یا جرم کا ارتکاب کرے تو اس کی ذات یا گھرانے کے سوا کوئی مبتلائے ہلاکت و فساد نہیں ہوگا۔

۳۳۔اور جفنہ بھی بنی ثعلبہ کی شاخ ہیں، انہیں بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۴۔اور بنی شطیبہ کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو بنی عوف کے یہودیوں کو، وفا شعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

۳۵۔اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۶۔اور یہودیوں کے قبائل کو شاخوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو۔

۳۷۔اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر جنگ کے لئے نہیں نکلے گا۔

۳۸۔اور زخم کا بدلہ لینے میں رکاوٹ نہیں ڈالی جائے گی، جو شخص خونریزی کرے تو ذمہ داری اس پر اور اس کے گھرانے پر ہوگی، بجز اس شخص کے جس پر ظلم کیا گیا ہو، اللہ ان کے ساتھ ہے۔

۳۹۔ یہودی اپنے خرچ کے ذمہ دار ہوں گے اور مسلمان اپنے خرچ کے۔

۴۰۔ جو کوئی اس دستور العمل کو قبول کرنے والوں کے خلاف جنگ کرے تو وہ یہودی اور مسلمان ایک دوسرے کی مدد کریں گے، وہ ایک دوسرے کی خیر خواہی پر عمل پیرا رہیں گے، اور باہم مشورہ کریں گے، وفا ان کا شیوہ ہوگا نہ کہ بدعہدی۔

۴۱۔کوئی شخص اپنے حلیف کی بدعملی کا ذمہ دار نہ ٹھہرایا جائے گا اور مظلوم کو بہرحال مدد دی جائے گی۔

۴۲۔ یہودی اس وقت تک مصارف برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مسلمانوں کے ساتھ ہو کر جنگ میں شریک رہیں گے۔

۴۳۔ یثرب کا میدان اس دستاویز کو ماننے والوں کے نزدیک مقدس ہوگا۔

۴۴۔ پناہ گزیں سے ویسا ہی سلوک کیا جائے گا جیسا کہ اصل پناہ دہندہ سے ہو رہا ہو، نہ اسے کوئی نقصان پہنچایا جائے اور نہ وہ کسی جرم کا مرتکب ہوگا۔

۴۵۔کسی عورت کو اس کے کنبے والوں کی اجازت کے بغیر پناہ نہیں دی جائے گی۔

۴۶۔اس دستاویز کو قبول کرنے والوں کے درمیان کوئی نیا معاملہ یا جھگڑا پیدا ہو جس پر فساد رونما ہونے کا خوف ہو تو اسے اللہ تعالیٰ کی طرف اور اس کے رسول محمد ﷺ کی طرف لوٹایا جائے گا، اس دستاویز میں جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کو اس پر زیادہ احتیاط اور وفاداری پسند ہے۔

۴۷۔نہ قریش کو پناہ دی جائے گی اور نہ اس شخص کو جو اس کا معاون ہو۔

۴۸۔اگر کوئی یثرب پر حملہ آور ہو تو ان (معاہد فریقوں یعنی یہودیوں اور مسلمانوں پر) ایک دوسرے کی امداد و نصرت لازم ہوگی۔

۴۹۔اگر انہیں صلح کر لینے اور اس میں شرکت کرنے کی دعوت دی جائے گی تو یہ اسے قبول کر لیں گے اور شریک ہوں گے، اسی طرح وہ کسی کو صلح کے لئے بلائیں گے تو اسے قبول کریں گے اور مسلمانوں پر بھی قبول کرنا لازم ہوگا، بجز اس

صورت کے کہ کوئی دینی جنگ کرے۔

۵۰۔ ہر شخص کے حصے میں اس کی مدافعت آئے گی جو اس کے بالمقابل ہوگا۔

۵۱۔ اور اس کے یہودیوں کو خواہ اصل ہو یا موالی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اس دستاویز کے ماننے والوں کو حاصل ہے، بشرطیکہ اس دستاویز کے شریکوں کے ساتھ اچھا برتاؤ ہو۔

۵۲۔ اور وفاداری عہدی شکنی سے مانع ہوگی، ہر شخص کے کئے دھرے کا نقصان اسی پر ہوگا، اور اللہ اس شخص کی حمایت اس کے ساتھ ہوگا جو اس دستاویز کے مشمولات پر زیادہ سچائی اور زیادہ وفاداری سے قائم رہیں گے، اور یہ دستاویز کسی ظالم یا مجرم کے آڑے نہیں آئے گا۔

۵۳ جو شخص جنگ کے لئے نکلے وہ بھی اور جو شخص گھر میں بیٹھا رہے وہ بھی امن کا مستحق ہوگا، صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہوں گے جو ظلم یا جرم کے مرتکب ہوں گے، اور اللہ اس شخص کا حامی ہے جو عہد و اقرار میں وفا شعار اور پرہیزگار رہے، اور اللہ کے رسول محمد ﷺ بھی اس کے حامی ہیں (سیرت ابن ہشام، از عبدالملک بن ہشام ۲/ ۳۶۸، ۳۷۰)۔

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ آمد کے بعد وہاں مذہب وعقیدہ اور قبائلی وخاندانی نسبت اور طرز زندگی کے اعتبار سے متنوع صفت مجموعہ تشکیل پایا، چنانچہ اس مجموعہ میں قریش کے مہاجرین، اوس وخزرج کے مسلمان، اوس وخزرج کے بت پرست، اوس وخزرج کے یہود، اور یہودیوں کے تین قبائل: بنوقینقاع، بنونضیر، اور بنوقریظہ، مدینہ کے باشندے اعرابی، ان کے موالی، غلام اور حلفاء تھے، ان سب کا ذریعہ معاش جدا جدا تھا مثلاً تجارت، زراعت، صنعت وحرفت، غلہ بانی، شکار، لکڑی چننا وغیرہ، بلاشبہ مدنی دستاویز کے مطابق جس نبوی نمونہ کی تشکیل کا آغاز ہوا وہ دو باہم موافق سمتوں میں بٹا ہوا تھا، ایک سمت ان مسلمانوں سے متعلق تھا جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتے تھے اور اللہ کی شریعت کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے تھے، اسی پر عمل کرتے تھے، اور اپنی زندگی میں منطبق کرتے تھے، جبکہ دوسری سمت مسلمانوں، اوس وخزرج اور اہل کتاب سے متعلق تھی جن میں باہم امن کی بنیاد پر اتحاد تھا (السیرۃ النبویۃ، از: مروان الشیخ الارض، ص: ۲۳، ۲۴)۔

میثاق مدینہ چار محاور پر مشتمل تھا:

اول: مدینہ کے تمام باشندوں کے درمیان اجتماعی امن وامان اور پرامن بقائے باہم، اور نفس کے تحفظ کی طرح پڑوس کے حق کا بھی تحفظ کیا گیا۔

دوم: تمام باشندوں کے لئے عقیدہ کی آزادی کی ضمانت، یہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے ثابت ہے "للیہود دینھم وللمسلمین دینھم" یہ دراصل قرآن کا دیا ہوا حق ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم

وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین " (سورہ ممتحنۃ:۸)۔

اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو دین کے لئے تم سے لڑے نہیں، اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکالا کہ ان سے بھلائی اور انصاف کا سلوک کرو، بیشک اللہ تعالی انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

سوم: مدنی معاشرہ میں تمام باشندوں کے لئے انصاف اور برابری کا تحقق، جو زندگی کے مختلف میدان میں موثر شرکت کے ذریعہ عمل میں آتا ہے۔

چہارم: انفرادی ذمہ داری کے قاعدہ کا اقرار، اور اس ذمہ داری کی اساس و بنیاد نظام کا اظہار اور اس پر اتفاق رائے ہے، دستاویز کی یہ شق اس بات کی تاکید کرتی ہے: "**وإن البر دون الاثم لایکسب کاسب الا علی نفسه وان الله علی اصدق مافی هذه الصحیفة وابره انه لایحول هذا الکتاب دون ظالم وآثم**"

میثاق مدینہ پہلا دستور شمار کیا جاتا ہے جو حقیقی شہریت کے مفہوم کو متعین کرتا ہے، اس طور پر کہ اس میں شہریت کے حقوق اور مکمل شہریت (جس میں مسلمان مدینہ منورہ کے دوسرے باشندوں کے ساتھ برابری کا حق رکھتے ہیں) کی بنیاد پر عائد ہونے والی ذمہ داریاں وضع کی گئی ہیں، یہ بات اس دستاویز کے سرنامہ سے ہی ظاہر ہو جاتا ہے، "**هذا کتاب من محمدالنبی ﷺ بین المومنین والمسلمین من قریش ویثرب ومن تبعهم فلحق بهم وجاهدمعهم**"

اس جملہ میں ان اہل کتاب کو جو مسلمانوں کے وطن کے اردگرد رہتے تھے شہری قرار دیا گیا، اور یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہوں گے، بشرطیکہ وہ شہریت کی بنیاد پر عائد ہونے والے حقوق کی ادائیگی کرتے رہیں، چنانچہ دستاویز کے مطابق دین کا فرق شہریت سے محرومی کا سبب نہیں ہے، اسی طرح جو ان کے ساتھ شریک ہو جائیں ان کو بھی اس قوم کا فرد اور اسلامی مملکت کا شہری قرار دیا گیا ہے۔

معروف اسلامی مفکر محمد عمارۃ تحریر کرتے ہیں:

اسلام اس دوسرے طبقہ سے صرف ایک چیز چاہتا ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ دوسرا طبقہ اسلامی حکومت کی ملکی وتہذیبی امن کی دیوار کی اینٹ ثابت ہو، اور اس کی مکمل وفاداری حکومت اور وطن کے لئے ہو، اور اس کی نسبت خالص امت کی طرف ہو جس کا وہ بنیادی حصہ ہے، اور کسی بھی دشمن کو فائدہ پہونچانے کا ذریعہ نہ بنے (حقائق وشبہات حول السماحۃ الاسلامیۃ وحقوق الانسان/۳۲)۔

خلاصہ یہ کہ میثاق مدینہ نے شہریت کے حق کے لئے جدید بنیاد تشکیل دی، جو دو مثبت عناصر سے مرکب ہے، پہلا عنصر وطن کی طرف نسبت ہے، اور دوسرا عنصر معاہدوں اور معاملات سے وفاداری ہے۔

وطن کی طرف نسبت قبیلہ یا گروہ کی طرف نسبت سے الگ ہے، اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کی بنیاد ایسی ثابت شدہ

نصوص پر ہے جو انسان کے حقوق اور اس کی کرامت وآزادی پر مبنی ہے، نیز یہ انسانوں کے درمیان مساوات اور شہریوں اور معاشرہ کے افراد کے درمیان باہمی تعاون واتحاد اور عمومی صلاح کے فروغ اور مفاسد سے اجتناب کو پختہ کرتا ہے۔

چنانچہ معاہدہ مدینہ منورہ شہریت کی بنیاد فراہم کرتا ہے، لیکن اس سے قبل وہ دین کی مختلف جماعتوں کو اور مختلف مشرب کے لوگوں کو ایک امت اور ایک معاشرہ بنا چکا تھا۔

پھر دار الاسلام سے مکمل وفاداری کے عوض جو چیز ملتی ہے وہ حقوق، آزادی اور ذمہ داریوں میں مساوات ہے، یہیں سے شہریت کے اسلامی تصور اور مغربی تصور کے درمیان فرق واضح ہوتا ہے، کہ مغرب میں شہریت سیکولرزم کی بنیاد پر کھڑی ہے، جبکہ اسلام نے جس شہریت کی وضاحت چودہ سو سال پہلے کی، اس کا سرچشمہ اور ستون دین ہے، اور شہریت دین کے ساتھ کبھی متصادم نہیں ہوتا، چنانچہ اللہ کے حقوق کے لئے اسلامی معاشرہ کا ہر طبقہ اور اس کی نظریات کو اللہ تعالی کے حوالہ کر دیا جاتا ہے، اور اسلام اس کو اپنے اندر داخل ہونے پر مجبور نہیں کرتا، اور جہاں تک بندوں کے حقوق کی بات ہے تو تمام لوگوں کے مصالح کے تحفظ اور مفاسد کو ختم کرنے کے لئے اسلام اپنے قوانین اور معاملات کے ذریعہ دخل اندازی کرتا ہے، تا کہ معاشرہ کی رفتار کو منضبط کیا جائے۔

مزید یہ کہ میثاق مدینہ کی اہمیت اس کے صحیح طریقہ پر نازل ہونے اور حقیقی دنیا میں منطبق ہونے سے بھی ظاہر ہوتی ہے، یعنی مختلف عقائد، جنس اور قبائل کے افراد کے درمیان پر امن بقائے باہم کا اسلامی نظریہ کی اس طرح تطبیق عمل میں آئی کہ تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی، اس پوری مدت میں کسی یہودی کی زبان پر حرف شکایت نہیں آیا، اور ان کے درمیان اور مسلمانوں کے درمیان جو متوازن معاشرتی وحدت تھی اس میں کوئی خلل پیدا نہیں ہوا، گرچہ یہودی اسلامی معاشرہ کے اندر خفیہ سازشوں کے تانے بانے بنتے رہے، کبھی عصبیت کو ہوا دے کر، کبھی جاہلی نعرے بلند کر کے، اور کبھی جاہلیت کے خونی کینہ توزیوں کو بڑھاوا دے کر، اس کے علاوہ وہ لوگ مستقل مسلمانوں کے ذہنوں میں دین کے حوالہ سے شکوک وشبہات کے کانٹے بونے کی کوشش کرتے رہے، اور اس سلسلہ میں سب سے خطرناک اقدام رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی سلول سے خفیہ پینگیں تھیں، لیکن ان سب کے باوجود اللہ کے رسول ﷺ غیر مسلموں کا اکرام کرتے رہے، آپ ان کی گفتگو توجہ سے سنتے، اور ان کی شکایات کو جو ایک دوسرے کے خلاف ہوتی پورے شرح صدر، کشادہ قلبی اور ذمہ داری کے ساتھ سماعت فرماتے، یہاں تک کہ انہیں تورات میں مذکور شرعی احکام پر لوٹاتے، تا کہ ان کے بارے میں کوئی ایسا اسلامی حکم نازل نہ ہو جائے جس سے وہ واقف نہ ہوں۔

سچائی یہی ہے کہ شہریت ملک کے باشندوں کی صفت ہے جو حقوق سے مستفید ہوتے ہیں اور وطن سے نسبت کی بنیاد پر قانون اور دستور کی طرف سے عائد ذمہ داریوں کو ادا کرتے ہیں، چنانچہ ہر شہری کو کچھ معاشرتی، سیاسی، اقتصادی اور علمی

حقوق حاصل ہوتے ہیں، ملکی نظام ان حقوق کی ضمانت دیتا ہے، مثلاً عقیدہ کا تحفظ، نفس کا تحفظ، اہل وعیال کا تحفظ، عزت وناموس کا تحفظ، اموال وملکیت کا تحفظ، تعلیم علاج ومعالجہ کی فراہمی، مہذب زندگی، عدل وانصاف کا قیام، شخصی آزادی، نیز ملکیت کی آزادی، عمل کی آزادی، مذہب کی آزادی، رائے وتقریر کی آزادی، اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کی آزادی وغیرہ۔

اسی طرح شہریوں کے لئے وطن اور معاشرہ کے تئیں (جہاں وہ رہتا ہے اور جس کی طرف نسبت کرتا ہے) کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں، ان ذمہ داریوں کا خلاصہ اس طرح ہے: دستور وقانون کا احترام، عمومی نظام کا احترام، وطن کا دفاع، اس کی سرحدوں کی حفاظت میں شرکت، اقتصادی، علمی اور معاشرتی ترقی میں شرکت، ملکی سرمایہ کی حفاظت، معاشرہ کے افراد کے درمیان باہم محبت والفت تاکہ سکون واطمینان کی فضاء قائم رہے، وطن کے ساتھ خیانت نہ کرنا، ملک دشمنوں کے ساتھ عدم تعاون، ان کو پناہ نہ دینا اور ان کے مصالح کی خاطر جاسوسی سے احتراز وغیرہ۔

دوسرا محور: اسلام اور بین الاقوامی قانون میں پناہ گزینوں کے حقوق:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے:

"إن الذين توفاهم الملائكة ظالمى انفسهم قالوا فيم كنتم قالوا كنامستضعفين فى الأرض قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها فأولئک مأواهم جهنم وسائت مصيرا" (سورہ نساء: ۹۷)۔

(بے شک ان لوگوں کی جان جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے، جب فرشتہ قبض کرتے ہیں تو ان سے کہیں گے کہ تم کس کام میں تھے، وہ بولیں گے ہم اس ملک میں بے بس تھے، فرشتہ کہیں گے کہ اللہ کی سرزمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے، تو یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے)۔

شہریت کے حقوق میں ایک حق یہ بھی ہے کہ آدمی کسی بھی وجہ سے دوسرے ملک کو جائے یا وہاں قیام کرے، یہ حق اسلامی شریعت کی طرف سے مسلم اور بین الاقوامی قوانین معاہدوں اور عالمی اعلامیہ سے بھی ثابت شدہ ہے۔

چنانچہ ہر انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے اندر یا ملک کے باہر جہاں چاہے آئے جائے، اس کی یہ آزادی کوئی چھین نہیں سکتا، بلکہ اسلام ظلم کے وقت اور جب انسانی حقوق کا پاس ولحاظ ختم ہوجائے تب دوسرے ملک جانے کی اجازت دیتا ہے، لیکن اسی کے ساتھ اس بات سے بھی منع کرتا ہے کہ کسی فرد کو وطن چھوڑنے یا اس سے دور ہونے پر مجبور کیا جائے، سوائے کسی عذر شرعی کے، اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

"يسألونک عن الشهر الحرام قتال فيه قل قتال فيه كبير وصدعن سبيل الله وكفربه والمسجد الحرام وإخراج أهله منه اكبر عند الله والفتنة اكبر من القتل" (سورہ بقرہ: ۲۱۷)۔

(اور آپ سے حرمت والے مہینوں کی بابت اس میں قتال کی بابت دریافت کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے کہ اس میں قتال کرنا بڑا گناہ ہے، اور اس سے کہیں بڑے جرم اللہ کے نزدیک اللہ کی راہ سے روکنا اور اللہ سے کفر کرنا اور مسجد حرام سے روک دینا اور اس سے اس کے رہنے والوں کو نکال دینا ہیں)۔

اسی طرح قرآن نے ان مہاجرین پناہ گزینوں کی تعریف وتوصیف بیان کی ہے جنہوں نے وطن چھوڑنے کو ترجیح دی، اور اپنے عقیدہ اور دین کی حفاظت کی خاطر مال ومتاع کو قربان کیا، اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا فى سبيل الله بأموالهم وأنفسهم أعظم درجة عند الله وأولئک هم الفائزون" (سورۂ توبہ: ۲۰)۔

(اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد اپنے مال اور اپنی جان سے کیا، وہ درجہ میں بہت بڑے ہیں اللہ کے نزدیک اور یہی لوگ کامیاب ہیں)۔

اسلام میں اصول یہ ہے کہ دار الاسلام ہر مسلمان کا وطن ہوتا ہے، چنانچہ ملک کے اندرون میں کہیں جانے یا رہنے کے حق کو محدود کرنا صحیح نہیں ہے، بلکہ ہر اسلامی ملک پر لازم ہے کہ وہ ہر مسلمان کو اپنے ملک میں آنے یا رہنے کی بغیر سیاسی حد بندیوں کے اجازت دے۔

بلکہ پناہ گزین اپنے عقیدہ، نسبت اور وطنیت کے فرق کے باوجود ان تمام حقوق سے مستفید ہوں گے جن کی ضمانت اسلامی شریعت اور بین الاقوامی قوانین میں دی گئی ہے، کوئی ملک جو پناہ دینے کے حق سے اتفاق کرتا ہو وہ اس حق کو بدل نہیں سکتا اور نہ ہی بغیر کسی معقول سبب کے اس سے انکار کرسکتا ہے، کیونکہ وہ معاہدہ ۱۹۵۱ء اور اس معاہدہ کو مکمل کرنے والا پروٹوکول ۱۹۶۷ء (یہ دونوں پناہ گزینوں کے مرکز سے متعلق ہیں) پر دستخط کرچکا ہے، چہ جائیکہ معاہدہ جنیوا ۱۹۴۹ء، اور دو اضافی پروٹوکول ۱۹۷۷ء، اور انسانی حقوق کے عالمی اعلامیہ ۱۹۴۷ء وغیرہ، جہاں دنیا کے اکثر ممالک کے دستور نے فیصلہ کیا کہ ہر ملک کو اقوام متحدہ اور انسانی حقوق کے عالمی منشور کے ضابطہ کے مطابق عمل کرنے کا پابند بنایا جائے۔

پناہ گزینی کا مفہوم کیا ہے؟ اس کے اسباب وعوامل کیا ہیں، نیز پناہ گزینوں کے حقوق کیا ہیں؟ ان باتوں کو ہم اس محور میں بیان کریں گے:

۱۔ پناہ گزینی (پناہ کے عمل) کی تعریف:

پناہ کے عمل کے لئے عربی میں 'اللجوء' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، لفظ 'اللجوء' مشتق ہے لفظ 'لجأ' سے، کہا جاتا ہے: **لجأت إلى فلان وعنه، والتجأت وتلجأت** (میں نے کسی کا سہارا لیا، فلاں سے تقویت حاصل کی، یا ایک کی طرف سے دوسری طرف رجوع کیا)، اسی طرح کہا جاتا ہے: **ألجاه الى الشئى** (کسی بات

پر مجبور کرنا) **ألجاه** (مامون ومحفوظ کرنا) وغیرہ، گویا اس مفہوم میں لفظ 'اللجوء' میں نکلنے اور تنہا ہونے کی طرف اشارہ ہے (دیکھئے: لسان العرب، از ابن منظور ۱/ ۱۵۲، مادہ لجأ)۔

اور اصطلاح میں پناہ گزیں ہر ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جس کی زندگی، یا سلامتی یا آزادی خطرے میں ہو، ایسی حالت میں اسے پناہ کی جگہ تلاش کرنے کا حق ہے (القانون الدولی العام، علی صادق ابو ہیف، ص: ۲۴۹)۔

اور پناہ گزیں کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:

"کل شخص هجر موطنه الأصلي أو أبعد عنه بوسائل التخويف فلجا إلى إقليم دولة أخرى طلبا للحماية أو لحرمانه من العودة الى وطنه الاصلي" (مبادی القانون الدولی العام، محمدی حافظ غانم، ص: ۵۴)۔

ہر وہ شخص جو خوف کی وجہ سے اپنے وطن اصلی کو چھوڑ دے یا اس سے دور ہو جائے، اور تحفظ کی تلاش میں یا اپنے وطن اصلی کی طرف واپسی سے محروم ہونے کی وجہ سے کسی دوسرے ملک کی پناہ لے۔

اور جہاں تک قرآنی اصطلاح کی بات ہے تو قرآن میں یہ لفظ صراحت کے ساتھ نہیں آیا ہے، لیکن مختلف آیات میں اس کا مفہوم موجود ہے، جیسے لفظ استجارہ، استئمان، ہجرۃ، ابن السبیل وغیرہ، اس کی تفصیل اس طرح ہے:

الاستجارہ: امن طلب کرنا، جیسا کہ اللہ کے اس ارشاد میں ہے:

"وإن احد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه ذلك بأنهم قوم لايعلمون" (سورہ توبہ: ۶)۔

(اور اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دیجئے تاکہ وہ کلام الٰہی سن سکے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہونچا دیجئے، یہ حکم اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو پوری خبر نہیں رکھتے)۔

المستامن: امن طالب کرنے والا، یعنی ایسا شخص جو بیت اللہ شریف کی پشت پناہی حاصل کرنے کے ارادہ سے اس کی پناہ لے، اسلامی شریعت اس طرح کے تحفظ سے آگاہ ہے، اس پر قرآن کریم اور رسول اللہ ﷺ کی سنت شاہد ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"وإذجعلنا البيت مثابة للناس وأمنا" (سورہ بقرہ: ۱۲۵)۔

(اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے ایک مقام رجوع اور مقام امن قرار دیا)۔

اور رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بھی اس کی دلیل ہے:

"ومن دخل المسجد فهو آمن" (سنن ابی داؤد، کتاب الخراج والفئی والامارۃ، باب ماجاء فی خبر مکۃ، حدیث نمبر: ۳۰۲۲، شیخ البانی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے)۔

اورحضرت ام ہانی بنت ابی طالب سے مروی ہے وہ بیان کرتی ہیں کہ:

”ذهبت الى رسول الله ﷺ عام الفتح فوجدته يغتسل وفاطمة ابنته تستره،قالت :سلمت عليه فقال:من هذه،فقلت انا أم هانى بنت أبى طالب،فقال :مرحبا بأم هانى فلمافرغ من غسله قال: فصلى ثمانى ركعات ملتحفا فى ثوب واحد،فلما انصرف قلت :يارسول الله زعم ابن أمى أنه قاتل رجلا قد أجرته فلان ابن هبيرة فقال رسول الله ﷺ :قد أجرنا من اجرت يا ام هانى،قالت أم هانى:وذاک ضحى“(صحیح البخاری،کتاب الصلاۃ،باب الصلاۃ فی ثوب واحد،حدیث نمبر:۳۵۰)۔

الہجرۃ:صحابہ کی پہلی جماعت نے طرح طرح کے تکالیف،ظلم وستم اوراللہ کے راستہ سے روکے جانے پرحبشہ کی طرف ہجرت کی،جبکہ ان کے پاس قوت وطاقت نہیں تھی جس سے وہ اپنا تحفظ کرسکیں،چنانچہ کمزورمسلمان مردوعورت نے دومرتبہ حبشہ ہجرت کی،اس کے بعد باقی مسلمانوں نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی،اللہ تعالی فرماتے ہیں:

”والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار والذين اتبعوهم بإحسان رضى الله عنهم ورضوا عنه وأعد لهم جنات تجرى تحتها الأنهار خالدين فيها أبدا ذلک الفوز العظيم“(سورہ توبہ:۱۰۰)۔

(مہاجرین وانصارمیں سے جوسابق ومقدم ہیں اورجتنے لوگوں نے نیک کرداری میں ان کی پیروی کی اللہ ان سب سے راضی ہوااوروہ اس سے راضی ہوئے،اوراللہ نے ان کے لئے ایسے باغ تیارکررکھے ہیں کہ ان کے نیچے ندیاں بہہ رہی ہوں گی،ان میں وہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے،یہی بڑی کامیابی ہے)۔

نیز اللہ عزوجل کا یہ ارشادگرامی:

”للفقراء المهاجرين الذين أخرجوا من ديارهم وأموالهم يبتغون فضلا من الله ورضوانا وينصرون الله ورسوله أولئک هم الصادقون “ (سورہ حشر:۸)۔

(ان مفلس مہاجروں کے لئے جواپنے گھروں سے نکالے گئے اوراپنی جائیدادوں سے بے دخل کئے گئے وہ اللہ اوراس کے رسول کافضل اوررضامندی تلاش کرتے ہیں،وہی لوگ سچے ہیں)۔

ابن السبیل:اللہ تعالی فرماتے ہیں:

”وآت ذا القربى حقه والمسكين وابن السبيل ولاتبذر تبذيرا“(سورہ اسراء:۲۶)۔

ابن السبیل سے مراد ایسا اجنبی مسافر جوراستہ بھول چکاہو اوراپنے گھرواپس ہونا چاہتا ہو،لیکن اس کے پاس اتنامال نہ ہوجس سے وہ گھرپہونچ سکے،چنانچہ ایسے شخص کے لئے صدقات سے ایک حصہ متعین ہے،جمہورفقہاء کی نظرمیں ابن السبیل ایسا شخص ہے جواپنے شہرسے دوسرے شہرمیں داخل ہوچکاہو(فقہ الزکوۃ،ازعلامہ یوسف القرضاوی ا/۶۷)۔

۲۔ بین الاقوامی قوانین میں پناہ گزینی کے اسباب:

پناہ گزینوں سے متعلق اقوام متحدہ کے معاہدہ ۱۹۵۱ء اور ملکی پناہ کیمپ سے متعلق اقوام متحدہ کے پروٹوکول میں پناہ گزینی کے اسباب کی تفصیل آئی ہے، جو اس طرح ہے:

۱۔ ظلم وستم کے نتیجہ میں پیدا شدہ خوف، جس کی وجہ سے آدمی ایسی جگہ کی تلاش کرے جہاں اسے امن وامان ملنے کی امید ہو۔

۲۔ زندگی اور آزادی خطرے میں پڑنے اور بین الاقوامی ڈکلریشنوں اور دستاویز سے ثابت شدہ انسانی حقوق کی پامالی کے نتیجہ میں پیدا شدہ ظلم وزیادتی۔

۳۔ معاملات، آزادی، حقوق اور ذمہ داریوں میں امتیازی سلوک، جس کے نتیجہ میں امان کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔

۴۔ جنسیت، اور جماعتی تعدد: یعنی ایسی جماعت کا فرد ہو جو وہاں کی اکثریت کے مقابلہ میں اقلیت میں ہو، اور اپنے حقوق کی پامالی اور آزادی سلب کئے جانے سے دوچار ہو۔

۵۔ دین، یعنی وہ عقیدہ جس پر انسان ایمان رکھتا ہے اور دینی آزادی جس کی ضمانت بین الاقوامی ڈکلریشنوں اور عالمی دستاویزات میں دی گئی ہے۔

۶۔ کسی متعین جماعت سے انتساب، بایں طور کہ حکمران جماعت اور بعض رعایا کے درمیان بے اعتمادی ہو اور سیاسی یا فکری جماعت سے وابستگی کی وجہ سے حکمراں جماعت سے وفاداری نہ ہو، جس کی وجہ سے ظلم وستم کا نشانہ بنے۔

۷۔ سیاسی نقطہ نظر، یعنی سیاسی نظام کی آراء کے خلاف جداگانہ رائے قائم ہو جو ظلم وزیادتی اور تعاقب کا خوف پیدا کرے، البتہ عملی حقوق کی پامالیوں کے ذریعہ اس طرح کے اندیشوں کے لئے جواز پیدا ہونا ضروری ہے، جیسے تنگ کرنا، صفایا کرنا اور قید وبند میں ڈالنا وغیرہ۔

۳۔ اسلامی شریعت میں پناہ گزینوں کے حقوق:

اسلامی شریعت نے پناہ گزینوں کو حقوق اور ذمہ داریاں عطا کر کے، ان کی طرف توجہ کر کے، انہیں تحفظ فراہم کر کے، ان کے دین، جان ومال، عزت وآبرو، ان کی عقل اور ان کی نسل کو تحفظ فراہم کر کے انہیں بلند مقام سے نوازا ہے۔

بلکہ اسلامی شریعت نے پناہ گزینوں کو ایسے حقوق عطا کیا ہے جو ہر زمانہ میں اور ہر جگہ کے لئے مناسب ہے، اس طرح اسلامی شریعت کو دیگر قوانین پر فوقیت حاصل ہے، اسی بنیاد پر ایک جدید مطالعہ (جس کی نگرانی اقوام متحدہ میں پناہ گزینوں کے حقوق سے متعلق اعلی کمیٹی نے امیر نایف عربی یونیورسیٹی اور تنظیم اسلامی کانفرنس کے تعاون سے انجام دی

ہے) نے یہ انکشاف کیا ہے کہ اسلامی شریعت کے مصادر پناہ گزینوں سے متعلق حقوق کی قانون سازی میں سب سے زیادہ اثر انداز ہوئی ہے، ان قوانین سے پوری دنیا میں لکھوکھا پناہ گزیں مستفید ہو رہے ہیں، اس مطالعہ میں اسلامی شریعت اور پناہ گزینوں کے بین الاقوامی قانون کے درمیان موازنہ کیا گیا ہے۔

اعلی کمیٹی کے نمائندہ 'انٹونیو جوٹریز' نے بتا کہ تنظیم نے اسلام کے عطا کردہ حقوق سے ہی استفادہ کر کے قانون کی بنیاد بنائی ہے، مثلا پناہ گزینوں کو امان فراہم کرنا، اور انہیں ان مصائب میں دوبارہ نہ دھکیلنا جن سے وہ بھاگے ہیں، مزید یہ کہ پناہ گزینوں کے تحفظ میں غیر مسلم بھی شامل ہیں، جنہیں اسلام اپنا مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کرتا ہے، اسلام ان کے حقوق کے بدلے ان کا سودا نہیں کرتا، بلکہ اسلام انہیں اور ان کی جائیداد کو تحفظ فراہم کرتا ہے، اور اس کے خاندانی شیرازہ کو بکھرنے سے بچاتا ہے، اور یہ سب کچھ اسلام چودہ سو سال سے کر رہا ہے۔

جوٹریز مسلمان پناہ گزینوں کے تئیں نسل پرستی کو ختم کرنے اور اسلام کو صحیح طریقہ سے سمجھنے کی دعوت دیتے ہیں، نیز وہ بتاتے ہیں کہ بین الاقوامی سماج کی ذمہ داری ہے کہ پناہ گزینوں کے لئے اسلام نے جن حقوق کی ضمانت دی ہے ان کی قدر کریں۔

پناہ گزینوں سے متعلق اہم حقوق کا خلاصہ اس طرح ہے:

☆ ہر ستم رسیدہ مسلمان یا ہر مظلوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دارالاسلام کے دائرہ میں رہتے ہوئے جہاں امان حاصل ہو وہاں پناہ لیں، اسلام ہر ستم رسیدہ کے لئے اس حق کی ضمانت دیتا ہے، قطع نظر اس کے کہ اس کا عقیدہ کیا ہے، وہ کس رنگ کا ہے اور کس نسل کا ہے۔

اگر کوئی پناہ گزیں اپنی سلامتی، امان اور زندگی سے متعلق خطرات سے تحفظ کے لئے دارالاسلام میں داخل ہونا چاہتا ہے تو امام المسلمین یا اس منصب فائز شخص کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسے شخص کو ملک میں داخل ہونے کی اجازت دے، بشرطیکہ وہ مذکورہ مقصد سے آئے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"وإن أحدمن المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مامنه ذلك بانهم قوم لايعلمون" (سورۃ توبہ:٦)۔

(اور اگر مشرکین میں سے کوئی آپ سے پناہ کا طالب ہو تو اسے پناہ دیجئے تا کہ وہ کلام الہی سن سکے، پھر اسے اس کی امن کی جگہ پہونچا دیجئے، یہ حکم اس سبب سے ہے کہ وہ ایسے لوگ ہیں جو پوری خبر نہیں رکھتے)۔

جب ایک مشرک کے لئے یہ حکم ہے تو کسی مسلمان کو پناہ دینا بدرجہ اولی ہوگا، بشرطیکہ جس ملک نے اسے پناہ دیا ہے اس کے مصالح کے لئے وہ نقصاندہ نہ ہو۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں ان کے دین کا تحفظ،اپنے شعار کی ادائیگی کی آزادی،اوردوسرا مذہب کوقبول کرنے پر مجبور نہ کئے جانے کا حق بھی ہے،اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"لاإکراہ فی الدین قد تبین الرشد من الغی فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقی لاانفصام لھاواللہ سمیع علیم" (سورہ بقرہ:۲۵۶)۔

یہ آیت کریمہ صاف واضح کررہی ہے کہ اسلام تمام افراداورتمام قوموں کے لئے مذہب کی آزادی کا قائل ہے،اس حق کی تاکید میثاق مدینہ منورہ میں بھی آئی ہے"**للیھود دینھم وللمسلمین دینھم وموالیھم وأنفسھم**"

ان تفصیلات کی روشنی میں ایسے معاشرہ میں مسلم غیرمسلم تعلقات کی شکل واضح ہوتی ہے جہاں مسلمانوں اورغیرمسلموں کے درمیان بقائے باہم کا اصول ہو،خواہ ایک ملک کے اندررہنے کی بات ہو، یا مصلحتوں کے تبادلہ کی بات ہو یا بین الاقوامی تعلقات کی بات ہو یااس کے علاوہ بقائے باہم کی شکلیں ہو، چنانچہ مذہب کا مسئلہ عام معاملات سے الگ ہوتا ہے،قرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ مسلمان دوسروں کے عقائد کے بارے میں جوابدہ نہیں ہیں،اورنہ ہی ان سے دوسروں سے محاسبہ کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے،لہذا جب ہمارے درمیان اوران کے درمیان اس حوالہ سے مباحثہ کی نوبت آئے گی تو یہ ادب کے دائرہ میں اورمناقشہ کے بہتر طریقہ کے ساتھ ہوگا (مجلّہ منبرالاسلام،شمارہ،۱۰، ۲۰۱۲ء،ازطلعت محمد عفیفی رص ۲)۔

اس کی طرف قرآن میں بھی اشارہ موجود ہے،اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"ولاتجادلوا أھل الکتاب الابالتی ھی أحسن إلا الذین ظلموا منھم وقولوا آمنابالذی أنزل إلیناوأنزل إلیکم وإلھنا وإلھکم واحد و نحن لہ مسلمون" (سورہ عنکبوت:۴۶)۔

اور جھگڑانہ کرواہل کتاب سے مگراس طرح پرجو بہتر ہو،مگر جوان میں بے انصاف ہیں،اوریوں کہو کہ ہم اس کو مانتے ہیں جو ہم پراتم پرنازل کیا گیا، ہمارےاورتمہارے معبود ایک ہی ہیں،اورہم اسی کے حکم پر چلتے ہیں)۔

چنانچہ اسلام عیسائی پرعیسائیت چھوڑنے کوضروری قرارنہیں دیتا،اورنہ یہودیوں کو یہودیت ترک کرنے پر مجبور کرتا ہے، بلکہ وہ ان دونوں سے جب تک کہ وہ اپنے قدیم دین سے وابستہ ہیں، یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اسلام کو اپنی حالت پر چھوڑ دیں، جو اس مذہب کو اختیار کرنا چاہے کرے،بغیر کسی تلخ چھیڑ چھاڑ اور برے انداز میں مناقشہ کے (حقوق الانسان،ازمحمد الغزالی رص ۷۴)۔

ان باتوں کے ساتھ اس کا بھی اضافہ کیجئے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کا احترام امام ابن قیم کے اس جملہ سے بھی واضح ہے جوانہوں نے اپنی کتاب احکام اہل الذمہ میں تحریر فرمایا ہے،وہ تحریر کرتے ہیں:

"وقد صح عن النبی ﷺ انہ انزل وفد نصاری نجران فی مسجدہ وحانت صلاتھم فصلوا

فيه وذلک عام الوفود"(احکام اہل الذمۃ،محمد بن ابی بکر بن ایوب ابن قیم الجوزیہ،تحقیق:یوسف بن احمد البکری وشاکر بن توفیق العاروری،دمام،ط:۱۴۱۸ھ مطابق ۱۹۹۷ء،۱/۳۹۷)۔

یہ بات رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے کہ آپ ﷺ نے نجران کے عیسائی وفد کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا،اور جب ان کی نماز کا وقت آیا تو انہوں نے مسجد میں ہی نماز ادا کی،اور یہ وفود والے سال کی بات ہے۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں ان کی جان کا تحفظ بھی ہے،اور یہ حق پناہ گزیں اور غیر پناہ گزیں دونوں کے لئے یکساں ہے،پناہ گزیں اس ملک کے ذمہ میں ہوں گے جن کی پشت پناہی انہوں نے حاصل کی ہے۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں ان کی عقل کا تحفظ بھی ہے،کہ عقل ہی مکلّف ہونے کی بنیاد ہے،اللہ تعالی نے انسان کو دوسری مخلوقات سے عقل کے ذریعہ ہی ممتاز کیا ہے،اس سے مادی اور معنوی تمام چیزوں سے پناہ گزینوں کی عقل کی حفاظت کی اہمیت ثابت ہوتی ہے۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں ان کی عزت وآبرو کا تحفظ بھی ہے،لہذا تہمت،سب وشتم یا کسی اور طرح سے ان کے ناموس سے کھلواڑ کرنا درست نہیں ہے،خواہ پناہ گزیں مسلمان ہو یا غیر مسلم،اور جن پر تہمت لگایا گیا ہے اگر وہ اہل کتاب میں سے ہے تو تہمت لگانے والے پر حد جاری کرنا ضروری ہے،اللہ تعالی نے اہل کتاب کو پاکبازی کی صفت سے متصف فرمایا ہے،اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"والمحصنات من المومنات والمحصنات من الذين أوتوا الكتاب من قبلكم اذا آتيتموهن أجورهن محصنين غير مسافحين ولا متخذى أخدان" (سورہ مائدہ:۵)۔

(اور اسی طرح جائز ہیں تمہارے لئے مسلمان پارسائیں اور ان کی پارسائیں جن کو تم سے پہلے کتاب مل چکی ہے،جب تم انہیں ان کے مہر دیدو،اور قید نکاح میں لانے والے ہو نہ کہ مستی نکالنے والے،اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والے)۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں رہائش کا حق بھی ہے،بشرطیکہ وہ پڑوسیوں کے لئے ضرر رساں نہ بنیں،اسی طرح اس کی رہائش گاہ بھی قابل احترام ہوگی،کسی کو اس کی اجازت کے بغیر وہاں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہوگی،اور عذر شرعی کے بغیر اس رہائش میں تنگی کرنا درست نہ ہوگا۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ انہیں خرید وفروخت،ہبہ،صدقہ،ملکیت،قبضہ،اور دیگر تمام صحیح معاملات کا حق حاصل ہوگا،نیز یہ کہ وہ وارث بھی ہوں اور مورث بھی۔

☆ پناہ گزینوں کو شخصی آزادی حاصل ہوگی،تاکہ امان کا تحقق ہو،کہ سارے افراد بشری طبیعت اور اصلی خلقت کے

اعتبار سے برابر ہوتے ہیں، ان میں باہم کوئی فرق اور تفاضل نہیں ہے، اللہ تعالی فرماتے ہیں:

"ولقد کرمنا بنی آدم وحملناهم فی البر والبحر و رزقناهم من الطیبات وفضلناهم علی کثیر ممن خلقناتفضیل"(سورہ اسراء:۷۰)۔

(اور ہم نے بنی آدم کو عزت دی ہے اور جنگلوں اور دریا میں سواری دی، اور صاف ستھری چیزوں سے رزق دیا اوران بہت سوں پر فضیلت دی جنکو ہم نے پیدا کیا)۔

چنانچہ اللہ تعالی نے علی العموم سارے بنی آدم کو فضیلت بخشی ہے، جس کا تقاضہ ہے کہ ان کی شخصی آزادی کی حفاظت کی جائے، سوائے ان مواقع پر جہاں شریعت میں امتیاز اور فوقیت ثابت ہے۔

شیخ الدعاۃ محمد الغزالی تحریر کرتے ہیں:

انسان کی آزادی اس کی زندگی کی طرح قابل احترام ہے، یہ انسان کی خلقی صفت ہے جس پر انسان پیدا ہوتا ہے، "**مامن مولود ویولدعلی الفطرة**" یہ صفت مستقل کے لئے ہے، کسی کے لئے اس پر زیادتی کرنا درست نہیں ہے، "**متی استعبدتم الناس وقد ولدتهم أمهاتهم أحرارا**" فرد کی آزادی کی مکمل ضمانت دینا ضروری ہے، اس آزادی کو محدود کرنا یا اس کی حد بندی کرنا سوائے شرعی دلیل یا شریعت سے ثابت کاروائی کے درست نہیں ہے (حقوق الانسان، از محمد الغزالی، ص: ۲۱۲)۔

اسلام افراد کی بنیادی آزادی کے حق کو بلند مقام تک پہونچاتا ہے، بایں طور کہ وہ مکمل مذہبی آزادی کی ضمانت دیتا ہے، چنانچہ اسلامی حکومت کا اپنے شہریوں کو تحفظ دینا اوراس کے ساتھ بہترین سلوک کرنے کا عمل اس ملک کے غیر مسلم شہری ہونے کی وجہ سے متاثر نہیں ہوتا۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں یہ بھی ہے کہ انہیں ان کے وطن کی طرف واپس نہیں کیا جائے گا جہاں ان پر ظلم ہوا ہے، اور شاید یہ پناہ گزینوں کو حاصل ہونے والے حقوق میں سب سے اہم حق ہے جس کی خواہش پناہ گزیں کرتے ہیں، چنانچہ پناہ گزیں اوراس ظالمانہ نظام کے درمیان جہاں سے وہ فرار ہوا ہے اسلام حائل ہوجاتا ہے، اس کی مثالوں میں یہ ہے کہ ابوطالب نے نبی کریم ﷺ کو قریش کے حوالہ کرنے سے انکار کردیا، جنہوں نے آپ ﷺ کو اذیتیں دیں اور تکلیفیں پہنچائیں، اوراس حق کی اہمیت کی وجہ سے اسے بین الاقوامی دستاویزات میں بڑی اہمیت حاصل ہے، چنانچہ اقوام متحدہ کے ڈکلریشن کی دفعہ (۳) کے پہلے فقرہ میں مذکور ہے، مذکورہ لوگوں یعنی پناہ گزینوں میں سے کسی بھی فرد کو سرحد کے پاس پہونچنے سے روکنے جیسی کاروائی کرنا درست نہیں ہے، اسی طرح جب وہ کسی ایسے ملک میں داخل ہوجائے جہاں کی پناہ چاہتا ہے تو جلاوطن کرنا، یا جبراً کسی ایسے ملک واپس کرنا جہاں وہ دوبارہ ظلم کا شکار ہوسکتا ہے، صحیح نہیں ہے (حقوق اللاجئ طبقا لمواثیق الامم

المتحدۃ، محمد شوقی عبدالعال/ص ۴۰)۔

اسی طرح ۱۹۵۱ء کے معاہدہ، پناہ گزینوں کی حالت سے متعلق قانون ،اس کے اضافی پروٹوکول ۱۹۶۷ء، اور معاہدہ کے دفعہ ۳۲ میں تین ضمانتیں دی گئی ہیں، جو اس طرح ہیں:

۱۔ پناہ گزیں کو جلاوطن کرنے سے متعلق حکومت کے اختیار کو محدود کرنا، اور یہ کام عمومی قاعدہ کے تحت جلاوطن کرنے کو ممنوع قرار دیکر ہوسکتا ہے۔

۲۔ جلاوطن کرنے سے متعلق تجویز منظور کرنے پر لازمی کاروائی کرنا، کیونکہ یہ بھی لازم ہے کہ یہ جلاوطنی قانون کے ذریعہ متعین کردہ راہوں کے مطابق انجام دیا جائے، نیز پناہ گزینوں کو اپنی بے گناہی ثابت کرنے، فیصلہ پر اعتراض کرنے ،اور قانونی مدد حاصل کرنے کا حق حاصل ہوگا۔

۳۔ اور جلاوطن کرنے سے متعلق تجویز حتمی شکل میں منظور ہوجانے پر پناہ گزینوں کو معقول مہلت دینا، تاکہ دوسری پناہ گاہ تلاش کرنا ممکن ہو (دیکھئے: حق اللجوء السیاسی، دراسۃ فی نظریۃ حق الملجأ فی القانون الدولی، از برہان امراللہ/ ۲۲۵)۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں برابری اور امتیاز کا نہ ہونا بھی ہے، یہ حق پناہ گزینوں سے متعلق معاہدہ ۱۹۵۱ء میں پوری وضاحت کے ساتھ مذکور ہے، اس کی دفعہ ۳ میں ہے: حکومتوں پر لازم ہے کہ وہ پناہ گزینوں سے متعلق مذکورہ معاہدہ کو نسل، مذہب اور وطن کی تفریق کے بغیر منطبق کریں (دیکھئے: نسبیۃ الحریات العامۃ وانعکاساتہا علی التنظیم الدولی، از سعاد الشرقاوی، ط: دار النہضۃ العربیۃ، مصر، طباعت: ۱۹۷۹ء، ص: ۱۷۸)۔

ان معاہدات سے صدیوں قبل میثاق مدینہ میں صراحت ہے کہ ''الناس أمة واحدة'' سارے لوگ ایک امت ہیں، یہاں شہریت کے تمام پہلوؤں میں برابری کے لئے لفظ 'امت' کا استعمال کیا گیا ہے، چنانچہ مومنین ایک امت ہیں، یہود مسلمانوں کے ساتھ ایک امت ہیں، یہودیوں کے لئے ان کا مذہب ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کا مذہب، ''وإنه من تبعنا من اليهود فان له النصر والأسوة'' اور جو مسلمانوں کی پناہ حاصل کرلے وہ مسلمانوں کے ساتھ امت ہیں، 'و من لحق بهم'۔

☆ فضائی، زمینی اور سمندری ہر طرح سے پورے ملک میں نقل وحرکت کی آزادی بھی پناہ گزینوں کے حقوق میں سے ہے، پناہ گزینوں سے متعلق خاص معاہدہ ۱۹۵۴ء کے دفعہ ۲۶ میں مذکور ہے، 'اس معاہدہ میں شریک ہر ملک اپنے ملک میں مقیم پناہ گزینوں کو اپنے لئے رہائش اختیار کرنے کا حق، اور آزادی کے ساتھ اپنی سرزمین میں نقل وحرکت کا حق دے گا، اس شرط کے ساتھ کہ وہ کسی ایسے قانون کے ماتحت ہو جوان جیسے خاص حالات میں غیر ملکیوں پر نافذ ہوتا ہو۔

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں وطن واپسی کا حق بھی ہے، انسانی حقوق سے متعلق عالمی اعلامیہ کے دفعہ ۱۳ میں

واپسی کے حق کی تاکیداس طرح آئی ہے:’’ ہر فرد کواپنے وطن کے اندر کہیں آنے جانے اوراسی طرح اپنے وطن واپس آنے کا حق ہوگا‘‘

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں تعلیم کا حق بھی ہے، یہ عمومی حق ہے جس میں سارے افراد شامل ہیں، معاہدہ ۱۹۵۱ء کے دفعہ ۲۲ میں اور پناہ گزینوں کی حالت سے متعلق معاہدہ ۱۹۵۱ء میں اس کی صراحت آئی ہے، عبارت اس طرح ہے:’’ معاہدہ میں شامل تمام ممالک پناہ گزینوں کو ملک کے باشندوں کے مساوی تعلیمی حق دیں گے‘‘

☆ پناہ گزینوں کے حقوق میں ان کی بنیادی حفظان صحت کا حق بھی ہے، معاہدہ کی عبارت اس طرح ہے:’’ ملک کے ہر فرد کو حفظان صحت کا حق دیا جائے گا، یہی حق مناسب طریقہ پر افراد، خاندان اور معاشرہ کو بھی دیا جائے گا، کیونکہ ان سب سے مکمل شرکت کا مطالبہ کیا گیا ہے، اور یہ معاشرہ کے بجٹ کے مطابق دیا جائے گا‘‘۔ (دیکھئے: تنظیم عالمی صحت کی ویب سائٹ)

☆ ان تمام حقوق کے ساتھ زندگی کی ہر ضروریات کا حق مثلاً ملازمت، رہائش، کھانا، ہر طرح کی آزادی، انصاف اور قومیت وغیر کے حقوق بھی شامل ہیں۔

شریعت اور بین الاقوامی قوانین میں پناہ گزینی ختم ہونے کے اسباب

☆ پناہ گزینی کے اسباب ختم ہوجائیں یا پناہ گزیں کی وفات ہوجائے تو پناہ گزینی ختم ہوجائے گی، چنانچہ جب مسلمانوں کو حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت حمزہؓ کے اسلام لانے کی خبر ملی تو وہ مکہ مکرمہ واپس ہوگئے، اسی طرح باقی مسلمان صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ منورہ لوٹ آئے۔

☆ پناہ گزینی ختم ہونے کے اسباب میں اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ استہزاء بھی ہے، چنانچہ اگر پناہ گزیں کی طرف سے اسلام، اسلامی تعلیمات شریعت، مسلمان اور مذہبی شخصیات کے استہزاء پر مشتمل کوئی بات سامنے آئے تو پناہ گزینی ختم ہوجائے گی، کیونکہ مسلمان ایسے فرد کو پناہ نہیں دے سکتے ہیں جو ان کا اور ان کے دین کا مذاق اڑائے (دیکھئے: مقالہ عبداللہ محمد، اللجوء فی الاسلام، پیش کردہ جامعہ نایف العربیہ للعلوم الامنیۃ، سعودی عرب، ۲۰۰۶ء، ص: ۷)۔

☆ خیانت: اس سے مراد اس ملک کے ساتھ خیانت ہے جس نے اسے پناہ دیا ہے، اس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں، مثلاً پناہ دینے والے ملک کے دشمنوں سے تعلق یا دشمنوں کے مفاد میں جاسوسی وغیرہ، جب اس طرح کی کوئی بات سامنے آجائے تو اسلامی حکومت کو وہ پناہ ختم کرنے کا حق حاصل ہوگا جو اس نے دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

’’وإما تخافن من قوم خيانة فانبذ اليهم على سواء ان الله لايحب الخائنين‘‘ (سورہ انفال: ۵۸)۔

(اور اگر آپ کو کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو آپ (وہ عہد) ان کی طرف اسی طرح واپس کر دیں، بے شک اللہ

خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا)

سید قطب شہیدؒ اس آیت کے بارے میں فرماتے ہیں:

یہ آیت کریمہ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے نازل کی گئی جو اس وقت بالفعل (جب کہ مدینہ میں اسلامی ریاست نشو ونما پا رہی تھی) اسلامی جماعت کو درپیش تھی، ان کے ذریعہ مسلم قیادت کو وہ احکام وہدایات دی جا رہی تھیں جن سے وہ اس حالت کا مقابلہ کر سکے، یہ ہدایت مسلم کیمپ اور اس کے گرد وپیش موجود دیگر کیمپوں کے مابین خارجہ تعلقات کے باب میں ایک اہم اساس کی حیثیت رکھتی ہے، جن میں اگر چہ بعد میں کچھ جزوی ترامیم کی گئیں اور پھر انہیں قطعی شکل دی گئی، تاہم بین الاقوامی سطح پر اسلام کے طریقہ معاملات میں ایک بنیادی اصول کے بطور ان کا درجہ باقی ومسلم ہے۔

ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مختلف کیمپوں کے مابین بقائے باہم کی غرض سے سلامتی کے معاہدے کئے جا سکتے ہیں بشرطیکہ ممکن حد تک یہ معاہدے عہد شکنی سے محفوظ رکھے جائیں اور ہر فریق ان کا مکمل احترام کرے اور صدق دل سے معاہدے کی دفعات کی پابندی کرتا رہے، لیکن فریق ثانی اگر ان معاہدوں کی آڑ میں خیانت وغداری کو کالعدم قرار دیدے اور فریق مخالف کو ان کی منسوخی کی اطلاع کر دے، پھر مسلم ریاست کا سربراہ آزاد ہوگا کہ وہ جب چاہے ان خائنوں اور غداروں کی سرکوبی کرے......اور یہ سرکوبی ایسی سخت اور عبرتناک ہوگی کہ ان تمام لوگوں پر دہشت طاری ہوجائے جو کھلے یا چھپے مسلم معاشرہ سے تعرض کرنے کا خیال دل میں پال رہے ہیں (فی ظلال القرآن ۳/۱۵۳۹)۔

آپ مزید تحریر فرماتے ہیں:

اسلام معاہدہ اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے عہد کی پاسداری کرے اور اپنے پیمان کو برقرار رکھے، لیکن جب فریق ثانی کی جانب سے اسے بدعہدی کا اندیشہ ہو تو وہ اس ہونے والے معاہدے کو علی الاعلان اس کے آگے پھینک دیتا ہے اور معاہدہ ختم کرنے کی اسے اطلاع دیتا ہے، وہ خیانت وغداری نہیں کرتا اور نہ دھوکہ دہی اور دغابازی کو اپنا شعار بناتا ہے، وہ دوسروں کو صاف صاف بتا دیتا ہے کہ ان معاہدے سے وہ دست کش ہو چکا ہے، اب اس کے اور ان کے مابین امن کا معاہدہ باقی نہیں رہا، اس طرح اسلام انسانیت کو شرف واستقامت کے اعلی مراتب پر فائز کرتا اور امن واطمینان کی وسعتوں میں لے جاتا ہے، وہ دوسروں پر ناگہانی شب خون نہیں مارتا اور نہ ان لوگوں پر اچانک اور فاجرانہ یلغار کرنے کا قائل ہے، جو بے خوف اور مطمئن بیٹھے ہوں، اور انہیں ان معاہدوں اور دستاویزات پر بھروسہ ہو جن کی منسوخی کی انہیں اطلاع نہ دی گئی ہو، اسلام ایسے لوگوں کو خوفزدہ کرنے کا روادار نہیں جنہوں نے دفاع ومحافظت کا سامان ساتھ نہ لیا ہو، اس صورت میں بھی نہیں جب ان کی طرف سے خیانت کا اندیشہ ہو، ہاں معاہدہ ختم ہوجانے کے بعد جب جنگی حالت پیدا ہوجائے تو اس وقت الحرب خدعة کے اصول پر جنگی چالیں جائز ہوجاتی ہیں، کیونکہ اس کے بعد ہر فریق چوکنا ومحتاط ہو چکا ہوتا اور دفاعی تدابیر

اپنا چکا ہوتا ہے، اب اگر دشمن کے خلاف جنگی چال روا رکھی جاتی ہے تو یہ اس کے ساتھ دغابازی اور غدر کے مترادف نہیں ہے، بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ غافل ہے، اس وقت فریب کے سارے حربے مباح ہیں، کیونکہ مقصد غداری وبدعہدی نہیں ہے۔

اسلام انسانیت کا معیار بلند کرنا چاہتا ہے، اس کا مطمح نظریہ ہے کہ انسانیت کا دامن پاک وصاف ہو، لہذا وہ غلبہ وعروج کی خاطر غدر اور دھوکہ کو روا نہیں رکھتا اور یہ کیونکر ممکن ہے جب کہ اس کی جدوجہد ایک اعلی وارفع مقصد کی راہ میں ہے، اس لئے وہ اس بات کی قطعا اجازت نہیں دیتا کہ ایک اونچے مقصد کے حصول کے واسطے گھٹیا طور طریق اپنایا جائے۔

اسلام کو خیانت سے شدید نفرت ہے، وہ خائنوں اور عہد شکنوں کو حقارت بھری نظر سے دیکھتا ہے، اس وجہ سے وہ پسند نہیں کرتا کہ مسلمان امانت عہد میں دھوکہ دہی کے مرتکب ہوں، خواہ یہ ایسے مقصد کی راہ میں ہو جو بجائے خود اعلی واشرف ہو، کیونکہ نفس انسانی ایک منقسم اکائی ہے، اور جب وہ اپنے لئے کوئی خسیس ذریعہ جائز ٹھہرا لے گی تو اس کے لئے کسی شریف مقصد کو محفوظ رکھ پانا ممکن نہ ہوگا......اور وہ شخص مسلمان نہیں جو اچھے مقاصد کے لئے ہر قسم کے ذرائع ووسائل استعمال کرنے کو درست سمجھتا ہو، یہ اصول، اسلامی شعور کے لئے بالکل اجنبی ہے، جس کا اسلام کی نگاہ میں کوئی جواز نہیں، اسلئے کہ نفس انسانی کی دنیا میں بلحاظ اس کی ساخت ذرائع اور مقاصد میں کوئی فرق نہیں، کسی مرغزار تک پہونچنے کی خواہش ایک مسلمان کو کیچڑ کے تالاب سے گذرنے پر آمادہ نہیں کرسکتی، کیونکہ بالآخر اس کے کیچڑ آلود پاؤں اس سبزہ زار کو بھی گندہ وپلید بنا دیں گے، یہی وہ اسباب ہیں جنکی بناء پر اللہ تعالی خائنوں وبدعہدوں کو ناپسند کرتا ہے، اور اسے خیانت وبدعہدی سے سخت نفرت ہے، "**إن الله لايحب الخائنين**"(فی ظلال القرآن ۳/ ۱۵۴۲)۔

ان باتوں کے ساتھ یہ بھی اضافہ کیجئے کہ جب نجران کے عیسائیوں کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان سے معاہدہ فرمایا، آپ نے بعض شرائط رکھے جن کی پابندی اور معاہدہ سے وفاداری ان کے دین کے لحاظ سے بھی ضروری تھی، ان میں بعض شرائط اس طرح تھے:: ان میں کوئی جاسوس نہیں ہوگا، اور نہ کسی حربی کے لئے مسلمانوں میں سے کسی کی نگرانی کرے گا نہ خفیہ نہ علانیہ، نہ مسلمانوں کے دشمنوں میں سے کسی کو بھی اپنے گھر میں آنے دے گا، جس کے ذریعہ موقع سے فائدہ اٹھانا اور حملہ کرنا چاہتا ہو اور نہ انہیں نہ ان کے علاوہ دوسروں کو سوائے اپنی ملت کے اپنے گھروں، اپنی زمینوں، اور اپنی عبادت خانوں میں داخل کرے گا، نہ مسلمانوں کے خلاف کسی حربی کی ہتھیار، گھوڑے یا افراد کے ذریعہ مدد دے گا، نہ اس کے ساتھ رواداری برتے گا......اگر اپنے پاس، اپنے گھروں میں، اور اپنے عبادت خانوں میں مسلمانوں میں سے کسی کو چھپانے کی ضرورت پڑے تو وہ اس کو پناہ دیں گے، اس کی مہمان نوازی کریں گے، اور زندگی کے مسائل میں اس کی غمخواری کریں گے، اور اس کو راز میں رکھیں گے، دشمن کو اس کی پوشیدہ باتوں سے واقف نہیں

کرے گا، اور نہ اپنی ذمہ داری میں کوتاہی کریں گے۔

اور جہاں تک بین الاقوامی قانون میں پناہ گزینی کے خاتمہ کی بات ہے تو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے اپنے اجلاس ۱۹۶۴ء میں یہ تجویز منظور کی تھی کہ جب تک پناہ گزینوں کی طرف سے معقول اسباب نہ پائے جائیں انہیں اپنے اصلی وطن واپس ہونے پر مجبور نہ کیا جائے، چنانچہ معاہدہ ۱۹۵۱ء کے دفعہ (ا) میں ہے کہ اس معاہدہ کا اجراء اس شخص پر موقوف ہے جس پر پیراگراف (الف) کے احکام منطبق ہوتے ہیں، اس صورت حال میں جب اس ملک کی حمایت جاری رکھنا جس کی وہ قومیت رکھتا ہے اس پر دشوار ہوجائے ان اسباب کے ختم ہوجانے کی وجہ سے جن کی وجہ سے وہ پناہ گزیں سمجھا جائے (دیکھئے: حقائق وشبہات حول السماحۃ الاسلامیۃ وحقوق الانسان، ص: ۳۲)۔

بین الاقوامی قانون میں پناہ ختم ہونے کے اسباب کا خلاصہ اس طرح ہے:

۱۔ وفات: وفات سے پناہ گزیں کی پناہ گزینی ختم ہوجائے گی۔

۲۔ اخراج/جلاوطنی: پناہ دینے والے ملک کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ پناہ گزیں کو واپس کرنے کے لئے یا جلاوطن کے لئے آخری تاریخ مقرر کرے، پناہ گزینوں کے حالات سے متعلق خاص معاہدہ میں تحدید کی گئی ہے کہ پناہ گزیں کے حق میں اخراج ممکن ہے، لیکن یہ عمل درج ذیل شرائط کے ساتھ ہونے چاہیے:

الف: پناہ دینے والا ملک قانونی پناہ گزیں کو صرف ملکی امن یا عمومی نظام کے اسباب کے تحت ہی جلاوطن کرسکتا ہے۔

ب: پناہ دینے والا ملک اسی وقت کسی کو جلاوطن کرسکتا ہے جب دوسرے ملک میں داخل ہونے کی اجازت اسے حاصل ہوجائے (دیکھئے: الملجأ فی القانون الدولی، حمدی الغنیمی، ص: ۶۳۹)۔

۳۔ رضاکارانہ واپسی: یہ پناہ گزیں کا اپنے ملک واپس ہونا ہے، بلاشبہ یہ مثالی طریقہ ہے جس سے پناہ گزینی (پناہ کا عمل) ختم ہوجاتی ہے۔

۴۔ پناہ دینے والے ملک کی شہریت حاصل ہوجائے: یعنی پناہ دینے والا ملک پناہ گزیں کو قومیت (نیشنلٹی) عطا کردے، اس وقت بھی پناہ گزینی ختم ہوجائے گی، کیونکہ اس وقت وہ جس ملک سے راہ فرار اختیار کیا تھا اس کے علاوہ دوسرے ملک کی قومیت سے مستفید ہورہا ہے (الاعلام بقواعد القانون الدولی والعلاقات الدولیۃ فی شریعۃ الاسلام، احمد ابوالوفا، دار النہضۃ العربیۃ، مصر، سن طباعت: ۱۹۹۲ء، ج ۶، ص: ۴۶۸)۔

خاتمہ:

ان مختصر صفحات میں ہم نے شہریت اور پناہ گزینوں کے حقوق کو اسلامی نقطہ نظر سے پیش کیا ہے، اور اس سلسلہ میں

بین الاقوامی قانون میں موجود بعض باتوں کو پیش کیا ہے، اس تحقیق سے درج ذیل نتائج سامنے آئے ہیں:

الف: ایسی شہریت جو معاشرہ کے مختلف میدانوں میں ترقی عطا کر سکے، اس کے لئے ضروری ہے کہ ایسی ذہنیت/مزاج تیار ہو جس کے اندر شعور ہو، ثقافت ہو، اور تجربہ ہو، اس طرح ریاستی ترقی کے تمام مراحل کی تکمیل کے لئے مثبت شہریت کا پیدا ہونا ضروری ہے۔

ب: مسلمان مواطن ہوں یا مقیم، اس کا مغربی دنیا میں ہم آہنگ ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی سرگرمیاں اسلامی اصول وضابطہ کے دائرہ میں ہو، اور اس کا تعامل غیر مسلم معاشرہ کے ساتھ منظّم اور باشعور ہو، اس لئے کہ مسلمان صاحب پیغام اور داعی ہے۔

ج: وطن سے تعلق اور محبت کا مطلب زمین کی باز آبادکاری، قوم کے ساتھ حسن سلوک، قانون کی پابندی اور معروف میں حکومت کی اطاعت کرنا ہے۔

د: اسلام کا پیغام پوری انسانیت کے لئے ہے، "وماأرسلناک إلا کافة للناس بشیرا ونذیرا" (سورہ سبا: ۲۸) فرد ہو یا جماعت، قبیلہ ہو یا قوم، اسلام کا پیغام انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے، اور انسان کے اندرون میں جو امن کی روح ہے اس سے ہم آہنگ ہے، ہمارے دین نے جن حقوق کو (ان میں شہریت اور پناہ گزینی کے حقوق بھی ہیں) لازم قرار دیا ہے وہ ایسی ضرورتیں ہیں جن سے لوگوں کو مفر نہیں، اس لئے کہ یہ حقوق انسان کے اس مقام بلند کی دلیل ہے جو اللہ تعالی نے عطا کیا ہے اور جس نے اس کو زمین میں جانشیں بنایا ہے۔

"وصل اللهم وسلم علی بدر التمام ومصباح الظلام ومفتاح دارالسلام وشمس دین الاسلام سیدناوحبیبنا محمدخیر الانام وعلی اهل بیته وصحبه الکرام والحمد لله رب العالمین فی البدء والختام"۔

☆☆☆

تیسرا باب

تفصیلی مقالات

شہریت اور شہری حقوق کی شرعی بنیادیں

ڈاکٹر مفتی محمد شاہجہاں ندوی ☆

اسلام میں اخوت اور بھائی چارگی کی بنیاد ایمان ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:"**إنما المؤمنون إخوة**"(سورۂ حجرات:۱۰)(مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں)، بلاشبہ اصل انسانیت میں تمام انسان برابر ہیں، اور انسانی رشتہ سب کے ساتھ قائم ہے، جس کی بنا پر کسی انسان پر ظلم روا نہیں، اور بہترین سماجی تعلقات سب کے ساتھ قائم کرنا مطلوب ہے، البتہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ انسانی رشتہ کے ساتھ ایمانی اخوت میں بھی بندھا ہوا ہے، لہذا قومی، قبائلی، خاندانی، علاقائی، سیاسی اور ذاتی مصالح کے پیش نظر اس رشتہ اخوت کو پامال کرنا یا کمزور کرنا یا اس میں رخنہ ڈالنا ایک جرم عظیم ہے، اس مختصر سی تمہید کے بعد سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱- اسلام میں شہریت حاصل ہونے کی اصل بنیاد: ۱-''ایمان'' ہے، چنانچہ مومن کا وطن ہر وہ ملک ہے جہاں اسلامی شریعت نافذ ہو، احکام الہی پر ہو، جیسا کہ ارشاد الہی ہے:"**والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض**"(توبہ:۷۱) (اور مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں)، ایک جگہ ارشاد ہے:"**إن الأرض لله يرثها من يشاء من عباده**"(سورۂ اعراف:۱۲۸)(زمین اللہ کی ہے وہ جن کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا وارث بناتا ہے)، ایک دوسری جگہ ارشاد ہے:"**يايها الذين آمنوا لا تتخذوا الكافرين أولياء من دون المؤمنين أتريدون أن تجعلوا لله عليكم سلطانا مبينا**"(سورۂ نساء:۱۴۴)(اے ایمان والو، مسلمانوں کے مقابلے میں کافروں کو اپنا دوست نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ کی صریح حجت قائم کرالو)، نیز فرمان الہی ہے:"**إنما المؤمنون إخوة**"(الحجرات:۱۰)(مومن آپس میں بھائی ہیں)۔

چنانچہ مکہ مکرمہ سے ہجرت کرنے والے صحابہ کرام مدینہ منورہ کے شہری ''ایمان'' کی بنیاد قرار پائے۔

دوسری بنیاد: ''مستقل بودوباش'' ہے، چنانچہ جو جس ملک میں مستقل بودوباش رکھتا ہو، اس طرح کہ نسل در نسل

☆ استاذ فقہ واصول فقہ، جامعہ اسلامیہ، شانتاپورم، مالاپورم، کیرالا۔

وہاں قیام کئے ہو، وہ اس ملک کا شہری ہے، چنانچہ قرآن کریم سے پتہ چلتا ہے کہ ایک ملک میں متعدد قومیں آباد رہ سکتی ہیں، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:"**ومن آياته خلق السموات والأرض واختلاف ألسنتكم وألوانكم إن فى ذلک لآيات للعالمين**"(سورۂ روم:۲۲)۔

(اور اس کی نشانیوں میں سے آسمانوں اور زمین کی تخلیق اور تمہاری بولیوں اور تمہارے رنگوں کا تنوع بھی ہے، بے شک اس کے اندر علم والوں کے لئے گونا گوں نشانیاں ہیں)۔

ایک جگہ ارشاد ہے:"**ولا تكونوا كالتي نقضت غزلها من بعد قوة أنكاثا، تتخذون أيمانكم دخلا بينكم أن تكون أمة هي أربى من أمة، إنما يبلوكم الله به، وليبنن لكم يوم القيامة ماكنتم فيه تختلفون**"(سورۂ نحل:۹۲)۔

(اور اس عورت کے مانند نہ بن جاؤ، جس نے اپنا سوت خوب مضبوط کاتنے کے بعد تار تار ادھیڑ کر رکھ دیا، تم اپنی قسموں کو اس اندیشہ سے آپس کے فساد کا ذریعہ بناتے ہو کہ ایک امت دوسری امت سے کہیں بڑھ نہ جائے، اللہ اس کے ذریعہ سے تمہاری آزمائش کر رہا ہے، اور وہ قیامت کے دن اس چیز کو اچھی طرح تم پر واضح کر دے گا، جس میں تم اختلاف کر رہے ہو)۔

علامہ ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:"**أي تحلفون للناس إذا كانوا أكثر منكم ليطمئنوا إليكم ، إذا أمكنكم الغدر بهم غدرتم، فنهى الله عن ذلک، لينبه بالأدنى على الأعلى إذا كان قد نهى عن الغدر والحالة هذه، فلأن ينهى عنه مع التمكن والقدرة لطريق الأولى**"(تفسیر القرآن العظیم لابن کثیر ۳/ ۱۳۱۰، بیروت، مؤسسۃ الریان طبع ۳، ۱۴۲۸ھ)۔

(یعنی تم لوگوں کے سامنے قسم کھاتے ہو، جب وہ تم سے زیادہ ہوتے ہیں، تاکہ وہ تم سے مطمئن ہوجائیں، پھر جب ان کے ساتھ عہد شکنی تمہارے لئے ممکن ہوتی ہے، تو تم عہد توڑ بیٹھتے ہو، چنانچہ اللہ تعالی نے اس سے منع فرمایا، تاکہ کم تر صورتحال سے برتر صورتحال پر متنبہ فرمائے کہ جب اس حالت میں عہد شکنی سے منع فرمایا ہے، تو بدرجہ اولی قدرت وقابو کی حالت میں اس سے منع فرمایا جائے گا)۔

نیز فرمان باری ہے:"**يا يهاالناس إنا خلقنا كم من ذكروانثى، وجعلناكم شعوبا و قبائل لتعارفوا، إن اكرمكم عند الله يتقاكم**"(سورۂ حجرات:۱۳)۔

ابوجعفر محمد بن جریر طبری اس کی تفسیر میں رقم طراز ہیں:"**يقول: وجعلناكم متناسبين، فبعضكم يناسب بعضا نسبا بعيدا، وبعضكم يناسب بعضا نسبا قريبا**"(جامع البیان ۱۱/ ۳۹۷، طبع اول، دارالکتب العلمیہ ۱۴۱۲ھ)۔

(اللہ تعالی فرماتا ہے: اور ہم نے تم کو ہم آہنگ کر کے پیدا کیا ہے، چنانچہ تم میں سے بعض دوسرے بعض کے ساتھ دور کے رشتہ کی بنا پر مناسبت رکھتے ہوں، اور تم میں سے بعض بعض سے نزدیکی رشتہ کی بنا پر مناسبت رکھتے ہو)۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: "**يأيها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة، وخلق منها زوجها، وبث منهما رجالا كثيرا ونساء**" (سورۂ نساء:۱)۔

ان تمام آیتوں سے واضح ہے کہ مسلم ملک میں متعدد قومیں آباد ہوسکتی ہیں، کیونکہ تمام انسان ایک باپ آدم اور ایک ماں حوا سے پیدا ہوئے ہیں، لہذا جو جہاں پیدا ہوا ہے، وہاں بسنے اور بود و باش رکھنے کا حق دار ہے۔

خود نبی کریم ﷺ نے مدینہ منورہ کی نئی اسلامی ریاست کا ۴۷ دفعات پر مشتمل جو دستور مرتب کیا تھا، اس کی ایک دفعہ ہے: "**إنه من تبعنا من يهود، فإن له النصر والأسوة،غير مظلومين ولا متناصرين عليهم**" (سیرت ابن ہشام ۱؍۵۰۳، ط مصر، الحلبی ۱۳۷۵)۔

(یہود میں سے جو ہماری تابعداری کرے، اس کی مدد کی جائے گی، اور اس پر ظلم نہ ہوگا، اور نہ اس کے خلاف مدد ہوگی)۔

اور ایک دوسری دفعہ میں ہے: "**إن يهود بني عوف أمة مع المؤمنين، لليهود دينهم، وللمسلمين دينهم، مواليهم وأنفسهم وأهل بيته إلا من ظلم وأثم، فإنه لا يوتغ إلا نفسه وأهل بيته**" (سیرت ابن ہشام ۱؍۵۰۳)۔

(یہود بنی عوف اہل ایمان کے ساتھ ایک امت ہیں، یہود کو اپنے دین کی آزادی ہے، اور خود مسلمانوں اور ان کے موالی (آزاد کردہ غلام) کو ان کے دین کی آزادی ہے، مگر جو ظلم کرے اور گناہ کا مرتکب ہو، تو وہ خود اپنی ذات اور اپنے گھر والوں کو ہلاک کرے گا)۔

اس تاریخ ساز دستور سے بھی پتہ چلتا ہے کہ متعدد قومیں مسلم ریاست کی سربراہی میں ایک درجہ کے شہری بن کر رہ سکتے ہیں۔

تیسری بنیاد: "مخصوص مدت تک کسی ملک میں قیام" ہے، خواہ قیام معاشی سرگرمی انجام دینے کے لئے ہو، یا نوکری و ملازمت کی خاطر ہو، اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص کو اس بنیاد پر شہریت دی جاسکتی ہے، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، جبکہ اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کے خلاف نہ ہو، علامہ کاسانیؒ رقم طراز ہیں:

"**والأصل أن الحربي إذا دخل دارالاسلام بأمان، ينبغي للإمام أن يتقدم إليه فيضرب له مدة**

معلومة على حسب ما يقتضي لرأيه، ويقول له: إن جاوزت المدة، جعلتک من أهل الذمة، فإذا جاوزها صار ذميا؛ لأنه لما قال له ذلک، فلم يخرج حتى مضت المدة، فقد رضي بصير ورته ذميا''(بدائع الصنائع کتاب السیر، مطلب الأمان المؤبد ۷؍۱۱۰)۔

(اور ضابطہ یہ ہے کہ حربی دارالاسلام میں اگر امان کے ساتھ داخل ہو، تو امام کے لئے مناسب ہے کہ اسے آگاہ کردے اور اپنی رائے کے مطابق ایک متعین مدت مقرر کردے، اور اس سے کہے کہ اگر تم اس مدت سے تجاوز کروگے، تو میں تجھے ذمیوں میں سے بنادوں گا، تو اگر وہ اس مدت سے تجاوز کرے گا، تو ذمی ہوجائے گا، اس لئے کہ جب اس نے اس سے یہ بات کہہ دی، اور وہ گیا نہیں، یہاں تک کہ مدت گذر گئی، تو وہ اپنے ذمی ہونے پر راضی ہوگیا)۔

یقیناً بڑی حد تک اس کی بنیاد مصلحت پر ہے، اگر ملک اور مسلمانوں کے مفاد میں ہے کہ کسی شخص کو ایک مخصوص مدت کے قیام کے بعد شہریت دے دی جائے تو شہریت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ اسلامی شریعت مصالح کی تحصیل وتکمیل کرتی ہے، جیسا کہ ابن تیمیہؒ نے لکھا ہے: ''**الشريعة جاء ت لتحصيل المصالح وتكميلها، وتعطيل المفاسد وتقليلها**''(الاستقامۃ لابن تیمیہ ۱؍۲۸۸ طبع اول جامعۃ الامام محمد بن سعود ۱۴۰۳ھ)۔

(شریعت مصالح کی تحصیل اور اس کی تکمیل اور مفاسد کے ازالہ اور اسے کم کرنے کے لئے آئی ہے)۔

۲- اس کی دو صورتیں ہیں: اول: اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری کی بنا پر دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے، اور وہ مجبوری ایسی ہو کہ اگر اس کی رعایت نہ کی جائے، تو اس کے دین یا جان یا عزت و آبرو یا مال کو شدید خطرہ لاحق ہو، تو ایسی صورت میں اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً فرض ہے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''**إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم في سبيل الله، والذين آووا ونصروا، اؤلئک بعضهم أولياء بعض، والذين آمنوا ولم يهاجروا مالكم من ولايتهم من شئ حتى يهاجروا وإن استنصروكم في الدين، فعليكم النصر**''(سورۂ انفال: ۷۲)۔

(وہ لوگ جو ایمان لائے، اور انہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کیا، اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ باہم اگر ایک دوسرے کے ولی وحامی اور مددگار ہیں، رہے وہ لوگ جو ایمان تو لائے لیکن انہوں نے ہجرت نہیں کی تو تمہارا ان سے کوئی رشتہ ولایت نہیں، یہاں تک وہ ہجرت کریں اور وہ دین کے معاملے میں تم سے طالب مدد ہوں تو تم پر مدد واجب ہے)۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

"والذين امنوا وهاجروا وجاهدوا في سبيل الله، والذين آووا ونصروا، أولئک هم المؤمنون حقا، لهم مغفرة ورزق كريم" (سورۂ انفال: ۷۴)۔

(اور جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ پکے مومن ہیں ان کے لئے بخشش ہے اور باعزت روزی ہے)۔

ان آیات سے بالکل واضح ہے کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمانوں کے دین وایمان، جان ومال اور عزت وآبرو کو بچانا فرض اور حقیقی ایمان کی علامت ہے، چنانچہ علامہ ابن کثیر تحریر کرتے ہیں:

"بعضهم أولياء بعض أي: كل منهم أحق بالآخر من كل أحد" (تفسیر القرآن العظیم ۱۰۳۱/۲) (ان میں سے ہر ایک شخص دوسرے کا عام لوگوں کے مقابلہ میں زیادہ حقدار ہے)۔

اور دوسری جگہ لکھتے ہیں: "فإنه واجب عليكم نصرهم؛ لأنهم إخوانكم في الدين" (مرجع سابق ۱۰۳۲/۲) (تو تم پر ان کی مدد واجب ہے، اس لئے کہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں)، اور ابن حجر رقم طراز ہیں: "وكانت الحكمة أيضا في وجوب الهجرة على من أسلم، يسلم من أذى ذويه من الكفار، فإنهم كانوا يعذبون من أسلم منهم، إلى أن يرجع عن دينه، وفيهم نزلت: إن الذين توفاهم الملائكة ظالمي أنفسهم، قالوا: فيم كنتم، قالوا: كنا مستضعفين في الأرض، قالوا: ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها" (نساء: ۹۷)، وهذا اهجرة باقية في حق من أسلم في دار الكفر، وقدر على الخروج منها" (فتح الباری ۳۸/۶-۳۹)۔

(مسلمان ہونے والے پر ہجرت کے وجوب کی یہ بھی حکمت تھی کہ وہ اپنے کافر رشتہ داروں کی ایذا رسانی سے محفوظ رہے، کیونکہ وہ اس شخص کو تکلیف دیتے تھے، جو ان میں سے مسلمان ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ وہ اپنے دین سے لوٹ جائے، اور ان ہی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی: جن لوگوں کی جان فرشتے اس حال میں قبض کریں گے کہ وہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے ہوئے ہیں، وہ ان سے پوچھیں گے کہ تم کس حال میں پڑے رہے، وہ جواب دیں گے، ہم تو اس ملک میں بالکل بے بس تھے، وہ کہیں گے کہ اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے) اور یہ ہجرت اس شخص کے حق میں باقی ہے جو دار الکفر میں اسلام لائے، اور وہاں سے نکلنے پر قادر ہو)۔

اور علامہ ابن قدامہ تحریر کرتے ہیں: "فالناس في الهجرة على ثلاثة أضرب" (المغنی، کتاب الجہاد، فصل فی الہجرۃ ۲۹۴/۹) پوری عربی عبارت کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

(ہجرت کے سلسلہ میں لوگوں کی تین قسمیں ہیں؛ ۱-ان میں سے ایک قسم وہ ہے جس پر ہجر واجب ہے، اور یہ وہ شخص ہے جو اس پر قادر ہو، اور اس کے لئے اپنے دین کو ظاہر کرنا ممکن نہ ہو، اور کفار کے درمیان رہ کر اپنے دین کے فرائض وواجبات کو انجام دینا ممکن نہ ہو، تو اس پر ہجرت واجب ہے...... ۲-دوسری قسم وہ ہے جس پر ہجرت نہیں ہے، اور یہ عورتوں، بچوں اور ان کی مانند میں سے وہ حضرات ہیں، جو اس سے عاجز ہوں، مرض یا قیام کرنے پر مجبور کئے جانے یا کمزوری کی وجہ سے، تو اس دوسری قسم پر ہجرت نہیں ہے، اس لئے کہ فرمان الٰہی ہے: (البتہ وہ بے بس مرد، عورتیں، اور بچے جو نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے اور نہ کوئی راہ پا رہے ہیں، یہ لوگ توقع ہے کہ اللہ ان سے درگزر فرمائے، بے شک اللہ معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے)......اور ۳-تیسری قسم وہ ہے جس کے لئے ہجرت مستحب ہے اور واجب نہیں، اور یہ وہ لوگ ہیں جو اس پر قادر ہوں، لیکن اپنے دین کے اظہار اور اسے قائم کرنے کی قدرت رکھتے ہوں، تو ان کے لئے ہجرت مستحب ہے، تاکہ کفار سے جہاد کر سکیں، اور مسلمانوں کی تعداد بڑھا سکیں، اور ان کی مدد کر سکیں، اور کفار کی تعداد بڑھانے سے بچ سکیں، اور ان کے ساتھ اختلاط سے محفوظ رہیں، اور ان کے درمیان برائیوں کے دیکھنے سے دور رہیں، اور اس قسم پر ہجرت واجب نہیں، اس لئے کہ یہ ہجرت کے بغیر اپنے دین کے واجبات انجام دے سکتے ہیں، اور نبی کریم ﷺ کے چچا مسلمان ہونے کے باوجود مکہ میں مقیم تھے)۔

اور ظاہر سی بات ہے کہ مسلم ملک مجبوری کی بھی اگر رعایت نہ کرے، تو پھر ہجرت کے وجوب کی ادائیگی کس طرح ہوگی، اور نبی کریم ﷺ نے فرمایا: "**المسلم أخو المسلم، لا يظلمه ولا يخذله**" (صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۶۶۳، سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۳۸۴۶)۔

(مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے بے یار ومددگار چھوڑتا ہے)، لہذا مجبوری کی حالت میں اسے بے یار ومددگار چھوڑنا جائز نہیں، اور اس کی شہریت کی درخواست قبول کرنا دوسرے مسلم ملک پر واجب ہے۔

۲- اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان محض خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اگر اس خطہ میں گنجائش ہو، تو اس دوسرے ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا مستحب ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: "**المسلم أخو المسلم؛ لا يظلمه ولا يسلمه، من كان في حاجة أخيه، كان الله عزوجل في حاجته**" (صحیح بخاری حدیث نمبر ۲۴۴۲، ۶۹۵۱، صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۵۸۰)۔

(مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، وہ نہ اس پر ظلم کرتا ہے، اور نہ اسے تباہی کے حوالہ کرتا ہے، جو اپنے بھائی کی حاجت پوری کرے گا، اللہ عزوجل اس کی حاجت پوری کرے گا)۔

۳- یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ تمام ممالک جہاں اللہ تعالی کی شریعت نافذ ہو، سارے مسلمانوں کا وطن ہے، لہذا مسلم ملک کی سب سے پہلی ذمہ داری ہے کہ وہ فوجی طاقت کے لحاظ سے اس قدر مضبوط ہو کہ دنیا کے کسی خطہ میں مسلمانوں پر ظلم نہ ہو سکے، لیکن اگر اس کے اندر مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کو روکنے کی طاقت نہیں ہے، تو پھر شرعا اس کے لئے درست نہیں ہے کہ وہ دوسرے ملک کے پناہ لینے والے مسلمانوں کو پناہ گزیں کا درجہ دے، اور ان تارکین وطن مسلمانوں کو شہری تسلیم نہ کرے، اور ملک کے قدیم باشندوں کی طرح شہری ہونے کی سہولتیں انہیں فراہم نہ کرے، انہیں پناہ گزیں قرار دینا ایک سنگین جرم، اسلام کے ساتھ ایک عظیم خیانت اور مغرب کی اندھی تقلید ہے، جس کی بنا پر مسلمانوں کو مختلف خانوں اور سرحدوں میں بانٹ دیا گیا ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**من يهاجر في سبيل الله يجد في الأرض مراغما كثيرا وسعة**"(نساء:۱۰۰) (جو اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا، وہ زمین میں بڑے ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا)۔

اگر اللہ تعالی کی زمین میں تارکین وطن مسلمانوں کے ساتھ دہرا معیار اختیار کیا جائے تو پھر اللہ تعالی کی زمین ان کے حق میں وسیع کیسے ہوگی اور اسے ناگواریوں سے چھٹکارا کیسے ملے گا، چنانچہ علامہ کثیرؒ رقم طراز ہیں: "**هذا تحريض على الهجرة، وترغيب في مفارقة المشركين، وأن المؤمن حيثما ذهب وجدعنهم مندوحة وملجأ يتحصن فيه**"(تفسیر القرآن العظیم ۱/۶۰۸) (یہ ہجرت پر ابھارنا ہے، اور مشرکوں سے جدا ہونے کی رغبت دلانا ہے، اور یہ بتانا ہے کہ مومن جہاں جائے گا، تو ان سے نجات کی جگہ اور پناہ گاہ پائے گا، جہاں محفوظ ہو سکے)۔

اور اللہ تعالی نے ایک جگہ ارشاد فرمایا ہے:"**وإن استنصروكم في الدين، فعليكم النصر إلا على قوم بينكم و بينهم ميثاق، والله بما تعملون بصير**"(انفال:۷۲)۔

(اور اگر وہ دین کے معاملے میں تم سے مدد طلب کریں، تو تم پر مدد واجب ہے، مگر یہ کہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے مقابلہ میں ہو جن کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہو، اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کو دیکھ رہا ہے) اور یہ بالکل واضح ہے کہ یہ حکم اس وقت ہے جبکہ دار الاسلام کا دروازہ تمام مسلمانوں کے لئے کھلا ہوا ہو، دار الاسلام ان کو دار الکفر سے ہجرت کی دعوت دے رہا ہو اور ان کو یکساں اور برابر درجہ کا شہری قرار دینے کے لئے بے تاب ہو، اگر صورتحال یہ ہو کہ دار الکفر کے مسلمان اسلام کے جرم میں ستائے جارہے ہوں، تو ان کو ظلم سے بچانے کے لئے ان کی مدد کرنا فرض ہے، اور اگر مدد کی صورت یہ ہو کہ وہاں سے ان کو نکال لیا جائے، تو ان کو وہاں سے نکال کر مسلم ملک کی شہریت عطا کرنا ضروری ہے، اور معاہد قوم سے جنگ نہ کرنے کا جواز اس وقت ہے، جبکہ تارکین وطن مسلمانوں کو مسلم ملک اپنا شہری بنانے کے لئے تیار ہو، بصورت دیگر عہد توڑ کر ظالم کی سرکوبی لازم ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:"**والذين تبوا الدار والإيمان من قبلهم يحبون من هاجر إليهم ولا يجدون في صدورهم حاجة مما أوتوا، ويؤثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة، ومن يوق شح نفسه فأولئک هم المفلحون**"(حشر:۹)۔

(اور جولوگ پہلے سے ٹھکانے بنائے ہوئے اور ایمان استوار کئے ہوئے ہیں، وہ دوست رکھتے ہیں ان لوگوں کو جو ہجرت کر کے ان کی طرف آ رہے ہیں، اور جو کچھ ان کو دیا جار ہا ہے اس سے وہ اپنے دلوں میں کوئی خلش نہیں محسوس کر رہے ہیں، اور وہ ان کو اپنے او پر ترجیح دے رہے ہیں، اگر چہ انہیں کوئی احتیاج ہو، اور جو خود غرضی سے محفوظ رکھے گئے، تو درحقیقت وہی لوگ کام یاب ہیں)۔

یہ آیت واضح طور پر اس بات پر دلالت کر رہی ہے کہ مسلمان تارکین وطن کے ساتھ فراخ دلی کا برتاؤ ہونا چاہئے، ان کو برابر درجہ کے حقوق ملنے پر قدیم باشندوں کے دلوں میں کوئی رشک وحسد کا جذبہ پیدا نہ ہونا چاہئے، اور ان کا کشادہ دلی سے خیر مقدم اور استقبال ہونا چاہئے۔

اور ایک حدیث میں آپ ﷺ نے امیر لشکر کو حکم دیا ہے:"**ثم ادعهم إلى التحول من دارهم إلى دارالمهاجرين، وأعلمهم إن فعلوا ذلک أن لهم ما للمهاجرين، وأن عليهم ما على المهاجرين**"(صحیح مسلم حدیث نمبر:۱۷۳۱)۔

(پھر مسلمان ہونے والی قوم کو اپنے ملک سے ہجرت گاہ سے منتقل ہونے کی دعوت دو، اور انہیں بتاؤ کہ اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو ان کے حقوق دیگر مہاجرین کی طرح ہوں گے اور ان کی ذمہ داریاں بھی دیگر مہاجرین کی طرح ہوں گی)۔

اس حدیث سے بالکل واضح ہے کہ مسلمان تارکین وطن اور کسی ملک کے قدیم باشندوں کے درمیان ایک شہری ہونے میں کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ نے مدینہ منورہ کو مہاجرین کا ملک قرار دیا ہے)۔

اور حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ "**دعا النبي ﷺ الأنصار أن يقطع لهم البحرين، قالوا: لا، إلا أن تقطع لإخواننا من المهاجرين مثلها**"(صحیح البخاری حدیث نمبر:۲۳۷۶،۳۱۶۳،۳۷۹۴)۔

(نبی کریم ﷺ نے انصار کو بلا کر یہ خواہش ظاہر کی کہ (بحرین) کا علاقہ انہیں جاگیر دے دی جائے، تو انہوں نے منع کر دیا اور یہ خواہش کی کہ ہمارے مہاجر بھائی کو بھی اس کے برابر جاگیر دے دی جائے تب ہی ہم جاگیر لینا پسند کریں گے) اس حدیث سے بھی واضح ہے کہ مسلمان تارکین وطن اور کسی مسلم ملک کے قدیم باشندوں کے درمیان شہری ہونے کی سہولتوں کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔

اور حضرت ابوہریرہؓ کہتے ہیں کہ انصار نے کہا:"**اقسم بیننا وبین إخواننا النخیل، قال: "لا" فقالوا: أتکفوننا المؤنة ونشرککم في الثمرة؟ قالوا: سمعنا وأطعنا**"(صحیح بخاری حدیث نمبر ۲۳۲۵،۲۷۱۹،۳۷۸۲)۔

(ہمارے اور ہمارے مہاجرین بھائیوں کے درمیان کھجور کے باغ تقسیم کر دیجئے تو آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، تب انصار نے کہا کہ آپ حضرات باغ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھال لیں، اور ہم پھل میں آپ کے شریک رہیں گے، تو دونوں فریق نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور اطاعت کی، یعنی نبی کریم ﷺ کے حکم کی تعمیل کی، اس بات کے سلسلہ میں جس کی طرف آپ نے اشارہ فرمایا)۔

اس حدیث سے بھی واضح ہے کہ مسلمان تارکین وطن اور مسلم ملک کے قدیم باشندوں کے درمیان شہریت کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے، بلاشبہ مسلمان اور مسلمان کے درمیان فرق کرنا صریح ظلم ہے، اور ظلم حرام ہے، اور یقیناً شہریت کے حقوق میں مسلمان تارکین وطن اور مسلم ملک کے قدیم باشندوں کے درمیان فرق کرنا کھلا ہوا ظلم ہے جو مسلمان کے شایان شان نہیں ہے)۔

۴-اسلامی نقطہ نظر سے شہریت کے درج ذیل حقوق ہیں:

۱-شخصی آزادی کا حق: اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ملک میں مکمل آزادی کے ساتھ کہیں بھی آ جا سکتا ہے، اور کسی بھی جگہ کا سفر کر سکتا ہے، بغیر کسی سبب کے نہ اسے سزا دی جا سکتی ہے، اور نہ اسے گرفتار کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:"**ولا تعتدوا إن الله لا یحب المعتدین**" (بقرہ:۱۹۰)(اور حد سے بڑھنے والے نہ بنو، بے شک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو دوست نہیں کر رکھتا)۔

اور حضرت ابوذرؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنے روایت کی کہ وہ فرماتا ہے:"**یا عبادي إني حرمت الظلم علی نفسي، وجعلته بینکم محرما، فلا تظالموا......**"(صحیح مسلم حدیث مبر:۲۵۷۷)۔

(اے میرے بندو، میں نے اپنی ذات پر ظلم کو حرام ٹھہرالیا ہے اور اسے تمہارے درمیان بھی حرام قرار دیا ہے، لہذا آپس میں ظلم نہ کرو)۔

چونکہ انسان مکرم ہے، لہذا اس کی تکریم کا تقاضا شخصی آزادی ہے، جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:"**ولقد کرمنا بني آدم وحملناهم في البروالبحر، ورزقناهم من الطیبات، وفضلنا هم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا**"(اسراء:۷۰)(اور ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور خشکی اور تری دونوں میں ان کو سواری عطا کی، اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا، اور ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فضیلت دی)۔

۲- سماجی حق: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شہری کو اپنے مذہب کے دائرہ میں رہ کر شادی بیاہ کی آزادی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "**فانكحوا ماطاب لكم من النساء مثنى وثلث وربع، فإن خفتم ألا تعدلوا فواحدة**" (نساء: ۳) (تو عورتوں میں سے جو تمہیں پسند ہوں، ان سے دو دو، تین تین، چار چار تک نکاح کرلو، اور اگر ڈر ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کرسکو گے، تو ایک ہی پر بس کرو)۔

۳- معاشی حق: اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شہری پوری آزادی اور اپنے مکمل اختیار کے ساتھ کوئی کام، پیشہ، تجارت وروزگار اور سرکاری اداروں میں ملازمت کرنے کا حق رکھتا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: "**هو الذي جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا في مناكبها، وكلوا من رزقه وإليه النشور**" (سورۂ ملک: ۱۵) (وہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ایک فرمانبردار اونٹنی کی مانند بنایا، تو بخشے ہوئے رزق میں سے برتو، اور اس کی طرف پھر اکٹھے ہونا ہے)۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: "**فإذا قضيت الصلاة فانتشروا في الأرض وابتغوا من فضل الله**" (جمعہ: ۱۰) (پھر جب نماز ختم ہوجائے، تو زمین میں پھیل جاؤ، اور اللہ کے فضل کے طالب بنو)۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**لأن يحتطب أحدكم حزمة على ظهره، خير من أن يسأل أحدا فيعطيه أو يمنعه**" (صحیح البخاری، حدیث نمبر ۲۰۷۴، ۲۳۷۴، صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۰۴۲) (تم میں سے کوئی لکڑی چنے اور اس کا گٹھر اپنی پشت پر لے کر آئے، یہ اس بات سے بہتر ہے کہ کسی سے بھیک مانگے کہ وہ دے یا نہ دے)۔

۴- سماجی تکافل کا حق: ہر شہری کو فقر و فاقہ اور احتیاج کے وقت سماجی تعاون اور سماجی کفالت کا حق حاصل ہے اور بیماری کی حالت میں سرکاری ہسپتالوں میں مفت علاج کا حق ہے، جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان**" (مائدہ: ۲) (نیکی اور تقوی میں تم تعاون کرو، اور گناہ اور ظلم زیادتی میں تعاون نہ کرو)۔

اور حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**أنا أولى المؤمنين من أنفسهم، فمن مات وعليه دين، ولم يترك وفاء فعلينا قضاؤه، ومن ترك مالا فلو رثته**" (صحیح البخاری حدیث نمبر ۲۲۹۸، ۶۷۳۱، صحیح مسلم ۱۶۱۹)۔

(میں مومنوں سے خود ان کی جانوں کے مقابل میں زیادہ قریب ہوں، سو جو مر جائے اور اس کے ذمہ دین ہو، اور ادائیگی کے لئے مال نہ چھوڑ جائے تو ہمارے ذمہ اسے ادا کرنا ہے، اور جو مال چھوڑ جائے تو وہ اسکے ورثہ کا ہے)۔

اس حدیث سے پتہ چلا کہ سرکاری خزانہ سے محتاجوں کی مدد کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، اور یہ احسان نہیں، بلکہ فقراء ومحتاجین کا حق ہے، لہذا حکومت کی ذمہ داری ہے کہ کام پر قادر کے لئے کام کے مواقع فراہم کرے اور محتاجوں کی مدد کرے۔

۵- تعلیم وتعلم کا حق: ہر شہری کو سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم وتعلم کا حق ہے، چنانچہ قرآن کریم کی پہلی آیت ہی لوگوں کو پڑھنے اور لکھنے کے ذریعہ تحصیل علم کا حکم دیتی ہے، جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: ''**اقرأ باسم ربک الذي خلق، خلق الإنسان من علق، اقرأ وربک الأکرم، الذي علم بالقلم، علم الإنسان مالم یعلم**''(العلق:۱-۵) (پڑھ اپنے اس پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا، انسان کو خون کے لوتھڑے سے، پڑھ، اور تیرا رب بڑا ہی کریم ہے، جس نے قلم کے واسطہ سے تعلیم دی، اس نے سکھایا انسان کو وہ کچھ جو وہ نہیں جانتا تھا)۔

اور یہ ظاہر ہے کہ انسان پڑھنے لکھنے کی ذمہ داری سے پوری طرح اسی وقت سبکدوش ہوسکتا ہے، جبکہ حکومت اس کے مواقع سب کے لئے یکساں طور پر فراہم کرے، تاکہ علم عام ہو، اور ہر شخص تحصیل علم کر سکے، اسی لئے نبی کریم ﷺ نے علم کے چھپانے کو سخت جرم اور قابل سزا گناہ قرار دیا ہے، جیسا کہ ارشاد ہے: ''**من سئل عن علم فکتمه ألجم بلجام من نار یوم القیامة**''(سنن ابی داؤد، حدیث نمبر ۳۶۵۸، صحیح ابن حبان حدیث نمبر ۹۵، اور اس کی سند صحیح ہے) (جس سے کسی علم کے بارے میں دریافت کیا جائے اور وہ اسے چھپالے تو قیامت کے دن اسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی)۔

۶- عدالتی چارہ جوئی اور انصاف حاصل کرنے کا حق: اسلام کی نظر میں ہر شہری کو عدالتی چارہ جوئی اور انصاف حاصل کرنے کا حق ہے، ارشاد باری تعالی ہے: ''**وإذا حکمتم بین الناس أن تحکموا بالعدل**......''(نساء:۵۸) (اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو، تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو)، دوسری جگہ ارشاد ہے: ''**یأیها الذین آمنوا کونوا قوامین لله شهداء بالقسط، ولایجرمنکم شنآن قوم علی ألاتعدلوا، اعدلوا هو أقرب للتقوی، واتقوا الله، إن الله خبیر بما تعملون**''(مائدہ:۸)۔

(اے ایمان والو، عدل کے علمبردار بنو، اللہ کے لئے اس کی شہادت دیتے ہوئے، اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم عدل نہ کرو، عدل کرو، یہی تقوی سے قریب تر ہے، اور اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ جو کچھ تم کرتے ہو، اس سے باخبر ہے)، اور رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**إیاکم والظلم، فإن الظلم ظلمات یوم القیامة**''(صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۵۷۸، الأدب المفرد للبخاري حدیث نمبر ۴۸۸) (ظلم سے بچو، کیونکہ ظلم قیامت کے دن تاریکیوں کا سبب ہے)۔

۷- سیاسی حقوق: ہر شہری کو اسلام کی نظر میں ووٹ دینے، انتخاب میں امیدوار ہونے اور سرکاری اداروں میں

ملازمت کا حق ہے، اوران سیاسی حقوق کے واسطہ سے وہ اپنی حکومت کے معاملات کوانجام دینے میں شریک ہوسکتا ہے، چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**وشاورهم في الأمر**'' (آل عمران:۱۵۹) (اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو) اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: ''**وأمرهم شورى بينهم**'' (شوری:۳۸) (اوران کے معاملات شوری سے طے پاتے ہیں)، اور یہ بالکل واضح ہے کہ ان سیاسی حقوق کے حاصل ہوئے بغیر حکومت کے معاملات کوانجام دینے میں شہری کی شرکت نہیں ہوسکتی ہے، اورحضرت ابوموسی اشعریؓ کہتے ہیں: ''**دخلت على النبي ﷺ أنا ورجلان من قومي، فقال أحد الرجلين: أمرنا يا رسول الله، وقال الآخر مثله، فقال- ﷺ: إنا لا نولي هذا من سأله، ولا من حرص عليه**'' (صحیح البخاری حدیث نمبر ۷۱۴۹، المنتقی لابن الجارود ر ۳۳۷)۔

(میں اور میری قوم کے دوشخص نبی کریم ﷺ کے پاس گئے، تو ایک شخص نے کہا کہ اے اللہ کے رسول، ہمیں حاکم بنا دیجئے، اور دوسرے نے بھی یہی بات کہی، تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ہم اس منصب پر طالب اور حریص کو فائز نہیں کرتے)۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ حکومت ملازمت کی شرائط تو متعین کرسکتی ہے، لیکن اس حق سے شہریوں کومحروم نہیں کرسکتی ہے، اورحضرت ابورقیہ تمیم بن اوس داریؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا: ''**الدين النصيحة، قلنا: لمن؟قال: لله ولكتابه ولرسوله، ولأئمة المسلمين وعامتهم**'' (صحیح مسلم حدیث نمبر:۵۵) (دین خیرخواہی کا نام ہے، ہم نے کہا: کس کے لئے تو آپ ﷺ نے جواب دیا: اللہ، اس کی کتاب، اس کے رسول اور مسلمانوں کے حکمراں اور عام مسلمانوں کی خیرخواہی کا نام دین ہے)۔

اور عام مسلمانوں کی خیرخواہی کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ان کے حق میں جو بہتر اور مصلحت کا تقاضا ہو اسے انجام دیا جائے، لہذا ہر شہری کو ووٹ دینے کا حق ہے، تاکہ عام لوگوں کے لئے بہتر شخص کا انتخاب ہوسکے، جو ان کے مصالح کو بروئے کار لائے، اور جسے ووٹ دینے کا حق ہے اسے انتخاب میں امیدوار ہونے کا بھی حق ہے۔

۸- رائے کی آزادی کا حق: ہر شہری کو دوسرے کو اذیت پہنچائے بغیر رائے اختیار کرنے اور اس کے اظہار کرنے کا حق ہے، جیسا کہ گذرا کہ نبی کریم ﷺ نے حکمرانوں کی خیرخواہی کو دین قرار دیا ہے، اور اس خیرخواہی کی ادائیگی اسی وقت ہوگی، جبکہ حکام کو بتایا جائے کہ کون سی پالیسی مسلمانوں کے لئے نفع بخش ہے اور کون سی پالیسی مضرت رساں ہے، اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**تأمرون بالمعروف وتنهون عن المنكر**'' (آل عمران:۱۱۰) (نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو)۔ اور یہ بالکل واضح ہے کہ بھلائی کا حکم اور برائی کی ممانعت آزادی رائے کے حق کے بغیر ممکن نہیں۔ اور نبی کریم ﷺ نے

ارشاد فرمایا: "**افضل الجهاد کلمة حق عند سلطان جائر**" (سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۴۳۴۴، سنن ترمذی حدیث نمبر ۲۱۷۴، مسند احمد حدیث نمبر ۱۱۱۴۳، اوراس کی سند صحیح ہے) (بہترین جہاد ظالم بادشاہ کے پاس حق بات کہنا ہے)۔

اور یہ ظاہر ہے کہ حق گوئی آزادی رائے کے حق کے بغیر ممکن نہیں۔

۹- عقیدہ کی آزادی کا حق: ہر شہری کو اختیار ہے کہ اپنے پسندیدہ دین کو اختیار کرے، ارشاد ربانی ہے: "**لا إكراه في الدين**" (بقرہ: ۲۵۶) (دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں ہے)، اور نبی کریم ﷺ نے حضرت علیؓ کو دعوت پر آمادہ کرتے ہوئے فرمایا: "**أفوالله، لأن يهدي الله بك رجلا واحدا، خيرلک من أن يكون لک حمرالنعم**" (صحیح بخاری حدیث نمبر: ۳۰۰۹، ۳۷۰۱، صحیح مسلم حدیث نمبر ۲۴۰۶) (اللہ کی قسم، اللہ تعالی تمہارے ذریعہ ایک شخص کو ہدایت دے دے، یہ تمہارے حق میں اس سے زیادہ بہتر ہے کہ تم سرخ اونٹوں کے مالک بن جاؤ)۔

۱۰- معصیت سے دوری کا حق: کسی شہری کو اسلامی نقطہ نظر سے کسی معصیت پر مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے، ارشاد الہی ہے: "**لا ينال عهدي الظالمين**" (بقرہ: ۱۲۴) (میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں جو ظالم ہوں گے)، اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: "**لا طاعة لمخلوق في معصية الله عز وجل**" (مسند احمد حدیث نمبر ۱۰۹۴، اوراس کی سند صحیح ہے) (اللہ عز وجل کی معصیت میں مخلوق کی اطاعت نہیں)، اور ایک روایت میں ہے: "**لا طاعة في معصية الله، إنما الطاعة في المعروف**" (صحیح البخاری حدیث نمبر ۷۲۵۷، صحیح مسلم ۱۸۴۰) (اللہ کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت نہیں، طاعت تو بس نیک کاموں میں ہے)۔

۵- شریعت اسلامی میں پناہ گزینوں کے درج ذیل حقوق ہیں:

۱- ان کا دفاع کیا جائے، ان کی حمایت ونصرت کی جائے، ان کے بچاؤ کا انتظام کیا جائے، ان کو پناہ دی جائے، اور ان کے ٹھہرانے کا نظم کیا جائے کہ یہی عدل وانصاف کا تقاضا ہے، اور اللہ تعالی کا ارشاد ہے: "**إن الله يأمر بالعدل والإحسان وإيتآي ذي القربى ، وينهى عن الفحشاء والمنكر والبغي**" (نحل: ۹۰) (یقیناً اللہ حکم دیتا ہے عدل کا، احسان کا، اور رشتہ داروں کو دیتے رہنے کا، اور بے حیائی، برائی اور سرکشی سے روکتا ہے)، اور ایک جگہ عاجز اور بے بس کفار کی مدد کرنے کے سلسلہ میں ارشاد ہے: "**ويطعمون الطعام على حبه مسكينا ويتيما وأسيرا**" (دہر: ۸) (اور وہ مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں) اور اللہ کے رسول ﷺ کی صفت تھی:

"**إنک لتصل الرحم، وتحمل الكل، وتكسب المعدوم، وتقري الضيف وتعن على نوائب الحق**" (صحیح بخاری، حدیث نمبر: ۳) (آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزور کی مدد کرتے ہیں اور محتاج کو مال عطا کرتے ہیں، مہمان کی

میزبانی کرتے ہیں اور قدرتی آفات کے وقت لوگوں کی مدد فرماتے ہیں)۔

اور نبی کریم ﷺ نے ''حلف الفضول'' کو مبارک معاہدہ قرار دیا، جو مظلوموں کی مدد اور کمزوروں اور بے سہاروں کی پشت پناہی کے لئے کیا گیا تھا، جیسا کہ حضرت طلحہ بن عبد اللہ بن عوف سے مروی ہے کہ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**لقد شهدت في دارعبد الله بن جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمر النعم، ولو أدعى به في الإسلام لأجبت**'' (معرفة السنن والآثار للبيهقي حدیث نمبر ۱۳۲۳۲، السنن الکبری للبیہقی حدیث نمبر: ۱۳۰۰۸)۔

(میں عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں ایک ایسے معاہدہ میں شریک ہوا کہ جس کے بدلہ مجھے سرخ اونٹ بھی پسند نہیں، اور اگر اس طرح کے معاہدہ کی مجھے اسلام کی حالت میں بھی دعوت دی جائے تو میں ضرور قبول کروں)۔

۲-دوسرا حق: پناہ گزینوں کو ان کے ملک کے حوالہ نہ کرنا، اگر ان پر ظلم و جبر کا اندیشہ ہو، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله، ثم أبلغه مأمنه**'' (توبہ: ۶) (اور اگر مشرکین میں سے کوئی تم سے امان کا طالب ہو، تو اس کو امان دے دو، تا کہ وہ اللہ کا کلام سن لے، پھر اس کو اس کے امان کی جگہ پہنچا دو)۔

ایک جگہ فرمایا: ''**والسابقون الأولون من المهاجرين والأنصار، والذين اتبعوهم بإحسان رضي الله عنهم ورضوا عنه**'' (توبہ: ۱۰۰) (اور مہاجرین وانصار میں سے جو سب سے پہلے سبقت کرنے والے ہیں اور پھر جن لوگوں نے خوبی کے ساتھ ان کی پیروی کی ہے، اللہ ان سے راضی ہوا، اور وہ اس سے راضی ہوئے)۔

اس آیت میں باشندگان مدینہ میں سے ان کی تعریف کی گئی ہے، جنہوں نے مظلوم مہاجرین کی مدد کی اور ان کو کفار مکہ کے حوالہ نہیں کیا۔

اور ایک دوسری جگہ ارشاد ہے: ''**لقد تاب الله على النبي والمهاجرين والأنصار الذين اتبعوه في ساعة العسرة**'' (توبہ: ۱۱۷) (اللہ نے نبی اور ان مہاجرین وانصار پر رحمت کی نظر کی، جنہوں نے نبی کا ساتھ تنگی کے وقت میں دیا)۔

اس آیت کے اندر بھی ان باشندگان مدینہ کی مدح کی گئی ہے، جنہوں نے مدینہ میں پناہ لینے والوں کی مدد کی، یہاں تک کہ ان کا لقب ہی (انصار) (مدد کرنے والے) پڑ گیا۔

۳-تیسرا حق: پناہ گزینوں کو وہ تمام انسانی حقوق حاصل ہوں گے، جن سے شہری مستفید ہوتے ہیں، جیسے جان و مال، عزت و آبرو کے تحفظ، معاشی حمایت، عدل وانصاف، عقیدہ ورائے کی آزادی، چلنے پھرنے، سفر کرنے کی آزادی، شادی، اور خاندان کی تشکیل، پرامن جماعتوں اور پارٹیوں میں شرکت، کام اور پیشہ اختیار کرنے، سونے اور آرام

کرنے، صحت کے تحفظ اور تحصیل علم کے حقوق حاصل ہوں گے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"والذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا في سبيل الله، والذين آووا ونصروا، أولئک هم المؤمنون حقا، لهم مغفرة ورزق كريم، والذين آمنوا من بعد وهاجروا وجاهدوا معكم فأولئک منكم، وأولوالأرحام بعضهم أولى ببعض في كتاب الله، إن الله بكل شئ عليم"(انفال:۷۴،۷۵)۔

(اور جو لوگ ایمان لائے، ہجرت کی، اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی، یہی لوگ پکے مومن ہیں، ان کے لئے بخشش اور باعزت روزی ہے، اور جو ایمان لائیں اس کے بعد اور ہجرت کریں اور تمہارے ساتھ جہاد میں شریک ہوں، یہ بھی تم ہی میں سے ہیں، اور رحمی رشتے والے اللہ کے قانون میں ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، بے شک اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے)۔

اور فرمان الٰہی ہے: **"لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين، ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم، إن الله يحب المقسطين"**(ممتحنہ:۸)۔

(اللہ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، جنہوں نے دین کے معاملہ میں نہ تم سے جنگ کی ہے، اور نہ تم کو تمہارے گھروں سے نکالا ہے، اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے)۔

اور ایک دوسری جگہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **"وأمرت لأعدل بينكم"**(شوری:۱۵)(اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں)۔

اس آیت سے پتہ چلا کہ انصاف ہر ایک کے ساتھ مطلوب ہے، لہذا تمام انسانی حقوق پناہ گزینوں کو بھی حاصل ہوں گے۔

پناہ گزینوں اور شہریوں کے حقوق کے درمیان فرق:

اگر مستقل اور دائمی طور سے پناہ دی گئی ہے، تو پناہ گزینوں اور عام شہریوں کے حقوق میں کوئی فرق نہیں ہے، جیسا کہ انصار نے مہاجرین کو دائمی پناہ دی تھی، اور تمام انسانی اور شہری حقوق میں ان کو شریک کیا تھا، اسی لئے ان کا لقب ''انصار'' (مدد کرنے والے) پڑا، ارشاد باری تعالی ہے: **"إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم و أنفسهم فی سبيل الله، والذين آووا ونصروا، أولئک بعضهم أولياء بعض"**(انفال:۷۲)۔

"إنما ينهاكم الله عن الذين قاتلوكم فی الدين وأخرجوكم من دياركم، وظاهروا على إخراجكم أن تولوهم، ومن يتولهم فأولئک هم الظالمون"(ممتحنہ:۹)۔

''إن الله يأمر بالعدل والإحسان''(نحل:۹۰)۔

یہ آیت مطلق ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم اور غیر مسلم سب کے ساتھ سماجی انصاف مطلوب ہے۔

اور اگر عارضی طور سے پناہ دی گئی ہے، اور پناہ گزیں غیر مسلم ہے، تو ایسی صورت میں سیاسی حقوق کے علاوہ دیگر انسانی حقوق اسے حاصل رہیں گے۔

۶- اصل یہ ہے کہ مسلمان غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار نہ کرے، اس لئے کہ غیر مسلم ملک میں ہر طرف ایمان پر ڈاکہ ڈالنے والے امور موجود ہوتے ہیں، برائیوں، شرور اور فتن کا دور دورہ ہوتا ہے اور برے مناظر عام ہوتے ہیں، جس سے معصیت کی روح پروان چڑھتی ہے، اور نیکی اور تقوی کی اسپرٹ کمزور ہوتی جاتی ہے، اسلامی تشخص کا تحفظ دشوار ہوجاتا ہے، حلال وحرام کے درمیان تمیز آہستہ آہستہ ختم ہوجاتی ہے، کفار ومشرکین کی چاپلوسی کرنی پڑتی ہے، ایک دو نسل تک اسلام کی حفاظت کسی حد تک ہوجاتی ہے، لیکن بعد کی نسلوں سے اسلام یا تو دور ہوجاتا ہے، یا برائے نام رہ جاتا ہے، جبکہ قرآن کریم نے کفار ومشرکین کے ساتھ ایسی دوستی کو مذموم قرار دیا ہے جو اسلام کے مصالح کے خلاف ہو، ''يأيها الذين آمنوا لا تتخذوا آباء كم وإكوانكم أولياء، إن استحبوا الكفر على الإيمان، ومن يتولهم منكم فأولئك هم الظالمون''(سورۂ توبہ:۲۳)۔

اس آیت کے اندر اپنے کفار رشتہ دار کو ولی بنانے کی ممانعت ہے، تو پھر دور دراز کے کفار کو ولی بنانا کس طرح روا ہوگا؟

اور اسی جیسی حالت کے لئے جس میں اسلامی تشخص کا برقرار رکھنا دشوار ہو، نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''من جامع المشرک وسکن معه، فإنه مثله''(سنن ابی داؤد حدیث نمبر ۲۷۸۷ اور اس کی سند صحیح ہے)۔

(جو مشرک کے ساتھ اکٹھا ہو اور ان کے ساتھ رہے، تو وہ اسی کی مانند ہے)۔

اور ایک حدیث میں فرمایا: ''أنا بريئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله، ولم؟ قال: ''لا تراء ى ناراهما'' (سنن ابی داؤد، حدیث نمبر: ۲۶۴۵، ترمذی حدیث نمبر ۱۶۰۴، نسائی حدیث نمبر ۴۷۷۹، اگرچہ اس حدیث کے بارے میں ارسال کا کلام ہے، پھر بھی وہ صحیح ہے)۔

(میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکوں کے درمیان اقامت کرے، صحابہ نے عرض کیا، ایسا کیوں؟ اے اللہ کے رسول، تو آپ ﷺ نے جواب دیا: دونوں کی آگ ایک ساتھ نظر نہیں آنی چاہئے)۔

اور کیا ہی خوب لکھا ہے ابو الولید محمد بن احمد بن رشد قرطبی (جد) (و:۵۲۰ھ) نے ''فكيف يباح لأحد

الدخول إلى بلادهم، حيث تجري عليه أحكامهم في تجارة أو غيرها، وقدكره مالك -رحمه الله تعالى-أ يسكن أحد ببلد يسب فيه السلف، فكيف ببلد يكفر فيه بالرحمن، وتعبر فيه من دونه الأوثان، لاتستقرنفس أحد على هذا، إلاوهو مسلم سوء مريض الإيمان"(المقدمات الممہد ات ۲/ ۱۵۲، طبع اول دار الغرب الإسلامی ۱۴۰۸ھ)۔

(توکسی کے لئے کفار ومشرکین کے ملک میں داخل ہونا کیونکہ مباح ہوگا؟ جہاں اس پر تجارت وغیرہ کے سلسلہ میں ان کے احکام نافذ ہوں گے، جبکہ امام مالکؒ نے ایسے شہر کی سکونت کو مکروہ قرار دیا ہے، جہاں سلف کو برا بھلا کہا جاتا ہو، تو ایسے ملک کی سکونت کیونکر جائز ہوگی، جہاں رحمان کے ساتھ کفر کیا جاتا ہو، اور اسے چھوڑ کر بتوں کی پوجا کی جاتی ہو، اس صورتحال سے اسی کا دل مطمئن ہوسکتا ہے جو کمزور ایمان والا ہو)۔

ب-اگر خدانخواستہ ایسی مجبوری ہو کہ مسلم ملک میں بادشاہی یا ڈکٹیٹر نظام کی وجہ سے دین و مذہب، جان و مال، عقل اور عزت و آبرو کو خطرہ ہو، اور سیکولر ملک میں مذہبی آزادی اور باعزت زندگی کی سہولت دستیاب ہو، دعوت الٰہی اور صحیح اسلامی تعلیم کی نشر واشاعت پر کوئی پابندی نہ ہو، اور مستقبل بعید میں بھی اپنے اور اپنی آئندہ نسل کے ایمان اور اسلامی تشخص کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو، تو ایسی مجبوری کی حالت میں کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس لئے کہ مشہور فقہی قاعدہ ہے: "الضرورات تبيح المحظورات" اور اسی جیسی حالت کے لئے ماوردی نے لکھا ہے: "**إذا قدر على إظهار الدين في بلد من بلاد الكفر، فقد صارت البلدة دار إسلام، فالإقامة فيها أفضل من الرحلة عنها، لما يترجى من دخول غيره في الإسلام**"(المجموع شرح المهذب، کتاب السير ۱۹/ ۲۶۴)۔

(اگر کفار کے ممالک میں سے کسی ملک میں دین کے ظاہر کرنے پر قادر ہو، تو وہ ملک (اس کے حق میں) دار الاسلام (کے حکم میں) ہوگیا، سو وہاں مقیم ہونا وہاں سے کوچ کرنے سے بہتر ہے، کیونکہ اس کی بدولت دوسرے اشخاص کے اسلام میں داخل ہونے کی امید ہے)۔

ج-محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت اس وقت ہوگی، جبکہ اپنے اور اپنے آئندہ نسل کے دین وایمان کے ضائع ہونے کا خطرہ نہ ہو، اور مسلم ملک میں عزت وآبرو کے ساتھ معاشی ضرورت پوری نہ ہوتی ہو، نیز یہ بھی شرط ہوگی کہ شہریت اختیار کرنے والا اپنے داعیانہ کردار کو فراموش نہ کرے، اور ایمان اور عمل صالح کے تقاضے کو ہر حال میں مقدم رکھے، کیونکہ ایمان سے بڑھ کر کوئی دولت نہیں، لہذا دنیا بگڑ جائے، زندگی تلخ ہوجائے، اور حیات مصائب وشدائد میں گذرے، لیکن ایمان پر آنچ نہ آئے، اسی لئے سیدنا یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد سے اپنے آخری

وقت میں توحید اور اسلام کا عہد لیا تھا، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

"**أم كنتم شهداء إذ حضر يعقوب الموت، إذ قال لنبيه ما تعبدون من بعدي، قالوا: نعبد إلهک وإله أبائک، ابراهيم وإسماعيل وإسحاقا إلها واحد او نحن له مسلمون**" (بقرہ:۱۳۳)۔

۷- اس کا تعلق مصلحت سے ہے، اگر اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کا تقاضا ہو کہ چند غیر مسلم حضرات کو مسلم ملک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کیا جائے، تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، علامہ مرغینانیؒ تحریر کرتے ہیں: "**والأصل فيه أن الحربي لا يمكن من إقامة دائمة في دارنا إلا بالاسترقاق أو الجزية؟ لأنه يصير عينالهم و عونا علينا فيلحق المضرة بالمسلمين**" (ہدایہ مع البنایہ، کتاب السیر، باب المستأمن ۷/۲۰۷)۔

(اس سلسلہ میں ضابطہ یہ ہے کہ حربی کو غلام بنا کر یا اس سے جزیہ لے کر ہی دار الاسلام کے دائمی قیام کی قدرت دی جاسکتی ہے، کیونکہ وہ کفار کا جاسوس اور ہمارے خلاف ان کا مددگار رہو جائے گا، سو وہ مسلمانوں کو ضرر پہنچائے گا)۔

اور علامہ سرخسیؒ رقم طراز ہیں: "**وفي التقدم إليه، إن بين مدة، فقال: إن خرجت إلى وقت كذا، وإلا جعلتک ذميا، فإن خرج إلى ذلک الوقت تركه ليذهب، وإن لم يخرج لم يمكنه من الخروج بعد ذلک، وجعله ذميا؟لأن مقامه بعد التقدم إليه حتى مضت المدة رضامنه بالمقام فى دارنا على التأبيد**" (المبسوط ۱۰/۸۴)۔

(اور اسے آگاہ کرنے کے وقت اگر امام نے مدت بیان کردی تھی اور کہہ دیا تھا کہ اگر فلاں وقت تک نکل گئے تو بہتر ہے، ورنہ میں تجھے ذمی بنادوں گا، سو اگر وہ اس وقت تک نکل جائے، تو اسے جانے دے، اور اگر نہ نکلے، تو اسے اس کے بعد نکلنے نہ دے، اور اسے ذمی قرار دے، اس لئے کہ آگاہ کرنے کے بعد اس کا مزید قیام کرنا دار الاسلام میں ہمیشہ قیام کرنے پر رضامندی ہے)۔

اس سے پتہ چلا کہ اگر مجلس شوری کے مشورہ سے امام کی رائے میں کسی غیر مسلم کو ذمی شہری کی حیثیت سے آباد کرنا مناسب ہو تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے۔

☆☆☆

انسان کی شہریت اور حقوق کا مسئلہ - فقہ وقانون کی نظر میں

مولانا اختر امام عادل قاسمی ☆

انسان کی شہریت کا مسئلہ عہد حاضر کے جدید ترین مسائل میں ہے، جس پر مختلف جہتوں سے کئی دہائیوں سے گفتگو ہورہی ہے، ...... آج سے دس بارہ سال قبل جب میری کتاب ''غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل'' شائع ہوئی، تو اس وقت یہ بالکل نیا مسئلہ تھا، اور بہت کم مصنفین نے اس پر تفصیلی بحثیں کی تھیں، ...... میں نے اس کتاب میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی، جو غالباً اردو زبان میں اس موضوع پر پہلی باقاعدہ علمی تحریر تھی، اس میں بڑی حد تک موضوع کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی، کئی ممتاز اہل علم نے جن کے نام میرے پاس محفوظ ہیں اس مسئلہ پر میری حوصلہ افزائی اور تحسین فرمائی ...... فجزاہم اللہ۔

قومیت کا قدیم تصور

یہ اس دور کا بہت حساس مسئلہ ہے، یہ اس دور میں انسان کی شناخت کا اولین ذریعہ بن گیا ہے، مذہب، اور رنگ ونسل کی بنیادیں آج ثانوی درجہ میں چلی گئی ہیں، ...... گویا یہ عہد کے لحاظ سے معیار کی تبدیلی ہے، پہلے انسان کی پہچان اس کے وطن یا جغرافیہ سے نہیں، بلکہ اس کے افکار وخیالات اور مذہبی تصورات سے ہوتی تھی، ان کے علاوہ رنگ ونسل اور زبان وبیان بھی انسانی امتیاز کا معیار بنتے تھے، ...... پہلے کے لوگ جغرافیائی بنیادوں پر اتنا یقین نہیں رکھتے تھے، اور نہ ان پابندیوں کے قائل تھے، اسی لئے جب کبھی تصورات ونظریات اور نسلی یا لسانی معاملات میں جغرافیہ حائل ہونے کی کوشش کرتا تو وہ ہمیشہ جغرافیائی زنجیریں توڑ کے نکل جاتے، انہوں نے کبھی جغرافیہ کو گلے کا طوق نہیں بنایا، اور نہ تاریخ کے پچھلے معتبر ادوار میں کبھی جغرافیائی اور زمینی حدود کو قومیت (یعنی انسان جس نسبت سے پہچانا جائے) کی بنیاد بنایا گیا، بلکہ زمین کے ہر خطہ کو ہر فکر ونظر اور ہر رنگ ونسل کے لئے آزاد سمجھا جاتا تھا۔

☆ مہتمم جامعہ ربانی منورواشریف، سمستی پور بہار۔

فطرت سے قریب تر معیار:

قرآن کریم کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قومیت کا وہی پرانا معیار فطرت سے قریب تھا، سورہ حجرات میں ارشاد ہے:

''**یاایھا الناس إنّا خلقناکم من ذکر وانثیٰ وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا إنّ أکرمکم عنداللہ اتقاکم**''(الحجرات:۱۳)۔

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہارے خاندان اور قبیلے بنائے، تاکہ تمہاری شناخت قائم ہو، بلاشبہ اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ تقویٰ والا ہے)۔

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے کہ گو دنیا کے تمام انسان ایک مرکز وحدت سے وابستہ ہیں، لیکن ان کے درمیان نسلی اور خاندانی امتیازات موجود ہیں، رنگ اور زبان کا تفاوت بھی خاندانی فرق سے پیدا ہوتا ہے، اور مختلف رنگوں کی آمیزش سے نئے رنگ، نئی زبانیں اور نئی تہذیبیں وجود میں آتی ہیں، ......خالق کائنات نے خود پردہ اٹھایا ہے کہ یہ امتیازات صرف باہمی شناخت کے لئے ہیں،، اور یہ فرق مصنوعی نہیں فطری ہیں، جو خود خلاق فطرت نے قائم کئے ہیں، اگر یہ نہ ہوں تو کسی کو پہچاننا اور ایک دوسرے میں فرق کرنا مشکل ہوجائے، لیکن ان میں سے کوئی بات معیار شرافت نہیں ہے، معیار فضیلت صرف تقویٰ، خوف خدا ہے، اور قومیت کی اصل بنیاد نظریۂ ایمان ہے۔

آیت کریمہ واضح طور پر اشارہ کررہی ہے کہ خاندان، رنگ اور زبانیں بھی قومیت کی فطری بنیادیں ہیں، اور ان کی بنیاد پر جو انسانی اکائیاں بنتی ہیں وہ بالکل غیر فطری نہیں ہیں، البتہ خود خالق فطرت کے نزدیک قومیت کی بہترین بنیاد وحدت فکر ونظر ہے، اہل تقوی دنیا میں جہاں بھی ہیں وہ بظاہر خواہ کتنی ہی اکائیوں میں منقسم ہوں، لیکن حقیقت میں وہ ایک ہی وحدت سے منسلک ہیں، جس کو کبھی اس طرح بیان کیا گیا کہ:

''**إنما المؤمنون إخوۃ**''(سورۂ حجرات:۱۰)(تمام اہل ایمان بھائی بھائی ہیں)۔

اور کہیں اس طرح فرمایا گیا:

''**المسلمون کرجل واحد إن اشتکیٰ عینہٗ إشتکیٰ کلہٗ وإن اشتکیٰ راسہٗ إشتکیٰ کلہ**''(صحیح مسلم باب تراحم المؤمنین وتعاطفہم ج ۸ ص ۲۰ حدیث نمبر ۶۷۵۴ ط دار الجیل بیروت)۔

(تمام مسلمان شخص واحد کی طرح ہیں، اس کی آنکھ دکھتی ہے تو پورا جسم دکھتا ہے اور سر میں تکلیف ہوتی ہے تو پورے جسم میں تکلیف ہوتی ہے)۔

''إنما مثل المؤمنين فی توادهم وتراحمهم كالجسد إذا اشتكیٰ منه شيئا تداعیٰ لهٗ سائر الجسد ''(مسند الشہاب القضاعی لمحمد بن سلامۃ بن جعفر القضاعی المصری (المتوفی ۴۵۴ھ) حدیث نمبر ۱۳۶۷، ط موسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۹۸۶ء)۔

(مسلمانوں کی مثال باہمی محبت وتعلق میں ایک جسم کی ہے، کہ جسم کے ایک حصہ میں تکلیف ہوتی ہے تو پورا جسم اس سے متأثر ہوتا ہے)۔

قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص اس پر شاہد ہیں کہ کلمہ کا رشتہ تمام رشتوں پر یہاں تک کہ خون کے رشتہ پر بھی مقدم ہے، قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر آیا ہے، طوفان کے موقعہ پر حضرت نوحؑ کی ہزار خواہش کے باوجود ان کا بیٹا طوفان کی زد سے محفوظ نہ رہ سکا، جبکہ وعدۂ الٰہی تھا کہ حضرت نوحؑ کے اہل خانہ کی حفاظت کی جائے گی، اللہ پاک نے اس کی یہ توجیہ فرمائی کہ:

''إنهٗ ليس من أهلك ''(سورۂ ہود:۴۶)(اے نوح تیرا بیٹا تیرے افراد خاندان میں شامل نہیں تھا)۔

ولدیت کا طاقتور ترین رشتہ ہونے کے باوجود خاندان نوحؑ سے کنعان کا نام خارج کر دیا گیا، اس طرح کے نصوص واشارات سے اسلام کا نقطۂ نظر یہ سمجھ میں آتا ہے کہ خاندان، اور اس طرح کی دوسری تمام بنیادیں اگرچہ خود صناع قدرت کی بنائی ہوئی ہیں، لیکن قومیت کی اصل بنیاد اللہ کے نزدیک وحدت کلمہ اور وحدت فکر ونظر ہے۔

چنانچہ تاریخ کے پچھلے تمام ترادوار انہی بنیادوں کے گرد گردش کرتے ہیں، خود یورپ کا کلیسائی نظام اسی تصور کا علمبردار تھا، بلکہ یک گونہ اس میں شدت پسندی پائی جاتی تھی،......مگر یورپ کے مادی عروج کے بعد جب مغربی اقوام پر مذہب بیزاری اور لادینیت کا غلبہ ہوا، تو انہوں نے صدیوں پرانے کلیسائی نظام سے آہستہ آہستہ آزادی حاصل کر لی، اس کے بعد لادینی رجحانات کا فروغ ہوا، اور اس کے اثرات یورپ کے زیر نگیں تمام علاقوں میں پہونچے، خواہ وہ ان کی قدیم آبادیاں ہوں یا نو آبادیات کا علاقہ، کوئی اس وبا سے محفوظ نہ رہ سکا، پھر دین کی جگہ پر وطنیت کا نیا بُت تراشا گیا، اور اس بنیاد پر انسانوں کو انسانوں سے بانٹا گیا، مذہب اور خون کے رشتوں کو کاٹا گیا، ایک وطن میں رہنے والے تمام لوگوں کو، خواہ وہ کسی رنگ ونسل کے ہوں اور کسی بھی فکر ونظر اور مذہب وملت کے حامل ہوں ایک قوم قرار دیا گیا،...... یہ وطنیت کا نیا تصور تھا، اور اسی بنیاد پر مغرب نے عالم اسلام کو بھی پارہ پارہ کر دیا، بقول ڈاکٹر اقبال:

چاک کر دی ترک ناداں نے خلافت کی قبا سادگی اپنوں کی دیکھ، دشمن کی عیاری بھی دیکھ

اور اسی تصور کی بنیاد پر ملکوں کی سرحدی پابندیاں شروع ہوئیں، اور آمدورفت اور بود وباش کی سہولتیں محدود کی

گئیں، اوراس کے لئے نئے قواعد وضوابط وضع کئے گئے ،اور یورپ کے عالمی قوت بن جانے کے بعدان اصولوں کوبھی عالمی حیثیت دی گئی اور تمام ممالک کے لئے ان کی پابندی لازم کردی گئی۔

وطنیت کی بنیادیں:

ملکوں کی سرحدیں پہلے بھی تھیں ،ایک ملک سے دوسرے ملک آمدورفت اور تجارت کا سلسلہ بھی جاری تھا ،بین الاقوامی معاہدات بھی ہوتے تھے ،تجارتی قواعد بھی تھے ،جنگی کا نظام بھی تھا ،وطنیت کا تصور بھی موجودتھا ،اوراس تعلق سے کچھ قواعد وضوابط بھی تھے ،ہماری کتب فقہ میں وطن کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں:

''الاوطان ثلاثة :وطن اصلی وهووطن الانسان فی بلدتهٖ أو بلدة أخریٰ اتخذها داراًوتوطن بها مع أهلهٖ وولدهٖ وليس من قصدهٖ الارتحال عنها، بل التعيش بها ،وطن الإقامة وهوأن يقصد الإنسان أن يمكث فی موضع صالح للإقامة خمسة عشر يوماً أوأكثر ،ووطن السكنیٰ :وهو أن يقصد الانسان المقام فی غير بلدتهٖ اقل من خمسة عشر يوما'' (بدائع الصنائع للکاسانیؒ (م ۵۸۷ھ) ج ا ص ۳۱۶ ط دارالکتب العلمیۃ بیروت ،لبنان ۱۹۸۶ء ،المبسوط للسرخسیؒ ج ا ص ۴۶۴ ط دارالفکر بیروت لبنان ۲۰۰۰ء وغیرہ)۔

(وطن اصلی :یعنی مقام پیدائش یا ایسا مقام جہاں وہ مستقل طور پر اپنے اہل وعیال کے ساتھ منتقل ہو چکا ہو، اور وہاں سے واپسی کا کوئی ارادہ نہ رکھتا ہو، وطن اقامت : ایسا مقام جہاں پندرہ دن یا اس سے زیادہ عارضی قیام کا ارادہ ہو، (۳)وطن سکونت: ایسا مقام جہاں پندرہ دن سے بھی کم قیام کا ارادہ ہو)۔

بعض فقہاء نے وطن کی دوہی قسمیں کی ہیں (ا) وطن قرار: مقام پیدائش یا وہ مقام جہاں مستقل بودوباش کا ارادہ ہو، (۲) وطن مستعار: جہاں مستقل قیام کا ارادہ نہ ہو (حوالۂ بالا)۔

اسی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لئے ویزہ کا نظام بھی بہت پہلے سے قائم ہے، البتہ اس کی ضرورت عموماً اس وقت پڑتی تھی جب دو ملک باہم برسرپیکار ہوں یا جنگ کے حالات پیدا ہو چکے ہوں، امن کے حالات میں عام طور پر اس کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، اسی لئے اس وقت کے حالات کے مطابق ویزہ کے لئے امان کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا، یہ اصطلاح خود اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی ضرورت صرف جنگی حالات میں تھی ،......پھر ویزہ (امان) کی بھی کئی قسمیں تھیں:

☆شخصی ویزہ......(**استامن لنفسهٖ**......) ☆فیملی ویزہ ......(**طلب الامان لاهلهٖ** ......) ☆گروپ ویزہ ...... (**آمنونی علیٰ عشرة** ......)وغیرہ (دیکھئے البحرالرائق شرح کنزالدقائق لابن نجیم المصریؒ (م ۹۷۰ھ) ج ۵ ص ۸۷ ط دارالمعرفۃ بیروت)۔

تفصیل کے لئے دیکھئے کتب فقہ میں کتاب السیر ،اس موضوع پر راقم الحروف کی کتاب ''اسلام اور بین الاقوامی قانون''میں بھی کافی تفصیل موجود ہے)۔

شہریت کا تصور:

یہ اس دور کی بات ہے جب ساری دنیا پر عالم اسلام کی بالادستی قائم تھی ،اور بین الاقوامی معاملات میں اسلامی ضابطوں کو برتری حاصل تھی،......لیکن جب مسلمانوں پر زوال آیا، وہ عالمی قوت کے طور پر باقی نہ رہے، اور اقوام مغرب کو عالمی بالادستی حاصل ہوئی،تو عالمی سیاست کا معیار بھی تبدیل ہوا ،خارجہ پالیسیاں بدلیں ،اور لادینی بنیادوں پر نئے قواعد وضوابط وجود میں آئے ،......انہی تبدیلیوں میں ایک بڑی تبدیلی قدیم اصطلاحات کو نئے تصور دینا اور پرانی شراب کو نئی بوتلوں میں پیش کرنا ہے۔

انہی محرف اور مسخ شدہ اصطلاحات میں شہریت کی اصطلاح بھی ہے،عربی میں اب اس کے لئے جنسیت'' کا لفظ استعمال ہوتا ہے، جنسیت دراصل قومیت (nationeltiy) کا مترادف ہے،یعنی اب نئے معیار کے مطابق قوم مذہب یا رنگ ونسل سے نہیں، بلکہ وطن سے بنتی ہے،اس لئے اس کی جنس اسی ملک کی طرف منسوب ہوگی ،عالمی سیاست پر مغرب کی بالادستی سے قبل ان اصطلاحات کا وجود نہیں تھا، پہلے اس کے لئے عربی زبان میں'' وطنیت یا توطن'' کا لفظ استعمال ہوتا تھا،اردو میں شہریت کی اصطلاح بڑی حد تک وطنیت سے قریب ہے ،لیکن مفہوم میں بڑا فرق ہے ،اب شہریت '' جنسیت'' کے معنیٰ میں استعمال ہوتا ہے، وطنیت کے لفظ میں بہت توسع ہے، عارضی اقامتگاہوں کے لئے بھی وطن کا لفظ استعمال کیا جاسکتا تھا،البتہ دونوں میں فرق کرنے کے لئے مستقل اقامتگاہوں کو وطن اصلی یا وطن قرار کہا جاتا تھا اور عارضی اقامتگاہوں کو وطن اقامت، وطن سکونت یا وطن مستعار کہا جاتا تھا،......اصل میں یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں بالعموم کتاب الصلوٰۃ میں مسافرت کی نماز کے ضمن میں آیا ہے ،اور بحث نماز کے اتمام اور قصر کی ہے ،اس لئے فقہاء نے محدود مدت والی اقامتگاہوں کو بھی از راہ توسع وطن قرار دیا،تاکہ حالت سفر میں اتمام صلوٰۃ کی نوبت نہ آئے ،......ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جس معنیٰ میں آج شہریت کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے، وہ بڑی حد تک صرف'' وطن اصلی'' یا وطن قرار'' میں پایا جاتا ہے، اور اسی روشنی میں شہریت کے حدود اربعہ کو بھی سمجھا جاسکتا ہے۔

اصطلاحی تعریف اور قسمیں:

شہریت موجودہ اصطلاح میں فرد اور حکومت کے درمیان اس مخصوص سیاسی اور قانونی رابطہ کا نام ہے جس کی بنیاد پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں، اور ایک دوسرے کے بعض تقاضوں اور واجبات کی تعمیل کرنی پڑتی ہے، یہ وہ قانونی رشتہ ہے جس

کی بنیاد پر ایک فرد کا وجود اور تشخص اس ریاست کی طرف منسوب ہوجاتا ہے، جہاں کا وہ شہری ہے، مثلاً ہندوستانی، امریکی، برطانوی اور سعودی وغیرہ۔

پھر شہریت کی بھی دو قسمیں ہیں:

(۱) پیدائشی شہریت: یعنی کسی ملک میں پیدائش کی بنیاد پر بلا اختیار بچہ کو شہریت حاصل ہوجائے۔

(۲) اختیاری شہریت: یعنی جو شہریت سعی وارادہ سے حاصل کی جائے، مثلاً اس ملک کی کسی لڑکی یا لڑکا سے شادی کرلی جائے، یا حکومت سے درخواست کرکے شہریت حاصل کی جائے، وغیرہ۔

پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت منسوخ ہوجاتی ہے، مثلاً ہندوستان کا کوئی شخص برطانوی شہریت حاصل کرلے تو برطانوی شہریت حاصل ہوتے ہی ہندوستانی شہریت اس کی ختم ہوجائے گی، یعنی اب وہ ہندوستانی نہیں بلکہ برطانوی کہلائے گا،......اور کبھی یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت برقرار رہے، مثلاً پاکستان کا کوئی شخص برطانوی شہریت حاصل کرے تو اسے دونوں جگہوں کی شہریت برقرار رکھنے کا حق ہوگا، یعنی وہ بیک وقت پاکستانی بھی ہوگا اور برطانوی بھی،...... پاکستان میں پاکستانی رہے گا اور برطانیہ میں برطانوی، یہ مختلف ملکوں کے اپنے اپنے معاہدات کی روشنی میں طے پاتا ہے، کہ کس ملک میں شہری کے ساتھ کیا معاملہ روا رکھا جائے؟ (الجنسیۃ فی الشریعۃ الاسلامیۃ لرحیل الرحیل ص ۱۳ بحوالہ راقم کی کتاب ''غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل''، ص ۳۵)۔

پھر جب کوئی شخص کسی ملک کا شہری بن جاتا ہے تو اس کو وہ تمام حقوق ومراعات حاصل ہوجاتے ہیں جو ایک پیدائشی شہری کو حاصل ہیں، اور تمام وہ ضمانتیں جو بحیثیت شہری کے ملنی چاہئے مل جاتی ہیں اسی کے ساتھ اس پر بعض واجبات اور مطالبات بھی عائد ہوتے ہیں جن کی تکمیل بحیثیت فرد اس کو کرنی پڑتی ہے:

حقوق مثلاً: ☆ ہر شہری کو اپنے ملک میں مستقل قیام کا حق حاصل ہے۔

☆ وہ ملک کے تمام وسائل سے بلا امتیاز استفادہ کرسکتا ہے۔

☆ وہ اپنی صلاحیت سے ملک کے کسی بھی باوقار عہدہ تک پہونچ سکتا ہے، کسی بھی قسم کی ملازمت حاصل کرسکتا ہے، کسی بھی قسم کی تجارت کرسکتا ہے۔

☆ اسے اپنے ملک میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہوگی۔

☆ اس کی جان ومال اور عزت ووقار کو تحفظ فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے، وغیرہ۔

واجبات مثلاً: ☆ملکی آئین کے ساتھ اس کی وفاداری ضروری ہے۔

☆ ملک کی تعمیر و ترقی میں حصہ لے۔

☆ ملکی مفادات کے تحفظ کے لئے ہر طرح کی خدمت و قربانی کے لئے تیار رہے وغیرہ۔

وطنیت کا یہ تصور بہت قدیم ہے، اور لوگ ہر دور میں ارض وطن کے ساتھ اسی قسم کی جذباتی وابستگی رکھتے رہے ہیں، اور ہر ریاست اپنے شہریوں کے لئے اسی قسم کے احساسات کی حامل رہی ہے، خود نبی کریم ﷺ اور مکہ معظّمہ کے مہاجر مسلمانوں نے جب مدینہ منورہ کو اپنا نیا وطن قرار دیا، تو نبی کریم ﷺ نے اس کے ساتھ انتہائی خیر خواہانہ جذبات کا اظہار فرمایا اور دلوں میں اس کی محبت جاگزیں ہونے کی دعا فرمائی:

''**اللهم حبب إلينا المدينة كحبنا مكة أو أشد**'' (صحیح البخاری ج ۲ ص ۶۶۷ حدیث نمبر ۱۷۹۰ ط دار ابن کثیر، الیمامة بیروت ۱۹۸۷ء)۔

ترجمہ: اے اللہ مدینہ کی محبت ہمارے دلوں میں اسی طرح ڈال دیجئے، جیسے کہ مکہ کی محبت بسی ہوئی ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر۔

ارض وطن کی نگرانی کرتے ہوئے مرنے والے کو شہید قرار دیا گیا:

''**من مات مرابطاً مات شهيداً**'' (کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال لعلی المتقیؒ (م ۹۷۵ھ) ج ۴ ص ۴۱۸ ط مؤسسة الرسالة ۱۹۸۱ء)۔

(جو سرحد کی نگرانی کرتا ہوا مرے وہ شہید ہے)۔

ارض وطن میں رہنا ہر شہری کا حق ہے، کوئی اپنے اس حق کے تحفظ کے لئے مارا جائے تو اسے شہید کہا گیا ہے:

''**إذا جاء ک المسلم يريد أن يقاتلک من أجل أن يخرجک من بلدک أو من بيتک فقاتلهٔ إن قتلتهٔ فهو في النار وإن قتلک فأنت شهيد**'' (شرح ریاض الصالحین (للنوویؒ) للعثیمین (م ۱۴۲۱ھ) ج ۱ ص ۱۰)۔

(کوئی مسلمان تم سے تمہیں اپنے شہر یا گھر سے نکالنے کے لئے لڑے تو تم اس سے لڑو اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو جہنم رسید ہوا اور اگر تم مارے گئے تو تم شہید ہو)۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کے مدینہ تشریف لانے کے بعد وہاں کے مقامی لوگوں کے ساتھ جن میں انصار صحابہ کے علاوہ بہت سے غیر مسلم بھی تھے، قیام ریاست کے ضمن میں جو معاہدہ نامہ تیار ہوا اس کی کئی دفعات میں فرد و ریاست کے تعلق سے اسی طرح محبت و ذمہ داری کا تصور ملتا ہے، مثلاً:

*’’وإن المؤمنين المتقين علىٰ من بغىٰ منهم أو ابتغىٰ دسيعة ظلم أوإثم أو عدوان أوفساد بين المؤمنين وأن أيديهم عليه جميعاً ولو كان ولد أحدهم ‘‘

(متقی مسلمان باغیوں اور ظالموں کے ظلم وگناہ اور فساد وطغیان کے خلاف مضبوط دیوار ہونگے، سب کی قوت ایک مانی جائے گی چاہے ان میں سے کسی کا کوئی بچہ ہی کیوں نہ ہو)۔

*’’وإنهٗ من تبعنا من يهود فإن لهٗ النصر والاسوة غير المظلومين ولامتناصرين عليهم‘‘

(جو یہود ہمارے حمایتی ہونگے ان کو یکساں طور پر امداد واستحقاق حاصل ہوگا ان پر کوئی ظلم نہیں ہوگا اور نہ ان کے خلاف کسی کی مدد کی جائے گی)۔

*’’وإن بينهم –بين المسلمين واليهود–النصر علىٰ من حارب أهل هذهِ الصحيفة ‘‘

(مسلمان اور یہودی باہم تعاون کے پابند ہونگے ان لوگوں کے خلاف جو اس میثاق میں شامل فریقوں سے بر سر پیکار ہوں)۔

*’’وإن بينهم النصح والنصيحة ‘‘

(ان کے درمیان باہم ہمدردانہ اور خیر خواہانہ جذبات کارفرما رہیں گے)۔

*’’وإن بينهم النصر على من دهم يثرب‘‘

(مدینہ منورہ پر یلغار کرنے والوں کے خلاف یہ باہم ایک دوسرے کے تعاون کے پابند ہونگے) (سیرت ابن ہشام ۱/۵۰۱، الروض الانف للسہیلیؒ ۲/۳۴۵، عیون الاثر لابن سید الناسؒ ۱/۲۶۰، النہایۃ فی غریب الاثر لابن محمد الجزریؒ ۳/۵۳۴)۔

شہریت کے حدود اربعہ اور بنیادیں:

(۱) رہا یہ مسئلہ کہ اسلام میں شہریت یا وطنیت کے حدود کیا ہیں؟ اور اس کے لئے کن چیزوں کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؟ ......قرآن وسنت میں اس ضمن میں کوئی تصریح نہیں ملتی، اور نہ فقہاء کے یہاں اس سلسلے میں کوئی صراحت موجود ہے، البتہ وطن کی تفصیلات کے ضمن میں بعض چیزیں تذکرۃً آئی ہیں جن سے اس مسئلہ پر روشنی حاصل کی جاسکتی ہے......اس ضمن کے مباحث فقہ شافعی اور فقہ حنبلی میں موجود نہیں ہیں، فقہاء مالکیہ کے یہاں بھی اجمال کے ساتھ آئی ہے، البتہ فقہاء حنفیہ کے یہاں نسبتاً زیادہ تفصیل ملتی ہے، اور اکثر علماء حنفیہ نے اس موضوع سے تعرض کیا ہے، زیر بحث مسئلے میں ان تفصیلات سے فی الجملہ تین بنیادیں ابھر کر آتی ہیں، جن کو شہریت کے مسئلے میں مدار بنایا جاسکتا ہے:

(۱) ولادت: یعنی وہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو۔

(۲) نکاح: یعنی وہاں کے کسی شخص سے زوجیت کا رشتہ قائم ہوا ہو۔

(۳) مستقل بود و باش کا ارادہ، خواہ ملازمت اور ذریعۂ معاش کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے۔

علامہ محمود ابن مازہ بخاری شہیدؒ (م ۶۱۶ھ) لکھتے ہیں:

''**وطن أصلي وهو مولدالرجل والبلد الذی تأهل به**'' (المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی ج ۲ ص ۳۵، ۳۶ ط دارالکتب العلمیۃ بیروت ۲۰۰۴ء)۔

(وطن اصلی: جو مقام پیدائش ہو یا اس نے وہاں شادی کی ہو)۔

علامہ کاسانیؒ رقمطراز ہیں:

''**أو بلدة أخرىٰ اتخذها داراًوتوطن بها مع أهلهٖ وولدهٖ وليس من قصدهٖ الارتحال عنها، بل التعيش بها**'' (بدائع الصنائع للکاسانی (م ۵۸۷ھ) ج ۱ ص ۳۱۶)۔

(کسی مقام پر اس نے اپنا گھر بنالیا اور اہل وعیال کے ساتھ وہاں مستقل بود و باش کا ارادہ کرلیا، اور وہاں سے واپسی کا کوئی ارادہ نہ ہو)۔

فقہاء حنفیہ کے یہاں عام طور پر ان تینوں بنیادوں کا تذکرہ ملتا ہے، بعض فقہاء مالکیہ نے بھی ان میں سے کچھ چیزوں کا ذکر کیا ہے، محمد بن عبداللہ الخرشی مختصر خلیل کی شرح میں لکھتے ہیں:

''**الأول الوطن وهو مااتخذ فيه الإقامة بنية التأبيد**'' (شرح مختصر خلیل للخرشیؒ (م ۱۱۰۱ھ) ج ۵ ص ۱۸۸ الشاملۃ)۔

(وطن وہ ہے جہاں اس نے ہمیشہ کی نیت سے قیام کا ارادہ کرلیا ہو)۔

''**والوطن فی الثانية هو المسافر بقرية فيها أهلهٗ وولدهٗ فاقام عندهم ولو صلاة واحدة أتم ......ومن كتاب ابن المواز وإذالم تكن مسكنهٗ ولكنهٗ نكح بها فلايتم حتى يبنى بأهلهٖ ويلزمهٗ السكنى**'' (مواہب الجلیل لشرح مختصر خلیل للحطاب الرعینیؒ (م ۹۵۴ھ) باب صلاۃ السفر ج ۲ ص ۵۰۰ ط دار عالم الکتب)۔

(وطن سے مراد ایسی بستی کا سفر ہے جہاں اس کے اہل وعیال رہتے ہوں، وہاں ایک نماز کے برابر بھی قیام کرے گا تو اس پر اتمام ضروری ہے،......اور اگر اس کا وہ مسکن نہ ہو لیکن اس نے نکاح کیا ہو تو پوری نماز اس وقت پڑھے گا جبکہ اپنی بیوی کے ساتھ وہیں زفاف گذارے، اور سکونت لازم ہے)۔

☆ فقہاء کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وطنیت کے حصول کے لئے یہ تینوں بنیادیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں، یعنی ان میں سے کوئی ایک بنیاد بھی موجود ہو تو شہریت حاصل ہوجائے گی، اسی لئے اگر کسی کو دو جداگانہ مقامات پر ان میں سے کوئی ایک چیز حاصل ہو تو اسے دوہری شہریت حاصل ہوگی اور دونوں جگہیں اس کے لئے وطن کا درجہ رکھیں گی: المحیط

البرہانی فی الفقہ النعمانی للبخاری میں ہے:

''وإن كان لهٗ أهل ببلدةٍ فاستحدث ببلدةٍ أخرىٰ أهلاً فكل واحدٍمنهما وطن أصلي،وروى أنهٗ كان كان لعثمان ؓ أهل بمكة وأهل بمدينة، وكان يتم الصلوٰة بهما جميعاً''(ج۲ص۳۶)۔

(اگرکسی کے اہل وعیال ایک شہر میں ہوں پھر دوسرے شہر میں اس نے شادی کرلی تو دونوں شہروں کی شہریت اسے حاصل ہوگی،روایت میں آتا ہے کہ حضرت عثمان غنیؓ کی ایک بیوی مکہ معظّمہ میں رہتی تھیں اور دوسری اہلیہ مدینہ منورہ میں اور دونوں جگہ وہ نماز پوری پڑھتے تھے)۔

☆اسی طرح فقہاء نے مستامن کی بحث میں یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ وقتی قیام کی غرض سے کوئی غیر مسلم دارالاسلام میں داخل ہو،وہ اگر مستقل قیام کا ارادہ کرلے،یا (علیٰ اختلاف الاقوال) طویل مدت تک قیام کرے،یا وہاں کے کسی متوطن سے رشتۂ ازدواج قائم کرلے،یا وہاں کی کوئی خراجی زمین خریدلے تو دارالاسلام کی شہریت اسے حاصل ہوجائے گی،اور پھر وہ مستامن باقی نہیں رہے گا،نیز اگر وہ اہل وعیال کے ساتھ ہے تو اس کے ساتھ وہ بھی اہل ذمہ (یعنی اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہری) قرار پائیں گے (البدائع للکاسانی ج ۷ ص ۱۱۰،الاحکام السلطانیۃ للماوردیؒ ص ۱۴۶،المبسوط للسرخسیؒ ج ۱۰ ص ۸۴،السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۸۶۵،ابن عابدین ج ۳ ص ۳۴۶،المہذب للشیرازیؒ ج ۲ ص ۲۵۱ وغیرہ)۔

یہ بات اگرچہ غیر مسلموں کے تعلق سے کہی گئی ہے مگر فی الجملہ اس کو شہریت کے حصول کے معاملے میں بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

شہریت کے نئے قواعد بنائے جاسکتے ہیں:

میرے خیال میں فقہاء نے مذکورہ جن چیزوں کا ذکر کیا ہے،وہ حصر کے لئے نہیں ہے،بلکہ یہ اس دور کی چند معروف صورتوں کا تذکرہ ہے،کیونکہ یہ چیزیں منصوص نہیں ہیں،بلکہ اجتہادی ہیں،جن میں عرف وعادت اور مشاہدہ وتجربہ کا دخل ہوتا ہے،اس لئے اگر کسی ملک کی انتظامیہ شہریت کے لئے کچھ نئی بنیادیں وضع کرے،یا مذکورہ چیزوں میں ترمیم کرے یا کچھ شرطوں کا اضافہ کرے تو اس کی گنجائش محسوس ہوتی ہے،بشرطیکہ اس کا مقصد ملک وملت کی سلامتی اور مسلمانوں کا تحفظ ہو،اس لئے کہ عرف وعادت میں تغیر ممکن ہے،ملکی قانون میں تبدیلی تغیر عرف کی علامت قرار دی جائے گی۔

مسلم ملک میں کسی بیرونی مسلمان کو شہریت دینے کا مسئلہ:

(۲) اس ضمن میں یہاں ایک اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ کیا کسی مسلم ملک کے لئے ہر ایسی درخواست شہریت کی تعمیل ضروری ہے جو کسی دوسرے ملک کے مسلم امیدوار کی جانب سے پیش کی جائے؟......

اس معاملہ میں اسلام کا اصل مزاج جو قرآن وحدیث کی نصوص سے سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اسلام کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت کا مزاج ایسے تمام مسلم امیدواروں کے لئے توسع کا ہونا چاہئے، کئی نصوص سے اس پر روشنی پڑتی ہے، مثلاً:

* ''**إن الذين توفاهم الملائکة ظالمی أنفسهم قالوا فیم کنتم قالوا کنا مستضعفین فی الأرض قالوا ألم تکن أرض الله واسعة فتهاجروا فیها فاولئک مأواهم جهنم وساء ت مصیراً**'' (سورۂ نساء:۹۷)۔

(بے شک ان لوگوں کی جان جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کر رکھا ہے (جب) فرشتہ قبض کرتے ہیں تو ان سے کہیں گے کہ تم کس کام میں تھے وہ بولیں گے، ہم اس ملک میں بے بس تھے، فرشتے کہیں گے کہ اللہ کی سرزمین وسیع نہ تھی، کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے؟ ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے)۔

اس آیت کریمہ میں جہاں ایسی سرزمین میں اقامت کو جرم قرار دیا گیا ہے جہاں نظام طاغوت کی حکمرانی ہو، وہیں اسلامی حکومتوں کو یہ اشارہ بھی دیا گیا ہے کہ اللہ کی زمین اللہ کے نام پر آنے والوں کے لئے تنگ نہیں کی جانی چاہئے، بلکہ مہاجرین کے لئے وہاں ہمیشہ گنجائش رہنی چاہئے، اس لئے کہ ہجرت کے حکم سے قبل مقام ہجرت کا وجود شرط ہے، اس کے بغیر حکم ہجرت کی کوئی معنویت باقی نہیں رہتی،......مہاجرین کے لئے حالات کے تحت حکم میں فرق ہوسکتا ہے، مگر ایک خالص اسلامی ریاست کو اس حکم کی تعمیل میں ہر وقت لچک باقی رکھنی ہوگی۔

☆ مدینہ کی پہلی اسلامی ریاست قائم ہونے کے بعد مدینہ میں مہاجرین کا سلسلہ شروع ہوگیا، اور حضورﷺ نے ایسے تمام لوگوں سے جو غیر اسلامی ماحول میں قیام پذیر تھے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا:

''**انابریء من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین قالوا یا رسول الله ولم؟ قال لاترای ناراهما**'' (ترمذی کتاب السیر باب ماجاء فی کراہیۃ المقام بین اظہر المشرکین حدیث نمبر ۱۶۰۴ ج ۴ ص ۱۵۵ ط داراحیاء التراث العربی بیروت، سنن ابی داؤد کتاب الجہاد، باب النہی عن القتل من اعتصم بالسجود حدیث نمبر ۲۶۴۷ ج ۲ ص ۳۴۹ ط دارالکتاب العربی بیروت)۔

(میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو، لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ! کیوں؟ آپ ؐ نے ارشاد فرمایا، دونوں اتنی دور رہیں کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی آگ نہ دیکھ سکے)۔

ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا:

''**لاتساکنواالمشرکین ولاتجامعوهم فمن ساکنهم أو جامعهم فهو مثلهم**'' (السنن الکبریٰ للبیہقی، کتاب السیر باب الرخصۃ فی الاقامۃ بدار الشرک لمن لایخاف الفتنۃ ج ۹ ص ۱۸)۔

(مشرکانہ ماحول میں سکونت اور اٹھنے بیٹھنے سے پرہیز کرو، جو ان کے ساتھ رہے گا یا اکٹھا ہوگا وہ انہی کی طرح سمجھا جائے گا)۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں:

"من جامع المشرک وسکن معهٗ فإنهٗ مثلهٗ" (ابوداؤد کتاب الجهاد باب فی الاقامة بارض الشرک ج ۲ ص ۴۸ حدیث نمبر ۲۷۸۹)۔

نبوت کی طرف سے یہ احکامات اسلامی حکومت کے فرائض کی نشاندہی کرتے ہیں اور کلمہ گو مہاجرین کے لئے اس پر عائد ذمہ داریوں کے لئے دلیل راہ ہیں، اس طرح کے احکامات آپ ﷺ نے مکی عہد نبوت میں نہیں دیئے، اس لئے کہ اس وقت ان کی کوئی معنویت سمجھ میں نہیں آتی،...... مدینہ کی اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد یہ اعلانات بحیثیت پیغمبر بھی ممکن ہوئے اور بحیثیت صدر مملکت بھی۔

☆اسی لئے دار الہجرت کے قیام کے بعد جنگی دستوں کے ذریعہ مختلف علاقوں میں مشرف باسلام ہونے والے لوگوں کو دار الہجرت منتقل ہونے کی باقاعدہ منادی کرائی گئی، حضرت بریدہؓ کی روایت کے الفاظ جو مختلف کتب احادیث میں آئے ہیں:

"إذا لقیت عدوالله من المشرکین فادعهم إلیٰ ثلاثة خصال أو خلال فأیتهن أجابوک فأقبل منهم وکف عنهم ثم ادعهم إلی الاسلام، فإن أجابوک فأقبل منهم وکف عنهم، ثم ادعهم إلی التحول من دارهم إلیٰ دارالمهاجرین وأخبرهم أنهم إن فعلوا ذلک، فلهم ما للمهاجرین وعلیهم ماعلی المهاجرین" (صحیح مسلم ج ۵ ص ۱۳۹ حدیث نمبر ۴۶۱۹ ط دار الجبل بیروت لبنان، سنن ترمذی ج ۴ ص ۱۶۲ حدیث نمبر ۱۶۱۷ ط دار احیاء التراث العربی بیروت)۔

(غیر مسلموں سے سامنا ہو تو ان کو تین باتوں کی دعوت دو، اگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی قبول کرلیں تو جنگ سے گریز کرو، ان کو اسلام کی دعوت دو اگر وہ قبول کرلیں تو جنگ سے گریز کرو، پھر ان کو اپنے ملکوں سے دار الہجرت منتقل ہوجانے کی دعوت دو، اور ان کو بتاؤ کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کو وہی ملے گا جو مہاجرین کو ملتا ہے، اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہونگی جو مہاجرین پر عائد ہوتی ہیں)۔

☆اسی طرح قرآن کریم میں ہجرت کر کے مدینہ آنے والی خواتین کے بارے میں فرمایا گیا:

"یا یها الذین آمنوا إذا جائتکم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهن الله اعلم بإیمانهن، فإن علمتموهن مؤمنات فلاترجعوهن إلی الکفار" (الممتحنة:۱۰)۔

(اے ایمان والو! تمہارے پاس مؤمن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو ان کا جائزہ لو، اللہ ان کے ایمان کو زیادہ جانتا ہے، اگر وہ تمہیں مؤمن معلوم ہوں تو ان کو کافروں کے پاس مت لوٹاؤ)۔

دراصل یہ حکم ایک خاص پس منظر میں دیا گیا تھا صلح حدیبیہ کے موقعہ پر اہل مکہ کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس کی رو سے مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آنے والے مسلمانوں کو مدینہ کی سکونت نہیں دی جاسکتی تھی، بلکہ ان کو مکہ واپس کرنا ضروری تھا، اس کے برعکس اگر کوئی شخص مدینہ سے مکہ چلا جاتا، تو اہل مکہ پر ان کو لوٹانا ضروری نہیں تھا،...... یہ معاہدہ اگرچہ کہ مردوں اور عورتوں سب کے لئے بظاہر یکساں تھا، لیکن عملاً عورتوں پر اس کا اطلاق نہیں ہوا، چنانچہ حضرت ابوجندلؓ کو مقام حدیبیہ ہی سے واپس کر دیا گیا اور اس کے بعد بھی پوری مدت معاہدہ میں کسی کو مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی گئی، لیکن ہجرت کر کے آنے والی خواتین کو حضور ﷺ نے واپس نہیں فرمایا، بشرطیکہ انہوں نے اسلام کے لئے ہجرت کی ہو، حضرت ام کلثوم بنت عقبہؓ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ہجرت کر کے مکہ سے نکلیں تو مسلمانوں کو بڑی تشویش ہوئی کہ ان کو کیا جائے، اس پر مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

بعض روایات میں آتا ہے کہ مقام حدیبیہ میں صلح نامہ کی کتابت کے بعد ہی ایک مسلم خاتون سبیعۃ بنت حارث اسلمیہؓ مکہ سے بھاگ کر وہاں پہونچیں، تو ان کے غیر مسلم شوہر مسافر المخزومی (ایک روایت کے مطابق صیفی ابن الراہب) نے اپنی بیوی کی واپسی کا مطالبہ کیا اور کہا کہ ابھی تو معاہدہ نامہ کی سیاہی بھی خشک نہیں ہوئی ہے، ابھی آپ کے امتحان کا وقت آگیا، اس پر اللہ پاک نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی، یعنی عورتیں اس معاہدہ میں شامل نہیں ہیں (شرح الوقایۃ ج ۳ ص ۲۸۹)۔

بعض حضرات کا خیال ہے کہ عورتیں اس معاہدہ میں داخل ہی نہیں تھیں، اس کی تائید ان روایات سے ہوتی ہے جن میں صلحنامہ کے یہ الفاظ منقول ہیں:

(لایاتیه رجل) یعنی اس معاہدہ میں صرف مرد داخل تھے (الروض الانف للسہیلیؒ (م ۵۸۱ھ) ج ۴ ص ۴۸)۔

بعض علماء کی رائے ہے کہ یہ معاہدہ تو عام تھا (جیسا کہ معاہدہ نامہ کے الفاظ اکثر روایات میں یہ نقل ہوئے ہیں: **''لایاتیه أحد''** (الروض الانف للسہیلیؒ (م ۵۸۱ھ) ج ۴ ص ۴۸) لیکن عورتوں کے حق میں اس کو منسوخ کر دیا گیا تھا (دیکھئے احکام القرآن لاحمد ابی بکر جصاص الرازی الحنفیؒ (م ۳۷۰ھ) ج ۳ ص ۵۸۴ ط دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۴ء)۔

بہر حال معاہدہ کی بنا پر تھوڑی دشواری پیدا ہو گئی تھی، لیکن اسلام کا اصل حکم عام حالات کے لئے یہی ہے کہ آنے والے مہاجرین کو اسلامی حکومت قبول کرے، واپس نہ کرے۔

مسلم ملک کا غیر مسلم ملکوں سے مہاجرین کے مسئلہ پر معاہدہ کرنا

☆ البتہ اگر اسلامی ریاست غیر مسلم ملکوں سے مہاجرین کے معاملہ میں کوئی معاہدہ کر لے، یا اس قسم کے کسی بین الاقوامی

منشور کو منظوری دے دے جس کی رو سے دوسرے ملکوں کے مہاجرین کو اسلامی حکومتیں اپنے یہاں مستقل سکونت نہ دے سکتی ہوں، تو اس صورت میں حکم شرعی کیا ہوگا؟

اس مسئلے میں فقہاء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

مالکیہ اور حنابلہ کی رائے:

مالکیہ اور حنابلہ کی رائے یہ ہے کہ ایسی صورت میں معاہدہ پر عمل کرتے ہوئے مہاجرین سے شہریت کے معاملے میں معذرت کا جواز ہے، البتہ اسلامی حمیت کے نقطۂ نظر سے خارجی طور پر ان کی مدد کی جائے گی (حاشیۃ الدسوقی ج ۲ ص ۲۰۶، ۲۰۷، الخرشی ج ۳ ص ۱۵۱، کشاف القناع للبہوتیؒ ج ۳ ص ۱۱۴، المغنی لابن قدامہؒ ج ۱۰ ص ۵۱۷)۔

ان کی اس بات کا ماخذ یہ ہے کہ:

(۱) اسلام میں معاہدات کی پابندی کی بڑی اہمیت ہے، خواہ وہ مسلمانوں سے کیا جائے یا غیر مسلموں سے، ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وأوفوا بعهدالله إذاعاهدتم ولاتنقضوا الايمان بعد توكيدها وقدجعلتم الله عليكم كفيلاً إن الله يعلم ماتفعلون" (النحل: ۹۱)۔

(جب معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو، اور قسمیں موکد کرنے کے بعد نہ توڑو، جب کہ تم نے اللہ کو اپنے اوپر کفیل بنالیا ہے، جو تم کرتے ہو اللہ پاک اسے جانتے ہیں)۔

ایک روایت سے بھی اس مضمون کی عملی تائید ہوتی ہے:

حضرت ابوطفیلؓ روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے حضرت حذیفہ بن الیمانؓ نے بیان کیا کہ غزوۂ بدر میں میری شرکت اس لئے نہیں ہوسکی کہ میں اور میرے والد حسیل مکہ سے نکلے تو کفار قریش نے ہمیں پکڑ لیا کہ تم لوگ محمد ﷺ کے پاس جانے کا ارادہ رکھتے ہو، ہم نے کہا نہیں ہم صرف مدینہ جانا چاہتے ہیں، تو ان لوگوں نے ہم سے اللہ کے نام پر ہم سے عہد و پیمان لیا کہ ہم سیدھے مدینہ جائیں، اور محمد ﷺ کے ساتھ جنگ میں شرکت نہ کریں، چنانچہ ہم سیدھے رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر ہوئے، (آپ ﷺ بدر میں تھے) اور سارا ماجرا سنایا تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

"انصرفا نفی لهم بعهدهم ونستعين الله عليهم" (صحیح مسلم ج ۵ ص ۱۷۵ احدیث نمبر ۴۷۴۰ ط دار الجبل بیروت، مسند احمد بن حنبلؒ ج ۵ ص ۳۹۵ حدیث نمبر ۲۳۴۰۲ ط مؤسسۃ قرطبہ القاہرۃ، سنن الکبریٰ للبیہقی ج ۹ ص ۱۴۵ حدیث نمبر: ۱۸۲۱۰ ط مکتبہ دار الباز مکہ المکرمہ ۱۹۹۴ء)۔

(:تم دونوں مدینہ واپس جاؤ، ہم ان کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ان کے خلاف مدد چاہیں گے)۔

(۲) نیز رسول اللہ ﷺ نے صلح حدیبیہ کے بعد جو طرز عمل اختیار فرمایا اس سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے، حضرت ابوجندلؓ کو حدیبیہ ہی سے واپس کر دیا گیا۔

بعد میں حضرت ابوبصیرؓ کے واقعہ کا ذکر تاریخ وسیر کی تقریباً تمام ہی کتابوں میں ہے، کہ وہ کسی طرح بھاگ کر مدینہ پہنچے، مکہ والے ان کو لینے کے لئے مدینہ آ گئے، اور حضور ﷺ نے ان کو حسب معاہدہ واپس کر دیا،......لیکن حضرت ابوبصیرؓ کسی طرح مکہ نہ جا کر ساحل سمندر کے علاقے میں جا کر پناہ گزیں ہو گئے، یہ خبر مکہ کے دوسرے مجبور مسلمانوں کو ملی جو معاہدہ کی بنا پر مدینہ نہ آ سکتے تھے، چنانچہ حضرت ابوجندلؓ سمیت ساٹھ ستر اور بعض روایات کے مطابق تین سو (۳۰۰) مسلمانوں کی ایک تعداد وہاں جمع ہو گئی جہاں سے قریش کے تجارتی قافلے گذرتے تھے، اور حضور ﷺ نے ان کو اس وقت تک مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی جب تک کہ خود مکہ والوں نے ہی ان کو مدینہ واپس بلانے کی رضامندی نہ دے دی (اسد الغابہ لابن الاثیرؒ (م ۶۳۰ھ) ج ۳ ص ۱۴۵، الاستیعاب للقرطبیؒ (م ۴۶۳ھ) ج ۲ ص ۱۳، الطبقات الکبریٰ لابن سعدؒ (م ۲۳۰ھ) ج ۷ ص ۴۰۵ ط دار صادر بیروت ۱۹۶۸ء وغیرہ)۔

یعنی ان فقہاء (مالکیہ وحنابلہ) کے نزدیک حدیبیہ کے موقعہ پر نبی کریم ﷺ نے جو طریقۂ کار اختیار فرمایا، اور اس وقت کے حالات کے مطابق یک طرفہ طور پر کفار کی شرطوں کو قبول فرمایا جن میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان کے شہر کا کوئی مسلمان ان کی مرضی کے بغیر دار الکفر (مکہ) سے نکل کر دار الاسلام (مدینہ) نہیں جا سکتا، یہ آج بھی سنت قائمہ ہے اور آج بھی ویسے حالات پیدا ہو جائیں تو اس کو قانون کے طور پر اختیار کیا جا سکتا ہے۔

شافعیہ کا موقف:

☆ شافعیہ اس طرف گئے ہیں کہ اس طرح کی شرطوں کو قبول کرنا درست نہیں اور نہ آنے والے مسلمانوں کو واپس کرنا جائز ہے، البتہ اگر ان کے اہل خاندان اپنے ملک میں مضبوط اور صاحب اثر ورسوخ ہوں، اور انہیں خاندانی حمایت حاصل ہو جس سے ان کے دینی ابتلا کا اندیشہ کم ہو تو واپس کرنے کی گنجائش ہے، بعض شوافع کا خیال ہے کہ جس مسلمان پر ہجرت فرض نہ ہو اس کو واپس کیا جا سکتا ہے،......ان کے یہاں ایک قول یہ بھی ملتا ہے کہ آزاد شخص کو واپس کرنے کی مطلق اجازت ہے، یعنی وہ واپس جانے کے بجائے کہیں اور اپنی پناہ گاہ تلاش کر سکتا ہے جس طرح کہ حضرت ابوبصیرؓ نے کیا تھا (نہایۃ المحتاج للرملیؒ ج ۸ ص ۱۱۰، مغنی المحتاج للشربینیؒ ج ۴ ص ۲۶۴)۔

حنفیہ کا مسلک:

☆ جبکہ حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ شرط باطل ہے اور اس طرح کے کسی معاہدہ کو پورا کرنا ضروری نہیں ہے (فتاویٰ ہندیۃ ج ۲ ص ۱۹۷ ط دار الفکر بیروت لبنان، وشرح السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۴۱، شرح الوقایۃ ج ۶ ص ۸۰)۔

اس کی کئی وجوہات ہیں:

(الف) حنفیہ کے نزدیک صلح حدیبیہ کا واقعہ دائمی نہیں وقتی تھا اور بعد میں اس کو منسوخ کر دیا گیا، قرآن کریم کی یہ آیت اس پر شاہد ہے:

"فإن علمتموهن مؤمنات فلاترجعوهن إلى الكفار" (الممتحنۃ:۱۰)۔

(یعنی ان کے ایمان کا علم ہوجانے کے بعد ان کو کافروں کے پاس واپس بھیجنا درست نہیں ہے)۔

(یہ اس تاویل پر مبنی ہے کہ معاہدہ کو مردوں اور عورتوں کے لئے عام قرار دیا جائے، جیسا کہ مشہور یہی ہے) (فتح القدیر لابن الہمامؒ ج ۵ ص ۴۶۰ ط دار الفکر بیروت لبنان ۱۹۷۷ء، وشرح السیر الکبیر ج ۱ ص ۲۰۶، ج ۴ ص ۱۳۰۲ الشاملۃ)۔

(ب) نیز یہ حکم نبی کریم ﷺ کے ساتھ خاص تھا، اس لئے کہ آپ صاحب وحی تھے، آپ وحی کے ذریعہ معلوم کر سکتے تھے کہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں؟ جیسا کہ حدیبیہ کے بظاہر مغلوبانہ معاہدہ کو قرآن کریم نے فتح مبین قرار دیا، یہ ظاہری صورت کے اعتبار سے نہیں بلکہ نتائج کے اعتبار سے تھا، عہد نبوت کے بعد اب کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ واقعات کے نتائج کا پہلے سے علم ہو، اس لئے اب اس کی اجازت نہیں ہوسکتی کہ مسلمان کفر کے مقابلے میں مغلوبانہ پوزیشن اختیار کریں، اور حقارت آمیز شرطوں پر معاہدے کریں (شرح السیر الکبیر ج ۴ ص ۳۰۲)۔

غور طلب یہ ہے کہ حنفیہ نے اس طرح کی شرطوں کا انکار دو وجہ سے کیا ہے، ایک ذلت وحقارت اور دوسرے دینی فتنہ کی بنا پر، لیکن اگر معاہدہ دوطرفہ مساوات پر مبنی ہو اور دار الکفر میں بھی دینی فتنہ کا اندیشہ نہ ہو، جیسا کہ آج کے دور میں ہے تو حنفیہ اپنے اس حکم پر اصرار نہیں کریں گے۔

لیکن بعض کتابوں کی عبارتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ واپسی کے معاہدہ پر برابری کی صورت میں بھی وہ راضی نہیں ہیں، اور اس شق کو وہ صریح طور پر معاہدہ نامہ سے خارج کئے جانے کے قائل ہیں، یعنی معاہد ملکوں کو صراحت کے ساتھ بتا دیا جائے کہ ہم اپنے ملکوں میں ہجرت کرکے آنے والے مسلمانوں کو واپس نہیں کریں گے، "شرح السیر الکبیر" میں ہے:

"وهذا شرط لاينبغي أن يترک ذکرهٗ في الکتاب؛ لأنهٗ اخرج إلينا منهم مسلم أو ذمي لايجوز لنا أن نردهٗ عليهم فالظاهر أنهم يطالبوننا بالمناصفة ويقولون کما لاتردون أنتم فنحن لانرد وبعد ذکر

ھذا الشرط تنقطع ھذہ المحاجۃ'' (شرح السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۴)۔

(معاہدہ نامہ میں اس شرط کا ذکر نہ کرنا مناسب نہیں ہے، اس لئے کہ اگر کوئی مسلمان یا ذمی ان کے پاس سے نکل کر ہمارے پاس چلا آئے تو ہمارے لئے ان کو واپس کرنا جائز نہیں ہوگا، مگر وہ برابری کا مطالبہ کریں گے اور کہیں گے کہ جیسے تم ہمارے آدمی کو نہیں لوٹاتے ہو ہم بھی نہیں لوٹائیں گے، لیکن صراحتاً اس شرط کے تحریر میں آجانے کے بعد حجت باقی نہیں رہے گی)۔

بحالات موجودہ میرے خیال میں عالمی حالات کافی بدل چکے ہیں، سیاسی طور پر مسلمانوں کی وہ پہلی سی شان بھی باقی نہ رہی اور مسئلہ اختلافی ہے، اور رسول اللہ ﷺ سے اس طرح شرط کا قبول کرنا قطعی طور پر ثابت ہے، البتہ اس کے نسخ کی نوعیت میں اختلاف ہے، نیز حنفیہ کے ذہن میں اسلام کی ذلت وتحقیر اور مہاجرین کے دینی فتنہ کا جو اندیشہ ہے، اس کے پیش نظر مسئلہ کو منسوخ ماننے کے بجائے اختلاف احوال پر محمول کیا سکتا ہے، یعنی عہد غلبہ اور عہد مغلوبیت کے احکام میں فرق کرنا ہوگا، حدیبیہ کا قصہ اس دور کا ہے جب عرب کی سطح پر مسلمان عہد غلبہ میں داخل نہیں ہوئے تھے، مسلمانوں کا عہد غلبہ صحیح معنیٰ میں فتح مکہ کے بعد شروع ہوا، عہد نبوت کے مختلف ادوار کو مسلمانوں کے مختلف حالات سے جوڑا جانا چاہئے، اور حسب ضرورت ان سے روشنی حاصل کی جانی چاہئے، کسی شق کے نسخ سے زیادہ تطبیق پر توجہ دی جائے تو زیادہ بہتر عمل ہوگا، ہمارے فقہاء نے عہد غلبہ کے احکام لکھے ہیں، اگر وہ عہد مغلوبیت میں ہوتے تو وہ بھی حدیبیہ کے پس منظر کو قانونی حیثیت دینے پر رضامند ہوجاتے، اس طرح اس اختلاف کو اختلاف برہان پر نہیں بلکہ اختلاف احوال وزمان پر محمول کیا جاسکتا ہے۔

مسلم ملک میں مسلمان پناہ گزینوں کا مسئلہ:

(۳) بعض دفعہ کسی ملک کے مسلمان مجبور ہوکر کسی مسلم ملک سے سیاسی پناہ کی درخواست کرتے ہیں، اور مسلم ملک اس کو سیاسی پناہ دینے پر آمادہ ہوتے ہیں، لیکن ان کو پناہ گزیں کی حیثیت سے رکھا جاتا ہے، انہیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، کیا اس کی شرعاً گنجائش ہوگی؟...... اس کی دو صورتیں ممکن ہیں:

(الف) میرے خیال میں سیاسی پناہ کے لئے کسی ملک میں اقامت اختیار کرنا عموماً ایک وقتی عمل ہوتا ہے یعنی اگر اس کے اپنے ملک کے حالات درست ہوگئے تو واپس ہوجائے گا...... ظاہر ہے کہ شہریت کے حصول کے لئے مستقل قیام کا ارادہ ضروری ہے، اس لئے اگر اس بنیاد پر ملک کے عام شہری اور سیاسی پناہ گزینوں میں فرق کیا جاتا ہے تو شرعاً کوئی مضائقہ نظر نہیں آتا، اس لئے کہ عارضی قیام کرنے والوں کو اس ملک کے اصل باشندوں کا درجہ نہ دیا جائے تو یہ ایک انتظامی عمل ہے، اور اس پر کوئی نکیر شریعت میں موجود نہیں ہے، اس طرح کے فرق کا ثبوت خود عہد نبوت میں بھی ملتا ہے، مثلاً:

☆بہت سے وفود وقتی تعلیم وتربیت کے لئے مدینہ منورہ آتے تھے،اور کچھ دنوں قیام کرکے واپس چلے جاتے تھے، ظاہر ہے کہ حقوق وواجبات کے معاملے میں ان کو اہل مدینہ کا مقام تو حاصل نہیں ہوسکتا تھا۔

☆اسی طرح بہت سے وہ لوگ جو مدینہ سے باہر قیام پذیر تھے،ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

’’فإن أبوا أن يتحولوا منها فأخبرهم أنهم يكونون كأعراب المسلمين يجرى عليهم حكم الله الذى يجرى على المؤمنين ولايكون لهم فى الغنيمة والفىء شىء إلاأن يجاهدوا مع المسلمين‘‘

(صحیح مسلم ج ۵ ص ۱۳۹ حدیث نمبر ۴۶۱۹ ط دارالجبل بیروت لبنان،سنن ترمذی ج ۴ ص ۱۶۲ حدیث نمبر ۱۶۱۷ ط داراحیاء التراث العربی بیروت)۔

(اگر یہ لوگ دارالہجرت میں واپس ہونے پر رضامند نہ ہوں تو تو ان کو خبردار کردو کہ وہ اعرابی مسلمانوں کے درجے میں ہونگے،اور وہ حکم الٰہی کے اسی طرح پابند ہونگے جس طرح دیگر مسلمان پابند ہیں،مگران کو مال غنیمت اور فیء میں کوئی حصہ نہیں ملے گا جب تک کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شرکت نہ کریں)۔

☆نیز اسلام کا یہ متفقہ اصول ہے کہ:

’’المغنم بالمغرم فى الاسلام‘‘ (دررالحکام شرح مجلۃ الاحکام ج ا ص ۹۰ مادہ ۸۷)۔

(نفع نقصان کے ساتھ جڑا ہوا ہے)۔

جوملک کے مستقل شہری ہیں ان پر ملک کی بہت سی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں،مثلاً ان کو خزانۂ مال کے استحکام کے لئے ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے،ملک کے تحفظ کے لئے جان ومال کی قربانی کرنی پڑتی ہے وغیرہ،اس لئے بہت سے اضافی حقوق بھی انہی کو مل سکتے ہیں جو محض سیاسی پناہ کے لئے مقیم حضرات کو نہیں مل سکتے۔

(ب)البتہ اگر سیاسی پناہ کا قیام وقتی نہ ہو بلکہ مستقل طور پر اس ملک میں آباد ہوجانے کا ارادہ ہو،اور سیاسی پناہ محض اس ملک میں داخلہ کا عنوان ہو،تو پھر ایسے لوگوں کو مستقل شہریوں کا درجہ حاصل ہونا چاہئے،ان کے ساتھ امتیازی سلوک روا رکھنا درست نہ ہوگا،قرآن کریم کا یہ ارشاد اس سلسلے میں بہت واضح ہے:

’’إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم فى سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئك بعضهم أولياء بعض‘‘ (الانفال:۷۲)۔

(جولوگ ایمان لائے،ہجرت کی،اللہ کے لئے اپنی جانی اور مالی صلاحیتیں خرچ کیں اور وہ لوگ جنہوں نے ان کو پناہ دی اور مدد کی وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور ولی ہیں)۔

''والمؤمنون والمؤمنات بعضهم اولياء بعض''(سورۂ توبہ:۷۱)۔

(تمام مؤمن مرداور عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں)۔

اسی لئے نبی کریم ﷺ نے دارالاسلام منتقل ہوجانے والے مسلمانوں کو وہاں کے مقیم مسلمانوں کے مساوی قرار دیا،اوران کو باہم بھائی بھائی بنادیا،اسلام میں جغرافیہ اور رنگ ونسل کوئی چیز نہیں ہے، یہ صرف باہم تعارف کے ذرائع ہیں،لیکن اصل پہچان رشتۂ ایمان ہے،اگر کوئی چیز اس کی راہ میں حائل ہوتی ہے تواس کوفنا کرکے صرف کلمہ کو پہچان کی بنیاد بنائی جائے گی،اورکلمہ شریک تمام لوگ بھائی بھائی قرار دئے جائیں گے۔

نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا:

''من صلیٰ صلاتنا واستقبل قبلتنا وأكل ذبيحتنا فهوالمسلم لهٗ ماللمسلم وعليه ماعلى المسلم''(صحیح بخاری ج۱ص ۱۵۳حدیث نمبر ۳۸۵ط دارابن کثیر بیروت ۱۹۸۷ء)۔

(جو ہماری طرح نماز پڑھے،ہمارے قبلہ کا استقبال کرے،اور ہمارا ذبیحہ کھائے،وہ مسلمان ہےاوراس کووہ تمام حقوق حاصل ہونگے جومسلمانوں کوحاصل ہیں اوراس پروہ تمام واجبات عائد ہونگی جومسلمانوں پرعائد ہوتی ہیں)۔

ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

''كونوا عبادالله إخواناً المسلم اخوالمسلم لايظلمهٗ ولايكذبهٗ ولايحقرهٗ''(صحیح المسلم ج۸ ص۱۰ حدیث نمبر ۶۷۰۶ باب تحریم ظلم المسلم وخذلہ ط دارالجیل بیروت)۔

(اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ،مسلمان مسلمان کا بھائی ہے،نہ کوئی اس پرظلم کرے،نہ جھٹلائے اورنہ کمتر جانے)۔

☆اس کی تائیداس مسئلۂ شرعی سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی مستامن (وقتی امان لیکرآنے والا غیرمسلم) یا ذمی (اسلامی حکومت کا غیرمسلم شہری) اسلام قبول کرلےتو باتفاق فقہاء اس کا عقد ذمہ ختم ہوجاتا ہے،اوروہ تمام امتیازات بھی کالعدم ہوجاتے ہیں جوغیرمسلم ہونے کی وجہ سے بہت سی چیزوں میں پیدا ہوتے ہیں،اور جملہ حقوق وواجبات میں وہ وہاں کے قدیم شہریوں کے مساوی قرار پاتا ہے،اس سے وحدت ایمانی کی معنویت سمجھنے میں مدد ملتی ہے اور زیر بحث مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے(ہدایۃ مع فتح القدیر ج ۵ ص ۳۰۳،جواہر الاکلیل ج ۱ ص ۲۶۷،مغنی المحتاج ج ۴ ص ۲۵۸،الاحکام السلطانیۃ لابی یعلیٰ ص ۱۴۳،۱۴۴)۔

البتہ شہریت کی تکمیل کے لئے انتظامی طور پر کچھ قواعد وضوابط وضع کئے جاسکتے ہیں،اوراس کے لئے کوئی مدت یا مراحل مقرر کئے جاسکتے ہیں۔

اس باب میں ہم مستامن کے مسئلے سے بھی استیناس کر سکتے ہیں جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، کہ اگر وقتی قیام کے ارادہ سے دارالاسلام میں آنے والا شخص ایک مخصوص مدت (حنفیہ کے نزدیک اس کی مدت ایک سال ہے، علیٰ اختلاف الاقوال) تک قیام کر لے، یا وہاں کے متوطن سے شادی کر لے، یا کوئی خراجی زمین خرید لے وغیرہ تو اس کو ذمی یعنی دارالاسلام کا باقاعدہ شہری قرار دیا جائے گا (البدائع للکاسانیؒ ج ۷ ص ۱۱۰، الاحکام السلطانیۃ للماوردیؒ ص ۱۴۶، المبسوط للسرخسیؒ ج ۱۰ ص ۸۴، السیر الکبیر ج ۵ ص ۱۸۶۵، ابن عابدینؒ ج ۳ ص ۳۴۶، المہذب للشیرازیؒ ج ۲ ص ۲۵۱)۔

اس فقہی جزئیہ کو انتظامی مراحل کے لئے بطور رہنما اصول ہم استعمال کر سکتے ہیں۔

شہریت سے وابستہ حقوق وواجبات:

(۴) رہا یہ مسئلہ کہ شہریت کی بنیاد پر کیا کیا حقوق وواجبات عائد ہوتے ہیں؟ یعنی وہ کیا چیزیں ہیں جو بطور حق شہریوں کو ملتی ہیں اور بطور ذمہ داری ان پر عائد ہوتی ہے؟...... تو میرے علم ومطالعہ کی حد تک اسلام میں اس کی کوئی تفصیل مقرر نہیں ہے، کچھ حقوق بنیادی ہیں اور کچھ احوال وظروف اور زمان ومکان کے تغیرات سے پیدا ہوتے ہیں، اس لئے ان کی تفصیلات کا تعین ممکن نہیں، بس معروف کی بنیاد پر جو حقوق وواجبات وہاں کے عرف میں شہریت سے متعلق سمجھے جاتے ہیں، شریعت ان کی نفی نہیں کرتی، گذشتہ صفحات میں ایک روایت کا حوالہ دیا گیا ہے، اس میں عمومیت کے ساتھ یہ الفاظ آئے ہیں:

''لہٗ ماللمسلم وعلیہ ماعلی المسلم'' (صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۵۳)۔

یعنی وہ تمام حقوق جو مسلمانوں کو ملتے ہیں وہ اس کو ملیں گے اور وہ تمام واجبات جو مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں اس پر عائد ہونگے۔

اس مضمون کی اور بھی جو روایات آئی ہیں ان میں بھی یہی عمومی انداز بیان اختیار کیا گیا ہے۔

اسی طرح ہجرت کے بعد نبی کریم ﷺ نے جو میثاق مدینہ تیار فرمایا اس میں بلا امتیاز مذہب وملت داخلی اور خارجی سطح پر جن حقوق وواجبات کی نشاندہی کی گئی ہے، ان سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ حقوق کے باب میں کوئی خاص شکل مقرر نہیں ہے، بلکہ ان کا تعلق مختلف ملکوں کے اپنے حالات، تقاضے، اور عرف سے ہے، اور اس معاملے میں ہر ملک کی انتظامیہ پوری طرح آزاد ہے کہ کس چیز کو وہ حق قرار دیتی ہے اور کس چیز کو واجبات میں شامل کرتی ہے، بس شرط یہ ہے کہ اس تعین کی بنیاد معروف پر ہو، انسانیت کی فلاح پیش نظر ہو، اسلام کی روح اور مقاصد سے ہم آہنگ ہو اور شریعت کی کسی نص سے متصادم نہ ہو۔

(۵) پناہ گزینوں اور شہریوں کے حقوق اور فرق مراتب کی بحث شق نمبر (۳) کے ضمن میں آ چکی ہے۔

مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ملکوں کی شہریت حاصل کرنا:

(٦) اگر کوئی مسلمان ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہے تو کیا اس کی اجازت ہوگی؟......

ہمارے قدیم مراجع میں باضابطہ یہ بحث نہیں ملتی، لیکن عصر حاضر میں یہ مسئلہ علماء کے درمیان زیر بحث رہا ہے حقیر راقم الحروف کی کتاب ''غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل'' میں اس موضوع پر تفصیلی بحث موجود ہے:

دونقطۂ نظر:

عصر حاضر میں اس موضوع پر علماء اور اہل قلم کی طرف سے جو مباحث پیش کئے گئے ہیں، ان کو پڑھنے سے علماء کے دونقطۂ نظر سامنے آتے ہیں:

(ا) ایک طبقہ اس کو خروج عن الاسلام اور صریح ارتداد کے مترادف قرار دیتا ہے اور ایسے تمام حضرات پر مرتدین کے احکام جاری کرنے کا قائل ہے، جو غیر مسلم ملکوں میں مقیم ہیں (فتاویٰ الامام محمد رشید رضا ج ۵ ص ۱۷۵۰)۔

اس طبقہ کے مشہور نام عرب علماء میں یہ ہیں، شیخ محمد رشید رضا مصری، شیخ محمد یوسف الدجوی، اور شیخ محمد شاکر، (یہ از ہر کے اکابر اہل علم میں ہیں) شیخ ادریس شریف محفوظؒ یہ اپنے وقت میں بیروت کے مفتی تھے (حکم التجنس بجنسیۃ دولۃ غیر اسلامیۃ ص ۷۱-۹۷) اور ڈاکٹر محمد عبدالکریم الجزائری (تبدیل الجنسیۃ ردۃ وخیانۃ ص ۲۷) وغیرہ۔

(ب) دوسرا طبقہ اس کو ارتداد نہیں کہتا، بلکہ صرف معصیت قرار دیتا ہے اس طبقہ میں شیخ مختار السلامی رکن مجمع الفقہ الاسلامی اور شیخ محمد عبداللہ بن سہیل امام وخطیب مسجد حرام عضو ہیئۃ کبار العلماء السعودیۃ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں، ویسے ناموں کی فہرست لمبی ہے (مجلۃ الفقہ الاسلامی ج ۲ ص ۱۱۵۶، حکم التجنس بجنسیۃ دولۃ غیر اسلامیۃ ص ۱۱۳)۔

''اللجنۃ الدائمۃ للبحوث العلمیۃ والافتاء'' نے بھی یہی فتویٰ جاری کیا ہے (فتاوی اللجنۃ الدائمۃ للبحوث والافتاء ج ۱۲ ص ۵۸)۔

(۲) دوسری رائے جواز کی ہے، پھر جواز کے قائلین میں بھی دونقطۂ نظر ہو گئے ہیں:

(الف) ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کی گنجائش صرف بوقت ضرورت ہے،......عرب علماء میں شیخ احمد بن احمد الخلیلی مفتی عام سلطنت عمان اور رکن مجمع الفقہ الاسلامی کی یہی رائے ہے، مصری دار الافتاء نے بھی اسی کے مطابق فتویٰ دیا ہے (فتویٰ نمبر ۸۸۹، ۲۰۰۰ء) وغیرہ

(ب) دوسرا نقطۂ نظر اصلاً جواز کا ہے، البتہ حالات وظروف اور اغراض ومقاصد کے لحاظ سے حکم کی نوعیت میں

فرق ہوسکتا ہے۔

عہد حاضر کے جمہور علماء کی رائے یہی ہے، اس رائے کے حامل چند مشہور نام یہ ہیں۔

ڈاکٹر یوسف القرضاویؒ (ویب سائٹ پر ان کا فتویٰ موجود ہے، (www.qardawi.net)، ڈاکٹر محمد رافت عثمانی عمید الکلیۃ الشرعیۃ والقانون جامعۃ الازہر، ڈاکٹر وہبہ الزحیلیؒ (فقہ الاقلیات المسلمۃ ص۶۰۹) اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب (بحوث فی قضایا فقہیۃ معاصرۃ ص ۳۲۰) وغیرہ۔

قائلین عدم جواز کے دلائل:

جو حضرات عدم جواز کی رائے رکھتے ہیں ان کے موقف کی دلیلیں درج ذیل ہیں:

(۱) **"ألم تر إلی الذین یزعمون أنھم آمنوا بما أنزل إلیک وماأنزل من قبلک یریدون أن یتحاکموا إلی الطاغوت وقد أمروا أن یکفروا بہ یرید الشیطان أن یضلھم ضلالاً بعیداً"** (سورۂ نساء:۶۰)۔

(کیا آپ نے ان لوگوں پر نظر نہیں کی، جو دعویٰ رکھتے ہیں کہ وہ اس (کتاب) پر ایمان لے آئے ہیں، جو آپ پر نازل کی گئی ہے، اور جو آپ سے قبل نازل ہو چکی ہے، لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اپنا مقدمہ طاغوت کے پاس لے جائیں، حالانکہ انہیں حکم مل چکا ہے، کہ اس کے مقابلے میں کفر اختیار کریں، اور شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ انہیں بھٹکا کر بہت دور دراز لے جائے)۔

طاغوت سے مراد وہ نظام قانون ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو، غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا گویا باختیار خود اسلامی نظام قانون سے نکل کر طاغوتی نظام قانون میں داخل ہونا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے انحراف کے مترادف ہے (فتاویٰ محمد رشید رضا مصری ج۵ ص ۱۷۵۵)۔

(۲) **"ومن یبتغ غیر الاسلام دیناً فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین"** (آل عمران:۸۵)۔

(جو کوئی اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ شخص آخرت میں تباہ کاروں میں شمار ہوگا)۔

علامہ بیضاویؒ نے اسلام کی تفسیر توحید اور اتباع امر اللہ سے کی ہے (بیضاوی مع حاشیۃ الشہاب ج۳ ص ۴۳)۔

ان کے نزدیک جو حضرات اسلامی مملکت، اسلامی نظام قانون اور مسلم بالادستی سے نکل کر غیر اسلامی مملکت میں قیام پذیر ہیں یا قیام کا ارادہ رکھتے ہیں وہ اس آیت کریمہ کے مصداق ہیں۔

(۳) ایک اور مقام پر قرآن نے مومن اور غیر مومن کے درمیان امتیاز کا معیار بیان کیا ہے۔

''فلاوربک لایومنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم ثم لایجدو فی أنفسهم حرجاً مماقضیت ویسلموا تسلیماً'' (نساء:٦۵)۔

(پس آپ کے پروردگار کی قسم ہے کہ یہ لوگ ایماندار نہ ہونگے، جب تک کہ یہ لوگ اس جھگڑے میں جوان کے آپس میں ہوں آپ کو حکم نہ بنالیں اور پھر جو فیصلہ آپ کردیں اس سے اپنے دلوں میں تنگی نہ پائیں اوراس کو پورا پورا تسلیم کریں)۔

ابوبکر جصاصؒ اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں کہ'' اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص اللہ یا اس کے رسول علیہ کے کسی امر کو رد کردے، وہ خارج از اسلام ہے، خواہ شک کی بنیاد پر رد کرے یا اس کو بالقصد قبول کرنے سے انکار کردے (احکام القرآن للجصاص ج ۳ ص ۸۱۸)۔

غیر اسلامی مملکت میں قیام دوسرے لفظوں میں احکام الٰہی کو قبول کرنے سے بالارادہ گریز ہے۔

(۴) ان آیات کریمہ سے بھی استدلال کیا گیا ہے جن میں غیر مسلموں سے دوستانہ تعلقات سے اجتناب کرنے کا حکم دیا گیا ہے:

*''یٰأ یھا الذین آمنوا لاتتخذوا الیھود والنصاریٰ أولیاء بعضھم أولیاء بعض ،ومن یتولھم منکم فإنهٗ منھم، إن اللہ لایھدی القوم الظالمین'' (سورۂ مائدۃ:۵۱)۔

(اے ایمان والو! یہود ونصاریٰ کو دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے کے دوست ہیں، جو ان سے دوستی کرے گا اس کا شمار انہی کے ساتھ ہوگا، بیشک اللہ ظالم لوگوں کو راہ یاب نہیں کرتے)۔

☆''یایھاالذین آمنوا لاتتخذوا آباء کم وإخوانکم أولیاء إن استحبوا الکفر علی الإیمان ومن یتولھم منکم فأولٰئک ھم الظالمون'' (توبۃ:۲۳)۔

(اے ایمان والو! اپنے آباء اور بھائیوں کو دوست نہ بناؤ، اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں، جو ان سے دوستی کرے گا وہ ظالم قرار پائے گا)۔

ان دونوں آیات میں غیر مسلموں کے ساتھ دوستانہ تعلقات اور ان کی اتباع وفرمانبرداری کو صریح ظلم وارتداد قرار دیا گیا ہے، ......غیر مسلم ملکوں میں اقامت اختیار کرنا اور بالارادہ ان کی معیت ورفاقت، ان سے ربط وتعلق اور قانونی اطاعت وفرمانبرداری کے مترادف ہے، اس لئے اس کی گنجائش نہیں ہے۔

(۵) بعض احادیث سے بھی ان حضرات نے استدلال کیا ہے، جن میں صراحت کے ساتھ غیر مسلموں کے درمیان اقامت وسکونت سے منع کیا گیا ہے، اور حضور علیہ نے ایسے مسلمانوں سے اپنی براءت کا اظہار کیا ہے، جو

غیر مسلموں کے درمیان رہائش پذیر ہیں:

''أنا بریء من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین ''(ترمذی کتاب السیر حدیث نمبر ۱۶۵۴)۔

(میں ہر ایسے مسلمان سے بیزار ہوں جو مشرکین کے درمیان قیام پذیر ہوں)۔

(۶) عقلی طور پر یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں قیام کا مطلب ان ملکوں کے تمام قانونی تقاضوں کی تکمیل ہے، جن میں بہت سی چیزیں خلاف شرع بھی ہیں، اور کبھی اس سے فوجی خدمات کا بھی مطالبہ ہوسکتا ہے، اور فوجی ملازمت کے دوران اگر خدانخواستہ کسی اسلامی سلطنت سے جنگ چھڑ جائے تو اس میں غیر مسلم فوجیوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف جنگ میں بھی حصہ لینا ہوگا، ان کے علاوہ اور بھی کئی مراحل آسکتے ہیں جن میں خلاف شرع باتوں پر اس کو عمل کرنا پڑے، ظاہر ہے کہ ایک مومن کے لئے جائز نہیں کہ وہ جان بوجھ کر دینی طور پر اپنے کو ان شدید خطرات میں مبتلا کرے اور اپنی ہلاکت کا سامان کرے۔

جمہور کے دلائل:

لیکن جو علماء جواز کے قائل ہیں، ان کے پیش نظر وہ قرآنی آیات ہیں جن میں اسلام کی آفاقیت اور اس کی دعوت عامہ کا ذکر موجود ہے، مثلاً:

☆''هوالذی أرسل رسولهٗ بالهدیٰ ودین الحق لیظهرهٗ علی الدین کلهٖ ولو کره المشرکون'' (سورۂ توبہ: ۳۳)۔

(وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو تمام ادیان پر غالب کردے، چاہے مشرکوں کو ناپسند لگے)۔

*''وماأرسلناک إلا رحمة للعالمین ''(سورہ انبیاء: ۱۰۷)۔

(اور ہم نے آپ کو سارے عالم کے لئے رحمت ہی رحمت بنا کر بھیجا)۔

☆''وماأرسلناک إلاکافة للناس بشیراً ونذیراً ولکن أکثر الناس لایعلمون''(سورۂ سبا: ۲۸)۔

(ہم نے آپ کو تمام لوگوں کے لئے صرف بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں)۔

☆''ادع إلیٰ سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلهم بالتی هی أحسن''(سورۂ نحل: ۱۲۵)۔

(راہ خدا کی طرف حکمت اور بہترین انداز سے دعوت دو اور ان کے ساتھ بہتر طریق پر جدال کرو)۔

*''قل هذهٖ سبیلی أدعوالی الله علی بصیرة أنا ومن اتبعنی''(سورۂ یوسف: ۱۰۸)۔

(آپ کہہ دیجئے کہ میرا طریق یہی ہے، میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں، دلیل پر قائم ہوں میں بھی اور میرے پیرو بھی)۔

ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت دنیا کے ہر خطہ میں پہونچانا اس امت کا منصبی فریضہ ہے، اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان اسلامی ملکوں سے نکل کر غیر مسلم ملکوں میں بھی جائیں، اور اسلام کی دعوت چار دانگ عالم میں پہونچائیں، اگر مسلمان اپنے ہی ملکوں میں سمٹ کر رہ جائیں تو اسلام کی دعوت اور اس کے نمونے اسلامی دنیا تک کیسے پہونچیں گے۔

صحابہ کرام نے دنیا کے سامنے جو عملی مثال پیش کی ہے وہ ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے، انہوں نے سخت مشکل حالات میں اپنا وطن چھوڑ کر غیر اسلامی ملکوں کا سفر کیا، وہاں قیام کیا اور دین کی دعوت دنیا کے گوشے گوشے میں پہونچائی، انہوں نے دعوت وتبلیغ کے باب میں جغرافیائی امتیاز نہیں رکھا، اور زمین کے کسی حصہ کو صرف اس لئے نظر انداز نہیں کیا کہ وہاں غیر اسلامی حکومت قائم ہے، اگر صحابہ اپنے آپ کو اسلامی ملکوں تک محدود کر لیتے تو ان کے ذریعہ وہ عالمی دعوت کا کام انجام نہ پاتا جو ان کا امتیاز سمجھا جاتا ہے۔

قواعد فقہ سے رہنمائی:

اس سلسلے میں بعض قواعد فقہیہ سے بھی رہنمائی ملتی ہے:

(۱) مشہور فقہی قاعدہ ہے کہ زمان ومکان اور حالات کی تبدیلی کی وجہ سے حکم بدل جاتا ہے۔

''**لاینکر تغیر الأحکام بتغیر الازمان**'' (قواعد الفقہ لعمیم الاحسان المجددی البرکتی ط دار النشر ج ۱ ص ۲۳ وکذا فی الفروق للقرافیؒ (م ۶۸۴ھ) ج ۳ ص ۶۸ ط دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۸ء)۔

جس دور میں بعض عرب علماء نے غیر مسلم ملک کی شہریت کو حرام قرار دیا تھا وہ فرانسیسی استعمار کا دور تھا، عرب ممالک بالخصوص تونس اور الجزائر کا علاقہ اس استعمار کے زیادہ شکار تھے، اس استعمار کا مقصد اسلام کے خلاف منصوبے بنانا، اس کی بنیادوں کو کمزور کرنا، اس کے خلاف شکوک وشبہات پیدا کرنا، سچے مسلمانوں کے اوپر ظلم وجبر کرنا اور دینی انحراف پھیلانا تھا۔

اس دور میں ظاہر ہے کہ اسلام دشمنوں کے ملکوں میں رہنا اور وہاں کا شہری بننا ایک خطرناک عمل تھا، جو عام مسلمانوں کے لئے ناقابل جواز تھا لیکن آج حالات بدل چکے ہیں، مذہبی آزادی کا اصول بین الاقوامی طور پر تسلیم کر لیا گیا ہے، اس لئے آج اس قدیم فتویٰ پر (جو عبوری دور میں دیا گیا تھا) اصرار کرنا مناسب نہیں ہے، آج ضرورت ہے کہ حالات کے تغیر کے مطابق فتویٰ میں بھی تبدیلی لائی جائے۔

(۲) مصالح ومفاسد کے درمیان تعارض ہو جائے تو موازنہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے، اور جو پہلو غالب ہو اس کے مطابق حکم شرعی عائد کیا جاتا ہے، یہ اسلام کا بنیادی اصول ہے۔

’’إذا تعارض مفسدتان روعی اعظمهماضررا بارتکاب أخفهما‘‘(الاشباہ والنظائر لابن نجیمؒ ج ا ص ااا)۔
(جب دومفسدوں میں تعارض ہوجائے تو بڑی مضرت کی رعایت کی جائے گی اور ہلکے مفسدہ کی اجازت دی جائے گی)۔

’’الأخذ بأعظم المصلحتین ودفع أعظم المفسدتین‘‘(الاشباہ والنظائر لابن نجیمؒ ج ا ص ۸۸،الاشباہ والنظائر للسیوطیؒ ص ۸۷)۔
(دومصلحتوں میں سے بڑی مصلحت کو اختیار کیا جائے گا اور دومفسدوں میں سے بڑے مفسدہ کو دور کیا جائے گا)۔

آج کے دور میں کسی غیر اسلامی ملک کی شہریت میں کچھ نقصانات ضرور متوقع ہیں لیکن ان کی تلافی کی صورتیں بھی موجود ہیں، وہاں دینی ادارے قائم کئے جائیں، مدارس ومکاتب بنائے جائیں، مساجد کی تعمیر ہو، علماء ودعاۃ سے رابطہ رکھا جائے، وغیرہ تو بڑی حد تک جوار کفر کی مضرتوں سے بچا جاسکتا ہے۔

اس کے علاوہ اور بھی کئی مصلحتیں ہیں جو مسلمانوں کے وہاں قیام کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی ہیں مثلاً:

(الف) غیر مسلم ممالک اپنے شہریوں کو مکمل مذہبی آزادی، فکر وخیال کی آزادی، اظہار کی آزادی اور سیاسی، اقتصادی اور فوجی حقوق دیتے ہیں، جس کے مطابق کوئی بھی شخص باعزت زندگی گذار سکتا ہے، اور اپنے آئینی حقوق کے ذریعہ وہاں کی حکومت پر بھی اثر انداز ہوسکتا ہے۔

آج غیر مسلم طاقتیں بالخصوص مغربی ممالک جس طرح اسلام اور مسلم ممالک کے خلاف محاذ آراء ہیں، یا اس کا ارادہ رکھتے ہیں، اگر مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد وہاں موجود ہو تو ان کے اس قسم کے فیصلوں پر فیصلہ کن طور پر اثر انداز ہوسکتے ہیں، اور خود حکومتوں کو بھی مسلمانوں کے خلاف اس قسم کے فیصلوں میں دس بار سوچنا ہوگا کہ اس کے نتائج خود ان ملکوں میں کیا ظاہر ہوں گے؟......اگر مسلمان وہاں نہ ہوں تو یہ بڑا قومی فائدہ اسلام اور ملت اسلامیہ کو حاصل نہیں ہوسکتا۔

(ب) غیر اسلامی ملکوں میں رہ کر مسلمان اپنے وسائل سے اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمت کرسکتے ہیں، اور جو علماء، دعاۃ اور مسلمان وہاں پہونچیں ان کے لئے بہتر معاون ومددگار ثابت ہوسکتے ہیں، اگر ان ترقی یافتہ غیر مسلم ملکوں میں مسلمان نہ ہوں تو مسلم اقلیتوں کو وہاں کے وسائل سے استفادہ کی صورت کیا ہوگی؟

(۳) فقہ کا ایک مشہور قاعدہ ہے:

’’مالایتم الواجب إلابہ فھو واجب‘‘(الاشباہ والنظائر ص ۹۱)۔

(جس کے بغیر واجب پورا نہ ہوتا ہو وہ بھی واجب ہے)۔

دعوت الی اللہ اس امت کا منصبی فریضہ ہے، اور اس کی تکمیل اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ روئے زمین کے تمام باشندوں تک اسلام کی آواز نہ پہونچ جائے، اور اس کے عملی نمونے ان کے سامنے نہ آجائیں، آج کے دور میں اسلام کی آواز ترقی یافتہ وسائل ابلاغ کے ذریعہ پہونچائی جاسکتی ہے، اور اسلامی تعلیمات سے بھی کسی حد تک روشناش کرایا جاسکتا ہے، لیکن عملی نمونے کے لئے مسلمانوں کے ایک طبقہ کا وجود وہاں ضروری ہے، جو غیر مسلموں کے درمیان اسلامی آئیڈیل کا کام دے،...... علاوہ ازیں یہ مسلمان خود بھی اپنے قول وعمل اور اخلاق وکردار سے امت غیر مسلمہ میں دعوت کا کام کریں، اس کے لئے ضرورت ہے کہ مسلمان غیر مسلم ملکوں کی شہریت حاصل کریں اور خود ان کے ملک کا حصہ بن جائیں کیونکہ غیر ملکیوں کا قول وعمل آج کی دنیا میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔

(۴) فقہ کا ایک اور مشہور قاعدہ ہے:

''**الضرورات تبیح المحظورات**'' (قواعد الفقہ لعمیم الاحسانؒ ج۱ ص۱۹ط دار النشر ،فواتح الرحموت بشرح مسلم الثبوت ج۱ ص ۴۳،الفروق للقرافیؒ ج۷ ص ۳۸۳)۔

(ضرورت کی بنیاد پر بعض ممنوعات کی اجازت دی جاتی ہے)۔

کبھی مسلمانوں کو اپنے ملک کے بعض مسائل کی بنیاد پر ہجرت کی ضرورت پیش آتی ہے، اور بحالات موجودہ ساری دنیا میں کوئی ایسی مملکت اسلامی موجود نہیں ہے جو پوری وسعت نظری کے ساتھ کسی بیرونی مسلمان کو بحیثیت شہری قبول کرنے کے لئے آمادہ ہو، جبکہ بہت سے غیر مسلم ملکوں میں شہریت کے معاملے میں زیادہ توسع موجود ہے، ان حالات میں بدرجۂ مجبوری مسلمانوں کو غیر مسلم ملکوں میں قیام وشہریت کی اجازت دینی چاہئے، اور غیر مسلم ملکوں کے توسع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔

مسلک راجح:

مذکورہ مباحث پر تحقیقی نظر ڈالنے سے جمہور کا مسلک زیادہ مضبوط، قابل قبول اور لائق ترجیح محسوس ہوتا ہے، جس کی کئی وجوہ ہیں:

(۱) اس حد تک تمام علماء کا اتفاق ہے (خواہ وہ جواز کی رائے رکھتے ہوں یا عدم جواز کی) کہ غیر مسلموں سے تعلق خاطر اور مسلم ملکوں کے مقابلے میں ان کی عظمت واحترام کی بنا پر غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا ناجائز ہے، عدم جواز کے وہ تمام دلائل جو مانعین پیش کرتے ہیں ان میں بآسانی یہ تاویل کی جاسکتی ہے کہ ان کا مصداق یہی قدر مشترک ہے۔

(۲) اور اگر عدم جواز کی رائے علی الاطلاق مان بھی لی جائے تو اس کو استعماری دور پر محمول کیا جائے گا، جب غیر مسلم ملکوں میں کسی صاحب ایمان کا داخلہ مشکل سمجھا جاتا تھا اور اس کو ارتداد یا تعاون علی الکفر کے مترادف تصور کیا جاتا تھا، ......آج وہ صورت حال باقی نہیں رہی، اب مسلمانوں کی بڑی تعداد وہاں مقیم ہے اور بڑے سکون اور آزادی کے ساتھ دینی زندگی گذار رہی ہے، بڑے بڑے دینی مراکز وہاں قائم ہیں اسلام کی اشاعت کا کام بھی وہاں ہو رہا ہے، اور مسلمان اپنے نومسلم بھائیوں کی مدد کرتے ہیں اور ان کی تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کرتے ہیں، ان مسلمانوں نے اپنی تمام تر توقعات اور صلاحیتیں اسی سرزمین کے لئے مرکوز کردی ہیں، اور دوبارہ وطن واپسی کا کوئی خیال نہیں رکھتے، ان حالات میں عدم جواز کی رائے یقیناً بعد از وقت اور دشوار کن ہے۔

(۳) عدم جواز کے قائلین نے جو دلائل پیش کئے ہیں وہ اپنے مفہوم و مصداق کے اعتبار سے قطعی نہیں ہے، بلکہ ان میں تاویل کا احتمال موجود ہے مثلاً:

(الف) جن آیات کریمہ کو اس استدلال میں پیش کیا گیا ہے کہ غیر مسلم ملک کی شہریت احکام اسلامی کا بالا رادہ ترک اور کفار کے ساتھ دوستانہ تعلقات کا اظہار ہے، اس کا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ غیر مسلم ملکوں کے جو قوانین اسلامی احکام سے متصادم ہیں، ضروری نہیں کہ مسلمان ان کو من وعن قبول کرلیں، بلکہ ان کو حق ہے (اور ان کو یہ کرنا چاہئے) کہ وہ ان قوانین کے بارے میں اپنے مشترکہ احساسات ایوان حکومت تک پہونچائیں، ان کو تبدیل یا ان میں مناسب ترمیم کرانے کی متحدہ جدوجہد کریں اور جب یہ ترمیم منظور ہوجائے تو قانون کی اس لچک سے فائدہ اٹھائیں، مثلاً مرنے کے بعد مورث کے ترکہ کا قانون یوروپی ملکوں میں غیر اسلامی ہے، لیکن اس میں یہ گنجائش رکھی گئی ہے، کہ اگر کوئی فرد مرنے سے پہلے اپنے ورثہ کی تقسیم کے لئے کوئی لائحہ عمل تجویز کردے تو اس کی موت کے بعد ورثہ پر لازم ہوگا کہ وہ اس کے تجویز کردہ طریقۂ کار کے مطابق ترکہ کی تقسیم کریں، قانون کی اس شق سے استفادہ کرتے ہوئے مسلمانوں کو چاہئے کہ مرنے سے قبل یہ وصیت تحریر کرجائیں کہ اس کی موت کے بعد اس کے ترکہ کی تقسیم اسلامی شریعت کے مطابق ہوگی، مورث کے اس عمل کے بعد ورثہ پر قانونی طور پر لازم ہوجائے گا کہ وہ شریعت کے مطابق ترکہ کی تقسیم کریں۔

اسی طرح ان ملکوں میں نکاح کا رجسٹریشن کرانا قانونی طور پر لازم ہے، اس کے بغیر نکاح غیر قانونی، غیر لازم اور غیر نافذ قرار پاتا ہے، اور نہ اس کے بغیر کسی قسم کے مطالبات ثابت ہوسکتے ہیں، لیکن اگر کوئی مسلمان اسلامی طور پر نکاح کرے اور اس کا رجسٹریشن بھی کرائے تو قانونی طور پر ممنوع نہیں ہے۔

اس طرح ان غیر مسلم ملکوں میں قانونی مشکلات کا حل دریافت کیا جاسکتا ہے، اور وہاں کی شہریت سے ہرگز

ضروری نہیں کہ اس شخص نے اپنے دین وایمان کا سودا بھی کرلیا ہو، العیاذ باللہ۔

(ب) بہت سے غیر مسلم ملکوں میں مسلم ممالک کو یہ قانونی اختیار دیا گیا ہے کہ وہاں کا کوئی شخص اگر غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرلے تو یہاں کی شہریت کے ساتھ اپنے ملک کی شہریت بھی باقی رکھ سکتا ہے، یعنی بیک وقت وہ دوملکوں کی شہریت کا حامل ہوسکتا ہے، دو پاسپورٹ رکھ سکتا ہے، اس لئے غیر مسلم ملک کی شہریت سے لازم نہیں آتا کہ اسلامی ریاست اور اس کے نظام قانون سے بھی دستبردار ہوگیا ہو،

(ج) پھر غیر مسلموں کے ساتھ معاملات اور سماجی تعلقات اسلام میں ممنوع نہیں ہیں، صرف ان سے وہ قلبی ارتباط ممنوع ہے، جس سے انسان کی دینی زندگی متأثر ہو اور اس کا ایمانی رسوخ کمزور ہو، اسلام نے صرف ان غیر مسلموں سے قطع تعلق کا حکم دیا ہے، جو ان کے دشمن ہوں، یا ان کے اور ملت اسلامیہ کے لئے نقصان دہ ہوں، لیکن عام امن پسند غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات ومعاملات سے وہ ہرگز نہیں روکتا، قرآن کریم نے یہ مضمون پوری صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

''لاینهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم فى الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم'' (سورۂ ممتحنۃ: ۸)۔

(اللہ تم کو ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور انصاف کرنے سے نہیں روکتا، جن سے تمہاری دینی جنگ نہیں ہے، اور جو تم کو تمہارے ملکوں سے نکالنا نہیں چاہتے)۔

(د) دراصل اس موقعہ پر یہ فرق ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے، کہ قرآن کا ممنوعہ موالات اور جس ملک میں انسان آباد ہو وہاں کے انتظامی قوانین (جن کا اسلامی احکام سے کوئی تعلق نہ ہو) کا احترام یہ دونوں الگ الگ چیزیں ہیں۔

(ھ) جہاں تک غیر مسلم ملکوں میں عسکری ملازمت کا مسئلہ ہے تو اولاً جو ملک ہر قسم کے مطالبات اور جملہ حقوق فراہم کرتا ہے، الغرم بالغنم کے اصول پر اس ملازمت کا مطالبہ بیجا نہیں ہے۔

☆ نیز فوجی ملازمت میں اگر کچھ نقصانات ہیں تو فوائد اس سے زیادہ ہیں، سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ آج بڑی طاقتوں کے پاس جو فنون حرب اور جنگی صلاحیتیں ہیں مسلمان فوج کا حصہ بن کر اس سے کافی استفادہ کرسکتے ہیں، اور اس کی بڑی ضرورت ہے اس لئے کہ بڑی طاقتوں کے مقابلے کے لئے جو ضروری تیاریاں اور جنگی صلاحیتیں ہونی چاہئے وہ ہماری مسلم افواج اور حکومتوں کے پاس مفقود ہیں، جو حکم الٰہی ''**أعدوا لهم مااستطعتم من قوة**'' (الانفال: ۶۰) کے خلاف ہے، اس لئے غیر مسلم ملکوں میں مقیم مسلمانوں کو اگر ایسے مواقع ہاتھ آتے ہیں تو ان کو ضائع کرنا مناسب نہیں ہے، فقہ کا اہم ترین ضابطہ ہے:

’’المصلحة العامة مقدمة على المصلحة الخاصة‘‘(الاشباہ والنظائر لابن نجیمؒ ص۸۸ط دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۸۰ء، الاشباہ والنظائر للسیوطیؒ ص ۸۷ط دار الکتب العلمیۃ بیروت، درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ج ۱ص ۴۱مادۃ ۲۸)۔

(مصلحت عام مصلحت خاص پر مقدم ہوتی ہے)۔

☆ دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اگر غیر مسلم افواج میں مسلمانوں کی قابل لحاظ تعداد موجود ہو تو مسلم ممالک پر فوج کشی اتنی آسان نہ ہوگی جس قدر آج ان کے لئے محسوس ہوتی ہے،......اس لئے ’’أخف الضررين‘‘(المستصفی للغزالیؒ (م ۵۰۵ھ) ج ۱ص ۴۲۶ط مؤسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۹۹۷ء، کشف الاسرار للبزدویؒ (م ۷۳۰ھ) ج ۴ص ۱۳۴ط دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۷ء) کے اصول پر عسکری ملازمت کی وجہ سے مسلمانوں کو بددل نہیں ہونا چاہئے۔

☆ علاوہ ازیں فوجی ملازمت سے کنارہ کشی پر مسلمانوں پر غداری اور دیگر الزامات بھی لگ سکتے ہیں، جو بحیثیت قوم سخت نقصان دہ ہے اور اسلام کی اشاعت کی راہ میں بھی اس سے خلل پڑ سکتا ہے، اس لئے ’’لاضرر ولاضرار‘‘(الاشباہ والنظائر لابن نجیمؒ ص ۸۵، الاشباہ والنظائر للسیوطیؒ ص ۸۳) کے ضابطہ پر مسلمانوں کو فوجی ملازمت سے گریز نہیں کرنا چاہئے۔

☆ پھر ہر ملک میں فوجی ملازمت کا جبری اصول نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر ملکوں میں انسان کے اپنے اختیار تمیزی پر چھوڑا گیا ہے، مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے قیام کے لئے ایسے ملک کا انتخاب کریں جہاں فوج کی جبری ملازمت کا قانون نہیں ہے۔

☆ اور فوجی ملازمت کی صورت میں بھی مسلمانوں کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ بعض حالات میں فوجی مہم میں شرکت سے معذرت کر دیں، اس لئے کہ تمام ملکوں نے حریت ادیان کا اصول تسلیم کر لیا ہے، اور فوج میں باقاعدہ مذہبی رہنما رکھے جاتے ہیں، ان کے لئے مساجد اور بنیادی دینی تعلیم کا انتظام کیا جاتا ہے، غرض اس طرح کے جتنے شبہات وخطرات پیش کئے جاتے ہیں ان تمام کا مناسب حل موجود ہے۔

ان تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ غیر مسلم ملکوں میں قیام یا وہاں کی شہریت شجر ممنوعہ ہرگز نہیں ہے، البتہ مسلمانوں کے لئے بہتر یہی ہے کہ اگر وہ کسی مسلم ملک میں قیام پذیر ہیں، اور وہاں کے حالات ان کے لئے پریشان کن نہیں ہیں تو اپنے ملکوں میں ہی قیام کریں، اور اسلامی نظام قانون کے تحت زندگی گذاریں اور دوسرے ملکوں کا سفر یا قیام عارضی طور پر محض ضرورت کے بقدر کریں، ان حالات میں غیر مسلم ملکوں میں مستقل قیام یا شہریت کا حصول کراہت سے خالی نہیں ہے، ......البتہ اگر کسی کے لئے ایسے حالات وظروف پیدا ہو جائیں کہ مسلم ملکوں میں قیام اس کی پریشانیوں کا باعث ہو، اور کسی غیر مسلم ملک میں اس کے لئے بہتر مواقع میسر ہوں تو اس کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنے کی گنجائش ہوگی

بشرطیکہ:

(۱) وہاں رہ کر اس کا دینی تشخص اور اسلامی وجود مجروح نہ ہو، اور مستقبل قریب میں اس کے یا اس کی اولاد یا اس کی عزت ووقار کے لئے دینی اعتبار سے کوئی خطرہ نہ ہو۔

(۲) مسلمان وہاں دین وملت کا صحیح نمائندہ ہو، اپنے اخلاق وعمل اور خلوص وصداقت سے اسلام کا ئینہ دار ہو جس کے اثرات اس کے غیر مسلم پڑوسیوں پر پڑیں۔

(۳) اس ترک وطن کو وہ ہجرت حبشہ کی طرح پاک مقاصد کے لئے اختیار کرے، اور اپنے احساسات واعمال کے ذریعہ اس نقل مکانی کو اپنے اور ملت اسلامیہ کے لئے ہر طرح مفید اور بامقصد ثابت کرے۔

معاشی مقاصد کے تحت ترک وطن کرنا

اس حکم میں معاشی مجبوریوں کے تحت نقل مکانی بھی شامل ہے،:

(الف) بشرطیکہ اس کے اپنے ملک میں معاش کے ضروری وسائل میسر نہ ہوں، اور اس کی بنا پر مجبوراً کوئی مسلمان غیر مسلم ملک چلا جائے، اور اپنے دینی تشخصات کی حفاظت کے ساتھ وہاں کی اقامت یا شہریت اختیار کرے، جمہور فقہاء کے نزدیک اس کی اجازت ہے (المبسوط للسرخسیؒ ج ۱۰ ص ۸۸، احکام القرآن لابن العربیؒ ج ۱ ص ۵۱۵، الجامع لاحکام القرآن للقرطبیؒ ج ۵ ص ۳۵۱، کشاف القناع للبہوتیؒ ج ۳ ص ۱۳۱)۔

اس لئے کہ کسب معاش بھی ایک اہم ترین فریضہ ہے، اور اس کے لئے شریعت نے کسی مکان کی قید نہیں رکھی ہے، قرآن کریم میں ہے:

''**هوالذی جعل لكم الأرض ذلولاً فامشوا فى مناكبها وكلوا من رزقهٖ وإليه النشور**'' (سورہ الملک: ۱۵)۔

(وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے تابع بنایا پس اس کے کاندھوں پر چلو اور اس کی دی ہوئی رزق استعمال کرو اور اسی کی طرف پھر اٹھایا جانا ہے)۔

(ب) البتہ وسائل معاش میسر ہوں، لیکن زیادہ سے زیادہ دولت کمانے کی غرض سے کوئی شخص کسی غیر اسلامی ملک کی شہریت کا خواہاں ہو تو ظاہر ہے کہ یہ صورت کراہت سے خالی نہیں ہے، اس لئے کہ کفار کی صحبت بد کے اثرات بہرحال مرتب ہوتے ہیں، اور یہ اثرات اس سے زیادہ اس کے اہل وعیال پر پڑتے ہیں، حضرت سمرۃ بن جندبؓ کی اس روایت کی حساسیت ملاحظہ کیجئے:

''من جامع المشرک وسکن معهٗ، فإنهٗ مثلهٗ'' (سنن ابوداؤد باب الاقامۃ بارض الشرک ج ۳ ص ۴۸ حدیث نمبر ۲۷۸۹ ط دار الکتاب العربی بیروت)۔

(جو مشرک کے ساتھ اکٹھا ہو اور سکونت رکھے وہ اسی کی طرح ہے)

علامہ خطابیؒ (م ۳۸۸ھ) تشریح حدیث کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''وفیه دلالة علیٰ کراهة دخول المسلم دارالحرب للتجارة والمقام فیها أکثر من مدة اربعة أیام'' (معالم السنن للخطابیؒ، کتاب الجہاد باب علی مایقاتل المشرکون ج ۲ ص ۲۷۲ طبع اول المطبعۃ العلمیۃ حلب ۱۹۳۳ء)۔

(حدیث میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ کسی مسلمان کے لئے تجارت کی غرض سے دار الحرب کا سفر کرنا یا وہاں چار دن سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے)۔

ابوداؤدؒ نے مراسیل میں مکحولؒ سے نقل کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''لاتترکوا الذریة إزاء العدو'' (مراسیل ابی داؤد ج ۱ ص ۳۸۳ حدیث نمبر ۳۲۲، حاشیۃ ابن قیمؒ علی سنن ابی داؤد ج ۷ ص ۲۱۹ ط دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۵ء)

(اپنی اولاد کو دشمن کے بالمقابل مت چھوڑو)۔

بعض فقہاء نے مالی اغراض کے تحت دار الحرب کی سکونت اور اہل کفر کی آبادی میں اضافہ کو سقوط عدالت کا سبب قرار دیا ہے (تکملۃ رد المحتار ج ۱ ص ۱۰۱)۔

یہ تمام چیزیں اس طرف رہنمائی کرتی ہیں کہ محض دولت کی ہوس اور زیادہ سے زیادہ امیر بننے کی آرزو کے لئے غیر مسلم ملک کی سکونت وشہریت کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

(ج) اگر بنیادی وسائل معاش اپنے ملک میں میسر ہوں جس سے فاقہ کی نوبت تو نہ آتی ہو مگر اپنی یا اپنے خاندان کی اقتصادی پوزیشن بہتر کرنے کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں اقامت وسکونت اختیار کرے؟......اس صورت میں صرف عارضی قیام وسکونت کی گنجائش نظر آتی ہے، جیسا کہ بعض علماء نے اس کی صراحت کی ہے (احکام القرآن لابن العربیؒ ج ۱ ص ۴۸۶، الجامع لاحکام القرآن للقرطبیؒ ج ۵ ص ۳۵۱)۔

☆ اس لئے کہ حصول رزق کے لئے مکان کی قید نہیں ہے:

''لیس علیکم حرج أن تبتغوا فضلاً من ربکم'' (سورۂ بقرۃ:۱۹۸)۔

(کوئی مضائقہ نہیں اس بات میں کہ تم اپنے رب کی دی ہوئی رزق تلاش کرو)۔

اسی طرح نبی کریم ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے:

''البلاد بلاد الله و العباد عباد الله فحیثما أصبت خیراً فأقم''(مسند احمد بن حنبلؒ ج ۱ ص ۱۶۶ ط مؤسسۃ قرطبۃ الاندلس، الجامع الصغیر للسیوطیؒ ج ۱ ص ۴۹۶ ط دار الفکر بیروت، حدیث ضعیف ہے)۔

(تمام شہر اللہ کے ہیں اور بندے سارے اللہ کے ہیں، اس لئے جہاں سے تم کو خیر کی امید ہو وہاں قیام کرو)۔

لیکن مستقل سکونت اور باقاعدہ شہریت کی اجازت دینا اس صورت میں بہت مشکل ہے۔

(د) تجارتی مقاصد کے تحت غیر اسلامی ملکوں کا سفر اور وہاں قیام کرنے کی جمہور علماء کے نزدیک اجازت ہے ،لیکن یہ بھی وقتی قیام کی حد تک ہے(المبسوط للسرخسیؒ ج ۱۰ ص ۸۸)۔

امام مالکؒ اور علامہ ابن حزمؒ کو وقتی قیام سے بھی اختلاف ہے، ان کے نزدیک علی الاطلاق دنیوی اغراض کے لئے غیر اسلامی ملک میں قیام کرنا جائز نہیں ہے (البیان والتحصیل لابن رشد ج ۴ ص ۱۷۱ ط دار المغرب الاسلامی بیروت ۱۹۸۴ء، ملحق المدونۃ الکبریٰ ج ۵ ص ۴۶۶ ط دار الکتب العلمیۃ بیروت ۱۹۹۴ء، المحلیٰ لابن حزم ج ۱۱ ص ۳۴۹)۔

دراصل جمہور فقہاء کے پیش نظر عہد نبوی کے بعض واقعات ہیں جن میں بعض صحابہ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے مختلف اغراض کے تحت غیر مسلم ملکوں میں اقامت اختیار کی اور حضور ﷺ نے نکیر نہیں فرمائی، اس لئے کہ ان کے لئے دینی فتنہ کا اندیشہ نہیں تھا، یا یہ کہ ان کا وہیں قیام کرنا زیادہ مفید تھا، مثلاً:

☆ حضرت عباسؓ کا واقعہ مشہور ہے کہ انہوں نے مدینہ ہجرت نہیں کی اور اپنے اسلام پر قائم رہے (المغنی لابن قدامۃ ج ۱۰ ص ۵۰۷)۔

☆ اسی طرح نجاشی نے بھی قبول اسلام کے بعد ہجرت نہیں کی اور اپنی غیر اسلامی مملکت میں مقیم رہے (فتح الباری شرح صحیح البخاریؒ لابن حجرؒ ج ۷ ص ۱۹۱ ط دار الفکر بیروت)۔

☆ حضرت نعیم النحامؓ کے بارے میں آتا ہے کہ انہوں نے جب ہجرت کا ارادہ کیا تو ان کے قبیلہ بنوعدی نے آکر ان سے کہا کہ آپ ہم کو چھوڑ کر نہ جائیں، اور اپنے دین پر آزادانہ طور پر عمل کریں، اور اپنی خدمات سے ہمیں محروم نہ کریں اگر کوئی آپ کو تکلیف پہونچائے گا تو ہم آپ کا دفاع کریں گے، دراصل وہ کافی صاحب اثر اور غرباء و مساکین اور بیواؤں اور یتیموں کے بڑے خدمتگار تھے، اس لئے ان کی قوم کو ان کی جدائی شاق گذری، اس طرح ایک مدت تک وہ ہجرت نہ کرسکے، عرصہ کے بعد جب مدینہ ہجرت کی تو رسول اللہ ﷺ نے ان سے فرمایا:

''قومک کانوا خیراً لک من قومی لی قومی اخرجونی وأرادوا قتلی وقومک حفظوک ومنعوک ،فقال یا رسول الله، بل قومک اخرجوک إلیٰ طاعة الله وجهاد عدوه''(الطبقات الکبریٰ لابن سعدؒ ج ۴ ص ۱۳۸ ط دار صادر بیروت ۱۹۸۵ء، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب للقرطبیؒ ج ۳ ص ۵۲۷ ط دار الکتاب العربی بیروت، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ

لابن الاثیرؒ ج ۴ ص ۵۷۰ ط دار الفکر بیروت ۱۹۸۹ء، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ لابن حجرؒ ج ۳ ص ۵۳۷ ط دار الکتاب العربی بیروت، روایت میں کچھ ضعف ہے)۔

(تمہاری قوم میری قوم سے بہتر ہے، میری قوم نے مجھے شہر بدر کیا، اور میرے قتل کا ارادہ کیا، جبکہ تمہاری قوم نے تمہاری حفاظت کی اور تمہیں پناہ دی، حضرت نعیمؓ نے عرض کیا، آپ کی قوم نے آپ کو اطاعت الٰہی اور جہاد کی طرف نکلنے پر مجبور کیا)۔

☆ حضرت فدیکؓ کے بارے میں مروی ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی خدمت عالیہ میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا کہ لوگوں کا گمان یہ ہے کہ جس نے ہجرت نہیں کی وہ ہلاک ہوگیا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''یافدیک أقم الصلاۃ وآت الزکاۃ واھجر السوء واسکن من دار قومک حیث شئت، قال: وأظنہٗ قال: تکن مھاجراً'' (سنن للبیہقی ج ۹ ص ۱۷، صحیح ابن حبان مع الاحسان فی تقریب صحیح ابن حبان لعلاء الدین علی بن بلبان ج ۱۱ ص ۲۰۲ ط مؤسسۃ الرسالۃ بیروت ۱۹۸۸ء، رجالہ ثقات)۔

(اے فدیک! نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، اور برائیوں سے پرہیز کرو اور اپنی قوم کے ملک میں جہاں چاہے رہو، فرماتے ہیں کہ میرا گمان ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ تم مہاجر کے حکم میں رہوگے)۔

بالخصوص آج کے دور میں مسلم ممالک تجارت وصنعت کے میدان میں جس قدر پسماندہ ہیں، ان کا تقاضا ہے کہ مسلم تجار ترقی یافتہ غیر مسلم ملکوں کا دورہ کریں، وہاں قیام کریں اور اعلیٰ صنعتوں سے روشناش ہوں،...... یوں بھی تجارتی بنیادوں پر افراد کار کی آمد ورفت اور اشیاء کا تبادلہ اس دور میں ملک کی ترقی کے بہترین ذرائع میں سے ہے۔

اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ تجارت اگر پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ اسلامی اصولوں کے مطابق کی جائے، تو غیر مسلم برادری پر اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے اچھے اثرات پڑیں گے، اور اس سے دعوت کی راہ کھلنے کے بڑے امکانات ہیں...... ماضی میں تجارت ہی کے عنوان سے ہمارے اسلامی قافلوں نے مختلف ملکوں کا سفر کیا اور انہی قافلوں کے ذریعہ اسلام دنیا کے مختلف علاقوں میں پہونچا، اس لئے تجارت آج کے دور میں دعوت کا بہترین وسیلہ ہے، اور اس وسیلہ کو کھودینا ہرگز دانشمندی نہیں ہوگی۔

ظاہر ہے کہ یہ ضرورت وقتی قیام سے بھی پوری ہوسکتی ہے، اس کے لئے مستقل شہریت کی ضرورت نہیں ہے ......البتہ اگر کوئی شخص تجارت کو محض وسیلۂ دعوت کے طور پر اختیار کرے، اور اصل مقصد دعوت وتبلیغ ہو تو اس کے لئے بلاشبہ غیر مسلم ملکوں کی شہریت نہ صرف جائز بلکہ باعث فضیلت ہوگی۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو شہریت دینا:

(۷) یہاں ایک سوال یہ ہے کہ کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا؟

یہ کوئی نیا مسئلہ نہیں ہے، فقہاء نے اس مسئلہ کو بہت پہلے صاف کر دیا ہے، ہماری تمام فقہی کتابوں میں ''اہل ذمہ'' کا باقاعدہ باب قائم کیا گیا ہے، اوران سے متعلق احکام کی پوری تفصیل موجود ہے۔

ذمی ہر ایسے غیر مسلم کو کہتے ہیں جس کو حکومت (اور حنفیہ کے نزدیک کسی بھی مسلمان) کی طرف سے جزیہ اور دنیوی آئین اسلام کی اطاعت کی شرط پر ملک میں دائمی طور پر رہنے کی اجازت دی گئی ہو اور حکومت نے اس کے لئے تمام تحفظات ومراعات اور حقوق وواجبات (بعض استثناءات کو چھوڑ کر) کی ضمانت دی ہو۔

فرد اور حکومت کے اسی قانونی رابطہ کا نام شہریت ہے، حنفیہ کے علاوہ تمام فقہاء اس طرح کے قانونی معاہدہ کا اختیار صرف حکومت یا امیر المؤمنین کو دیتے ہیں، حنفیہ اس اختیار کو عامۃ المسلمین تک توسیع کرتے ہیں (البدائع للکاسانیؒ ج ۷ ص ۱۱۱، ابن عابدینؒ ج ۳ ص ۲۷۵، الاموال لابی عبیدؒ ص ۸۷، الاحکام السلطانیۃ للماوردیؒ ص ۱۴۵)۔

بعض فقہاء نے ان شرائط کی تفصیل بھی لکھی ہے جن کی پابندی غیر مسلم شہریوں پر ضروری ہوتی ہے، علامہ ماوردی نے ایسی چھ (۶) چیزوں کا تذکرہ کیا ہے:

☆ کتاب الٰہی کا احترام کریں اور ان کے بارے میں کسی طعن وتحریف کا تذکرہ نہ کریں۔

☆ ناموس رسالتؐ میں کوئی بے ادبی نہ ہو۔

☆ دین اسلام کی تحقیر نہ کریں۔

☆ کسی مسلمان خاتون سے زنا یا نکاح کا تعلق قائم نہ کریں۔

☆ کسی مسلمان کو دینی یا مالی فتنہ میں مبتلا نہ کریں۔

☆ اہل حرب کی مدد یا ان کے لئے جاسوسی نہ کریں۔

ان شرائط میں سے کسی بھی شرط کی خلاف ورزی پر ان کی شہریت منسوخ کی جاسکتی ہے (الاحکام السلطانیۃ للماورديؒ ص ۱۴۵)۔

بعض فقہاء نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ وہ اپنی عمارتیں مسلمانوں سے اونچی نہیں بنا سکتے، اسی طرح اگر ان کی تعداد زیادہ ہو تو ان کی آبادی مسلمانوں سے الگ ہونی چاہئے (ابن عابدین ج ۳ ص ۲۷۵، الاحکام السلطانیۃ للماورديؒ ص ۱۴۵، الاحکام السلطانیۃ لابی یعلیؒ ص ۱۴۳)۔

دراصل عقد ذمہ کو غیر مسلموں کے حق میں اسلام کے قائم مقام قرار دیا گیا ہے، اور اس کا مقصد غیر مسلموں سے حصول مال نہیں بلکہ ان کو اسلامی معاشرہ میں رکھ کر اسلام کی عملی دعوت دینا مقصود ہے (فتح القدیر والعنایۃ علی الہدایۃ ج ۵ ص ۲۱۳، ۲۱۴)۔

اسی لئے اللہ کے نبی ﷺ نے غیر مسلم شہریوں کے ساتھ پوری مراعات کرنے کا حکم دیا ہے اور ان کے ساتھ ظلم وزیادتی کو سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، آپ نے ارشاد فرمایا:

''ألامن ظلم معاهداً أوانتقص حقه' أوكلفهٗ فوق طاقته أوأخذ منه شيئاً بغير طيب نفس منه فأناحجيجهٗ يوم القيٰمة'' (ابوداؤد ج ۳ ص ۱۳۶ ط دار الکتاب العربی بیروت)۔

(خبردار! جو کسی معاہد پر ظلم کرے گا، اس کی حق تلفی کرے گا، یا اس کی طاقت سے زیادہ زیر بار کرے گا، یا بغیر اس کی رضامندی کے اس کی کوئی چیز لے لے گا تو بروز قیامت اس کے خلاف میں خود مستغیث بنوں گا)۔

عقد ذمہ کی یہ حقیقت اس بات کی دلیل ہے کہ مسلم ملکوں کے دروازے ہر وقت غیر مسلموں کے لئے کھلے رہنے چاہئیں، اور بلا کسی معقول وجہ کے اس کو بند نہیں کرنا چاہئے، یہ دعوتی اعتبار سے بھی فائدہ مند ہے،...... مالی طور بھی سود مند ہے،...... دوسرے ملکوں سے معاہدات میں مفید ہے...... اور اس سے خود مسلمانوں کے لئے بھی غیر مسلم ملکوں میں اقامت وشہریت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

جزیرۃ العرب میں کسی غیر مسلم کو شہریت نہیں دی جاسکتی

البتہ اس میں باتفاق فقہاء جزیرۂ عرب کا استثناء کیا گیا ہے (ابن عابدینؒ ج ۳ ص ۲۷۵، الماوردیؒ ص ۱۶۷، احکام اہل الذمۃ لابن القیمؒ ج ۱ ص ۱۷۶-۱۸۶)۔

اور اس کی وجہ وہ حدیث پاک ہے جو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمائی ہے:

''لاخرجن اليهود والنصارىٰ من جزيرة العرب حتى لاادع إلامسلماً'' (صحیح مسلم باب اخراج الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب ج ۵ ص ۱۶۰ حدیث نمبر ۴۶۹۳ ط دار الجبل بیروت، ترمذی ج ۴ ص ۱۵۶ حدیث نمبر ۱۶۰۶ ط دار احیاء التراث العربی بیروت)۔

(میں یہود ونصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے ضرور نکالوں گا اور یہاں کسی مسلمان کے علاوہ کسی کو رہنے کی اجازت نہ دوں گا)۔

ایک حدیث کے الفاظ ہیں:

''لايجتمع فى أرض العرب دينان'' (مسند احمدؒ ج ۶ ص ۲۷۵ ط المیمنیۃ، مجمع الزوائد للہیثمیؒ ج ۵ ص ۳۲۵ ط القدسی، الاموال

لابی عبیدؒ ص ۱۲۸ اط دار الفکر ۱۳۹۵ھ)۔

(عرب کی سرزمین پر دو دین جمع نہیں ہو سکتے)۔

جزیرۃ العرب اہل جغرافیہ کے مطابق عرب کے اس جزیرہ نما علاقہ کا نام ہے جس کے غرب میں بحر قلزم (بحر احمر)، جنوب میں بحر عرب، اور شرق میں خلیج بصرۃ (خلیج عربی) ہے، جانب شمال کی حد کیا ہے اس میں اختلاف ہے، صاحب معجم البلدان کے مطابق اس کی حد عذیب سے حضرموت تک ہے، ابن الاعرابی نے بھی اس کی تحسین کی ہے، جبکہ اصمعی کا بیان یہ ہے کہ جزیرۃ العرب طول میں عدن سے ریف عراق تک اور عرض میں ابلہ سے جدۃ تک ہے (معجم البلدان لیاقوت الحمویؒ (م ۶۲۶ھ) جزیرۃ العرب ج ا ص ۴۹۵)۔

اسی لئے فقہاء کرام میں حنفیہ اور مالکیہ نے جزیرۃ العرب کو صرف مکہ اور مدینہ تک محدود نہیں رکھا ہے بلکہ پورا خطۂ عرب (جس کو اہل بلدیات جزیرۃ العرب مانتے ہیں) اس میں شامل ہے، اس لئے کہ الفاظ حدیث میں عموم ہے (فتح القدیر لابن ہمامؒ ج ۴ ص ۳۷۹، حاشیۃ ابن عابدینؒ ج ۳ ص ۲۷۵)۔

البتہ مالکیہ میں علامہ قرطبیؒ کی رائے یہ ہے کہ اس سے مراد مکہ، مدینہ، یمامۃ اور یمن کے اطراف ہیں (الحطاب ج ۳ ص ۳۸۱ بحوالہ الموسوعۃ ارض العرب)۔

شافعیہ اور حنابلہ کے یہاں اس سے مراد سرزمین حجاز ہے (احکام اہل الذمۃ لابن القیمؒ ج ا ص ۱۷۶)۔

حجاز کی تشریح امام غزالیؒ وغیرہ نے یہ کی ہے کہ اس میں مکہ، مدینہ، یمامہ، نجد اور اطراف آتے ہیں، الوج، طائف اور خیبر مدینہ کے اطراف میں شامل ہیں، یمن اس میں داخل ہے کہ نہیں اس میں اختلاف ہے، اس لئے کہ بعض لوگ جزیرۃ العرب کو شام و عراق تک توسیع کرتے ہیں (الوجیز للغزالیؒ ج ۲ ص ۱۹۹ بحوالہ الموسوعۃ الفقہیۃ ج ۳ ص ۱۲۹)۔

☆☆☆

شرعی اور سیاسی تناظر میں شہریت اور اس سے متعلق احکام

مولانا محمد اقبال ٹنکاروی☆

اللہ تعالیٰ نے انسان کو جو حقوق دیئے ہیں، ان میں سے ایک ''کائنات سے استفادہ کا حق'' ہے، اللہ تعالیٰ نے یہ وسیع کائنات انسان کے لئے انتہائی موزون بنائی ہے، بحر وبر اس کے لئے مسخر کردیئے ہیں، زمین اس کے لئے مستقر ہے ؛ تاکہ اس پر رہ سکے اور زندگی گذار سکے اور انسان ہونے کے ناطے اللہ پاک کی نعمتوں سے جتنا چاہے فائدہ اٹھائے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے: ''**اللّٰه الذي خلق السموت والأرض وأنزل من السماء ماءً فأخرج به من الثمرات رزقا لكم ، وسخر لكم الفلك لتجري في البحر بامر ہ ، وسخر لكم الانهٰر**....(سورۂ مریم:۳۲-۳۴)۔

گویا انسان کے لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دنیا میں بے شمار نعمتیں پیدا کی ہیں اور اس سے فائدہ اٹھانے کا حق دیا ہے، یہ اور اس جیسے دوسرے حقوق بیان کرنے سے پہلے شہریت کی وضاحت کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

(۱) شہری اور شہریت کی تعریف: اسٹیٹ کی آبادی میں دو طرح کے لوگ موجود ہوتے ہیں، ایک تو ملکی باشندے یا مملکت کے شہری یا اتباع اور دوسرے غیر ملکی باشندے یا اجانب، لفظ شہری کے معنی شہر کے باشندے کے ہیں؛ لیکن اصطلاحاً اس سے مراد مملکت کے فقط وہ ارکان ہیں؛ جنہیں ملکی دستور اور قوانین کے تحت مدنی اور سیاسی حقوق حاصل ہوں، ان کے مقابلہ میں اجانب کو چند شخصی تحفظات حاصل ہوتے ہیں، لیکن وہ مدنی اور سیاسی حقوق سے محروم ہوتے ہیں۔

فی زمانا حق شہریت حاصل کرنے یا ہونے کے لئے عموماً دو میں سے ایک اصول کو اپنایا جاتا ہے، ایک خونی رشتہ کا اصول جس کے مطابق کسی ملک کی شہریت رکھنے والے ماں باپ سے پیدا شدہ بچہ خود بخود اپنے والدین کے ملک کا شہری مانا جائے گا، دوسرا جائے پیدائش کا اصول، یعنی جو بچہ جس ملک کی سرزمین پر پیدا ہوا وہاں کا شہری مانا جاتا ہے، برطانیہ، ولایات متحدہ امریکہ میں شہریت کے تعین کا فارمولا ان دونوں اصول سے مرکب ہے، مزید براں مملکت کو حق ہے کہ وہ کسی بھی

☆ مہتمم دار العلوم ماٹلی والا، بھروچ، گجرات۔

غیر ملکی کو ''ملکیانے'' Naturalilzation کے عمل سے شہریت عطا کر سکتی ہے (مبادئ سیاسیات: باب: ۴، ص: ۶۹، ۷۰، قاضی پبلیشرز و دسٹری بیوٹرز دہلی)۔

دوسرا اصول تو ہر ایک ملک میں رائج ہے اور ضروری بھی ہے؛ تا کہ نومولود پیدا ہوتے ہی شہری حقوق کا حقدار ہو جائے، لیکن ایک شخص ایک ملک میں پیدا ہوا، وہاں کی شہریت اسے حاصل ہے اور اب وہ اس ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک میں آباد ہونا چاہتا ہے۔

تو اس کو حق شہرت ملے اس کے لئے کس بات کو بنیاد بنایا جائے؟ بنیادیں مختلف ہیں، جیسے معاشی سرگرمیاں انجام دینا، لیکن آدمی سکون واطمینان کے ساتھ معاشی سرگرمیاں اسی وقت انجام دے سکتا ہے؛ جبکہ اس کو سکونت وقیام کے بارے میں اطمینان ہو جائے اور کامل اطمینان اس وقت ہوگا، جبکہ حق شہریت مل جائے، یہ اس کی فطرت ہے۔

اور کسی آدمی کا بود وباش کا پختہ ارادہ ہے اس کا علم، بلکہ یقین بھی اسی وقت ہو سکتا ہے، جبکہ وہ ایک طویل مدت تک رہے، لہذا ایک مخصوص مدت تک قیام کو بنیاد بنانا بہتر معلوم ہوتا ہے، اب یہ مدت کتنی ہونی چاہئے؟ احقر کی رائے میں ۴ر سال یا اس سے ایک دو سال زائد بہتر ہے، محدثین کے یہاں ایک اصول بتلایا جاتا ہے کہ راوی کسی شہر میں کتنی مدت رہے تو ان کو اس شہر کی طرف منسوب کیا جائے؟ عبداللہ بن مبارک ۴ر سال کے قائل ہیں، ''**كم المدة التي إن أقامها الشخص في بلد نسب إليها ؟ أربع سنين، وهو قول عبدالله بن المبارك**.(تیسیر مصلح الحدیث: باب: ۲۰، ص: ۲۳۳، ط: مکتبہ فیصل دیوبند)۔

(۲) ایک ملک کا شہری دوسرے ملک میں آباد ہونا چاہے تو اس کی ۴ر صورتیں متصور ہو سکتی ہیں، (۱) کافر کسی کافر ملک میں آباد ہونا چاہے (۲) مسلمان کسی مسلمان ملک میں آباد ہونا چاہے (۳) کافر کسی مسلمان ملک میں آباد ہونا چاہے (۴) مسلمان کسی کافر ملک میں آباد ہونا چاہے۔

پہلی صورت سے ہمیں کوئی بحث نہیں ہے یعنی (کسی مسلمان یا کافر ملک کا) کافر شہری کسی کافر ملک میں آباد ہونا چاہے۔

دوسری صورت سوال نمبر ۲ر میں ذکر کی ہے۔
تیسری صورت سوال نمبر ۷ر میں مذکور ہے۔
چوتھی صورت سوال نمبر ۶ر میں مذکور ہے۔

دوسری صورت کے سوال کے مطابق اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو یہ

دیکھا جائے کہ وہ مسلم ملک کا باشندہ ہے یا غیر مسلم ملک کا۔

۲- اگر وہ کسی مسلم ملک کا باشندہ ہے اور وہاں اسے کوئی مجبوری نہیں ہے، صرف ایک قلبی تمنی وخواہش ہے کہ کسی دوسرے ملک میں آباد ہوتو ایسے مسلمان کی درخواست کو قبول کرنا دوسرے مسلم ملک پر ضروری نہ ہونا چاہئے؛ کیونکہ یہاں بھی وہ کسی مسلمان حاکم کی ولایت میں ہے اور یہاں وہ تمام دینی امور اچھی طرح ادا کرسکتا ہے۔

ہاں! اگر مجبوری ہے، مسلم حکومت ہونے کے باوجود کچھ دینی امور، دینی تعلیم اور بنیادی مذہبی وشہری حقوق سے محروم رکھا جاتا ہے؛ پھر بھی یہ مسلمان اس ملک میں رہ کر جدوجہد کرے اور بنیادی حقوق کے حصول کے لئے کوشاں رہے، تو امید ہے کہ ماحول سازگار ہوگا، سعی وکاوشیں بارآور ہوگی۔

پھر بھی اگر یہ لوگ کسی دوسرے مسلم ملک میں مجبوری کی وجہ سے شہریت لینا چاہتے ہیں تو ان کو حق شہریت کے بجائے یہ صورت زیادہ بہتر معلوم ہوتی ہے کہ دوسرے مسلم ممالک اس مسلم ملک پر دباؤ بنائے جو اپنے مسلم شہریوں کو بنیادی حقوق سے محروم رکھے ہوئے ہیں۔

کیونکہ شہریت طلب کرنے والے کو شہریت دے دینا یہ کوئی حل معلوم نہیں ہوتا، اہل حکومت مسلمان ہیں؛ لہذا انہیں کسی کا آلۂ کار نہ بننے پر سمجھایا جائے، اور رعایا کے حقوق سمجھائے جائیں؛ تاکہ وہ لوگ جو کسی مجبوری کی وجہ سے کسی طرح دوسرے ملک کی شہریت لینے کے خواہش مند ہونے کے باوجود شہریت نہیں لے سکتے انہیں بھی فائدہ ہو۔

ہاں! اگر کسی مسلمان ملک کا حاکم یا برسراقتدار جماعت کسی فرقۂ ضالہ کی ہمنوا ہے اور اس سے یہ توقع رکھنا بیجا ہو کہ وہ کسی مسلمان کو ان کے بنیادی حقوق، دینی امور کی ادائیگی اور بنیادی دینی تعلیم کا حق دے تو ایسے مسلمان کو حق شہریت طلب کرنے پر اخوت ایمانی، بھائی چارگی، غیرت وحمیت کو مدنظر رکھتے ہوئے دوسرے ملک کو شہریت دینی چاہئے۔

کیونکہ اس مسلمان پر اب مسلم ملک میں زمین تنگ کردی گئی ہے؛ حالانکہ اللہ پاک کی پیدا کردہ زمین میں وسعت ہے تو اب دوسرا مسلم ملک اس وسعت میں اپنے اس مسلم بھائی کو آباد کرے۔

اور اگر وہ کسی کافر ملک میں آباد ہے اور اب کسی مسلم ملک میں شہریت لینا چاہتا ہے تو اگر اس مسلمان کو کافر ملک میں پریشانی نہیں ہے اور حالات بھی سازگار ہے، لوگوں کو عبادات وغیرہ کی اجازت ہے اور وہ مسلمان اس کافر ملک سے مسلمان ملک میں آباد ہونا چاہے تو بھی اس کو حق شہریت دینا بہتر معلوم ہوتا ہے، جیسے مہاجرین حبشہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں حبشہ ہجرت کرکے آباد ہوئے تھے اور وہاں کے بادشاہ کی طرف سے کسی طرح کی کوئی تکلیف نہیں تھی، وہ صحابۂ کرام وہیں رہے، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”لما نزلنا أرض الحبشة جاورنا خير جار وامنا على ديننا، عبدنا الله تعالىٰ لا نؤذى ونسمع شيئا نكرهه“(السیرۃ الحلبیہ: باب الہجرۃ الثانیہ الی الحبشہ،ص:۳۰،ج:۲،ط:دارالمعرفہ بیروت)۔

فتح خیبر کے بعد مہاجرین حبشہ میں سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کو آپ نے حبشہ واپس نہیں لوٹایا، بلکہ ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔”السیرۃ الحلبیہ“ میں ہے:

”وقد م عليه ﷺ بعد فتح خيبر جعفر بن ابي طالب رضي الله عنه من أرض الحبشة ومعه الاشعريون ....ولما أقبل عليه ﷺ جعفر رضي الله عنه قام ﷺ إلي جعفر وقبله بين عينيه“(غزوۂ خیبر، ص:۷۵۶،ج:۲،ط:دارالمعرفہ بیروت)۔

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ حبشہ عیسائی مملکت میں ایک طویل مدت تک مقیم رہے، بلکہ ہجرت نبوی ﷺ کے بعد بھی کئی سال تک مقیم رہے، اسی لئے ان کی آمد پر آپ ﷺ بہت خوش ہوئے؛ کیوں کہ لمبی مدت کے بعد ملاقات بھی ہورہی تھی، ما أدرى انا بقدوم جعفر أسر أو بفتح خيبر، حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی یہ آمد سن ہجری ۷ر میں ہوئی، اس کے بعد وہ حبشہ نہیں گئے، اور ۹ھ میں موتہ میں جام شہادت نوش فرمایا۔

اور اگر وہ ایسے کافر ملک سے آیا ہے جہاں مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھایا جارہا ہے، عبادات پر پابندیاں اور شعائر کی بے حرمتی ہورہی ہے، تو ایسے لوگوں کو مسلمان ملک میں شہریت دینا لازم ہونا چاہئے، جیسے کئی صحابہ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ ہجرت کی اور انہیں ہمیشہ کے لئے وہاں اقامت مل گئی، اسی طرح کئی دیگر شہروں اور ملکوں سے صحابہ اسلام میں داخل ہوئے اور مدینہ منورہ میں مقیم رہے۔

اتنا ہی نہیں؛ بلکہ دو-دو صحابہ کے درمیان اخوت قائم کی اور انصاری صحابہ نے مہاجرین صحابہ رضی اللہ عنہم کو اپنی ملکیت میں حصہ تک کی پیش کش کی۔

اور دوسرا فائدہ ان کو حق شہریت دینے میں یہ بھی ہے کہ وہ کسی کافر حاکم کی ولایت سے نکل کر مسلمان حاکم کی ماتحتی اور ولایت میں آجائیں گے۔

(۳) اسلام میں ایک مؤمن کو دوسرے مؤمن سے قلبی تعلق ومحبت پر ابھارا ہے، اور ”إنما المؤمنون اخوة“ کے پیش نظر سب کے درمیان اخوت ایمانی قائم کر کے بھائی چارگی اور محبت پیدا کردی، نیز تمام مؤمنین کو ایک جسم کی طرح قرار دیا کہ اگر ایک مؤمن کو تکلیف ہو تو اس کے دکھ اور درد کا احساس دوسرے کو بھی ہونا چاہئے۔

”عن النعمان بن بشير قال؛ قال رسول الله ﷺ:مثل المؤمنين في توادهم وتراحمهم

وتعاطفهم مثل الجسد ، إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد بالسهر والحمى'' (مسلم: کتاب البر والصلہ ، باب تراحم المؤمنین وتعاطفہم وتعاضدھم، رقم الحدیث: ۶۵ / ۲۵۸۵،ص:۱۱۲۲، دارابن حزم بیروت)۔

اس میں ایک دوسرے کے الم ومصیبت اور تکلیف میں شرکت کرنے پر ابھارا ہے، مفتی محمد تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں:

"**تداعى له أي دعا بعضه بعضا إلى المشاركة في الألم**'' (تکملہ فتح الملہم : رقم الحدیث : ۶۶/ ۲۵۸۶،ص: ۳۰۴،ج:۱۱، ط: المکتبہ الاشرفیہ دیوبند)۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ''**قال ابن أبي جمرة: الذي يظهر أن التراحم والتوادد والتعاطف، وإن كا نت متقاربة في المعنى، لكن بينهما فرق لطيف.... وأما التعاطف فالمراد به إعانة بعضهم بعضا، كما يعطف الثوب عليه ليقويه . كذا في فتح الباري**'' (تکملہ فتح الملہم : رقم الحدیث : ۶۶/ ۲۵۸۶،ص: ۳۰۴،ج:۱۱، ط: المکتبہ الاشرفیہ دیوبند)۔

اب کوئی مؤمن کسی ملک میں ظلم وستم کا شکار ہے تو دوسرے ملک کے مؤمن حاکم کی طرف سے اس کی اعانت کی دوصورتیں ہیں:

۱- اس ظالم ملک کے حاکم پر کسی طرح دباؤ بنائے ؛ تاکہ مظلومین کو سکون ملے، لیکن فی زماننایہ شکل مشکل معلوم ہورہی ہے۔

۲- دوسری صورت یہ ہے کہ اس ملک کے مظلوم مسلمانوں میں سے جو مسلمان اسکے ملک میں آئے اس کو امن وپناہ دینے کے بجائے شہریت دے دیوے؛ تاکہ یہ پرامن وپرسکون زندگی گذارے۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا: ''**ولينصر الرجل أخاه ظالما أو مظلوما ، إن كان ظالما فلينهه، فإنه له نصر ، وإن كان مظلوما فلينصره**'' (صحیح مسلم: کتاب البر والصلہ ، باب نصر الاخ ظالما اومظلوما، رقم الحدیث: ۶۲/ ۲۵۸۴،ص: ۱۱۲۲، ط: دارابن حزم بیروت)۔

نیز اس مسلم ملک کے حاکم کو ''**ومن فرّج عن مسلم كربة فرج الله عنه بها كربة من كرب يوم القيامة**'' (صحیح مسلم: رقم الحدیث: ۵۸، ۲۵۸۰) جیسی حدیثیں بھی مدنظر رکھنی چاہئے ، تاکہ اس مظلوم مؤمن کی تکلیف حق شہریت ملنے کی وجہ سے مکمل ہی رفع ہوجائے۔

اگر پناہ دی ہے تو ہوسکتا ہے کہ اس کو اپنے ملک میں واپسی کی صورت میں تکالیف کا سامنا کرنا پڑے، اس مدت کے درمیان اس کی ملکیتیں ہلاک کردی گئی ہو، اور یہاں بھی پناہ گزیں کی حیثیت سے رہے گا تو یہاں بھی اس کو وہ اطمینان نہ

ہوگا، جوایک شہری کو ہوتا ہے، کیونکہ کبھی پناہ ختم ہونے کا امکان ہے، جس کے نتیجہ میں زندگی اجیرن ہوجائے، اس لئے مسلم ملک کے حاکم کے لئے مظلوم مسلمانوں کو پناہ دینے کا جذبہ اورقدم یقیناً قابل مدح ہے؛ لیکن اعانت میں ایک قدم اورآگے بڑھیں تو یہ یقیناًاعانت کے آخری درجات میں سے ہوسکتا ہے۔

۴-اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے لئے درج ذیل حقوق حاصل ہونے چاہئے:

ووٹ دینے کا حق جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اورحضرت علی رضی اللہ عنہ میں سے کس کو خلافت کے لئے منتخب کیا جائے، اس کے حل کے لئے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے سب کی رائے لی؛ حتی کہ پردہ نشین عورتوں سے بھی رائے طلب کی، اس میں یہ امتیاز نہیں کیا کہ جو مدینہ کے باشندے ہیں، انہیں سے پوچھ لیا جائے اور باقی حضرات جو دیگر ممالک یا شہروں سے آکر آباد ہوئے ہیں ان کو چھوڑ دیا جائے؛ بلکہ ہرایک سے انہوں نے رائے طلب کی، حتی کہ اعرابی اور راہگیروں کی بھی رائے لی۔

"ویروي أن أهل الشورى جعلوا الأمر إلى عبد الرحمن ليجتهد المسلمين في أفضلهم ليولّيه، فيذكر أنه سأل من يمكنه سواله من أهل الشورى وغيرهم فلا يشير إلا بعثمان بن عفان، حتى أنه قال لعلى: ارأيت إن لم أولئک بمن تشير به عليّ؟ قال: بعثمان، وقال لعثمان : ارأيت ان لم اولک بمن يشير به؟ قال: بعلى بن ابي طالب، وينخلع عبدالرحمن منها لينظر الأفضل، والله عليه والإسلام ليجتهد ن في أفضل الرجلين فيوافيه، ثم نهض عبدالرحمن بن عوف رضى الله عنه يستشير الناس فيهما ويجمع رأى المسلمين برأي رؤس الناس واقيادهم جميعا وأشتاتا، مثنى وفرادى ومجتمعين ، سرا وجهرا ، حتى خلص إلى النساء المخدرات في حجابهن، وحتى سأل الولدان في المكاتب، وحتى سأل من يرد من الركبان والأعراب إلى المدينة ، في مدة ثلاثة أيام بلياليها" (البدایہ والنھایہ: خلافت امیرالمؤمنین عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، ص:۱۵۹، ۱۶۰، ج:۷، ط: دارالفکر العربی)۔

انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق: اگراس آدمی میں صلاحیت، ملکی مسائل سے دلچسپی اوراس کے حل کی مہارت، امانت ودیانت اوردیگر جوشرائط ایک والی اورحاکم کے لئے ہونی چاہئے وہ پائی جائے تو اسے یہ حق بھی ملنا چاہئے، اورآج کل کئی ممالک میں حق شہریت کے بعد یہ حق بھی دیا جاتا ہے، خودخلفائے اربعہ ہجرت کرکے مدینہ آئے اوروہیں کے ہورہے، آپ ﷺ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد یہ بالترتیب خلیفہ بنے، اورکئی ایک صحابہ جودوسرے ملکوں سے یادوسرے شہروں سے آئے تھے؛ وہ گورنر بنے۔

سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق: جیسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ملکِ یمن میں قبیلۂ دوس سے تعلق رکھتے تھے، قبول اسلام کے بعد تبوک کے موقع پر مدینہ منورہ میں تشریف لائے، حتی کہ مدینہ منورہ دائمی اقامت کرلی، امیر المؤمنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں بحرین کا گورنر نامزد کیا، اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں وہ مدینہ منورہ کے گورنر رہے، اور اس طرح ان کو ایک سرکاری ملازمت سپرد کی گئی۔

محمد احمد غضنفر لکھتے ہیں: امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطابؓ نے حضرت ابوہریرہؓ کو بحرین کا گورنر نامزد کیا.... حضرت امیر معاویہؓ کے دور حکومت میں حضرت ابوہریرہؓ کو مدینہ منورہ کے گورنر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا، کبھی مروان بن حکم اس عہدے پر فائز ہوتا اور کبھی حضرت ابوہریرہؓ مسند امارت مدینہ پر جلوہ افروز ہوتے (حکمران صحابہ: ص: ۶۴۳، ۶۴۶، ط: فرید بکڈپو)۔

بحرین کی گورنری سے پہلے وہ دوسری بھی سرکاری ملازمت سنبھال چکے تھے، بحرین میں عمرؓ نے قدامہ بن مظعون کو ٹیکس کا محکمہ سپرد کیا اور ابوہریرہؓ کو محکمۂ پولس اور نماز کی ذمہ داری سونپی، ایک اور روایت کے مطابق قدامہ بن مظعونؓ کو ٹیکس اور پولس کا محکمہ دیا، جب کہ ابوہریرہؓ کو نماز اور قضا کی ذمہ داری دی۔

بہرحال کچھ دنوں تک ان ذمہ داریوں کی ادائیگی کے بعد حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ واپس مدینہ لوٹ آئے.... اس کے بعد پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو بحرین کے گورنر بنائے (حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ حیات وخدمات: باب: ۴، خلافت راشدہ، ص: ۶۳، ط: مکتبہ نعیمیہ دیوبند)۔

سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، روزگار کا حق:

معاشی تگ ودو کا حق: حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ مدینہ منورہ ہجرت کر کے تشریف لائے تو آپ ﷺ نے سعد بن الربیع خزرجی کے ساتھ ان کی مواخات قائم فرمائی، ’’**وآخى بنيه وبين سعد بن الربيع الخزرجي**‘‘ (تہذیب الکمال فی اسماء الرجال: رقم الترجمۃ: ۳۹۲۳، ص: ۳۲۶، ج: ۱۷، ط: موسسہ الرسالہ)۔

دیگر مہاجرین صحابہ کی طرح انہیں بھی ان کے انصاری بھائی حضرت سعد کی طرف سے اپنی مملوک اشیاء میں حصہ اور شرکت کی پیش کش کی گئی؛ لیکن انہوں نے اس کو قبول کرنے کے بجائے تجارت کی غرض سے بازار کا راستہ دریافت کیا اور معاشی تگ ودو اور طلب رزق میں بھی لگے۔ بخاری شریف میں ہے:

”**لما قدموا المدينة آخى رسو ل الله صلى الله عليه وسلم بين عبد الرحمن بن عوف وسعد بن الربيع ، قال لعبد الرحمن : إني أكثر الأنصار مالا، فاقسم مالى نصفين ، ولي امرأتان فانظُر اعجَبَها**

إليک فسَمِّها لي اطلقها فإذا انقضت عدتها فتزوجتها . قال : بارک الله لک في أهلک ومالک ، اين سوقکم ؟ فدلوه على سوق بنى قينقاع، فما انقلب إلا ومعه فضل من اقط وسمن...'' (فتح الباری؛ کتاب مناقب الانصار، باب اخاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بین المہاجرین والانصار، رقم الحدیث: ۳۷۸۰، ص: ۴۸۶، ج: ۷، ط: دارالفکر بیروت لبنان)۔

انصاف حاصل کرنے کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق: یہ حق بھی اس آدمی کے لئے ضروری ہے، جسے کسی جگہ حق شہریت ملے؛ تاکہ وہ ظلم وجور کا شکار نہ ہو، اور پرامن فضا میں سانس لے سکے۔

محمد محمود فیض آبادی نے ایسے تمام حقوق کو یکجا جمع کیا ہے، جو ایک شہری کے لئے ضروری ہے، وہ لکھتے ہیں:

مملکت کی حتمی غایت اپنے شہریوں کی حفاظت اور ان کی شخصیات کے نشو ونما کے لئے ضروری اسباب ووسائل مہیا کرنا ہے، مملکت کے قانون کی غرض وغایت انصاف کے اسی نصب العین کا حصول ہے، مملکت کا قانون اسی لئے مبنی برحق تسلیم کیا جاتا ہے؛ کیونکہ وہ سماج میں ان خارجی حالات کی ضمانت دیتا ہے، جن کے بغیر افراد اپنی شخصیات کی تکمیل کے قابل نہیں ہوسکتے، سماج میں انہیں خارجی کیفیات کو (Rights) کا نام دیا گیا ہے۔

مملکت کا بنیادی وظیفہ ان حقوق کو قانوناً تسلیم کرکے انہیں نافذ کرنا ہے، اگر مملکت کا وجود انسانی شخصیت کی نشو ونما کے لئے ہوا ہے تو اس مقصد کا حصول قانونی حقوق کے نظام کے بغیر ممکن نہیں ہے، تمام حقوق کا معیار ان کی انسانی افادیت ہے، وہ حقوق اسی لئے کہلاتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول میں مد ومعاون ہیں، جن کے لئے مملکت کا وجود ہوا ہے، لیکن جہاں افراد کو مملکت کے اوپر کچھ حقوق حاصل ہیں وہیں ان حقوق کی لازمی شرائط کے طور پر مملکت کے تئیں ان کے اوپر بھی چند فرائض عائد ہوتے ہیں، کیونکہ سماج تکافل باہم (Interdipendence) کی بنیاد پر قائم ہے۔

مملکت اپنے شہریوں کے حقوق کی تعیین اپنے عین العیون یعنی عدل وانصاف کی روشنی میں کرتی ہے، عدل یا انصاف وہ اعلی ترین قدر ہے، جو حریت ، مساوات اور اخوت کی تینوں اخلاقی قدروں کی میزان اور مجموعہ ہے، انصاف سے مراد ان تینوں بنیادی انسانی قدروں کے درمیان مناسبت، توازن اور ہم آہنگی کی کیفیت ہے، اگر حریت انصاف کا ایک مبدا ہے تو انصاف نہ صرف حریت کی مختلف شکلوں کے درمیان، بلکہ حریت اور مساوات کے درمیان اور ان دونوں اور اخوت کے درمیان مناسبت اور مطابقت قائم کرتا ہے، انصاف کا اعلی ترین مبدا انہیں تینوں مبادی کا مجموعہ اور میزان ہے، وہ ان تینوں کے مختلف الجہات تقاضوں اور عملیات کے درمیان تناسب اور توازن لاتا ہے، وہ نہ صرف ان تینوں اقدار کے درمیان بلکہ مختلف زمروں کے حقوق کے درمیان جو بسا اوقات آپس میں متصادم بھی ہوسکتے ہیں؛ تناسب قائم رکھتا ہے۔

حریت کی تین خاص انواع یہ ہیں:

(۱)شخصی حریت (۲) مدنی اور سیاسی حریت (۳)اقتصادی حریت

جس طرح ہر فرد بہ حیثیت انسانی فرد کے مملکت کا آزاد رکن ہے، اسی طرح ہر فرد دوسرے افراد کے برابر درجہ کا شہری ہے؛ لیکن مساوات کے معنی مطلق یا فطری (نیچرل) مساوات کے نہیں، کیونکہ خدا نے سب انسانوں کو یکساں بنایا ہے؛ نہ سب کو یکساں صلاحیتیں ودیعت ہوئی ہیں، نہ سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کیا جانا ممکن ہے؛ بلکہ مدنی زندگی میں مساوات سے مراد ہر فرد کے قانونی مرتبہ اور قانونی اہلیت کی مساوات ہے۔

مساوات کی دوسری اور اہم تر نوع ''سماجی مساوات'' ہے، یعنی سماج میں افراد کی دوسروں کے برابر سماجی مواقع سے بہرہ ور ہونے کی آزادی، اس کے لئے لازم ہے کہ سماج میں نہ تو مخصوص افراد اور مخصوص طبقات کو خصوصی مراعات یا خصوصی تحفظات دیئے جائیں، نہ کسی کے ساتھ بھید بھاؤ یا امتیازی برتاؤ کی اجازت دی جائے۔

مساوات کی تیسری نوع ''سیاسی مساوات'' ہے، یعنی سیاسی زندگی میں افراد کی دوسروں کے برابر ووٹ دینے ،سیاسی عہدوں کے لئے امیدوار ہونے اور ہر طرح سے سیاست وانتظام میں حصہ داری کی آزادی۔ مساوات کی چوتھی نوع ''اقتصادی مساوات''، یعنی دوسرے کے ساتھ مساویانہ درجہ میں روزگار، آمدنی، معقول شرائط ملازمت پانے اور مقابلہ کرنے کی آزادی ہے۔

آج کل مملکتیں اپنے شہریوں کے درمیان حقوق کی تقسیم حریت، مساوات اور اخوت کے رہ نما اصول کی روشنی میں کرتی ہے اور انہیں اپنے قانونی نظام کے ذریعہ نافذ کرتی ہے، یہ اصول نہ صرف مشترکہ طور سے تمام حقوق کی تعیین کرتے ہیں؛ بلکہ ان میں سے ہر اصول اپنے مخصوص زمرہ میں مخصوص حقوق سے بھی ہم رشتہ ہے اور اپنے زمرہ میں ان کی تقسیم کا تصفیہ کرتا ہے، اس لحاظ سے ہم حقوق کو چار خاص زمروں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

(۱) حریت کے حقوق (۲) مساوات کے حقوق (۳) فلاحی حقوق (۴) نجی ملکیت کے حقوق۔

(۱) حریت کے حقوق تین زمروں میں منقسم ہیں: (الف) سیاسی آزادی کے حقوق (باء) شہری آزادی کے حقوق اور (جیم) اقتصادی آزادی کے حقوق۔

سیاسی آزادی کے حقوق میں عموماً ملکی انتخابات میں حصہ لینے ، سیاسی عہدوں کے لئے امیدوار ہونے، حکام کو عرضداشت اور اپنی شکایات کرنے اور ان کا ازالہ کرانے کے حقوق شامل ہیں، سیاسی پارٹی بنانے کا حق اگرچہ سیاسی آزادی ہی کا ایک جزو ہے، لیکن رسماً اظہار رائے، جلسہ وجلوس اور اجتماع کی عام شہری آزادیوں سے منسلک ہے۔

شہری آزادی (سول لبرٹی) کے حقوق کوفی زمانہ تین خانوں میں منقسم کیا گیا ہے: (۱) شخصی آزادی یعنی جان وتن یاہوّیت کی سلامتی کا حق (مثلاً جسمانی ایذا، حبس بے جا، غیر انسانی سزا اور خلوت ومسکنت میں دخل بے جا سے تحفظ کا حق، اندرون ملک نقل وحرکت کی آزادی، کسی بھی مقام پر ٹھہرنے یا بسنے کی آزادی، ملک سے باہر سفر کرنے اور ملک میں واپس آنے کی آزادی، اور دوسرے ممالک میں پناہ گزیں کا حق، (۲) ذہنی سرگرمیوں کی آزادی کے حقوق مثلاً عقیدہ، ضمیر اور مذہب کی آزادی، فکری اور نظریاتی آزدای کے حقوق، اظہار رائے، جلسہ وجلوس اور جماعت سازی کی آزادی، اور (۳) عملی سرگرمیوں کی آزادی کے حقوق مثلاً معاہدہ کرنے کی آزادی، کاروبار کی آزادی، نجی جائداد کی خرید وفروخت کی آزادی، شادی بیاہ کرنے اور خاندان بسانے کا حق، وغیرہ۔

(۲) مساوات کے حقوق: اس زمرہ میں کم از کم چھ حقوق آتے ہیں: (۱) قانونی مساوات یعنی قانونی مرتبہ کی مساوات کا حق (۲) عدالتی کارروائی میں دوسروں کے مساوی قانونی سلوک پانے کا حق اور قانون کے تحت مساویانہ تحفظ پانے کا حق (۲) ٹیکسوں کی ادائیگی میں دوسروں کے مساوی سلوک پانے کا حق (۳) دوسروں کے برابر سماجی مواقع پانے کا حق (۴) دوسروں کے برابر سرکاری ملازمتوں، سیاسی عہدوں اور سرکاری اعزازات میں حصہ پانے کا حق (۵) سیاسی مساوات یعنی ملکی سیاست میں دوسروں کے برابر نمایندگی اور حصہ داری پانے کا حق، سرکاری حکام سے اپنی شکایات کا ازالہ کرانے کا حق اور استبداد وبدعنوانی کے خلاف مناسب طریقہ پر حدود کی رعایت کے ساتھ احتجاج، سول نافرمانی اور ستیہ گرہ کرنے کا حق۔

(۳) فلاحی خدمات پانے کا حق: فرانسیسی ماہر قانون لیوں ڈیوگوئی نے اخوت کے بجائے ''سماجی سا لمیت'' کی اصطلاح استعمال کر کے افراد کے تین فلاحی حقوق اور ان کے متوازی سرکار کے تین بنیادی فرائض متعین کئے ہیں، یعنی (۱) تعلیم پانے کا حق (۲) بوقت ضرورت سرکاری امداد پانے کا حق اور (۳) روزگار اور ذریعۂ معاش پانے کا حق، اخوت یا تعاون کا اصول نہ صرف سرکاری امداد اور معیشت کو، بلکہ سماجی زندگی کے تمام دوسرے زمروں کو بھی محیط ہے، اس کے مطابق افراد کو ہر میدان میں اپنی ذہنی ومادی بہبود کے لئے درکار تمام سہولیات اور خدمات پانے کا حق ہے۔

(۴) نجی ملکیت کے حقوق: فطری حقوق اور انسانی حقوق کے اب تک کے تمام اعلانات میں نجی ملکیت کے حقوق کو نمایاں جگہ دی گئی ہے، قدیم زمانہ سے آج تک سیاسی مفکروں کی اکثریت نجی ملکیت کو فرد کی مسرت اور بہبود کے لئے لابدی قرار دیتی ہے (مبادی سیاسیات: باب ۴، شہریت اور شہری حقوق وفرائض، حقوق کی زمرہ بندی کا بیان، ص: ۷۱-۷۸، ط: قاضی پبلیشرز ودسٹری بیوٹرز دہلی)۔

ابھی تک سطور بالا میں جو کچھ حقوق ذکر کئے گئے ہیں اس کو ذیل میں بالترتیب ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

انسانی حقوق کے نظریہ کے پیچھے فلسفہ یہ ہے کہ انسان کو انسانی زندگی گذارنے کے لئے کچھ آزادی، کچھ وقار اور کچھ حقوق چاہئے، جن کی عدم موجودگی میں کوئی بھی انسان انسان کی طرح نہیں جی سکتا، یہ حقوق ہر انسان کو صرف انسان ہونے کی حیثیت سے ملتے ہیں۔

اسلام نے شروع سے ہی حقوق انسان میں بے حد دلچسپی لی، یہ دلچسپی ملکی سطح پر تھی، چونکہ دور نبوی ﷺ میں جزیرۃ العرب (ملک) تک اسلام کا پھیلاؤ ہوا تھا، اس لئے ملکی سطح پر قوانین بیان کردیئے گئے، پھر خلفائے اربعہ کے دور میں اسلام نے ملکی سطح سے باہر قدم رکھے اور عالمی سطح پر پھیلنے لگا، تو خلفاء نے اپنے اپنے دور میں اجتہاد کرکے جو عملی قوانین جاری کئے، آج کل اقوام متحدہ بھی ایسے حقوق میں کاغذی سطح پر دلچسپی لے رہی ہے، ان قوانین میں سے کچھ درج ذیل ہیں:

ہر فرد کو زندگی، آزادی اور ان دونوں کے تحفظ کا پورا حق ہونا چاہئے۔

کسی بھی انسان کو ایذا، ظلم اور غیر انسانی سلوک کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔

ہر فرد کو ایک انسانی پہچان دی جائے گی جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کا نام اور انفرادی پہچان ہوگی۔

قانون کے سامنے ہر فرد برابر ہوگا، کسی قسم کا ترجیحی سلوک حقوق انسان کی سخت خلاف ورزی ہوگی۔ جیسے حضرت علی کا مقدمہ قاضی شریح کی عدالت میں پیش ہوا، تو امیر المؤمنین ہونے کے باوجود قاضی صاحب نے خصمین کے درمیان مساوی سلوک کیا اور خلیفۂ وقت کے ساتھ امتیازی سلوک نہ کیا۔

ہر فرد حقوق انسان اور بنیادی حقوق دونوں کے استحصال کے خلاف ملک کی اعلی ترین عدالت میں جا سکتا ہے۔ جیسے مہر کے باب میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کے خلاف فوراً ایک خاتون نے اسی مقام پر اپنی رائے قرآنی آیت کو مستدل بنائے ہوئے پیش کیا، حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ وقت تھے، اور قاضیوں کی تقرری وہ خود ہی کرتے تھے، گویا قاضی القضاۃ بھی تھے۔

بغیر کسی وجہ کے کسی کو نہ قید کیا جائے گا نہ نظر بند اور نہ جلاوطن ہی کیا جائے گا۔

ہر قسم کی حراست میں بند ہر انسان کو صاف ستھری مساوات پر مبنی اور غیر جانبدار عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا جیسے جنگی قیدیوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرنا اور صحابہ کو ان قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی تائید۔

اپنی ریاستی حدود میں کہیں بھی رہنے یا سفر کرنے کا حق ہر کسی کو حاصل ہوگا، جیسے صلح حدیبیہ کی قرارداد کے مطابق

راستے پرامن بنائے گئے؛ تاکہ لوگوں کو آمدورفت میں سہولت رہے۔

دوسرے ممالک میں پناہ اور تحفظ حاصل کرنے کا بھی ہر شخص کو حق ہوگا، جیسے صلح حدیبیہ میں ایک دفعہ یہ بھی شامل کی گئی، مگر کافروں نے غلبہ کی وجہ سے من جانب واحد اس کو منظور کیا۔

ہر فرد کو شہریت کا حق حاصل ہوگا ، نہ کسی کی شہریت زبردستی غصب کی جائے گی اور نہ ہی نیشنلٹی Nationality تبدیل کرنے سے روکا جائے گا۔

ہر فرد شرکت میں یا ذاتی طور پر جائداد خرید سکتا ہے، کسی کو اس کی جائداد سے جس کا وہ قانونی طور پر مالک ہے؛ بلاوجہ محروم نہیں کیا جائے گا۔

ہر فرد کو اپنے اصول اور نظریہ اپنے ضمیر اور مذہب کی روشنی میں رکھنے کی پوری آزادی ہونی چاہئے ، اس کا اظہار کرنے کا بھی پورا موقع اسے میسر ہونا چاہئے۔

ہر فرد کو آزادیٔ رائے اور اظہار خیال کی پوری آزادی ہونی چاہئے؛ لیکن اس سے کسی کی عزت وآبرو، ذاتی زندگی، خاندانی و پرائیویٹ معاملات میں رائے زنی سے بچا جائے۔ جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سامنے خاتون کا واقعہ، جس نے مہر کے باب میں اپنی رائے فوراً پیش کردی۔

آج کے جمہوری طرز کے مطابق ہر فرد کو پرامن طور پر ملنے، انجمن بنانے اور مظاہرہ کرنے کا حق ہونا چاہئے، لیکن کسی کو کسی انجمن کا ممبر بننے کے لئے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

اپنے ملک میں ہونے والے سیاسی واقعات اور سرکار کے انتخاب میں حصہ لینے کا ہر ایک کو اختیار رہے۔ جیسے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے انتخاب کے وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا ہر ایک کی رائے جاننا۔

اپنی حکومت کے تحت چلنے والی خدمات اور رفاہی امور پر ہر ایک کا برابر حق ہے۔

جمہوری طرز کے صحیح اور صاف ستھرے انتخابات ہونا بھی ہر ایک فرد کا حق ہے اور ان میں حصہ لینا بھی بنیادی انسانی حق ہے۔

ہر فرد کو کام کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے ، بے روزگاری سے تحفظ بھی اس میں شامل ہے، ہر فرد کو اپنے کام کرنے کے سلسلہ میں ٹریڈ یونین کا ممبر ہونے، ٹریڈ یونین قائم کرنے اور اس میں حصہ لینے کا پورا حق ہونا چاہئے۔

ہر فرد کو کام کے ساتھ آرام اور تفریح کا بھی پورا حق حاصل ہونا چاہئے، اس میں کام کے گھنٹوں اور چھٹیوں کا معاملہ بھی شامل ہے۔

ہر فرد کو ایک خوش حال معیار زندگی کا حق حاصل ہونا چاہئے، اس میں روٹی، کپڑا، مکان، دوا اور سماجی تحفظ شامل ہے، اس کے علاوہ زچگی اور حمل کے دوران خصوصی دیکھ بھال اور بچے کی صحیح پرورش کا پورا حق ہر عورت اور بچے کو حاصل ہونا چاہئے، جبکہ بچہ شادی شدہ تعلقات سے پیدا ہوا ہو اور اگر شادی کے بغیر پیدا ہوا تو بھی بچہ کو حق پرورش ملنا چاہئے، چاہے عورت کو اس کے جرم کی پاداش میں سزا عائد کی جائے؛ البتہ سزا میں پرورش کی مدت تک تاخیر ہونی چاہئے۔ جیسے ایک خاتون (امرأۃ غامدیہ) نے خدمت نبوی میں آکر اقرار زنا کیا تو آپ نے وضع حمل تک حد مؤخر کی، وضع حمل کے بعد وہ خاتون پھر حاضر ہوئی تو آپ نے بچہ کی پرورش تک حد مؤخر کی اور بچہ کی پرورش کی طرف توجہ دی۔

"**وإذا زنت الحامل حدّها الجلد لم يجلد حتی تتعالیٰ من نفاسها أی ترتفع يريد به تخرج منه؛ لأن النفاس نوع مرض فيؤخر إلى زمان البرء بخلاف الرجم؛ لأن التأخير لأجل الولد، وقد انفصل، وعن أبي حنيفة رحمه الله أنه يؤخر إلى أن يستغني ولدها عنها إذا لم يكن أحد يقوم بتربيته؛ لأن في التأخير صيانة الولد عن الضياع**" (ہدایہ: کتاب الحدود، ص: ۵۱۳، ج: ۲)۔

ہر فرد کو تعلیم حاصل کرنے کا حق ہونا چاہئے، بنیادی تعلیم فراہم کرنا جمہوری حکومت کا فرض ہے۔

ہر فرد کو اپنی تمدنی زندگی گزارنے کا اور سائنسی ایجادات سے ہونے والے فوائد حاصل کرنے کا پورا حق ہونا چاہئے، اپنی ایجادات اور دریافتوں سے ہونے والے معاشی اور اخلاقی فوائد کے تحفظ کا اختیار بھی اس میں شامل ہے۔

مقامی اور عالمی سطح پر دی جانے والی آزادی پر بھی حق ہونا چاہئے، تاکہ ان تمام حقوق پر عمل ممکن بنایا جا سکے۔

تمام عالم انسانی کے لئے ہر فرد کے مختلف سطح پر فرائض بھی ہیں؛ جو دوسروں کے حقوق انسانی کے تحفظ کی گارنٹی دیتے ہیں، اس طرح انسانی حقوق پر مبنی معاشرہ عالم میں وجود میں آتا ہے، جو کہ دراصل ہر فرد کو اس کی شخصیت کی ترقی کے مواقع فراہم کرتا ہے، اس طرح ہر فرد فرائض اور حقوق کے ذریعہ فلاح انسانی کے ایک خاص معیار کو حاصل کر سکتا ہے۔

اور آج کل کے اکثر ملکوں کے حالات کے پس منظر میں ان حقوق انسان کی اس طرح تاویل نہ کی جائے کہ امن، آشتی، آزادی اور دوسرے کے حقوق کا استحصال ہونے لگے، دوسرے الفاظ میں اپنی کلچرل آزادی دوسروں کے لئے دہشت گردی نہ بن جائے (جامع اردو انسائکلو پیڈیا، ص: ۹۵، ج: ۳)۔

(۵) سوویت یونین کی طرف سے "پناہ حاصل کرنے کا حق" بھی دیا گیا ہے، لیکن یہ کاغذی سطح پر ہے، "جس کی لاٹھی اس کی بھینس" کے اصول کے تحت بہت سے ممالک میں پناہ حاصل کرنے والوں کو کالمعلقہ کر دیا ہے، لیکن یہ عالمی ادارہ خاموش ہے، اسلام میں یہ اختیار انسان دوستی اور مظلوم سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہے، جو انتہائی قابل تعریف ہے؛ حتی کہ جنگ

کے مواقع پر پناہ لینے والوں کو بھی پناہ دی گئی ہے؛ حالانکہ وہ دشمنی میں مقابلہ کے لئے آئے تھے۔

احقر کی رائے اس باب میں یہ ہے کہ ان کو اوپر ذکر کردہ حقوق میں سے ہر قسم کے حقوق ملے، صرف سیاسی حقوق میں ووٹ دہی کا حق اور عدالتی چارہ جوئی کا حق ملے، بقیہ حقوق نہ دیئے جائیں، اور اگر پناہ گزیں ایک ہی جگہ پر آباد ہیں، تو انہیں میں سے کسی آدمی کو وہ لوگ چن کر ایوان میں بھیجیں، تاکہ وہ آدمی پناہ گزیں کے مسائل ایوان میں رکھ سکے۔

(۶) جس غیر مسلم ملک میں کوئی مسلمان قیام کرنا چاہتا ہے، قانونی اور اسلامی طور پر ایک مؤمن کے لئے وہاں کی صورت حال کیا ہے؟ وہاں قیام کا سبب اور محرک کیا ہے؟ یہ دونوں باتیں جاننا بھی ضروری ہے؛ تاکہ اس کے مطابق حکم معلوم کیا جاسکے۔

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں:

کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک میں اس ملک کے باشندے اور شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقل مسکن بنالینا، ایک ایسا مسئلہ ہے، جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کی اغراض ومقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوجاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا اس کو جیل میں ظلماً قید کرلیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو، ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہ وہاں جاکر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے اور وہاں رائج شدہ منکرات وفواحشات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے گا۔

(۲) اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی حالات سے دوچار ہوجائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں؛ حتی کہ وہ نان جویں کا بھی محتاج ہوجائے، ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے، جس کی بناء پر وہ وہاں رہائش اختیار کرلے تو مذکورہ بالا شرائط کے ساتھ اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فریضہ ہے، جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی؛ بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو؛ چنانچہ قرآن کریم کی ایک آیت ہے:

”هو الذى جعل لكم الأرض ذلولا فأمشوا في مناكبها وكلوا من رزقه ، وإليه النشور“ (سورۃ ملک:۱۵)۔

(وہ ایسی ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کردیا، اب تم اس کے راستہ میں چلو اور خدا تعالیٰ کی دی ہوئی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہوکر جانا ہے)۔

(۳) اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا، اس نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا صرف یہ نہیں کہ جائز ہے؛ بلکہ موجب اجر وثواب ہے، چنانچہ بہت سے صحابہ اور تابعین رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی اور جو بعد میں ان کے فضائل ومناقب اور محاسن میں شمار ہونے لگی۔

(۴) اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں، جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوشحالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات ومنکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے اور بلاضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش وعشرت اور خوش حالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں، ان میں دینی حمیت کمزور ہوجاتی ہے، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کے ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ سنن ابوداود میں حضرت سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے؛ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"من جامع المشرک وسکن معه، فإنه مثله"

جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے (ابوداؤد شریف: کتاب الضحایہ)۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

"أنا بريئی من كل مسلم يقيم بين اظهر المشركين، قالوا: يارسول الله ! لم؟ قال: لا تر اي نار اهما"۔

(میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا: یارسول اللہ ! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، تم یہ امتیاز نہیں کرسکو گے کہ یہ مسلمان کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے)۔

امام خطابیؒ حضور ﷺ کے اس قول مبارک کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''مختلف اہل علم نے اس قول کی شرح مختلف طریقوں سے کی ہے، چنانچہ بعض اہل علم کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اور مشرک حکم کے اعتبار سے برابر نہیں ہوسکتے، دونوں کے مختلف احکام ہیں اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دارالاسلام اور دارالکفر دونوں کو علیحدہ علیحدہ کردیا ہے، لہذا کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ملک میں ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ جب مشرکین اپنی آگ روشن کریں گے اور یہ مسلمان ان کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے ہوگا تو دیکھنے سے یہی خیال کریں گے کہ یہ بھی انہیں میں سے ہیں، علماء کی اس تشریح سے یہ بھی ظاہر ہورہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دارالکفر جائے تو اس کے لئے وہاں پر ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے (معالم السنن للخطابی: ص: ۴۳۷، ج: ۳)۔

اور مراسیل ابوداود عن المکحول میں روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو'' (تہذیب السنن لابن قیم: ص: ۴۳۷، ج: ۳)۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ صرف ملازمت کی غرض سے کسی مسلمان کا دارالحرب میں رہائش اختیار کرنا، اور ان کی تعداد میں اضافہ کا سبب بننا ایسا فعل ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہوجاتی ہے (تکملہ ردالمختار: ج: ۱، ص: ۱۰۱)۔

۵- پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دارالکفر کی شہریت اور قومیت کو دارالاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود و باش میں ان کا طرز اختیار کرکے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے، ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقا حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (فقہی مقالات: مقالہ: مغربی ممالک کے چند جدید فقہی مسائل، ص: ۲۲۲-۲۲۵، ج: ۱، ط: زم زم بک ڈپو دیوبند)۔

۷- متعدد زمانوں میں غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کیا گیا ہے اور ان کو حقوق بھی دیئے گئے ہیں، جو''ذمیوں کے احکام'' سے کتابوں میں معروف ہے،لیکن آج کل کے اسلام ومسلم دشمنی اور مسلمانوں سے عناد سے کوئی ناواقف نہیں ہے، ایسے میں کسی غیر مسلم غیر ملکی شہری کو ایک طویل مدت کے لئے ویزا (امان) دینے میں اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ وہ جاسوسی اور سازشیں کرنے لگے اور اس کی آمد مسلمان ملکوں کے لئے یا ان کے کئی اہم مسائل کے لئے خطرہ بن جائے،تو اگر طویل مدتی ویزا میں جب یہ خطرہ ہے تو ایک شہری کی حیثیت سے آباد کرنے میں یہ اندیشہ دو چند ہوسکتا ہے،اس لئے کچھ جزوی حالات میں کڑی شرائط کے ساتھ آباد کرنے کی گنجائش دی جائے؛لیکن انہیں حساس شعبے،لشکر، حکومتوں کے اعلی شعبے ومناصب وغیرہ میں ملازمتیں نہ دی جائیں اور ان کی خاص نگرانی رکھی جائے۔

خلاصۂ بحث:

۱- ایک مخصوص مدت تک قیام کو شہریت کے حصول کے لئے بنیاد بنانا بہتر معلوم ہوتا ہے۔

۲- اگر اس مسلم کے لئے جس مسلم یا غیر مسلم ملک میں آباد ہے وہاں عبادات پر روک ہے، یا شعائر پر پابندی ہے یا برسراقتدار کسی خاص فرقہ ضالہ کا ہمنوا ہے، اس لئے دوسری جماعت کے لوگوں پر ظلم دھایا جاتا ہے،تو ایسے مسلمان کی درخواست کو قبول کرنا دوسرے مسلم ملک پر ضروری ہونا چاہئے۔

اور اگر اسے اس طرح کی کوئی پابندی نہیں ہے،عبادات بھی کھلے عام ادا کرسکتا ہے،صرف اپنے ایک شوق اور خواہش میں دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے،تو شرعاً اس کی درخواست قبول کرنا ضروری نہ ہونا چاہئے۔

۳- انہیں شہری تسلیم نہ کیا جانا مناسب معلوم نہیں ہوتا ہے۔

۴- وہ حقوق درج ذیل ہیں:

۱-مثبت حقوق: اس کے ضمن میں چار (۴) حقوق ہیں۔

۲-سیاسی حقوق: اس کے تحت چھ (۶) حقوق ہیں۔

۳-معاشی حقوق: اس میں چار (۴) حقوق ہیں۔

۴-شخصی حقوق: اس میں سات (۷) حقوق شامل ہیں۔

۵-نجی افراد وگروہوں کے خلاف حقوق: اس میں چھ (۶) حقوق مندرج ہیں۔

کوئی آدمی مزید تحقیق کرے تو اور بھی حقوق بیان کرسکتا ہے،اور اجمالی طور پر بیان کرے تو اس میں کمی وبیشی کرسکتا

ہے،ان سب حقوق کی تفصیل جواب نمبر ۴ (چار) کے جدول میں مذکور ہے۔

۵- سیاسی حقوق میں سے صرف ووٹ دہی کا حق اور عدالتی چارہ جوئی کا حق دیا جائے، باقی حقوق میں سے سب دیئے جائیں، جیسے مثبت حقوق، معاشی حقوق وغیرہ۔

۶- اس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کی اغراض ومقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوجاتا ہے۔

اگر کسی مسلمان کو اپنے مسلم ملک میں بغیر کسی جرم کے تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا قید وبند کی صعوبتیں دی جاتی ہوں یا اس کی جائدادیں ضبط کی جاتی ہوں اور اب غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی کوئی راہ نہ ہو تو اس کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہوجائے اور تلاش بسیار کے باوجود اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوتے ہوں اور دوسرے کسی غیر مسلم ملک میں جائز وسائل مل جاتے ہوں تو وہاں شہریت کے حصول کی اس کو اجازت ہونی چاہئے۔

اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں غیر مسلموں کے درمیان تبلیغ دین اور وہاں مقیم مسلمانوں کے درمیان اشاعت احکام شریعت کی غرض سے شہریت لینا چاہتا ہے تو ایسے آدمی کو بھی اجازت ہونی چاہئے۔

کوئی آدمی محض معیار زندگی بلند کرنے کے لئے یا محض دوسرے ملک کی شہریت کے حصول کی خواہش وجذبہ کی تسکین کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اسے اجازت نہ ہونی چاہئے۔

۷- جزوی حالات میں کڑی شرائط کے ساتھ درست ہونا چاہئے، لیکن انہیں حساس شعبہ اور سرکاری اعلی مناصب پر ملازمتیں نہ دی جائیں۔

☆☆☆

غیر مسلموں کو مسلم ملک میں شہریت دینا

مولانا ابوسفیان مفتاحی☆

۱- وطن وہ جگہ ہے جس میں انسان پیدا ہوا ہے، یا اپنے بچپن اور جوانی میں جہاں مقیم ہو اس جگہ کی محبت سے ربط وتعلق ہو اور اس کی طرف اور اس کے باشندوں کی طرف میلان ہو، نہ یہ کہ محدود حقوق کے بعد حاصل کرے۔

اور قرآن کریم نے لفظ مواطن ذکر کیا ہے اور مراد لیا ہے اس سے جگہیں بغیر ربط وتعلق کے، یہاں تک کہ مقام ولادت اور نشوونما کے تعلق کے بغیر، چنانچہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے: "**لقد نصركم الله فى مواطن كثيرة**" (بقرہ: ۲۵) یعنی بہت سی جگہیں جیسے مقام بدر جو وطن نہیں تھا بدلہ لینے والوں کی ولادت کا یا ان کی نشوونما کا، اور جیسے بقیہ غزوات غزوہ حنین سے پہلے (المواطنہ فی الاسلام ۳-۴)۔

اسلام کا موقف شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے بلاشبہ اسلام اجتماعیت اور امت وقوم اور دولت و حکومت کو قائم کرتا ہے عقیدہ ودین کے تعلقات کی بنیاد پر، اور بہت کوشش کرتا ہے حقوق اخوت کو ثابت کرنے کے لئے بطور اصل ونظیر بنانے کے اور اس کے مطابق بنانے اور تاثیر کے، چنانچہ اللہ تعالی نے فرمایا ہے: "**انما المومنون إخوة**" (سورۂ حجرات: ۱۰) اس واضح انحصاری طریقہ سے تمام مسلمانوں پر بھائی چارگی کے حقوق کو فرض کرتا ہے، یعنی محبت و ہمدردی، اور نفرت و تعاون باہمی، اور آپس میں ایک دوسرے کا کفیل و ضامن ہونا، چنانچہ اللہ تعالی فرماتا ہے: "**والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض يأمرون بالمعروف وينهون عن المنكر، ويقيمون الصلوة ويؤتون الزكوة ويطيعون الله ورسوله أولئک سيرحمهم الله إن الله عزيز حكيم**" (سورۂ توبہ: ۷۱)، بلکہ اللہ تعالی نے بیان کیا ہے اس محبت و ہمدردی کی ضرورت کو جو ایمان پر جامع ہے اس کی حمایت وحفاظت کے لئے اور عدوان ودشمنی کے دفاع کے لئے اور وہ محبت و ہمدردی جو کفر ونفاق پر جامع ہے قضاء وفیصلہ کے لئے اسلام ومسلمانوں پر تو اللہ تعالی نے فرمایا ہے: "**والذين كفروا بعضهم أولياء بعض إلا تفعلوه تكن فتنة فى الأرض وفساد كبير**" (سورۂ

☆ صدر مدرس مفتاح العلوم مئو۔

انفال:۷۳)،اور رسول اللہ ﷺ کی سنت نے فیض جاری کیا ہے اس ایمانی بھائی چارگی اور اس کے حقوق و آثار کے سلسلہ میں (مراجع کتاب ریاض الصالحین)۔

اسلام نے رعایت کی ہے شہریت کے سلسلہ میں ایجابی وانسانی جہتوں کی اور اس ایمانی بھائی چارگی کے ساتھ جو جامع ہے تو اس لئے کہ اسلام نے بیکار نہیں چھوڑا ہے ان ایجابی پہلوؤں کو جو قومیت وشہریت کو علاحدہ کرنے وفرقہ بندی کرنے اور تعصب سے دور ہے اس روشنی میں وطن وشہر اسلامی مفہوم میں وہ امت اسلامیہ کے لئے وطن کبیر ہے جہاں بھی رہے وطن بنائے اور شہریت والا مسلمان ہو کہ کافر وہندو اسلامی حکومت میں خلافت راشدہ سے دولت عثمانیہ کے زوال تک جہاں بھی رہتا اور گھومتا تھا عالم اسلامی کے طول وعرض میں بغیر کسی قید وشرط کے، پس اس کی جنسیت وقومیت اسلام ہو تو وہ جہاں بھی مقیم ہو وہی اس کا وطن وشہر ہے، اس کے لئے اس کے حقوق ہوں گے اور اس پر واجبات ہوں گے، پس مسلمان کی محبت اور تعلق اس کے اسلامی کبیر وطن کے لئے ہوگا۔

۲- اور اس کے ساتھ اسلام نے رعایت کی ہے انسان کے فطری پہلو کی، یعنی اس کی محبت اس کے وطن وشہر کے لئے جس میں وہ پیدا ہوا ہے، بلکہ اس کے اس ملک کے لئے ہے جس کی طرف وہ منسوب ہوتا ہے۔

پھر رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہؓ مکہ مکرمہ سے سخت محبت کرتے تھے، اور صحیح حدیث سے ثابت ہے نبی کریم ﷺ سے کہ آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ کو مخاطب کر کے فرمایا کتنا اچھا و پاکیزہ شہر ہے تو اور تو میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے اگر تیری قوم مجھ کو تجھ سے نہ نکالے ہوتی تو میں اس کے علاوہ شہر میں نہ رہتا، اور صحابہ کرامؓ نے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کرتے ہوئے مکہ مکرمہ کی جانب بہت محبت ظاہر کیا تھا تو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ کے بارے میں دعا کیا تھا: اے اللہ ہم کو محبوب کر دے مدینہ کو ہماری محبت کی طرح مکہ سے یا اس سے زیادہ: "**اللهم بارک لنا فی صاعنا، وفی مدنا وصححها لنا، وانقل حماها إلى الجحفة**" (رواہ البخاری) تو اللہ تعالی نے آپ ﷺ کی دعا قبول فرمایا تو ان کے اندر دلوں میں مدینہ کی محبت گاڑ دیا۔

ب-اعتبار کیا ہے اسلام نے کہ انسان کو اس کے ولادت کے وطن وشہر سے یا اس کے اس ملک سے جس کی طرف وہ منسوب ہوتا ہے نکالنا اللہ کی راہ میں قتال وجہاد کے اہم واسباب میں سے ہے، چنانچہ اللہ تعالی نے آیت کے شروع میں جہاد کے سلسلہ میں فرمایا ہے: "**أذن للذين يقاتلون بأنهم ظلموا وإن الله على نصرهم لقدير، الذين أخرجوا من ديارهم بغير حق إلا أن يقولوا ربنا الله، ولولا دفع الله الناس بعضهم ببعض لهدمت صوامع وبيع وصلوات ومساجد يذكر فيها اسم الله كثيرا ولينصرن الله من ينصره إن الله لقوى عزيز**" (سورۂ حج:۳۹،۴۰)۔

تو اللہ تعالی نے ذکر کیا ہے جہاد وقتال کے مشروع ہونے کا پہلا سبب وہ گھروں اور بستیوں سے نکالنا ہے اور اس سے تاکید ہے اس کی جس کو باقی رکھا ہے اللہ تعالی نے بقیہ انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کے لئے، چنانچہ ذکر کرتا ہے ہمارے لئے طالوت وجالوت کے قصہ میں اس حقیقت کو تو اللہ تعالی نے فرمایا: "**الم تر إلی الملأ من بنی اسرآئیل من بعد موسی إذ قالوا لنبی لهم ابعث لنا ملکا نقاتل فی سبیل الله قال هل عسیتم إن کتب علیکم القتال الا نقاتلوا قالوا ومالنا الا نقاتل فی سبیل الله وقد اخرجنا من دیارنا وابنآئنا فلما کتب علیهم القتال تولوا إلا قلیلا منهم والله علیم بالظالمین**" (بقرہ:۲۴۶)۔

ج- ذکر کیا ہے فرق کو اس مسلمان شہری کے درمیان جو اسلامی حکومت کے سایہ میں زندگی گذارتا ہے اور اس مسلمان کے درمیان جو اسلامی حکومت کے سایہ میں زندگی نہیں گذارتا، تو پہلے مسلمان کو حق ہوگا حمایت وحفاظت اور نصرت میں جو اسلامی حکومت پر معلق ہے اور دوسرا تو اس کے لئے ولایت ومحبت اور نصرت کا حق ہے، مگر اس قوم یا حکومت پر جس کے لئے عہد و میثاق ہے اسلامی حکومت کے ساتھ، چنانچہ اللہ تعالی فرماتا ہے: "**إن الذین امنواوهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم فی سبیل الله والذین أوواونصرواأولئک بعضهم أولیآء بعض، والذین آمنوا ولم یهاجروا مالکم من ولایتهم من شئ حتی یهاجروا وإن استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر إلا علی قوم بینکم وبینهم میثاق، والله بما تعملون بصیر**" (سورۂ انفال:۷۲)۔

اسلامی حکومت کے سایہ میں زندگی گذارنا فرض کرتا ہے بہت سے حقوق کو اس کے حقوق سے زیادہ جو حکومت کے خارج میں زندگی گذارتا ہے، یہاں تک کہ وہ رہے برحق مسلمان، تو اسلامی حکومت اس حالت میں معاملہ کرے گی عہود ومواثیق کے موافق اور اونچی مصلحتوں کے مطابق۔

د- شہر کا دستور: تم غافل نہ ہونا عقیدہ کے تعلق کی جانب سے، ساتھ ہی وطن وشہر بنانے کے تعلق سے، اور زندگی گذارنے کے تعلق سے ایک مشترک وطن میں تعلق کی دو قسمیں ہیں: ۱- ایک عقیدہ والا تعلق، چنانچہ یہود ایک امت ہیں، اور تمام مسلمان ایک امت ہیں، یعنی عقیدہ ودین اور علامات کی امت۔

۲- وطن وشہر میں شرکت کا تعلق کہ یہود بنی عوف ایک امت ہیں مؤمنین کے ساتھ ہیں، یہود کے لئے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین ہے، پھر ذکر کیا یہود بنی نجار وغیرہ کے بقیہ قبائل کو اس طرح ثابت کیا گیا ہے کہ تمام مسلمان اور یہود ایک امت ہیں تو ان مسلمین ویہود کی دعوت اور ایک ہونے کو ثابت کرنا صرف ممکن ہے اس تعلق کے درمیان جو جامع ہے، اور تمام کو سمیٹ لیتا ہے اور اس کو ہمارے موجودہ زمانہ میں رباط مواطنہ نام دیا جاتا ہے، ایک ہونے کا مطلب

ہے کہ تمام مسلم و یہود ایک سیاسی نظام میں شریک ہیں ان کے اہل کتاب ہونے کے اعتبار سے برابر کے حقوق ہیں (المواطنۃ فی الاسلام للدکتور علی محی الدین القرہ داغی ۸/۱۰)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے مسلمان کے لئے اخوت ایمانی بنیاد ہے، اور بود و باش اختیار کر لینا، وہاں معاشی سرگرمیاں انجام دینا، ایک مدت تک وہاں قیام کرنا بھی بنیاد ہوسکتا ہے، اس شرط کے ساتھ کہ وہ شخص مسلم حکومت کی آفس میں درخواست پیش کرے اور حاکم اس کو تسلیم کر کے دستخط کر دے اور اپنے مہر لگادے، بہر حال غیر مسلم کے لئے درخواست پیش کرنا اور منظوری دستخط و مہر کے ساتھ شہری ہونے کے ضروری بنیاد ہے۔

کسی مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا:

ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اس دوسرے ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعا ضروری ہے اور اگر وہ مسلمان ہے تو اس شرط سے کہ وہ فساد اور بغاوت کا مزاج نہ رکھتا ہو اس کی تحقیق کرنا ضروری ہے، اور اگر وہ غیر مسلم ہے اور مزاجا شریف ہے، فساد و بغاوت کا ذہن نہیں رکھتا، تو مسلم حکمراں اس کی درخواست قبول کر سکتا ہے، اور اگر مسلمان غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا چاہے تو حاکم غیر مسلم کو اختیار ہوگا کہ درخواست قبول کرے یا نہ کرے اور اگر غیر مسلم دوسرے غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا چاہے تو غیر مسلم حاکم اپنے شہریت کے قانون کی رعایت کرے گا، قانونا شہریت دینے کے لئے اس کو اختیار ہوگا۔

۳- بعض دفعہ کسی خاص خطہ میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے اور وہاں کے مسلمان کسی اور مسلم ملک کی پناہ لیتے ہیں تو انہیں پناہ گزیں کا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن انہیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا تو شرعا ان کے ساتھ حسن سلوک و عمل خیر اور نفع پہنچانا واجب ہے، **"تعاونوا علی البر والتقوی"** (سورۂ مائدہ: ۲)، اللہ تعالی نے واجب کیا ہے کہ وہ محل تعاون ہیں تو ان کے ساتھ بر و حسن وسلوک اور عمل خیر، نفع پہنچانا اور تقوی کا تعاون کیا جائے اور اس کے بعد آزادی کو مطلق رکھا تعاون کرنے والوں کے ساتھ، اس طرح کے مسلمان کے لئے جائز ہے کہ تعاون کرے تمام کے ساتھ جب تک تعاون کا محل بر و تقوی باقی ہے، اسی لئے اللہ تعالی نے تعاون کرنے والوں کی کوئی تحدید نہیں کی اور اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے اس تعاون کی اہمیت کو بیان کیا مشرکین جاہلین کے ساتھ بھی جس وقت فرمایا: **"لقد شهدت في دار عبد الله من جدعان حلفا ما أحب أن لي به حمرا النعم ولو أدعى به في الإسلام لاجبت"** (رواہ البیہقی فی السنن الکبری ۶/۳۶۷، المعارف لابن قتیبہ ص ۶۰۴)۔

اسی طرح زعماء قریش نے دیکھا کہ یہاں کچھ مظلوم لوگ ہیں اور محتاج ہیں جو محتاجگی کی وجہ سے مرجائیں گے اور عاجز و کمزور ہیں جن کی کوئی مدد نہیں کرتا تو فطرت سلیمہ ان میں حرکت میں آئی تو زعما قریش حلف الفضول میں اکٹھا ہوئے

بعثت سے پہلے اور معاہدہ کیا اس پر کہ وہ کمزور کی مدد کریں گے اور عاجز کی فریادرسی کریں اور محتاج کی مدد کریں گے اور مہمان کی مہمان نوازی کریں گے، اور یہ سب چیزیں مکارم اخلاق سے ہیں۔

مسلم اقلیت کے لئے قرآن وسیرت میں دو نمونے ہیں دونوں کو رہنما رہنا چاہئے۔

اور جس وقت ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں تو پاتے ہیں کہ قرآن نے ایک بہترین نمونہ مسلمان شخص کے لئے ذکر کیا ہے جس کو کہ حالات زمانہ نے چھوڑ رکھا ہے، کیونکہ جو مسلمان غیر مسلم سماج میں زندگی گذارتا ہے اور وہ نمونہ سیدنا یوسفؑ ہیں، جیسا کہ کتب سیرت نے ذکر کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ مرد اور عورتوںؓ کی ایک کثیر تعداد نے حبشہ کی طرف ہجرت کیا اور زندگی گذارا مناسب موقع تک، اسی لئے ہم پر لازم ہے کہ کچھ چیزیں ان دونوں نمونوں کی ذکر کریں۔

پہلا نمونہ: اللہ کے نبی یوسف علیہ السلام کا ہے قرآن نے اس کی مکمل تفصیل ذکر کی ہے ہم اس کا خلاصہ ذکر کر رہے ہیں کہ انہوں نے مصر میں زندگی گذارا، اپنے دین وعقیدہ اور اخلاق کی حفاظت کرتے ہوئے اور اللہ کے فضل وکرم سے شہوتوں کی جانب پھسلے نہیں امرأہ عزیز کے سخت حملہ علی الرغم جس کو قرآن کریم نے بیان کیا ہے: ”**وغلقت الأبواب وقالت هيت لک قال معاذ الله إنه ربی أحسن مثوای إنی لا يفلح الظالمون** (سورۂ یوسف: ۲۳)۔

اس پس منظر میں واجب ہے مسلم اقلیت پر کہ رہنمائی لے حضرت یوسف علیہ السلام سے اس بات میں کہ مسلم اقلیت کی بڑی فکر اور سوچ اپنے دین وعقیدہ اور اخلاق کی حفاظت ہو اس مقصد کو ثابت کرنے کے لئے، اور یہاں ظاہر ہوتا ہے ثبات قدمی اور حفاظت کا دور تنظیم وافراد پر، ورنہ تو کوئی قیمت نہیں ہے کسی دینوی مقصد کبیر وعظیم کی، جبکہ دین اور اخلاق ضائع ہو جائے، اور اسی کی وضاحت سیدنا یوسف علیہ السلام نے کی .... تو اگر لوگ انہیں کے مثل کر لیں تو عالم کا بڑا حصہ اسلام میں داخل ہو جائے گا، جیسا کہ داخل ہوئے ہیں مشرق ایشیاء کے قبیلے تجار مسلمین اور ان کے اخلاق سے متاثر ہو کر اور ان کی دعوت سے متاثر ہو کر۔

دوسرا نمونہ مہاجرین الی الحبشہ کا:

اصحاب سیر رحمہم اللہ نے ذکر کیا ہے کہ قریش نے جب زیادہ کر دیا رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کے ساتھ ایذاء پہنچانا اور عذاب دینا اور تنگ کرنا مکہ مکرمہ میں تو رسول اللہ ﷺ نے بعض صحابہ کرامؓ کو ہجرت کی اجازت دے دی، جیسا کہ تاریخ ابن کثیر میں ہے۔

تمام غیر مسلمین (کفار وہنود) برابر نہیں ہوتے، پس بعض ان میں سے شریف اچھے عادل ہوتے ہیں دنیوی معاملات میں اور ان میں سے بعض مسلمان کو قبول کرتے ہیں، تا کہ اس کے ملک وشہر میں رہے، پس اس کا ٹیکس وغیرہ ادا

کرے، اوران میں سے بعض اس کے سوا شریر ہوتے ہیں اوراس لئے جائزنہیں ہے ان میں قانون برابر۔

(پس غیر مسلم ملک سے ترک وطن مناسب نہیں ہے، پس معروف طریقہ سے اپنے حقوق کا مطالبہ کریں تو ضرور ملے گا، جیسا کہ ہندوستانی مسلمانوں کو یہی سابقہ پڑتا ہے اوران کو حقوق دیئے جاتے ہیں)۔

اقلیت کے لئے حق ہے کہ وہ اونچے مناصب پر اور وزارتوں وغیرہ میں آئے، جیسا کہ ہندوستان میں ہے، پس ترک وطن غیر مناسب ہے۔

مسلمان مکلّف ہے زندگی بنانے کا ہر جگہ میں، چنانچہ حضرت یوسفؑ قائم رہے باعتبار فعل عظیم زندگی کے بنانے میں غیر مسلم حکومت میں۔

تو اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان ہر ملک میں شرعا رہ سکتا ہے اگر قانونا بھی ہے اور اگر نہیں ہے تو اس ملک سے اجازت لینا ضروری ہے۔

مادر وطن کو نہ بھولنا اور محبت و ہمدردی اس کے لئے باقی رکھنا اس کے باشندوں کے ساتھ احسان کو مقدم رکھتے ہوئے اور اسی کو کیا ہے، حضرت یوسفؑ نے، جب کہ انہوں نے اپنے بھائیوں کی مدد کی اور ان کے ساتھ احسان کیا عطیہ اور کھانے پینے کی چیزوں کو دے کر پھر اپنے والدین اور بھائیوں سے طلب کی کہ وہ لوگ مصر میں اکرام وعزت اور امان کے ساتھ داخل ہوجائیں (سورۂ یوسف:۹۹)۔

اس کے ملک والوں کی بدسلوکیوں کو بھول جانا عوام کی طرف سے ہو یا حکام کی طرف سے، یہ عظیم رہنما نمونہ ہے ہر مسلم اقلیت کے لئے تمام عالم میں کہ حضرت یوسفؑ کے مثل ہوکر معاملہ کریں اپنے اس وطن کے ساتھ جس میں پناہ لئے ہیں اور اپنے پہلے وطن کے ساتھ اس کے اس باشندوں کے ساتھ جنہوں نے بدسلوکی کی ہے ان میں رہ کر لمبی عمر گذارنا بہت محبوب اور افضل ہے اس معصیت وگناہ میں پڑنے سے جو اللہ تعالی کے غضب کی طرف پہنچائے تو تمہارا کیا حال ہوگا کفر وارتداد میں پڑنے سے، یعنی پناہ گزیں کا درجہ دیا جانا بہتر ہے معصیت یا کفر وارتداد میں پڑنے سے۔

ہر محسن کے لئے وفادار ہونا اگرچہ کافر ہندو ہو، جس طرح عزیز مصر نے حضرت یوسفؑ کو خرید کر احسان کیا اور عزیز مصر کی عورت نے جب ان کو اپنی طرف ورغلایا تو حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت اس احسان کو نہ بھولے (تو پناہ گزینوں کو پناہ دینا احسان ہے اس پر شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ اس مسلم حکومت کا احسان ہے)۔

۴- اہل شہر کے لئے ظلم نہ ہونا یہاں تک کہ اگر بعض اہل شہر کی طرف سے یا ان کے حکام کی طرف سے اوران کی حکومتوں کی طرف سے مہاجر یا اقلیت کے لئے ظلم کا وقوع ہوجائے اسلامی حکومت کی طرف سے تو محض ظلم کے مقابل میں ظلم نہ

ہونا چاہئے، حضرت یوسفؑ نے اسی کو کہا ہے: ''إنه لا يفلح الظالمون'' (سورۂ یوسف: ۲۳)۔

اوراس میں قوی تردید ہے ان بعض مہاجر مسلمانوں پر جو زیادتی کرتے ہیں یورپی یا امریکی حکومتوں کے مالوں پراس طرح کہ یہ ظالم حکومتیں ہیں مسلمانوں کے مالوں کو لیا ہے تو جو ہم لیتے ہیں وہ بدلہ ہے ان کا تو یہ کمزور سمجھ ہے مخالف شرع ہے۔

دوسرے ملک کو وطن بنانا اور اس وطن کی محبت جس میں اس نے زندگی گذارا ہے تو سیدنا یوسفؑ ان صورتوں کی طرف سے تنگی کئے جانے کے باوجود نہیں فرمایا کہ یہاں سے ہجرت کر جانا یا نکل جانا میرے نزدیک زیادہ محبوب ہے (سورۂ یوسف: ۳۳)۔

اور یہ دلیل ہے اس پر کہ انہوں نے مصر کو وطن بنایا اور اس کو محبوب رکھا اور جیل میں رہنے کو اس سے نکلنے پر ترجیح دیا اور اس سے زیادہ کیا کہ انہوں نے مطالبہ کیا کہ بادشاہ ان کو بنادے زمین کے خزانوں پر، تاکہ خدمت کریں مصر کے شعبوں کی، بلکہ اپنے والدین اور بھائیوں کو لائے مصر، تاکہ وہ لوگ اسی میں وطن بنائیں باوجودیکہ مصر دین ابراہیمی پر نہیں تھا (پس پناہ گزینوں کو اپنے ملک سے ہجرت نہ کرنا چاہئے، بلکہ باوجود ظلم کے ڈٹے رہنا چاہئے)۔

خلاصہ کلام یہ کہ مسلم اقلیت جہاں بھی رہے وجوبی طور پر اپنے دین کے عقائد سے نہ اترے اور اس کے خلاف کو قبول نہ کرے، دارالکفر، یعنی غیر مسلم کی طرف بھی ترک وطن کر کے جانا جائز ہے اور اس میں رہنا جائز ہے، اس جدید وطن ملک سے محبت جس نے ان کو پناہ دی ہے اور اس ملک کے دشمنوں کی جانب سے حملہ وانتقام پر غمگین نہ ہونا اور اس ملک کی نصرت کے لئے دعا کرنا اور اس جنگ میں تارک وطن کا شریک ہونا اور اس ملک کی مدد پر خوش ہونا۔

نیز مظالم کے باوجود کسی مسلم ملک میں پناہ لینے کے لئے ترک وطن نہ کرنا چاہئے، بلکہ وہیں کے عوام اور حکام حکومت کے ساتھ حسن سلوک کے ساتھ رہنا چاہئے اور حکومت کی وفاداری پر قائم رہنا چاہئے اور اپنے لوگوں کو اس پر ترغیب دینا چاہئے اور ہماری شریعت کا جو نمونہ ہے جو حجت ہے جس خطہ میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے رہتے ہیں اور ان کے تنگ کئے جانے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے تو کسی دوسرے مسلم ملک کی طرف ترک وطن کر کے پناہ لینا شرعا جائز ہے اور ان کی پناہ میں رہنا جائز ہے اگر وہ حکومت ان کو اپنا شہری تسلیم کر کے شہریت دے دے تو بہت بہتر، چاہے ان کی درخواست کے بغیر یا ان کی درخواست کی روشنی میں اور یہ بات جائز ہے کہ مسلمان تارکین وطن کو دوسرے مسلمان ملک میں اس ملک کے قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی سہولتیں دی جائیں۔

اور غیر مسلم ملک میں بھی ترک وطن کر کے پناہ لینا ہجرت کرنا اور اس میں باقی رہنا جائز ہے، ان نئے شہریوں کے

ذمہ اس جدید وطن کی محبت وہمدردی ہونی چاہئے اوران کی وفاداری کرنالازم ہے۔

۵- اسلامی نقطہ نظر سے ووٹ دینے کاحق انتخاب میں امیدوار ہونے کاحق، سرکاری اداروں میں ملازمت کاحق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کاحق، سرکاری ہسپتالوں میں علاج کاحق، روزگار کاحق، عدالتی چارہ جوئی کاحق، معاشی تگ و دوکاحق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کاحق وغیرہ یہ حقوق مانے جائیں گے۔

۶- شریعت اسلامی میں شہریوں کو جوحقوق حاصل ہوں گے وہ ذکر کئے جاچکے ہیں، اور پناہ گزینوں کو یہ حقوق حاصل نہیں ہوں گے۔

۷- کسی مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیرمسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہیں، بلکہ دارالکفر اور غیرمسلم کی طرف ہجرت کرنااوراس میں رہناجائز ہے، بغیراس کی شہریت اختیار کئے ہوئے، اس لئے کہ یہ صحابہؓ حبشہ میں رہے عام خیبر تک، یعنی فتح خیبر تک (البدایہ النہایہ ۴/۱۷۹، المعجم الکبیر للطبرانی ۲/۷۸، ۱۴، مجمع الزوائد ۶/۳۰)۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ کسی مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کے بغیر محض معاشی فوائد کی غرض سے غیرمسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہیں۔

۸- مسلم ملکوں میں غیرمسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا آج کے اس دور میں درست نہیں، کیونکہ وہ رفتہ رفتہ اپنی آبادی میں بڑھ کر مسلم ملکوں میں بغاوت وفساد کی آگ کا شعلہ بھڑکانا شروع کردیں گے اوراپنی آبادی کے بٹوارہ وعلاحدگی کے لئے مسلم ملکوں سے احتجاج شروع کردیں گے اورجس خطہ میں ان کی آبادی غالب ہوگی اور مسلمان کم ہوں گے تو وہ مسلمانوں کو مارنا پیٹنا تنگ کرنا شروع کردیں گے جس کی وجہ سے مسلم ملکوں کے حکمرانوں کی پریشانیاں بڑھ جائیں گی، یہاں تک کہ وہ مسلم افواج سے دوسرے غیرمسلم ملکوں کے تعاون سے جنگ شروع کردیں گے تومزید پریشانیاں بڑھ جائیں گی، خلاصہ یہ کہ آج کے اس دور میں غیرمسلموں کو مسلم ملکوں میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنادرست نہیں، جیسا کہ آج کا مشاہدہ شاہد عدل ہے اس پرخوب غورکرلیاجائے، جلدبازی نہ کی جائے۔

☆☆☆

اسلام میں حصول شہریت کی بنیاد اور موجودہ سیاسی نظام

مولانا خورشید انور اعظمی ☆

قدیم زمانے میں کسی ملک میں شہریت حاصل کرنے کا مسئلہ نہیں تھا، ہر شخص مکمل طور پر آزاد تھا کہ جہاں چاہے جائے اور جہاں چاہے سکونت اختیار کرے، دنیا کے کسی بھی حصے میں آنے جانے اور رہنے سہنے کی ہر فرد و بشر کو عام اجازت تھی، لیکن حالات بدلے اور ملکی قوانین وضوابط کا سلسلہ شروع ہوا، یہاں تک کہ آج کی صورت حال یہ ہے کہ ہر ملک کا اپنا مخصوص آئین ہے اور وہاں کا ہر شہری اس کا لازمی طور پر پابند ہے، اسی طرح اگر دوسرے ملک کا کوئی باشندہ وہاں جا کر تجارت کرنا چاہے یا بود و باش اختیار کرنا چاہے یا کسی اور غرض سے کچھ دنوں کے لئے رہنا چاہے تو وہاں کے ملکی قانون کا پابند ہونا لازم ہوگا، قانونی مراحل سے گذرے بغیر کسی بھی ملک میں تجارت، سکونت، سیاحت یا کسی اور غرض سے جانا ممکن نہیں ہے۔

اسلام میں وطن سے محبت کی تعلیم ضرور ہے اور یہ عین فطرت بھی ہے، لیکن وطنیت کے تعلق سے اس کا تصور محدود نہیں، بلکہ آفاقی ہے وہ یہ کہ پوری دنیا اللہ کی ملکیت ہے، اور ہر بندہ خدا اس میں زندگی بسر کرنے کا پورے طور پر حقدار ہے، نیز وطن کا قیام، وحدت دین وعقیدہ کی بنیاد پر عمل میں آتا ہے۔

۱- اسلام میں حصول شہریت کی بنیاد:

اسلام کی نگاہ میں انسان کا وطن وہ مقام ہے جہاں وہ پیدا ہوتا ہے یا ازدواجی زندگی بسر کرتا ہے یا مستقلا بود و باش اختیار کر لیتا ہے، علامہ ابن عابدین شامی ''ردالمحتار'' میں لکھتے ہیں:

''الوطن الأصلی هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه'' (ردالمحتار ۲/۷۴۲)۔

(وطن اصلی سے مراد یہ ہے کہ وہ اس کی جائے پیدائش ہو یا وہاں اس کی شادی ہوئی ہو یا اسے اس نے وطن بنالیا ہو)۔

☆ صدر مدرس جامعہ مظہر العلوم بنارس۔

علامہ سید شریف جرجانی تحریر فرماتے ہیں:

"**الوطن الأصلی هو مولد الرجل و البلد الذی هو فیه**"(التعریفات ص ۳۲۷)۔

(وطن اصلی سے مراد یہ ہے کہ وہ آدمی کی جائے پیدائش ہو اور وہ شہر جس میں وہ رہتا ہو)۔

نبی اکرم ﷺ نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ جس جگہ سے آدمی کا ازدواجی تعلق ہوتا ہے وہاں کا وہ شہری مان لیا جاتا ہے، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"**من تأهل ببلدة فهو من أهلها**"(شرح السیر الکبیر ۱۰۷)۔

(جس نے کسی شہر میں شادی کی وہ وہیں کا مانا جائے گا)۔

اور اگر کوئی شخص کسی جگہ صرف معاشی مقاصد کے تحت یا کسی اور غرض سے مخصوص مدت تک قیام پذیر ہوتا ہے اور وہاں مستقلا بود و باش اختیار نہیں کرتا تو اسے وہاں کا شہری نہیں مانا جائے گا، علامہ جرجانی "التعریفات" میں وطن اقامت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"**وطن الإقامة:موضع ینوی أن یستقر فیه خمسة عشر یوما أو أکثر من غیر أن یتخذه مسکنا**"(التعریفات: ۳۲۷)۔

(وطن اقامت سے مراد وہ جگہ ہے جہاں انسان اپنا گھر بنائے بغیر پندرہ یوم یا اس سے زیادہ اقامت کرے)۔

مذکورہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ شہریت کے حصول کی بنیاد بود و باش اختیار کر لینے پر ہے، اسی لئے اگر ایک شہر چھوڑ کر دوسری جگہ مستقلاً سکونت اختیار کر لی جائے تو سابقہ وطن کی اصلیت باقی نہیں رہتی، "کفایہ شرح ہدایہ" میں ہے:

"**لو انتقل من البلد الذی تأهل به بأهله وتوطن ببلدة أخری لا تبقی البلدة المنتقل عنها وطناله، ألا تری أن مکة کانت وطنا أصلیا لرسول الله علیه السلام ثم هاجر منها إلی المدینة بأهله و توطن ثمة انتقض وطنه بمکة حتی قال علیه السلام عام حجة الوداع "اتموا صلاتکم یا أهل مکة فأنا قوم سفر**"(کفایہ شرح ہدایہ علی ہامش فتح القدیر ۲/۱۷)۔

(آدمی اگر اس شہر سے جہاں اس نے شادی کی ہے اپنے اہل وعیال کے ساتھ منتقل ہو گیا اور کسی دوسرے شہر میں وطن بنالیا تو جس شہر سے منتقل ہوا ہے اب اس کا وطن باقی نہیں رہے گا، کیا آپ نہیں دیکھتے کہ مکہ آپ ﷺ کا وطن اصلی تھا پھر آپ ﷺ نے وہاں سے اپنے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ ہجرت کی، اور وہاں اپنا وطن بنالیا تو آپ کا مکہ والا وطن ختم ہو گیا، یہاں تک کہ آپ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: اے اہل مکہ آپ لوگ اپنی نماز پوری کرلیں، ہم لوگ مسافر ہیں)۔

۲-دوسرے ملک میں شہریت اختیار کرنے کا مسئلہ:

اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ تمام مسلمان بھائی بھائی ہیں، اور ہر مسلمان ملت اسلامیہ کا رکن ہے، اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں:

”**إنما المؤمنون أخوة**“(الحجرات:۱۰)(مسلمان جو ہیں سو بھائی ہیں)۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

”**والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض**“(توبہ:۷۱)(ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کی مددگار ہیں)۔

اس صورتحال میں اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں مقیم ہے، لیکن اس کے لئے اپنے دین پر باقی رہنا دشوار ہے تو اسے وہاں سے کسی ایسے ملک میں ہجرت کرنا واجب ہے جہاں وہ اپنے دین پر قائم رہ سکے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

”**یا عبادی الذین آمنوا ان أرضی واسعة فإیای فاعبدون**“(العنکبوت:۵۶)۔

(اے بندو میرے جو ایمان لائے ہو، میری زمین کشادہ ہے، سو مجھے کی بندگی کرو)۔

علامہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

”**هذا أمر من الله تعالى لعباده المؤمنين بالهجرة من البلد الذى لا يقدرون فيه على إقامة الدين إلى أرض الله الواسعة حيث يمكن إقامة الدين**“(تفسیر ابن کثیر ۳/۴۱۹)۔

(اللہ تعالی اس آیت میں ایمان والوں کو ہجرت کا حکم دیتا ہے کہ جہاں وہ دین کو قائم نہ رکھ سکتے ہوں وہاں سے اس جگہ چلے جائیں جہاں ان کے دین میں انہیں آزادی رہے، خدا کی زمین بہت کشادہ ہے)۔

البتہ اگر دوسری جگہ منتقل ہونے پر قدرت نہ ہو یا کوئی ایسی جگہ نہ مل رہی ہو جہاں وہ ہجرت کر سکے تو ایسی صورت میں وہ معذور سمجھا جائے گا، مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

”جس شہر یا ملک میں انسان کو اپنے دین پر قائم رہنے کی آزادی نہ ہو دوسرے شہر یا ملک میں جہاں دین پر عمل کی آزادی ہو چلا جانا بشرطیکہ قدرت ہو واجب ہے، البتہ جس کو سفر پر قدرت نہ ہو یا کوئی ایسی جگہ میسر نہ ہو جہاں آزادی سے دین پر عمل کر سکے وہ شرعا معذور ہے“(معارف القرآن ۶/۷۱۱)۔

مذکورہ بالا صورتحال سے دوچار شخص اگر کسی مسلم ملک سے درخواست کرتا ہے کہ وہاں کی شہریت اختیار کرے تو اس ملک کو چاہئے کہ حتی المقدور اس شخص کا تعاون کرے اور اپنے ملک میں اسے جگہ دے کر ایک شرعی فریضہ انجام دے، اللہ تعالی

ارشاد فرماتا ہے:

”وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر إلاعلی قوم بینکم وبینهم میثاق، والله بما تعملون بصیر“(سورۂ توبہ:۷۲)۔

(اور اگر وہ تم سے مدد چاہیں دین میں تو تم پر لازم ہے ان کی مدد کرنی، مگر مقابلہ میں ان لوگوں کے کہ ان میں اور تم میں عہد ہو اور اللہ جو تم کرتے ہو اس کو دیکھتا ہے)۔

علامہ ابن کثیر اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

”ان استنصروکم هولاء الأعراب الذین لم یهاجروا فی قتال دینی علی عدولهم فانصروهم فإنه واجب علیکم نصرتهم، لأنهم إخوانکم فی الدین“(تفسیر ابن کثیر ۳/ ۳۵۳)۔

(جو دیہاتی مسلمان وہیں مقیم ہیں ہجرت نہیں کی یہ اگر کسی وقت تم سے مدد کی خواہش کریں دشمنان دین کے مقابلے پر تمہیں بلائیں تو ان کی مدد تم پر واجب ہے، اس لئے کہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں)۔

علامہ شبیر احمد عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

”دار الحرب کے مسلمان جس وقت دینی معاملہ میں آزاد مسلمانوں سے مدد طلب کریں تو ان کو اپنے مقدور کے مطابق مدد کرنا چاہئے، مگر جس جماعت سے آزاد مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہو اس کے مقابلہ میں تابقائے عہد دار الحرب کے مسلمانوں کی امداد نہیں کی جاسکتی“(حاشیہ عثمانی برترجمہ شیخ الہند ص ۲۴۷)۔

اور اگر وہ شخص ایسے غیر مسلم ملک میں رہتا ہے جہاں دین پر عمل کرنے کی آزادی ہے، یا کسی ایسے مسلم ملک میں سکونت پذیر ہے جہاں احکام الہی کی علی الاعلان خلاف ورزی ہو رہی ہے اور وہ شخص اس کے روکنے پر قادر بھی نہ ہو تو وہاں سے منتقل ہو جانا مستحب ہے، علامہ ابن تیمیہ تحریر فرماتے ہیں:

”والمقیم بها إن کان عاجزاعن إقامة دینه وجبت الهجرة علیه، وإلااستحبت ولم تجب“(فتاوی ابن تیمیہ ۲۸/ ۲۴۰)۔

(غیر مسلم ملک میں مقیم مسلمان اگر اپنے دین کے قائم کرنے سے عاجز ہوں تو ان پر ہجرت واجب ہے، ورنہ مستحب ہے، واجب نہیں)۔

مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی تحریر فرماتے ہیں:

”جس دار الکفر میں عام احکام دینیہ پر عمل کرنے کی آزادی ہو وہاں سے ہجرت فرض وواجب تو نہیں ہے، مگر

مستحب بہر حال ہے، اور اس میں دار الکفر ہونا بھی ضروری نہیں، دار الفسق جہاں احکام الہیہ کی خلاف ورزی اعلانا ہوتی ہو اس کا بھی یہی حکم ہے، اگرچہ وہاں کے حکمراں کے مسلمان ہونے کی بنا پر اس کو دار الاسلام کہا جاتا ہو' (معارف القران ۶/۱۱۷)۔

اس صورت حال میں مسلم ملک کے حکمراں کے لئے مستحب ہوگا کہ کسی مسلمان کی درخواست بسلسلہ حصول شہریت پر غور کرے اور اسے اپنے ملک کا شہری بنائے، الغرض مسلم حکمراں کو چاہئے کہ مسلم مصالح کا لحاظ کرتے ہوئے مظلوم و بے کس مسلمانوں کا حسب مقدرت تعاون کرے اور انہیں اپنے ملک کی شہریت عطا کرے، اگر مسلمان کے لئے اپنے ملک میں دین پر قائم رہنا مشکل ہو اور اس کی وجہ سے اس کا وہاں سے نقل مکانی کرنا از روئے شرع واجب ہو تو مسلم ملک کے لئے اس کا شہری بنانا واجب ہوگا، ورنہ مستحب۔

۳- تارکین وطن کو پناہ دینے کا مسئلہ:

اگر کسی علاقے میں مظالم ڈھائے گئے اور وہاں کے مسلمان ترک وطن کر کے کسی مسلم ملک میں پناہ گزیں ہوئے تو اس ملک کو چاہئے کہ ان بے سہارا مسلمانوں کا ہر ممکن تعاون کرے، اگر ہو سکے تو ملکی مفاہمت کے ذریعہ یا اقوام متحدہ کے وضع کردہ قوانین کے ذریعہ ان کا مسئلہ حل کرائے، ورنہ انہیں اپنے ملک کا شہری تسلیم کرے، اس وجہ سے کہ یہی اسلامی اخوت ہے، اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

"إن الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم فى سبيل الله والذين آووا ونصروا أولئک بعضهم أولياء بعض" (توبہ: ۷۲)۔

(جو لوگ ایمان لائے اور گھر چھوڑا اور لڑے اپنے مال اور جان سے اللہ کی راہ میں، اور جن لوگوں نے جگہ دی اور مدد کی وہ ایک دوسرے کے رفیق ہیں)۔

نبی اکرم ﷺ کا اشاد ہے:

"المؤمن للمؤمن كالبنيان يشد بعضه بعضا" (صحیح بخاری حدیث نمبر ۲۲۶۶، صحیح مسلم ۴۶۸۴)۔

(مومن، مومن کے لئے عمارت کے مانند ہے کہ اس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے)۔

نیز آپ ﷺ نے فرمایا:

"المسلم أخو المسلم لا يظلمه ولا يسلمه ومن كان فى حاجة أخيه كان الله فى حاجته ومن فرج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربة من كر بات يوم القيمة، ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة" (صحیح بخاری حدیث نمبر ۲۲۶۲، صحیح مسلم حدیث نمبر ۴۶۷۷)۔

(مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کو کسی کے حوالہ کرتا ہے، جس نے اپنے بھائی کی ضرورت پوری کی اللہ تعالی اس کی ضرورت پوری کرے گا، اور جس نے کسی مسلم کی پریشانی دور کی اللہ تعالی قیامت کے دن اس کی پریشانی دور کرے گا، جس نے کسی مسلمان کے عیوب چھپائے اللہ تعالی قیامت کے دن اس کے عیوب چھپائیں گے)۔

مذکورہ تفصیل سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی اخوت کا تقاضا یہی ہے کہ مسلم ممالک پریشان حال تارکین وطن کو اپنے ملک کا شہری بنائیں، اس وجہ سے کہ دارالاسلام بمنزلہ ایک جگہ کے ہوتا ہے۔

''بزازیہ'' میں ہے:

''**امرأة مسلمة سبيت بالمشرق وجب على أهل المغرب تخليصها من الأسر مالم تدخل دارالحرب؛ لأن دارالإسلام كمكان واحد**'' (فتاوی بزازیہ علی ہامش الہندیہ ۶/ ۳۰۸)۔

(اگر کوئی مسلمان عورت مشرق میں گرفتار ہو تو مغرب والوں پر اس کی قید سے رہائی دلانا واجب ہے، جب تک وہ دارالحرب میں داخل نہ ہو جائے، اس وجہ سے کہ دارالاسلام مکان واحد کے مثل ہے)۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ دوسرے مظلوم و بے بس مسلمانوں کا حتی المقدور تعاون کرے، لہذا مسلم ممالک کو چاہئے کہ مسلم تارکین وطن کو اپنے ملک کا شہری بنائیں اور انہیں قدیم باشندوں کی طرح سہولتیں فراہم کریں۔

۴-شہریت کے حقوق:

اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جن کا تعلق مصالح ضروریہ، یعنی حفاظت دین، حفاظت جان، حفاظت عقل، حفاظت نسل اور حفاظت مال سے ہو، حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المقدس کے عیسائیوں کو از روئے معاہدہ جو حقوق دیئے تھے، ان سے بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ نے جان، مال اور مذہب جیسے بنیادی حقوق کو مفتوحہ اقوام کے حق میں محفوظ رکھا، وہ حقوق یہ تھے:

''یہ وہ امان ہے جو خدا کے غلام امیر المؤمنین عمرؓ نے اہل ایلیا کو دی، یہ امان جان، مال، گرجا، صلیب، تندرست، بیمار اور ان کے تمام اہل مذہب کے لئے ہے، نہ ان کے گرجا میں سکونت اختیار کی جائے گی، نہ ڈھائے جائیں گے، نہ ان کے احاطہ کو نقصان پہنچایا جائے گا، نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی، مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا، نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا'' (تاریخ اسلام ۱/ ۲۲۲ بحوالہ طبری)۔

۵-پناہ گزینوں کے حقوق:

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ہر شخص خدا کی زمین میں جہاں خیر و بھلائی پائے، مقیم ہو کر زندگی بسر کرے، ابن کثیر نے مسند احمد کی ایک روایت نقل کی، آپ ﷺ نے فرمایا:

"**البلاد بلاد الله والعباد عباد الله حيثما أصبت خيرا فاقم**"(ابن کثیر بحوالہ معارف القرآن ۶/۱۱۷)۔

(سب شہر اللہ کے شہر ہیں، اور سب بندے اللہ کے بندے، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہو وہاں اقامت کرو)۔

اس لئے مسلم حکمراں کے فرائض میں سے ہے کہ مظلوم مسلمانوں کی دادرسی کے لئے ہمہ وقت تیار رہے، نبی اکرم ﷺ نے مسلم حکمراں کو "ظل اللہ فی الأرض" کہا ہے، اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس کے زیر سایہ پوری امت مسلمہ سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی کے لمحات گذار سکے، اور پریشان حال و بے سہارا افراد اسلامی مملکت کی حدود میں آ کر ٹھکانا پاسکیں، آپ ﷺ نے فرمایا:

"**السلطان ظل الله فى الأرض يأوى إليه كل ضعيف وملهوف**"(فتاوی ابن تیمیہ ۳۵/۴۵)۔

(بادشاہ، زمین میں اللہ کا سایہ ہے، ہر کمزور مظلوم شخص اس کی پناہ لیتا ہے)۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پناہ گزینوں کا ہر ممکن تعاون کرنا لازم ہے، ان کے الجھے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لئے سعی بلیغ کرنی چاہئے، یہاں تک کہ انہیں اپنا شہری تسلیم کر کے امن و چین کے ساتھ زندگی گذارنے کا حق فراہم کرنا چاہئے، اور ایسا نظام بنا دینا چاہئے جس سے انہیں وہ تمام حقوق انسانی حاصل ہوسکیں، جو دیگر شہریوں کو پہلے سے حاصل ہیں، نبی اکرم ﷺ نے مہاجرین وانصار کے درمیان جو رشتہ اخوت قائم فرمایا تھا، اس سے بھی یہی روشنی ملتی ہے۔

۶-مسلمان کا کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کا مسئلہ:

ایک مسلمان کسی غیر مسلم ملک میں کسی وجہ شرعی کے بغیر شہریت اختیار کرے، درست نہیں ہے، البتہ اگر تبلیغ دین کی غرض سے وہاں اقامت کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، علامہ ماوردی نے اس طرح کی اقامت کو افضل قرار دیا ہے، اس وجہ سے کہ دعوت و تبلیغ اور اظہار شعائر دینی کے ذریعہ دوسروں کو اسلام کے سمجھنے اور اس کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملے گا۔

اسی طرح ایسے امور کے سبب بھی غیر مسلم ممالک میں اقامت پذیر ہونے کی اجازت ہے جن کا تعلق مصالح مسلمین سے ہے، "الاستعانۃ بغیر المسلمین فی الفقہ الاسلامی" میں ہے:

"**ذلک؛ لأن ما يترتب على بقائه من الخير سيتضاعف على ما يمكن أن يجعل له من الشر**

والضرر علی أن یکون قادرا علی إظهار دعوته وشعار دینه، و هکذا الحکم فی إقامته من أجل مصلحة تهم المسلمین، کتعلم نوع من العلوم أو صنعة من الصنائع أو نحوهما مما تحتاجه الأمة الاسلامیة ولا یوجد فی دیارهم أو لیکون سفیر الدولة الإسلام عندهم "(ص۷۸،۷۹)۔

(یہ اس وجہ سے کہ اس کے وہاں رہنے سے جو خیر حاصل ہوگا وہاں کے ممکنہ شر ونقصان سے دوچند ہوگا، اس وجہ سے کہ وہ دعوت اور دینی شعائر کے اظہار پر قادر ہوگا، نیز یہی حکم ہے مصالح مسلمین کے تعلق سے اقامت کرنے کا، مثلاً کسی خاص علم یا صنعت یا کسی اور چیز کا سیکھنا جس کی امت اسلامیہ کو ضرورت ہو اور وہ چیز مسلمانوں کے شہر میں نہ پائی جاتی ہو، یا یہ کہ وہ اسلامی حکومت کا سفیر ہو)۔

اسی طرح ایک مسلمان تجارت کی غرض سے غیر مسلم ممالک میں جاسکتا ہے، ''بدائع الصنائع'' میں ہے:

"**ولا بأس بحمل الثیاب والمتاع والطعام ونحو ذلک إلیهم لا نعدام معنی الامداد و الإعانة، وعلی ذلک جرت العادة من تجار الأمصار أنهم یدخلون دارالحرب للتجارة من غیر ظهورالردوالإنکار علیهم، إلا أن الترک أفضل؛ لأنهم یستخفون بالمسلمین، ویدعونهم إلی ماهم علیه فکان الکف والإمساک عن الدخول من صیانة النفس عن الهوان والدین عن الزوال، فکان أولی**"(۶/۶۵)۔

(کپڑا، سامان اور کھانا وغیرہ کو غیر مسلموں کے پاس لے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے، اس وجہ سے کہ یہ امداد و معاونت نہیں ہے، برایں بنا مسلم شہروں کے تاجروں کا معمول رہا ہے کہ وہ کسی روک ٹوک کے بغیر بغرض تجارت دارالحرب میں جاتے ہیں، مگر نہ جانا افضل ہے، اس وجہ سے کہ وہ لوگ مسلمانوں کو حقیر جانتے ہیں، اور انہیں اپنے عادات واطوار اور دین ومذہب کی دعوت دیتے ہیں، لہذا اپنے کو ذلت سے اور دین کو برباد ہونے سے بچانے کے لئے وہاں نہ جانا بہتر ہوگا)۔

صحابہ کرام کے عمل سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ آپ حضرات نے بغرض تجارت غیر مسلم ممالک کا سفر کیا ہے، چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے بصرہ کا تجارتی سفر کیا (الطبرانی فی المعجم الکبیر ص ۶۷۵)، اسی طرح طلحہ بن عبید اللہ اور سعید بن زید بن عمرو بن نفیل وغیرہ ''بحر روم'' میں تجارت کیا کرتے تھے (تاریخ دمشق ۲۵/۵۷)۔

حاصل یہ کہ شرعی وجہ کے بغیر غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنا درست نہیں ہے، تاہم تجارت کی غرض سے وہاں آنے جانے کی اجازت ہے، مگر نہ جانے کو افضل قرار دیا گیا ہے، نیز اظہار دین ومصالح مسلمین کے تحت اگر کوئی وہاں اقامت کرتا ہے تو اس کی بھی اجازت ہے، الغرض اسلام کی نگاہ میں سب سے بڑا مسئلہ دین اور شعائر دین کے تحفظ کا ہے، اس

لئے ہر مسلمان کو ہمہ وقت اس کے لئے فکر مند ہونا چاہئے، اور ایسے ماحول، معاشرہ اور شہر و ملک سے حتی المقدور احتراز کرنا چاہئے، جہاں دینی شعائر اور اسلامی تشخص کو خطرہ لاحق ہو۔

۷-غیر مسلم کا مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کا مسئلہ:

غیر مسلم کو جزیرۃ العرب میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے، ''بدائع الصنائع'' میں ہے:

''ویمنع المشرکون أن یتخذوا أرض العرب مسکنا کذا ذکرہ محمد تفضیلا لأرض العرب علی غیرھا وتطھیر الھاعن الدین الباطل''(۸۵/۶)۔

(مشرکین کو اس بات سے منع کیا جائے گا کہ وہ سرزمین عرب کو اپنا مسکن بنائیں، امام محمد نے ایسا ہی ذکر کیا ہے، اس کا مقصد سرزمین عرب کو دیگر زمینوں پر فضیلت دینا اور اس کو باطل دین سے پاک کرنا ہے)۔

''فتح القدیر'' میں ہے:

''ویمنعون من أن یتخذوا أرض العرب مسکنا ووطنا''(فتح القدیر ۳۰۱/۵)۔

(یہ لوگ اس بات سے منع کئے جائیں گے کہ سرزمین عرب کو اپنا مسکن اور وطن بنائیں)۔

علامہ شامی نے ''درمختار'' کی عبارت: **''لمنعون من استیطان مکة والمدینة؛ لأنھما من أرض العرب''** پر کلام کرتے ہوئے اس بات کی صراحت فرمائی ہے کہ اس میں تمام جزیرۃ العرب شامل ہے:

''إن الحکم غیر مقصور علی مکة والمدینة، بل جزیرة العرب کلھا، کما عبربه فی الفتح وغیرہ''(ردالمحتار ۲۰۹/۴)۔

(بلاشبہ یہ حکم مکہ و مدینہ تک محدود نہیں ہے، بلکہ پورا جزیرۃ العرب ہے، جیسا کہ ''فتح القدیر'' وغیرہ نے اس کی صراحت کی ہے)۔

جزیرۃ العرب کے علاوہ دوسرے مسلم شہروں میں غیر مسلم کو سکونت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی، ''فتح القدیر'' میں ہے:

''بخلاف أمصار المسلمین التی لیست فی جزیرة العرب، یمکنون من سکناھا ولا خلاف فی ذلک''(فتح القدیر ۳۰۱/۵)۔

(مسلمانوں کے دیگر شہروں کے برخلاف جو جزیرۃ العرب میں نہیں ہیں، ان میں انہیں سکونت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی، اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے)۔

''بدائع الصنائع''میں ہے:

"ويتركون أن يسكنوا فى أمصار المسلمين يبيعون ويشترون، لأن عقد الذمة شرع ليكون وسيلة لهم إلى الاسلام وتمكينهم من المقام فى أمصار المسلمين أبلغ فى المقصود، وفيه أيضا منعة المسلمين بالبيع والشراء فيمكنون من ذلك"(بدائع ۶/ ۸۳)۔

(انہیں مسلمانوں کے شہروں میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی کہ یہ لوگ معاملہ بیع وشراء کیا کریں، اس وجہ سے کہ عقد ذمہ کی مشروعیت اس وجہ سے ہوئی ہے کہ یہ ان کے اسلام کا ذریعہ بنے، ان کو مسلم شہروں میں ٹھہرانے سے یہ مقصود پورے طور پر حاصل ہوگا، نیز اس میں خرید وفروخت کی وجہ سے مسلمانوں کی منفعت بھی ہے، لہذا انہیں اس کی اجازت دی جائے گی)۔

علامہ شامی نے علامہ سرخسی کے حوالہ سے فرمایا:

"قال السرخسى فى شرح الكبير: فإن مصر الإمام فى أراضيهم كما مصر عمرؓ البصرة والكوفة فاشترى بها أهل الذمة دورا وسكنوا مع المسلمين لم يمنعوا من ذلك ،فانا قبلنا منهم عقد الذمة ليقفوا على محاسن الدين، فعسى أن يؤمنوا واختلاطهم بالمسلمين والسكن معهم يحقق هذا المعنى"(ردالمحتار ۴/ ۲۱۰)۔

(علامہ سرخسی نے شرح کبیر میں کہا ہے کہ اگر امام اپنی اراضی میں شہر بساتا ہے، جیسا کہ حضرت عمرؓ نے بصرہ وکوفہ کو بسایا، اور اس میں ذمیوں نے مکانات خریدے اور مسلمانوں کے ساتھ بود وباش اختیار کی تو انہیں اس سے منع نہیں کیا جائے گا، اس وجہ سے کہ ہم نے ان سے عقد ذمہ اس وجہ سے قبول کیا ہے کہ وہ لوگ محاسن دین سے واقف ہوسکیں، ہوسکتا ہے کہ ایمان لے آئیں، مسلمانوں کے ساتھ ان کے اختلاط اور رہن سہن میں یہ مقصد پورا ہوسکتا ہے)۔

البتہ اگر غیر مسلم کے سکونت اختیار کرنے سے ملکی مصالح متاثر ہورہے ہوں تو انہیں شہر کے ایسے مقامات پر بسنے کو کہا جائے گا جہاں ان سے کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو، جیسا کہ علامہ شمس الائمہ حلوانی نے اس بات کی صراحت فرمائی ہے (دیکھئے: ردالمحتار ۴/ ۲۱۰)۔

اسی طرح غیر مسلم کسی بھی مسلم ملک میں بغرض تجارت آسکتا ہے، درمختار میں ہے:

"ولودخل لتجارة جاز ولا يطيل" (۴/ ۲۰۹)۔

(اور اگر تجارت کے لئے داخل ہوتو جائز ہے البتہ زیادہ نہ ٹھہرے)۔

غیر مسلم، کسی مسلم ملک میں ذمی بن کر رہ سکتا ہے اور اس کو تجارت کی عام اجازت ہوتی ہے، لیکن اگر امان (ویزا) لے مسلم ملک میں آتا ہے تو اسے تجارت کی اجازت تو ہوتی ہے، لیکن ملکی مصالح کے پیش نظر سال بھر سے پہلے ہی اس کو وہاں سے واپس آجانا ضروری ہوتا ہے۔

علامہ مرغینانی تحریر فرماتے ہیں:

"والأصل أن الحربی لا یمکن من إقامة دائمة فی دارنا إلا بالاسترقاق أو الجزیة، لأنه یصیر عونا علیهم فیلتحق المضرة بالمسلمین،ویمکن من الإقامة الیسیرة؛ لأن فی منعنهاقطع المیرة والجلب، وسدباب التجارة ففصلنا بینهما بسنة "(ہدایہ ۵۸۶/۲)۔

(اصل یہ ہے کہ حربی کو ہمارے ملک میں مستقل اقامت کی اجازت نہیں دی جائے گی، الا یہ کہ اسے غلام بنالیا جائے یا وہ جزیہ ادا کرے، اس وجہ سے کہ وہ اہل حرب کا جاسوس اور ان کا معاون ہوگا جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے گا اور اسے کم مدت تک اقامت کرنے کی اجازت دی جائے گی اس وجہ سے کہ اس کے نہ دینے سے غلہ اور مال کو ختم کرنا اور تجارت کے دروازے کو بند کرنا لازم آئے گا، اس وجہ سے ہم نے دونوں مدتوں کے درمیان ایک سال کو حد فاصل بنا دیا)۔

حاصل یہ کہ غیر مسلم جزیرۃ العرب کی شہریت اختیار نہیں کرسکتا، اس کے علاوہ دیگر شہروں میں ذمی بن کر شہریت اختیار کرسکتا ہے، اور اسے تجارت وغیرہ کی آزادی ہوگی، البتہ اگر ان کی وجہ سے مسلمانوں کے نظام میں کوئی خلل واقع ہو رہا ہو تو انہیں ایسی جگہ سکونت اختیار کرنے کو کہا جائے گا کہ کوئی مسئلہ نہ پیدا ہو اور اگر کوئی غیر مسلم صرف امان حاصل کر کے تجارت کی غرض سے مسلم ملک میں جاتا ہے تو جائز ہے، لیکن ملکی مصالح کے پیش نظر اس کو بتا دیا جائے گا کہ سال کے اندر اندر وہ یہاں سے واپس چلا جائے۔

☆☆☆

کسی بھی ملک کا شہری ہونے کی شرعی بنیادیں

مولانا خورشید احمد اعظمی☆

شہریت سے مراد کسی ملک کا باشندہ ہونا ہے، جس کو جنسیہ، وطنیت، قومیت اور نیشنلٹی سے بھی تعبیر کرتے ہیں، جو کسی فرد اور ملک (حکومت) کے مابین ایک سیاسی اور قانونی رابطہ ہے، جو دونوں کے اوپر ایک دوسرے کے کچھ حقوق کو واجب کرتا ہے، اور اس کی رعایت ہر دو پر ضروری ہوتی ہے۔

”رابطةسياسية وقانونية بين الفرد والدولة“

(فرد اور حکومت کے درمیان ایک سیاسی اور قانونی رابطہ ہے)۔

” رابطة تربط شخصا معينابدولةمعينة،وتعتبره عضوا فى تلك الدولةوتمكنه من المطالبة بحمايتها،وتخضعه كذلك لتنفيذ ماتفرض عليه دولته من واجبات “۔

(ایک رابطہ ہے جو کسی شخص معین کو کسی متعینہ حکومت سے مربوط کرتا ہے، اور اس فرد کو اس حکومت کا ایک ممبر اور فرد مانتا ہے، اور اس کو اپنی حمایت کے مطالبہ کا حق دیتا ہے، اور ایسے ہی حکومت اس پر جو ذمہ داریاں عائد کرتی ہے ان کو نافذ کرنے کے لئے اس کو تابع بناتا ہے)۔

”وعرفتها محكمة العدل فى السادس من ابريل سنة ١٩٥١،بأنها رابطة قائمةأساسا على رابطة اجتماعيةو تضامن فعال فى المعيشة والمصالح والمشاعر مع التلازم بين الحقوق والواجبات“ (الأحکام الشرعیۃللنوازل السیاسیۃ ص ۲۱۷)۔

(اور محکمۃ العدل نے ۶/اپریل ۱۹۵۱ میں (شہریت کی) یہ تعریف کیا ہے، کہ یہ ایک رابطہ ہے جو اساسی طور پر حقوق وواجبات میں تلازم کے ساتھ معیشت ومصالح میں ایک اجتماعی رابطہ اور فعال شمولیت پر قائم ہے)۔

کسی ملک کا شہری ہونے کی بنیاد چند امور ہو سکتے ہیں مثلاً:

☆ استاذ جامعہ عربیہ تعلیم الدین مئو۔

(۱) آدمی کی پیدائش اس ملک کی ہو (۲) آدمی کا اس ملک میں اپنا گھر اور مکان ہو جس میں اس کی مستقل رہائش اور سکونت ہو (۳) اس ملک میں شادی کرلیا ہو (۴) اس کے والدین میں سے کوئی ایک اس ملک کا پیدا یا باشندہ ہو. ان امور کی بنیاد پر کوئی شخص کسی ملک کا شہری قرار دیا جاسکتا ہے، کسی ملک یا شہر میں محض معاشی اور تجارتی سرگرمیاں انجام دینے سے یا چند سال عارضی قیام سے وہ اس ملک کا شہری قرار نہیں پائے گا.

''باب صلاۃ المسافر'' کے تحت وطن اصلی اور وطن اقامت کی تعریف میں مذکور ہے: ''**الوطن الأصلی هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه**''. **أو تأهله** کے تحت علامہ شامی علیہ الرحمۃ لکھتے ہیں: ''**أی تزوجه،قال فی شرح المنیة: ولو تزوج المسافربلد ولم ینو الإقامة به، فقیل لا یصیر مقیما ،وقیل یصیر مقیما،وهو الأوجه،ولو کان له أهل ببلدتین فأیتهما دخلها صار مقیما**''

(یعنی اس شہر میں شادی کرلیا ہو، شرح منیۃ میں کہا ہے: اور اگر مسافر نے کسی شہر میں شادی کرلیا، اور اس میں رہنے کا ارادہ نہیں کیا تو کہا گیا ہے کہ وہ مقیم نہیں ہوگا، اور کہا گیا ہے کہ مقیم ہو جائے گا، اور یہی زیادہ وجیہ ہے، اور اگر اس کے اہل دوشہروں میں ہوں، تو ان میں سے جس میں بھی وہ داخل ہوگا، مقیم ہوگا) (ردالمحتار ۲/۱۴۱۶)۔

نیز ''شرح کتاب السیر الکبیر'' میں مذکور ہے: ''**وإن قال المیمنة غدا علی أهل المصیصة فکان رجل من أهل الکوفةسکن المصیصة،فإن کان اتخذها منزلافهو من المصیصة،لقوله** ﷺ: ''**من تأهل ببلدة فهو من أهلها**''. **ولأن من یکون ساکنافی بلدة مقیما بها یعد فی الناس من أهلها ،ألا تری أناإذا عددنا فقهاء الکوفةذکرنا فی جملتهم النخعی والشعبی وأبا حنیفة رضی الله عنهم وهم ما کانوا من الکوفة فی الأصل و لکنهم سکنوها**'' (ج ۱ ص ۱۷۰)۔

(اور اگر کہا کہ میمنہ، کل اہل مصیصہ پر مشتمل ہوگا، تو اگر کوفہ کا کوئی آدمی مصیصہ کا ساکن ہے، اور اس نے مصیصہ کو اپنی جائے رہائش بنالیا ہے تو وہ مصیصہ کا ہوگا، رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کی وجہ سے کہ جو اپنے اہل کے ساتھ کسی شہر میں رہنے لگا تو وہ اس شہر کے لوگوں میں سے ہے، اور اس لئے کہ جو شخص کسی شہر میں مقیم کی حیثیت سے ساکن ہو تو لوگوں میں اس کا اہل شمار کیا جاتا ہے، کیا ایسا نہیں ہے کہ جب ہم لوگ فقہاء کوفہ کا شمار کرتے ہیں تو ان میں نخعی، شعبی اور ابوحنیفہ رحمہم اللہ کا بھی ذکر کرتے ہیں، حالانکہ یہ لوگ اصلا اہل کوفہ سے نہیں، لیکن وہاں سکونت اختیار کیا ہے)۔

۲- کوئی مسلمان جو کسی مسلم یا غیر مسلم ملک کا باشندہ ہے، جہاں اسے دینی شعائر قائم کرنے اور فرائض کے انجام دینے پر کوئی ممانعت اور پابندی نہیں ہے، اور وہ کسی دوسرے مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہتا ہے، تو اس مسلم ملک پر اس

کی درخواست قبول کرنا واجب نہیں ہوگا،ایک حدیث میں وارد ہے کہ ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے ہجرت کی درخواست کی،آپ ﷺ نے ان سے فرمایا: کیا اپنے اونٹوں کی زکوۃ دیتے ہو ؟ انھوں نے عرض کیا ہاں.آپ ﷺ نے فرمایا:اپنے گاؤں میں ہی عمل کرتے رہو،اللہ تمھارے اعمال میں (اس کے ثواب میں) کوئی کمی نہیں کریں گے؛

"إن أعرابیاسأل رسول الله ﷺ عن الهجرة،فقال :ویحک ؛ان شأن الهجرة لشدید،فهل لک من ابل ؟قال نعم ،قال فهل تؤتی صدقتها؟ قال نعم،قال :فاعمل من وراء البحار ،فإن الله لن یترک من عملک شیئا" (صحیح مسلم،کتاب الامارہ،حدیث ۸۷)،بحار، سے مراد یہاں پرقری اور گاؤں ہیں،جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے صراحت کیا ہے ،نیز اس حدیث کی شرح میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے :"ولکن اعمل بالخیر فی وطنک وحیث ما کنت فهو ینفعک ولا ینقصک الله منه شیئا" (شرح مسلم،۹/۱۳)۔

(اپنے وطن میں یا جہاں کہیں بھی رہو،اچھے عمل کرتے رہو،وہ تمھیں نفع دے گا،اور اللہ اس میں سے تم سے کچھ کم نہیں کرے گا)۔

اور اگر کسی دینی وشرعی مجبوری کی وجہ سے وہ کسی دوسرے مسلم ملک میں قیام کرنا چاہتا ہے،تو اس مسلم ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا واجب ہوگا،جیسا کہ آیت کریمہ کے اس حصہ سے ظاہر ہے:"وإن استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر ،إلا علی قوم بینکم وبینهم میثاق والله بما تعملون بصیر" (سورہ انفال آیت ۷۲)۔

(اگر وہ تم سے دین میں مدد طلب کریں تو تمھارے اوپر مدد کرنا واجب ہے،.........)۔

۳- کسی ملک یا اس کے بعض خطہ میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں،اور وہاں کے مسلمان کسی دوسرے مسلم ملک کی پناہ لیتے ہیں، جہاں انھیں پناہ گزیں کا درجہ دیا جاتا ہے،اور انھیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا،لیکن شرعا اسے درست نہیں ہونا چاہئے ،کیونکہ مسلمان ہونے کے اعتبار سے پوری دنیا کے مسلمان ایک جیسے ہیں،ایک ہی ملک میں دو مسلمانوں کے درمیان بنیادی حقوق میں تفریق مناسب نہیں ،"المسلمون تتکا فأ دماؤهم" (سنن ابوداؤد حدیث ۲۷۵۱،کتاب الجہاد) (مسلمان ، ان کے خون ایک جیسے ہیں)۔

اللہ تبارک وتعالی کا ارشاد ہے:"إنما المؤمنون اخوة" (الحجرات:۱۰)۔

(بلاشبہ مومنین بھائی بھائی ہیں)۔

اور ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:"والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولیاء بعض" (التوبۃ:۷۱)۔

(مومن مرد اور مومن عورتیں،بعض،بعض کے ولی (معاون ومددگار) ہیں)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: ”**المؤمن للمؤمن کالبنیان یشد بعضه بعضا**“(صحیح مسلم ر کتاب البر والصلہ رح ۶۵)۔

(مومن، مومن کے لئے عمارت کی طرح ہے، بعض، بعض کی پشت پناہی کرتا ہے)۔

ایک دوسری حدیث میں ارشاد ہے :”**المسلم أخو المسلم ،لا یظلمه ولا یخذله...... الحدیث**“(صحیح مسلم رکتاب البر والصلۃ رح ۳۲)۔

(مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اس کی مدد کرنا ترک کرتا ہے)۔

اس حدیث کی شرح میں امام نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:”**وأما لا یخذله ،فقال العلماء الخذل :ترک الإعانة والنصر ، ومعناہ إذا استعان به فی دفع ظالم ونحوہ لزمه اعانته إذا أمکنه ولم یکن له عذر شرعی**“(شرح مسلم ۱۶ر۱۲۰)۔

(علماء نے کہا ہے کہ خذل، مدد اور اعانت کا ترک کرنا ہے، اور رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ جب ظالم یا اس کے مثل دفع کرنے کے لئے اس سے مدد طلب کرے، تو اس کی مدد کرنا لازم ہے، جبکہ اس کے لئے ممکن ہو اور کوئی عذر شرعی نہ ہو)۔

یہ آیات واحادیث جن میں اللہ اور اس کے رسول نے، مومنین کے درمیان اخوت اور بھائی چارگی قائم کی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان، خواہ کسی ملک کا رہنے والا ہو مظلوم ہو کر اپنے ملک یا شہر میں پناہ لیتا ہے تو اس کی مدد کی جائے، اس کو اپنے جیسا سمجھا جائے، اگرچہ پہلے سے کوئی عقد ومعاہدہ نہ ہو، کیونکہ اللہ اور اس کے رسول کا قائم کیا ہوا عقد واخوت موجود ہے،”**لا یؤمن أحدکم حتی یحب لأخیه ما یحب لنفسه**“ (تم میں کا کوئی کامل مومن نہیں ہوگا یہاں تک کہ پسند کرے اپنے بھائی کے لئے ویسا ہی جیسا اپنے لئے پسند کرتا ہے)۔

نیز قرآن کریم کا مذکورہ فرمان:” **وان استنصروکم فی الدین ،فعلیکم النصر**“(سورۂ انفال:۷۲) سے بھی یہی حکم ماخوذ ہوتا ہے، اور آیت کریمہ:”**وما لکم لاتقاتلون فی سبیل الله،والمستضعفین من الرجا ل والنساء والولدان الذین یقولون ربنا أخرجنا من هذہ القریة الظالم أهلها واجعل لنا من لدنک ولیا واجعل لنا من لدنک نصیرا ۔**“ (سورۂ نساء آیت ۷۵) سے مظلوم، کمزور مسلمان خواہ کہیں بھی بستے ہوں ان کی مدد کرنا، اور ان کو ظلم سے نجات دلانا فرض معلوم ہوتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں صاحب تفسیر قرطبی لکھتے ہیں : ” **حض علی الجهاد ،وهو یتضمن تخلیص**

المستضعفين من أيدى كفرة المشركين الذين يسومونهم سوء العذاب ،ويفتنونهم عن الدين ، فأوجب تعالى الجهاد لاعلاء كلمته وإظهار دينه واستنقاذالمؤمنين الضعفاء من عباده ،وإن كان فى ذلک تلف النفوس"(الجامع لاحکام القرآن ۲۷۹/۵)۔

(جہاد پر ابھارنا ہے، اور یہ شامل ہے کمزور لوگوں کو ان مشرکین کفار کے ظلم سے نجات دلانے کو، جوان پر ظلم کرتے ہیں اور دین کی طرف سے آزمائش میں مبتلا کرتے ہیں، تو اللہ تعالی نے جہاد واجب کیا ہے اپنے کلمہ کو بلند اور اپنے دین کو غالب کرنے کے لئے، اور اپنے بندوں میں سے کمزور مومنین کو نجات دلانے کے لئے، اگر چہ اس میں جانوں کا ضیاع ہو)۔

ان آیات کے مضمون سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمان جو کسی ملک میں ظلم اور جبر واستبداد سے دو چار ہیں انکی مدد کرنا، ظلم سے نجات دلانا، ان کے حق میں ظالم ملک کے خلاف آواز اٹھانا اور ان کو اپنے ملک میں جگہ دینا کسی بھی مسلم ملک پر لازم ہے۔

۴- کسی ملک کا شہری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک کے مفاد، اسکے اموال وجائداد کے تحفظ اور اس کے دفاع کے حقوق اپنے ذمہ تسلیم اور لازم کئے جائیں، جیسا کہ ملک کے اوپر اس کے شہریوں کے تحفظ، انکی حمایت، ان کے لئے روزگار کے مواقع فراہم کرنے، ان کے باہمی معاملات وخصومات میں انصاف دلانے وغیرہ کے حقوق عائد ہوتے ہیں، اس لحاظ سے کسی بھی شہری کو اپنے ملک میں ہونے والے انتخاب میں امیدوار ہونے، ووٹ دینے، سرکاری اداروں میں ملازمت کرنے، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے، سرکاری ہسپتالوں میں علاج، عدالتی چارہ جوئی، روزگار ومعاش، اور پیشگی اجازت کے بغیر ملک کے کسی بھی حصہ میں آمدورفت کے حقوق حاصل ہونگے۔

۵- مسلم ملک میں پناہ لینے والے اگر مسلمان ہیں تو ان کو وہ سارے حقوق حاصل ہوں گے جو وہاں کے کسی شہری کو حاصل ہیں، جیسا کہ نصوص مذکورہ سے معلوم ہوتا ہے، اور اگر پناہ لینے والے غیر مسلم ہیں، تو پھر یہ سربراہان مملکت کی صواب دید پر ہوگا، اولی یہ ہے کہ انھیں پناہ دی جائے۔

"**ولا خلاف بين كافة العلماء أن أمان السلطان جائز ،لأنه مقدم للنظر والمصلحة،نائب عن الجميع فى جلب المنافع ودفع المضار**"(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۷۶/۸)۔

نیز آیت کریمہ میں ارشاد ہے:"**وإن أحد من المشركين استجارک فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه،ذلک بأنهم قوم لايعلمون** "(سورہ توبہ آیت ۶)۔

اس آیت کی تفسیر میں منقول ہے:"**وقال ابن القاسم :وكذلک الذى يوجد وقد نزل تاجرا**

بساحلنافیقول :ظننت أن لا تعرضوا لمن جاء تاجرا حتی یبیع ،وظاهر الأیة إنما هی فیمن یرید سماع القرآن و النظر فی الاسلام،فأما الإجازة لغیر ذلک، فإنما هی لمصلحة المسلمین والنظر فیما تعود علیهم به منفعته"(الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۸/۷۶)۔

(ابن قاسم نے کہا ہے کہ ایسے ہی وہ شخص جو پایا جائے، حاصل یہ کہ وہ آیا ہو ہمارے علاقہ میں بطور تاجر کے، اور وہ کہے کہ میرا گمان یہ تھا کہ آپ لوگ تجار سے تعرض نہیں کرتے ،(یعنی اس کو بھی پناہ دی جائے گی) اور ظاہر آیت یہ ہے کہ یہ حکم اس شخص کے بارے میں ہے جو قرآن سننے اور اسلام کے بارے میں سمجھنے کا ارادہ رکھتا ہو، بہر حال اس کے علاوہ کے لئے اجازت تو مسلمانوں کی مصلحت اور ان کی منفعت کے پیش نظر ہوگی)۔

لہذا جو مظلوم ہو کر اسلامی مملکت کی حدود میں بغرض پناہ داخل ہوئے ہیں ان کو مامون ہونے تک پناہ دینا انسانی اخوت کے تقاضہ کو پورا کرنا ہے،

البتہ ان غیر مسلم پناہ گزینوں کو مسلمان شہریوں جیسے حقوق حاصل نہیں ہونگے ،ان کو پیشگی اجازت کے بغیر ملک کے کسی بھی حصہ میں آمد ورفت کا حق نہیں ہوگا ،اور نہ انتخابات یا انتظامی امور میں کسی طرح کا حق ان کو حاصل ہوگا، اور نہ سرکاری ملازمتوں یا سرکاری اداروں میں تعلیم کا حق ان کو ہونا چاہئے۔

۶-مسلمانوں کا غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنا شرعی اعتبار سے مختلف فیہ ہوسکتا ہے۔

بعض وجوہ سے یہ نا جائز اور حرام معلوم ہوتا ہے، کیونکہ کسی مسلمان کا کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا، مرادف ہے اس غیر مسلم ملک اور اس کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ محبت وموالاۃ کو، اسکے شریعت مخالف قوانین کے تسلیم کرنے کو، اس کی فوج میں شرکت اور اس کی طرف سے دفاع کرنے کو جو کسی مسلم ملک کے خلاف بھی ہوسکتا ہے، اور قرآن وحدیث میں ان امور سے ممانعت وارد ہے۔

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:"**لا یتخذ المؤمنون الکافرین أولیاء من دون المؤمنین،ومن یفعل ذلک فلیس من الله فی شئ الا أن تتقوا منهم تقاة، و یحذرکم الله نفسه وإلی الله المصیر**" (آل عمران ۲۸)۔

ایک دوسری آیت میں ارشاد ہے:"**یأیها الذین آمنوا لا تتخذوا الکافرین أولیاء من دون المؤمنین ، أتریدون أن تجعلوا لِله علیکم سلطانا مبینا**" (النساء ۱۴۴)۔

ایک اور آیت میں ارشاد ہے:"**یأیها الذین آمنوا لا تتخذوا الیهود والنصاری أولیاء بعضهم أولیاء بعض ،ومن یتولهم منکم فإنه منهم ،إن الله لایهدی القوم الظلمین**" (المائدہ ۵۱)، نیز اس مفہوم کی متعدد آیات

ہیں جس میں کفار ومشرکین کی موالاۃ سے ممانعت وارد ہے۔

اسی طرح اللہ اور اس کے رسول کی شریعت کے خلاف حکم کے بارے میں وارد ہے: "**فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینهم**" (النساء ۶۵) اور "**ومن لم یحکم بما أنزل الله فأولئک هم الکافرون**" اور "**أولئک هم الظلمون**" (المائدہ ۴۴،۴۵)۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "**أنا بریء من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین**" (سنن ابوداؤد ۲۶۴۵)۔

(میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے بیچ قیام کرے)۔

ایک اور حدیث میں ہے: "**من جامع المشرک وسکن معه، فإنه مثله**" (سنن ابوداؤد ۲۷۸۷)۔

(جو شخص مشرک کے ساتھ اٹھے بیٹھے، اور اس کے ساتھ سکونت اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے)۔

جن میں صراحۃً مشرکیں کے ساتھ سکونت سے منع کیا گیا ہے، نیز بہز بن حکیم سے مروی ایک حدیث میں مذکور ہے: "**لا یقبل الله عز وجل من مشرک بعد ماأسلم عملاأو یفارق المشرکین إلی المسلمین**" (سنن النسائی ۵ / ۸۳، کتاب الزکاۃ)۔

"**أی الی أن یفارق، وحاصله أن الهجرة من دار الشرک إلی دار الإسلام واجب علی کل من آمن، فمن ترک فهو عاص یستحق رد العمل**" (السندی فی شرحہ)۔

نیز غیر مسلم ممالک میں سکونت کا ایک زبردست نقصان یہ ہے کہ باہمی اختلاط کی وجہ سے غیر مسلموں کی بہت ساری عادات، انکے طور طریقے، انکے رسوم ورواج غیر شعوری طور پر مسلمانوں کی طرف منتقل ہوتے رہتے ہیں، اور بہت سارے منکرات کے منکر ہونے کا احساس نہیں رہ جاتا، حتی کہ غیر شعوری طور پر کچھ غیر شرعی معتقدات اور افکار ونظریات بھی رچ بس جاتے ہیں۔

اس لئے ایک رجحان تو یہ ہے کہ مسلمانوں کو غیر اسلامی ممالک کی شہریت نہیں اختیار کرنی چاہئے۔

اور بعض وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہے، جیسا کہ متعدد صحابہ کو ایمان لانے کے بعد آپ ﷺ نے ان کے اپنے ہی قبیلہ میں رہنے کا حکم دیا، مگر اس کا جواب یہ ہوسکتا ہے کہ اس وقت ابھی کسی اسلامی سلطنت کا قیام نہیں ہوا تھا۔

دوسری وجہ جواز مسلمانوں کو حبشہ کی طرف ہجرت اور وہاں قیام کا حکم دینا ہے، وجہ استدلال، مدینہ منورہ میں اسلامی

ریاست کے قیام کے بعد بھی ایک طویل مدت تک مسلمانوں کا حبشہ میں باقی رہنا ہے، مہاجرین حبشہ کی واپسی مدینہ منورہ ۷ ہجری میں ہوئی ہے۔

ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے: "**أن أعرابيا سأل رسول الله ﷺ عن الهجرة فقال: ويحک أن شأن الهجرة لشديد، فهل لک من إبل ؟قال نعم ،قال : فهل تؤتي صدقتها ؟ قال نعم ،قال : فاعمل من وراء البحار ،فان الله لن يترک من عملک شيئا** "(صحیح مسلم، کتاب الامارہ)۔

(ایک اعرابی نے رسول اللہ ﷺ سے ہجرت کے متعلق سوال کیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ہجرت کا معاملہ تو مشکل ہے، کیا تمھارے پاس اونٹ ہیں ؟ اس نے کہا، ہاں، آپ نے فرمایا اس کی زکوۃ ادا کرتے ہو، اس نے کہا، ہاں، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: گاؤں میں ہی رہ کر عمل کرو، اللہ تعالی تمھارے عمل کے ثواب میں کوئی کمی نہیں کریں گے)۔

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر مسلمان اپنے فرائض پر عمل کرتا ہے تو کہیں بھی سکونت اختیار کرے، اسکے لئے اجازت ہے. اس کی تائید ایک دوسری حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے : "**قال رسول الله ﷺ : البلاد بلاد الله والعباد عباد الله ،فحيثما أصبت خيرا فأقم**" (مسند احمد ۱/۱۶۶، فیض القدیر ۳/۲۲۳، حدیث ۳۲۲۱)۔

(ملک اللہ کا ہے اور بندے اللہ کے ہیں، جہاں خیر ملے وہاں قیام کرلو) (مگر اس حدیث کی سند کو ضعیف قرار دیا گیا ہے)۔

دونوں رجحانات کے مآخذ و دلائل کے پیش نظر: ایک رجحان یہ بھی سامنے آتا ہے، کہ بہتر یہ ہے کہ اگر مسلمان کو کسی مسلم ملک کی سکونت میسر ہو تو بلا وجہ شرعی یا ضرورت شدیدہ کسی غیر مسلم ملک کی سکونت اختیار نہ کرے، بسا اوقات ایک مسلمان ملک میں ہی شریعت کا پابند مسلمان ظلم وستم کا شکار ہوتا ہے، اس کے لئے اپنے شرعی احکام پر عمل کرنا مشکل ہوتا ہے، اور کسی دوسرے مسلم ملک میں رہائش کی سہولت میسر نہیں ہوتی، اور کسی غیر مسلم ملک میں اسے اپنی شریعت پر عمل کی آزادی ملتی ہے، جیسا کہ موجودہ دور میں اکثر ممالک کا یہی حال ہے، تو اس صورت میں کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہونی چاہئے۔

اسی طرح وہ مسلمان جو کسی غیر مسلم ملک کے ہی اصل باشندہ ہیں، اور انکے لئے وہاں اپنی شریعت پر عمل کرنے میں کوئی پابندی اور مشکل نہیں ہے، تو ان پر اپنے ملک کو چھوڑ کر کسی مسلم ملک کی طرف ہجرت کو لازم و واجب نہیں کہا جائیگا، کیونکہ علی الاطلاق ہجرت کی فرضیت فتح مکہ سے پہلے تک ہی تھی "**لاهجرة بعد الفتح**"۔

اسی طرح اگر کوئی مسلمان دعوت وتبلیغ اور اشاعت اسلام کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی سکونت اختیار کرتا ہے تو اسے بھی ناجائز نہیں ہونا چاہئے "انما الأعمال بالنیات"، محض معاشی مفاد کی غرض سے کسی غیر مسلم کی سکونت کو اختیار کرنا درست نہیں ہوگا۔ ان نصوص کے پیش نظر جو غیر مسلموں کے ساتھ رہائش کی ممانعت پر مشتمل ہیں۔

۷- البتہ مسلم ملک میں غیر مسلم کو سکونت ورہائش کی اجازت دی جاسکتی ہے، مدینہ منورہ میں اسلامی قوت وغلبہ کے بعد بھی وہاں یہودیوں کو رہائش کی اجازت تھی اور اسکے بعد فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا اسلامی ریاست میں توسیع ہوئی، اور خلافت راشدہ، خلافت امویہ، خلافت عباسیہ اور خلافت عثمانیہ، تمام ہی ادوار میں غیر مسلموں کو اسلامی سلطنت میں، مستقل شہری کی حیثیت سے رہائش کی اجازت رہی ہے، خواہ جزیہ لیکر یا بغیر جزیہ کے، اور ان کے حقوق کی رعایت کی گئی ہے، البتہ جزیرۃ العرب میں بشمول یہود ونصاری کسی بھی غیر مسلم کو مستقل رہائش کی اجازت نہیں دی جائیگی۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: "أخرجوا المشرکین من جزیرة العرب" اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے لکھا ہے: " **قال الطبری: فیه أن علی الإمام إخراج کل من دان بغیر دین الإسلام من کل بلد غلب علیهاالمسلمون عنوة إذا لم یکن بالمسلمین ضرورة إلیهم کعمل الأرض ونحو ذلک**" (صحیح بخاری مع فتح الباری ۲۷۱/۶ ح۳۱۶۸)۔

(مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکال باہر کرو،........طبری نے کہا ہے کہ اس حدیث میں یہ ہے کہ امام پر واجب ہے کہ ہر اس شخص کو جو اسلام کے ولاوہ کسی اور دین پر ہو۔ اس کو ہر اس ملک سے نکال دے، جس پر مسلمانوں کا قبضہ بزور وقوت ہوا ہو، جبکہ مسلمانوں کو ان کی ضرورت نہ ہو)۔

اگر چہ اس صورت میں بھی اس کا خدشہ ہے کہ ان کے غیر اسلامی عادات واطوار، اختلاط کی وجہ سے مسلمانوں میں سرایت کریں گے، لیکن اس کی تلافی ممکن ہے، اس لئے کہ غلبہ اسلامی قوت کا ہوگا، اور اس خطرہ کے پیش نظر ان پر کچھ پابندیاں عائد کی جاسکتی ہیں، نیز حاکم وقت کی صوابدید پر اور عام مسلمانوں کے مفاد کی مصلحت میں ان کو حسب ضرورت وتقاضا، انتظامی امور میں بھی شامل کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

حقوق شہریت کی حقیقت واصلیت شرعی نقطہ نظر سے

مولانا محمد مصطفیٰ قاسمی آواپوری☆

۱- اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے اسلام کے عطا کردہ بنیادی حقوق کو ہی اساس و بنیاد بنایا جائے گا، تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام میں بنیادی حقوق کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان کا وجود، خالق و مالک نے جس طرح اس کی طبعی زندگی کے لئے ہوا، پانی، خوراک، روشنی اور دوسرے بے شمار اسباب زندگی فراہم کئے ہیں اسی طرح اسے معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے ایک ضابطہ حیات بھی آغاز زندگی کے ساتھ ہی عطا کردیا گیا تھا۔ دنیا میں بھیجنے اور منصب خلافت پر فائز کرنے سے پہلے اسے حقوق وفرائض کا شعور عطا کردیا گیا تھا اور اسباب زندگی کی فراہمی کے ساتھ ہی آداب زندگی بھی سکھا دیا گیا تھا (سورہ بقرہ: ۳۰ تا ۳۸، معارف القرآن ۱/۱۱۸ تا ۱۲۸، تفہیم القرآن ۱/ ۶۳ تا ۶۹ مرکزی جماعت اسلامی ہند پبلشرز نئی دہلی ۲۰۰۴، نیز اس کی تفصیلات کے لئے دیکھئے: بنیادی حقوق ص/۱۱۷ تا ۱۲۴ محمد صلاح الدین ایڈیٹر جسارت مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی ۱۹۸۹ء)۔

حق کا مطلب ہے ثابت قدم، یعنی ٹھہرنے والا، نہ مٹنے والا، جو بات ثابت ہو اٹل ہو اور امٹ ہو اسے ''حق'' کہا جاتا ہے، ''حق'' اللہ تعالی کا نام بھی ہے، کیونکہ اس سے بڑھ کر اور کون ہے جو ثابت ہو، اٹل اور امٹ ہو، ارشاد باری تعالی ہے: ''**انه لحق مثل ما أنكم تنطقون**'' (سورۂ ذاریات: ۲۳) (وہ برحق ہے جیسا تم باتیں کررہے ہو)۔ حق کے معنی سچ کے بھی ہیں کیونکہ سچائی اٹل اور امر ہوتی ہے، حق اس مانگ کو بھی کہتے ہیں جو پکی اور سچی ہو، جس سے آپ انکار نہ کرسکیں، جن کا پورا کرنا ضروری ہو، جیسے اللہ کا حق، رسول اللہ ﷺ کا حق، ماں باپ کا حق، استاد کا حق، بہن بھائی اور رشتہ داروں کا حق، پڑوسیوں، محلّہ والوں، گاؤں والوں کا حق، حکمراں کا حق، عوام ورعایا کا حق، ایک مسلمان کا رض ہے کہ وہ ہر ایک حق دار کا حق پہنچانے اور اس کو ادا کرے اسی طرح حکمراں کا فرض ہے کہ عوام ورعایات کا حق جو ان پر ہے اس کو پہنچانیا وراس کو ادا کرے، ارشاد گرامی ہے: ''**فاعط كل ذی حق حقه**'' (ترمذی ۲/ ۶۷، ابواب الزہد، باب ہذا حدیث صحیح) (رسول اللہ ﷺ نے ارشاد

☆ مدرسہ اسلامیہ شکرپور بھروارہ، دربھنگہ بہار۔

فرمایا: پھر تو ہر ایک حق دار کو اس کا حق ادا کرو) اس سے یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ حقوق شہریت بھی تمام انسانوں کے لئے واجبی ولازمی حقوق ہیں یہ ایسے بنیادی حقوق ہیں جس سے دست برداری مشکل ترین اور کٹھن مرحلہ ہے، بلکہ ان حقوق کے نہ ملنے کی صورت میں عدالتی چارہ جوئی کے ذریعہ حقوق حاصل کرنے کا شرعا حق حاصل ہے۔

۲- شہریت دراصل اس وابستگی کی بنیاد ہے جو موجودہ حکومتوں کے لئے ''وطنیت'' کو شناخت قرار دیتی ہے، شہریت اس مٹی سے وابستگی کا نام ہے جو ایک جغرافیائی دائرہ کے اندر محدود ہوتی ہے، اس مٹی سے جو بھی وابستہ ہوں گے وہ شہری ہوں گے اور شہریت کے وہ سارے حقوق اور ذمہ داریاں ان پر عائد ہوں گی (حقوق شہریت ص ۶ طبع قاضی پبلشر زنئی دہلی)۔

عصر حاضر میں مساوات اور قومی سالمیت اور انسانی آزادی کے احترام کا دور جو موجودہ زمانہ میں پیدا ہوا ہے اس کو عام طور پر لوگ اس جدید مغربی انقلاب سے منسوب کرتے ہیں جس کی ایک علامت اقوام متحدہ ہے، مگر خود جدید انقلاب اور اقوام متحدہ اس اسلامی انقلاب کی پیداوار ہیں جو چودہ سو سال پہلے پیغمبر اسلام اور آپ ﷺ کے اصحاب نے عالمی سطح پر پیدا کیا تھا (سفر نامہ غیر ملکی اسفار جلد اول ص ۳۶۷ مولانا وحید الدین خاں)۔

بین الاقوامی ادارہ حلف الفضول ''اقوام متحدہ'' کا قیام حضور ﷺ کے دور میں ۵۸۶ھ میں ہوا، اس ادارہ کی تشکیل وتالیف میں آپ ﷺ نے بھی معاونت کی تھی اس وقت آپ ﷺ کی عمر ۲۰ سال کی تھی، ان کے چار ارکان تھے ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں: فضل، فضالہ، مفضل، فضیل، عبد اللہ بن جدعان بنی تیم کے سردار کے گھر پر اس ادارہ کی تشکیل ہوئی تھی (حلف الفضول کی تفصیل کے لئے دیکھئے: لسان العرب ۱۱/۵۲۷ دار صادر بیروت لبنان)۔

عصر حاضر میں اقوام متحدہ نے جو انسانی حقوق کا چارٹر تیار کیا ہے، ۳۰ دفعات پر مشتمل جن میں شہریت سے متعلق دفعات حسب ذیل ہیں:

۱- ہر فرد کو اپنی حدود ریاست میں نقل وحرکت اور رہائش کی مکمل آزادی حاصل ہوگی۔

۲- ہر فرد کو بیرون ملک جانے اور اپنے ملک واپس آنے کا حق حاصل ہوگا۔

۳- ہر فرد کو ظلم وتشدد سے بچنے کے لئے دوسرے ممالک میں پناہ لینے کا حق حاصل ہوگا۔

۴- ہر فرد کو شہریت حاصل کرنے کا حق ہوگا۔

۵- کسی فرد کو بلا جواز اس کی شہریت سے محروم نہیں کیا جائے گا اور نہ شہریت کی تبدیلی کا حق سلب کیا جائے گا۔

۴- آئین بھارت کے تناظر میں حقوق شہریت کی وضاحت وصراحت:

دفعہ ۵- اس آئین کی تاریخ نفاذ پر ہر وہ شخص بھارت کا شہری ہوگا جس کی بھارت کے علاقہ میں مستقل جائے

سکونت ہواور

الف- جو بھارت کے علاقہ میں پیدا ہوا تھا، یا

ب-جس کے والدین میں سے کوئی ایک بھارت کے علاقہ میں پیدا ہوا تھا، یا

ج- جو ایسی تاریخ نفاذ کے عین قبل کم سے کم پانچ سال تک بھارت کے علاقہ کا معمولا باشندہ رہا ہو۔

دفعہ ۶ - دفعہ ۵ میں کسی امر کے باوجود کسی شخص کا جس نے اس علاقہ سے جو اس وقت پاکستان میں شامل ہے بھارت کے علاقہ میں ترک وطن کیا ہے، اس آئین کی تاریخ نفاذ پر بھارت کا شہری ہونا متصور ہوگا اگر۔

الف- وہ یا اس کے والدین میں سے کوئی ایک یا اس کے والدین کے والدین میں سے کوئی بھارت میں جس کی تعریف گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء میں کی گئی ہے (جیسا کہ وہ ابتداء وضع کیا گیا تھا) پیدا ہوا تھا؛

ب- (۱) اس صورت میں جب ایسے شخص نے ۱۹/ جولائی ۱۹۴۸ء سے پہلے اس طرح ترک وطن کیا ہو کہ وہ اس کے ترک وطن کرنے کی تاریخ سے بھارت کے علاقہ کا معمولا باشندہ رہا ہو، یا۔

(۲) ایسی صورت میں جب ایسے شخص نے ۱۹/ جولائی ۱۹۴۸ء کو یا اس کے بعد بھارت میں اس طرح ترک وطن کیا ہے کہ اس کا نام بھارت ڈومینین کی حکومت کے اس بارے میں تقرر کیئے ہوئے کسی عہدہ دار نے اس کی درخواست پر بھارت کے شہری کی حیثیت سے درج رجسٹر کیا ہو جو اس نے اس عہدہ دار کو اس حکومت کے مقرر کیئے ہوئے نمونہ اور طریقہ کے مطابق اس آئین کی تاریخ نفاذ کے قبل اس غرض سے دے دی ہو۔

بہ شرط کہ کسی شخص کا اس طرح سے درج رجسٹر نہ ہوگا بہ جز اس کے کہ وہ بھارت کے علاقہ کا اس کی درخواست کی تاریخ سے عین قبل کم سے کم چھ ماہ تک باشندہ رہا ہو (دیکھئے بھارت کا آئین ص ۴۰ تا ۴۲، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی)۔

اسلامی تناظر کی روشنی میں شہریت حاصل ہونے یا کرنے کے لئے کسی ملک میں بودوباش اختیار کرلینے، وہاں معاشی سرگرمیاں انجام دینے، ایک مخصوص مدت تک وہاں قیام کرنے کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے، قرآن وسنت سے یہ بات واضح ہے کہ ہر شخص کو ساری سہولیات حاصل ہے، اب اگر اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو اس کی ڈکٹیٹر شپ ہوگی اس کے لئے دیکھئے (سورۂ بقرہ: ۳۰ تا ۳۸، ۸۵ سورۂ اعراف: ۱۲۸، سورۂ روم ۲۱ تا ۲۳، مسند امام احمد بن حنبل ۸۶/۲۴، مسلم ۱۲۶/۲، بین الاقوامی منشور کی دفعہ ۱۵) ہر فرد کو شہریت حاصل کرنے کا حق ہوگا، کسی فرد کو بلا جواز اس کی شہریت سے محروم نہیں کیا جائے گا، اور نہ شہریت کی تبدیلی کا حق سلب کیا جائے گا، ہر ملک کے حکمراں کو ایسے شخص کو خوشی بہ خوشی حقوق شہریت دے دینی چاہئے اس میں ٹال مٹول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

غیر ملکی مسلمان کسی ملک کی شہریت اختیار کرنے کی خواہش کرے تو اس کی درخواست قبول کرنا شرعاً ضروری ہوگا:

اگر ایک مسلم ملک یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً ضروری ولابدی ہوگا، فتح مکہ کے وقت بہت سے روسا قریش جو پہلے سے اسلام کی حقانیت کا یقین رکھتے تھے، مگر برادری کے خوف سے اظہار نہ کر سکتے تھے، اب ان کو موقع مل گیا وہ مشرف بہ اسلام ہوگئے اور جو اس وقت بھی اپنے قدیم مذہب کفر پر جمے رہے ان کو بہ جز معدودے چند افراد کے رسول کریم ﷺ نے سب کو جان و مال کا امان دے کر پیغمبرانہ اور معجزانہ اخلاق کا ثبوت دیا جس کا دوسرے لوگوں سے تصور بھی نہیں ہوسکتا، ان کی تمام گذشتہ عداوتوں اور مظالم اور بے رحمی کے واقعات کو یکسر نظر انداز فرما کر ارشاد فرمایا کہ میں آج تم سے وہی بات کہتا ہوں جو یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں سے اس وقت کہی تھی، جبکہ وہ والدین کے ساتھ یوسف علیہ السلام کے پاس مصر پہنچے (معارف القران ۵/۳۰۹)۔

آپ ﷺ نے فتح مکہ کے وقت مغلوب دشمنوں کے ساتھ بے نظیر کریمانہ سلوک کیا اور یہ ایک مجبور مسلمان ہے جو مسلم ملک کے حکمراں سے اپنے یہاں امن و امان کے ساتھ سکونت پذیر ہونے کی درخواست کرتا ہے تو بدرجہ اولی اس کی درخواست کو قبول کرنا چاہئے، کیونکہ یہ اقدام اسوہ حسنہ کے مطابق ہے۔

"وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأمنه ذلك بأنهم قوم لا يعلمون" (سورۂ توبہ:۶) (اور اگر کوئی مشرک تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ سن لے کلام اللہ کا، پھر پہنچا دے اس کو اس کی امن کی جگہ، یہ اس واسطے کہ وہ لوگ علم نہیں رکھتے)۔

تشریح: اس آیت سے بھی چند مسائل اور فوائد حاصل ہوئے جن کو امام ابوبکر جصاص نے تفصیل سے بیان کیا ہے، اول یہ کہ اس آیت سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی کافر مسلمان سے اس کا مطالبہ کرے کہ مجھے اسلام کی حقانیت دلیل سے سمجھاؤ تو مسلمان پر لازم ہے کہ اس کا مطالبہ پورا کریں۔

دوسرے یہ کہ جو شخص اسلام کی تحقیق اور معلومات حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس آئے تو ہم پر واجب ہے کہ اس کو اجازت دیں اور اس کی حفاظت کریں، اس کو کسی قسم کی تکلیف یا نقصان پہنچانا جائز نہیں، تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ حکم اس صورت میں ہے، جبکہ اس کے آنے کا مقصد اللہ کا کلام سننا اور اسلام کی تحقیق کرنا ہو اور اگر کوئی دوسری غرض تجارت وغیرہ ہو تو وہ مسلمانوں کے مصالح اور حاکم مسلمین کی صوابدید پر موقوف ہے، مناسب سمجھے تو اجازت دے، ورنہ اختیار ہے، تیسرے یہ

کہ غیر مسلم حربی جس کے ساتھ ہمارا کوئی معاہدہ نہ ہو اس کو ضرورت سے زیادہ ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے چوتھے یہ کہ مسلمان حاکم وامیر کے فرائض میں سے ہے کہ جب کوئی حربی غیر مسلم کسی ضرورت کی بنا پر ہم سے اجازت (ویزا) لے کر ہمارے ملک میں داخل ہو تو اس کے حالات پر نظر رکھے اور جب وہ اپنا کام پورا کر چکے تو اس کو حفاظت کے ساتھ واپس کر دے (تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ۴/ ۳۱۸، ۳۱۹)۔

"لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخروجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا اليهم إن الله يحب المقسطين" (سورۂ ممتحنہ:۸) (اللہ تم کو منع نہیں کرتا ان لوگوں سے جو لڑتے نہیں تم سے دین پر اور نکالا نہیں تم کو تمہارے گھروں سے کہ ان سے کرو بھلاؤ اور انصاف کا سلوک بے شک اللہ چاہتا ہے انصاف والوں کو)۔

تشریح: صحیح بخاری حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیقؓ سے روایت ہے کہ ان کی والدہ بہ حالت کفر مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ پہنچیں، مسند احمد کی روایت میں ہے کہ یہ واقعہ اس وقت کا ہے، جبکہ غزوہ حدیبیہ کے بعد قریش مکہ سے معاہدہ صلح ہو گیا تھا اور ان کی والدہ کا نام قتیلہ ہے، یہ اپنی بیٹی اسماء کے لئے کچھ تحفے ہدیئے لے کر مدینہ طیبہ پہنچیں تو حضرت اسماءؓ نے ان کے تحفے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا، اور اپنے گھر میں آنے کی بھی اجازت اس وقت تک نہ دی جب تک کہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت نہ کر لیا، غرض حضرت اسماءؓ نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میری والدہ مجھ سے ملنے کے لئے آئی ہیں اور وہ کافرہ ہیں ان کے ساتھ کیا سلوک کروں؟ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اپنی والدہ کی صلہ رحمی کرو، یعنی ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو؟ اس پر یہ آیات نازل ہوئی **"لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين"** (سورۂ ممتحنہ:۸)، یعنی روایات میں ہے کہ حضرت اسماءؓ کی والدہ قتیلہ کو صدیق اکبرؓ نے زمانہ جاہلیت میں طلاق دے دی تھی، حضرت اسماءؓ اسی کے بطن سے تھیں اور ان کی بہن ام المومنین حضرت عائشہؓ صدیق اکبرؓ کی دوسری بیوی ام رومان کے بطن سے تھیں، یہ مسلمان ہو گئی تھیں (ابن کثیر ومظہری)۔

اس آیت میں ایسے کفار جنہوں نے مسلمانوں سے مقاتلہ نہیں کیا، اور ان کے گھروں سے نکالنے میں بھی کوئی حصہ نہیں لیا ان کے ساتھ احسان کے معاملہ اور اچھے سلوک اور عدل وانصاف کرنے کی ہدایت دی گئی ہے، عدل وانصاف تو ہر کافر کے ساتھ ضروری ہے جس میں کافر ذمی اور مصالح اور کافر حربی ودشمن سب برابر ہیں، بلکہ اسلام میں تو عدل وانصاف جانوروں کے ساتھ بھی واجب ہے کہ ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بار نہ ڈالے اور ان کے چارے اور آرام کی نگہداشت رکھے، اس آیت میں اصل مقصود بر واحسان کرنے کی ہدایت ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: معارف القرآن ۸/ ۴۰۵، ۴۰۶)۔

زبدۃ الخلاصہ: سورۂ توبہ آیت ٦ سے یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ جب اللہ تعالیٰ ایک مشرک کو پناہ دینے کی اجازت دیتے ہیں اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیتے ہیں تو پھر مجبوری و اضطراری حالت میں ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان کسی دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً بہ درجہ اولیٰ واجب ہوگیا، کیونکہ یہ مظلوم اور بے آسرا ہے مصیبت زدوں کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کرنے کی ضرورت ہے، جب یہ شخص مستقل سکونت پذیر ہونے کے لئے درخواست دے رہا ہے، تاکہ اس ملک کے سماج میں گھل مل کر اپنی باقی ماندہ زندگی بسر کر سکے تو اس مسلم ملک کے حکمراں کو شرعی نقطہ نظر سے خوش دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اجازت دے کر اپنی عاقبت بنانے کی سعی بلیغ کرنی چاہئے، اس سے ان کے ملک کی آبادی بڑھے گی، تجارت و معیشت کی منڈی آباد ہوگی اور خوشحالی آئے گی، طرح طرح کے بیش بہا فوائد حاصل ہوں گے۔

سورۂ ممتحنہ آیت ۸ سے بھی یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو اصل مقصود بر و احسان کرنے کی ہدایت کر رہے ہیں، حضرت قتادہؓ فرماتے ہیں؛ عہد جاہلیت کے ہر اچھے اخلاق کو اسلام نے برقرار رکھا اور ہر بری عادت و اخلاق سے باز رہنے کا حکم دیا، اسلام نے گھٹیا اخلاق اور ناپسندیدہ عادات سے روک دیا ہے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو قبائل عرب کے سامنے دعوت اسلام پیش کرنے کا حکم دیا، چنانچہ حج کے موقع پر قبیلہ ابن شیبانی بن ثعلبہ کے پاس حضور ﷺ تشریف لے گئے اور انہیں اسلام اور اپنے تعاون کی دعوت دی۔

ان تمام معروضات کی روشنی میں یہ بات الم نشرح ہوگئی کہ اس دوسرے مسلم ملک کے سربراہ اعلیٰ پر اس مظلوم تارکین وطن کی درخواست کو شرعاً قبول کرنا واجب ہوگا۔

پناہ گزیں کو آئین شرعی کی روشنی میں شہری کا درجہ ملے گا:

بعض دفعہ کسی خاص خطہ میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں اور وہاں کے مسلمان کسی اور مسلم ملک کی پناہ لیتے ہیں تو انہیں پناہ گزین کا درجہ دیا جاتا ہے، لیکن انہیں شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، کیا یہ بات شرعاً درست ہے؟ یہ اسلام کی تعلیم نہیں ہے، اسلام ہمدردی، غم خواری خیر خواہی، تعاون و امداد، محبت و الفت احسان و سلوک کا درس دیتا ہے کہ انسان بھی اپنے رب کا پرتو کا پیکر ہے، اس کی سیرت و کردار، گفتار و رفتار سے رحم دلی کا مظاہرہ ہو، شرعی نقطہ نظر سے مسلم ملک کے حکمراں کا یہ رویہ اور سلوک قطعاً درست نہیں ہے، بلکہ سراسر ظلم و ستم ہے اور کیا یہ بات جائز مانی جا سکتی ہے کہ مسلمان تارکین وطن کو دوسرے مسلمان ملک میں اس ملک کے قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی سہولتیں نہیں دی جائیں؟، جب یہ پناہ گزیں کسی مسلم ملک میں آ کر زندگی بسر کرنے لگیں، اس کے ساتھ اپنی وابستگی اور فرمانبرداری کا اظہار بھی کرتے ہوں تو پھر اب تارکین وطن کو اس

مسلمان ملک میں اس ملک کے قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

ارشاد باری تعالی ہے:"**وتعاونوا علی البروالتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان واتقوا الله إن الله شدید العقاب**"(سورۂ مائدہ:۲)(اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو گناہ اور ظلم پر اور ڈرتے رہو اللہ سے بے شک اللہ کا عذاب سخت ہے)۔

"**إنما الصدقات للفقرآء والمساکین والعاملین علیها والمؤلفة قلوبهم وفی الرقاب والغارمین وفی سبیل الله وابن السبیل فریضة من الله والله علیم حکیم**"(سورۂ توبہ:۶۰)(زکوۃ جو ہے سو وہ حق ہے مفلسوں کا اور محتاجوں کا اور زکوۃ کے کام پر جانے والوں کا اور جن کا دل پرچانا منظور ہے اور گردنوں کے چھڑانے میں اور جو تاوان بھریں اور اللہ کے راستہ میں اور راہ کے مسافر کو ٹھہرایا ہوا ہے اللہ کا اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے)۔

چنانچہ زیاد بن حارث صدائی یہ فرماتے ہیں کہ میں ابھی اس مجلس میں حاضر تھا کہ ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں کچھ سوال لے کر حاضر ہوا، آپ ﷺ نے یہ جواب دیا کہ صدقات کی تقسیم کو اللہ تعالی نے کسی نبی یا غیر نبی کے بھی حوالہ نہیں کیا، بلکہ خود ہی اس کے آٹھ مصرف متعین فرمادیئے، اگر تم ان آٹھ میں داخل ہو تو تمہیں دے سکتا ہوں (معارف القرآن ۴ر ۳۹۳)عصر حاضر کے پناہ گزیں تارکین وطن حضرات بھی اس زمرہ میں شامل ہوں گے اور اسی سے سارے حقوق و لوازمات بھی ثابت ہوں گے، شہریت اسلامی حکومت یا غیر اسلامی حکومت کے اندر ہر مسلمان کا حق ہے جہاں وہ پیدا ہوا ہو، یہاں اپنے مل کو چھوڑ کر آتا ہو، ہر حال میں حقوق شہریت پانے کا مستحق ہے۔

"**ان الذین امنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وانفسهم فی سبیل الله والذین اووا ونصروا اولائک بعضهم اولیاء بعض والذین آمنوا ولم یهاجروا مالکم من ولایتهم من شئ حتی یهاجروا وإن استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر إلا علی قوم بینکم وبینهم میثاق والله بما تعملون بصیر**"(سورۂ انفال:۷۲)۔

(جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کی جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں، رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے، مگر ہجرت کرکے (دار اسلام) میں آنہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آجائیں، ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے)۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس کی تشریح وتوضیح کرتے ہوئے یوں رقم طراز ہیں:

یہ آیت اسلام کے دستوری قانون کی ایک اہم دفعہ ہے، اس میں یہ اصول مقرر کیا گیا ہے کہ ''ولایت'' کا تعلق صرف ان مسلمانوں کے درمیان ہوگا جو یا تو درالاسلام کے باشندے ہوں، یا اگر باہر سے آئیں تو ہجرت کر کے آئیں باقی رہے وہ مسلمان جو اسلامی ریاست کے حدود ارضی سے باہر ہوں، تو ان کے ساتھ مذہبی اخوت تو ضرور قائم رہے گی، لیکن ''ولایت'' کا تعلق نہ ہوگا، اوراسی طرح ان مسلمانوں سے بھی یہ تعلق ولایت نہ رہے گا جو ہجرت کر کے نہ آئیں، بلکہ دارالکفر کی رعایا ہونے کی حیثیت سے دار اسلام میں آئیں، ''ولایت'' کا لفظ عربی زبان میں حمایت، نصرت، مددگاری، پشتیبانی، دوستی، قرابت، سرپرستی اوراس سے ملتے جلتے مفہومات کے لئے بولا جاتا ہے، اوراس آیت کے سیاق وسباق میں صریح طور پراس سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے، اور شہریوں کا اپنی ریاست سے، اور خود شہریوں کا آپس میں ہوتا ہے، پس یہ آیت ''دستوری وسیاسی ولایت'' کو اسلامی ریاست کے ارضی حدود تک محدود کردیتی ہے، اوران حدود سے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتہ سے خارج قرار دیتی ہے، اس عدم ولایت کے قانونی نتائج بہت وسیع ہیں جن کی تفصیلات بیان کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے، مثال کے طور پر صرف اتنا اشارہ کافی ہوگا کہ اسی عدم ولایت کی بنا پر دارالکفر اوردار اسلام کے مسلمان ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوسکتے ہیں، ایک دوسرے کے قانونی ولی (Guardian) نہیں بن سکتے، باہم شادی بیاہ نہیں کرسکتے، اوراسلامی حکومت کسی ایسے مسلمان کو اپنے یہاں ذمہ داری کا منصب نہیں دے سکتی جس نے دارالکفر سے شہریت کا تعلق نہ توڑا ہو، علاوہ ازیں یہ آیت اسلامی حکومت کی خارجی سیاست پر بھی بڑا اثر ڈالتی ہے، اس کی رو سے دولت اسلامیہ کی ذمہ داری ان مسلمانوں تک محدود ہے جو اس کی حدود کے اندر رہتے ہیں، باہر کے مسلمانوں کے لئے کسی ذمہ داری کا باراس کے سر نہیں ہے، یہی وہ بات ہے جو نبی ﷺ نے اس حدیث میں فرمائی ہے کہ **"انا برئ من کل مسلم یقیم بن أظھر المشرکین"** (میں کسی ایسے مسلمان کی حمایت وحفاظت کا ذمہ دار نہیں ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو) اسی طرح اسلامی قانون نے اس جھگڑے کی جڑ کاٹ دی ہے جو بالعموم بین الاقوامی پیچیدگیوں کا سبب بنتا ہے، کیونکہ جب کوئی حکومت اپنے حدود سے باہر رہنے والی بعض اقلیتوں کا ذمہ اپنے سرے لے لیتی ہے تو اس کی وجہ سے ایسی الجھنیں پڑ جاتی ہیں جن کو بار بار کی لڑائیاں بھی نہیں سلجھا سکیں (تفہیم القرآن ۲/ ۱۶۱ تا ۱۶۲، حقوق شہریت ص ۶۷ تا ۷۲)۔

راشد غنوشی اس سلسلے میں تحریر فرماتے ہیں: شہریت اسلامی حکومت کے اندر ہر مسلمان کا حق ہے دو بنیادی قسم کے لوگ اس سے مستفید ہوتے ہیں، ایک اسلامی حکومت میں سکونت پذیر مسلمان اس کی دلیل درج بالا آیت ہے، دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہیں اصطلاح میں ذمی کہا جاتا ہے، اس قسم میں علامہ مودودی کے بہ قول وہ تمام غیر مسلم لوگ آتے ہیں جو

اسلامی حکومت کے حدود میں رہتے ہوں، اس کے ساتھ اپنی وابستگی اور فرمانبرداری کا اظہار کرتے ہوں، قطع نظر اس سے کہ وہ دیار اسلام ہی میں پیدا ہوئے ہوں یا دوسری جگہ سے آ کر حکومت سے درخواست گزار ہوئے ہوں کہ انہیں اہل ذمہ میں شامل کرلیا جائے، اسلام ایسے تمام لوگوں کو ملک کے داخلی قوانین کے مطابق مسلمانوں کے برابر حقوق عطا کرتا ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: حقوق شہریت ۷۳/۷۸)۔

زبدۃ الخلاصہ: سورۂ انفال: ۷۲ میں شہریت کے لئے دو بنیادوں کا ذکر ہوا ہے، ایک ایمان اور دوسرے دیار اسلام میں سکونت یا اس کی جانب ہجرت، لہذا کوئی مسلمان شخص اگر دیار اسلام کی جانب ہجرت نہیں کرتا ہے اور اسے اپنا وطن بناتا ہے، تو وہ دیار اسلام والوں میں شمار نہیں ہوگا، یعنی جو لوگ دیار اسلام میں سکونت پذیر ہوں خواہ وہیں ان کی پیدائش ہوئی یا دیار کفر سے منتقل ہو کر وہاں آ گئے ہوں وہ دیار اسلام والوں میں شمار ہوں گے اور سبھوں کے حقوق برابر ہوں گے (نظریۂ اسلام وہدیہ رص ۳۰۰ تا ۳۰۱، از مولانا سید ابوالاعلی مودودی بحوالہ حقوق شہریت رص ۷۳)۔

صورت مسئولہ فی السوال کی بھی دراصل حقیقت یہی ہے، لیکن ڈکٹیٹر شپ والے کے نزدیک اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، ان کے نزدیک مسلم سے زیادہ سپر پاور، اور یہودیوں کی حیثیت ہے، اس کی آواز پر غیروں کو دینے کے لئے تیار رہتے ہیں، کیونکہ وہ آقا و مولا ہے، تف ہے ایسی زندگی پر، لیکن اپنے مظلوم تارکین وطن بھائیوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھتے، بہر حال مظلوم مسلمان تارکین وطن کیا ذمیوں کے مقابلہ میں کم تر درجہ رکھتے ہیں، اس لئے یہ فرق امتیاز کیا جا رہا ہے، اسلامی قانونی نقطۂ نظر سے حقوق میں مسلم ذمی و دیگر اقوام برابر ہیں، کسی مسلم والی کو ان میں ترمیم و تنسیخ کا کوئی جواز نہیں ہے تو اس سلسلے میں بھی ان کو رد و بدل اور فرق و امتیاز کا کوئی حق جواز نہیں ہوگا۔

یہ لوگ دیار کفر سے ستم رسیدہ ہو کر دیار اسلام میں آ گئے ہیں، اس لئے یہ تمام تارکین وطن دیار اسلام والوں میں شمار ہوں گے اور سبھوں کے حقوق برابر ہوں گے اور ان لوگوں کو بھی قدیم باشندوں کی طرح شہری تسلیم کیا جائے گا اور ایک شہری ہونے کی تمام سہولتیں فراہم کی جائیں گی (تفصیل کے لئے دیکھئے: الجہاد فی الاسلام)۔

اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے جمیع بنیادی وفاقی حقوق مانے جائیں گے:

تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو اسلام میں بنیادی حقوق کا تصور اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسان کا وجود انسان کے خالق و مالک نے جس طرح اس کی طبعی زندگی کے لئے ہوا، پانی، خوراک، روشنی اور دوسرے بے شمار اسباب زندگی فراہم کئے ہیں، اسی طرح اسے معاشرتی زندگی بسر کرنے کے لئے ایک ضابطہ حیات بھی آغاز زندگی کے ساتھ عطا کر دیا تھا۔

قرآن کی پیش کردہ تاریخ انسانی حقوق اس امر کا واضح ثبوت مہیا کر دیتی ہے کہ اسلام میں بنیادی حقوق کا تصور

اولین انسان کی پیدائش کے دن سے موجود ہے، اور اس سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان حقوق کا ماخذ کیا ہے؟۔

اہل مغرب کا دعوی ہے کہ بنیادی حقوق کی تاریخ صرف تین چار سو سال پرانی ہے، اور انہوں نے اس عرصے میں اپنے یہاں بڑی جدو جہد اور کاوشوں سے جو کچھ حاصل کیا ہے آج پوری دنیا اس سے فیض یاب ہو رہی ہے، لیکن قرآن جو تاریخ ہمارے سامنے پیش کرر ہا ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس دن اولین انسان نے اس دنیا میں قدم رکھا تھا بنیادی حقوق اسی دن سے اس کے احساس و شعور کا حصہ ہیں، اور ان کا حصول و تعین اس کا اپنا کارنامہ نہیں، بلکہ خود مقتدر اعلی نے اسے بہ تدریج یہ حقوق عطا کئے ہیں، آج جہاں کہیں ان حقوق کی بازگشت سنائی دے رہی ہے وہاں الہامی تعلیمات کے پرتو ہی سے بنیادی حقوق کا شعور بیدار ہو رہا ہے۔

قرآن کی پیش کردہ تاریخ کے آئینہ میں دیکھا جائے تو فطری حقوق (Natural Rights) اور پیدائشی حقوق (Birth Rights) کی اصطلاح استعمال کرنے کا حق صرف اسلام کو ہے، کیونکہ ان اصطلاحوں کے سلسلہ میں مغرب کے تصور حقوق میں جو ابہام پایا جاتا ہے وہ یہاں موجود نہیں ہے، اسلام اس سوال کا واضح جواب دیتا ہے کہ ان حقوق کو متعین کس نے کیا ہے؟ جبکہ نظریۂ فطری حقوق کے مغربی علم بردار (Benthem) اور دوسرے معترضین نے اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکے کہ فطرت سے ان کی کیا مراد ہے؟ اور ان حقوق کا تعین کرنے والی اتھارٹی کون ہے؟ بہ الفاظ دیگر ان کی پشت پر سند جواز (Senction) کیا ہے؟ اسلام نے حقوق کے فطری اور پیدائشی پہلو کو پوری وضاحت سے پیش کر کے اس طرح کے کسی اعتراض کی گنجائش نہیں چھوڑی ہے (تفصیل کے لئے دیکھئے: بنیادی حقوق رص ۱۴۷ تا ۱۶۷)۔

اسلامی نقطہ نظر سے شہریوں کو جن بنیادی حقوق کی سہولتیں فراہم کی گئی ہے جو بلا امتیاز عقائد تمام شہریوں کو بہ حیثیت انسان یکساں طور پر حاصل ہیں، وہ مندرجہ ذیل ہیں:

تحفظ دین کا حق، تحفظ نفس کا حق، تحفظ نسل کا حق، تحفظ مال کا حق، تحفظ عقل کا حق، تحفظ عزت و آبرو کا حق، تحفظ نجی زندگی کا حق، تحفظ شخصی آزادی کا حق، عمل غیر کی ذمہ داری سے بریت کا حق، ظلم کے خلاف احتجاج کا حق، آزادی اظہار رائے کا حق، آزادی ضمیر و اعتقاد کا حق، آزادی تنظیم و اجتماع کا حق، مساوات کا حق، حصول عدل و انصاف کا حق، تحفظ معاش کا حق، معصیت سے اجتناب کا حق، سیاسی زندگی میں شرکت کا حق، آزادی نقل و حرکت اور سکونت کا حق، آزادی نقل و حرکت و ہجرت کا حق، اجرت و معاوضہ کا حق، ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق، مذہبی دل آزادی سے تحفظ کا حق، تحفظ ناموس خواتین کا حق، شکوک و شبہات کی بنا پر کاروائی نہ کرنے کا حق، نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون کا حق، معذوروں اور کمزوروں کے تحفظ کا حق، ووٹ دینے کا حق، الیکشن میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی

اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تنگ دو کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر بلا اجازت آمدورفت کا حق، تجارت اور صنعت وحرفت کا حق، مقامات مقدسہ کے تحفظ کا حق، ازدواجی زندگی گذارنے کا حق، رہبانیت سے اجتناب کا حق، ازدواجی زندگی میں شقاق ونفاق حائل ہوجانے پر طلاق کا حق، مسلم لا کے تحفظ کا حق، مسلم اوقاف کے تحفظ کا حق، مساجد ومدارس کے تحفظ کا حق، خانقاہ ومقابر کے تحفظ کا حق، عورت کا حق مہر، عورت کو خلع کا حق، عورت کو نفقہ کا حق، قصاص وخون بہا کا حق، وراثت ووصیت کا حق، معاملات کا حق، تعزیرات و محاربت کا حق، عورت کو عصمت وعفت کی زندگی گذارنے کا حق، عورت کو اپنے محرم کے علاوہ نامحرم سے پردہ کرنے کا حق، عورت کو گھر میں پردہ نشیں رہنے کا حق، یہ سب بنیادی حقوق میں شامل ہیں ان حقوق کو کوئی سلب وغصب نہیں کرسکتا، کیونکہ اللہ تعالی کی جانب سے عطا کردہ حقوق ہیں (تفصیل کے لئے دیکھئے: انسان کے بنیادی حقوق ص ۳ تا ۱۲۹)۔

بنیادی حقوق کی وضاحت ایڈیٹر جسارت کی زبانی:

ان حقوق کی ضمانت ملک کے عام قوانین کی بہ جائے سب سے بالاتر قانون ''دستور'' میں دی جاتی ہے انہیں ''بنیادی حقوق'' اس لئے کہا جاتا ہے کہ ریاست کا کوئی بھی باز وخواہ وہ انتظامی ہو یا قانون سازان کی خلاف ورزی نہیں کرسکتا، یہ حقوق فرد کو کسی ریاست کا شہری ہونے کی حیثیت سے نہیں، بلکہ عالمگیر انسانی برادری کا رکن ہونے کی حیثیت سے حاصل ہوتے ہیں، یہ رنگ، نسل، علاقے، زبان اور دوسرے تمام امتیازات سے ماوراء ہیں اور انسان کو محض انسان ہونے کی بنا پر حاصل ہیں اور اس کے وجود کا لازمی حصہ ہیں، کوئی ریاست انہیں تسلیم یا نافذ کرنے سے گریز کرتی ہے تو اسے فطرت کے عطا کردہ حقوق کو غصب کرنے کا مجرم سمجھا جاتا ہے، کیونکہ یہ حقوق غیر منفک (nalianable) اور ناقابل تنسیخ (Irrevocable) ہیں، ریاست کو ان کی تنسیخ تو کجا ان میں ترمیم، تحدید یا کسی عذر کی بنا پر ان کے عارضی تعطل کا بھی اختیار نہیں، الا یہ کہ خود مقتدر اعلی یعنی عوام نے اسے دستور میں متعین حدود وشرائط کے ساتھ یہ اختیار بخشا ہو، یہ گنجائش بھی صرف مغرب کے دساتیر میں رکھی گئی ہے، اسلامی دستور میں کسی بھی فرد، ادارے، بلکہ بہ حیثیت مجموعی پوری امت تک کو یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ بنیادی حقوق کو کسی بھی صورت میں منسوخ، محدود یا معطل کرسکے (بنیادی حقوق ص ۲۶)۔

بنیادی حقوق (Fundamental Rights) اور قانونی حقوق (Legal Rights) میں آکر اس کے سوا اور کیا فرق ہے کہ بنیادی حقوق ناقابل ترمیم وتنسیخ ہیں، یہ ریاست کے عام اختیارات قانون سازی سے ماوراء ہیں......اس کے برعکس قانونی حقوق عام قانون سازی (Legislation) کے دائرہ میں آتے ہیں اور ریاست جب چاہے اپنے اختیارات قانون سازی کے ذریعہ ان میں ترمیم وتنسیخ اور کمی بیشی کرسکتی ہے۔

شریعت اسلامی کی روشنی میں پناہ گزینوں کو بھی شہریت کے سارے حقوق حاصل ہوں گے:

شریعت اسلامی میں پناہ گزینوں کو بھی وہ سارے حقوق حاصل ہوں گے جو شہریت کے لئے صفت لازم کی حیثیت رکھتی ہے، شہریت کے لئے مسلم، کافر، گورا، کالا، مالدار، غیر مالدار، قدیم باشندہ، جدید باشندہ مرد، عورت، جیسی آہنی دیوار حائل کرنے کی اجازت اسلامی نقطہ نظر سے نہیں دی جائے گی۔

مولانا سید ابوالاعلی مودودیؒ رقم طراز ہیں:

اسلامی حکومت میں شہریوں کے درمیان مساوات کا اصول بالکل طے شدہ ہوتا ہے، مسلم اور غیر مسلم دونوں حقوق اور ذمہ داریوں میں برابر ہوتے ہیں، البتہ عقائد کی چیزیں مستثنیٰ ہوتی ہیں، کیونکہ جس طرح دو برابر اشیاء کے درمیان برابری عدل ہے اسی طرح دو غیر برابر چیزوں کے درمیان برابری ظلم ہے، لہذا اعقائدی امور کے اندر مساوات یہی ہے کہ برابری نہ برتی جائے، شہید عبد القادر عودہؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں یا ذمیوں کو ان کے عقائد کے خلاف چیزوں پر آمادہ کرنا عدل و مساوات کے خلاف ہے۔ مثلاً ذمی کو شراب چھوڑنے کا حکم دیا جائے یا مسلمان کو طلاق نہ دینے کا حکم دیا جائے۔

ذمی کو بھی اسی طرح فکر، اظہار اور عقیدہ کی آزادی حاصل ہے جس طرح ایک مسلمان کو حاصل ہے، بلکہ حربی کو یہ حق بھی حاصل ہے کہ اپنے عقیدہ و مذہب کا دفاع کرے، دوسرے عقائد و مذاہب کے بالمقابل اس کی خوبیوں کا اظہار کرے، شیخ زیدان کے بہ قول اسلامی شریعت میں ذمیوں کو یہ آزادی حاصل ہے کہ وہ قانون اسلامی کے حدود میں رہتے ہوئے اپنے اجتماعات منعقد کریں، امن پسند تنظیمیں قائم کریں اور حکومت کے ساتھ وفاداری برتتے ہوئے دیگر سرگرمیاں انجام دیں (حقوق شہریت راشد غنوشی رص ۷۵)۔

اسی طرح پناہ گزینوں کو بھی سارے حقوق شہریت دیئے جائیں گے جس طرح قدیم باشندوں کو سارے حقوق شہریت حاصل ہیں، جس کو آپ نے پناہ دی ہے تو آپ پر اس کے سارے حقوق کی ادائیگی واجب و لازم ہوگی اس سے بے اعتنائی برتنا شرعاً ممنوع و حرام ہوگا۔

"عن عمر بن الخطاب عن النبی ﷺ فی هذه القصة قال وتغيثوا الملحوف وتهدوا الضال" (ابوداؤد ۲ر ۶۶۳) (حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ اس قصہ میں راستہ میں بیٹھنے والوں کو راستہ کے حقوق کی ادائیگی کے سلسلے میں ارشاد فرمایا مظلوم کی اعانت کرو اور بھٹکے ہوئے راہ گیر کو راستہ کی صحیح رہنمائی کرو)۔

غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرنے کا شرعی حکم:

کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک کے ایک باشندے اور

ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقل مسکن ووطن بنالینا، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف وانقلاب اور رہائش اختیار کرنے والوں کے اغراض ومقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوجاتا ہے،عصر حاضر میں اختلاف نوعیت کی سات قسمیں ہیں:

پہلی قسم:اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا اس کو جیل میں ظلما قید کرلیا جائے یا اس کی جائیداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سواان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو،ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بہ شرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہاں جا کر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے گا،اور وہاں رائج شدہ منکرات وفواحشات سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکے گا۔

دوسری قسم:اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہوجائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ وہ نان جویں کا محتاج ہوجائے ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے جس کی بنا پر وہ وہاں رہائش اختیار کرلے بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہ وہاں جا کر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے گا اور وہاں رائج شدہ منکرات وفواحشات سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے گا،اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے۔اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی، بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو(سورۂ ملک:۱۵)۔

”عن عبد الله قال :قال رسول الله ﷺ: طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة“(المعجم الکبیر الطبرانی ۱۰/۹۰، اتحاف السادۃ المتقین ۱/۱۳۱)(حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ حلال روزی حاصل کرنے کی فکر وکوشش فرض کے بعد ایک فریضہ ہے)۔

تیسری قسم تبلیغی واصلاحی:اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرتا ہے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا اور تبلیغ کرے گا اسی نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا صرف یہ نہیں کہ جائز ہے، بلکہ موجب اجر وثواب ہے، چنانچہ بہت سے صحابہ اور تابعین نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی،اور جو بعد میں ان کے فضائل اور مناقب ومحاسن میں شمار ہونے لگی(سورۂ کہف:۳۰،فقہی مقالات ۱/۲۳۳ مولانا تقی عثمانی)۔

چوتھی قسم معیار زندگی کی بلندی وخوشحالی: اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوش حالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرتا ہے تو ایسی رہائش اختیار کرنا موجب اجر وثواب نہیں ہے، بلکہ مکروہ تحریمی ہے۔

پانچویں قسم تعلّی اور استخفاف اسلام:

پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دار الکفر کی شہریت اور قومیت کو دار الاسلام کی شہریت وقومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود وباش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقا حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (سورۂ توبہ: ۶۹ تا ۷۰، فقہی مقالات ۱/ ۲۳۵)۔

چھٹی قسم تجارتی: اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وتجارتی وسائل حاصل ہیں جن کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے ساتھ تجارت کر کے اعلی معیار کے مطابق ایک اچھے تاجر کی حیثیت سے زندگی گذار سکتا اور اعلی قسم کا تاجر وسیٹھ بن سکتا ہے، لیکن صرف معیار تجارت بلند کرنے کی غرض سے اور اپنا نام ونمود اور شہریت حاصل کرنے کی غرض سے اور اعلی قسم کی خوشحالی اور عیش وعشرت کی زندگی ہنود ویہود اور نصاری جیسی گزارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی رہائش اختیار تا ہے تو ایسی رہائش اختیار کرنا کراہت تحریمی سے خالی نہیں ہے، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات ومنکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے، اور بلا ضرورت اپنی دینی و اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش وعشرت اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ان میں دینی حمیت کمزور ہو جاتی ہے، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں، اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

ساتویں قسم تعلیمی: اسی طرح اگر کوئی شخص اعلی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرتا ہے، حالانکہ خود اس کے ملک اور شہر میں وافر مقدار میں تعلیمی وسائل حاصل ہیں، جس کالج، یا یونیورسٹی اور جس شعبہ تعلیم میں وہ

داخلہ کا خواہش مند ہوگا، اس کی ضرورت تعلیم اکمل طریقہ سے پوری کی جائے گی، کوئی تشنگی باقی نہ رہے گی، مگر مغربی تہذیب و تمدن کا اتنا فریفتہ ہے گویا کہ وہ اس کے نزدیک منزل من السماء ہے، اس لئے وہاں جا کر ہی تعلیم حاصل کرے گا اس کے نگاہ میں اسلامی تہذیب وتمدن فرسودہ اور خام خیالی ہے، ایسی صورت حال میں وہ کسی غیر مسلم ملک میں تعلیمی مشن کی تکمیل کے لئے رہائش کرتا ہے تو ایسی رہائش اختیار کرنا اس کے لئے زہر ہلاہل ثابت ہوگی، اور اسلام کا قلادہ اس کی گردن سے نکل کر مغربی تہذیب وتمدن کے مسموم بحر ذخار کی تہہ میں جا گرے گا، شرعی نقطہ نظر سے مطلقا اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا حرام ہوگا، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (سورۂ توبہ:٦٩ تا ٧٠)۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنے کا شرعی حکم:

”عن أبی هريرة قال: بينما نحن فی المسجد خرج النبی ﷺ فقال: انطلقوا إلی يهود فخرجنا حتی اذا جئنا بيت المدارس فقال اسلموا تسلموا، واعلموا أن الارض لله ورسوله وأنی أريد ان أجليتكم من هذه الأرض فمن يجد منكم بماله شيئا فليبعه، وإلا فاعلمو اأن الأرض لله ورسوله“ (بخاری ۱/۴۴۹، کتاب الجزیۃ والموادعۃ باب اخراج الیہود من جزیرۃ العرب، مکتبہ رشیدیہ دہلی)۔

(حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا کہ ہم ابھی مسجد نبوی میں موجود تھے کہ نبی اکرم ﷺ تشریف لائے اور فرمایا کہ یہودیوں کے پاس چلو چنانچہ ہم روانہ ہوئے یہاں تک کہ یہودیوں کے مدرسہ بیت المدارس پر پہنچے تو آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا اسلام قبول کرلو سلامت رہوگے اور جان لو کہ زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے اور میرا ارادہ ہے کہ تم کو اس زمین ”حجاز“ سے نکال دوں تو اگر تم میں سے کوئی اپنے مال کا عوض قیمت پائے تو اسے بیچ دے، ورنہ جان لو کہ زمین اللہ اور اس کے رسول کی ہے)۔

”عن أبی هريرة أن رسول الله ﷺ قال فی مرضه الذی توفی فيه : لا يجتمع دينان فی جزيرة العرب“ (نصب الرایہ ۳/۴۵۴ مجلس علمی ڈابھیل ۱۹۸۸ء)۔

(حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ فی الواقع رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس بیماری کی حالت میں جس میں آپ ﷺ کی وفات ہوئی تھی، ارشاد فرمایا کہ جزیرۃ العرب میں دو مذہب جمع نہیں ہوں گے)۔

۳-**”عن ابن شهاب أن رسول الله ﷺ قال: لا تجتمع دينان فی جزيرة العرب“** (موطا امام مالک ص ٣٦٠، کتاب الجامع، ماجاء فی اجلاء الیہود من المدینۃ، ادارہ مرکز ادب دیوبند)۔

(حضرت ابن شہاب زہریؒ سے روایت ہے کہ فی الواقع رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جزیرۃ العرب میں دو

مذہب جمع نہیں ہوں گے)۔

"عمر بن الخطاب أنه سمع رسول الله ﷺ يقول: لأخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب حتى لاادع إلامسلما"(مسلم ۲/ ۹۴، کتاب الجہاد والسیر باباجلاء الیہود بن الحجاز، مکتبہ رشیدیہ، مصنف عبدالرزاق ۶/ ۵۴ طبع المکتب الاسلامی بیروت)۔

(حضرت عمرؓ نے رسول ﷺ سے یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ میں یہودو اور نصاری کو جزیرۃ العرب سے ضرور نکال دوں گا اور مسلمان کے علاوہ وہاں کسی اور کو نہیں رہنے دوں گا)۔

ان تمام احادیث کی روشنی میں یہ بات الم نشرح ہوگئی ہے کہ جزیرۃ العرب میں کسی بھی جگہ غیر مسلم کو رہنے کی اجازت نہ ہوگی اور نہ کسی مسلم ملک میں غیر مسلم کو رہنے کی اجازت ہوگی تو یہ بات بھی ظاہر ہوگئی کہ مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا، دور دراز غیر مسلم ملکوں سے غیر مسلم کو بلوا کر آباد کرنا، رہائش اختیار کرنے کی اجازت دینا بہ درجہ اولی حرام وممنوع ہوگا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے بخاری شریف، کتاب الجہاد "باب ہل یشتفع الی اہل الذمۃ ومعاملتہم" کے ذیل میں فتح الباری شرح بخاری میں جمہور علماء کی رائے نقل کی ہے کہ جزیرۃ العرب میں صرف حجاز کے اندر مشرکوں کو داخل ہونے کی یا شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوگی، حجاز میں مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، جدہ، حدیبیہ، یمامہ، طائف وغیرہ کے قرب وجوار کے تمام علاقے اس زمرہ میں شامل ہوں گے، ان کے علاوہ جزیرۃ العرب میں شمار ہونے والے دیگر مقامات کا یہ حکم نہیں ہوگا، کیونکہ علماء کا اتفاق ہے کہ یمن میں مشرکوں کا داخلہ ممنوع نہیں ہے، حالانکہ یمن بھی جزیرۃ العرب میں داخل ہے، حنفیہ کے نزدیک مسجد الحرام کے علاوہ حدود حرم کے دیگر مقامات میں داخلہ کی اجازت ہے، امام مالکؒ کے نزدیک تجارت کی غرض سے حرم میں داخلہ کی اجازت ہے، امام شافعیؒ کے نزدیک حرم میں داخلہ کی اجازت بالکل نہیں ہے، ہاں اس صورت میں جب صرف مسلمانوں کی کوئی مصلحت وحکمت ہوتو اس کی رعایت ونصرت کے خیال سے امام حکم ران کی اجازت ہی سے وہ داخل ہوسکتے ہیں، اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہیں ہے(تفصیل کے لئے دیکھئے: فتح الباری ۶/ ۱۹۷ تا ۱۹۸ دارالریان للتراث القاہرہ ۱۹۸۷ء)۔

حضرت عمر بن خطابؓ اپنے دور خلافت میں یہودو نصاری اور ذمی وغیرہ کو مدینہ منورہ میں تجارت کی غرض سے تین روز تک ٹھہرنے کی اجازت دیتے تھے اور ان کی عورتوں کو بھی پردے اور حجاب کا مکمل اہتمام کی شرط کے ساتھ رہنے کی اور زیب وزینت اور زیورات پہننے کی اجازت مرحمت فرماتے تھے(مصنف عبدالرزاق ۶/ ۵۴ طبع بیروت لبنان طبع دوم ۱۹۸۳ء)۔

غیر مسلم کو حرم میں قیام کرنے کی اجازت بالکل نہیں دی جائے گی اور نہ حرم سے گذرنے کی اجازت دی جائے گی، قرآن وحدیث سے اس کی ممانعت منصوص ہے، عصر حاضر کی شرارت وخباثت حد سے بڑھ چکی ہے اس کے پیش نظر تو پوری مملکت سعودیہ میں اس کے داخلے پر ممانعت کردینی چاہئے، بہر حال حدود ومیقات حدود حرم میں داخلے کی پابندی اس کے اوپر برقرار رہے گی، پورے صوبہ حجاز میں کہیں بھی اس کو قیام ورہائش اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہوگی اس سلسلے میں حکومت سعودیہ کو مکمل چاق وچوبند اور مستعد رہنے اور مکمل ممانعت پر کاربند رہنے کی اشد ضرورت ہے۔

☆☆☆

اسلام اور شہریت

مولانا اشرف عباس قاسمی☆

۱-اسلام میں حصول شہریت کی بنیاد:

اسلام میں معاصر حالات کے تناظر میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے اس کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے کہ کوئی شخص وہاں کی بودوباش اختیار کرے،ہمیں اس سلسلے میں فقہاء کی تصریحات سے روشنی مل سکتی ہے۔فقہی اعتبار سے جو مقام کسی کے لیے وطن اصلی کی حیثیت اختیار کرلے،اس شخص کو وہاں کا شہری تسلیم کیا جانا چاہئے،احناف کے یہاں وطن اصلی کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے: ''**هو الذی ولدفیه أو تزوج أولم یتزوج وقصد التعیش فیه لا الارتحال عنه**'' (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲؍۳۰۴)۔

اور کسی انسان کا وطن اصلی وہ ہے جہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو یا اس نے وہاں شادی کی ہو یا شادی نہ کی ہو،مگر وہیں مستقل رہائش اختیار کرلی ہو،اس سے یہ بھی واضح ہے کہ کسی مقام پر محض معاشی سرگرمیاں انجام دینا اس کے وہاں کے مواطن ہونے کے لے کافی نہیں ہے، بلکہ اصل مدار اس پر ہے کہ وہ اس جگہ بودوباش اختیار کرلے،خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم،لہذا اگر کوئی غیر مسلم کسی اسلامی ملک میں اس معیار پر کھرا اترے تو اس کو اس اسلامی ملک کا شہری تسلیم کیا جائے گا اور اس سلسلے میں کسی خاص مدت کی تعیین مشکل امر ہے اس کا تعلق ملکی مصالح اور معاصر حالات کے تقاضوں سے ہے،اگرچہ ہمیں فقہاء کے یہاں اس حوالے سے بھی بعض تصریحات مل جاتی ہیں؛چنانچہ اگر کوئی مستأمن (وقتی اجازت سے آنے والا غیر مسلم شخص)۔

دارالاسلام میں آئے تو اسے وہاں زیادہ سے زیادہ ایک سال قیام کی اجازت دی جاسکتی ہے،لیکن اگر وہ دارالاسلام میں ایک سال قیام کرلے تو اسے دارالاسلام کی شہریت دے دی جائے گی اور وہ ذمی (مسلم ملک کا غیر مسلم شہری) قرار پائے گا جمہور فقہاء احناف وشوافع وحنابلہ کی یہی رائے ہے،جبکہ بعض علماء کی رائے ہے کہ اسے اختیار دیا جائے گا کہ یا تو وہ فوری طور سے دارالاسلام سے نکل جائے یا ذمی کی حیثیت سے وہاں کا شہری بن جائے (المسلم مواطنا فی اوربا ص ۱۸ نقلاعن

☆ خادم تدریس دارالعلوم دیوبند۔

البدائع ۷/۱۱۱والخراج لأبي يوسف ۱۸۹)۔

درج بالا جزئیہ سے معلوم ہورہا ہے کہ ایک سال سے زائد قیام پر شہریت دے دی جائیگی ،لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ جغرافیائی حد بندیوں اور ملکوں کی تقسیم سے صورت حال یکسر بدل چکی ہے، اس لے حالات ومصالح کو سامنے رکھ کر اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنا چاہئے۔

۲-کیا مسلم ملک پر شہریت کی درخواست قبول کرنا ضروری ہے؟

اگر ایک مسلمان، خواہ وہ کسی خطے سے تعلق رکھتا ہو مسلم ملک میں رہتا ہو یا غیر مسلم ملک میں، اگر کسی دوسرے ملک کی شہریت کسی مجبوری کی وجہ سے اختیار کرنا چاہے تو اس دوسرے مسلم ملک کو اس کی درخواست ضرور قبول کرنی چاہئے، قرآن کریم نے واضح طور پر کہا ہے: ''إنما المؤمنون إخوة'' (الحجرات ۱۰) (مسلمان تو سب بھائی ہیں)۔

دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے: ''والمؤمنون والمؤ منات بعضهم أولياء بعض'' (التوبۃ:۷۱)۔

ان آیات سے اور اس مفہوم کی بہت ساری احادیث مبارکہ سے واضح ہے کہ اسلام، معاشرہ قوم یا ملک کو دین وعقیدے کی بنیادوں پر قائم کرتا ہے اور اس ایمانی رشتے کی اس کے نزدیک بڑی اہمیت ہے؛ چنانچہ جب مکہ مکرمہ کے خانماں برباد ی مظلوم ومقہور مسلمانوں نے مدینہ منورہ کی شہریت اختیار کرنی چاہی تو مدینہ کے مسلمانوں نے یہ جانتے ہوئے کہ ان کے اس اقدام سے عرب کا ایک بڑا طبقہ چراغ پا ہو جائے گا، لیکن انھوں نے ان مخالفتوں کی بالکل پرواہ نہیں کی، اور اخوت اسلامی کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اخوت ونصرت کی وہ مثال قائم کی کہ انھیں انصار کا خطاب ملا، البتہ اگر کسی معاہدے کی خلاف ورزی ہورہی ہو تو درخواست قبول نہ ہوگی؛ کیونکہ معاہدوں پر قائم رہنا اور وعدوں کا ایفاء کرنا بھی اسلامی مملکت کی اہم ذمہ داریوں میں سے ہے۔

چنانچہ آیت کریمہ میں ہے: ''و إن استنصر وكم فى الدين فعليكم النصر إلا على قوم بينكم و بينهم ميثاق والله بما تعملون بصير'' (الانفال ۷۲)۔

حافظ ابن کثیر اس کی تفسیر میں فرماتے ہیں: ''وان استنصروكم فى قتال دينى على عدولهم فانصروهم ' فإنه واجب عليكم؛ لأنهم إخوانكم فى الدين، إلا أن يستنصروكم على قوم من الكفار بينكم وبينهم ميثاق ، فلا تخفروا ذمتكم ولا تنقضواأيمانكم مع الذين عا هدتم، وهذا مر وى عن ابن عباس'' (دیکھئے: جامع البیان للطبری، ۲۰/ ۶۶۔۷۰) المواطنۃ فی الإسلام' ص ۳۰)۔

(اور اگر وہ اپنے دشمنوں کے خلاف مذہبی جنگ میں تمہاری مدد چاہیں تو تم ان کی مدد کرو، اس لے کہ یہ تمہارا فریضہ

ہے وہ تمہارے دینی بھائی ہیں، البتہ اگر وہ کفار کی اس جماعت کے خلاف تمہاری مدد چاہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہے تو تم عہد شکنی مت کرو اور جن لوگوں کے ساتھ تمہارا معاہدہ ہے ان سے عہد و پیمان کو نبھاؤ۔ یہ تفسیر حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے)۔

دکتور علی محی الدین القرہ داغی فرماتے ہیں: کہ آیت بالا سے معلوم ہو رہا ہے کہ عہد کو پورا کرنا ایک ایسا حق ہے جو بعض ان اہل ایمان کے حقوق سے بڑھ کر ہے جنہوں نے ہجرت نہیں کی ہے (المواطنۃ ۲۹)۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر طے پانے والے معاہدے کی بعض دفعات کی بنا پر مسلمانوں کے سخت اضطراب کے باوجود حضرت ابوجندلؓ کو مکہ والوں کے ہی سپرد کر دیا اور حضرت ابوبصیر وغیرہ کو بھی محض اس معاہدے کی بنا پر مدینہ منورہ میں قیام کی اجازت نہیں دی، جیسا کہ ساری تفصیلات کتب حدیث و سیر میں موجود ہیں؛ لہٰذا مسلم ملک کے لیے ہر درخواست شہریت کو قبول کرنا ضروری نہیں قرار پائے گا۔

۳-کسی مسلمان کو شہری تسلیم کئے بغیر پناہ گزیں کا درجہ دینا:

بعض دفعہ کسی خاص خطے میں مسلمانوں پر مظالم ہوتے ہیں وہاں کے مسلمان کسی اور مسلم ملک کی پناہ لیتے ہیں تو انھیں پناہ گزین کا درجہ تو دیا جاتا ہے، لیکن شہری تسلیم نہیں کیا جاتا، تو اس سلسلے میں جہاں تک تعلق ہے خاطر مدارات اور پناہ کا، تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلم ملک کے حکمران کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے مظلوم اور ستم رسیدہ مسلمانوں کی اشک شوئی کرے، ان کی ضیافت اور اکرام میں پیش پیش رہے اور اخوت ایمانی کے تقاضوں کو پورا کرے۔

یہ شرعی و اخلاقی ذمہ داریوں سے آنکھ موند لینے کی بات ہے کہ مظلوم و بے سہارا مسلمانوں کو پناہ دینے کے بجائے سرحد کی دیواریں اونچی کر کے انھیں ظالموں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے، بلکہ انھیں بھی دوسرے شہریوں کے مساوی حقوق دیئے جانے چاہئیں، لیکن شہریت کے لئے بین الاقوامی ضوابط اور ملکی نزاکتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اگر انھیں جدید اصطلاح کے اعتبار سے شہری تسلیم نہ کرے فقط پناہ گزیں قرار دے تب بھی گنجائش ہے، جبکہ انسانیت کی بنیاد پر دیگر حقوق و مراعات مل رہی ہوں۔

۴-اسلامی نقطۂ نظر سے شہریت کے حقوق:

اس وقت عام طور سے جمہوری نظام حکومت رائج ہے، جمہوریت میں عوامی حکمرانی کا تصور ہوتا ہے، رائے عامہ کے ذریعہ حکمرانوں کا انتخاب ہوتا ہے، جمہوری نظام حکومت میں مملکت کا کوئی خاص مذہب نہیں ہوتا ہے، جمہوری نظام بعض جہتوں سے اسلام کے شورائی نظام سے مماثلت رکھتا ہے، اس لئے کوئی حرج نہیں کہ مسلمان اپنے معتقدات اور شخصی

امتیازات پر قائم رہتے ہوئے اس نظام کا حصہ بنیں، بالخصوص ان ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور یہ بات مشاہدے میں ہے کہ جمہوری اور سیکولر نظام مسلمانوں کے لئے بسا اوقات غنیمت ثابت ہوا ہے، بلکہ ہو رہا ہے۔

جمہوری نظام حکومت میں شہریوں کے جتنے حقوق ہیں، اسلام ان سب کی تقریر کرتا ہے، اور ملک کے استحکام اور دفاع کی مشترکہ کوششوں کی اجازت، بلکہ ترغیب دیتا ہے، معاہدۂ حلف الفضول اور میثاق مدینہ کی مختلف دفعات پر نظر کرنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے، اور قرآن کریم کا بھی عام اور صریح حکم ہے ''**وتعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان**'' (المائدہ:۲)۔

(اور نیکی اور تقوی میں ایک دوسرے کی اعانت کیا کرو، اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی اعانت مت کیا کرو)۔

اور جہاں تک تعلق ہے ان ملکوں کا جہاں اسلامی نظام حکومت ہے، تو کیا ایسی اسلامی مملکت میں بھی تمام شہریوں کو بہ شمول غیر مسلم یہ سارے حقوق حاصل ہوں گے؟ اس سلسلے میں دقت نظر سے احکام شرع کا جائزہ لینے کی ضرورت ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض بنیادی حقوق جن کا تعلق انسانی حقوق سے ہے، مملکت اسلامی کے ہر فرد کو حاصل ہیں؛ چنانچہ کسی بھی غیر مسلم شہری کو مذہبی آزادی حاصل ہے؛ کیونکہ میثاق مدینہ کی ایک دفعہ ہے:

'' **لليهود دينهم وللمسلمين دينهم**'' (یہود اپنے مذہب پر عمل پیرا رہیں گے اور مسلمان اپنے مذہب پر)۔

اسی طرح جب بعض انصاری صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اپنے بعض افراد خاندان کو جو یہودی ہو چکے تھے، مسلمان ہونے پر مجبور کرنا چاہا تو اللہ پاک نے آیت نازل فرمائی:

''**لا إكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي**'' (البقرہ:۲۵۶)۔

(دین میں زبردستی نہیں، ہدایت یقیناً گمراہی سے ممتاز ہوچکی ہے)۔

نیز پوری اسلامی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مسلمانوں نے اپنی رعیت اور غیر مسلم شہریوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا ہو۔ اسی طرح روزگار اور معاشی تگ ودو کے بھی یکساں حقوق حاصل ہیں، امام ابوبکر جصاص رازیؒ فرماتے ہیں:

''**إن الذميين في المعاملات والتجارات كالبيوع وسائر التصرفات كالمسلمين**'' (احکام القرآن، ۲/ ۳۴۶)۔

''اسلامی ملک کے غیر مسلم شہری (ذمی) آپسی معاملات اور تجارت، مثلاً بیع وشراء اور تمام تصرفات میں مسلمانوں کی طرح ہیں''۔

علامہ کاسانی فرماتے ہیں: ”کلما جاز من بیوع المسلمین جاز من بیوع أهل الذمة وما یبطل أو یفسد من بیوع المسلمین یبطل ویفسد من بیوعهم إلا الخمر والخنزیر“ (البدائع: ۴/۱۷۴)۔

(بزنس اور تجارت کے جو معاملات مسلمانوں کے لئے جائز ہیں وہ ذمیوں کے لیے بھی جائز ہیں، اور تجارت کی جو صورتیں مسلمانوں کے لئے باطل یا فاسد ہیں وہ ذمیوں کے تعلق سے بھی باطل یا فاسد ہیں، البتہ خمر اور خنزیر کا استثناء ہے)۔

اسی طرح غیر مسلم شہریوں کو عدالتی چارہ جوئی اور انصاف حاصل کرنے کے بھی یکساں حقوق حاصل ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا واضح ارشاد گرامی ہے:

” ألا من ظلم معاهداً أو انتقصه حقه أو كلفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئاً بغير طيب نفس منه فأنا حجيجه يوم القيامة“ (سنن ابی داؤد، الحدیث، رقم: ۳۰۵۲)۔

(آگاہ رہو! جو کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کی حق تلفی کرے گا، یا اس پر اس کی طاقت سے زیادہ کا بوجھ ڈالے گا، یا اس کی کوئی چیز اس کی بشاشت کے بغیر لے لیگا تو میں قیامت کے دن اس کی طرف سے حجت قائم کروں گا)۔

ان غیر مسلم شہریوں کے جان ومال کی حفاظت بھی اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے؛ چنانچہ مال کے سلسلے میں فقہاء احناف یہاں تک کہہ گئے ہیں کہ اگر کوئی مسلم شہری ان کے خمر وخنزیر جیسی چیز کو بھی جو مسلمان کے نزدیک غیر متقوم اور قابل نفرت ہے، تلف کردے تو معاوضہ ادا کرنا پڑے گا (دیکھئے: بدائع: ۵/۱۴۳)۔

اور جان ومال کی حرمت کے سلسلے میں رسول اکرم ﷺ کا واضح ارشاد ہے: ”من قتل معاهداً لم یرح رائحة الجنة وإن ریحها توجد من مسیرة أربعین عاماً“ (صحیح البخاری، کتاب الجزیہ)۔

(جس شخص نے کسی معاہد کو قتل کردیا اس کو جنت کی خوشبو نصیب نہ ہوگی، حالانکہ جنت کی خوشبو چالیس سال مسافت کی دوری سے محسوس کی جاسکے گی)۔

اس لئے فقہاء احناف کی رائے یہ ہے کہ کسی غیر مسلم شہری کا قاتل مستحق قتل ہے، اگرچہ وہ مسلم شہری ہی کیوں نہ ہو۔

اسی طرح وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلم شہریوں کو حاصل ہیں، البتہ ووٹ دینے کا حق یا انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق وغیرہ وہ حقوق ہیں جو محض شہری ہونے کی حیثیت سے اسلامی مملکت غیر مسلم مواطن کو بھی فراہم کرے یہ کوئی ضروری نہیں ہے؛ اس لئے کہ مسلم ملک میں اسلامی احکام کی بالادستی بھی مطلوب ہے، اس لئے اس طرح کے بہت حد تک خودمختار اور کلیدی عہدوں تک غیر مسلم شہریوں کی رسائی بہت سے مسائل جنم دے گی، اسی طرح ایسے عہدے پر انہیں فائز نہیں کیا جائے گا جو خالص مذہبی نوعیت کے ہوں۔

البتہ ملازمتوں کے دروازے ان کے لئے بھی کھلے رہیں گے، اور دیگر عہدے اور مناصب بھی انہیں سونپے جاسکتے ہیں، حتی کہ علامہ ماوردیؒ نے وزارت تنفیذ کے سلسلے میں بھی جس میں اصل حکم سلطان اور حاکم اعلی کا ہوتا ہے، وزیر محض اس کے نافذ کرنے کا پابند ہوتا ہے، فرمایا ہے: ''**ویجوز أن یکون هذا الوزیر من أهل الذمة**'' (الأحکام السلطانیۃ: ص، ۲۸)۔

''اور اس درجے کا وزیر کسی ذمی شخص کو بنایا جاسکتا ہے''۔

۵- شریعت اسلامی میں پناہ گزینوں کے حقوق:

پناہ یا جوار کا حق قدیم عربی اور اسلامی خصال میں سے ہے، عرب جب کسی کو پناہ دیتے تو نہ صرف یہ کہ اسے پوری طرح نباہتے تھے، بلکہ اس کے اخفار اور عہد شکنی کو توہین تصور کرتے تھے، عرب شاعری میں اس کے بہ کثرت نمونے موجود ہیں (دیکھئے: ''اللجوء في الإسلام۔ للدکتور أحمد أبوالوفاء، ۱۔ ۲۔ ۳)۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب حبشہ ہجرت کرنا چاہا تو سید القارۃ ابن الدغنہ نے انہیں اپنی حفاظت اور پناہ میں لینے کا اعلان کیا اور قریش کے سردار اس کی مخالفت نہ کرسکے۔ مکہ مکرمہ کے ستائے ہوئے مظلوم اور مقہور مسلمانوں کو شاہِ حبشہ نجاشی نے اور مدینہ منورہ کے قبیلۂ اوس وخزرج نے پناہ دی۔

پناہ کی تعریف:

دکتور ابوالوفاء کے مطابق اسلام کے نقطۂ نظر سے پناہ، لجاء یا جوار کی تعریف اس طرح کی جاسکتی ہے:۔ ''**إعطاء الأمن لملهوف فار إلی دار الإسلام من اضطهاد وظلم أو وضع سيء یمکن أن یتعرض له**'' (اللجوء في الإسلام: ص ر ۴)۔

(پناہ نام ہے کسی ایسے مصیبت زدہ شخص کو امن فراہم کرنے کا جو کسی ظلم وستم یا کسی ایسی صورت حال سے بھاگ کر دارالاسلام آ گیا ہو جو اسے پیش آسکتی ہے)۔

قرآن کریم میں اور عموماً بین الاقوامی اسلامی قانون میں اس کے لئے استجارہ یا اجارہ کے الفاظ آئے ہیں۔ سورۂ حشر کی آیت نمبر ۹ ر میں جو کچھ کہا گیا ہے اس کی روشنی میں اسلام میں پناہ گزینوں کے تعلق سے احکام کے خط وخال متعین کیے جاسکتے ہیں۔

آیت کریمہ یہ ہے: ''**والذین تبوّؤالدار والإیمان من قبلهم یحبون من هاجر إلیهم ولا یجدون في صدورهم حاجةً مما أوتوا ویؤثرون علی أنفسهم ولو کان بهم خصاصة ومن یوق شُحّ نفسه فأولئک هم المفلحون**'' (سورۃ الحشر: ۹)۔

(اوران لوگوں کا (بھی حق ہے) جو دارالاسلام (یعنی مدینہ) میں ان (مہاجرین) کے آنے کے قبل سے قرار پکڑے ہوئے ہیں جوان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے، اس سے یہ لوگ محبت کرتے ہیں، اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ (انصار) اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے، اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں اگر چہ ان پر فاقہ ہی ہو) (ترجمۂ تھانویؒ)۔

آیت کریمہ سے لاجئین کے سلسلے میں چار بنیادی باتیں معلوم ہو رہی ہیں:۔

(۱) خندہ پیشانی کے ساتھ مہاجرین اور پناہ کے متلاشی افراد کا استقبال اور حسن سلوک، جیسا کہ "**يحبون من هاجر إليهم**" سے معلوم ہو رہا ہے، اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انہیں اپنی سرحدوں کی طرف واپس کر دینا اور ان کا استقبال نہ کرنا درست نہیں ہے۔

(۲) ان کے ساتھ احسان اور ایثار کا برتاؤ کیا جائے، جیسا کہ ارشاد باری: "**ويؤثرون على أنفسهم ولو كان بهم خصاصة**" (سورۂ حشر:۹) سے واضح ہے۔

(۳) پناہ کے طالب افراد کا استقبال کیا جائے، خواہ وہ اہل ثروت ہوں یا فقراء، یعنی ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہئے کہ اگر وہ ذی وجاہت یا مالدار یا سیاسی حیثیت کے حامل ہوں تو انہیں پناہ دی جائے اور بے سہارا لوگوں کو نظر انداز کر دیا جائے، اس لئے کہ اصل مقصد حمایت اور امن وامان فراہم کرنا ہے، خواہ وہ کوئی بھی ہو، آیت کے درج ذیل جز سے اس کی طرف اشارہ ہو رہا ہے:۔"**ولا يجدون في صدورهم حاجة مما أوتوا**" (سورۂ حشر:۹) "اور مہاجرین کو جو کچھ ملتا ہے اس سے یہ (انصار) اپنے دلوں میں کوئی رشک نہیں پاتے"۔

(۴) ان مہاجرین اور پناہ گزینوں کی درخواست بھی رد نہیں کی جاسکتی جن کا تعلق انتہائی غربت زدہ خطے سے ہو۔
"**ولو كان بهم خصاصة**" (اگر چہ ان پر فاقہ ہی ہو)۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد پناہ گزینوں کی تعداد میں زبردست اضافے اور نت نئے مسائل کے پیش نظر اقوام متحدہ نے اس حوالے سے خاص ضوابط وضع کیے، چنانچہ ۱۹۶۷ء اور بعد کے اقوام متحدہ کے چارٹر میں پناہ گزینوں کے بنیادی حقوق کا تعین کرنے کے ساتھ یہ بھی واضح کیا گیا ہے کہ یہ جس ملک میں پناہ لیں وہاں کے تعلق سے ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، بہت حد تک یہ وہی حقوق ہیں جو اسلامی تعلیمات میں پہلے ہی بیان کیے جاچکے ہیں اور عملی اعتبار سے اسلامی مملکتوں میں نافذ رہے ہیں۔

میرا مقصد اس مختصر تحریر میں دونوں قوانین کا مطالعہ کر کے ایک ایک شق کا مقابلہ وموازنہ نہیں ہے، البتہ بنیادی طور

پر جو اہم بات بین الاقوامی قانون میں کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ پناہ کے طالب شخص کو پناہ فراہم کرنا اور اس کے بنیادی حقوق کی رعایت رکھنا کسی بھی حکومت کا فرض ہے۔ یہ بات اسلامی قانون میں واضح طور پر موجود ہے، پناہ گزیں کو ایسے ملک میں واپس جانے پر مجبور کرنا یا ایسی حکومتوں کے سپرد کر دینا جہاں اسکی عزت وآبرو اور جان و مال کو خطرہ ہے، اسلام کی نگاہ میں جرم ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ پناہ گزیں مسلمان ہے یا غیر مسلم، اس لئے کہ امان یا ذمہ کی وجہ سے وہ ان تمام مراعات کا مستحق ہو جاتا ہے جو ایک مسلم شہری کو حاصل ہیں، بلکہ ہمارے فقہاء نے وضاحت کی ہے کہ ایسے شخص کو کسی مسلم قیدی کی رہائی کے عوض بھی اس کے متعلقہ ملک کو سونپا نہیں جا سکتا اگر وہ اس پر راضی نہ ہو۔

چنانچہ امام محمدؒ فرماتے ہیں: "**فإن دخل حربي منهم إلينا بأمان فطلبوا مفاداة الأسير بذالک المستأمن و کره ذلک المستأمن وقال: إن دفعتموني إليهم قتلوني فليس ينبغي لنا أن ندفعه إليهم، لأنه في أمان منا. فيكون كالذمي إذا كره المفاداة**" (شرح السیر الکبیر، حیدرآباد، ۳/ص/۳۰۰)۔

(اور اگر کوئی حربی ہماری اجازت اور امان سے ہمارے پاس آئے اور اس کے ملک کے حکمراں، اس مستامن (اجازت لے کر آنے والا شخص) کے عوض قیدی کی رہائی کا مطالبہ کریں، لیکن وہ مستامن اس پر راضی نہ ہو اور کہے کہ اگر تم نے مجھے میرے ملک کے حکمرانوں کے سپرد کر دیا تو وہ مجھے قتل کر دیں گے، اس صورت میں اس کو ان کے سپرد کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ وہ ہماری امان اور حفاظت میں ہے)۔

اسی طرح شاہ حبشہ نجاشی نے ان مسلمانوں کو قریش کے حوالے کرنے سے انکار کر دیا تھا جنہوں نے اس کے پاس پناہ لی تھی۔

خلاصہ یہ کہ لاجئین اور پناہ گزینوں کے سلسلے میں اسلامی شریعت میں تفصیلات بکھری پڑی ہیں، اور اس کو مستقل موضوع بنا کر اس پر کافی کچھ لکھا جا سکتا ہے۔

۶- غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا:

کسی مسلمان کے لئے ضرورت و مجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے دنیا کے کسی بھی ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہے، بہ شرطیکہ وہاں اسے فکر ونظر اور واجبات دینیہ کی ادائیگی کی آزادی ہو، اور ایک انسان و شہری ہونے کے ناطے جو حقوق معروف ہیں وہ اسے حاصل ہوں۔

چنانچہ حدیث وسیر کی کتابوں میں متعدد صحابۂ کرام کے سلسلے میں منقول ہے کہ قبول اسلام کے بعد بھی انہوں نے رسول اکرم ﷺ کی اجازت سے اپنے غیر مسلم قبیلے میں سکونت باقی رکھی۔

حضرت عمرو بن عبسہ السلمیؓ نے مکہ میں اسلام قبول کرنے کے بعد وہیں سکونت کی خواہش ظاہر کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''لکن ارجع إلی أهلک فإذا سمعت بي قد ظهرت فأتني'' نہیں تم اپنی برادری اور قبیلے میں چلے جاؤ، اور جب میرے غلبے کی بابت سنو تو میرے پاس آ جانا'' (صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، (رقم/ ۸۳۲)۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی آپ نے اسی طرح ارشاد فرمایا تھا: (دیکھئے: صحیح مسلم: رقم/ ۲۴۷۳)۔

حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ مکہ میں اسلام قبول کر چکے تھے، لیکن اپنی قوم میں ہی قیام کر کے انہیں دعوت اسلام دیتے رہے، یہاں تک کہ غزوۂ خیبر کے موقع پر حضرت ابو ہریرہؓ سمیت ۸۰ افراد کے ہمراہ مدینہ طیبہ آئے (سیرۃ حلبیہ: ۱/ ۵۱۳)۔

اسی طرح مہاجرین حبشہ کا ۷ھ تک حبشہ میں غیر مسلم مواطنین کے درمیان قیام کیے رہنا، باوجودیکہ مدینہ منورہ میں مکہ مکرمہ جیسی صورت حال نہیں تھی، یہ بھی اس امر کی دلیل ہے کہ غیر مسلم ملک میں بھی پر امن بقاءِ باہم کی گنجائش ہے۔

اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ تاکہ ان غیر مسلم مواطنین تک صحیح معنوں میں اسلامی پیغام کے پہنچانے کی ذمہ داری پوری کی جا سکے۔

لیکن یہ سب اس وقت ہے جب کہ وہاں دین وعقیدے کی آزادی ہو، جن فقہاء نے غیر مسلم ملک کی شہریت کے عدم جواز اور دار الحرب کے ہجرت کے وجوب کا قول کیا ہے، وہ اسی پس منظر میں ہے کہ وہاں دین وشریعت پر عمل کی آزادی نہ ہو، ورنہ اگر ایسی صورت حال نہ ہو، جیسا کہ اس وقت عام طور سے دنیا کے ملکوں میں ہے تو وہاں قیام میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۷- مسلم ملک میں غیر مسلم کو شہری کی حیثیت سے آباد کرنا:

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے، اگر ملکی اور دینی مفادات پر اس سے زد نہ پڑتی ہو، چنانچہ میثاق مدینہ کی بعض دفعات میں یہودیوں کو مستقل شہری کی حیثیت دیتے ہوئے ان کے حقوق کے تحفظ کی بات کہی گئی ہے۔

اسی طرح خلفاء راشدین کے عہد میں جو ممالک فتح ہو کر بلاد اسلامیہ کا حصہ بنتے گئے، ہر جگہ چند شرائط کے ساتھ غیر مسلم شہریوں کو بھی رہنے کی اجازت دی گئی۔ تاریخ میں کہیں ایسا واقعہ نہیں ملتا کہ اسلامی ملک سے غیر مسلموں کو محض مسلمان نہ ہونے کی پاداش میں شہر بدر کر دیا گیا ہو، بلکہ عباسی خلفاء کا عہد جو علم وثقافت کے اعتبار سے عہد زریں کہلاتا ہے، اس میں بڑے بڑے اہم عہدے اور مناصب پر غیر مسلم شہری تعینات نظر آتے ہیں۔

مشہور مؤرخ آدم نیرا اپنے تجزیے میں کہاں تک لکھ گیا ہے:

"من الأمور التي تعجب لها كثرة عدد العمال "الولاة وكبار المؤظفين والمتصرفين غير المسلمين في الدولة الإسلامية فكأن النصارى هم الذين يحكمون المسلمين في بلاد الإسلام" (الحضارۃ الإسلامیۃ: ۱/ ۱۱۸، المواطنۃ في الإسلام، ص ۲۴)۔

(نیز ایک تعجب خیز امر اسلامی حکومت میں غیر مسلم کارکنان کی کثرت ہے جن میں وزراء، بڑے بڑے عہدے دار اور بااثر افراد شامل ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اسلامی ملکوں میں عیسائی ہی مسلمانوں پر حکمرانی کرتے تھے)۔

البتہ اس حقیقت کے اعتراف میں بھی کوئی قباحت نہیں کہ بعد کے مسلم حکمرانوں کی اس دریا دلی نے بعض مرتبہ اسلامی مملکتوں کو غیر مستحکم کرنے میں افسوسناک کردار ادا کیا ہے، اور مسلمانوں کو ایسے زخم پہنچائے ہیں جو اب تک مندمل نہیں ہوسکے ہیں؛ اس لئے مسلم حکمرانوں کو ایسے عناصر کو شہریت دینے سے گریز کرنا چاہئے، جن سے مملکت کی بنیادیں متزلزل ہوسکتی ہیں؛ چنانچہ مدینہ کے یہود اپنی طبعی شرارتوں اور ریشہ دوانیوں سے باز نہیں آئے تو ان کا ویزا منسوخ کرکے انہیں شہر بدر کردیا گیا۔

☆☆☆

شہریت کا مسئلہ- حقوق اور احکام کے تناظر میں

مولانا رحمت اللہ ندوی☆

اصولی اور بنیادی بات یہی ہے کہ اسلام کے احکام اور اس کی ہدایت وتعلیمات زندگی کے تمام شعبوں پر محیط ہے، اور اس میں ہر موقع کی رہنمائی موجود ہے، جس طرح عبادات، معاملات، اخلاقیات اور سماجیات سے متعلق احکام ملتے ہیں اسی طرح معاشیات اور سیاسیات کے بارے میں بھی بنیادی ہدایات واحکام اور اصول وقواعد موجود ہیں، جن کی روشنی میں علماء اسلام اور فقہاء کرام نئے مسائل کے احکام سے امت کی رہبری کر سکتے ہیں۔

البتہ معاشیات وسیاسیات، حکومت کے آئین ودساتیر مفصل بیان نہیں ہوئے ہیں اور ایسا اس لئے ہے کہ یہ احکام ماحول، مصالح اور حالات کے تطور وتغیر کی وجہ سے بدلتے رہتے ہیں، اس وجہ سے مناسب یہی تھا کہ اساسی اصول اور عمومی قواعد پر اکتفا کیا جائے تا کہ ہر دور کے سربراہان مملکت اور والیان امور کے لئے اس کی گنجائش رہے کہ وہ حدود شریعت میں رہتے ہوئے حسب مصلحت وضرورت اپنے قوانین کی تفصیل وتشریح کر لیں (ملاحظہ ہو علم اصول الفقہ الخلاف ص ۳۳، ۳۴)۔

غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش:

کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر رہنا اس کا حکم زمانہ، حالات اور اغراض ومقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوگا، مفتی تقی عثمانی کی کتاب ''فقہی مقالات'' میں اس سے متعلق جو صورتیں لکھی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے:

۱- اگر ایک مسلمان اپنے وطن میں ناحق کسی جرم کے بغیر ستایا جارہا ہو، یا اس کو جیل میں ظلما قید کر لیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کر لی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش کے علاوہ مظالم سے بچنے کی کوئی صورت نہ ہو تو ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کر کے وہاں کا باشندہ اور شہری بن کر رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہاں جا کر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے اور منکرات وفواحش سے بچنے پر اطمینان ہو۔

☆ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

۲-اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہوجائے اور کوشش وتلاش کے باوجود کسی اسلامی ملک میں معاشی مسائل نہ حاصل ہوسکیں تو کسی جائز ملازمت کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرسکتا ہے، کیونکہ شریعت نے کسی جگہ اور ملک کی قید رزق حلال تلاش کرنے کے لئے نہی لگائی ہے، بلکہ عام اجازت دی ہے۔

۳-غیر مسلموں کو دعوت دین دینے اور انہیں مسلمان بنانے کے لئے رہائش اختیار کرنا نہ صرف جائز ہے، بلکہ موجب اجروثواب ہے، صحابہ اور تابعین نے اسی نیک مقصد اور ارادے سے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی، جو بعد میں ان کے فضائل ومناقب اور محاسن ومحامد میں شمار ہونے لگی۔

۴-محض معیار زندگی بلند کرنے اور خوش حالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرنا کراہت سے خالی نہیں، کیونکہ بلا کسی دینی یا دنیاوی ضرورت کے اپنے آپ کو وہاں کے رائج فواحش و منکرات کے طوفان میں ڈالنا اور اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ سے دوچار کرنا ہے، ایسی رہائش سے دینی حمیت کمزور ہوجاتی ہے اور ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیزی سے پگھل جاتے ہیں، اسی لئے حدیث میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے، ”**من جامع المشرک وسکن معه، فإنه مثله**“ (ابوداؤد)۔

(جو شخص کسی مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی جیسا ہے)۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا: ”**أنا بریئ من کل مسلم مقیم بین أظهر المشرکین، قالوا یا رسول الله! لم؟ قال: لا تر اي ناراهما**“ (میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان مقیم رہے، صحابہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول کیوں؟ فرمایا: تم مسلمان اور کافر کی آگ میں امتیاز نہیں کرسکوگے)۔

۵-اپنی سوسائٹی اور سماج میں معزز بنے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی ظاہر کرنے کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اپنانا یا دارالکفر کی شہریت کو دارالاسلام پر ترجیح دینا، اور اس کو برتر وافضل سمجھنا یا اپنی پوری عملی زندگی میں بودوباش میں ان کا طرز اختیار کرکے ظاہری زندگی میں مشابہت اپنانا اور ان جیسا بننا، مطلقا حرام ہے (فقہی مقالات ۱/ ۲۳۲ تا ۲۳۵)۔

ڈاکٹر صلاح سلطان لکھتے ہیں:

”غیر مسلم ممالک میں قیام پذیر ہونے کا مسئلہ اگرچہ اب تک مختلف فیہ ہے، مگر جو حضرات مسلمان اقلیتوں کے لئے فتوی دینے اور اجتہاد کرنے کے اہل ہیں، ان کی رائے یہ ہے کہ اسلامی پیغام کی امین ومبلغ ہونے اور سب کی بھلائی کے لئے برپا کی جانے والی امت کی حیثیت سے مسلمانوں کے لئے غیر اسلامی ممالک میں قیام پذیر ہونا صحیح یا مستحب یا واجب ہے“۔

کچھ آگے چل کر لکھتے ہیں:

’’بہرحال اگر روئے زمین کے تمام فقہاء اس بات پر اجماع کرلیں کہ غیر مسلم ممالک میں قیام پذیر ہونا درست نہیں ہے تو اس فیصلہ سے ان لوگوں کی صورتحال میں کوئی فرق نہیں واقع ہوگا، جو ان ممالک کے حقیقی باشندے ہیں، مہاجرین کی اکثریت ہرگز ان ملکوں میں واپس نہیں جائے گی، جہاں سے مشکلات جھیل کر وہ آئے ہیں، تو کیا اب فقہ کا یہی کام رہ گیا ہے کہ وہ لوگوں کو گنہگار بنائے یا اس کا کام یہ ہے کہ لوگوں پر سے وہ بیڑیاں اور زنجیرین ہٹائے جن میں وہ جکڑ دیئے گئے ہیں؟......میرے سامنے روز بروز پوری شدت کے ساتھ اس رائے کی کمزوری واضح ہوتی جارہی ہے کہ مغرب میں قیام پذیر ہونا یا مغربی ممالک کا سفر کرنا ناجائز ہے (فقہ الاقلیات ص ۳۳،۳۵)۔

ڈاکٹر صلاح سلطان مزید لکھتے ہیں کہ میں اپنے مطالعہ کی روشنی میں اس نتیجہ تک پہنچ چکا ہوں کہ اگر غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت کرنے اور وہاں اقامت پذیر ہونے پر مجبور کرنے والے حالات نہ بھی پیش آتے جب بھی پوری دنیا میں ایک منظم اور منصوبہ بند طریقہ پر اشاعت اسلام کی غرض سے وہاں جانا اور مقیم ہونا فرض تھا، کیونکہ اقامت کا یہ مطلب نہیں کہ ان نظاموں میں ضم ہوجایا جائے، خاص طور پر اعتقادی اصولوں، اخلاقی اقدار اور شرعی مسلمات سے متصادم امور میں تو ہرگز نہیں‘‘ (ایضا ص ۳۵)۔

ایک منہجی مسئلہ یہ ہے کہ دارالحرب اور دارالاسلام کا جو ذکر اور تعیین ہماری فقہی کتابوں میں ہے وہ اس دور اور مخصوص صورتحال پر منطبق تھی، لیکن آجکل یا تو دارالاسلام ہے یا دارالامان، یا دارالعہد یا دارالدعوۃ ہے، ایک منہجی غلطی یہ ہے کہ مجموعی طور پر تمام غیر اسلامی ممالک میں قیام پذیر ہونے کو حرام یا مکروہ قرار دیا جاتا ہے، یہ اجمالی حکم لگانا درست نہیں، کیونکہ غیر اسلامی ممالک کے درمیان عام طور پر اپنی اقوام اور خاص طور سے مسلمانوں کے حوالہ سے آزادی اور پابندی کے دائروں میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، چنانچہ جنوبی اور وسطی امریکہ کی بعض ریاستیں متحفظ ہیں اور کچھ ریاستوں جیسے نیویارک اور کیلی فورنیا میں اباحیت اور بے لگام آزادی کا رجحان پایا جاتا ہے، جو مشرق میں قابل مذمت ہیں، بعض ایسے مسلم اور غیر مسلم ممالک ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شدید ترین مہم کی آڑ میں جواب کو غیر قانونی قرار دیتے ہیں، دین کے داعیوں پر پابندی عائد کرتے اور دین دار نوجوانوں کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں، جبکہ بہت سے غیر مسلم ملکوں کا موقف یہ ہے کہ وہ جلاوطن داعیوں کو پناہ دیتے، اور ان مظلوموں کے ساتھ حسن سلوک کرتے اور ان کے لئے سیاسی پناہ گزیں کی حیثیت سے تنخواہیں مقرر کردیتے ہیں۔

امام نسفیؒ نے سچ فرمایا ہے: ’’ملکوں اور مقامات کی نوعیت اس پہلو سے بہت حد تک بدل جاتی ہے کہ وہاں ایک

مسلمان کا دین، اس کے اہل وعیال، اس کی عزت ومال محفوظ ہیں یا نہیں (فقہ الاقلیات ص ۳۶،۳۵)۔

شہریت کی بنیاد کیا ہے؟

عاجز کے نزدیک شہریت کی بنیاد کوئی ایک متعین شئ نہیں ہے، بلکہ مختلف چیزوں میں سے کسی کو بھی بنیاد بنایا جاسکتا ہے، اوراس سلسلہ میں جس ملک کی جو پالیسی یا قانون حکومت ہو اسی کا اعتبار کیا جائے گا، کسی جگہ شادی کر لینا یا وہاں زمین یا جائداد خرید لینا یا مکانات تعمیر کر لینا جس سے مستقل رہائش کا ارادہ معلوم ہو، یا وہاں کے اصل باشندوں کے ساتھ مل کر دشمنوں کے خلاف دفاعی اور مقابلہ آرائی کی پوزیشن حاسل کر لینا یا تجارتی ومعاشی سرگرمیوں میں حصہ لینا، یا مخصوص مدت جس کی تعین سلطان یا امیر اور ملک کا دستور کرے گا، تک قیام پذیر ہوتا ہے۔

مہاجرین مدینہ کے حالات اور حضور اکرم ﷺ کے طرز عمل سے مذکورہ بالا تمام امور کی طرف رہنمائی یا اشارہ ملتا ہے، اگر کسی جگہ مسلمانوں پر مظالم ہورہے ہیں، ان پر عرصہ حیات تنگ کیا جارہا ہو، ان کی مذہبی آزادی سلب کر لی گئی ہو اور ان کی جان ومال خطرہ اور عزت وآبرو غیر محفوظ ہو تو وہاں سے ہجرت کرنا فرض ہے، اور مسلم ملک پر ان مہاجرین کو پناہ دینا اور ان کے دینی اعمال کی انجام دہی کو یقینی بنانا لازم ہے۔

ملکوں کی تقسیم دارالحرب اور دارالاسلام کے اعتبار سے آج کل محل نظر ہے، ہر ملک کے اپنے کچھ آئین اور قوانین ہیں، ایک ملک سے دوسرے ملک جانے کے لئے ویزا لینا ہوتا ہے، پاسپورٹ کی ضرورت ہوتی ہے، مزید کچھ کاروائیاں ہوتی ہیں، پہلے زمانہ میں جو ''امان'' کے ساتھ جانے کا رواج تھا آج وہی ویزا کہلاتا ہے، ویزا کے ساتھ ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے والے کی مدت مختصر بھی ہوسکتی ہے اور طویل بھی، مختصر ایک ہفتہ یا اس سے کم اور طویل ایک سال یا اس سے زائد ہوسکتی ہے۔

ہدایہ میں ہے: ''**إذا دخل الحربی إلینا مستأمناً لم یمکن أن یقیم فی دارنا سنة، ویقول له الإمام: إن أقمت تمام السنة وضعت علیک الجزیة......وللإمام أن یوقت فی ذلک ما دون السنة کالشهر والشهرین**'' (ہدایہ ثانی ص ۵۸۶،۵۸۵)۔

(اگر حربی دارالاسلام مستامن بن کر آئے تو ایک سال تک قیام کا موقع نہیں دے گا، اور امام اس سے کہہ دے گا کہ اگر تم پورا سال ٹھہرے تو میں تم پر جزیہ مقرر کر دوں گا......اور امام کو اختیار ہے کہ اس سلسلہ میں سال سے کم مثلاً ایک اور دو ماہ کا وقت متعین کر دے)۔

امام جصاصؒ نے آیت کریمہ: ''**وإن أحد من المشرکین استجارک......أبلغه مأمنه**'' (سورۂ توبہ: ۶) کے

تحت لکھا ہے:"قال أصحابنا: لا ينبغي للإمام أن يترک الحربي في دارالإسلام مقيما بغير عذر ولا سبب يوجب إقامته وإن عليه أن يتقدم إليه بالخروج إلى داره، فإن أقام بعد التقدم إليه سنة في دار الإسلام صار ذميا ووضع عليه الخراج"(احکام القرآن للجصاص ۳/ ۱۰۴)۔

(ہمارے اصحاب کا کہنا ہے کہ امام کے لئے مناسب نہیں کہ وہ حربی کو دارالاسلام میں بغیر کسی عذر اور سبب کے اقامت کرنے دے کہ وہ مقیم ہوجائے، امام پر لازم ہے کہ وہ حربی کو پہلے اپنے ملک جانے کی بات کہے اگر وہ اس طرف پیش قدمی کے بعد دارالاسلام میں سال بھر رہ جائے تو وہ ذمی ہوجائے گا اور اس پر خراج ہوگا)۔

ڈاکٹر زحیلی مذکورہ بالا آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"الآية تفيد عموم حكم الأمان لأهداف دينية أو سياسية أو تجارية، قال ابن كثير: والغرض أن من قدم من دار الحرب إلى دار الإسلام في أداء رسالة أو تجارة أو طلب صلح أو مهادنة أو حمل جزية أو نحو ذلک ومن الأسباب، وطلب من الإمام أو نائبه أمانا، أعطى أمانا، مادام مترددا في دارالإسلام، حتى يرجع إلى مأمنه ووطنه" (آیت دینی یا سیاسی یا تجارتی مقاصد کے لئے امان کے عمومی حکم کا فائدہ دیتی ہے، ابن کثیرؒ فرماتے ہیں: آیت کا مقصد یہ ہے کہ جو شخص دارالحرب سے دارالاسلام پیغام رسانی یا تجارت یا طلب مصالحت یا معاہدہ یا جزیہ وغیرہ اسباب میں سے کسی وجہ سے آئے اور امام یا اس کے نائب سے امان طلب کرے، تو وہ امان دے گا جب تک کہ وہ حربی دارالاسلام میں رہے، یہاں تک کہ اپنے وطن یا جائے امن لوٹ جائے)۔

ڈاکٹر موصوف آگے مزید لکھتے ہیں:

"نص الحنفية والشافعية وغيرهم على أن الحربي إذا دخل دارالإسلام مستجيرا لغرض شرعي كسماع كلام الله أو دخل بأمان للتجارة، وجب تأمينه وحماية نفسه وماله إلى أن يبلغ داره التي يأمن فيها"(التفسیر المنیر ۱۰/ ۱۱۳، ۱۱۴، سورۂ توبہ:٦)۔

(حنفیہ اور شافعیہ وغیرہم نے اس کی صراحت کی ہے کہ حربی جب دارالاسلام کسی شرعی مقصد، جیسے کلام اللہ کا سننا، کی خاطر پناہ لے کر آئے یا تجارت کے لئے امان کے ذریعہ داخل ہو تو اس کو امان دینا اور اس کی جان و مال کی حفاظت و نگرانی کرنا واجب ہے، یہاں تک کہ وہ اپنے مامون گھر میں پہنچ جائے)۔

علامہ جصاصؒ نے اس آیت کے تحت لکھا ہے کہ:

"في هذا دليل أيضا على أن على الإمام حفظ أهل الذمة والمنع من أذيتهم والتخطي إلى

ظلمهم، وفيه الدلالة على أنه لا يجوز اقرار الحربی فی دارالإسلام مدة طويلة، وأنه لا يترک فيها إلابمقدار قضاء حاجته"(احکام القرآن للجصاص ۳/ ۱۰۳)۔

(اس میں اس بات کی بھی دلیل ہے کہ امام پر اہل ذمہ کی حفاظت، ان کو اذیت سے بچانا اور ان پر ظلم ڈھانے سے روکنا لازم ہے، اور اس میں یہ دلالت ہے کہ دار الاسلام میں حربی کو طویل مدت باقی رکھنا جائز نہیں، اور یہ کہ اس کو صرف اپنی ضرورت پوری کرنے کے بقدر دار الاسلام میں رہنے دیا جائے گا، اس سے زیادہ نہیں)۔

حربی کا ذمی اور مستامن کا حربی بن جانا:

باہمی رضامندی یا دار الاسلام میں ایک سال تک اقامت، یا شادی کرنے یا غلبہ وفتح کے ذریعہ حربی ذمہ بن جاتا ہے، اسی طرح مستأمن، یعنی وہ حربی جو دار الاسلام میں عارضی طور پر مقیم ہو، دار الاسلام میں مقررہ مدت اقامت ختم ہونے کے ساتھ ہی حربی بن جاتا ہے...... بسا اوقات مستامن خود اپنی طرف سے "امان" ختم کرنے سے یا اقامت کی نیت سے دار الحرب میں لوٹ آنے کے سبب حربی بن جاتا ہے، اگر تجارت، سیر وتفریح یا کسی ضرورت کے تحت دار الحرب جائے اور پھر وہاں سے دار الاسلام لوٹ آئے تو حربی نہیں بنے گا (موسوعہ فقہیہ ۷/ ۱۶۳)۔

جمہور فقہاء کے یہاں اگر مسلمان یا ذمی کسی حربی کو (خواہ وہ مستامن ہو) قتل کردے تو اس سے قصاص نہیں لیا جائے گا، جیسا کہ اگر وہ غیر مستامن حربی کو قتل کردے تو ان پر دیت واجب نہیں ہوتی، اس لئے کہ حربی کے خون کے مباح ہونے میں شبہ موجود ہے اور اس لئے کہ اصل میں وہ مباح الدم ہے (موسوعہ فقہیہ ۷/ ۱۶۶)۔

مستامن کے لئے مدت قیام:

اصل یہ ہے کہ غیر مسلم جس کے ساتھ عقد ذمہ نہ ہو، اس کو دار الاسلام میں مستقل اقامت نہیں کرنے دیا جائے گا، صرف وقتی امان کے ذریعہ کچھ دنوں اقامت کی اجازت ہوگی اور اس امان والے کو مستامن کہتے ہیں، جمہور فقہاء (حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ) کے نزدیک مستامن کی دار الاسلام میں اقامت کی مدت پورے سال نہیں ہوگی، اگر وہ ایک سال یا اس سے زیادہ اقامت کرلے تو اس پر جزیہ عائد کردیا جائے گا، اور اس کے بعد وہ ذمی ہوجائے گا۔

لہذا غیر مسلموں کی لمبی اقامت اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ دائمی اقامت اور اہل ذمہ کے شرائط قبول کرنے پر راضی ہیں۔

واضح رہے کہ اگر امام نے کوئی مدت مقرر کی تھی تو جس دن امام نے کہا تھا اس دن سے ایک سال تک اقامت کرے تو جزیہ لیا جائے گا۔

اور اگر کوئی مدت مقرر نہیں کی تھی تو اکثر حنفیہ کے نزدیک ایک سال اقامت کرنے سے ذمہ بن جائے گا، جبکہ بعض کا کہنا ہے کہ جس دن امام نے نکلنے کا نوٹس دیا ہے، اس ایک سال کا لحاظ اس تاریخ کے اعتبار سے ہوگا (ایضا)۔

پناہ گزینوں کے حقوق:

اگر کسی ملک نے دوسرے ملک کے باشندوں کو مظالم یا آفات سماویہ کی وجہ اپنے ملک میں پناہ دے رکھی ہے تو یہ عارضی پناہ گزیں مستقل شہریوں کے مساوی حقوق میں نہ ہوں گے، بلکہ معاہدہ کے تحت حقوق کا استحقاق رکھیں گے، اب اس ملک کا امیر یا سلطان حسب گنجائش ان کو آئندہ ایک شہری کی حیثیت بھی دے سکتا ہے اور حالات معمول پر آنے کی صورت میں انہیں ان کے ممالک بھی واپس کرسکتا ہے، کیونکہ اخلاقی و انسانی اعتبار سے اس نے نازک گھڑی میں ان کا ساتھ دیا، اور سہولت فراہم کی یہی کیا کم خدمت ونصرت ہے۔

ہاں اگر یہ پناہ گزیں مستقل شہری بن جاتے ہیں تو قدیم و جدید کا فرق نہیں ہوگا، بلکہ ان کو ایک شہری کی حیثیت سے وہ جملہ حقوق حاصل ہوں گے جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔

☆☆☆

شہریت سے متعلق چند اہم مسائل

قاضی محمد حسن ندوی مدھوبنی☆

۱-اسلام میں شہریت کی بنیاد:

یہ بات مسلم ہے کہ اسلام ہی ایک واحد مذہب ہے جس نے ہر زمانے میں انسانوں کو حقوق عطا کئے ہیں، اور اس کے کچھ اصول و بنیاد مقرر کئے ہیں، شرعی تعلیمات کی روشنی میں قرآن وحدیث سے دو اصول و بنیاد کی طرف رہنمائی ملتی ہے:

۱-ایک اصول یہ ہے کہ انسان کا اللہ تعالی کی وحدانیت کا اعتراف کر کے اللہ کی عبدیت کو قبول کرنا اور زبان و دل سے کلمہ کا اقرار کرنا، اقرار عبدیت کی وجہ سے شہری اور مدنی تمام حقوق کے مستحق ہوں گے۔

حدیث شریف میں ہے:

”**وقد قال رسول الله ﷺ: أمرت أن اقاتل الناس حتى يقولوا لا إله إلا الله، فمن قال لا إله إلا الله عصم منى ماله و نفسه إلا بحقه**“ (مشکوۃ ۲؍۱۵۷)۔

(رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: کہ مجھے اس وقت تک لوگوں سے مقاتلہ کرنے کا حکم دیا گیا جب تک کہ کلمہ نہ پڑھ لے، جب کلمہ کا اقرار کرلیا تو اس کا مال اور جان محفوظ ہوگئی، مگر حق کے ساتھ)۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے علامہ طیبی تحریر کرتے ہیں:

”**من قال لا اله الا الله وأظهر الإسلام نترک مقاتله ولا نفتش باطنه هو مخلص أم لا**“ (مرقاۃ المفاتیح ۴؍۲۸۸)

(جس نے لا الہ الا اللہ کہا اور اسلام کا اظہار کیا تو ہم اس سے جنگ ترک کردیتے ہیں اور اس کے باطنی حالات کی تفتیش نہیں کرتے کہ آیا وہ مخلص ہیں یا نہیں)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بھی اقرار اسلام کو حفظ نفس اور مال کا سبب قرار دیا ہے، ”**وإعلان الإسلام يؤدى إلى عصمة دم الإنسان وماله من أي أذى**“ (موسوعہ فقیہ ۱۳؍۷۱؍۳)۔

☆ استاذ حدیث وفقہ دار العلوم ماٹلی والا بھروچ گجرات۔

(اسلام کا اعلان انسان کی جان و مال کی حفاظت کا سبب ہے)۔

دوسری جگہ پر ڈاکٹر وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

"حدد التشریع الاسامی اطرا العلاقات الثلاث علاقة الانسان بربه وعلاقته بنفسه وعلاقته بمجتمعه" (موسوعۃ الفقہ ۱۲/۶۰۷)۔

"لأن رسالة الاسلام ذات نزعة عالمية موجهة لجميع الناس فتكرر الخطاب بكلمة "يا ايها الناس" (حوالہ سابق)۔

شریعت مطہرہ نے شہری حقوق کے لئے تین باتوں کو بنیاد بنایا ہے، انسان کا اللہ تعالی سے تعلق ہونا، اپنے ذات سے تعلق ہونا اور انسان کا اپنے معاشرہ سے تعلق ہونا۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی کی اس عبارت سے یہی بات عیاں ہوتی ہے کہ شہریت کی اصل بنیاد اسلام قبول کرنا، اور انسان کا اللہ تعالی سے عبدیت کا رشتہ استوار ہونا، اگر یہ رشتہ قائم ہے تو وہ انسانی تمام حقوق کا مستحق ہے، ورنہ نہیں۔

۲-حقوق انسانی کی دوسری بنیاد انسانی کرامت و شرافت ہے، کیونکہ بحیثیت انسان سارے لوگ برابر ہیں اور کائنات کی ساری چیزیں انسان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں، اس لئے انسان ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا زیادہ حق دار ہوگا، اور اس کائنات میں انسان ہی کو سب سے زیادہ معزز اور قابل احترام مخلوق تصور کیا جائے گا، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **"ولقد كرمنا بنی آدم وحملناهم فی البر والبحر ورزقناهم من الطيبات و فضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا"** (بنی اسرائیل:۷۰)۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے بھی حقوق انسان کی بنیاد تکریم انسان کو قرار دیا ہے۔

"وإنما أساس هذه الحقوق فی الإسلام هو إقرار الكرامة الإنسانية أو التكريم الإلهی للإنسان، وهی تستلزم الاعتراف بالحرية، والعدل والسلام والحقوق الضرورية أو الحاجة الإنسانية فی العلم والتربية والعمل والكسب والانتقال وغير ذلک" (موسوعہ الفقہ الاسلامی والقضایا المعاصرہ ۱۲/۶۰۸)۔

(یقیناً اسلام میں ان حقوق کی بنیاد کرامت انسانی کا اقرار کرنا ہے، یا انسان کو اللہ تعالی کی وحدانیت کے اقرار کرنے کی وجہ سے مکرم و محترم سمجھنا ہے اور یہی حقوق عدل، حریت و سلامتی، ضروری حقوق، یا انسانی زندگی کے تمام حاجات کے معترف کا مستلزم ہے)۔

غرض یہ کہ تکریم انسان کا تصور اسلام کے بنیادی تصورات میں سے ہے، اس اعتبار سے سارے انسان برابر ہیں،

خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، شہری ہوں یا پناہ گزیں۔

مغرب کا تصور شہریت:

لیکن اسلام کے علاوہ دوسرے ممالک کا تصور مختلف ہے، اور مغربی ممالک کا تصور بالکل آزادانہ ہے، یہ لوگ حقوق شہریت کو ایک طبعی حق سمجھتے ہیں، اس کے لئے کسی اصول و بنیاد کی کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ صاحب ''موسوعة الحقوق الانسانی'' لکھتے ہیں:

"ویری الفکر الغربی ذلک حقا طبیعیا ینبع من السیادة المطلقة للإنسان التی لا تعلو لها سیادة" (ص ۴، مطبع دار السلام)۔

(مغربی فکر کا تصور یہ ہے کہ یہ ایک طبعی حق ہے جو انسان کو مطلقاً سیادت وحکومت کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے)۔

البتہ بعض ممالک کے حکمراں نے (یعنی ہندوستان، برطانیہ اور امریکہ نے) حقوق شہریت کے حصول کے لئے دو اصول وضع کئے ہیں۔

۱- ایک اصول خونی رشتہ کا اصول ہے، جس کے مطابق کسی ملک کی شہریت رکھنے والے ماں باپ سے پیدا ہونے والا بچہ خود بخود اپنے والدین کے ملک کا شہری مانا جاتا ہے۔

۲- دوسرا اصول پیدائش کا ہونا ہے، یعنی جو بچہ جس ملک کی سرزمین پر پیدا ہوا وہاں کا شہری مانا جاتا ہے، جیسا کہ صاحب ''مبادی سیاسیات'' تحریر کرتے ہیں:

دستور ہند کے پارٹ (۲) میں لکھا ہے کہ ہر وہ شخص جو ۲۶؍جنوری ۱۹۵۰ء کو دستور ہند کے نفاذ کے وقت ہندوستان میں سکونت پذیر تھا، یا ہندوستان کے کسی علاقہ میں پیدا ہوا یا جو دستور ہند کے نفاذ کے فوراً بعد کم از کم پانچ سال ہندوستان کے کسی علاقہ میں سکونت پذیر رہا وہ ہندوستان کا شہری مانا جائے گا (مبادی سیاسیات ص ۳۵۴)۔

اسی طرح امریکی دستور اور نظام حکومت کا تاثر ہے، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں:

سارے انسان مساوی پیدا ہوئے ہیں، یہ کہ خالق کائنات نے انہیں چند ناقابل تنسیخ حقوق عطا کئے ہیں، یہ کہ ان حقوق میں جان وتن کی سلامتی، آزادی وحریت کے حقوق شامل ہیں، اور حکومت کے قیام کا مقصد ہے حقوق کی حفاظت کرنا، جب کوئی حکومت مقاصد میں ناکام ثابت ہوتی ہے تو عوام کو حق ہے کہ وہ اسے بدل ڈالیں، اور اس کی جگہ پر نئی حکومت نصب کریں (مبادی سیاسیات ص ۳۳۰)۔

۲- شہریت حاصل ہونے کی بنیاد کے تعلق سے اوپر تفصیل سے وضاحت کی گئی کہ اسلام میں اس کی دو بنیادیں ہیں:

ایک مسلمان ہونا، دوسری بنیادانسان ہونا، یعنی اسلام نے ان ہی دو باتوں کو شہریت کے حقوق کا سبب قرار دیا ہے(موسوعۃ الفقہ الاسلامی ۱۲/ ۶۰۸)۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالی نے سارے انسان کو خیر امت کہا ہے، اور آپس میں کسی وجہ سے تفاوت اور تفوق کسی پر روانہیں کیا ہے، نہ کسی کو کسی پر ترجیح دی ہے، بلکہ سبھوں کو محترم ومکرم قرار دیا ہے، ہر انسان، خواہ کسی بھی مذہب وملت پر ہو اچھی صورت اور عزت وتکریم والا ہے، اور آپس میں سب برابر ہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:"**هو الذى خلقكم من نفس واحدة**"(اعراف:۱۸۹)، اللہ وہ ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔

اسی طرح سیرت نبوی سے بھی ہمیں یہی سبق ملتا ہے کہ آپ ﷺ نے عالم کے انسانوں کو وحدت کی لڑی میں پرونے کی کوشش کی ہے۔

"**لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي، كلكم من آدم وآدم من تراب**" (کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر فضیلت ہے، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے)۔

دوسری جگہ پر ارشاد نبوی ہے:

"**قال أي يوم هذا؟قالوا يوم حرام، ثم قال أي شهر هذا؟ قالوا شهر حرام، قال أي بلد هذا؟قالوا بلد حرام، قال: فإن الله قد حرم بينكم دمائكم وأموالكم أو اعراضكم كحرمة يومكم هذا، فى شهركم هذا، فى بلدكم هذا**"(مسند امام احمد بن حنبلؒ حدیث نمبر:۲۳۳۸۱)۔

(اللہ کے رسول ﷺ نے کہا یہ کون سا دن ہے؟ صحابہ کرام نے کہا: یوم حرام ہے، پھر پوچھا کون سا مہینہ ہے؟ کہا شہر حرام ہے، کہا کون سا شہر ہے؟ تو کہا محترم شہر (مکہ) ہے، پھر کہا اللہ تعالی نے تمہارے درمیان اس دن، مہینہ اور اس شہر کی طرح ایک دوسرے کا خون، مال اور عزتوں کو حرام قرار دیا ہے)۔

رسول پاک ﷺ کی مذکورہ تعلیمات کے علاوہ آپ ﷺ نے کچھ عملی نمونے بھی پیش کئے ہیں، تاریخ اسلام اور سیرت نبوی ﷺ سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ جب بھی کسی ملک سے اسلام قبول کر کے آپ کے پاس اور آپ کی صحبت میں رہنے کی درخواست کی تو رسول اللہ ﷺ نے صرف پناہ ہی نہیں دیا، بلکہ اسے شہری تمام حقوق عطا کئے، اور کسی کے ساتھ ناروا سلوک نہیں کیا، مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم ذمی اور مستامن کے معاہدہ کا خود پاس ولحاظ کیا اور صحابہ کرام کو بھی اس کی وصیت فرمائی۔

ہجرت کے بعد امت مسلمہ کے ساتھ آپ کا جو کردار تھا اس کے بارے میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی رقم طراز ہیں:

"كل هذه التصرفات السياسية والإدارية تدل على أن الرسول ﷺ كان رسولا و قائدا وحاكما فى المدينة المنورة التى اكتسب فيها المسلمون وجودا دوليا خارجياو محليا"(موسوعۃ الفقہ الاسلامی ۱۲/ ۶۱۷)۔

(یہ سیاسی اور حکومتی تصرفات ہیں جو اس بات پر دال ہیں کہ رسول اللہ ﷺ واحد رسول وقائد اور حاکم تھے جن کی وجہ سے تمام مسلمانوں کو اپنا وجود اور سیاسی خارجی اور داخلی تمام حقوق حاصل ہوئے)۔

دوسری جگہ پر لکھتے ہیں:

"وفى المدينة بعد الهجرة وضع الرسول ﷺ نظام الدولة الاسلامية جاعلا إياها محل الوحدة القومية وأصبح المسلمون مساوين جميعا"(موسوعۃ الفقہ الاسلامیہ ۱۲/ ۶۱۸)۔

(ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اسلامی حکومت کے زمام کو امت وحدۃ کے مقام پر لا کھڑا کیا اور اسی وجہ سے سارے مسلمان برابر ہو گئے)۔

انصاری صحابہ کرام نے مہاجرین صحابہ کرام کے ساتھ جو سلوک پیش کئے وہ بھی اس وقت کے حالات میں ہمارے لئے مشعل راہ ہیں، نمونہ کے طور پر ایک یہاں مثال پیش کی جارہی ہے:

"عن أنس أنه قال: قدم علينا عبد الرحمن بن عوف وأخا رسول الله ﷺ بينه وبين سعد بن الربيع وكان كثير المال فقال سعد: قد علمت الانصار أنى من أكثرها مالا سا قسم مالى بينى و بينک شطرين، ولى امرأتان فانظر اعجبهما إليک فاطلقها حتى إذا حلت تزوجتها فقال عبد الرحمن بارک الله لک فى أهلک"(بخاری ۱/ ۵۳۳)۔

اس واقعہ میں دیکھئے کہ حجرت سعد بن ربیع نے مواخات کا کیا نمونہ پیش کیا مال کا آدھا حصہ مہاجر صحابی عبد الرحمٰن بن عوف کو دے دیا نیز دو بیویوں میں سے ایک بیوی کو اس کے نکاح میں دینے کے لئے طلاق دینے کا ارادہ ظاہر کیا، اور پسند کرنے کے لئے کہا، اس پر عبد الرحمٰنؓ نے دعا دی۔

بہر حال اوپر کی بحث اور حضور ﷺ کی سیرت طیبہ اور صحابہ کے کردار سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اگر کوئی مسلم کسی شرعی عذر کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کے لئے درخواست دے تو شرعاً اور اخلاقاً درخواست قبول کرنا ضروری ہوگا۔

۳- یہ بات اوپر کی بحث وتحقیق سے نمایاں ہوئی کہ اسلام میں شہریت کی بنیاد صرف دو چیزیں ہیں، مسلمان ہونا اور

دوسری بنیاد انسان کا بحیثیت انسان مکرم ومحترم ہونا، لہذا جن لوگوں میں دونوں صفات یا ایک صفت پائی جائے گی انہیں مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کا موقع اور حق حاصل ہوگا۔

لہذا اگر کوئی مسلمان ظلم سے بچنے کے لئے یا شعائر اسلام کے تحفظ کے لئے کسی مسلم ملک میں پناہ لے تو اسے شہری تسلیم کرنا چاہئے ، یہ حق دینا شرعا درست ہی نہیں ہے ، بلکہ اولی وافضل ہوگا ، نیز اسے ملک کے قدیم شہری کی طرح حق اور سہولتیں نہ دینا شرعا جائز نہیں ہوگا۔

لیکن مغربی ممالک اور ہندوستان کے قانون اور اساس شہریت کے اعتبار سے غیر ملکی باشندے (پناہ گزیں) کو چند ہی حقوق حاصل ہوتے ہیں، البتہ وہ مدنی اور سیاسی بہت سے حقوق سے محروم ہوجاتے ہیں، اور قدیم باشندوں کی طرح تمام سہولتیں نہیں دی جاتی ہیں (مبادی سیاسیات ص٦٩)۔

۴- اسلامی نقطہ نظر سے بحیثیت انسان وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو شہریت کے لئے ناگزیر ہیں، مثلاً شخصی آزادی، یعنی جان وتن اور تحفظ جان کا حق ، اندرون ملک نقل وحرکت کی آزادی، کسی بھی مقام پر بسنے کی آزادی، ملک سے باہر سفر کرنے اور ملک واپس آنے کی آزادی، اور دوسرے ملک میں پناہ گزین کا حق ، ذہنی سرگرمیوں کی آزادی کے حقوق، عقیدہ ضمیر اور مذہب کی آزادی، فکری اور نظریاتی آزادی، اظہار رائے ، جلسہ جلوس اور جماعت سازی کے حقوق، نجی جائداد کی فروخت کی آزادی، شادی بیاہ کرنے اور خاندان بنانے کا حق۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی قلمبند کرتے ہیں:

"يقر الاسلام ما تضمنه الاعلان العالمى عن حقوق الانسان فى العاشر من كان أول (ديسبمبر)عام ١٩۴٨ م (١) المادة ١٦ المتعلقة بحق الرجل والمرأة فى التزوج وحريتهما فى تكوين أسرة من غير تقييد، (٢) المادة ١٨ فى حق الانسان فى تغيير دينه أو اعتقاده وهى تتعارض مع منع المسلم من ترک دينه والارتداد إلى دين آخر، (٣) المادة ٢۵ التى تقربثبوت النسب من غير طريق شرعى، أما النظر الاسلامية فلا تمنع من رعاية اللقطا وأولاد الزنا و تربينهم والإحسان إليهم، هذه هى المواد التى يتحفظ عليها المسلمون، وما عدا هذه المواد من ميثاق حقوق الاسلام يقره الاسلام ويدعو إليه مثل حرية التعبير والرائى والمساواة بين الناس من غير اعتبار العنصر والجنس واللون و حق التربية والتعليم والتعلم وحق الحياة، والعيش الكريم، و حق العمل والتنقل وتكوين الدولة وتقلد الوضائف ومراعاة الحقوق الاقتصادية و الاجتماعية و غير ذلک"(موسوعہ الفقہ الاسلامی ١٢/ ٦١٢)۔

یعنی حقوق انسانی کے تحفظ کے خاطر ۱۹۴۸ء میں جو قوانین و دفعات وضع کئے گئے، اسلام ان کی تائید کرتا ہے، البتہ دفعہ/ ۱۸ کی مخالفت کرتا ہے (یعنی تبدیلی مذہب کا حق) کیونکہ یہ حق اسلامی نظریہ سے ٹکراتا ہے، اس کے علاوہ اسلام درجہ ذیل حقوق کو روا سمجھتا ہے، مثلاً آزادی رائے کا حق، لوگوں کے درمیان غیر جانبدارانہ صورت میں مساوات کو برتنا، تربیت، تعلیم وتعلم کا حق، رہائش اختیار کرنے، منتقل ہونے کا حق، مال حاصل کرنے کا حق اور تمام معاشی اور معاشرتی حقوق کا حاصل ہونا، جیسا کہ ''موسوعۃ الفقہ الاسلامی'' میں ہے:

"الحقوق المدينة والسياسية: أهمها أحق فى الحياة والكرامة الإنسانية والحرية بأنواعها، وحق العدل أو المساواة أمام الشرع والقانون، وحق التدين والحرة الدينية وحرية الرائى والتعبير والاعتقاد و حقوق التعليم والتربية" (۱۲/ ۵۴۵)۔

اسی طرح ایک شہری کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو اخروی اور دنیوی ترقی میں معین و مددگار ثابت ہوں گے اور یہ سب حقوق شریعت کے نقطہ نظر سے حاصل ہوں گے۔

"فمن حيث المصدر نجد أن مصدر الحقوق الشرعية من كتاب و سنة" (موسوعۃ حقوق الانسان فی الانسان/ص ۷)۔

بلا شبہ حقوق شرعیہ کے دلائل وہ باتیں ہیں جو اللہ کی طرف سے وحی کے ذریعہ آئیں اور وہ دلائل ہیں جو قرآن و حدیث سے ثابت ہیں۔

لہذا انسانوں کو شہریت کے جو بھی حقوق دیئے جائیں گے وہ شریعت کے آئینے میں ہوں گے، اسے چشم پوشی کرکے کوئی حق دینا یا اس کا استعمال کرنا شرعا درست نہیں ہوگا۔

۵- چونکہ اسلام نے عام شہریوں کے حقوق اور پناہ گزینوں کے حقوق میں کوئی فرق و امتیاز نہیں کیا ہے، بلکہ دونوں کو مسلمانوں اور انسان (بنو آدم) ہونے کی وجہ سے یکساں حقوق دیئے ہیں، ارشاد باری ہے: **"يا يها الناس انا خلقنا كم من ذكر وانثى وجعلنا كم شعوبا و قبائل لتعارفوا إن اكرمكم عند الله اتقاكم"** (حجرات: ۱۳)۔

(اے لوگو، ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے، اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تا کہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو، اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ پرہیزگار بڑا شریف ہے)۔

کیونکہ اسلام ایک ایسا واحد مذہب ہے جو انسانیت کا احترام کرتا ہے، اور اس کے ساتھ ہمدردانہ سلوک کرنے کی ترغیب دیتا ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ حکومت کا سلوک ہر انسان کے ساتھ یکساں ہو، شہری اور غیر شہری کے اعتبار سے فرق نہ

کیا جائے، سیرت نبوی اور خلفائے راشدین کے عمل سے یہی پیغام ملتا ہے، اور یہ خدمت خلق، انسانی ہمدردی اور اسلامی تعلیمات کا تقاضہ ہے، چنانچہ فقہ اکیڈمی کے سمینار کی چند تجاویز سے اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے:

۱-اسلام انسانیت کا احترام کرتا ہے، اس لئے مسلمانوں کے لئے حتی المقدور انسانی ہمدری کی بنیاد پر غیر مسلم بھائیوں کی مدد کرنا ان کا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے۔

۲-مسلمانوں کی طرف سے خدمت خلق کے اداروں کے ذریعہ بلاتفریق مذہب تمام لوگوں کی خدمت اور اعانت کرنی چاہئے، یہی انسانی ہمدردی اور اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے (دیکھئے: غیر مسلم ممالک میں آباد مسلمانوں کے کچھ مسائل: رص ۵۰)۔

گرچہ یہ تجاویز غیر مسلم کے سلسلہ میں ہیں تو مسلم کے سلسلہ میں بدرجہ اولی حکومت کا سلوک اور کردار بہت ہی بہتر ہونا چاہئے، اس لئے پناہ گزینوں کو اسلامی نقطہ نظر سے عام شہریوں کی طرح تمام حقوق حاصل ہوں گے، البتہ ملکی قانون اور نظم وضبط کو بحال رکھنے کے لئے ''**انزل الناس علی قدر منازلهم**'' قول رسول ﷺ پر عمل کرتے ہوئے کچھ حقوق میں فرق ہوگا، مثلاً پناہ گزینوں کو شروع میں ووٹ دینے کا حق اور امیدوار ہونے کا حق حاصل نہیں ہوگا، اس کے علاوہ تمام حقوق حاصل ہوں گے (مبادی سیاسیات رص ۶۹)۔

البتہ ڈاکٹر وہبہ زحیلی نے عقیدہ توحید کی بنیاد پر سیاسی حقوق کو صرف مسلمانوں کے ساتھ خاص کیا ہے، لیکن اساسی حقوق میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کو یکساں شریک کیا ہے (موسوعۃ الفقہ الاسلامی ۱۲/ ۵۴۴)۔

۶- رزق حلال کے لئے محنت کرنا، بھاگ دوڑ کرنا اور جائز ذرائع کو اختیار کرنا درست ہی نہیں، بلکہ دوسرے فرائض کی طرح ایک اہم اور دینی فریضہ ہے جس کی ترغیب قرآن پاک میں کئی جگہوں پر آئی ہے (دیکھئے: سورۂ مومنون ر ۳۴، جمعہ ر ۱۰)۔

حدیث شریف میں ہے:

''عن انس أن رجلا من الانصار اتی النبي ﷺ يسأله فقال: أما في بيتک شئ؟ فقال: بلی حلس نلبس بعضه ونبسط بعضه وقعنب نشرب فيه من الماء......واشتر بالآخر قدوما فائتنني به فأتاه به فشد فيه رسول الله ﷺ عودا بيده ثم، قال: اذهب فاحتطب وبع ولا ارينک خمسة عشر يوما......'' (مشکوۃ ر ۲ ر ۱۶۳)۔

حدیث پاک سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ معاش کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے جائز طریقہ اختیار کرنا درست ہے، نیز اس کے لئے سفر کرنا حتی کہ غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی گنجائش ملتی ہے، کیونکہ آیات اور حدیث میں مطلقا اس کی ترغیب ہے، دار الاسلام اور دار الحرب کی کوئی تحدید نہیں ہے، اس لئے کچھ شرطوں کے ساتھ مسلمان کے لئے معاش کو

بہتر بنانے کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی، جیسا کہ مفتی تقی عثمانی صاحب نے چند صورتوں میں گنجائش دی ہے۔

۱-کسی مسلمان کو اپنے وطن میں بلا وجہ تکلیف پہنچائی جارہی ہو، یا اس کی جائداد ضبط کرلی گئی ہے، حفظ مال کے لئے غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا اور کوئی صورت نہ ہو تو اس صورت میں درست ہوگا۔

۲-مسلم ملک میں رہتے ہوئے معاشی مسائل درست نہ ہو حتی کہ فاقہ سے دوچار ہو تو دوسرے غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا درست ہوگا، جبکہ شریعت پر چلنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔

۳-اعلاء کلمۃ اللہ کے خاطر وہاں بود و باش اختیار کرنا درست ہی نہیں، بلکہ موجب اجر و ثواب ہوگا، یہی وجہ ہے کہ عہد عمرؓ میں بے شمار صحابہ نے مدینہ کو چھوڑ کر کوفہ میں رہائش اختیار کرنے کو دین کے لئے ترجیح دی۔

۴-اگر کسی مسلمان کو اپنے ملک میں ضرورت کے مطابق معاش حاصل ہے، لیکن معیار کے مطابق نہیں ہے تو صرف معیار زندگی بلند کرنے کے لئے غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرنا مکروہ اور ناپسندیدہ ہوگا (فقہی مقالات ۱/ ۲۳۲)۔

۷- اسلام ایک آفاقی مذہب ہے اور مسلمان زندگی سے بھرپور آفاقی ضمانت رکھنے والی قوم ہے، انہوں نے تاریخ کے ایک طویل عرصہ پر حکمرانی کی ہے، مگر کبھی کسی اقلیت کے بنیادی مسائل میں تنگ نظری، حق تلفی یا جانبداری کا ثبوت نہیں دیا ہے، بلکہ اقلیت کو عام مسلمانوں کے حقوق عطا کئے ہیں، نیز اس کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہانہ کردار ادا کرنے کی تعلیم خود قرآن نے دی ہے (ممتحنہ:۸)۔

امام قرطبی نے (سورہ ممتحنہ:۸) کے سلسلہ میں فرمایا: اللہ تعالی کی طرف سے مسلمانوں کو رخصت و اجازت دی گئی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ کریں جو مسلمانوں سے عداوت نہیں رکھتے ہیں اور نہ ان سے جنگ کرتے ہیں (تفسیر قرطبی:۱۸، ۵۹)۔

مفسر قرآن علامہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

اللہ تعالی ان کفار کے ساتھ احسان اور حسن سلوک سے منع نہیں کرتے جو تم سے برسرپیکار نہیں ہیں کہ تم ان کے ساتھ حسن سلوک کرو (تفسیر ابن کثیر ۴/ ۳۷۳)۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات و ارشادات میں غیر مسلموں کے حقوق کا بڑا خیال کیا گیا ہے، نمونہ کے طور پر آپ ﷺ کی اہم ترین ہدایت پیش کی جارہی ہے جو اپنے عمال کو فرمائی تھی:

"ألا من ظلم معاهدا أو إنتقصه أو كلفه فوق طاقته أو اخذ منه شيئا بغير طيب نفس فأنا

حجیجه یوم القیامة''(رواہ ابوداؤد کتاب الجہاد مشکوۃ علی المرقاۃ کتاب الصلح ۹/۸۹)۔

(خبردار! جوشخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث ہوں گا)۔

یہ صرف کتابی نظریہ اور قانونی دفعات کی حد تک نہیں ہے، بلکہ عہد اسلامی کے خلفاء نے ان کو عملی طور پر ثابت کیا ہے۔

حضرت علیؓ کے عہد خلافت میں کسی مسلمان نے ایک غیر مسلم کو قتل کیا، تو انہوں نے حکم دیا کہ قاتل کو مقتول کے ورثہ کے حوالہ کردیا جائے، مقتول کے ورثہ نے اسلامی مساوات اور حضرت علیؓ کے انصاف سے متاثر ہوکر قاتل کو معاف کردیا اور حضرت علی کے پاس حاضر ہوکر اس کی اطلاع دی تو آپ نے فرمایا کہ تم پر کچھ دباؤ تو نہیں ڈالا گیا (نصب الرایۃ ۴/۳۳۷)۔

مذکورہ آیت، فرمان رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے عملی نمونے سے یہ بات واضح ہوئی کہ مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو شہری کی حیثیت سے آباد ہونے کی اجازت دی جائے، مگر دوسری طرف کئی آیات میں ان کو دوست اور قریب کرنے سے منع بھی کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

''**یایها الذین آمنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم أولیاء**'' (ممتحنہ:۱)۔

(اے ایمان والو! میرے اور تم اپنے دشمن کو دوست (رازداں) مت بناؤ)۔

دوسری جگہ پر ہے:

''**یایها الذین آمنوا لا تتخذوا الیهود والنصاری أولیاء بعضهم اولیاء بعض ومن یتولهم منکم فانه منهم**''(مائدہ:۵۱)۔

(اے ایمان والو! تم یہود ونصاری کو درست مت بناؤ، وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں، جوشخص ان کے ساتھ دوستی کرے گا وہ ان ہی میں سے ہوگا)۔

رسول اللہ ﷺ کی حدیث:

''**أنا بري من کل مسلم أقام مع المشرکین لا ترای ناراهما**'' (مجمع الزوائد ۵/۲۶۰) (میں اس مسلمان سے براءت کا اظہار کرتا ہوں جس نے مشرکوں کے ساتھ بود وباش اختیار کیا ان کو تو اس طرح رہنا چاہئے کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے)۔

بہرحال غیر مسلموں کو مسلم ملکوں میں حقوق انسانی کے تعلق سے تمام حقوق حاصل ہوں گے، لیکن مسلمانوں کو چاہئے

کہ ان کے ساتھ ہمدردی اور اخلاق سے متاثر کرے ان کو اپنے سے قریب کرے، ان کے عقیدے اور تہذیب سے متاثر ہونا اور ان کے رسومات میں شرکت کرنا شرعا درست نہیں ہوگا، بلکہ ایسی صورت میں علاحدہ رہنا ضروری ہوگا۔

یہاں پر ارشادات تھانوی کو نقل کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے، لکھتے ہیں:

کفار کے ساتھ تعلق کی تین قسمیں ہیں:

۱-موالات یعنی دوستی وقلبی تعلق، ۲- مدارات یعنی ان کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرنا، ۳-مواسات یعنی کچھ دے دلا کر ان کو فائدہ پہنچانا۔

پہلی قسم کا تعلق تو بالکل ناجائز ہے، جہاں تک دوسری اور تیسری صورت کا تعلق ہے تو یہ تین مواقع پر درست ہیں:

۱-دفع ضرر کے لئے، ۲-کافر کی دینی مصلحت کے لئے، ۳-اگروہ مہمان ہے یا معزز لوگوں میں سے ہے تو اس کا اکرام کیا جائے گا (احکام القرآن بحوالہ اقلیتوں کے حقوق)۔

مخلوط آبادی:

غرضیکہ مشترکہ طور پر غیر مسلموں کو مسلم معاشرہ میں آباد کرنے میں دوصورتیں پیدا ہوں گی، ایک اعتبار سے منفعت ہے، یعنی اسلامی تعلیمات و اخلاق کی تبلیغ آسان ہوگی، دوسری صورت میں مضرت ہے، یعنی غیر اسلامی تہذیب سے مسلمانوں کا متاثر ہونا لازم آئے گا، اور فقہاء کا ایک مسلمہ قاعدہ ہے: "**دفع المضرة أولى من جلب المنفعة**" (منفعت حاصل کرنے کے مقابلہ میں مضرت کو دور کرنا اولی ہے)، لہذا غیر مسلموں کو مسلم ملکوں میں مسلمانوں کی آبادی سے ہٹ کر بود و باش اختیار کرنے کی اجازت دینا درست ہوگا، تاکہ مسلمان ان کی تہذیب سے متاثر نہ ہوں، اور ان کی مدد کرنے میں اور دین اسلام سے قریب کرنے میں سہولت بھی ہو۔

☆☆☆

شہریت حاصل کرنے کی شرعی بنیاد

مولانا محمد قمر الزماں ندوی☆

اسلام میں شہریت حاصل کرنے یا شہریت حاصل ہونے کے لئے کس بات کو بنیاد بنایا جائے اس کا انحصار حکومت کی صوابدید پر ہے، اگر حکومت کسی کو ملک میں محض بودوباش اختیار کر لینے پر یا معاشی سرگرمیاں انجام دینے پر یا ایک مخصوص مدت تک وہاں قیام پر شہریت دے دیتی ہے تو یہ اس کے دائرہ اختیار میں ہے، کیونکہ عصر حاضر میں مستقل شہریت کے رائج طریق کار کے مطابق صرف حکومت ان معاملات میں مجاز (Compitent Authority) ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں احقر کی رائے یہ ہے کہ حکومت اور ارباب حکومت کو میثاق مدینہ، مہاجرین حبشہ کا حبشہ میں عارضی قیام اور نجاشی اور حکومت نجاشی اور وہاں کی عوام کے ان کے ساتھ سلوک، نیز مدینہ کے اندر مہاجرین کی شہریت اور حضور ﷺ کی شہریت کے سلسلہ میں رہنما اصول سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہئے اور خاص طور پر مسلم ممالک کو دل ونگاہ کی تنگی کو ختم کر کے شہریت کے اصول وضابطہ میں نرمی پیدا کرنا چاہئے اور پوری دنیا کے حکمراں کو یہ باور کرانا چاہئے کہ شہریت کے مسئلہ کا حل اگر کسی کے پاس ہے تو صرف اور صرف اسلام کے پاس ہے اور اس کے اصول اور ضابطے صرف تعلیمات نبوی ﷺ میں موجود ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ اسلام شہریت کے مسئلہ میں فراخ دلی اور کشادہ قلبی کی تعلیمات دیتا ہے، میثاق مدینہ کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غیر مسلم افراد کے لئے شہریت کی بنیاد اسلامی سلطنت میں ''ولاء'' اور تبعیت کے معاہدہ کے تحت موجود تھی، شہریت کی یہ اساس عقیدہ کی اساس کے علاوہ تھی جو اختلاف عقیدہ کے باوجود انہیں اسلامی ریاست کا فرد شمار کرتی تھی، اس اساس پر ملنے والی شہریت کے حقوق وفرائض کے تعین کے لئے نبی کریم ﷺ کا یہ مقولہ فقہی قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **''لھم ما للمسلمین وعلیھم ما علیھم''** (ابن حبان)۔

☆ استاذ مدرسہ نور الاسلام کنڈہ پرتاپ گڑھ۔

یہ حدیث میثاق مدینہ کے پچیسویں دفعہ کے ابتدائی فقروں کی ترجمانی کرتی ہے جس کے تحت یہود اور مسلمانوں کو معاہدہ ولاء کے تحت یکساں حیثیت کی شہریت حاصل تھی، شہریت کے ضمن میں میثاق مدینہ کی یہ دفعہ دو اہم نکات کی نشاندہی کرتی ہے۔

۱-مدنی ریاست کا دستور عقیدہ کی آزادی کے اصول پر قائم ہوا تھا۔

۲-اس ریاست کا دستور دیگر سماوی ادیان کے ساتھ برداشت، رواداری کے اصولوں پر مبنی تھا۔

مذہب اسلام نے عقد ذمہ سے بھی غیر مسلموں کو شہریت کے حقوق عطا کئے ہیں، میثاق مدینہ کی شق نمبر ۱۵ میں اس کی وضاحت کی گئی ہے، دفعہ کے الفاظ ہیں:

''اور اللہ کا ذمہ ایک ہی ہے (ان مسلمانوں) کا ادنی فرد بھی کسی کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا)۔

اوپر کی تفصیلات سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ حضور ﷺ نے شہریت کے مسئلہ کو کتنے بہتر انداز میں حل فرمایا تھا کہ مسلم تو مسلم غیر مسلم کے لئے بھی شہریت حاصل کرنا کتنا آسان تھا اور آپ ﷺ نے اس مسئلہ کو کس قدر خوش اسلوبی سے حل فرمایا تھا، آج ضرورت ہے کہ مسلم حکمراں خاص طور پر اور پوری دنیا کے سربراہان مملکت عام طور پر میثاق مدینہ اور مدنی شہریت، نیز ارض حبشہ میں مسلمانوں کی بحیثیت مہاجر اقامت اور نجاشی بادشاہ کی فراخ دلی کا گہرائی سے مطالعہ کریں اور پھر اس کی بنیاد پر شہریت کے مسئلہ کو حل کریں اور اس حدیث کو پیش نظر رکھیں۔

''الخلق عیال الله''، پوری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اور اس سلسلے میں بیجا شدت اور غیر انسانی اصول اور ضابطہ کو ختم کرنے کی کوشش کریں، نیز ایک ہی ملک میں وہاں کے باشندوں کے ساتھ امتیاز اور غیر مساویانہ سلوک سے حتی الامکان پرہیز کریں۔

مسلم یا غیر مسلم کی شہریت کی درخواست قبول کرنا کیا حکومت پر ضروری ہے؟

اس مسئلہ کا حل سوال نمبر ایک کے جواب کی روشنی میں ہم تلاش کر سکتے ہیں کہ کسی مسلم یا غیر مسلم کی شہریت کی درخواست کو قبول کرنا وہاں کی حکومت کے اختیار میں ہے، اگر اس ملک میں گنجائش ہے اور وہاں مال وزر اور اسباب وسائل کا افراط ہے، اور درخواست دہندہ کے وہاں قیام سے ملک وملت کا کوئی دینی، معاشی اور سماجی نقصان بھی نہیں ہے، بلکہ یہ شخص اس ملک کا شہری بن کر ملک کا نام روشن کرسکتا ہے یا وہاں کی حکومت کے لئے مفید بن سکتا ہے، اور وہ شخص اپنے ملک میں معاشی پریشانی سے دوچار ہے اور خطرہ ہے کہ کہیں ''کاد الفقر أن یکون کفرا'' کی حدیث کا مصداق نہ بن جائے تو ایسی صورت میں اس ملک کی اور حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ اس کی درخواست کو ضرور بالضرور قبول کرے اور اس کو کفر کی دہلیز پر

جانے سے بچائے، جبکہ عام حالت میں جبکہ مسلمان صرف اورصرف معاشی فائدے کی غرض سے اور معیار زندگی کو بلند کرنے کی غرض سے درخواست پیش کرتا ہے تو حکومت پر ضروری نہیں ہے کہ وہ اس کی درخواست کو ضرور قبول ہی کرے، بلکہ وہ اپنے ملک اور وہاں کے باشندوں کے مفاد کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنے اور قبول کرنے کا مجاز ہوگا، ایسے موقعہ پر حکومت کو حتی الامکان وسعت سے کام لینا چاہئے اور وسعت ظرفی کا ثبوت دینا چاہئے۔

مسلمان تارکین وطن مسلمان ملک میں کس درجہ کے شہری ہوں گے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مسلمان ملک کے لئے شان زیبا تو یہی ہے کہ وہ ان تارکین وطن کو اپنے ملک میں قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی سہولتیں فراہم کرے جس طرح کہ انصار مدینہ نے مہاجرین مکہ کو شہر مدینہ میں بسایا اور ان کو ہر طرح کی سہولیات فراہم کیا، لیکن یہ بات یادرہے کہ مذکورہ حکم اس وقت ہوگا، جبکہ اس ملک میں تارکین وطن کے دائمی قیام کے لئے گنجائش ہو اور ان تارکین وطن کے مستقل قیام سے وہاں کی حکومت اور عوام کو دینی سماجی اور معاشی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے، لیکن اگر اس ملک میں ان تارکین وطن کو مسقل قیام کی اجازت سے حکومت اور عوام کو پریشانی کا زبردست سامنا کرنا پڑسکتا ہو تو اس ملک اور حکومت کو اس کی اجازت ہوگی کہ انہیں پناہ گزیں کا درجہ دے اور ملک کے قدیم باشندوں کی طرح انہیں ایک شہری ہونے کی سہولتیں نہ فراہم کرے، بلکہ حکومت کو اس کا اختیار ہوگا کہ جس ملک سے وہ آئے ہیں وہاں حالات درست ہوجائیں اور مظالم کا سلسلہ بند ہوجائے تو ان پناہ گزیں کو اپنے ملک واپس بھیج دیں۔

(نوٹ) حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ مسلمان جب تک اس ملک میں رہیں ان کے ساتھ حسن سلوک کریں اور ان کو مہمان کا درجہ دے کر ان کی خوب خاطر مدارات کریں، اور ان کی ضروریات کی مکمل کفالت کریں۔

شہریت کے حقوق کیا ہیں؟

اس سوال کا جواب اور حل پیش کرنے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میثاق مدینہ کے حوالہ سے چند تمہیدی باتیں سامنے آجائیں۔

اسلامی مملکت کے قیام کے بعد آپ ﷺ نے میثاق مدینہ کا اہتمام کیا، اور مہاجرین، انصار، یہود و عیسائی اور دیگر قبائل کو جمع کیا اور اس موقع پر ایک تحریر لکھوائی، جس کو ہم پہلا تحریری دستور قرار دے سکتے ہیں، جس میں امن و امان کی ضمانت، اقلیتوں کے حقوق کی پاسداری، فکری و مذہبی آزادی کا پورا خیال رکھا گیا جس کے بنیادی اجزاء و نکات کو ملاحظہ کیجئے۔

۱-آبادیوں میں امن رہے گا، تا کہ سکون سے نئی نسل کی تربیت کی جاسکے، ۲-مذہب اور معاش کی آزادی ہوگی، ۳-فتنہ وفساد کو قوت سے ختم کیا جائے گا، ۴-بیرونی حملوں کا مل کر مقابلہ کیا جائے گا، ۵-حضور ﷺ کی اجازت کے

بغیر کوئی جنگ کے لئے نہیں نکلے گا، ۶-میثاق کے بارے میں اختلاف پیدا ہوا تو رسول ﷺ سے رجوع کیا جائے گا۔

اس معاہدے میں مسلمانوں، یہودیوں اور مختلف قبیلوں کے لئے الگ الگ دفعات مرقوم ہیں، یہ اصل میں مدینہ کی شہری مملکت کے نظم ونسق کا ابتدائی ڈھانچہ تھا۔

یہاں یہ بات واضح طور پر ذہن میں رہے کہ حضور ﷺ یونان کی شہری ریاستوں کی طرح کوئی محدود ریاست قائم کرنا نہیں چاہتے تھے، بلکہ آپ ﷺ نے ایک عالمگیر مملکت کی بنیاد ڈالی تھی جو مدینہ کی چند گلیوں سے شروع ہوئی اور روزانہ ۹۰۰ سو کلومیٹر کی رفتار سے پھیلتی رہی، اس وقت دس لاکھ مربہ میل کی مملکت تھی جب اللہ کے رسول ﷺ نے دنیا سے پردہ فرمایا (مستفاد از محمد رسول اللہ ﷺ مؤلف ڈاکٹر حمید اللہ)۔

اس میثاق، یعنی صحیفہ میں بلدیاتی نظام کے تعلق سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

امن وامان کا قیام، ۲-تعلیم وتربیت کی سہولتیں، ۳-روزگار سکونت اور ضروریات زندگی کی فراہمی۔

اوپر کی تفصیلات کا گہرائی سے اگر مطالعہ کیا جائے تو اسلامی نقطہ نظر سے وہ سارے حقوق جن کا سوال نمبر ۴ میں ذکر آیا ہے شہریت کے حقوق مانے جائیں گے، مثلاً ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری اسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق۔

(نوٹ) اگر اس ملک میں کسی خاص ریاست یا صوبہ (میں) کے لئے حکومت نے کسی خاص مصلحت سے دوسرے صوبے کے لوگوں کے لئے زمین کی خریداری پر روک لگا دی ہو تو اس ملک کا نیا بننے والا شہری بھی اس آرڈر اور حکم کا مکلّف ہوگا۔

شریعت میں پناہ گزینوں کے حقوق:

شریعت اسلامی کی رو سے اگر کسی ملک میں وہاں کی حکومت کی اجازت سے لوگ پناہ لیتے ہیں جن کو عرف عام میں آج پناہ گزیں کہا جاتا ہے تو ایسے لوگوں کو اس ملک میں زندگی گزارنے، نیز اولاد کی تعلیم وتربیت اور حفظان صحت کے سلسلے میں تمام رعایتیں دی جائیں گی اور اگر حکومت ان لوگوں کے خوردونوش اور رہائش کا انتظام کرنے سے اپنے کو بے بس ظاہر کرتی ہے اور ان کو مکلّف بناتی ہے کہ اپنے خوردونوش کا انتظام خود کریں تو اس صورت میں ان پناہ گزینوں کو معاشی تگ ودو کی مکمل اجازت دینا حکومت کی ذمہ داری ہوگی، البتہ ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار بننے کا حق، سرکاری اداروں میں

ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا باضابطہ حق، نیز وہاں کے سرکاری اسپتالوں میں علاج ومعالجہ کے سلسلے میں عام شہری کی طرح حق، روزگار کا حق، سرکاری طور پر حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقلی کا حق، یہ تمام حقوق وہ ہیں جو ان پناہ گزینوں کو اس وقت حاصل ہوں گے جب وہاں کی حکومت ان لوگوں کو اس کی اجازت قانونی طور پر دے دے۔

البتہ حکومت کی ذمہ داری بنتی ہے کہ جب ان لوگوں کو وقتی طور پر ہی سہی اگر ملک میں رہنے کی اجازت دی ہے تو دامے درمے ان کی مدد کریں ان کے بچوں کی تعلیم کی فکر کریں، حفظان صحت کے سلسلے میں ان کی مدد کریں ان کے دواوعلاج کا مفت انتظام کریں، موسم کی شدت وحدت کے دنوں میں ان کا خاص خیال رکھیں، اور اس سلسلے میں یہ کوشش بھی کریں کہ اگر ان کی ضروریات خود پوری نہ کرسکیں تو متمول اسلامی ممالک سے تعاون کی درخواست کریں اور اقوام متحدہ کے مالی فنڈ سے ان کی مدد کرائیں، ان کے لئے انسانیت نوازی کا پورا ثبوت دیں۔

اس سلسلے میں حکومت اور وہاں کے باشندوں کی ذمہ داری ہے کہ اگر چہ وہ لوگ وہاں کے حقیقی شہری نہیں ہیں، لیکن اسلام نے ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان سے اخوت کے رشتے سے جوڑ دیا ہے، اس لئے ان پناہ گزینوں کو اپنا بھائی سمجھیں اور ان سے تعصب نہ برتیں۔

الغرض پناہ گزینوں کو جو حقوق حاصل ہونے چاہئیں وہ مختصر ایوں ہیں:

۱-ضمیر کی آزادی، ۲-زبان کی آزادی، ۳-زندگی گذارنے کی آزادی، ۴-رہائش اور امن وامان کا حق۔

غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا کیسا ہے؟

کسی مسلمان کے لئے مجبوری اور ضرورت شدیدہ کی بنا پر غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اسلام میں گنجائش نظر آتی ہے، عام حالت میں غیر مسلموں کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ حدیث کی مشہور کتاب ''ابوداؤد'' میں حضرت سمرہ بن جندب کی روایت موجود ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

''**من جامع المشرك وسكن معه، فإنه مثله**'' (ابوداؤد کتاب الضحایا) (جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے)۔

حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا:

''**أنا برئي من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين قالوا يا رسول الله! لم؟قال لا تراي ناراهما**'' (میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں، جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے، صحابہ کرامؓ نے سوال کیا یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، تم یہ امتیاز

کر سکو گے کہ یہ مسلمان کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے)۔

امام خطابیؒ اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''مختلف اہل علم نے اس قول کی شرح مختلف طریقوں سے کی ہے، چنانچہ بعض اہل علم کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلمان اور مشرک حکم کے اعتبار سے برابر نہیں ہوسکتے، دونوں کے مختلف احکام ہیں اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالی نے دار الاسلام اور دار الکفر دونوں کو علاحدہ علاحدہ کردیا ہے، لہذا کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ملک میں ان کے ساتھ رہائش اختیار کرنا جائز نہیں ہے، اس لئے کہ جب مشرکین اپنی آگ روشن کریں گے اور یہ مسلمان ان کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے ہوگا تو دیکھنے سے یہی خیال کریں گے کہ یہ بھی انہیں میں سے ہے، علماء کی اس تشریح سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دار الکفر جائے تو اس کے لئے وہاں پر ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے'' (معالم السنن للخطابی ۳/ ۳۷۴، بحوالہ فقہی مقالات جلد اول)۔

ایک حدیث میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

(اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو)۔

یہی وجہ ہے کہ عام حالت میں مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے، البتہ مخصوص حالات میں ضرورت شدیدہ کی بنا پر فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے، نیز غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کے مقصد سے بھی وہاں قیام کی گنجائش فقہاء نے دی ہے۔

غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنے یا نہ کرنے کا مسئلہ زمانہ اور حالات کے اختلاف سے بدل بھی سکتا ہے، چنانچہ فقہاء کے یہاں ایک مشہور قاعدہ ہے: ''**لا ینکر تغیر الأحکام بتغیر الأزمان**''، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں مفتی تقی عثمانی صاحب کی تحریر پیش کردی جائے:

''کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی شہریت اختیار کرنا اور اس ملک کے ایک باشندے اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو مستقل مسکن بنالینا، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کی اغراض ومقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوجاتا ہے، مثلاً:

۱- اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا اس کو جیل میں ظلماً قید کرلیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہو، ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر

وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرے کہ وہ وہاں جا کر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے گا اور وہاں رائج شدہ منکرات وفواحشات سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے گا۔

۲-اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہوجائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ وہ نان جویں کا بھی محتاج ہوجائے ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے، جس کی بنا پر وہ وہاں رہائش اختیار کرے تو مذکورہ بالا دوشرائط (جن کا بیان نمبر ایک میں گزرا) اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی، بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو، چنانچہ قرآن مجید میں ہے:

"هو الذى جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا فى مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور" (سورۂ ملک) (وہ ایسی ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کردیا، اب تم اس کے راستوں میں چلو، اور خدا کی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہو کر جانا ہے)۔

۳-اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شریعہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا اس نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا، صرف یہ نہیں کہ جائز ہے، بلکہ اجر وثواب ہے، چنانچہ بہت سے صحابہ اور تابعین رضوان اللہ تعالی علیہم اجمعین نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی، اور جو بعد میں ان کے فضائل ومناقب اور محاسن میں شمار ہونے لگی۔

۴-اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں، جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوشحالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات ومنکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے اور بلا ضرورت دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش وعشرت اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ان میں دینی حمیت کمزور ہوجاتی ہے، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں۔

۵-پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے

اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دارالکفر کی شہریت اور قومیت کو دارالاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بودوباش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے، ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقا حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (بحوالہ فقہی مقالات جلد اول)۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کی مستقل شہریت کا شرعی حکم:

سرزمین حجاز مقدسہ میں غیر مسلموں اور اہل کتاب کو مستقل یا عارضی شہری کی حیثیت سے آباد کرنا کسی حال میں درست نہیں ہے، کیونکہ حضور ﷺ کا حکم ہے کہ انہیں سرزمین حجاز سے باہر نکال دو، ایک اور موقع پر آپ ﷺ نے فرمایا: ”**لا یجتمع فی الجزیرۃ دینان**“ جزیرہ عرب میں دو دین ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے، یعنی اسلام اور کفر ایک ساتھ اکٹھا نہیں ہوسکتے۔

عرب ملکوں میں ضرورت کی بناء پر جن غیر مسلموں کو رہائش کی اجازت مل سکتی ہے ان کے لئے شرط یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے دشمن نہ ہوں یا ان سے برسرجنگ نہ ہوں، چونکہ اسلام غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن سلوک، اور عدل کرنے سے نہیں رکتا، بلکہ صرف ان لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات سے روکتا ہے جو مسلمانوں کے خلاف برسرجنگ ہوں اور ان کے خلاف جارحیت اختیار کریں۔

اگر ضرورت شدیدہ کی بنا پر غیر مسلموں کو شہریت کی اجازت دینی ہی پڑ جائے تو مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان میں دعوت وتبلیغ سے غافل نہ ہوں اور اسلام کے محاسن کو بیان کرنے سے پیچھے نہ رہیں، چنانچہ ایک سوال کے جواب میں علامہ ابن بازؒ لکھتے ہیں:

”الطریق لھذا والسبیل إلیہ ھو دعوۃ غیر المسلمین إلی الخیر والھدی، وأن یفسر لھم ما جاء بہ الرسول ﷺ من الھدی ودین الحق بالأسلوب الذی یفھمونہ وبیان محاسن الإسلام لھم لعلھم یدخلون فی دین اللہ ولعلھم یخرجون من ظلمات الشرک والجھل والظلم إلی نور التوحید والإیمان وعدالۃ الاسلام–فمن قبل الحق واستقام علی دین اللہ فالحمد للہ، وإلا أمکن أبعادہ إلی بلاد الکفرۃ إذا کان لیس من أھل الوطن، وإن کان منھم أمکن أن یستتاب، فان تاب وإلاقتل إن کان لیس من أھل الکتاب ولا عن المجوس، وإن کان من المجوس أو من اھل الکتاب توخذ منھم الجزیۃ، ویبقی فی صغار و ذل حتی ید خل فی دین اللہ ویسلم الناس من شرہ ویعرفونہ............وھذا کلہ فی غیر

الجزيرة العربية، أما في الجزيرة العربية فالوا جب أن يمنعوا من دخولها وأن لا يبقوا فيها" (مجموع فتاوی ابن باز)۔

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ عرب ملکوں (جزیرۃ العرب کو چھوڑ کر) میں بھی شہری کے طور پر صرف اہل کتاب اوراہل مجوس ہی رہ سکتے ہیں، وہ بھی خاص شرطوں کے ساتھ غیر مسلموں، یعنی مشرکوں کو اگر مجبوری کی بنا پر قیام اورشہریت کی اجازت دے دی بھی گئی تو بھی حکومت کو حق ہے کہ ان کو اسلامی ملکوں سے ضرورت ختم ہونے پر باہر کردیں اور شریعت نے بھی اس کی اجازت دی ہے، البتہ جب تک وہ رہیں گے ان کے ساتھ عدل وانصاف کا معاملہ کیا جائے گا اور ان کو تمام جمہوری اور دستوری حقوق حاصل ہوں گے۔

☆☆☆

اسلام میں حصول شہریت کے بنیادی عناصر

مولانا محبوب فروغ احمد قاسمی☆

۱- کسی بھی جگہ سکونت کی مختلف نوعیت ہوتی ہے، اور ہر ایک کے الگ الگ احکام ہوتے ہیں، فقہاء نے قیام کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے: وطن اصلی، وطن اقامت، وطن سکونت، گفتگو کا محور زیر بحث تحریر میں صرف ''وطن اصلی'' ہے، جس کو شہریت سے تعبیر کرتے ہیں۔

فقہاء نے وطن اصلی کے حصول کے بنیادی عناصر کی طرف اشارہ کیا ہے، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ شہریت کا تحقق دو جہت سے ہوسکتا ہے۔

الف- غیر اختیاری، جس کو پیدائشی شہریت بھی کہتے ہیں، یعنی جس جگہ ایک انسان پیدا ہوا ہے وہ ازخود اس کا وطن بن گیا۔

ب- اختیاری شہریت: یعنی ایسی شہریت جو کوشش کے بعد حاصل ہوتی ہے، اس کی بھی دو صورت ہے، ایک تو یہ کہ کسی بھی جگہ کو مستقل قیام کے لئے منتخب کرلیا جائے، حتی کہ وہاں سے فی الفور جانے کا ارادہ نہ ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس مقام پر کسی خاتون سے جس کو پہلے ہی سے وہاں کی شہریت حاصل ہو، اس سے شادی کرلی جائے۔

یہ دوسری صورت وطنیت کے لئے کافی ہوگی یا نہیں، تھوڑا اختلاف پایا جاتا ہے؛

''ردالمحتار'' میں ہے: **''الوطن الأصلي هو موطن ولادته أو تأهله أي: تزوجه، قال في شرح المنية: ولوتزوج المسافر ببلد ولم ينو الإقامة، فقيل لا يصير مقيما، وقيل: يصير مقيما، وهو الأوجه، أو توطنه، أي: عزم على القرار فيه وعدم الارتحال، وإن لم يتأهل''** (ردالمحتار ۱/۵۸۶، باب المسافر، مطلب فی الوطن الأصلی، مطبوعہ رشیدیہ پاکستان)۔

☆ خادم حدیث مدرسہ حسینیہ کیرالا۔

(وطن اصلی تو وہ مقام ولادت ہے، یا جائے ازدواج، شرح منیہ میں ہے: اگر مسافر نے کسی شہر میں شادی کر لی اور اقامت کی نیت نہیں کی تو ایک قول یہ ہے کہ مقیم نہیں ہوگا، دوسرا قول ہے: مقیم ہو جائے گا، یہی مروجہ ہے، یا وطن اصلی تو وطن کی وجہ سے ہوگا، یعنی وہاں رہنے کا عزم ہے، جانے کا نہیں، اگر چہ شادی نہ کی ہو)۔

ابن ہمام لکھتے ہیں: "**الأوطان ثلاثة: وطن أصلي، وهو مولد الإنسان، وموضع تأهل به، أو من قصد التعيش به لا الارتحال، ولو تزوج المسافر فى بلد لم ينو الإقامة فيه، قيل يصير مقيما، وقيل لا**" (فتح القدیر ۲/۱۴۱، کتاب المسافرین، مطبوعہ زکریا دیو بند ۱۴۲۱ھ)۔

(وطن کی تین قسمیں ہیں: وطن اصلی اور وہ انسان کی جائے پیدائش ہے، یا وہ جگہ ہے جہاں شادی کی ہے، یا اس جگہ زندگی گزارنے کا قصد ہے، جانے کا ارادہ نہیں ہے، اگر مسافر نے کسی شہر میں شادی کی، مقیم ہونے کی نیت نہیں ہے تو کہا گیا ہے کہ مقیم ہوگا، اور کہا گیا ہے کہ نہیں ہوگا)۔

اس سے شہریت کا معیار سمجھ میں آتا ہے اور وہ تین چیزیں ہیں: جن کو بنیاد بنا کر کسی بھی شخص کی شہریت کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے: ۱- پیدائشی مقام، ۲- بود و باش کی نیت سے کسی جگہ قیام، ۳- اس جگہ کسی مستقل شہری خاتون سے نکاح و زواج، اس تیسری شق میں اختلاف بھی ہے، حضرت عثمان غنیؓ تیسرے خلیفہ راشد کی رائے بھی جائے نکاح میں مقیم ہونے کی لگتی ہے، اسی وجہ سے جب وہ مکہ حج کی نیت سے جاتے تو تاہل کی وجہ سے اتمام فرمایا کرتے تھے۔

کیا حکومت کی اجازت پر شہریت کا حصول موقوف ہے؟

احادیث اور واقعات پر نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک شخص مستقل طور پر کسی جگہ بود و باش اختیار کرنا چاہتا ہے مگر حکومت اجازت نہیں دیتی ہے تو وہ شہری باور نہیں کیا جا سکتا، بعض حدیثوں اور بعض واقعات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

الف- بخاری شریف میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے ایک اعرابی کا قصہ مذکور ہے، اعرابی نے مدینہ ہجرت کرنے کا ارادہ کیا تو حضور ﷺ نے منع کرتے ہوئے فرمایا:

"**ويحك إن شأن الهجرة شديد، فهل لك من إبل، قال: نعم، قال: فهل تؤدي صدقتها قال: نعم، قال: فاعمل من وراء البحار، فإن الله هلم يترك من عملك شيئا**" (بخاری ۲/۹۱۱، کتاب الأدب، باب ماجاء في الرجل ويهلك)۔

(کیا کہہ رہے ہو!! ہجرت کا معاملہ سخت ہے، کیا تمہارے پاس اونٹ ہیں، اس نے کہا: ہاں ہے! حضور نے فرمایا: کیا اس کی زکاۃ دیتے ہو؟ کہا: ہاں، حضور ﷺ نے فرمایا: یہاں سے دور دراز علاقے میں (سمندر پار رہ کر) رہتے ہوئے عمل کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے عمل میں سے کچھ کمی نہیں کرے گا)۔

اس سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ توطن اور بود و باش اختیار کرنے کے لئے سرکار سے اجازت بھی اہم حیثیت رکھتی ہے، حکومت کو حق ہے کسی کو ارادہ کے باوجود روک دے کہ تم یہاں بود و باش کی نیت سے نہیں رہ سکتے ہو۔

ب-غزوہ طائف کے بیان میں ایک مخنث کا ذکر احادیث میں آتا ہے، اس کا نام ''ہیت'' تھا، اس نے کچھ نازیبا انداز گفتگو عبداللہ بن ابی امیہ کے سامنے اختیار کیا، جس پر رسول اللہ ﷺ نے تنبیہ فرمائی کہ یہ مخنث نہیں ہے، بلکہ مردانہ صفت کا حامل ہے، لہذا عورتوں کے پاس نہ آوے (بخاری ۲/۶۱۹، کتاب المغازی، باب: غزوۃ الطائف)۔

علامہ قسطلانی کے حوالہ سے محشی لکھتے ہیں: ''**ثم أجلاه من المدينة إلى الحمى، فلما ولي عمر بن الخطاب قيل له: إنه قد ضعف و كبر، فاحتاج فأذن له أن يدخل كل جمعة فيسأل الناس، يرد إلى مكانه**'' (حاشیہ بخاری ۹: ۲/ ۶۱۲)۔

(پھر اس کو مدینہ سے ''حمی'' کی جانب جلاوطن کردیا، جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو آپ سے ذکر کیا گیا: وہ مخنث ضعیف ہوگیا ہے، چنانچہ مال کا محتاج ہے، تو حضرت عمرؓ نے اجازت دی کہ ہر جمعہ وہ مدینہ آیا کرے اور سوال کرلیا کرے اور اپنے مکان چلا جایا کرے)۔

اسی طرح کے واقعات دور صدیقی و فاروقی میں بھی پیش آئے، ''عمدۃ القاری'' میں ابوموسی کے حوالہ سے اس طرح مرقوم ہے:

''**نفى أبوبكر ما تعا إلى فدك، وليس بها أحد يومئذ من المسلمين، وأخرج عمر فلانا و فلانا**'' (عمدۃ القاری ۹/ ۳۰۴)۔

(حضرت ابوبکرؓ نے ماتع نامی مخنث کو فدک روانہ کردیا وہاں اس وقت کوئی بھی مسلمان نہیں تھا، اور حضرت عمرؓ نے فلاں و فلاں کو نکال دیا)۔

اس سے اتنی بات تو معلوم ہو رہی ہے کہ کسی کی بھی وطنیت کو ختم کرنے میں سرکار کو دخل ہوتا ہے، اس لئے شہریت کی بنیاد ''بود و باش'' کو بنانے کے ساتھ اس قید کا اضافہ بھی مناسب ہوگا، اگر حکومت کی اجازت سے بود و باش اختیار کی جائے تو شہریت حاصل ہوگی، ورنہ نہیں۔

۲-مسلم ملک پر کسی مسلمان کی درخواست شہریت قبول کرنا ضروری ہے یا نہیں؟

ایک ملک کو چھوڑ کر دوسرے ملک جانے کے لئے کچھ نہ کچھ محرکات ہوں گے، اگر وہ محرکات ایسے ہیں جن سے فتنہ میں ابتلاء کا اندیشہ ہے، یا جان و مال کو حقیقی خطرہ ہے، نیز یہ صورت حال جس طرح دار الکفر میں پیش آسکتی ہے، بعض اوقات

دارالاسلام میں بھی پیش آتی ہے، اپنے ملک میں ہوتے ہوئے بھی اپنی جان اور مال کو محفوظ نہیں سمجھتا، عزت وآبرو کو بعض اوقات ایسا خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ دوسری جگہ جانے پر مجبور ہوتا ہے، امام زہری کے حالات میں ہے کہ ولید بن یزید نے دھمکی دی تھی کہ میں تم کو ہشام کے بعد قتل کردوں گا (سیر اعلام النبلاء ۶/ ۱۴۶ ترجمہ ۷۷۴، دارالفکر بیروت)۔

بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ انہوں نے عزم مصمم کرلیا تھا کہ اگر ولی کی تاج پوشی ہوگئی تو میں روم چلا جاؤں گا ،لیکن اللہ نے ان کو ولید کے دست برد سے محفوظ رکھا، اس کے خلیفہ ہونے سے پہلے ہی حضرت امام زہری دنیا سے رخصت ہوگئے۔

ایسے مجبور کن حالات میں ایک مسلمان سیاسی پناہ کا متلاشی ہوتا ہے، اس کے لئے سب سے بہتر جگہ مسلم حکومت ہی ہوسکتی ہے، نیز ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کی نصرت ومعاونت حتی المقدور لازم وضروری ہے، اس کا تقاضا ہے کہ خواہ مسلم ملک کا باشندہ ہو یا درالکفر کا رہنے والا مسلمان ہو اگر وہ مجبوری کی حالت میں ہے اور ایک مسلم ملک سے سیاسی پناہ کا طالب ہے تو اس کی درخواست قبول کرے، اور سیاسی پناہ دے، نیز حالات اگر ایسے ہوں کہ وہ اپنے ملک واپس نہیں جاسکتا ہے تو مستقل شہری کی حیثیت دے کر اس کو سرفراز کرے۔

لیکن کبھی کبھی ترک وطن کا محرک محض معاشی خوشحالی، اور دنیاوی جاہ وجلال کی افزونی ہوتی ہے، اپنے ملک میں اس کی جان ومال کو بھرپور تحفظ حاصل ہے، دین وایمان کو کوئی خطرہ نہیں، تو ایسے موقع پر کسی بھی مسلم ملک پر لازم نہیں ہے کہ اس کی خواہش کے احترام میں اپنے یہاں کی شہریت کی اجازت دے۔

پچھلی سطور میں بخاری کے حوالہ سے مذکور ہوچکا ہے کہ ایک اعرابی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ مدینہ ہجرت کرجاؤں، ان کو اپنے خطے میں رہتے ہوئے دینی پریشانی بھی نہیں تھی، تو رسول اللہ ﷺ نے صاف منع کردیا تھا، "**فاعمل من وراء البحار**" ایسے حالات میں سمندر پار رہ کر بھی اگر عمل کروگے تو اللہ تمہارے عمل میں کوئی کمی نہیں کرے گا، جبکہ اس واقعہ میں دنیوی ترقی مقصود نہیں تھی، نبی کی صحبت ومعیت مطلوب تھی، پھر بھی اجازت نہیں ملی۔

تارکین وطن اور حق شہریت:

اسلامی تعلیمات کا لب لباب تو یہ ہے کہ اپنے ملک میں رہنے والے ہر شخص کو رہنے سہنے کی ہر قسم کی سہولت فراہم کی جائے، خواہ وہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، حتی کہ ایسے مقام پر بھی ان کے مالکانہ تصرف کو گوارہ کیا گیا جہاں کفار کی بودوباش ناجائز ہے، جزیرۃ العرب یا خاص خطہ حجاز مسلمانوں کے لئے خاص ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنی وصیت میں صراحت کی ہے: "**أخرجوا الیھود والنصاری من جزیرۃ العرب**"، لیکن پھر بھی جب تک مسلمانوں کے پاس ان کے رہنے سہنے کے

لئے خطہ حجاز سے باہر زمین حاصل نہیں ہوسکی اس وقت تک خیبر کے یہود مدینہ میں ہی مقیم رہے، حضرت عمر فاروق کے دور خلافت میں ان کو اریحا و تیما کی طرف بھیجا گیا، زمین فراہم کی گئی، اتنے دنوں تک مدینہ میں رہنا گوارہ کیا گیا، اس میں راز یہی تھا کہ دارالخلافہ کے پاس مدینہ سے باہر زمین اپنی نہیں تھی۔

اسی طرح نجران کے عیسائیوں کو فاروقی دور میں شام کی طرف جلاوطن کیا گیا، حضرت عمر فاروق کا فرمان یعلی بن امیہ کو پہنچا، ملک یمن جا کر نجران کے عیسائیوں سے کہہ دو کہ اس ملک کو چھوڑ دیں، ہم تم کو حدود عرب سے باہر ملک شام میں تمہاری، ان زمینوں سے زیادہ زرخیز زمینیں اور ان زمینوں سے زیادہ وسیع زمین دیتے ہیں، اور تم کو کسی مالی و جسمانی محنت و نقصان میں مبتلا نہیں کرنا چاہتے، ملک عرب اب صرف مسلمانوں کے لئے رہے گا، غیر مسلم ہونے کی حالت میں تمہارا یہاں قیام ممکن نہیں (تاریخ اسلام نجیب آبادی ا/۳۱۷)۔

اسی طرح جتنے بھی لوگ اسیری کی حالت میں آ کر مسلمان ہوئے، یا مسلمان ہو کر دارالخلافہ حاضر ہوئے ہیں اگر ان کا رہنا منظور کر لیا گیا تو ان کے ساتھ امتیازی سلوک نہیں کیا گیا، ہرمزان ایران کا نامی گرامی سردار ہے جنگ قادسیہ سے فرار ہو کر اہواز میں مقیم ہوا، پھر پکڑا گیا، مدینہ حاضر کیا گیا، بعد میں اسلام لے آیا، حضرت عمر فاروقؓ نے مدینہ میں رہنے کی جگہ دی، دو ہزار سالانہ تنخواہ مقرر کر دی، مہم فارس میں اکثر ان سے مشورہ لیتے رہے (تاریخ اسلام نجیب آبادی ا/۳۵۶)۔

اس لئے نئے بسنے والوں کے ساتھ دوہری پالیسی رکھنا اسلامی ملک کی اقلیت کے لئے سم قاتل ہے، قلب و نگاہ میں نفرت و عداوت کی چنگاری چھپی رہتی ہے جو کبھی کبھار شعلہ بن کر خرمن اسلام کے بعض حصہ کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے، اس لے کسی طرح زیبا نہیں کہ اپنے یہاں موجود مسلمانوں کو پرانے مسلمانوں کے ساتھ شریک و سہیم نہ کر کے حکومت اسلامیہ کی بنیاد کھوکھلی کی جائے۔

لیکن بعض ایسی روایت بھی ملتی ہے جس کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ملک میں بسنے والوں کے مابین کسی جائز بنیاد پر تفریق بھی ہوسکتی ہے، ہر چند کہ اس جیسی تفریق و تقسیم سے غیر معمولی کمزوری بھی آ جائے گی، جس سے امت کا بھاری نقصان متوقع ہے۔

مشہور روایت ہے: حضور ﷺ نے مختلف مواقع پر انصار کے ساتھ خصوصی لطف و انعام کا معاملہ کرنا چاہا، لیکن انصار نے یہ کہتے ہوئے انکار کر دیا کہ جب تک ہمارے مہاجرین بھائیوں کو برابر کا شریک نہیں کیا جائے گا اس وقت تک ہم خصوصی امتیاز کو حاصل نہیں کر سکتے۔

بعض اوقات حضور ﷺ نے کچھ نئے لوگوں کے ساتھ داد و دہش کا معاملہ کیا تو اس پر بھی بعض انصار کو شبہ ہوا جس کا

ازالہ کرتے ہوئے وہی جملہ فرمایا کہ جو انصار کے انکار کے وقت کہا تھا "**فاصبروا حتى تلقوني فإنه ستصيبكم أثرة بعدي**" (بخاری ۱/۵۳۵، کتاب المناقب، باب قول النبی الانصار اصبروا الخ)۔

(تم لوگ صبر کرو یہاں تک کہ حوض پر ملاقات ہوگی، اس لئے کہ میرے بعد تمہارے اوپر ترجیحی معاملہ ہوگا) نسائی شریف کی ایک روایت میں اس ترجیح پر بیعت لینے کا ذکر بھی ہے (نسائی ۲/۱۶۱، باب البیعۃ، باب البیعۃ علی الأثرۃ)۔

شارحین کے بیان کے مطابق یہ ترجیحی معاملہ امور دنیا سے متعلق ہے، اور تقسیم مناصب میں رونما بھی ہوا، بعض انصار نے حضرت معاویہ سے اس کی شکایت بھی کی تو حضرت معاویہ نے فرمایا: تم کو ایسے موقع پر حضور ﷺ نے کیا حکم دیا تھا، تو انصاری نے جواب دیا: صبر کرنے کی تلقین کی تھی، حضرت امیر معاویہؓ نے فرمایا: پھر صبر کرو (حاشیہ بخاری ۱/۵۳۵ کتاب المناقب، مناقب الانصار)۔

اس سے اتنی بات اور معلوم ہو رہی ہے کہ اگر ایک ملک میں رہنے والوں کے مابین ترجیحی سلوک بھی اور جن پر ترجیح دی جا رہی ہے ان کو منظور بھی ہو تو حد جواز میں آ سکتا ہے، لیکن یہ ایسی چیز ہے جو ملت کے مفاد کے خلاف ہے، اور وحدت قوم کو پارہ پارہ کر سکتی ہے، اس لئے حوصلہ افزائی تو نہیں کی جا سکتی، لیکن ملکی مصالح یا خارجہ پالیسی کے تحت ایسا ہو تو حد گنجائش میں آ سکتا ہے۔

۴- شہریت کے حقوق:

ملک فرد کا نام نہیں، افراد و اشخاص کی مختلف اصناف کے مجموعہ کا نام ہے، افرادی قوت سے ملکی قوت استوار رہتی ہے، جب تک ایک ملک کا ہر باشندہ ملک کی تعمیر و ترقی کے لئے کوشاں وفکر مند نہیں ہوگا ملک صحیح راہ پر گامزن نہیں رہ سکتا، حکام وعوام کی تقسیم محض سہولت کے لئے ہے، سب کی حاجت ملک سے وابستہ ہے اور سب سے ملک کا مفاد متعلق ہے، جو معیشت کی خوشحالی، وقار کی مضبوطی اور ٹھوس و با اثر کردار کے بغیر روبعمل نہیں ہو سکتا ہے، باہر کی طاقت سے مقابلہ وزور آزمائی، اندرونی وسائل وذرائع کی تقویت کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے ملکی ترقی کے لئے ہر کوشش کا مستحق ملک میں بسنے والا ہر شہری ہے۔

ہماری اسلامی تاریخ کا روشن باب ہے کہ ہر ایک کے حقوق کی خاطر خواہ رعایت کی جائے، دور اول کے خلفاء نے جو تاریخی کردار ادا کیا ہے دنیا اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی، حضرت فاروق اعظم کا دور ہی کو لے لیا جائے، تو رفاہ عام کے لئے خلیفہ وقت کی تگ ودو دیکھ کر انسان حیران رہ جائے گا، ایک طرف بیت المال کا قیام، تا کہ ہر شہری کو روزینہ جاری کیا جا سکے، ممالک مفتوحہ کو آٹھ حصے میں تقسیم، تا کہ انتظام انصرام میں مضبوطی آئے، جگہ جگہ سرائے اور مہمان خانوں کی تعمیر، تا کہ آنے جانے والوں کو سہولت ہو، دیوانی وفوجی نظام کی بنیاد تا کہ ہر مسلم کو فوجی بنا کر لشکر اسلام میں شریک کیا جا سکے، ایسے بامقصد اور بافیض خدمات ہیں جو ساری دنیا کے لئے مشعل راہ ہیں۔

اس سے بخوبی نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ملک کی ترقی کی ہر کوشش میں شرکت ایک عام شہری کا حق ہے جو اپنے حدود و قیود کے ساتھ نافذ العمل ہوگی۔

ووٹ دینے کا حق:

اگر ملک جمہوری بنیاد پر قائم ہے، عوامی گنتی کو اہمیت حاصل ہے تو ایسے ملک ملک میں ہر بالغ شہری کو ووٹ دینے کا حق ہوگا، ووٹ عوامی نمائندگی کا بہترین ذریعہ ہے، سارے لوگ دار الخلافۃ تک نہیں پہنچ سکتے، اور سارے لوگوں کی فوج ظفر موج کارحکومت کو مختل بھی کرسکتی ہے، اس لئے ایسے مسلم جمہوری ملک میں ووٹ کی بنیاد پر انتخاب ہوتا ہے، اس لئے ہر شہری کو حق حاصل ہوگا کہ اس حق کو استعمال کرے۔

ابن خلدون حضرت عمرؓ کے دور خلافت میں عمال کی تقرری کے طریقہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: دو طریقے تھے: دوسرا طریقہ صوبے یا ضلع کے باشندوں کو انتخاب کا حکم بھیج دیتے تھے جن کو وہ لوگ منتخب کرتے اس کو انتظامی ملکی خدمت سپرد کردی جاتی (تاریخ ابن خلدون مترجم ۱/۳۸۷، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی پاکستان)۔

لیکن سلطنت وحکومت کی بنیاد اگر عوامی رائے پر نہ ہو، بلکہ خواص اور ارباب حل وعقد کے مشورے سے اسمبلی و پارلیمنٹ کا قیام ہو جو شخصی حکومت یا بادشاہت کی روح ہے تو ظاہر ہے ہر شہری اس کا مجاز نہیں ہوگا کہ وہ ووٹ دے کر حکمراں کا انتخاب کرے، بلکہ ارباب حل وعقد ہی اس عہدہ جلیلہ کو برپا کرسکتے ہیں، تاتارخانیہ کی عبارت ہے:

"فی الخانیة: قال علماؤنا یصیر المرء سلطانا بأمرین: بالمبایعة معه ویعتبر بالمبایعة معه مبایعة أشرافهم وأعیانهم" (تاتارخانیہ ۷/۵۵، کتاب الامارۃ والسلطنۃ، الفصل العاشر ۱۹۹۴۰)۔

(خانیہ میں ہے: علمائے حنفیہ نے فرمایا: انسان بادشاہ دو طرح ہوتا ہے: اس کے ساتھ بیعت کے ذریعہ، بیعت وہ معتبر ہے جو اشراف اور خاصان قوم کی بیعت ہو)۔

سرکاری اداروں سے انتفاع کا حق:

اسی طرح حکومت کا ہر سرکاری ادارہ خواہ تعلیم گاہ ہو، رفاہ عام کے لئے اسپتال ہو، باہمی نزاعات حل کرنے کے لئے عدالت ہو سب کا مقصد ہی عوام کو سہولت بہم کرنا ہے، بغیر ان اداروں سے انتفاع کا حق دئے ہوئے مقصد میں کامیابی نہیں ہوسکتی ہے، خلفائے راشدین کے دور میں بھی فوجی نظام قائم ہو چکا تھا، ڈاک خانے اور تعلیمی ادارے کھل چکے تھے، سیاسی دفاتر کا وجود ہو چکا تھا، دور حاضر میں رائج اکثر طریق حکمرانی کا وجود شرعی قواعد وضوابط کی بنیاد پر ہو چکا تھا، اگر شرعی قانون کے مطابق ان اداروں میں کوئی فساد نہیں ہے تو یقیناً ان سے انتفاع کا حق حسب صلاحیت ہر شہری کو ہوگا۔

اسی طرح ان اداروں کے چلانے کے لئے رجال کار کی ضرورت ہے جو اپنی قابلیت وصلاحیت سے عوام تک ان مقاصد کو پہنچانے میں نمایاں رول ادا کر سکتے ہیں، جن کے لئے ان کو بنایا گیا ہے، تو کیونکہ یہ حق باشندگان وطن کو نہ دیا جائے، حضرت ابوبکر وعمرؓ کے دور خلافت میں معیار افضلیت واہلیت تھی، لیکن کوشش یہ بھی ہوتی کہ ایسے باکمال اور دردمند افراد حکومت کی باگ ڈور سنبھالیں جو اس جگہ سے کسی نہ کسی بنا پر تعلق خاطر رکھتے ہوں، یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر نے بصرہ کا حاکم عتبہ بن غزوان کو مقرر کیا، کیونکہ انہوں نے بصرہ کو آباد کیا، کوفہ کا گورنر حضرت سعد بن ابی وقاص کو بنایا جو کوفہ کے مؤسس تھے، جزیرہ کا حاکم عیاض بن غنم کو بنایا کہ وہ فاتح ایران ہیں، مکہ کا گورنر خالد بن العاص کو منتخب کیا وہ ابوجہل کے بھتیجے ہیں اور معزز شخص ہیں، غالبًا یہ اس لئے ہوا کہ جتنی ہمدردی ملک سے ان حضرات کو ہوگی دوسروں کو نہیں ہوگی، آج اہل وطن کو جو دردمندی اپنے ملک سے ہوگی بشرطیکہ اس عہدہ کی قابلیت واہلیت بھی وہ شخص رکھتا ہو، دوسرے کو نہیں ہوسکتی، اس لئے یہ شہری کا حق سمجھا جائے گا۔

اسی طرح اسلام حریت کا پاسبان ہے، غلامیت حقیقت میں اس کی روح کے خلاف ہے، زنجیری اسیری کو کاٹنے میں اسلام نے کیا کیا رول ادا کیا ہے یہ مستقل عنوان ہے، آزادی وحریت کا نتیجہ ہے کہ اسلام کی کوئی سرحد نہیں، بعض مصالح اور سیاسی اغراض کے لحاظ سے سرحد کا تصور بھی پایا جاتا ہے، اس لئے روح اسلام کا تقاضا ہے کہ نقل وحرکت کی اصلا آزادی ہو، کسی خاص قوم یا فرد پر کسی خاص مصلحت سے حکومت کو حبس کا حق بھی ہے، لیکن یہ عارضی اور خارجی اسباب وعوامل کی بنا پر ہے۔

۵- پناہ گزینوں کے حقوق:

اب رہ گیا مسئلہ پناہ گزینوں کے حقوق کا، ظاہر ہے پناہ گزین کا قیام عارضی ہوتا ہے، حاجت وضرورت جب تک ہے اس وقت تک وہ کسی ملک میں ہیں بعدہ وہ اپنے ملک منتقل ہوجاتے ہیں، ایسے لوگوں کے لئے بنیادی سہولت، علاج و معالجہ کا سرکاری اداروں میں حق، ایسی ملازمتوں کا حق جن سے ان کے خورد ونوش کا مسئلہ بحال رہے، باہمی نزاع کو ختم کرنے کے لئے عدالتی چارہ جوئی کا حق، یہ وہ بنیادی حقوق ہیں جن پر ان کی حیات کا مدار ہے جو پناہ گزینوں کو بھی حاصل ہوں گے، لیکن ملکی انتظام وانصرام سے متعلق جو حقوق ہیں ان کو دینے کی بظاہر ضرورت متقاضی نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں پورے حجاز کو قحط نے اپنی لپیٹ میں ایک مرتبہ لے لیا تھا، زمین پر رہنے والوں کی بات تو اور ہے، ہوا میں اڑتے پرندے بھی بے خود ہوکر تلملا کر زمین پر گر پڑتے تھے، مدینہ کا گرد ونواح حجاز کا پورا علاقہ اس چپیٹ میں تھا، زندگی کی رونق ختم ہوچکی تھی، بھوک کی وجہ سے لاشوں کا انبار تھا، لوگوں نے اپنے اپنے علاقوں کو چھوڑ کر مدینہ میں پناہ

لیا، فاروق اعظم نے دارالاسلام کے ہر ملک میں گشتی فرمان جاری کیا کہ مدینہ لوگ اپنی اپنی امداد بھیجیں، ہر طرف سے مدد بھی ہوئی، یہ سلسلہ نو مہینے تک جاری رہا، پھر اللہ نے فضل فرمایا، استسقاء کا عمل بھی ہوا، پھر لوگ اپنے گھروں کو لوٹ گئے، اس موقع پر حضرت عمر کی حالت قابل دید تھی، ہر وقت پریشان، ہر قسم کی راحت رسانی، طبی امداد کی فراہمی میں کوشاں تھے (البدایہ والنہایہ ۷/۹۰)۔

اس سے اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ پناہ گزینوں کا قیام عارضی ہوتا ہے، اس لئے بنیادی حقوق ان کو حاصل ہوں گے، البتہ ملکی وانتظامی امور میں مداخلت کا حق ان کو نہیں ہوگا، لہٰذا امیدوار بننے، ووٹ ڈالنے، نیز گورنمنٹ نے جس جگہ پناہ دی ہے وہاں سے بغیر اجازت دوسری جگہ نقل وحرکت کا حق نہیں ہوگا۔

۶-مسلمانوں کے لئے غیر مسلم کی شہریت:

ایک مسلمان اپنے ملک کو کیوں چھوڑتا ہے، پہلے اس پر غور کرنا ہوگا، اس کا پس منظر یا تو سیاسی پناہ کا حصول ہے، اس لئے کہ اپنا ملک خواہ وہ مسلم ملک ہی کیوں نہ ہو تنگ ہو رہا ہے، عزت وآبرو کی حفاظت مشکل ہو جارہی ہے، جان ومال پر ہر وقت خطرہ ہے، ایسے موقع پر وہ کسی دوسرے ملک کو ترجیح دیتا ہے، دوسرا ملک بعض اوقات وہ ہوتا ہے جو غیر مسلم اقتدار کے ماتحت ہوتا ہے، اگر اس کو یقین ہے کہ اس ملک میں جا کر اپنے دین وایمان پر آنچ آنے نہیں دے گا، اور غیر مسلموں کے ساتھ غیر اسلامی امور میں تعاون نہیں کرے گا، تو اپنے نفس ومال، یا عزت وآبرو کی حفاظت کی ضرورت سے غیر مسلم ملک کی شہریت کے لئے تگ ودو کرے، اس کی سب سے بڑی دلیل تحفظ نفس وتحفظ مال کی ضرورت ہے، اسی طرح اس سے بھی استیناس کیا جاسکتا ہے کہ صحابہ نے حبشہ کی ہجرت کی، جبکہ وہاں عیسائی حکومت تھی، ہجرت مدینہ کے بہت بعد تک بعض صحابہ وہیں مقیم رہے، جعفر بن ابی طالب کا قافلہ تو قبیلہ اشعریین کے وفد کو لے کر غزوہ خیبر کے بعد واپس آیا، جس وقت یہ ہجرت ہو رہی تھی ہوسکتا ہے بنیت دوام نہ ہو، لیکن بادشاہ نے جو ہمدردی وبہی خواہی کا رویہ اختیار کیا، نیز صحابہ ضرورت پوری ہونے کے باوجود مقیم رہے یہ تو دلیل بن سکتی ہے، یہ بھی عذر کہنا نامناسب ہوگا کہ بادشاہ تو مسلمان ہو چکا تھا، اس لئے اس کا ایمان مخفی تھا، حتی کہ نماز جنازہ بھی ملک حبشہ میں نہیں ہوسکی۔

مسلمانوں کا رویہ بھی اپنے ملک کی مانند تھا، ایک نازک وقت بادشاہ پر آیا، ایک شخص نے نجاشی کے خلاف فوج کشی کی، اور ملک کا اقتدار چھیننا چاہا تو وہاں مقیم صحابہ نے مشورہ کیا، اگر کوئی دوسرا اقتدار میں آتا ہے تو وہ ہمارے احوال سے واقف نہیں ہوگا، اس لئے ہم لوگوں کو بادشاہ وقت کی مدد کرنی چاہئے، سب نے نجاشی کی فتح ونصرت کے لئے دعائیں کیں، حضرت زبیر بن العوام کو دریا عبور کر کے بادشاہ کی مدد کے لئے بھیجا بالآخر اللہ نے نجاشی کو فتح سے سرفراز کیا (سیرت ابن ہشام

۱/ ۲۶۷، مطبوعہ دارالخیر ۱۴۱۶)۔

کبھی دوسرے کسی غیر مسلم ملک جانے کا محرک غیر مسلموں سے قلبی تعلق اور مسلمانوں سے نفرت ہوتی ہے، ایسے وقت میں کسی بھی غیر مسلم ملک کی بود و باش اختیار کرنا جائز نہیں ہوگا۔

”**يا أيها الذين آمنوا لا تتخذوا اليهود والنصارى أولياء، بعضهم أولياء بعض، ومن يتولهم منكم فإنه منهم**“ (سورۂ مائدہ: ۵۱)۔

ایک محرک یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنے ملک میں معاش کا حال اچھا نہیں ہے، وہ اپنی روزی روٹی چلانے پر قادر نہیں ہے، دوسرا ملک اس قسم کے وسائل و ذرائع سے بھرپور ہے، تو ایسی صورت میں بھی دوسرے ملک کی شہریت حاصل کرنا جائز ہے ”**هو الذى جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا في مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور**“ (سورۂ ملک: ۱۵)۔

اسی طرح ”**ليس عليكم حرج أن تبتغوا فضلا من ربكم**“ (سورۂ بقرہ: ۱۹۸) کا مقتضا ہے کہ جہاں بھی رزق دستیاب ہو وہاں تک پہنچ کر حصول کرے، صورتحال ضرورت کی حد تک پہنچ چکی ہے، ضرورت کی بنا پر تو بعض محظورات بھی روا ہوجاتی ہیں۔

ہاں صرف مالی فراخی کے لئے غیر مسلم ملک کو مسلم ملک پر ترجیح دینا مکروہ ہوگا، ترمذی شریف کی روایت کا محمل یہی ہوگا۔

”**انا برئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا: يا رسول الله! قال: لا ترآى ناراهما**“ (ترمذی ۱/ ۲۸۹ کتاب السیر، باب کراہیۃ المقام بین اظہر المشرکین)۔

(میں ہر ایسے مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکوں کے مابین مقیم ہو، صحابہ نے پوچھا، کیوں؟ اے اللہ کے رسول، حضور نے فرمایا ان دونوں کی آگ ایک دوسرے کو نظر نہیں آنی چاہئے)۔

البتہ امام مالک کے نزدیک کسی بھی دنیوی غرض کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت کیا، سکونت بھی جائز نہیں ہے (مقدمات ابن رشد ۴/ ۴۶۶، مطبوعہ مع المدونہ، مطبوعہ دارالکتب العلمیہ ۱۴۱۵ھ)۔

ملکوں کی صورتحال کے اعتبار سے حکم میں فرق:

اسی طرح ملکوں کی صورتحال کے اعتبار سے بھی حکم میں فرق پڑے گا، پہلی قسم ان غیر مسلم ممالک کی ہے جن کی صورتحال مکی زندگی کے مشابہ ہو، یعنی وہاں دین و ایمان محفوظ نہ رہے، مگر ہجرت پر قدرت بھی ہو، تو ایسے وقت دوسرے ملک جانا، خواہ وہ غیر مسلم ملک ہی کیوں نہ ہو، واجب ہوگا، قرآن کریم نے ان لوگوں کو ڈانٹ پلائی ہے جنہوں نے نے ہجرت کی

قدرت کے باوجود ہجرت نہیں کی، اور قتل ہو گئے۔

"إن الذين توفاهم الملائكة ظالمى أنفسهم، قالوا فيم كنتم، قالوا كنا مستضعفين فى الأرض، قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها، فألئک ماواهم جهنم و ساء ت مصيرا" (سورۂ نساء)۔

البتہ بمصلحت قیام کرے تو حرج نہیں ہوگا، جیسا کہ حضرت عباس نے بمصلحت تاخیر سے ہجرت کی۔

دوسری صورت حال یہ ہے کہ ملک میں امن وامان نہیں، دین وایمان کو ہر لمحہ خطرہ، مگر ہجرت کی قدرت بھی نہیں تو ایسی صورت میں ایسے ہی ملک میں رہنے میں گناہ نہیں ہے، قرآن کریم کی مذکورہ بالا آیت میں استثناء موجود ہے:

"إلا المستضعفين من الرجال والنساء والولدان لا يستطيعون حيلة ولا يهتدون سبيلا وأولئک عسى الله أن يغفر عنهم وكان الله عفوا غفورا" (نساء:۹۸،۹۹)۔

تیسری قسم ان ملکوں کی ہے جو ہیں غیر مسلم ملک، مگر کسی مسلمان کا وہاں رہنا بحیثیت اقلیت بھی مضر نہیں ہے، بلکہ دین وایمان اور جان ومال ہر ایک کو تحفظ حاصل ہے، جیسا کہ آج غیر مسلم ملکوں کی صورتحال ہے، اسلامی ملکوں کے مقابلہ میں ان ممالک میں زیادہ مواقع ہیں کہ مسلمان ترقی کرے۔

ایسے ملکوں میں رہنے کے سلسلے میں دو نظریئے ہیں:

حضرت امام مالک کے نزدیک ایسے ملکوں میں رہنا جائز نہیں، خواہ دین پر عمل کرنا کتنا ہی آسان کیوں نہ ہو، یہ تو غیر اسلامی قانون کو اپنے اوپر تھوپ لینا ہے۔

جبکہ دوسری رائے جمہور کی ہے، بالخصوص حنابلہ وحنفیہ کی کہ ایسے ملکوں میں رہنا جائز ہے، اختلاف کا منشا حدیثوں میں اختلاف ہے، بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا حکم منسوخ ہوگیا "لا هجرة بعد الفتح" (بخاری ۱/۴۲۳ کتاب الجہاد باب لا ہجرۃ بعد الفتح)۔

اور بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ہجرت کا سلسلہ جاری ہے: "لا تنقطع الهجرة حتى تنقطع التوبة ولا تنقطع التوبة حتى تطلع الشمس من مغربها" (ابوداؤد ۱/۳۳۶ کتاب الجہاد، باب الہجرۃ ہل انقطعت)۔

(جب تک توبہ باقی ہے ہجرت کا حکم باقی ہے، اور توبہ سورج کے مغرب سے طلوع ہونے تک باقی رہے گی)۔

جمہور فرماتے ہیں: حضور نے جن حدیثوں میں انقطاع ہجرت کی خبر دی ہے وہ معلل بعلت ہے، وہ انہی معاملات میں رکاوٹ کا باقی نہ رہنا ہے، جس طرح یہ حکم مکہ کے لئے ہے اسی طرح ہر ایسے خطے کے لئے جہاں رکاوٹ نہ ہو (فتح

الباری ۶/ ۲۳۳)۔

یا پھر ابتداء میں ہجرت اس لئے ضروری تھی کہ مسلمانوں کی جمعیت یکجا ہو کر دار الخلافہ کو مستحکم کرسکیں لیکن اب استحکام کی حاجت نہیں ہے، اس لئے ایسے ممالک میں رہنے کی گنجائش ہے۔

البتہ دوسری قسم کی حدیثیں ایسی حالت پر محمول ہیں کہ جب دین وایمان محفوظ نہ ہو، یا ایسے ملکوں پر محمول ہیں جو قبل الفتح مکہ کے نقش قدم پر ہوں۔

جبکہ امام مالکؒ دوسری قسم کی احادیث سے استدلال کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ ہر وہ ملک جو غیر مسلم اقتدار کے ماتحت ہے وہاں رہنا یا وہاں کی شہریت حاصل کرنا جائز نہیں، بلکہ وہاں سے بھاگنا ضروری ہے، نیز ترمذی کی روایت جو سابق میں گذر چکی ہے، رسول اللہ ﷺ نے مسلموں کے ساتھ رہنے والے سے بیزاری کا اظہار فرمایا۔

''بیہقی'' کی روایت میں صاف طور پر منع کیا گیا ہے:''**لا تساكنوا المشركين ولا تجامعوهم، فمن ساكنهم أو جامعهم فهو مثلهم**''(بیہقی ۹/ ۱۸، کتاب السیر، باب الرخصۃ فی الاقامۃ بدار المشرک)۔

(مشرکوں کے ساتھ نہ رہو، اور نہ ان کے ساتھ اکھٹے ہو، جو ان کے ساتھ رہے گا یا اکٹھا ہوگا وہ انہی کی طرح ہے)۔

ترمذی کی روایت اور بیہقی کی روایت دونوں ہی متکلم فیہ ہیں، اگر اس سے اغماض بھی کیا جائے تو یہ جمہور کے نزدیک انہی ممالک پر محمول ہیں جہاں فتنہ کا خوف ہو۔

امام مالکؒ کی عقلی دلیل کے غیر اسلامی قانون کو اپنے اوپر تھونپ لینا ہے، اس کی معنویت اس دور میں ختم ہوگئی ہے، غیر مسلم ملکوں میں دین وشریعت پر عمل کرنے والے جس قدر آزاد ہیں، خدا معاف کرے اسلامی ملکوں میں بسنے والے اسی قدر گھٹن محسوس کرتے ہیں، غیر مسلم ملکوں میں آج کوئی رکاوٹ نہیں ہے، آج ان ممالک کی مثال حبشہ جیسی ہے، جس طرح حبشہ کی سکونت میں کوئی حرج نہیں سمجھا گیا تھا، اسی طرح ان ملکوں میں سکونت بھی جائز ہونی چاہئے۔

۷۔مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کی مستقل سکونت:

خطہ عرب یا مخصوص خطہ حجاز میں غیر مسلموں کے لئے سکونت حدیث کی رو سے ممنوع ہے، اس کے ماسوا دیگر مسلم حصوں میں غیر مسلم کو ذمی بنا کر رہنے دینے کا سلسلہ قرن اول سے معہود ومعروف ہے۔

حضرت عمرؓ نے اپنے بعد کے خلیفہ کے لئے جو بڑی قیمتی وصیت کی ہے، محدثین نے اس کا تھوڑا تھوڑا حصہ کر کے مختلف ابواب میں زیب قرطاس کیا ہے، بخاری کی روایت ہے:

”عن عمرو بن میمون قال: وأوصیه بذمة الله وذمة رسوله أن یؤتی لهم بعهدهم، وأن یقاتل من ورائهم ولا یکلفوا إلا طاقتهم“ (بخاری ۱/۴۲۹، کتاب الجہاد، باب یقاتل عن أہل الذمۃ)۔

(عمرو بن میمون فرماتے ہیں: میں اپنے بعد والے خلیفہ کو اللہ ورسول کے ذمہ کی وصیت کرتا ہوں کہ ان کے عہد (حفظ وامان) کو پورا کیا جائے، ان کی طرف سے قتال کیا جائے، نیز طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے)۔

ہر قتال کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جنگی مہمات کے اہم مقاصد اور اس کے نشیب وفراز امیر الجیش کو ذہن نشین کرایا کرتے تھے، ان میں ایک بنیادی بات یہ ہوا کرتی کہ اگر کوئی جزیہ ادا کرنا منظور کرلے تو ان سے قتال ختم، اب مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ان کی پوری حفاظت کرے۔

”عن بریدة: فإن هم أبوا فسلهم الجزیة، فإن أجابوک فاقبل منهم، وکف عنهم“ (مسلم ۲/۸۱۲ کتاب الجہاد والسیر، باب تامیر الامام الأمراء)۔

(حضرت بریدہ فرماتے ہیں (حضور ﷺ نے امیر سریہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا) اگر وہ لوگ (اسلام لانے سے انکار کریں) تو ان سے جزیہ کا مطالبہ کرو، اگر وہ قبول کرلیں تو ان سے قبول کرو اور لڑائی روک لو)۔

اس لئے اگر غیر مسلم، کسی بھی مسلم ملک میں دو شرطوں کو پوری کرتے رہیں تو اس کی مستقل سکونت بھی صحیح ہوگی، ان دو شرطوں کو بیان کرتے ہوئے ابن قدامہ لکھتے ہیں:

”لا یجوز عقد الذمة المؤبدة إلا بشرطین: أحدهما: أن یلتزموا إعطاء الجزیة في کل حول، والثاني: التزام أحکام الإسلام وهو قبول ما یحکم به علیهم من أداء حق أو ترک محرم لقول الله تعالی: ”حتی یعطوا الجزیة عن یدوهم صاغرون“، وقول النبي ﷺ في حدیث بریدة: فادعهم إلی أداء الجزیة، فإن أجابوک فاقبل منهم وکف عنهم“ (مغنی ابن قدامہ ۱۰/۵۶۳، مسئلہ ۷۶۴۱، فصل فی الہجرۃ)۔

(دائمی عقد ذمہ دو شرطوں سے جائز ہے (۱) ہر سال جزیہ دینا لازم کرلے (۲) احکام اسلام کا التزام اور وہ ان احکام کو قبول کرنا ہے جن کا فیصلہ ان کے اوپر کیا جائے، یعنی ادائے حق، اور حرام کا ترک، اللہ تعالی کے ارشاد ”حتی یعطوا الجزیة الخ“ کی وجہ کر، اور حضور ﷺ کا بریدہ کو ارشاد ہے ان کو ادائے جزیہ کی دعوت دو، اگر قبول کرلیں، تو ان سے قبول کرلو اور آپ اپنے ہاتھ ان سے روک لو)۔

شیخ فریدالدین عالم رقم طراز ہیں:

”ترک الکافر في دار الاسلام بالجزیة جائز“ (تاتارخانیہ ۷/۲۵۶، کتاب الخراج، بیان النوع الثانی وہو خراج

الرووس والجزیہ/ ۲ ۳ ۴ ۴ ۱۰)۔

(کافر کو دارالاسلام میں جزیہ کے عوض چھوڑے رکھنا جائز ہے)۔

لہذا اس طرح سے غیر مسلموں کو مسلم ملکوں میں دائمی سکونت دینا کہ وہ احکام اسلام کے ماتحت رہیں مسلمانوں کی اذیت اوران پر برتری کا کوئی عمل ان سے سرزد نہ ہو، تو مستقل اقامت دینے میں حرج نہیں ہوگا۔

☆☆☆

اسلام کے عطا کردہ شہری و دیگر حقوق

مولانا عبید اللہ ندوی☆

اسلام افراد، جماعتوں اور حکومتوں کے درمیان امن و سلامتی کے تعلقات استوار رکھتا ہے اور تعلقات کی اس استواری میں مسلمانوں کے باہمی تعلقات، نیز غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات میں مساوات و برابری قائم رکھتا ہے، چنانچہ اسلامی قانون کی کتابوں میں ذمیوں یا اسلامی سلطنت میں رہنے والے غیر مسلموں کے حقوق و فرائض کے لئے یہ تعبیر ضرب المثل کی حیثیت اختیار کرگئی ہے: ''**لھم ما لنا و علیھم ما علینا**'' (مشکوۃ ۲۴۱/۳ بمعناہ) (ان کے لئے وہی حقوق ہیں جو ہمارے لئے ہیں اور ان پر وہی ذمہ داریاں ہیں جو ہم مسلمانوں پر ہیں)۔

حضرت علیؓ کا ارشاد ہے: ''ان غیر مسلموں نے اسلامی سلطنت کے ساتھ معاہدہ اس لئے کیا ہے کہ ان کا مال ہمارے مال کی طرح اور ان کا خون ہمارے خون کی طرح ہوجائے'' (بدائع الصنائع ۱۱۱/۷ بحوالہ اسلام اور عصر حاضر)۔

مشہور فقیہ امام سرخسی فرماتے ہیں: ''ان غیر مسلموں نے عقد ذمہ اسی لئے قبول کیا ہے کہ ان کے اقوال اور ان کے حقوق مسلمانوں کے اقوال اور حقوق کے برابر ہوجائیں'' (شرح السیر الکبیر ۲۵۰/۳ بحوالہ سابق)۔

جہاں تک ذمیوں کے شہری حقوق کا تعلق ہے تو اس کی وضاحت خود حضور ﷺ نے اپنے ارشادات کے ذریعہ کردی ہے، نجران کے نصاری کے بارے میں آپ ﷺ نے ہدایت فرمائی تھی کہ: ان میں کا کوئی شخص دوسرے کے ظلم میں ماخوذ نہیں ہوگا (الطبقات الکبری لابن سعد ۲۸۷/۱ مطولا)، نیز آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: جو کوئی کسی ذمی کو تکلیف دے گا میں قیامت کے دن ان کے خلاف لڑوں گا (ابوداؤد: رقم: ۳۰۴۵)۔

چنانچہ آپ ﷺ کے خلفاءؓ نے اس کی بھرپور رعایت کی اور اپنے بعد آنے والوں کو اس کی وصیت کرتے رہے کہ ذمیوں اور غیر مسلموں کے حقوق کی دیکھ بھال کی جائے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے انسانوں کو جو حقوق دیئے ہیں اور ان میں جو مساوات قائم کی ہے اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔

☆ استاذ حدیث و ادب، دارالعلوم ماٹلی والا بھروچ گجرات۔

اسلام میں فرد کی عزت اور حقوق کا اعتراف:

اسلام نے لوگوں کے درمیان امن وسلامتی کے تعلقات قائم کرنے اور اس کے اصول کی تشہیر کرنے کے بعد انسان کی، انسان ہونے کی وجہ سے تکریم فرمائی ہے، قطع نظر اس سے کہ اس کی جنسیت، وطنیت، قومیت، دین ومذہب، زبان اور رنگ ونسل کیا ہے، چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے: ''**ولقد كرمنا بنی آدم وحملناهم في البر والبحر ورزقناهم من الطيبات وفضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا**'' (سورۂ اسراء: ۷۰)۔

اسی تکریم کا مظہر ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنے دست مبارک سے پیدا فرمایا، اس میں روح ڈالی، ملائکہ کو سجدہ کا حکم دیا، اور کائنات کی تمام اشیاء اس کے لئے مسخر کردیں، اس کو کرہ ارض کا مالک وسردار بنایا اور اپنا خلیفہ ونائب منتخب فرمایا، تاکہ اس کائنات کی اصلاح وتعمیر ہوتی رہے، اور اس وجہ سے کہ یہ تکریم واقعی اور حقیقی بن جائے اسلام نے تمام انسانوں کے حقوق کی ضمانت لی ہے، اور اس کی صیانت وحفاظت اور رعایت وحمایت کو واجب قرار دیا، خواہ وہ حقوق دینی ہوں یا دنیاوی، شہری ہوں یا تمدنی یا سیاسی، چنانچہ انہیں حقوق میں سے یہ ہیں:

۱-حق حیات، ۲-حق حفاظت مال، ۳-حق عرض (آبرو)، ۴-حق حریت، ۵-حق اظہار رائے، ۶-حق مأوی (یعنی جائے پناہ اختیار کرنے کا حق)، ۷-حق تعلیم، ۸-ظلم کے خلاف احتجاج ومزاحمت کا حق، ۹-حصول انصاف کے لئے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹانے کا حق، ۱۰-عدالتی امور میں مساوات، برابری اور یکسانیت کا حق، ۱۱-اجتماع کا حق، ۱۲-لاچاروں، حاجتمندوں کا سرکاری خزانہ سے امداد پانے کا حق، ۱۳-حکام پر نکتہ چینی اور ان کے محاسبہ کا حق، ۱۴-ضمیر واعتقاد اور مذہب اختیار کرنے کی آزادی وحق، ۱۵-عورتوں کے خصوصی حقوق اور تحفظات، ۱۶-شوی کی کاروائیوں میں حصہ لینے کا حق وغیرہ (قاموس الفقہ ۱/ ۶۷ ۴، مبادی سیاسیات ص ۳۵۶)۔

یہ وہ انسانی اور مدنی حقوق ہیں جو نصوص شرعیہ سے صراحۃ ثابت ہیں (قاموس الفقہ ۱/ ۹۷ ۴)، اور عملاً اسلام زمانہ حکمرانی میں تمام شہریوں کو حاصل تھے، حقیقت یہ ہے کہ آج کی ترقی یافتہ سائنٹفک اور عملی دنیا بھی انسانی حقوق کے تحفظ اور اس کے اکرام واحترام میں اسلام سے بہت پیچھے ہے اور وہ اپنے بلند بانگ دعووں کے باوجود انسانوں کی ہلاکت وبربادی اور ایذارسانی اور انسانی واخلاقی قدروں کی پامالی کے سوا کچھ نہیں کررہی ہے۔

خلاصہ بحث:

اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا کرنے کے لئے کئی باتوں کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے، منجملہ ان کے یہ ہیں:

الف-ایک مخصوص مدت تک وہاں قیام کو، دلیل اس کی یہ ہے کہ تقریبا تمام فقہاء نے یہ لکھا ہے کہ اگر دار الکفر کا

کوئی باشندہ امان لے کر اسلامی مملکت میں داخل ہوتو ایسے آدمی کو امیر المسلمین اپنی صوابدید پر زیادہ سے زیادہ ایک سال تک یہاں قیام کی اجازت دے سکتا ہے، اس لئے کہ اس سے زیادہ مدت تک کسی غیر ملکی شہری کے رہنے کی وجہ سے اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ وہ جاسوسی اور سازشیں کرنے لگے، چنانچہ اگر اس کے بعد ایک سال تک وہ یہاں رہ جائے تو وہ اس ملک کا شہری ہوگا (ہدایہ ۲/ ۵۸۶)۔

ب- نیز تمام محدثین نے اصول حدیث کی کتابوں میں یہ سوال اٹھایا ہے: ''**کم المدة التي إن أقامها الشخص في بلد نسب إليها**'' (تیسیر مصطلح الحدیث، باب معرفۃ أوطان الرواۃ وبلدانہم)۔

(وہ مدت کتنی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی ملک یا شہر میں اتنی مدت قیام کرلے تو اس کی طرف منسوب ہوگا؟ محدثین نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں: چار سال کی مدت (تیسیر مصطلح الحدیث رص ۲۳۳)، اور بعض دیگر محدثین اس سے کم مدت بیان کرتے ہیں (الباعث الحثیث، باب معرفۃ أوطان الرواۃ وبلدانہم)۔

محدثین کے مابین مدت اقامت میں اختلاف ضرور ہے، لیکن اس سے اتنی بات تو ثابت ہوگئی کہ قیام ہی کو حق شہریت کی بنیاد بنایا جائے گا، رہا سوال یہ کہ وہ مدت کتنی ہوگی؟ تو اس کو ملکی قانون یا حاکم پر چھوڑ دیا جائے گا وہ اپنی صوابدید سے اس کی تعیین کر سکتے ہیں۔

۲- خونی رشتہ کو بھی بنیاد بنا سکتے ہیں، یعنی کسی ملک کی شہریت رکھنے والے ماں باپ سے پیدا شدہ بچہ اپنے والدین کے ملک کا شہری تصور کیا جائے گا۔

۳- جائے ولادت، یعنی جو شخص جس ملک کی سرزمین پر پیدا ہوا ہو، وہ وہاں کا شہری مانا جائے گا۔

فی زماننا انہیں دونوں اصولوں پر عمل کیا جارہا ہے، چنانچہ ہندوستان، برطانیہ، ولایات متحدہ امریکہ وغیرہ میں شہریت کا یہی اصول چلتا ہے (مبادی سیاسیات رص ۷۰)۔

۴- کوئی بھی ملک کسی بھی غیر ملکی کو شہریت دینے کے لئے سوال میں مذکور کسی بھی چیز کو بطور اصول مقرر کر سکتا ہے بشرطیکہ وہ اصول وضابطہ خلاف شرع نہ ہو، اسلام کے متعین کردہ اصول سے ٹکراتا نہ ہو، نیز کسی حرام کام کے ارتکاب پر مبنی نہ ہو۔

۲- اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں رہنے والا انسان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو باستثناء مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ اس دوسرے ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا شرعا ضروری ہوگا کیونکہ:

الف-سکونت اور انتقال وطن ایک انسان کے انسانی و مدنی حقوق میں سے ہیں جونصوص سے صراحتا ثابت ہیں(تفسیر سورہ بقرہ:۸۵)۔

ب-اگر وہ مسلمان کسی غیر مسلم ملک کا باشندہ ہےتو اس کی درخواست قبول کرنا اس لئے بھی ضروری ہوگا، کیونکہ اس سے مسلمانوں کی اجتماعیت، وحدت، کثرت اور قوت میں اضافہ ہوگا، جو اسلام میں مطلوب ہے، اس کی پوری تفصیل اصل مقالہ میں کی جاچکی ہے۔

ج-ایک مسلمان کا بلا وجہ شرعی کسی غیر مسلم ملک میں رہنا بہرحال بہتر اور پسندیدہ نہیں ہے، اگرچہ دین اور دینی شعائر پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، کیونکہ غیر مسلموں کے درمیان رہ کر ان کے اثرات قبول کرنے کا اندیشہ ہے، نیز اس سے دینی حمیت کمزور ہوجاتی ہے۔

د-نیز حضور ﷺ کا فرمان ہے:"أنا بري من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين"(ابوداؤد کتاب الجہاد:۲۶۴۵)(میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان سکونت اختیار کرے)۔

(نوٹ) مکہ اور مدینہ کا استثناء اس لئے ہے کہ وہاں شہریت دیئے جانے سے تعداد میں کافی اضافہ ہوگا جس کی وجہ سے حج وعمرہ کی ادائیگی میں دشواری ہوگی۔

۳-**الف:** اگر وہ پناہ گزین خود اس ملک کی شہریت نہیں چاہتے ہیں، بلکہ ان کی نیت یہ ہے کہ ہمارے ملک کے حالات درست ہونے کے بعد ہم اپنے ملک واپس چلے جائیں گے تب تو ان کو پناہ گزین کا درجہ دینے اور اپنے ملک کا شہری تسلیم نہ کرنے میں شرعا کوئی قباحت نہیں ہونی چاہئے، البتہ پناہ گزین ہونے کے باوجود بھی ان کو وہ تمام حقوق ملیں گے جو انسانی اور مدنی حقوق کہلاتے ہیں جس کی تفصیل اصل مقالہ میں آچکی ہے۔

لیکن اگر وہ اس ملک کی شہریت چاہتے ہیں تو پھر ان کو شہری تسلیم نہ کرنا، بلکہ پناہ گزین کا درجہ دیا ان شرعا درست نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

"**مالكم لا تقاتلون فى سبيل الله والمستضعفين من الرجال والنساء والولدان الذين يقولون ربنا أخرجنا من هذه القرية الظالم أهلها واجعل لنامن لدنک ولیا، واجعل لنا من لدنک نصیرا**"(سورۂ نساء:۷۵)۔

اس آیت کریمہ میں ان کمزور ولاچار مسلمانوں کا تذکرہ ہے جو مکہ مکرمہ میں اسلام لائے جیسے ابن عباسؓ، ان کی والدہ مسلمہ بن ہشام، ولید بن ولید، اور ابوجندل بن سہیلؓ وغیرہ، لیکن اپنے ضعف جسمانی اور کم سامانی کی وجہ سے ہجرت پر

قادر نہیں تھے اور قریش بھی انہیں طرح طرح کی اذیتیں دیتے تھے، یہاں تک کہ ان مظلوموں نے اللہ سے خلاصی کی دعائیں کیں، تاکہ ان کو ظالموں کی تکالیف سے نجات ملے اور دین وعقیدہ کی آزادی حاصل ہو، آیات کا شان نزول اگرچہ مسلمانان مکہ سے متعلق ہے، لیکن بقاعدہ "**العبرة بعموم اللفظ لا بخصوص المعنی**" (اعتبار الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے نہ کہ مخصوص معانی کا) کے تحت رہتی دنیا تک کے تمام مسلمان اس میں داخل ہیں، لہذا ایسے تمام مسلمانوں کی حفاظت وصیانت اور مظلوموں کی فریادرسی تمام مسلمانان عالم کا اہم شرعی واخلاقی فریضہ ہے، آیت میں صاف لفظوں میں حکم قتال دینے کے بجائے یہ انداز بیان اختیار کیا گیا "**مالکم لا تقاتلون**" جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان حالات میں قتال وجہاد ایک طبعی اور فطری فریضہ جس کا نہ کرنا کسی بھلے آدمی سے بہت بعید ہے (معارف القرآن ۲/۶۷۴،۴۷۷)، خلاصہ یہ کہ اگر مسلم ممالک ان مظلوموں کی حفاظت اور مدد کے لئے جہاد وقتال نہیں کر سکتے تو کم از کم ان کو اپنے ملک کا شہری تسلیم کریں انہیں پناہ گزین کا درجہ تو نہ دیں۔

ب- "**والذین هاجروا في الله من بعد ما ظلموا لنبوئنهم في الدنیا حسنة ولأجر الآخرة أکبر لو کانوا یعلمون**" (سورۂ نحل: ۴۱) کی مفسرین نے کئی تفسیریں بیان کی ہیں، میری رائے میں ان مظلوموں کو اپنے ملک کا شہری تسلیم کرنا بھی اس میں داخل ہے، اس سے بڑھ کر اچھا ٹھکانا اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک مسلمان ملک انہیں اپنے ملک کا شہری اور باشندہ تسلیم کرلے، انہیں ترقی کے مواقع فراہم کرے۔

ج- حضور ﷺ نے فرمایا: "**أنصر أخاک ظالما کان أو مظلوما**" (بخاری، کتاب المظالم، رقم: ۲۴۴۳) (اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم) اور مظلوم بھائی کی مدد میں یہ بھی داخل ہے کہ اس کو اپنے ملک میں شہریت دی جائے، کیونکہ وہ بے گھر اور بے وطن ہو چکا ہے اور یہ اس کی بنیادی واولین ضرورت ہے۔

د- حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ لکھتے ہیں: حضور ﷺ کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد مظلوموں کی امداد بھی ہے (حجۃ اللہ البالغۃ ۲/ ۴۶۳، ۴۶۴)، لہذا آپ ﷺ کے بعد یہ کار نبوت امتی کو انجام دینا ہے اس کی شکل کچھ بھی ہو۔

ھ- حضور ﷺ اور آپ کے جاں نثار صحابہؓ جب مکہ مکرمہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو اہل مدینہ نے ہر طرح سے انکا تعاون کیا، تجارت، زراعت، کاروبار، معاش، اچھا ٹھکانا وغیرہ وغیرہ ہیں۔

ب- وہ حقوق جو انسانی اور مدنی ہیں اور نصوص سے ثابت ہیں وہ تو انہیں ہر حال میں ملیں گے، رہی یہ بات کہ ان تارکین وطن کو اس ملک کے قدیم باشندوں کی طرح ایک شہری ہونے کی سہولتیں نہ دی جائیں تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، چنانچہ شریعت میں اس کے کئی نظائر موجود ہیں مثلاً:

۱-”لا یستوی منکم من أنفق من قبل الفتح وقاتل أولئک أعظم درجۃ من الذین أنفقوا من بعد وقاتلوا، وکلاً وعد اللہ الحسنی“(سورۂ حدید:۱۰)،ظاہر سی بات ہے کہ یہ درجات کی بلندی ان کی قربانیوں اور وفاداریوں اور ملک وطن کے لئے کوششوں کی وجہ سے ہی ہے۔

۲-علماء ومحدثین نے صحابہ کرامؓ کے مراتب قائم کئے ہیں،مثلاً سابقین اولین، بدریین،احدیین وغیرہ۔

۳-نیز محدثین نے بعض مواقع پر قدیم الاسلام اور حدیث العہد بالاسلام رواۃ میں فرق کیا ہے جو اس بات کی دلیل ہے کہ صرف سہولیات میں کچھ فرق کیا جاسکتا ہے۔

۴-اسلام نے حقوق کی تین قسمیں کی ہیں:۱-انسانی حقوق،۲-شہری حقوق،۳-سیاسی حقوق،لہذا اسلامی نقطہ نظر سے شادی بیاہ، کام کاج، تجارت، ملازمت، الیکشن میں امیدواری، اورووٹ دینا، سرکاری اداروں میں ملازمت، سرکاری اسکولوں میں تعلیم ،اجتماعی ضمان،نجی ملکیت بنانے،آمدورفت، انسان کی عزت وحرمت خواہ زندہ ہو یا مردہ سرکاری اسپتالوں میں علاج،روزگار،عدالتی چارہ جوئی، انصاف حاصل کرنا،حکومت کی طرف سے جاری کردہ رفاہی اسکیموں سے فائدہ اٹھانا وغیرہ سب حقوق شہریت میں آئیں گے۔

۵-پناہ گزینوں کی دوصورتیں ممکن ہیں:

الف-جس ملک میں انہوں نے پناہ لی ہے اس ملک نے انہیں شہری تسلیم کیا ہے یا نہیں؟اگر انہیں باقاعدہ شہری تسلیم کرلیا گیا ہے تب انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو اس ملک کے دیگر شہریوں کو حاصل ہیں۔

ب-اور اگر انہیں صرف جائے پناہ دی گئی ہے،شہری تسلیم نہیں کیا گیا ہے تو انہیں وہ تمام حقوق جو بنیادی انسانی حقوق ہیں، حاصل ہوں گے،مثلاً تعلیم کا حق،علاج ومعالجہ کا حق،عدالتی چارہ جوئی کا حق،انصاف کا حق،معاشی تگ ودو کا حق وغیرہ،جس کی تفصیل اوپر گذر چکی، البتہ انہیں ووٹ دینے کا حق، الیکشن میں امیدوار بننے کا حق،کسی اہم سرکاری عہدہ اور منصب پر بحیثیت ملازم فائز ہونے کا حق مثلاً جج،ڈی ایم،وغیرہ حاصل نہیں ہوگا،یہ حقوق صرف شہریوں کو حاصل ہوں گے۔

۶- کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک کے ایک باشندے اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقل مسکن بنانا، ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حکم زمانے اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والے کی اغراض ومقاصد کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے،مثلاً:

۱-اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو، یا اس کو جیل میں ظلماً قید کرلیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کے سوا ان مظالم سے بچنے کی اس

کے پاس کوئی صورت نہ ہو، تو ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلا کراہت جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کر لے کہ وہ وہاں جا کر عملی زندگی میں دین کے احکام پر کاربند رہے گا اور وہاں رائج شدہ منکر اور فواحش سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے گا۔

۲-اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہو جائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ وہ نان شبینہ کا بھی محتاج ہو جائے ان حالات میں اگر اسے غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے، جس کی بنا پر وہ وہاں رہائش اختیار کر لے تو مذکورہ بالا دو شرائط (جن کا بیان نمبر ایک میں گذرا) کے ساتھ اس کا وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کی طرح ایک فرض ہے، جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی، بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو۔

۳-اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرتا ہے کہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا یا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شریعت پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا اس نیت سے وہاں رہائش اختیار کرنا صرف جائز ہی نہیں، بلکہ موجب اجر و ثواب ہوگا، چنانچہ بہت سے صحابہؓ اور تابعین نے اسی نیت اور نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی، جو بعد میں ان کے فضائل و مناقب اور محاسن میں شمار کیا گیا۔

۴-اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوشحالی اور عیش و عشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحش و منکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مرادف ہے اور بلا ضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش و عشرت اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ان میں دینی حمیت کمزور ہو جاتی ہے، ان کی سوچ و فکر کے انداز بدل جاتے ہیں، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے (ابوداؤد کتاب الجہاد رقم: ۲۷۸۷)۔

فقہاء فرماتے ہیں کہ صرف ملازمت کی غرض سے کسی مسلمان کا دار الحرب میں رہائش اختیار کرنا اور ان کی تعداد

میں اضافہ کا سبب بننا ایسا فعل ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہوجاتی ہے (تکملۃ رد المحتار ۱/۱۰۱، بحوالہ فقہی مقالات ۲/ ۲۳۵)۔

۵- پانچویں صورت یہ ہے کہ کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے یا دار الکفر کی قومیت اور شہریت کو دار الاسلام کی شہریت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل و برتر سمجھتے ہوئے ان کی شہریت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود و باش میں ان کا طرز اختیار کرکے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے تو ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقاً حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (فقہی مقالات ۲/ ۲۳۲ تا ۲۳۵)۔

خلاصہ یہ کہ سوال کی پہلی شق مجبوری کی صورت میں جواب کا دوسرا جزء منطبق ہوگا اور سوال کی دوسری شق محض معاشی فوائد والی صورت میں جواب کا چوتھا جزء منطبق ہوگا۔

۷- کفار کے حق میں مسلم ممالک کی تین اقسام ہیں:

الف- حرم پاک: تو کسی کافر کے لئے اس میں داخل ہونا کسی بھی حال میں درست نہیں، چاہے وہ ذمی ہو یا مستأمن، ائمہ اربعہ میں سے امام شافعیؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ اسی کے قائل ہیں، حتی کہ اگر دار الکفر سے کفار کا کوئی قاصد آئے اور امام المسلمین حرم میں ہو تو بھی اس کو دخول کی اجازت نہیں دی جائے گی، بلکہ امام المسلمین خود باہر تشریف لاکر یا اپنا نمائندہ اور قاصد بھیج کر اس کا پیغام سنیں گے۔

دلیل: ان حضرات ائمہ کی دلیل قرآن پاک کی آیت: "**إنما المشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام**" (سورۂ توبہ: ۲۸) کا ظاہری مفہوم ہے۔

ائمہ حنفیہ کی دلیل بھی قرآن پاک کی یہی آیت ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آیت کا دو مفہوم ہے:

الف- ممانعت ان مشرکین کے ساتھ خاص ہے جن کو دخول مکہ اور دیگر تمام مساجد میں دخول سے روک دیا گیا تھا، ذمہ نہ ہونے کی وجہ سے، اور ان سے اسلام اور قتال کے سوا کوئی چیز (ذمہ، جزیہ وغیرہ) قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ مشرکین عرب ہیں۔

ب- مشرکین کو حج کے لئے دخول مکہ سے روکا گیا ہے، یعنی کوئی کافر و مشرک حج کرنے کے لئے مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہوسکتا، دلیل اس کی یہ ہے کہ:

۱- ۹ھ میں حضور ﷺ کی طرف سے یہ اعلان کرایا گیا تھا: "**أن لا يحج بعد العام مشرك ولا يطوفن بالبيت عريان**" (ترمذی: ۳۰۹۱) (سن لو! اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرے گا اور نہ کوئی کعبۃ اللہ کا برہنہ طواف

کرے گا)، چنانچہ ۱۰ھ میں جب حضور ﷺ نے حجۃ الوداع فرمایا تو وہاں کوئی مشرک موجود نہ تھا۔

۲-دوسری دلیل یہ ہے کہ اسی آیت کے اگلے حصہ میں ہے: "**وإن خفتم عيلة فسوف يغنيكم الله من فضله**" (سورۂ توبہ:۲۸) سے بھی پتہ چلتا ہے کہ حج کے لئے دخول ممنوع ہے۔

۳-آیت میں ''نجس'' سے مراد نجس اعتقادی ہے، چنانچہ ثقیف کا وفد حضور ﷺ کے پاس آیا تو آپ ﷺ نے ان کے قیام کے لئے مسجد میں سائبان لگوادیا تھا، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! یہ نجس لوگ ہیں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان لوگوں کی نجاست کا کچھ اثر زمین پر نہیں پڑتا ہے، بلکہ ان کی نجاست کا اثر خود ان پر پڑتا ہے (بحوالہ ابحاث ہیئۃ کبار العلماء ۵۳۲/۷)۔

رہ گئی بات یہ کہ کافر اور ذمی کا استثناء کیوں کیا گیا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کافر معاہد کا استثناء اس آیت کی وجہ سے ہے: "**إلا الذين عاهدتم من المشركين**" (احکام القرآن ۲۷۹/۴ تا ۲۸۱)۔

۴-بلاد اسلام کی دوسری قسم حجاز مقدس یا جزیرۃ العرب ہے، اس کی حد بندی میں علماء کے مختلف اقوال ہیں، بعض کہتے ہیں کہ اس کی حد یمامہ، نجد، یمن اور مدینہ منورہ کے درمیان کا حصہ ہے، کلبی فرماتے ہیں کہ حجاز کی حد جبل طئی اور طریق عراق کے درمیان کا حصہ ہے، حربی فرماتے ہیں: تبوک بھی حجاز کا حصہ ہے (فقہ السنۃ ۵۵/۳، موسوعہ فقہیہ ۱۲۶/۳، ۱۲۷)، اب جزیرۃ العرب کو صرف تین حصوں میں تقسیم کرنا مناسب ہے، ایک اس کے مغربی اور جنوبی ساحلوں کے پہاڑ اور ان کے ساحل و میدان، اس میں حجاز، تہامہ، عسیر، یمن، حضرموت، شحر مدہ وطفار، اور عمان شامل ہیں۔

دوسرے جزیرۃ العرب کے مختلف صحراء و ریگستان اس میں صحراء الربع الخالی، الدہناء، النفوذ اور بادیۃ الشام شامل ہیں، تیسرے اس کی سطح مرتفع، نیز اس کے مشرق میں واقع سواحل اور میدان، اس میں نجد (یمامہ، قصیم، جبال طئی) احساء، قطر، کویت اور بحرین شامل ہیں (جزیرۃ العرب ص ۲۶، ۲۷)۔

ائمہ ثلاثہ فرماتے ہیں کہ امام، خلیفہ یا اس کے نائب کی اجازت سے کفار اس میں داخل ہوسکتے ہیں، لیکن مدت مسافرت (تین دن) سے زیادہ قیام نہیں کرسکتے ہیں۔

امام صاحب فرماتے ہیں: ان کو قیام اور استیطان (وطن بنانے) سے منع نہیں کیا جائے گا۔

جمہور فقہاء کے دلائل:

۱-"**لأخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب**" (مشکوۃ: ۴۰۵۲) (میں ضرور بالضرور یہود و نصاری کو جزیرۃ العرب سے نکالوں گا)۔

۲-"أخرجوا المشركين من جزيرة العرب"(مسلم کتاب الوصیۃ:۱۶۳۷)(مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکالو)۔

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو ہنگامی حالات کی وجہ سے فرصت نہ مل سکی تو حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان کو جلاوطن کیا، اور جو تجارت کی غرض سے آئے تھے ان کو تین دن کی مہلت دی۔

۳-"لا يجتمع دينان في جزيرة العرب" (السنن الکبری للبیہقی ۹/۲۰۸)(جزیرۃ العرب میں دو دین جمع نہیں ہوسکتے)۔

بلاد اسلام کی ان دو قسموں کے بارے میں راقم الحروف کی رائے یہ ہے کہ ان ممالک کے دین، امن وسکون اور استقرار کے پیش نظر اور کفار کے قیام کی وجہ سے پڑوسی ممالک کو جو خطرات لاحق ہوئے ہیں ان کے پیش نظر کسی بھی غیر مسلم کو ان میں مستقل قیام اور استیطان کی ہرگز اجازت نہ دی جائے، اس لئے کہ وہ اس دین کے دشمن ہیں ان سے دغا، فریب، دھوکہ اور خیانت کا صدر کبھی بھی ہوسکتا ہے، وہ کسی بھی وقت اعداء اسلام سے ساز باز کر سکتے ہیں، اس لئے ان پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، چنانچہ قرآن کا فرمان ہے: "لا يرقبون في مومن إلا ولا ذمه يرضونكم بأفواههم وتأبى قلوبهم واكثرهم فاسقون" (سورۂ توبہ:۱۰)(وہ نہیں لحاظ کریں گے تمہاری قرابت کا اور نہ عہد کا وہ تم کو اپنے منہ کی بات سے راضی کر دیتے ہیں اور ان کے دل نہیں مانتے ہیں، اور ان میں سے اکثر بدعہد ہیں)۔

چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں:

الف-حضور ﷺ کو علم ہوگیا تھا کہ زمانہ کا پانسہ پلٹتا رہتا ہے، ممکن ہے کہ اسلام کسی زمانے میں کمزور پڑ جائے اور اس کا شیرازہ بکھر جائے، اگر ایسے حالات میں یہ کفار دشمنان خدا ورسول اور اسلام، اسلام کی اصل اور مرکز میں ہوں گے تو اللہ تعالی کی حرمات اور دینی شعائر کی بے حرمتی و پامالی کا سبب بنیں گے، چنانچہ آپ ﷺ نے دار العلم کے اردگرد سے ان کو نکالنے کا حکم فرمایا۔

ب-کفار کے ساتھ بود و باش، رہن سہن، مسلمانوں کے دین کو بگاڑتا ہے، ان کے نفوس میں تبدیلی پیدا کرتا ہے، دینی غیرت وحمیت کو کمزور کرتا ہے، لیکن چونکہ دوسرے ممالک اسلامیہ میں ان کے ساتھ رہنے کے سوال کوئی چارہ نہیں ہے تو کم از کم حرمین شریفین کو ان کے ناپاک وجود سے پاک کیا جائے۔

ج-حضور پاک ﷺ پر آخری زمانے کے حالات منکشف ہوگئے تھے، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا: "إن الدين ليأرز إلى المدينة كما تأرز الحية إلى حجرها" (بخاری کتاب فضائل المدینہ حدیث نمبر ۱۸۷۶، مسلم کتاب الایمان

۱۴۷)(دین مدینہ منورہ کی طرف ایسا سمٹ آئے گا جیسے سانپ اپنے بل میں سمٹ جاتا ہے) اور حضور ﷺ کے فرمان کی تکمیل صرف اسی صورت میں ہوسکتی ہے کہ دوسرے تمام ادیان و مذاہب کے ماننے والوں کو وہاں سے نکال دیا جائے (حجۃ اللہ البالغہ ۲/۷ ۵۳، ۵۳۸)۔

۳-تیسری قسم تمام بلاد اسلام ہے ان میں کافر عہد، ذمہ اور امان لے کر قیام کرسکتا ہے، البتہ امام شافعیؒ کے نزدیک مساجد میں داخل نہیں ہوسکتا ہے جب تک کہ کسی مسلمان کی اجازت نہ حاصل کرلے، امام صاحبؒ کے نزدیک بغیر اجازت بھی داخل ہوسکتا ہے، مالکیہ اور حنابلہ کے نزدیک کسی بھی حال میں داخل نہیں ہوسکتا ہے چاہے اجازت ہو یا نہ ہو (فقہ السنہ ۵۵/۳)۔

غیر مسلموں کو مسلم ملک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنے کے سلسلے میں روایات اور عمل صحابہ اور فقہاء کی عبارتوں سے جواز اور عدم جواز دونوں کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ ''ابوداؤد شریف'' میں حدیث ہے: ''**أنا بریٔ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین**'' (ابوداؤد کتاب الجہاد رقم: ۲۶۴۵) (میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے)، نیز دوسری حدیث میں ہے: ''**من جامع المشرکین وسکن معه، فإنه مثله**'' (ابوداؤد کتاب الجہاد: ۲۷۸۷) (جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے، مراسیل ابوداؤد میں ہے: ''**لا تنزلوا الذرية بإزاء العدو**'' (ابوداؤد فی المراسیل، باب إنزال الذریۃ الثغور والسواحل) (اپنی اولاد کو دشمنوں (مشرکین) کے درمیان نہ چھوڑو)۔

یہ اور اس طرح کی تمام روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے نہ آباد کرنا چاہئے نہ خود آباد ہونا چاہئے۔

لیکن دوسری طرف جب ہم صحابہ کرام کا عمل دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ صحابہؓ کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم ملکوں میں ان کے درمیان آباد ہوئی، نیز فقہاء نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر دار الکفر سے کوئی کافر دار الاسلام آئے تو امام المسلمین اسے اپنی صوابدید پر زیادہ سے زیادہ ایک سال کی مہلت دے سکتا ہے اگر وہ اس سے زیادہ رہ گیا تو اب وہ اپنے وطن نہیں جاسکتا، بلکہ وہ اسی ملک کا شہری شمار ہوگا، چنانچہ صاحب ''ہدایہ'' تحریر کرتے ہیں:

''**وإذا دخل الحربي إلينا مستأمنا لم یمکن أن یقیم في دارنا سنة، ویقول له الإمام: إن أقمت تمام السنة وضعت علیک الجزیة، وإذا أقامها بعد مقال الإمام یصیر ذمیاً، ثم لا یترک أن یرجع إلی دار الحرب**'' (ہدایہ ۵۸۶/۲)۔

(حربی دارالاسلام امان لے کر آئے تو اس کو دارالاسلام میں ایک سال سے زیادہ قیام کی اجازت نہیں دی جائے گی اور امام المسلمین اس سے کہے گا کہ اگر تم مکمل ایک سال قیام کروگے تو میں تمہارے اوپر جزیہ لاگو کروں گا، پھر اگر وہ امام کے یہ کہنے کے بعد بھی وہاں مقیم رہا تو وہ ذمی ہوجائے، پھر اسے دارالحرب واپس جانے کی اجازت نہ ہوگی)۔

نیز قرآن پاک میں ہے:"**وإن أحد من المشركين استجارک فأجره حتى يسمع كلام الله**"(سورۂ توبہ:۶)،اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کو قیام کی اجازت ہونی چاہئے، تاکہ وہ محاسن اسلام سے واقف ہوسکے۔

نیز حضور ﷺ نے فرمایا:"**المؤمن الذي يخالط الناس ويصبر على أذاهم خير من الذي لم يخالط الناس ولم يصبر على أذاهم**"(ترمذی رقم:۲۵۰۰، ابن ماجہ رقم:۴۰۳۲)۔

(وہ مومن جو لوگوں کے درمیان رہتا ہے اور ان سے میل جول قائم رکھتا ہے اور ان کی ایذاؤں پر صبر کرتا ہے وہ اس مومن سے بہتر ہے جو لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا ہے اور ان کی ایذاؤں پر صبر نہیں کرتا ہے) اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اپنے درمیان اقامت کی اجازت دینا یا خود ان کے درمیان سکونت اختیار کرنا جائز ہے۔

دلائل پر غور کرنے کے بعد راقم الحروف کا خیال ہے کہ یہ مسئلہ جواز اور عدم جواز کا نہیں، بلکہ اولی اور غیر اولی کا ہے، اولی اور بہتر یہ ہے کہ مسلمان اپنی آبادیاں الگ قائم کریں، کالونیاں الگ بنائیں، لیکن اگر ان کے درمیان رہنے یا ان کو اپنے درمیان رکھنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو تو اس انداز سے رہیں کہ ان کے محلے الگ اور مسلمانوں کے محلے الگ ہوں اور اگر ایسا بھی ممکن نہ ہو تو غالب اکثریت والے مسلمانوں کے علاقہ میں رہائش اختیار کریں۔

خلاصہ یہ کہ اگر ضرورت ہو تو غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا جائز ہوگا، چنانچہ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں:

"**قال القرطبي: فيه أن على الامام إخراج كل من دان بغير دين الاسلام من كل بلد غلب عليها المسلمون عنوة إذا لم يكن بالمسلمين ضرورة إليهم كعمل الأرض ونحو ذلک، وعلى ذلک أقر عمرؓ من أقر بالسواد والشام**"(فتح الباری ۶/۲۰۸)۔

قرطبی فرماتے ہیں: اس حدیث (مشرکین کو جزیرۃ العرب سے نکالو) میں ہے کہ امام المسلمین ہر ایسے شخص کو جو دین اسلام کے سوا کسی دوسرے دین کا پیرو ہو، ہر ایسے شہر سے نکال دے جس پر مسلمانوں نے فتح کے ذریعہ غلبہ حاصل کیا ہو،

بشرطیکہ وہاں کے مسلمانوں کو ان کی کوئی ضرورت نہ ہو، مثلاً کاشت، زمین کی جوتائی وغیرہ، اور اسی وجہ سے حضرت عمر فاروقؓ نے سواد اور شام کے کچھ لوگوں کو باقی رکھا تھا۔

البتہ اس امر کا خیال ضرور رہے کہ وہ تعداد کے اعتبار سے مغلوب اور مسلمان غالب ہی رہیں۔

☆☆☆

قانون اسلام میں شہریت کا مفہوم اور شہریوں کے حقوق

مولانا نثار احمد حصیر القاسمی☆

شہریت کا مفہوم اور اس سے متعلق احکام:

شہریت و وطنیت کا مسئلہ دور حاضر میں بڑی اہمیت اختیار کر چکا ہے، موجودہ دور کے مسائل میں یہ ایک نہایت اہم مسئلہ ہے، درحقیقت شہریت دور حاضر کی اصطلاح ہے جو سٹیزن شپ (citizenship) کا ترجمہ ہے، اسی کو وسیع تر مفہوم میں نیشنلٹی سے تعبیر کر سکتے ہیں، شہریت فرد اور ملک کے درمیان کے تعلقات سے عبارت ہے جس کا تعین ملکی قانون کرتا ہے ، اور اس سے فرد کو بہت سے حقوق و آزادی حاصل ہوتی ہے اور ان پر ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں (دائرۃ المعارف البریطانیہ و وکی پیڈیا)۔

اسلامی اصطلاح کی ڈکشنری میں شہریت کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے کہ شہریت اس مقام و مرتبہ یا سماجی رابطے و تعلق کا نام ہے جو کسی زمین پر بسے افراد کو سیاسی ڈھانچے یا ملک سے مربوط کرتا ہے، اور ان دونوں کے درمیان خاص رشتہ قائم کرتا ہے، اس تعلق کے ذریعہ فریق اول وفاداری پیش کرتا ہے اور فریق ثانی تحفظ فراہم کرتا ہے، فرد اور ملک کے درمیان اس تعلق کو قانون کے ذریعہ متعین و محدود کیا جاتا ہے۔

اسلامی شریعت میں شہریت، وطنیت کے ہم معنی ہے جو مسلم فرد اور امت کے عناصر کو دیگر افراد سے اور حاکم و محکوم کو جوڑتا ہے، پھر ان تمام رابطوں کو وہ رابطہ مضبوط کرتا ہے جو ایک طرف مسلمانوں اور حکمرانوں کو یکجا کرتا اور دوسری طرف زمین اور اس میں تمام بسنے والوں کو جوڑتا ہے، یہ تعریف درحقیقت اس دارالاسلام کی ہے جہاں مسلمان اور غیر مسلم سب آباد ہوتے ہیں۔

عربک انسائیکلوپیڈیا میں اس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ وطنیت کا مطلب فرد کا اپنے وطن سے محبت کرنا اور اخلاص برتنا ہے، جو زمین سے اس پر بسنے والوں سے اور وہاں کے عادات و اطوار اور رسم و رواج سے وابستگی کا متقاضی ہے

☆ سکریٹری جنرل اکیڈمی آف ریسرچ اینڈ اسلامک اسٹڈیز، پوسٹ باکس 601 حیدر آباد۔

اس میں وطن کی تاریخ پر فخر کرنا اور وطن کی خدمت میں قربانی دینا بھی شامل ہے۔

وطنیت یا شہریت اور اس کی تنفیذ کے طریقے دور حاضر میں حسب ذیل ہیں:

۱۔ وفاداری ووابستگی۔ شہریت کے لئے ضروری ہے کہ وطن سے وابستگی اختیار کرے، وابستگی کا احساس ہر شہری کے اندر جوش وجذبہ پیدا کرتا ہے کہ وہ وطن کے لئے اٹھ کھڑا ہو اور اس کے دفاع میں ہر شہری اپنے وطن کے ساتھ وفاداری برتے، اپنے وطن پر فخر کرے، اس کا دفاع کرے، اس کی سلامتی کا حریص رہے، اور ملکی علامتوں جیسے قومی ترانہ، پرچم، زبان اور رسم ورواج کا احترام کرے۔

۲۔ ہر شہری کو سماجی سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی حقوق یکساں طور پر حاصل ہوں گے، اور حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ملک میں بسنے والے ہر شہری کو درج ذیل سہولیات فراہم کرے۔

جان کی حفاظت کرے، مال اور تمام املاک کی حفاظت کرے، اس کے دین ومذہب کی حفاظت کرے، تعلیم فراہم کرے، میڈیکل سہولیات مہیا کرے، بنیادی خدمات فراہم کرے، باعزت زندگی گذارنے کی راہ ہموار کرے، ہر ایک کے ساتھ عدل وانصاف اور مساوات برتے، ہر کسی کو شخصی آزادی دے، جس میں سرفہرست جائیدادوں کا مالک بننے کی آزدای کام کرنے اور ملازمت اختیار کرنے کی آزادی، عقیدے کی آزادی، رائے کی آزادی، دین ومذہب کی آزادی، آنے جانے کی آزادی ہے، اور اس کے علاوہ اور بھی بہت سی آزادیاں ہیں۔

۳۔ شہریت رکھنے والوں پر ملک اور سماج کے تعلق سے کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں، مثلا دستور، قانون اور ملکی نظام کا احترام کرنا، ملک کے دفاع میں حصہ لینا اور ضرورت ہو تو فوجی خدمات انجام دینا، حکومت کی جانب سے عائد کردہ ٹیکس اور فیسیز ادا کرنا، عام املاک کی حفاظت کرنا اسے نقصان پہنچانے سے گریز کرنا، وطن کے ساتھ خیانت وغداری نہ کرنا اور ملک کو نشانہ بنانے والے پروپیگنڈوں کا مقابلہ کرنا اور سماج کے افراد کے ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر کام کرنا۔

۴۔ ملک کی سیاسی وسماجی سرگرمیوں میں شریک رہنا، وطنیت وشہریت کی خاص علامتوں میں سے یہ بھی ہے کہ ملک کا ہر شہری سیاسی عمل میں حصہ لے (انتخابات میں حق کا استعمال کرے) سیاسی فیصلوں اور موقفوں پر اپنی رائے اور مشوروں کا اظہار کرے، سماجی سرگرمیوں، انسانی خدمات، اولکی مفاد سے متعلق عمل میں شریک رہے۔

لغوی اعتبار سے وطن چونکہ اس جگہ اور مقام کا نام ہے جہاں انسان رہائش پذیر ہوتا اور اسے اپنا وطن بناتا ہے، اس لئے اس کا بھی تقاضہ ہے کہ وہ اس سے مربوط ووابستہ رہے، اس کے ساتھ وفاداری کرے، اور اس مقام کے مفاد میں جو ہو اس میں ہاتھ بٹائے۔

شہریت کی اساس:

کسی بھی ملک کے اندر حقوق اور واجبات کے تبادلے کے دو بنیادی عناصر ہوتے ہیں اور اسی پر سیٹیزن شپ کی عمارت کھڑی ہوتی ہے، ایک عنصر عوام اور دوسرا عنصر ملک ہے، انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے، وہ دوسروں کے ساتھ مربوط رہکر اور باہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو بانٹ کر جینا چاہتا ہے، یہ اس کی فطری ضرورت اور زندگی کا لازمہ ہے، بلکہ اسی پر اس کا وجود قائم ہے، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی انفرادیت میں سب سے زیادہ غلو کرنے والا مذہب بھی اس ضرورت کا اعتراف کرتا ہے کہ لوگوں کے درمیان کچھ اقدار واخلاقیات کا ہونا ضروری ہے جو افراد کے تعلقات کو منظّم کرسکے اور اسے باضابطہ بنا سکے۔

سماج کے افراد کو جوڑنے والے تعلق کو اسلام اس طرح استوار کرنا چاہتا ہے کہ انسان کا تعلق اپنے رب کے ساتھ اچھا ہو، اس کے عہد کو انسانیت کی فلاح کے لئے پورا کرے، اس کے بالمقابل اس ربط وتعلق کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے حقوق کی پامالی، زمین میں فساد وبگاڑ پیدا کرنے کی کوشش اور اللہ کے عہد ومیثاق کو توڑنے کو اللہ کی ناراضگی اور دائمی شقاوت وبدبختی کا سبب قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ أَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ أُوْلٰئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْءُ الدَّارِ﴾ (الرعد:۲۵)۔

(رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ ڈالتے ہیں، جو ان رابطوں کو کاٹتے ہیں جنہیں اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے، اور جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، وہ لعنت کے مستحق ہیں اور ان کے لیے آخرت میں بہت برا ٹھکانہ ہے)۔

عوامی سطح پر باہم حقوق وواجبات کی بے شمار صورتیں ہیں، جیسے والدین واولاد کے حقوق، زوجین کے حقوق، ذوی الارحام کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، اور اس کے علاوہ بے شمار حقوق، غرض سماج کے افراد کے درمیان کے تعلقات کو انسانی سطح پر پہنچانے کے لئے اونچے اقدار واخلاق کی ضرورت ہے جسے دین اسلام نے مشروع کیا اور ایمان والوں کو اسے اپنانے کی تاکید کی ہے، ان اخلاق میں سرفہرست ولاء ووفاداری اور الفت ومحبت ہے، جو امت کو ایک دوسرے سے جوڑتی ہے، اللہ تعالیٰ نے اس وفاداری کا تذکرہ یوں کیا ہے۔

﴿وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ إِلَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ﴾ (الانفال:۷۳)۔

(جو لوگ منکرِ حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں۔اگر تم یہ نہ کروگے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہوگا)۔

ایک اخلاق ہمدردی وجذبہ ایثار ہے جس سے انسان نفسیاتی طریقہ پر ایک دوسرے سے قریب ومانوس ہوتا ہے، یہ ہمدردی انسانی بنیاد پر ہوتی ہے، کسی مفاد یا دکھاوے کے طور پر نہیں، اللہ کے رسول صلعم کا ارشاد ہے:

"**ترى المؤمن فی تراحمهم وتوادهم وتعاطفهم كمثل الجسد ، إذا اشتكى عضوا تداعى له سائر جسده بالسهر والحمى**"(صحیح البخاري، کتاب الأدب، حدیث نمبر:۵۶۶۵)۔

(مؤمن کی مثال باہم محبت کرنے ،رحم دلی کرنے ،اور ہمدردی کرنے میں جسد واحد کی طرح ہے کہ اس کے کسی ایک حصے کو اگر بیماری لاحق ہوتی ہے تو پورا جسم شب بیداری اور بخار میں اس کے لئے ٹوٹ پڑتا ہے)۔

ایک اخلاق نصیحت وخیرخواہی ہے،جس کا مطلب ہے کہ ہر ایسے کام کی کوشش کی جائے جس سے دوسرے کا بھلا ہو، اللہ کے نبی صلعم بیعت لیتے ہوئے اس کی بھی تاکید فرمایا کرتے تھے(**يعنى والنصح لكل مسلم**) آپ ﷺ کا واضح ارشاد ہے:

"**الدين النصيحة ، قلنا : لمن يارسول الله ؟ قال: لله ، ولكتابه، ولرسوله، ولأئمة المسلمين ، والمسلم أخو المسلم ، لا يخذله ، ولا يكذبه ، ولايظلمه، وإن أحدكم مرآة أخيه ، فإن رأى به أذى فليمطه عنه**" (جامع الأصول في أحاديث الرسول، حدیث نمبر:۴۷۹۴)۔

(دین نصیحت وخیرخواہی کا نام ہے،(صحابہ فرماتے ہیں) ہم نے کہا، کس کے لئے اے اللہ کے رسول؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے لئے ،اس کی کتاب کے لئے اس کے رسول کے لئے ،مسلمانوں کے ائمہ کے لئے ،اور مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، نہ اسے رسوا کرے، نہ اس کے ساتھ دروغ گوئی کرے، نہ اس پر ظلم کرے، تم میں سے ہر کوئی اپنے دوسرے بھائی کے لئے آئینہ ہے، اس میں اگر کوئی تکلیف دہ چیز پائے تو اسے چاہئے کہ اسے دور کردے)۔

ایسے ہی بنیادی، اخلاق میں سے ایک نصرت ومدد ہے، ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر حق ہے کہ وہ اس کی مادی ومعنوی ہر طرح سے مدد کرے، اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

"**أنصر أخاک ظالما أو ظلموما ، فقال رجل : يارسول الله ! أنصره إذا كان مظلوما فكيف أفرأيت إذا كان ظالما كيف أنصره ؟ قال: تحجزه أو تمنعه من الظلم ، فإن ذلک نصره**" (صحیح البخاري، کتاب العلم، حدیث نمبر:۲۹۵۲)۔

(اپنے بھائی کی مدد کرو، ظلم ہو یا مظلوم، ایک شخص نے کہا ہم اس کی مدد کرسکتے ہیں جبکہ وہ مظلوم ہو، لیکن اگر وہ ظالم

ہوتو ہم کس طرح اس کی مدد کریں؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: اسے ظلم کرنے سے روکو اور منع کرو، یہی اس کی مدد کرنا ہے)۔

اسلام نے اخلاقی اقدار کو اس لئے مشروع کیا کہ یہ اسلامی زندگی کا ضابطہ اور اس کی رہنمائی کا قاعدہ بنے اور سماج کا ڈھانچہ مضبوط و مستحکم ہو، یہ ایسے اقدار و اخلاقیات ہیں کہ نئی نسل کے ذہن میں اگر اسے راسخ کر دیا جائے، اور اس پر ان کی شخصیت کی تعمیر کی جائے، تو ایسا سماج سامنے آئے گا جس میں انسانیت کا بول بالا ہوگا، اور اس کا ہر فرد نفساتی، فکری، حرکیاتی ہر اعتبار سے بلند معیار کامکمل انسانیت کا حامل ہوگا۔

شہری اور ملک:

شرعی اصطلاح میں عام شہری کو رعایا سے تعبیر کیا گیا ہے، جس کا مطلب ہے راعی، یعنی حکومت رعایا کے ساتھ مکمل نگرانی و تحفظ کا معاملہ کرے، اسے انصاف دے، اس کے حقوق ادا کرے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

" ألا كلكم راع وكلكم مسؤول عن رعيته ، فالإمام الأعظم الذي على الناس راع وهو مسؤول عن رعيته ، والرجل راع على أهل بيته وهو مسؤول عن رعيته ، والمرأة راعية على أهل بيت زوجها ، وولده وهي مسؤو لة عنهم ، وعبد الرجل راع على مال سيده وهو مسؤول عنه ، ألا فكلكم راع وكلكم مسؤو ل عن رعيته " (صحیح البخاري، کتاب العلم، حدیث نمبر: ۷۱۳۸)۔

(آگاہ ہوجاؤ کہ تم میں سے ہر کوئی نگہباں ہے، اور تم میں سے ہر کسی سے اپنی زیر سرپرستی و نگرانی کے بارے میں سوال کیا جائے گا (وہ اس کا ذمہ دار ہے) امام اعظم (حکمراں) جو لوگوں پر ہوتا ہے، وہ نگراں ہے اور اس سے رعایا کے بارے میں سوال کیا جائے گا، مرد گھر والوں کا نگراں ہے اور وہ اپنے گھر والوں کا ذمہ دار ہے، اس سے پوچھا جائے گا، عورت اپنے شوہر کے گھر اور اس کی اولاد کی نگراں ہے اور اس سے اس کے بارے میں پوچھا جائے گا، کسی شخص کا غلام آقا کے مال کا نگراں ہے اور وہ اس کا ذمہ دار ہے، اس کے بارے میں پوچھ ہوگی، آگاہ ہوجاؤ کہ تم میں سے ہر کوئی نگہباں ہے اور وہ اپنے زیر نگرانی و سرپرستی کے بارے میں پوچھا جائے گا)۔

مسلمان اپنے دینی تشخص و ماحول کی وجہ سے یہ اور اس طرح کے احکام کو اچھی طرح سمجھتے تھے، اس لئے ان میں آج جیسی برائی پیدا نہیں ہوئی، انہوں نے اپنی رعایا کے مستقبل سے کھلواڑ نہیں کیا؛ بلکہ انہوں نے آج کی سمجھ کے برعکس سمجھا، انہوں نے خیال کیا کہ رعایا کے حقوق بہت زیادہ ہیں اور ان کی ذمہ داری نہایت اہم اور پرخطر ہے، انہوں نے مانا کہ ملک کے باشندوں میں اصل رعایا ہے، راعی و حکمراں نہیں، وہ تو محض ان کے امور کا منتظم اور خادم ہے۔

اس پس منظر میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ملک پر عام شہری کا حق ہے کہ اقتدار اور حکمرانی عوام کی پسند کے مطابق ہو،

عوام اگر مسلمان ہوں تو اللہ کی شریعت نافذ کی جائے، رعایا کے تمام افراد کے ساتھ خیر خواہی کی جائے، ان کے ساتھ دھوکا بازی نہ کی جائے، نہ تعلیمی وثقافتی دھوکا نہ سماجی دھوکا، اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

" ما من عبد يسترعيه الله رعية يموت يوم يموت وهوغاش لرعيته إلا حرم الله عليه الجنة"(؟)

(جس بندے کو بھی اللہ رعایا پر نگراں بنایا ہو(حکمرانی دی ہو)اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ عوام کے ساتھ دھوکا کرنے والا ہو تو اللہ تعالیٰ جنت اس پر حرام کر دے گا)۔

اس کا مطلب ہے کہ حکومت کو عوام کے ساتھ سچائی برتنی چاہئے، انہیں اندھیرے میں نہ رکھا جائے اور نہ پروپیگنڈہ کے ذریعہ آنکھ میں دھول جھونکنے کی کوشش کی جائے، اللہ کے نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

" من غشنا فليس منا " (صحیح البخاري، کتاب الإیمان، حدیث نمبر: ۲۹۴)۔

(جو ہمارے ساتھ دھوکا کرے، وہ ہم میں سے نہیں ہے)۔

اسی طرح عوام کا حق ہے کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جائے اور مساوات و برابری برتی جائے، وطن کے دشمنوں کے سامنے ذمہ داری نبھائے، اسی طرح عوام کے لئے کام کے مواقع فراہم کئے جائیں؛ تاکہ وہ اپنے معاش ومعاد کی اصلاح کر سکیں، ملک کا حق رعایا پر یہ ہے کہ وہ انتخاب میں حصہ لیں، ملکی نظام کی وفاداری کریں، ملکی مفاد کو مقدم رکھیں، اور اپنے وطن سے جڑے رہیں اور اس کیلئے قربانیاں دینے کے لئے تیار رہیں، ملک کے ساتھ وفاداری برتیں دستور، قانون، حکومتی فیصلوں اور ہدایات پر اگر وہ شرع اسلام سے ٹکراتا ہوا نہ ہو تو عمل کریں، اسے توڑنے یا اس کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش نہ کریں، ملک کے لئے کام کرنے میں مخلص ہوں، اور اس کی تعمیر وترقی میں ہاتھ بٹائیں، غلط فیصلوں پر حکومت کو پرامن طریقے پر مشورے دیں اور امن وامان کی برقراری کی کوشش کریں، اور ملک سے باہر ملک کی اچھی نمائندگی کریں اور اسے بدنام کرنے سے گریز کریں، اور حکومت جو بھی (ظالمانہ نہیں بلکہ عادلانہ) ٹیکس عائد کرے یا فیس متعین کرے اسے ادا کریں۔

بہر حال وطن سے وابستگی اور لگاؤ انسان کی فطرت میں داخل ہے، مگر کبھی اس وابستگی میں ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے؛ اسی لئے اسلام نے اس ٹکراؤ کی کیفیت کو ختم کرنے کی کوشش کی اور واضح کیا ہے کہ عقیدے کا اتحاد الگ ہے اور زمینی ووطنی اتحاد الگ، شہریت کے اصول وضابطے اور دینی بھائی چارگی کے تقاضے کچھ اور ہیں جبکہ دینی بھائی چارگی زمان ومکان سے آزاد ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ کہ اسلام نے وطن اور اہل وطن کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کو تقسیم کر دیا ہے، ان حقوق

اور انداز حکمرانی میں عوام کے ارادوں اور توقعات کی رعایت اہم ہے، تاکہ عدل وانصاف کے ضوابط کو برتا جا سکے، عوام کو تحفظ دیا جائے، اندورنی وبیرونی خطروں سے عوام کو بچایا جائے، اور کام کے مواقع فراہم کئے جائیں، ان کی ذمہ داریوں میں سے ہے کہ ملک کے ساتھ وفاداری برتیں ملک کو ترقی دین اور اس کی شان وشوکت بلند کرنے کی کوشش کریں، حکام کو گاہے بگاہے مشورے دیں، ہر جائز طریقہ پر ملک کا اندرونی و بیرونی دشمنوں سے دفاع کریں، عائد کردہ ٹیکس ادا کریں اور ملکی قانون کی پابندی کریں۔

اسلام اور پناہ گزینوں کے حقوق:

ایک اندازے کے مطابق اس وقت دنیا میں بارہ ملین پناہ گزیں ہیں، ان کی اکثریت کا تعلق مسلم ملکوں سے ہے، اسی طرح اس وقت دینا میں کم وبیش ۳۰ ملین تارکین وطن ہیں جو ملک کے دوسرے علاقوں میں یا ملک سے باہر کیمپوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں، ان تارکین وطن میں سے ۱۰ ملین سے زائد افراد کی میزبانی مسلم ممالک کر رہے ہیں، حالیہ بہار عرب کے دوران اس میں 9000000 نو لاکھ تارکین وطن کا اضافہ ہوا ہے، جو ملک میں جنگ وجدال، خانہ جنگی اور انقلاب کے نتیجہ میں بے گھر ہوئے ہیں، بین الاقوامی قانون کی رو سے پناہ گزینوں اور تارکین وطن کو تحفظ فراہم کرنا اندرون یا بیرون ملک جہاں یہ پہنچیں اس ملک کی ذمہ داری ہے جس کی ضمانت بین الاقوامی انسانی قانون کے اندر دی گئی ہے، اور اس کی بنیاد ۱۹۴۹ میں کئے گئے جنیوا معاہدہ ۱۹۷۷ میں اضافہ کئے گئے پروٹوکول ۱۹۸۷ میں طے کئے گئے پناہ گزینی معاہدہ اور ۱۹۶۷ کے پروٹوکول پر ہے، اس کے علاوہ حقوق انسانی کے بین الاقوامی قانون نے بھی ان کے حقوق کو تسلیم کیا اور انہیں تحفظ فراہم کرنے کو لازم کیا ہے، اور اس قانون کی بنیاد ۱۹۴۸ کے بین الاقوامی اعلامیہ برائے حقوق انسانی پر ہے، اس اعلامیہ کی روشنی میں ہی ۱۹۶۶ اور اس کے بعد معاہدات روبعمل لائے گئے اور اس میں ان کے لئے شہری، سیاسی اقتصادی، سماجی، ثقافتی اور دیگر حقوق کو تسلیم کرتے ہوئے، اس کی فراہمی کو لازم کیا گیا۔

اسلام ایمان والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کمزوروں (مستضعفین) کی مدد کریں، انہیں تحفظ فراہم کریں، اور ان کے لئے ایسے وسائل وذرائع مہیا کریں جس سے ان کی زندگی کی گاڑی چلتی رہے، تاہم اسلام اور اسلامی شریعت پناہ گزینوں وتارکین وطن کے لئے وسیع تر قانونی ایسا نظام فراہم نہیں کرتا جو تحفظ فراہم کرنے کے موجودہ مفہوم کے مطابق ہو، مثال کے طور پر اسلام میں پناہ حاصل کرنے کا حق دیا گیا ہے، اور اس کی سب سے بڑی مثال خود رسول اللہ ﷺ کا ظلم وبربریت سے بچنے کے لئے مدینہ منورہ کی ہجرت ہے، گذشتہ چند سالوں کے درمیان مسلم دنیا میں حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ سے متعلق کافی ردوقدح اور بحث ومباحثہ ہوتا رہا، اور یہ بحث چھڑی رہی ہے کہ یہ اعلامیہ شریعت اسلامیہ سے مطابقت وموافقت

رکھتا ہے یا نہیں، حقوق انسانی کا مسلم وغیر مسلم دفاع کرنے والے یہ خدشات پیش کرتے ہیں کہ اسلام یا اسلامی شریعت حقوق انسانی سے ہم آہنگی نہیں ہے، یا کم از کم حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ سے ہم آہنگ ومطابقت رکھنے والی نہیں ہے، اس کا مطلب ہوا کہ اسلامی شریعت ان کے بقول حقوق انسانی کے بین الاقوامی قانون سے ہم آہنگ نہیں ہے، دوسری طرف کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ حقوق انسانی کا عالمی اعلامیہ براہ راست شریعت اسلامیہ کے بعض مبادی اور بنیادی ضابطوں سے ٹکراتا ہے؛ اس لئے وہ عالم اسلام کے لئے مناسب نہیں ہے، اور اس اختلاف کی وجہ شاید یہ ہے کہ حقوق انسانی کے تعلق سے اسلامی نقطۂ نظر اور بین الاقوامی نقطۂ نظر کا خود حقوق کے مفہوم میں اختلاف ہے، عالمی اعلامیہ انسان کے حقوق کے عالمی ہونے پر زور دیتا ہے، جبکہ اسلام دو طرح کے حقوق کو تسلیم کرتا ہے ایک تو وہ حق ہے جو انسان کو اس سے حاصل ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق ہے، اور اس اعتبار سے اس کی پابندی کرنا اور اسے بجالانا اس پر لازم ہے اور ایک حقوق وہ ہیں جس کی انسان دوسرے انسانوں سے توقع کرتا ہے، حقوق کی یہ دوسری قسم متعارف حقوق انسانی سے ہم آہنگی ومطابقت رکھتی ہے؛ البتہ پہلی قسم کے حقوق وہ ہیں جو دین وایمان کے سرچشمے سے پھوٹتے ہیں، اس اعتبار سے اللہ ہی کی ذات ایسی ہے جو حقوق کی مالک ہے، رہا انسانوں کے حقوق تو وہ اللہ کے احکام کو ماننے کے اندر پنہا ہے، افراد کے یہ حقوق ان قوانین کی پابندی کرنے میں ہے جسے اللہ نے بنایا ہے، اور اس پر عمل اور اس حق سے استفادہ اللہ کے نظام پر عمل کر کے ہی ہوسکتا ہے؛ اس لئے یہ غیر مسلموں کو شامل نہیں ہوگا، ایک اور مسئلہ عورت ومرد کے درمیان مساوات کا ہے، حقوق انسانی کا عالمی اعلامیہ ان دونوں صنفوں کے درمیان کسی قید وشرط کے بغیر مکمل مساوات پر زور دیتا ہے، مگر اس کے برخلاف اسلامی شریعت میں عورت کو حق حاصل ہے کہ مرد اس کی کفالت کرے، اس کی نگرانی وحفاظت کرے، اور اس پر انفاق کرے، دوسری طرف مرد عورت کے مقابلہ پر دگنا میراث پاتا ہے، ممکن ہے کہ اس طرح کے مسائل پناہ گزینی وترک وطن کی صورت میں ان کے حق سے متعلق اور املاک واپس لینے کے باب میں مسئلہ پیدا کریں، خاص طور پر جبکہ بہت سی فیملی ایسی ہوتی ہے جس کی سربراہ عورت ہوتی ہے، وہی بقاء کی جدوجہد کرتی اور از سر نو زندگی تعمیر کرنے نقل مکانی پر مجبور ہونے اور جنگ وجدال کے بعد معاش کی تگ ودو میں رہتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اسلام نے عملی طور پر کئی طرح کے بے شمار حقوق فراہم کئے ہیں جو ہر انسان کا حق ہے، یہ حق انہیں اس لئے حاصل ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں، یہ حقوق عصر حاضر کے تناظر میں بھی حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ میں پیش کردہ حقوق سے مختلف نہیں؛ بلکہ اس سے ہم آہنگ ہیں، مثال کے طور پر زندگی اور جینے کا حق اسلام میں انسانوں کا بنیادی حق ہے جو عورتوں، مردوں، مسلموں اور غیر مسلموں سب کو یکساں طور پر حاصل ہے، دین ومذہب سے قطع

نظر ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ جسمانی اذیت سے اسے تحفظ حاصل ہو،اور اگر وہ کسی ایسے جرم کا مرتکب نہ ہوا ہو جس کی اسلامی شریعت میں سزائے جسمانی یا سزائے موت مقرر کی گئی ہو تو اسے جسمانی سزا دینا شریعت کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور ممنوع ہوگا،موجودہ سیکولر جمہوری ملکوں میں تنہا صرف اور صرف ملک کو ہی تشدد اختیار کرنے اور سختیوں پر مبنی کارروائی کرنے کا اختیار ہے؛لیکن اسلام میں یہ حق صرف اللہ کو حاصل ہے،کسی بندے،کسی حکومت یا کسی اتھاریٹی کو نہیں،قانون اسلامی کے اندر یہ گوشہ بالکل عیاں ہے،اسی طرح انصاف،مساوات،امن وامان اور انسانی شرافت،جیسے: حقوق اسلام کے دئے ہوئے بنیادی حقوق میں سے ہیں،اس کے علاوہ اور بھی ضمنی حقوق ہیں جو ان حقوق کی تکمیل کرنے والے ہیں،جیسے:سماجی تکافل،حق تعلیم،مالک بننے کا حق،غلامی سے آزادی حاصل کرنے کا حق اور اس طرح کے دیگر حقوق اس سے بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ حقوق انسانی سے متعلق عالمی اعلامیہ کے اندر جن حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے،درحقیقت یہ وہ حقوق ہیں جسے اسلام نے آج سے ۱۴ صدی پہلے ہی تسلیم کیا اور لوگوں کو اس کا پابند بنایا ہے،مگر اس سے اس کی نفی نہیں ہوتی کہ اس عالمی اعلامیہ کے پہلوؤں کو ان ملکوں کے اندر نافذ کرنا مشکل ہے جو اپنے یہاں کے نظام کو اسلامی شریعت کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں،اسی کا احساس کرتے ہوئے ''تنظیم مؤتمر اسلامی'' نے جس کے تمام مسلم ممالک رکن ہیں حقوق انسانی سے متعلق ایک مخصوص چارٹر تیار کیا ہے جو حقوق انسانی کے عالمی اعلامیہ سے ہی ماخوذ ہے،مگر اس میں تھوڑی تبدیلی کرکے اسے اسلامی شریعت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کی گئی ہے،اس کے اندر زور دیا گیا ہے کہ ''رکن ممالک پر لازم ہے کہ وہ اقوام متحدہ کے چارٹر اور بنیادی انسانی حقوق کی پابندی کریں،اس زور دینے کے ساتھ ہی اس میں دین اسلامی اور شریعت اسلامیہ کے مبادی کو ملحوظ رکھا گیا ہے،مگر افسوس کہ اسلام میں حقوق انسانی سے متعلق ''تنظیم مؤتمر اسلامی'' کے چارٹر یا قاہرہ اعلامیہ ۱۰ کا نفاذ کہیں نہیں ہوسکا اور ہنوز وہ کاغذی شکل ہی میں ہے۔

ہمیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ اسلام بنیادی طور پر دین مساوات وانصاف ہے اور اس سے متعلق حقوق کی گارنٹی دیتا ہے،ہمیں یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ آٹھ مسلم ملکوں میں سے جن سات نے ۱۹۴۸ء میں پہلی بار ووٹ ڈالنے کے لئے منعقدہ اجلاس میں شریک تھے ووٹنگ کے وقت حقوق انسانی کے بین الاقوامی اعلامیہ کے حتمی مسودے کے اندر کوئی ایسی بات نہیں پائی تھی جو اسلامی مبادی واصول سے ٹکراتے ہوں،اس لئے انہوں نے اس کے حق میں ووٹ دیا تھا،بلکہ اس کی تیاری میں ایران ولبنان بھی شریک تھے،اور اس وقت کے پاکستانی وزیر خارجہ نے بھی اسے اپنانے کی اپیل کی تھی،حقوق انسانی کا یہ بین الاقوامی اعلامیہ کوئی معاہدہ نہیں ہے کہ اس پر دستخط کرنا ضروری ہو؛ بلکہ یہ دستاویز اور تمام انسانوں کے حقوق کا عالمی منہج ہے؛البتہ کسی ملک کی جانب سے اس اعلامیہ کے روح کی عملی پابندی انفرادی معاہدے پر دستخط کے ذریعہ ہی لازم

ہوتی ہے اس کا مطلب ہے کہ حقوق انسانی کا عالمی اعلامیہ معاہدوں کے طے کرنے کا ذریعہ ہے قانونی دستاویز نہیں ہے، اس کے علاوہ بیشتر بین الاقوامی معاہدے دستخط کرنے والے فریقوں کو اجازت دیتے ہیں کہ وہ کسی خاص پیراگراف یا مخصوص دفعات سے متعلق اپنے تحفظات کا اظہار کریں، یہ ملک کے مخصوص حالات کی وجہ سے بھی ہوسکتے ہیں، اور مذہبی وثقافتی وجوہات کی بنیاد پر بھی۔

بیشتر مسلم ملکوں نے اس طرح کے معاہدوں پر دستخط کئے ہیں اور بعضوں نے اس کی تفصیلات میں اپنے تحفظات کا اظہار بھی کیا ہے جو سیاسی اسباب کی وجہ سے بھی ہیں اور مذہبی اسباب کی وجہ سے بھی (جیسے تمام میدانوں اور میراث وغیرہ میں بھی عورتوں اور مردوں کو مساوی حق دینے میں) بین الاقوامی معاہدوں کو اپنا کر اسلامی نظام تحفظ کی خلیج کو پاٹا جاسکتا ہے، خاص طور پر اس وقت، جبکہ بیشتر مسلم ملکوں کے عوام کی جانب سے شریعت اسلامیہ کے نفاذ کا مطالبہ زور پکڑ رہا ہے کہ قومی قانون سازی کے لئے اسلامی شریعت کو بنیاد بنایا جائے، اس میں شبہ نہیں کہ کمزور طبقوں کی مدد کرنا ایسا قدم ہے جو اسلامی اصولوں اور اسلامی شریعت سے میل کھاتا ہے؛ اس لئے اندرون یا بیرون ملک تارک وطن اور پناہ گزینوں کے تحفظ کے لئے بین الاقوامی سطح پر تسلیم کیا جانے والا قانونی دائرہ بنانا قابل ستائش اور خیر مقدم کیا جانے والا قدم ہوگا۔

اس سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ پناہ طلب کرنے والوں، پناہ گزینوں اور نقل مکانی کرنے والوں کے حقوق کا دفاع کرنے میں اسلام کا اہم رول رہا ہے، اسلام ان کمزوروں کا احترام کرتا اور جو ان کے لئے پناہ گاہیں فراہم کرتے اور مدد کرتے ہیں شریعت اسلامی ان کی قدر دانی کرتی ہے، اسلام نے ہجرت کرنے والوں کے مصائب ومشکلات پر خاص توجہ دی اور مسلمانوں کو اس کے ازالہ کا پابند بنایا ہے، مسلمانوں کی جانب سے غیر مسلموں کے لئے فراہم کردہ پناہ کے لئے اسلامی قانون میں ''امان'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس طرح کے پناہ کو توڑنا اور پامال کرنا جائز نہیں ہے، اگرچہ جسے پناہ دی گئی ہو اس کی مسلمانوں سے لڑائی ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ أَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ فَأَجِرْهُ .....﴾ (التوبہ:۶)۔

(اور اگر مشرکین میں سے کوئی شخص پناہ مانگ کر تمہارے پاس آنا چاہے؛ تاکہ اللہ کا کلام سنے تو اسے پناہ دے دو یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس (کی امن کی جگہ) تک پہنچا دو، یہ اِس لیے کرنا چاہیے کہ یہ لوگ علم نہیں رکھتے)۔

فقہاء اسلام کا خیال ہے کہ امان سے ایسی پابندی لازم ہوجاتی ہے جس سے روگردانی حلال نہیں ہے، قرآن کریم اور تاریخ کی کتابوں میں ہجرت کے واقعات کا تذکرہ تفصیل سے آیا ہے کہ ایمان والوں اور انبیاء نے ہجرتیں کیں، مسلمان

جب ظلم وبربریت کا شکار اور سخت اذیتوں اور عقوبتوں سے دوچار ہوگئے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے حکم سے مکہ سے حبشہ کو ہجرت کی اور وہاں انہیں عیسائی بادشاہ سے تحفظ ملا، خود نبی کریم ﷺ پناہ گزیں تھے، کہ آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کے ساتھ ۶۲۲ء میں مکہ سے ہجرت کی اور دیگر مسلمانوں کو بھی ہجرت کر کے مدینہ آجانے کا حکم دیا، آپ کو پناہ گزیں کی حیثیت سے میزبان معاشرہ کی جانب سے ساری سہولیات فراہم کی گئیں، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام ہجرت پر مجبور ہوئے اور اپنی پوری فیملی کے ساتھ نقل مکانی کی اور اللہ تعالیٰ نے انہیں تحفظ دیا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَنَجَّيْنَاهُ وَلُوطًا إِلَى الْأَرْضِ الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا لِلْعَالَمِينَ﴾ (الأنبياء:۷۱)۔

(اور ہم اسے اور لوط (علیہ السلام) کو بچا کر اس سرزمین کی طرف نکال لے گئے جس میں ہم نے دنیا والوں کے لیے برکتیں رکھی ہیں)۔

موسیٰ علیہ السلام نے بھی ہجرت کر کے مدین میں اس وقت پناہ لی جب فرعون ان کی جان کے درپے ہوگیا اور وہاں کا معاشرہ ان کے خلاف سازشوں میں لگ گیا اور ان کے ساتھ بدسلوکی پر اتر آیا مدین میں انہیں نہ صرف سر چھپانے کو گھر ملا بلکہ انہیں کام بھی ملا اور راحت وآرام کے سارے وسائل ملے، وہاں کے سماج نے انہیں اپنے اندر جذب کرلیا اور معاشرے کا ایک فرد بنا کر داماد بنالیا۔

﴿وَجَاءَ رَجُلٌ مِّنْ أَقْصَى الْمَدِينَةِ يَسْعَىٰ قَالَ يَا مُوسَىٰ ..... فَلَا عُدْوَانَ عَلَيَّ وَاللَّهُ عَلَىٰ مَا نَقُولُ وَكِيلٌ﴾ (القصص:۲۰-۲۸) (تمام آیتوں کے ترجمے مع تفاسیر اردو تفسیر میں ملاحظہ کیا جائے)۔

قرآن کی یہ آیتیں واضح کر رہی ہیں کہ ہجرت سختی وشدت کے وقت اور ناگفتہ بہ حالات میں جبکہ انسانی زندگی اور اس کا ایمان وعقیدہ خطرے میں پڑ جائے انسانی ضرورت بن جاتی ہے، بلکہ بعض قرآنی آیتیں تو ایمان والوں سے مطالبہ کرتی ہیں کہ ان حالات میں ایمان بچانے اور جان ومال کی حفاظت کے مقصد سے ہجرت کر جائیں اور دوسری مامون جگہ پر جا کر پناہ حاصل کرلیں، بشرطیکہ ایسا کرنے کی ان میں قدرت ہو، اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ .....﴾ (النساء:۹۷-۱۰۰)۔

(جو لوگ اپنے نفس پر ظلم کر رہے تھے، ان کی روحیں جب فرشتوں نے قبض کیں تو ان سے پوچھا کہ یہ تم کس حال میں مبتلا تھے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم زمین میں کمزور ومجبور تھے، فرشتوں نے کہا، کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑا ہی برا ٹھکانا ہے، ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے، بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کردے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا

ہے، اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر راستہ ہی میں اسے موت آ جائے اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے)۔

قرآن کریم نے ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ دیگر معاہدوں کی طرح پناہ گزینوں کے حقوق سے متعلق کئے گئے معاہدوں کی بھی پابندی کریں، ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَوْفُوا بِالْعُقُودِ﴾ (المائدۃ:۱)۔

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بندشوں کی پوری پابندی کرو)۔

قرآن نے مہاجرین و پناہ گزینوں کے ساتھ سلوک کرنے کے تعلق سے متعدد احکام و ہدایات ایمان والوں کو دی ہیں اور اس کی پابندی کرنے کو کہا ہے، ان لوگوں کی تعریفیں کی گئی ہیں جو مصیبت کے وقت لوگوں کے لئے دست تعاون بڑھاتے اور ان کی دستگیری کرتے ہیں، اور مومنوں سے کہا گیا ہے کہ وہ پناہ گزینوں کو تحفظ فراہم کریں:

﴿لَقَد تَّابَ اللَّهُ عَلَى النَّبِيِّ ..... إِنَّهُ بِهِمْ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (التوبہ:۱۱۷)

(اللہ نے معاف کر دیا نبی کو اور ان مہاجرین و انصار کو جنہوں نے بڑی تنگی کے وقت میں نبی کا ساتھ دیا، اگر چہ ان میں سے کچھ لوگوں کے دل کجی کی طرف مائل ہو چلے تھے، مگر جب انہوں نے اس کجی کا اتباع نہ کیا، بلکہ نبی کا ساتھ ہی دیا تو اللہ نے انہیں معاف کر دیا، بیشک اس کا معاملہ ان لوگوں کے ساتھ شفقت و مہربانی کا ہے)۔

قرآن نے پناہ گزینوں اور تارکین وطن کے حقوق کو تسلیم کیا اور انہیں مخصوص حقوق عطا کئے ہیں، انہی حقوق میں سے ایک یہ ہے کہ ان کے ساتھ انسانی سلوک کیا جائے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا ..... إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ (الانفال:۷۲-۷۵)۔

(جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے، اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں۔ رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے، مگر ہجرت کر کے دار الاسلام میں آ نہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کر کے نہ آ جائیں، ہاں اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے؛ لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھتا ہے، جو لوگ منکرِ حق ہیں وہ ایک دوسرے کی حمایت کرتے ہیں، اگر تم یہ نہ کرو گے تو زمین میں فتنہ اور بڑا فساد برپا ہو گا، جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے

اور جدوجہد کی اور جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں، ان کے لیے خطاؤں سے درگزر ہے اور بہترین رزق ہے، اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کرکے آ گئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں، مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے)۔

﴿وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا فِي اللّٰهِ مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا لَنُبَوِّئَنَّهُمْ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّلَأَجْرُ الآخِرَةِ أَكْبَرُ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل:۴۱)۔

(جو لوگ ظلم سہنے کے بعد اللہ کی خاطر ہجرت کر گئے ہیں ان کو ہم دنیا ہی میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا ہے، کاش جان لیں وہ مظلوم)۔

قرآن نے ان لوگوں کی مذمت کی ہے جن کی وجہ سے لوگ اجتماعی ہجرت ونقل مکانی پر مجبور ہوئے ہیں، ایسا کرنے والوں اور دوسروں کو ترک وطن پر مجبور کرنے والوں کو قرآن نے کافر قرار دیا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لاَ تَسْفِكُوْنَ دِمَاءَ كُمْ .... وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ﴾ (البقرۃ:۸۴-۸۵)۔

(پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرنا۔تم نے اس کا اقرار کیا تھا، تم خود اس پر گواہ ہو۔مگر آج وہی تم ہو کہ اپنے بھائی بندوں کو قتل کرتے ہو، اپنی برادری کے کچھ لوگوں کو بے خانماں کر دیتے ہو، ظلم وزیادتی کے ساتھ ان کے خلاف جتھے بندیاں کرتے ہو، اور جب وہ لڑائی میں پٹے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں، تو ان کی رہائی کے لیے فدیہ کا لین دین کرتے ہو، حالانکہ انہیں ان کے گھروں سے نکالنا ہی سرے سے تم پر حرام تھا، تو کیا تم کتاب کے ایک حصے پر ایمان لاتے ہو اور دوسرے حصے کے ساتھ کفر کرتے ہو؟ پھر تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا اور کیا ہے کہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہو کر رہیں اور آخرت میں شدید ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں؟ اللہ ان حرکات سے بے خبر نہیں ہے، جو تم کر رہے ہو)۔

اسلام میں پناہ گزینوں کے حقوق سے متعلق تنظیم مؤتمر اسلامی کے قاہرہ اعلامیہ کے پیراگراف نمبر ۲ میں صراحت کی گئی ہے:

(ہر انسان کو شریعت کے دائرہ میں نقل وحرکت کرنے، آنے جانے، ملک کے اندر یا باہر مقام اقامت کا انتخاب کرنے اور جہاں اسے امن محسوس ہو سکونت اختیار کرنے کا حق حاصل ہے، اور اگر اس پر ظلم ہو تو دوسرے ملک میں پناہ لینے کا بھی اسے حق حاصل ہے، اور جس ملک میں وہ پناہ لینا چاہے اس ملک کو چاہئے کہ وہ اسے اس وقت تک پناہ دے جب تک اسے امن کی ضرورت ہو)۔

عام طور پر جنگ وجدال، بدامنی، فتنہ وفساد اور خانہ جنگیوں میں سب سے زیادہ عورتیں اور بچے ہی متأثر ہوتے اور وہی زیادتیوں کا شکار بنتے ہیں، اس لئے قرآن نے ان کی مدد کرنے کی بطور خاص تاکید کی ہے:

﴿وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلاً سَدِيْدًا﴾ (النساء:۹)۔

(لوگوں کو اس بات کا خیال کر کے ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے۔ پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں)۔

﴿وَمَا لَكُمْ لاَ تُقَاتِلُونَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ .... وَاجْعَل لَّنَا مِن لَّدُنكَ نَصِيْرًا﴾ (النساء:۷۵)۔

(آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر نہ لڑو جو کمزور پا کر دبا لیے گئے ہیں اور فریاد کر رہے ہیں کہ خدایا ہم کو اس بستی سے نکال جس کے باشندے ظالم ہیں، اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی حامی و مددگار پیدا کر دے)۔

﴿ إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ ..... وَكَانَ اللّٰهُ غَفُورًا رَّحِيْمًا﴾ (النساء ۹۸:-۱۰۰)۔

(ہاں جو مرد، عورتیں اور بچے واقعی بے بس ہیں اور نکلنے کا کوئی راستہ اور ذریعہ نہیں پاتے۔ بعید نہیں کہ اللہ انہیں معاف کر دے، اللہ بڑا معاف کرنے والا اور درگزر فرمانے والا ہے۔ اور جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لیے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لیے بڑی گنجائش پائے گا، اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کے لیے نکلے، پھر راستہ ہی میں اسے موت آ جائے اس کا اجر اللہ کے ذمے واجب ہو گیا، اللہ بہت بخشش فرمانے والا اور رحیم ہے)۔

ان نصوص کی روشنی میں نقل مکانی کرنے والے تارکین وطن اور پناہ گزینوں کی مدد کرنا اور خطرات سے دوچار ہو کر بھاگنے والوں کو پناہ دینا اور زندگی گذارنے کے لئے لازمی سہولیات مہیا کرنا واجب ہے خواہ یہ پناہ گزیں مسلم ہوں یا غیر مسلم، کیونکہ اسلامی تشریعات کی اساس وبنیاد عدل ہے، اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ .... وَاتَّقُوْا اللّٰهَ إِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌ بِمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (المائدۃ:۸)۔

(اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ

کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جا، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے)۔

ابن سبیل کے ضمن میں زکات وصدقات بھی ان پناہ گزینوں کو دیا جاسکتا اور اس سے ان کی ضروریات پوری کی جاسکتی ہیں، اسلامی شریعت کی نگاہ میں ان پناہ گزینوں کی میزبانی کرنے والے ملک کے اندر عورتوں، مردوں اور بچوں کو جو حقوق حاصل ہوں گے، انہیں جائدادوں کا مالک بننے، کاروبار کرنے، ملازمت کرنے، آزادی کے ساتھ آنے جانے اور اس طرح کے سارے حقوق حاصل ہوں گے:

﴿وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا مِنْ بَعْدُ وَهَاجَرُوْا ... إِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (الانفال:۷۵)۔

(اور جو لوگ بعد میں ایمان لائے اور ہجرت کر کے آ گئے اور تمہارے ساتھ مل کر جدوجہد کرنے لگے وہ بھی تم ہی میں شامل ہیں، مگر اللہ کی کتاب میں خون کے رشتہ دار ایک دوسرے کے زیادہ حقدار ہیں، یقیناً اللہ ہر چیز کو جانتا ہے)۔

اسی لئے اللہ کے نبی ﷺ نے مہاجرین وانصار کے درمیان مواخاۃ کرایا اور فرمایا:

”إن حقوق المهاجرين هي نفس حقوق من يستضيفونهم“

(مہاجرین کے حقوق وہی ہیں جو میزبانی کرنے والے انصار کے ہیں)۔

اسلامی تشریعات میں ان پناہ گزینوں کو تعلیم وصحت کا بھی حق حاصل ہوگا کہ انہیں میڈیکل سہولیات اور تعلیم حاصل کرنے کے مواقع مہیا کئے جائیں، یہ بھی ضروری ہے کہ ان پناہ گزینوں کو منتشر نہ ہونے دیا جائے، بلکہ ان کی شیرازہ بندی کی جائے اور حتی الامکان ایک خاندان کے افراد کو ایک جگہ رکھا جائے، اور میزبان ملک کی یہ بھی ذمہ داری ہوگی کہ ان کی سیاسی مدد کریں، اپنے وطن لوٹنے کی راہ ہموار کرنے میں اپنا رول ادا کریں، لیکن ایسا اسی وقت کیا جاسکتا ہے، جبکہ ان کی اپنے وطن کو واپسی مامون ومحفوظ ہو۔

خلاصہ:

گذشتہ تفصیل سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ دنیا کے کسی بھی مسلم یا غیر مسلم ملک میں بود وباش اختیار کر لینے سے انسان کو اس کی شہریت حاصل کر لینے کا حق حاصل ہوجاتا ہے، اور اس میزبان ملک کی ذمہ داری ہے کہ اپنی سرزمین پر آ کر بسنے والے شخص کو شہریت دے اور انہیں وہ تمام حقوق عطا کرے جو میزبان ملک کے قدیم شہریوں کو حاصل ہیں، اسی طرح اگر کوئی شخص اپنے ملک سے نقل مکانی کرنے پر مجبور ہوتا یا کسی مجبوری کی وجہ سے ترک وطن کر کے دوسرے ملک میں پناہ لیتا اور شہریت حاصل کرنے کی درخواست دیتا ہے تو اس درخواست کو قبول کرنا اس ملک کی اخلاقی ذمہ داری ہے، اس پر لازم

وضروری نہیں ہے، ملکی حالات ومفادات اور سیاسی تناظر میں درخواست قبول کرنے یا نہ کرنے کا ملک کو اختیار رکھتا ہے؛ البتہ اگر ملک میں شہریوں پر مظالم ہورہے ہوں، ان کی جان مال عزت وآبرو اور دین ومذہب خطرے میں پڑ گئے ہوں، اور اس کے تحفظ میں وہ کسی دوسرے ملک میں داخل ہوکر پناہ لیئے ہوں تو انہیں تمام تر شہری حقوق حاصل ہوں گے، اور اس ملک پر لازم ہوگا کہ وہ شہریت یا پناہ کے حصول سے متعلق ان کی درخواست کو قبول کرے۔

شہری حقوق میں وہ تمام حقوق شامل ہیں جو کسی بھی ملک کے باشندے کو حاصل ہوتے ہیں، جیسے ووٹ دینے، امیدوار بننے، ملازمت اختیار کرنے اور اس جیسے دیگر حقوق، ایک مسلمان غیر مسلم ملک کی شہریت مجبوری میں یا معاشی فوائد حاصل کرنے کے مقصد سے اختیار کرسکتا ہے مگر اسی وقت جبکہ وہاں اسے تمام مذہبی وفکری آزادی حاصل ہو، تاہم مسلمانوں کو اس سے گریز کرنا چاہئے کیونکہ اللہ کے نبی صلعم نے مسلمانوں کو غیر مسلم آبادی میں رہنے بسنے سے منع کیا اور فرمایا: ''لاترای نار اهما''اس سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو شہریت دی جاسکتی ہے، اسوۂ رسول اور صحابہ وخلفائے راشدین کا طرز عمل اس کی بہترین دلیل ہے، تاہم اس میں بھی حکمرانوں کو ملکی مفاد پیش نظر رکھنا چاہئے ملکی مفاد اگر متقاضی ہو یا اس کی اجازت دیتی ہو تو غیر مسلموں کو شہریت اور اس کے ساتھ تمام تر حقوق دئے جاسکتے ہیں، لیکن ان کا وجود اگر ملک کے مفاد میں نہ ہو یا خطرہ بنے تو انہیں شہریت دینا درست نہ ہوگا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مرتدین سے قتال کے لئے گیارہ دستے ترتیب دئے تھے، اور ہر دستے کا ایک افسر مقرر کیا تھا، انہیں جن باتوں کی ہدایتیں دی تھیں ان میں سے ایک یہ تھا:

''وأن يمنع أصحابه العجلة والفساد ، وأن يدخل فيهم حشوا حتى يعرفهم ويعلم ما هم لئلا يكونوا عيونا ، ولئلا يؤتى المسلمون من قبلهم''(جمہرۃ رسائل العرب۔ رسالہ ابی بکر)۔

یہ اپنے ساتھیوں کو جلد بازی، فساد و بگاڑ بدعنوانی و کرپشن سے روکین، اور اپنے اندر ہر کسی کو جیسے تیسے بھرتی نہ کرلیں، انہیں اسی وقت اپنے ساتھ شامل کریں جب انہیں خوب اچھی طرح جان پہچان لیں کہ وہ کون ہیں، تاکہ وہ ہمارے اندر دوسروں کے جاسوس نہ ہوں، اور اس لئے بھی کہ ان کی وجہ سے کفار کی جانب سے مسلمانوں پر کوئی افتاد نہ آجائے۔

☆☆☆

شہریت کے شرعی احکام

مولانا محمد توقیر بدر القاسمی☆

۱- سوال میں ''اسلام میں شہریت'' جیسی تعبیر سے اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ ہمیں مقالہ میں جواب دیتے وقت صرف اور صرف خالص ''اسلامی احکام'' کو بیان کرنا ہے، قطع نظر اس کے کہ دیگر مذاہب اور سماج میں کیا کچھ ہے؟ ملکی اور بین الاقوامی قوانین کے کیا مندرجات ہیں؟

چنانچہ اس کے لئے ہمیں کتاب اللہ، سنت نبویہ اور آثار صحابہ کے ساتھ ساتھ فقہاء امت کے اجتہادات سے ہی فائدہ اٹھانا ہے، سوال میں مذکورہ لفظ ''شہریت'' اصلا انگریزی لفظ {{Citizenships}} کا ترجمہ ہے جس کا سادہ سا مطلب ''کسی بھی ملک میں قانونی طور سے رہنے کا حق پانا'' ہے، جہاں اس کی اپنی کچھ شہری ذمہ داری ہوتی ہے اور اس ملک کے مطابق اس کے حقوق اور فرائض کو بجالانا ہوتا ہے (دیکھئے: انگلش کی معروف لغ: چیمبر ص ۲۸۰ اور السٹریٹید آکسفورڈ ڈکشنری ص ۱۳۲) اس میں خاص بات ہے ''کسی بھی ملک میں رہنا'' اس میں کافی وسعت ہے؛ کیونکہ ''رہنا یا قیام کرنا'' یا تو تجارتی سرگرمیاں یا بودوباش، یا پھر مخصوص مدت تک وہاں ٹھہرنا، الغرض کسی بھی مقصد سے ہوسکتا ہے۔

تاہم اسلام کی نظر میں ان میں سے کون سی چیز مسئولہ ''شہریت'' کے لئے بنیاد بن سکتی ہے، اس پر جب ہم غور کرتے ہیں تو اول مرحلہ میں قرآن کریم کی آیات مقدسہ ہماری راہ نمائی کرتی نظر آتی ہیں، بموقع ہجرت سورہ انفال ''والذین -آووانصروا أولئک ھم المومنون حقا'' (سورۂ انفال: ۷۴)، اور بموقع امتنان بنی اسرائیل کے حوالے سے سورہ یونس ''ولقد بوأنا مبوأ صدق'' (سورۂ یونس: ۹۳) یہ آیتیں صاف صاف اپنے سیاق وسباق کی روشنی میں ہمارے سوال کا بہت حد تک جواب فراہم کرتی ہیں، دونوں آیتوں کا مفاد یہی ہے کہ اصلا کسی ملک میں ایک مسلمان کا اس نیت اور مقصد سے کہ معاش ومعاد کو بہتر بناسکیں گے اس جگہ مستقل قرار پکڑنا اور ہمیشہ کے لئے سکون کے ساتھ ٹھہر جانا ہی عند اللہ پسندیدہ رہائش حالت کی دلیل ہے، جسے ہم آج ''شہریت'' کی بنیاد سے تعبیر کرسکتے ہیں۔

☆ متخصص: المعہد العالی پھلواری شریف، پٹنہ۔

''سنن ابی داؤد'' کتاب الملاحم کی ایک روایت میں اس کی تائید ملتی ہیں؛

"عن أبی الدرداء: أن رسول الله ﷺ قال: ان فسطاط المسلمین یوم الملحمه بالغوطة إلی جانب مدینة یقال لها: دمشق من خیر مدائن الشام"(ابوداؤد باب:۲/ ۵۹۰-۵۹۱ فی المعقل من الملاحم)۔

(حضرت ابودرداءؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنگ کے موقعہ پر مسلمانوں کا خیمہ (مرکز) دمشق نامی شہر کی جانب واقع مقام ''غوطہ'' ہوگا اور دمشق شام کے بہترین شہروں میں سے ہوگا)۔

اس حدیث میں ''فسطاط مسلمین'' (مسلمانوں کا خیمہ) قابل غور ہے، ظاہری بات ہے کہ ''خیمہ'' سے مراد رہائشی جگہ اور مقام ہی ہوسکتے ہیں، جہاں انسان اپنا سر اور تن چھپاتا ہے، اور اس کی نوبت اسی وقت آتی ہے، جب کوئی کہیں عارضی یا مستقل رہنے کا ارادہ اور عزم کرلے، البتہ جنگ کے موقع پر ایسا ہونا اور پھر اس مقام کی خصوصیت ''مقام خیر'' بتانا یقیناً دینی مقاصد اور اس کی بقا کو ہی ثابت کرتا ہے۔

چنانچہ فقہاء امت بھی بتلاتے ہیں کہ ''وطن اصلی'' سے مراد ایسا وطن ہے جہاں انسان پیدا ہوا ہو یا اس نے کسی اور جگہ کو مستقل جائے سکونت بنالیا ہو اور تادم زیست وہیں رہنے کا عزم ہو، اسے وہاں نماز کی تکمیل ہی کرنا ہوگی، صاحب ''بدائع'' یہی رقم کرتے ہیں:

"وطن أصلی وهو وطن الإنسان فی بلدة أو بلدة أخری اتخذها دارا أو توطن بها مع أهله وولده ولیس من قصده الا رتحال عنها، بل التعیش بها" (بدائع الصنائع ۱/ ۲۸۰)۔

اس لئے راقم کے نزدیک اصلاً کسی ملک میں ایک مسلمان کا اس نیت اور مقصد سے معاش ومعاد کو بہتر بناسکیں گے اس جگہ مستقل قرار پکڑنا اور ہمیشہ کے لئے سکون کے ساتھ ٹھہر جانا ہی، جو عنداللہ پسندیدہ رہائشی حالت کی دلیل بھی ہے، آج کی مطلوب ''شہریت'' کی بنیاد بھی قرار پائے گی۔

۲- مذکورہ سوال کا جواب ذرا تفصیل طلب ہے؛ یعنی اگر مسلمان ہے اور اس قدر مجبور ہے کہ اس کی جان ومال، عزت وآبرو اور دین سبھی خطرے کی زد میں ہو، تو آنے والے ملک کو دیکھا جائے گا اس کے لحاظ سے اس کا اور حکم ہوگا! اور اگر خواہش سے آنا چاہتا ہے تو پھر اس میں بھی ملکی اور خود اس کی حیثیت کے پیش نظر حکم اور ہوگا!

اگر ایک ''پرآشوب غیر مسلم'' ملک سے آنے والا مسلمان بحالت مذکورہ مجبوری دوسرے پرامن مسلم ملک میں بود وباش اختیار کرنے کی درخواست لے کر آتا ہے تو ایسی صورت میں اس پرامن مسلم ملک کے لئے اس کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے اس کی مدد کرنا اس پر شرعا واجب اور ضروری ہے، ''سورۂ انفال'' میں اس کی صراحت موجود ہے: "وإن

استنصروكم في الدين فعليكم النصر"(انفال:۷۲)۔

حضرت انسؓ حضور ﷺ کا فرمان نقل فرماتے ہیں:

"**قال رسول الله ﷺ: انصر أخاك ظالما أو مظلوما فقال رجل : يا رسول الله، انصره إذا كان مظلوما أفرايت إذا كان ظالما كيف انصره؟ قال: تحجزه، أو تمنعه، من الظلم فإن ذلك نصره**"(بخاری ۲/ ۱۰۲۸)۔

ابن حجرؒ اس کی متعدد سندوں سے وضاحت کو بیان کرتے ہوئے باب ''اعن اخاک ظالما یومظلوما'' کے تحت رقم فرماتے ہیں:

"**قوله في الطريق الثانية: قال: يا رسول الله في رواية أبى الوقت فى البخارى! قالوا، وفى الرواية التى فى الاكراه: فقال رجل: ولم أقف على تسمية قوله، فقال: تأخذ فوق يديه كنى به عن كفه عن الظلم بالفعل إن لم يكف بالقول وعبر بالفوقية إشارة إلى الأخذ بالاستعلاء والقوة**"(دیکھئے: فتح الباری ۵/ ۱۲۳، ۱۲۲)۔

قول رسول ﷺ بھی اسی بات کا درس دیتا نظر آتا ہے، کہ اس مجبور انسان کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً ضروری ہے، بشرطیکہ شہری وسائل اور رقبہ، نیز آبادی میں گنجائش اس کی اجازت دیتے ہوں، ورنہ "**لا يكلف الله نفسا إلا وسعها**"(بقرہ:۲۸۶) کے مطابق شرعاً واجب نہ ہوگا، بلکہ اس کے صواب دید پر موقوف ہوگا۔

اور اگر پرآشوب ''مسلم ملک'' سے منتقل ہوکر یہاں کی بود و باش کے لئے درخواست دے رہا ہو اور وہ بھی اسی طرح مجبور ہو، جیسا کہ آج اغیار کی ملی بھگت اور سازش کے نتیجے میں بعض مسلم ملکوں میں ایسی حالتیں پیش آرہی ہیں، تو اس صورت میں بھی حدیث مذکورہ کی وجہ سے مذکورہ حکم نافذ ہوگا۔

رہ گئی بات ''خواہش'' سے ہجرت کرنے کی؛ تو اس بات کا اعتراف تو ہر کوئی کرتا ہے کہ خواہش کسی نہ کسی بہتر اور برتر شی کی ہی کی جاتی ہے ورنہ وہ پھر عبث کام ٹھہرتا ہے جس کا صدور ایک عقلمند انسان سے بعید ہے، بہر حال اگر آنے والا کسی مجبوری کے بجائے خواہش سے آنا اور شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو دیکھا جائے گا کہ یہ شخص دینی خواہش رکھنے والا عالم دین اور متقی انسان ہے، یا یوں ہی دین کے علاوہ کسی اور مقصد سے آنا چاہتا ہے، اگر دینی مزاج کا حامل اور علم دوست شخص ہے تو اس کے آنے، نیز یہاں کی یکسوئی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کی تقریر وتحریر کے ذریعہ عوام کی بھلائی اور راہ نمائی کا کام انجام پانا متوقع ہو تو احقر کے نزدیک ایسے صالح فرد کی درخواست کو قبول کرنا بھی قول باری تعالی:

"ولا تطرد الذین یدعون ربهم بالغداۃ والعشی یریدون وجهه ما علیک من حسابهم من شئ وما من حسابک علیهم من شئ فتطردهم فتکون من الظالمین "(انعام:۵۲)۔

(انہیں اپنی مجلس سے محروم نہ کیجئے جو رات و دن اپنے پروردگار کو پکارتے رہتے ہیں اور ان کی خوشنودی میں لگے ہوئے ہیں، ان کے حساب میں سے کسی بھی چیز کا بار آپ پر نہیں اور آپ کے حساب میں سے کسی بھی چیز کا باران پر نہیں، اس پر بھی اگر انہیں اپنی مجلس سے محروم کریں گے تو آپ کا شمار ظالموں میں ہوگا) کی روشنی میں واجب اور ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۳- پناہ اور اسی کے ساتھ ساتھ پناہ گاہ، نیز پناہ گزیں یہ سبھی اپنے مالہ اور ماعلیہ کے ساتھ آج کی مغرور اور متکبر اور نام نہاد مہذب دنیا کی پیداوار ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان اصطلاحات کی تعریفات ان ہی کتابوں میں ملتی ہیں، پناہ(Refuge) کے بارے میں السٹر یٹیڈ آکسفورڈ ڈکشنری میں درج ہے:

A place or state of safety from danger or trouble

اور پناہ گزیں کے بارے میں ہے:

(Refugee: person who has been forced to leave their country because of war or because they are being persecuted for their beliefs: pg:564)

ان کی لغات میں اس کا حقیقی مفہوم سمجھیں! مذکورہ عبارتیں صاف صاف بتارہی ہیں کہ پناہ گزین وہ شخص ہوتا ہے جس کو اپنا ملک چھوڑنے پر مجبور کردیا جائے، یا اس کے عقائد کے حوالے سے اسے اتنا ستایا جائے کہ مجبورا اپنا ملک چھوڑ کر اس خطرے اور پریشانی سے دور کسی مامون و محفوظ جگہ یا حکومت کی پناہ لے لے، جس (ستائے جانے اور عقیدہ پر مجبور کرنے) کا اسلام میں کوئی تصور نہیں، ہاں ان اہل ایمان وصاحب قرآن کی کتابوں میں اگر کوئی لفظ ہے تو اس کے لئے صرف اور صرف ''ہجرت'' جیسا مقدس لفظ دکھائی دیتا ہے، وہ بھی بحیثیت مظلوم نہ کہ ظالم!

اور مہاجر ومظلوم کے حوالے سے صرف اتنا ہے کہ اگر کسی مومن کے ساتھ ظلم ہوا ہے تو دنیا کے تمام مومنوں کا اپنی اپنی حیثیت کے مطابق "لا یکلف اللہ نفسا إلا وسعها " (بقرہ:۲۸۶) کے تحت نہ صرف اخلاقی، بلکہ دینی فریضہ اس کی دادرسی کرنا ہے، علامہ جصاص رازی ''احکام القرآن'' میں رقم کرتے ہیں: یعنی نصرت کی نفی جو کی گئی تھی وہ اللہ تعالی کا فرمان ''تمام مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے حمایتی ہیں'' کے حوالے سے منسوخ ہوگئی (التوبۃ :۷۱، احکام القرآن للجصاص ۳؍۹۸)۔

اسی کے ساتھ علامہ قرطبی مالکیؒ رقم کرتے ہیں: ''الثانیة (قوله تعالی: وان استنصروکم فی الدین فعلیکم

النصر)یرید ان یدعوا هولاء المومنون الذین لم یهاجروا من أرض الحرب عونکم بنفیر أو مأل لا ستقناذهم فأعینوهم فذلک فرض فلا تخذلوهم" (قرطبی ۷، ۸/۲۷)، اس تفصیل کے مطابق مجبور مسلمان کی دادرسی کو دوسرے خوشحال مسلمان حکومت وافراد پر جان اور مال سے فرض قرار دیا گیا ہے۔

نیز حضرت انسؓ حضور علیہ السلام کا فرمان نقل کرتے ہیں:

"قال رسول الله ﷺ: انصر أخاک ظالما أو مظلوما فقال رجل : یا رسول الله، انصره إذا کان مظلوما افرایت إذا کان ظالما کیف انصره؟ قال: تحجزه، أو تمنعه، من الظلم فإن ذلک نصره" (بخاری ۲/۱۰۲۸)۔

اگر کسی مومن کے ساتھ ظلم ہوا ہے تو دنیا کے تمام مومنوں کا اپنی اپنی حیثیت کے مطابق نہ صرف اخلاقی، بلکہ دینی فریضہ اس کی دادرسی کرنا ہے، اور نہ یہ کہ صرف مظلوم کی دادرسی ہے، بلکہ اس میں ظالم کی مدد بھی کارفرما ہے جو صرف اسلام کی نمایاں خصوصیت میں سے ہے، نیز سوال اول میں یہ بات تفصیل سے بیان کی جاچکی ہے کہ "شہریت" کے لئے مذکورہ آیت اور روایت ہی کافی ہے، اس لئے ایک مسلم ملک کے حکمراں کا اپنے ایک پریشان حال مسلمان کے لئے باوجود گنجائش کے قدیم باشندوں کی طرح سہولت نہ دینا اور شہریت سے محروم رکھنا راقم کی نظر میں شرعاً غلط اور نادرست ہے، کیونکہ اگر ایسا نہیں کرتے ہیں تو ہم اسلام کے پیروکار کے بجائے غیر اسلامی امور کے پیروکار کہلائیں گے اور قرآن وحدیث، نیز فقہاء کرام کے اجتہادات سے منحرف ٹھہریں گے، اسی لئے شرعاً لازم ہے کہ مسلم ملک گنجائش کی شکل میں اس کو شہریت اور اس کی تمام سہولتیں عطا کرے۔

اگر لوٹنا ممکن ہی نہیں، بلکہ اس کے لئے تمام تر کوششیں اور کارروائیاں انجام دے رہا ہو تو لوٹتے وقت تک اس کی دادرسی کرنا جہاں شرعاً لازم ہے وہیں اخلاقی طور سے بحیثیت مہمان اس کا اکرام بھی مطلوب و مستحسن ہے (دیکھئے: فتح الباری ۱۰/۶۵۳، احکام القرآن للجصاص رازی ۳/۲۵۷)۔

۴- اگر شہریت اختیار کرنے والا خود مسلمان ہے اور ملک بھی مسلمانوں کا ہے تو اس کو جصاص رازی حنفی کی تفصیل کے مطابق وہاں مذکورہ تمام حقوق حاصل ہوں گے، "ونسخ نفی إیجاب النصرة بقوله تعالی: "والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولیاء بعض" (توبہ: ۷۱)۔

یعنی نصرت کی نفی جو کی گئی تھی وہ اللہ تعالی کا فرمان "تمام مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے حمایتی ہیں" کے حوالے سے منسوخ ہو گیا، اور مدد کرنا شرعاً لازم اور ضروری ہے (سورۂ انفال: ۷۴، مع احکام القرآن للجصاص ۳/۹۸)، کیونکہ

اگر ایسا نہیں کیا گیا تو روئے زمین پر فساد بھیانک شکل میں پھیل سکتا ہے، جیسا کہ اس کی وضاحت بھی خود قرآن کریم کے اندر اسی سورہ کی اگلی آیت میں موجود ہے، خود علامہ جصاص رازی اس کی وضاحت یوں رقم کرتے ہیں: ''**قوله تعالى ''إلا تفعلوه تكن فتنة فى الأرض وفساد كبير''والله اعلم، إن تفعلوا ما أمرتم به فى هاتين الآيتين من إيجاب الموالاة والتناصر والتوارث بالأخوة والهجرة ومن قطعها بترك الهجرة تكن فتنة فى الأرض وفساد كبير وهذا مخرجه مخرج الخبر ومعناه الأمر**''(احکام القرآن للجصاص ۹۸/۳)اور ''**إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل إن الله نعما يعظكم به إن الله كان سميعا بصيرا**''(سورۂ نساء:۵۸)۔

مذکورہ آیات کی روشنی میں راقم کی یہی رائے ہے کہ اس مہاجر (پناہ گزیں) کو ایک شہری ہونے کے ناطے قدیم شہری کی طرح شہریت عطا کرنے کے بعد تمام تر سہولتیں: جیسے ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتال میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق وغیرہ جو ضروری ہیں مہیا کرنا شرعاً ضروری ہے، ان میں اور قدیم شہری میں کسی بھی طرح کی تفریق پیدا کرنا جہاں شریعت کے خلاف ہے وہیں کسی مہذب سماج اور انسانیت کے بہی خواہ کہلانے والے ملک و معاشرہ کے ماتھے پر بھی کلنک ہے، بالخصوص اس وقت جب کہ اقوام متحدہ، یوروپی کونسل، یونیسکو اور عالمی لیبر جیسی تنظیمیں بار بار اس طرح کے مساوات کی قراردادیں پاس کر کے سرخرو ہونے کا موقع پا رہی ہو۔

۵- اس سوال کا جواب مسلم پناہ گزین کی صورت میں مختصراً یوں دیا جا سکتا ہے کہ جب گذشتہ قرآنی آیات اور احادیث کی روشنی میں یہ طے ہو چکا کہ اپنے سابق ملک نہ لوٹ سکنے والے اس ستم رسیدہ مسلمان کو شرعاً بشرط سہولت شہریت کا درجہ دیا جانا واجب ہے، تو اس کے طے ہو جانے کے بعد اس کو تمام حقوق ملنا بھی طے ہو جاتے ہیں، لہذا اس میں کسی بھی طرح کی تفریق کیا جانا احقر کی رائے میں نامناسب معلوم ہوتا ہے۔

ہاں البتہ حالات اور امکانات ایسے ہوں کہ ان کا واپس اپنے سابق ملک میں لوٹ جانا واضح ہو تو ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ ان کی حیثیت ایک مہمان کی ہے، ان کے اپنے سابق ملک لوٹتے وقت تک اس کی دادرسی کرنا جہاں شرعاً لازم ہے وہیں اخلاقی طور سے بحیثیت مہمان اس کا اکرام بھی مطلوب و مستحسن ہے، جیسا کہ حضور ﷺ نے ایک مومن کی شان یہی بتلائی ہے: ''**عن أبى هريرة،قال: قال رسول الله ﷺ: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره،**

ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه، ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليقل خيرا أو ليصمت"(بخاری ۲/ ۸۸۹)۔

اسی کے ساتھ ساتھ اس مسلم پناہ گزیں کو بھی پناہ گزینوں سے متعلق ان تمام قوانین کی پابندی کرنی ہوگی جس کی صراحت اس ملک کے دستور میں ہوگی، تاکہ "**أوفوا بالعهد إن كان مسئولا**"(بنی اسرائیل:۳۵) کی خلاف ورزی نہ ہو، اور اگر پناہ گزیں غیر مسلم ہو تو اس کا تفصیلی جواب سوال ۷ کے جواب میں آرہا ہے۔

۶- ایک مسلمان کے لئے دنیا میں کہیں بھی کسی بھی ملک میں کس طرح زندگی گذارنی ہے؟ اس کی ہدایت دوٹوک انداز میں آپ ﷺ نے رہتی دنیا تک کے لئے دے دی ہے، چنانچہ اگر کوئی انتہائی مجبوری میں کسی غیر مسلم ملک کو مامون اپنے لئے سمجھتا ہے تو اس کی پناہ لینے یا شہریت اختیار کرنے میں شرعا کوئی حرج نہیں ہے، اس سلسلہ میں آپ ﷺ کا وہ فرمان کافی ہے جس میں ستائے جانے والے مسلمین مکہ کے لئے ہجرت حبشہ کا حکم صادر ہوا تھا، حضرت ابوموسیٰؓ فرماتے ہیں:

"**قال فدخلت أسماء بنت عميس، وهي ممن قدم معنا، على حفصة زوج النبي ﷺ زائرة، وقد كانت هاجرت إلى النجاشي فيمن هاجر إليه، فدخل عمر على حفصة، وأسماء عندها، فقال عمر حين رأى أسماء: من هذه؟ قال: أسماء بنت عميس، قال عمر: الحبشية هذه؟ البحرية هذه؟ فقالت أسماء: نعم، فقال عمر: سبقناكم بالهجرة، فنحن أحق برسول الله ﷺ منكم، فغضبت، وقالت كلمة: كذبت يا عمر كلا، والله كنتم مع رسول الله ﷺ يطعم جائعكم، ويعظ جاهلكم، وكنا في دار، أو في أرض البعداء البغضاء في الحبشة، وذلك في الله وفي رسوله، وايم الله لا أطعم طعاما ولا أشرب شرابا حتى أذكر ما قلت لرسول الله ﷺ، ونحن كنا نؤذى ونخاف، وسأذكر ذلك لرسول الله ﷺ وأسأله، ووالله لا أكذب ولا أزيغ ولا أزيد على ذلك، قال: فلما جاء النبي ﷺ قال: يا نبي الله إن عمر قال: كذا وكذا، فقال رسول الله ﷺ ليس بأحق بي منكم، وله ولأصحابه هجرة واحدة، ولكم أنتم، أهل السفينة، هجرتان**"(مسلم شریف رقم الحدیث ۲۵۰۳، ۲/ ۳۰۴)، اس روایت میں صحابیہ کا "**ونحن كنا نؤذى ونخاف**" کہنا اوران کا حبشہ کو "دار البعداء البغضاء" سے تعبیر کرنا بقول شارح مسلم امام نوویؒ "**وكنا في دار البعداء البغضاء، قال العلماء البعداء في النسب، البغضاء في الدين؛ لأنهم كفار**"(۲/ ۳۰۴) ہمارے نظریہ کی تائید کرتا نظر آتا ہے۔

تاہم تمام تر دینی و دنیوی امن وسکون میسر ہونے کے بعد بھی اگر کوئی محض کسی معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلک

ملک میں بود و باش اختیار کرنا چاہے تو ایسی صورت میں راقم کے نزدیک شرعا یہ محظور وممنوع ہوگا اس کی دلیل مصنف ابن ابی شیبہ کی وہ روایت ہے جس میں آپ ﷺ نے اپنے صحابہ کی ایک جماعت کو قبیلہ خثعم کی مہم پہ روانہ کیا تھا اور جب مسلمان غالب آئے تو کچھ لوگوں (ان میں گھلے ملے مسلمانوں) نے سجدہ کر کے (خود کو ایمان والا ظاہر کر کے) ان صحابہ کرام کے ہاتھوں سے بچنا چاہا، مگر اس کے باوجود بھی ان کے ہاتھوں کچھ لوگ قتل ہو گئے، اس کی خبر جب آپ ﷺ کو ملی تو آپ ﷺ نے اپنی ناراضگی اور مشرکوں و کافروں کے درمیان گھل مل کر رہنے والے مسلمان سے اپنی براءت کا اظہار کیا، البتہ ان کی نصف دیت بھی دلوادی (مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰/۲۸۶، رقم الحدیث: ۳۶۶۳۰)۔

دیت کا فیصلہ بھی بقول امام شافعیؒ بطور تطوع کے تھا، آئندہ اگر کوئی مسلمانوں کے ہاتھوں اسلامی مہم میں مارا گیا تو اس کی کوئی دیت ہوگی نہ اس کے اولیاء شرعا لازمی طور سے قصاص کے مطالبہ کے حقدار ہونگے، اس کی وضاحت بزبان امام شافعیؒ بحوالہ امام بیہقیؒ یوں ہے:

”**قال الشافعي: إن كان هذا ثبت فأحسب النبي ﷺ، والله أعلم أعطى من أعطى منهم متطوعا، وأعلمهم أنه بريء من كل مسلم مع مشرك، والله أعلم، في دار شرك ليعلمهم أن لا ديات لهم ولا قود، قال الشيخ الفقيه رحمه الله:وقد روي هذا موصولا**“ (السنن الکبری للبیہقی رقم الحدیث ۱۶۹۳۸، ۱۲/۲۳۰-۲۳۱، مصنف ابن ابی شیبہ ۲۰/۲۸۶، رقم الحدیث ۳۶۶۳۰) ممکن ہے کوئی نام نہاد روشن خیال آج جہاد کا انکار کرتے ہوئے ان سب باتوں کی تردید کرے تاہم فرقہ وارانہ فسادات اور گھلی ملی آبادی پر اس کے نتائج بد سے تو آج بچہ بچہ واقف ہے، اس لئے معاشی فوائد کی صورت میں غیر مسلم ملک کے اندر شہریت اختیار کرنا اس بات کے پیش نظر کہ نہ جانے وہ کب تعصب اور تشدد کا شکار ہو جائے؛ راقم کے نزدیک شرعا یہ محظور وممنوع ہے۔

۷- مذکورہ سوال کا جواب سورہ ممتحنہ میں بخوبی موجود ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ”**لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم فى الدين ولم يخرجوكم من دياركم ان تبروهم وتقسطوا اليهم ان الله يحب المقسطين**“ (ممتحنہ: ۸) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چند مخصوص شہروں، مثلاً مکہ، مدینہ اور یمامہ کے اطراف کو چھوڑ کر کسی بھی مسلم ملک میں بود و باش غیر مسلم اختیار کرسکتا ہے اور انسانیت اور ”امت دعوت“ نیز اگر وہ کسی مسلمان کا رشتہ دار ہو تو صلہ رحمی کے پیش نظر اس کو یہ موقع فراہم کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اس دعوت دین اور ایک مسلمان کے لئے اپنے رشتہ دار سے صلہ رحمی سے بڑھ کر اور کوئی بر و احسان ان کے حق میں نہیں ہو سکتا ہے۔

اس کی تفسیر میں علامہ ابن کثیرؒ احادیث کی روشنی میں اس بابت لکھتے ہیں: ”**قوله تعالى: ”لا ينهاكم الله“**

الآية وأخرج الطيالسي وأحمد والبزار وأبويعلى وابن جرير وابن المنذر وابن أبي حاتم والنحاس في تاريخه والحاكم وصححه والطبراني وابن مردويه عن عبد الله بن الزبير قال: قدمت قتيلة بنت عبد العزى على ابنتها ٠ سماء بنت أبي بكر بهدايا ضبابوأقط وسمن وهي مشركة فأبت أسماء أن تقبل هديتها أو تدخلها بيتها حتى أرسلت إلى عائشة أن سلي عن هذا رسول الله ﷺ فسألته فأنزل الله (لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين) إلى آخر الآية فأمرها أن تقبل هديتها وتدخلها بيتها وأخرج البخاري وابن المنذر والنحاس والبيهقي في شعب الإيمان عن أسماء بنت أبي بكر قالت: أتتني أمي راغبة وهي مشركة في عهد قريش إذا عاهدوا رسول الله ﷺ فسألت النبي ﷺ أصلها فأنزل الله (لا ينهاكم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين) فقال: نعم صلي أمک'' (تفسیر علامہ ابن کثیر، بخاری ۱/۴۲۹)۔

البتہ مذکورہ شہروں کا استثناء دراصل سورہ توبہ کی آیت:۲۸''**إنما المشركون نجس فلا يقربوا المسجد الحرام بعد عامهم هذا**''(توبہ:۲۸) کی بنا پر کیا گیا ہے۔

اور جہاں تک ان مسلم ملکوں میں ان کو ملنے والے سیاسی حقوق (Political Rights) کی بات ہے تو اس سلسلہ میں صاف واضح ہے کہ مسلمانوں کے برابر ان کو کلیدی مناصب (Key Positions) جو قانون سازی سے تعلق رکھتے ہوں، ان پر بحال نہیں کیا جا سکتا، مولانا مودودی صاحب اس فلسفہ پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم کرتے ہیں:

''اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں ریاست کے نظام کو چلانا مسلمانوں کی ذمہ داری ہے اور مسلمان اس بات پر مامور ہیں کہ جہاں بھی ان کو حکومت کے اختیارات حاصل ہوں وہاں وہ قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق حکومت کا نظام چلائیں چونکہ غیر مسلم نہ قرآن وسنت کی تعلیمات پر یقین رکھتے ہیں اور نہ اس کی اسپرٹ کے مطابق ایمانداری سے کام چلا سکتے ہیں (دیکھئے: رسائل ومسائل ۴/۲۲۲)۔ بہر حال سورہ یوسف (۴۰) اور سورہ نساء (۱۴۱) میں مذکورہ نظام کی وضاحت موجود ہے، علامہ قرطبی ان آیتوں کے ذیل میں رقم فرماتے ہیں: کہ انہیں اس طرح نہ دخیل بنالیں کہ وہ ہمارے اسلامی آثار وحکومت یا پھر ہماری جان ومال کی ہلاکت کے فیصلے کر کے آپ ﷺ کی منہ مانگی مراد اور منصوبہ خداوندی کو انگوٹھا دکھائے جیسا کہ آج کرہ ارضی پر موجود پارلیمانی دستوروں کے حوالے سے ان سب حقائق کا پتہ لگانا دشوار نہیں ہے، علامہ کی عبارت کے لئے ملاحظہ فرمائیں: (قرطبی ۵/۲۶۹)۔

البتہ جہاں تک مدنی حقوق (Civil Rights) کے حوالے سے ان کی مذہبی آزادی، جان ومال اور عزت وآبرو

کی حفاظت، نیز بنا کسی شرانگیزی کہ محض دلائل کے بنیاد پر تعلیم وتبلیغ اور حصول انصاف کی بات ہے تو اس کی اجازت پورے طور سے ان کو ملے گی اور اسی کے ساتھ ساتھ وہ تعزیری قوانین اور اسلامی دستور کے مطابق تمام حدود کے بھی پابند ہوں گے، اس کی بنیاد بھی راقم کے نزدیک باری تعالی کا وہ ارشاد ہے: "**إن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل إن الله نعما يعظكم به إن الله كان سميعا بصيرا**" (سورۂ نساء:۵۸) اور امام قرطبی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: "**والأظهر في الآية أنها عامة في جميع الناس فهي تتناول الولاة فيما إليهم من الأمانات في قسمة الأموال ورد الظلامات والعدل في الحكومات**" (قرطبی ۵/۱۶۵)۔

اور امام ابوداوؒد نے روایت نقل کی ہے: "**عن عبد الله بن عمر، أن رسول الله ﷺ قال: ألا كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته، فالأمير الذي على الناس راع عليهم، وهو مسئول عنهم**" (ابوداوٗد ۲/۴۰۶)۔

مذکورہ وضاحت کے پیش نظر راقم کی حقیر رائے بھی یہی ہے کہ غیر مسلم کو حسب گنجائش وسہولت ارض حجاز (مکہ، مدینہ، یمامہ) کو چھوڑ کر بقیہ روئے زمین پر پھیلے ہوئے مسلم ممالک میں مذکورہ حقوق وفرائض کے ساتھ شہریت مل سکتی ہے۔

☆☆☆

حصول شہریت کے موجودہ مسائل

مولانا ریحان مبشر قاسمی☆

۱- آج ہم جس دور میں زندگی گزار رہے ہیں یہ عہد ماضی سے بالکل مختلف ہے، نت نئی ایجادات واکتشافات، معیار زیست کی بالیدگی وبلندی، ان سب سے بڑھ کر پورے عالم کا ایک گاؤں میں متشکل ہوجانا ہے، پہلے جہاں ایک ملک سے دوسری جگہ جانے کے لئے تصور مشکل تھا آج آن واحد میں انسان ان دوریوں کو طے کرلیتا ہے، اور لوگوں کا سیر وتفریح و تجارت ومعیشت حصول علم اور علاج ومعالجہ کے لئے دوسرے ممالک کا سفر کرنا عام بات ہے۔

ظاہر بات ہے کہ کوئی بھی ملک ہر کس وناکس کو اپنی خارجی اور اندرونی پالیسی کے سبب ملک میں قیام کرنے کی اجازت یا اسے مستقل شہری تسلیم نہیں کرسکتا، ورنہ اجتماعیہ کے تعلق سے بہت سارے مسائل سے دوچار ہونا پڑسکتا ہے اور اس صورت میں ملک کے داخلی نظام کو متوازن رکھنا مشکل ہوسکتا ہے، لہذا ضرورت پڑتی ہے کہ کچھ ایسے معیار واصول واساس کی جس کے ذریعہ کسی فرد کو اجنبی ملک میں رہنا سہل ہو، یہ معیار اور قوانین خطوں اور ممالک کے اعتبار سے مختلف ہیں، لیکن مسلمان ہونے کے ناطے ہم پر ذمہ داری ہوگی کہ ان کو ہم اسلام کی کسوٹی پر پرکھیں، یا اسلام کا جو اپنا معیار ہے اس کو واضح کریں اسی سلسلے میں یہ تحریر چشم گزار کی جاتی ہے:

جو طریقے حصول شہریت کے عموماً رائج ہیں، پہلے انہیں تحریر کیا جاتا ہے، اس کی روشنی میں اسلامی معیار کو اخذ کرنا سہل ہوجائے گا۔

بنیادی طور پر شہری دوقسم کے ہیں: ۱- قدرتی (Natural)، ۲- مصنوعی، بنایا ہوا (Naturalised) قدرتی سے مراد وہ شہری ہیں جنہیں پیدائش کے ذریعہ شہریت کے حقوق حاصل ہوں، اور مصنوعی سے مراد وہ لوگ ہوتے ہیں جو کسی ملک میں بودوباش اختیار کر کے شہری بنیں، پیدائش کے ذریعہ شہریت حاصل کرنے کے بھی دو اصول ہیں: ایک جائے پیدائش یا جنم بھومی کی بنیاد پر دوسرے آبائی حق یا خونی رشتے کی بنیاد پر، جائے پیدائش کے اعتبار سے شہریت کے حصول کے لئے یہ

☆ جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ میرٹھ (یوپی)۔

دیکھا جائیگا کہ وہ بچہ کہاں پیدا ہوا؟ اس میں والدین کی شہریت سے بحث نہیں ہوتی کہ وہ کس ملک کے باشندے ہیں، اس اصول پر ارجنٹائنا میں عمل ہوتا ہے، چنانچہ اس اصول کے مطابق اگر انگریز والدین کا بچہ ارجنٹائنا میں پیدا ہوتو وہ ارجنٹائنا کا شہری تسلیم کرلیا جاتا ہے اور اسے وہ ساری مراعات ملتی ہیں جو ایک ارجنٹائنا کے شہری کو دی جاتی ہے، لیکن اگر ارجنٹائنا کے والدین کو برطانیہ میں بچہ پیدا ہوتو حکومت ارجنٹائنا اس نوزائیدہ کو اپنا شہری تسلیم نہیں کرتی، اگر خون کے رشتے کو دیکھا جائے تو مثلاً فرانسیسی والدین کو اگر ہندوستان میں بچہ ہوتو وہ فرانسیسی ہوگا، اسی طرح اگر ہندوستانی ماں باپ کو فرانس میں بچہ ہوتو وہ ہندوستانی ہوگا فرانسیسی شہریت اور اس کی مراعات سے وہ محروم رہے گا، زیادہ تر مملکتیں شہریت کے تعلق سے اسی خونی رشتے کو معیار مانتی ہیں، مگر بعض ممالک جن میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور برطانیہ قابل ذکر ہیں دونوں، اصول پر کاربند ہیں، ہمارے ملک میں شہریت حاصل کرنے کے لئے خونی رشتے اور جنم بھومی دونوں اصول پر عمل ہے، چنانچہ تقسیم ہند کے بعد پاکستان سے آنے واے افراد کو ہندوستان نے اپنا شہری تسلیم کیا۔

شادی: شادی بھی شہریت حاصل کرنے کا معیار تسلیم کی جاتی ہے، چنانچہ ہندوستان کا آدمی امریکہ میں اقامت کے دوران کسی امریکن عورت سے شادی کرلے تو اس ہندوستانی مرد کو امریکہ کا شہری اور اس عورت کو ہندوستانی شہری تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

جائز اولاد قرار دینا:

کسی شہری باپ اور غیر ملکی ماں کے ناجائز بچے کو خاص قانون کے ذریعہ جائز اولاد قرار دیا جاتا ہے اور اس بچے کو وہی شہریت حاصل ہوتی ہے جس ملک کا اس کا باپ رہنے والا ہو۔

زمین کی خریداری:

زمین کی خریداری سے بھی بعض جگہ شہریت حاصل کی جاتی ہے، چنانچہ کسی ملک میں اگر اجنبی شخص زمین خرید لے تو وہ اس جگہ کا شہری کہلانے لگتا ہے۔

سرکاری ملازمت کا حصول:

کچھ ملکوں میں ان غیر ملکیوں کو بھی اپنا شہری تسلیم کیا جاتا ہے جو کسی سرکاری ملازمت کو حاصل کرلیں یا ان کا کسی سرکاری عہدہ پر تقرر ہو جائے۔

معاشی سرگرمی انجام دینا:

اگر کوئی شخص کسی ملک کی معاشی حالت کو سدھارنے میں کلیدی رول ادا کرے یا وہاں قوم وملت کے مفاد کے تحت

معاشی سرگرمی انجام دے تو اس کو بھی شہری تسلیم کرلیا جاتا ہے۔

اقامت:

بسا اوقات کوئی غیر ملکی کسی ملک میں ایک خاص مدت تک یا مستقلا سکونت اختیار کرلے تو اسے بھی شہریت کے حقوق عطا کردیئے جاتے ہیں، برطانیہ اور امریکہ میں اس کی مدت غالبا پانچ برس اور فرانس میں دس برس ہے (ماخوذ اصول سیاسیات رص ۱۳۵، ڈاکٹر ہاشم قدوائی)۔

ملک کا انضمام:

اگر کوئی ملک یا اس کا کوئی حصہ کسی دوسرے ملک سے زمینی اعتبار سے مل جائے تو ملنے والے ممالک کے شہریوں کو اسی ملک کا شہری تسلیم کیا جاتا ہے جس ملک کے ساتھ انضمام ہوا ہو۔

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان اصولوں پر طائرانہ نظر:

شہریت کے حصول کے لئے پہلا: جنم بھومی اور جائے پیدائش والا معیار بہت واضح ہے اور اس کو اختیار کرنے میں بڑی سہولیت بھی، مگر اسے معیار بنانے کی صورت میں بعض دفعہ بڑی دقت پیش آسکتی ہے، مثلاً فرانسیسی والدین کے یہاں اگر امریکہ میں بچہ پیدا ہو تو اس نوازئیدہ کو دونوں جگہ کی شہریت ملتی ہے اور جنگ کے دوران دونوں ممالک اس فوج میں بھرتی ہونے کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔

اسلامی نقطہ نظر سے یہ معیار درست معلوم ہوتا ہے، کیونکہ جائے پیدائش کو بھی شریعت میں بڑا دخل حاصل ہے اور اس سے احکامات تبدیل ہوتے ہیں چنانچہ اتمام وقصر کے سلسلے میں فقہاء کرام جائے ولادت کو وطن اصلی سے تعبیر کرتے ہوئے اسے حقیقی وطن قرار دیتے ہیں، اور اس پر اتمام کو واجب کرتے ہیں، خواہ وہاں پندرہ دن قیام کی نیت نہ رہی ہو، جائے ولادت کو اس کا وطن ماننے میں فقہاء کی عبارت بہت صراحت کے ساتھ وارد ہوئی ہے، ''درمختار'' میں ہے:

''**الوطن الأصلي هو موطن ولادته أو تأهله أو توطنه**''(الدر)''(**الوطن الأصلی) وسیمی بالأهلي ووطن الفطرة والقرار**''(الدر المختار مع رد المحتار ۲/ ۶۱۴ کتاب الصلاۃ باب صلاۃ المسافر طبع زکریا)۔

دوسرا معیار شادی کے ذریعہ شہریت حاصل کرنے کا ہے، اسلامی نقطہ نظر سے یہ معیار بھی درست معلوم ہوتا ہے، بشرطیکہ ملکی مصالح کے خلاف نہ ہو اور اس سلسلے میں مبسوط کے اس جزئیہ سے راہ نمائی ملتی ہے:

اگر کوئی حربیہ مستامنہ کسی مسلمان یا ذمی سے شادی کرلے تو وہ دار الاسلام اس کا وطن ہوتا ہے اور وہ ذمیہ بن جاتی ہے''**الحربية المستأمنة إذا تزوجت مسلماً أو ذميا فقد توطنت وصارت ذمية**''(مبسوط ۱۰/ ۸۴ کتاب السیر

باب فی توظیف الخراج دارالمعرفۃ بیروت) سعودی عرب میں اس اصول پر شہریت دے دی جاتی ہے:

"نصت المادة:١٦ من نظام الجنسية العربية السعودية لسنة:١٣٧٤ھ تكتسب المرأة الأجنبية بالزواج جنسية زوجها السعودي" (احکام الذمیین:٦٣٦ الدکتور عبدالکریم الزیدان)۔

لیکن دوسرے جمہور عرب ممالک میں بعض شرائط کا اضافہ ہے کہ عورت وزیر داخلہ کے پاس شہریت حاصل کرنے کی درخواست دے، اور وزیر داخلہ اس کی درخواست کو رد نہ کردے اور اعلان کے بعد زوجین میں کم از کم دو سال تک نکاح باقی رہے۔

تیسرا اصول جائز اولاد قرار دینا ہے: یہ اصول قواعد اسلامیہ پر منطبق نہیں، کیونکہ شریعت ایسی اولاد کو ثابت النسب نہیں مانتی، "الولد للفراش وللعاهر الحجر" (مبسوط ١٧/٢٩ طبع دارالمعرفہ بیروت)، لہذا تعلقات یا ناجائز تعلقات سے پیدا ہونے والے بچے کو محض والدین کے کہنے سے باپ سے اس کا نسب ثابت نہیں ہوسکتا اور جب اس کا ثبوت ہی اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے تو اس کو معیار بنانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اسی طرح زمین کی خریداری، سرکاری ملازمتوں کا حصول اور معاشی سرگرمی انجام دینے کو بھی بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، کیونکہ یہ ٹھوس معیار یا مستحکم اصول نہیں ہے اور اسے اختیار کرنے میں بہت سارے مسائل سامنے آسکتے ہیں، جہاں تک معاشی سرگرمی انجام دینے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں خلیفہ دوم سیدنا حضرت عمر فاروقؓ کا عمل یہ رہا ہے کہ مدینہ منورہ میں جو نصاری تجارت کی غرض سے آتے تھے آپ انہیں تین دن سے زائد رکنے نہیں دیتے تھے، اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاشی سرگرمی اصول نہیں بن سکتی۔

کسی ملک یا شہر کا دوسرے ملک کے ساتھ انضمام ہوجائے تو دونوں ایک ملک کے شہری بن سکتے ہیں اس میں بظاہر کوئی اشکال نظر نہیں آتا اور نہ اس کو اختیار کرنے میں کسی دقت کے سامنے آنے کا امکان ہے، ہاں تسلیم نہ کرنے میں مشکلات ضرور پیش آسکتی ہیں۔

رہ گیا اقامت کا مسئلہ تو محدود مدت تک قیام معیار نہیں بن سکتا، البتہ مستقل رہنے کا عزم ہو اور وہاں سے کوچ کرنے کا ارادہ نہ ہو تو یہ چیز اصول بن سکتی ہے اور اس سلسلے میں نبی کریم علیہ السلام کے اس فرمان سے استدلال کیا جاسکتا ہے جس میں آپ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص کسی شہر میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے لگے تو وہ اس کے باشندوں میں سے ہوجاتا ہے "من تأهل ببلدة فهو من أهلها" (شرح السیر الکبیر ١/١٢٠)۔

یہ حدیث اگرچہ نماز کے قصر واتمام کے تعلق سے ہے کہ جو شخص کسی شہر میں مستقلا رہنے لگے تو وہ اس جگہ کا باشندہ

ہوگا اور اس پر اتمام کرنا ضروری ہوگا، مگر حدیث کے عمومی لفظ سے زیر بحث مسئلہ پر بھی استدلال ممکن ہے۔

وطن بننے کے لئے وہاں مستقل رہنے، او وہاں سے کوچ نہ کرنے کی شرط فقہاء کے اس قول کی وجہ سے لگائی گئی ہے: ''**فلو كان له أبوان ببلد غير مولده وهو بالغ ولم يتأهل به، فليس ذلک وطنا له إلا إذا عزم على القرار فيه، وترک الوطن الذي كان له قبله**'' (ردالمحتار ۲/ ۶۱۴ طبع زکریا)۔

تنبیہ: جن صورتوں میں شہریت کا حصول جائز ہے یا بالفاظ دیگر وہ معیار بن سکتی ہیں، ان تمام میں یہ شرط ملحوظ رہے گی کہ ان کی وجہ سے قومی، ملکی اور ملی مصالح متاثر نہ ہوں، اسی طرح رعایا کے لئے پریشانی کا باعث نہ ہوں، نیز ان سے عوام کو ضرر لاحق نہ ہو، کیونکہ امام المسلمین کے تصرفات مصلحت پر موقوف ہوتے ہیں، مشہور قاعدہ ہے:

''**تصرف الامام على الرعية منوط بالمصلحة**'' (الاشباہ ۱/ ۳۲۱، الفن الاول: القاعدۃ الکامسۃ طبع ادارۃ القرآن کراچی)۔ شہریت کے حصول کے مقابل ایک بحث اس کے منسوخ ہونے کی بھی ہے کہ کن صورتوں میں شہریت کو منسوخ کیا جاسکتا ہے؟ احقر نے اس سلسلے میں بھی کچھ صورتیں مسودہ میں تحریر کی ہیں، مگر موضوع سے متعلق نہ ہونے اور طوالت کے خوف سے اس کو ترک کردیا ہے۔

۲- غیر مسلم ملک یا مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان جو اپنی مجبوری کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنے کا متمنی ہو تو مطلوبہ ملک پر درخواست قبول کرنے کے سلسلے میں تفصیل ہوگی وجوب، عدم وجوب میں سے علی الاطلاق کسی ایک جانب کو راجح قرار نہیں دیا جائے گا۔

مجبوری دو قسم کی ہوسکتی ہے: دنیاوی مجبوری، شرعی مجبوری۔

دنیاوی مجبوری یہ ہے کہ آدمی جس ملک میں مقیم ہے اس کو وہاں بہتر روزگار کے مواقع فراہم نہیں، مگر اسے فقر و فاقہ کی نوبت نہیں، کسی دوسرے جائز ذرائع سے عزت کی روٹی کما کر اپنے طبقہ کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گزارنے پر قادر ہے، نیز اس ملک میں مذہبی آزادی حاصل ہے اور شعائر اسلام کو ادا کرنے پر کوئی پابندی نہیں محض ایمانی غیرت وحمیت اور معیار زندگی کو بلند کرنے کے لئے بہتر نوکری کی تلاش میں مسلم ملک میں رہنے کا متمنی ہے اور اس کی شہریت کے حصول کے لئے درخواست دیتا ہے تو ایسے آدمی کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً واجب وضروری نہیں ہے، کیونکہ اس صورت میں اگر درخواست قبول کرنے کو واجب قرار دیا جائے تو اس مسلم ملک کو بہت ساری دقتیں پیش آئیں گی، اور ملک کے انتظامی امور میں خلل واقع ہوگا اور متوازن حکومت برقرار رکھنے میں کافی حرج ہوگا، اسی طرح اگر کسی کی خواہش اور آرزو مسلم ملک میں رہنے کی ہو اور اس کو اپنے ملک میں بہتر روزگار بھی حاصل ہو اور مذہب پر عمل کی آزادی بھی ہو تو ایسے شخص کی درخواست پر بھی

حکومت اپنی صوابدید پر فیصلہ کرسکتی ہے، قبول کرنا واجب نہ ہوگا، ہاں ایسے شخص کی مذکورہ آمد قابل احترام اور باعث اجروثواب ضرور ہوگی، سعودی اور دیگر عربی ممالک میں اسی پر عمل ہے کہ حکومت اپنے صوابدید پر فیصلہ کرتی ہے:

"والمعمول بها حاليا فى الدول الإسلامية كالعربية المتحدة والعراق والسعودية ان عقد الذمة وهو يقابل منح الجنسية بطريق التجنس متروک لتقدير الحكومة، فلها أن ترفض الطلب ولها أن توافق عليه، وهذا الاتجاه لا يخالف أحكام الشريعة ؛لأن الإمام له سلطة النظر في الأمور العامة منها: النظر في منح الأجنبى جنسية الدولة"(احکام الذمیین:۳۱)۔

شرعی مجبوری: اس کے مختلف درجات اور صورتیں ہیں: اس مضمون کو ہجرت کے اقسام سے اخذ کیا جاسکتا ہے، ہجرت کی بنیادی طور پر چند قسمیں ہیں: پہلی قسم وہ ہے جو فتح مکہ سے قبل فرض تھی اور فتح مکہ کے بعد اس کا حکم منسوخ ہوگیا، تفصیل اس کی یہ ہے کہ جب نبی ﷺ نے بحکم الٰہی مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی، اس وقت ہجرت پر قدرت رکھنے والوں کے لئے ہجرت کرنا نہ صرف فرض عین تھا، بلکہ یہ ایمان کی علامت سمجھی جاتی تھی، چنانچہ جو کوئی ہجرت پر قادر ہونے کے باوجود ہجرت نہ کرتا اس کو مسلمان نہیں سمجھتے تھے، اور اس کے ساتھ وہی معاملہ ہوتا جو کفار کے ساتھ ہوا کرتا تھا، اس کا بیان سورہ نساء (۸۹) میں ہے: **"حتى يهاجروا في سبيل الله"**، مگر جب مکہ مکرمہ فتح ہوگیا تو ہجرت کا یہ حکم بھی منسوخ ہوگیا، کیونکہ اس کے بعد مکہ مکرمہ خود دارالاسلام بن چکا تھا، اس وقت رسول اکرم ﷺ نے یہ حکم بیان فرمایا: **"لا هجرة بعد الفتح"**، یعنی فتح مکہ کے بعد اب ہجرت کی ضرورت نہیں، اس طرح اس ہجرت کا فرض ہونا، پھر منسوخ ہونا خود نصوص سے ثابت ہے۔

ابن حجر علیہ الرحمہ نے اس پورے واقعہ سے چند مسائل کا استخراج کیا ہے، ان کو اگر قواعد حنفیہ کی روشنی میں دیکھا جائے تو وہ اس سے متعارض نہیں، بلکہ من کل الوجوہ میل کھاتے نظر آتے ہیں:

جس شہر یا ملک میں مسلمانوں کو اپنے دین پر قائم رہنے کی آزادی نہ ہو، وہ کفر وشرک یا احکام الٰہیہ کی خلاف ورزی پر مجبور ہوں ایسے مقامات سے اگر ہجرت کرنے پر آدمی کو قدرت ہو تو اس کے لئے کسی ایسی مامون جگہ کا انتخاب کرنا واجب ہوگا جہاں شعائر اسلام کو آزادی کے ساتھ انجام دیا جاسکتا ہو اور جس دارالکفر میں احکامات پر عمل کرنے میں پابندی نہ ہو تو وہاں سے ہجرت فرض نہیں، مستحب اور مستحسن ہے اور جو ہجرت پر قادر نہ ہو قید ہونے کی وجہ سے یا معذوری کی وجہ سے تو اسے اس جگہ رہنا جائز ہوگا۔

"أما قبل فتح البلد فمن به من المسلمين أحد ثلاثة: الأول: قادر على الهجرة منها لا يمكنه إظهار دينه، إلا أداء واجابته، فالهجرة فيه واجبة، الثانى قادر ؛لكنه يمكنه اظهار دينه، وأماء واجباته

فمستحبة لتكثير المسلمين بها، الثالث: عاجز يعذر من أسرأ ومرض أوغيره، فتجوز له الإقامة ، فإن حمل على نفسه وتكلف الخروج منها أجر"(فتح الباری:۶/۲۲۰)۔

یہی مضمون ابن قدامہ حنبلی علیہ الرحمہ نے (المغنی ۱۳/۱۵۱) پرذکر کیا ہے جس کو آگے ذکر کیا جائے گا، لہذا کوئی ایسا ملک جہاں پر مسلمانوں کو اپنی مذہبی آزادی حاصل نہ ہو کفر وشرک یا احکامات شرع کی خلاف ورزی پر انہیں مجبور کیا جاتا ہو ایسے لوگوں کو اگر وہاں سے نکل جانے پر قدرت ہو تو وہاں سے خروج ضروری ہوگا اور دارالاسلام یا اسلامی ملک سے بہتر کوئی اور موزوں جگہ نہیں، اگر ان کے علاوہ کہیں اور جگہ نہ مل سکے اور ہر جگہ کفر وشرک اور مذہب پر پابندی عام ہو تو اس درخواست کو اسلامی ممالک کے لئے قبول کرنا ضروری ہوگا، اسی طرح اگر کہیں بھی روزگار نہ ملے اور آدمی کو فقر وفاقہ کی نوبت آپہنچے اور کوئی ملک پناہ دینے پر آمادہ نہ ہو یا پناہ دے سکتا ہو، مگر وہاں مذہبی آزادی حاصل نہ ہو اور ایسا بے روزگار آدمی اسلامی ملک میں رہنے کی درخواست دے تو اس کی درخواست کو بھی قبول کرنا ضروری ہوگا، کہ بے سہارا افراد خاص کر مسلم حضرات کی اعانت اور ان کا تعاون ہمارا اسلامی فریضہ ہے اور ایک طرح سے یہ سنت انصار کو زندہ کرنا ہے، جن کے لئے قرآن کریم میں واضح لفظوں میں مغفرت کی بشارت دی گئی ہے۔

۳-شہری تسلیم نہ کئے جانے کی دوصورت ہے:

۱-صرف کاغذی طور پر وہ شہری نہ ہوں، باقی ساری سہولیات انہیں فراہم ہو۔

۲-شہری حقوق سے ان کو محروم رکھا جائے، اگر پہلی صورت ہو کہ صرف کاغذی طور پر شہری تسلیم نہ کئے جاتے ہوں، مہاجرین میں ان کا شمار ہوتا ہو، مگر وہ شہری معاشی اخلاقی جن کا بیان جواب ۴ میں ہے، انہیں وہ سارے حقوق حاصل ہوں تو بظاہر اس میں کوئی اشکال معلوم نہیں ہوتا، البتہ اگر ان کو ان بنیادی حقوق سے محروم کردیا جائے تو یہ جائز نہیں ہے، ہاں اگر انہیں سیاسۃ مصلحۃ سیاسی حقوق سے محروم کردیا جائے، مثلاً ووٹ نہیں دے سکتے، الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتے، تو اس کی گنجائش ہوسکتی ہے، جیسا کہ سوڈان اور ہمارے ملک ہندوستان میں اس پر عمل ہوتا آرہا ہے، البتہ اعلی بات یہ ہوگی کہ "**یوترون علی أنفسهم ولو كان بهم خصاصة**" (سورۂ حشر:۹) کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے ساتھ نہ صرف مساوات برتی جائے، بلکہ خصوصی حقوق کو بھی پاس کرالیا جائے، تاکہ وہ خوف وہراس سے نکل کر پرسکون زندگی جی سکیں جیسا کہ انصار مدینہ نے مہاجرین مکہ کے ساتھ معاملہ کیا تھا۔

۴-انسانی معاشرہ کو خوشگوار بنانے کے لئے حقوق واجبات طے کرلینا کام کو سہل بنا دیتا ہے، شریعت بھی اسے پسندیدہ نگاہ سے دیکھتی ہے، بشرطیکہ ان حقوق کو طے کرنے میں اللہ تعالی کی رضامندی کو ملحوظ رکھتا ہو اور دوسرے افراد کی ایذاء

رسائی سے محفوظ رکھا گیا ہو۔

سوالنامے میں جن حقوق کا تذکرہ کیا گیا ہے، اسلام کی رو سے سماج میں رہنے والے شہری کو حاصل ہوں گے یا نہیں؟ اس کا جواب اسی وقت آشکارا ہوسکتا ہے جب حقوق کی ماہیت وحقیقت کھل کر سامنے آئے، معاشرہ میں بسنے والے افراد کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ باہمی تعاون، اخوت ومساوات ایثار وقربانی کے جذبے سے سرشار ہوکر زندگی گذاریں، کیف ما اتفق لوگوں کے لئے دل آزاری کا سبب بن کر نہیں، مشہور حدیث ہے: حقیقت میں کامل مومن وہی ہے جس کے دست و لسان سے آدمی محفوظ رہ سکیں: ''**المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ**'' (مسلم: کتاب الایمان، باب بیان تفاضل الاسلام) اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہر شخص کو سوچنے یا کام کرنے کی اپنی فطری صلاحیتوں کو پوری طرح سے کام میں لانے کی آزادی حاصل ہو، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب دوسرے افراد اس آزادی کو تسلیم کریں بغیر اس کے معاشرتی زندگی کا تصور مشکل ہے، ان ہی آزادی اور سہولتوں کو حقوق سے تعبیر کیا جاتا ہے، جب تک یہ فرد کو حاصل نہ ہوں گے، اس وقت تک آدمی نہ تو اپنی شخصیت کی تعمیر کرسکتا ہے اور نہ دوسرے افراد اس کی خوابیدہ صلاحیتوں سے مستفیض ہوسکتے ہیں، اگر یہ سہولیات مخصوص افراد کو حاصل ہوں اور شہر کی اکثریت اس سے محروم رہے تو اسے مراعات کا نام دیا جاتا ہے، اسے حقوق کہنا مشکل ہے۔

حقوق کے حوالے سے درج ذیل چار نظریئے ملتے ہیں:

۱- قدرتی حقوق کا نظریہ: یہ نظریہ سب سے قدیم ہے، اس کا حاصل یہ ہے کہ حقوق قدرت کا عطیہ ہیں جو انسان کو پیدا ہوتے ہی حاصل ہوتے ہیں، ان کو سلب نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی ان پر کسی قسم کی پابندی لگائی جاسکتی ہے، یہ حقوق تب سے حاصل ہیں جب اسٹیٹ کا قیام عمل میں نہ آیا تھا اور زمانہ فطری تھا۔

حقوق کا تاریخی نظریہ: اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حقوق اسٹیٹ کی پیداوار ہیں اور وہی ان کا خالق ہے، لہذا جن حقوق کو وہ تسلیم کرے صرف انہیں کا اعتبار ہوگا۔

حقوق کا سماجی فلاحی نظریہ: ان کا ماحصل یہ ہے کہ حقوق کا انحصار پچھلی تواریخ پر ہے اور حقوق تاریخ ہی کی پیداوار ہیں اور ان کی بنیاد رسم ورواج ہیں۔

حقوق کا عینی یا فرد کی شخصیت کا نظریہ: اس نظریئے کے مطابق حقوق وہ سہولتیں ہیں جو فرد کی شخصیت کی ترقی کے لئے ضروری ہوں، حقوق فرد کو اس لئے دیئے جاتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذہنی، جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے ترقی دے، اسی میں سارے سماج کی ترقی ممکن ہے، یہ نظریہ حقوق کو اخلاقی نقطہ نگاہ سے دیکھتا ہے، موجودہ جمہوری مملکتوں میں شہریوں کے بنیادی حقوق کے سلسلے میں مستقل باب ہیں، جن سے حکومت اپنے شہریوں کو محروم نہیں کرسکتی، اور اگر کرے تو شہریوں کو ان

حقوق کی بازیابی کے لئے عدالتی چارہ جوئی کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔

سوال نامے میں جوحقوق مذکورہ ہیں یا جوذکر کرنے سے رہ گئے ان تمام حقوق کو بنیادی طور پر چار قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

۱-قدرتی حقوق: اس سے مراد وہ حقوق ہیں جو انسان کو دنیا کی ابتداء سے حاصل ہیں، ان کے بغیر زندگی گذارنے کا تصور ممکن نہیں، ان میں سرفہرست حق حیات، حق مساوات اور انصاف پانے کا حق ہے۔

۲-اخلاقی حقوق: وہ ہیں جنہیں دوسرے انسان تسلیم کرتے ہوں اور حکومت بھی ان کا احترام کرتی ہو، مثلاً مصیبت زدگان کی مدد کرنا۔

۳-قانونی حقوق: وہ حقوق جن کی پشت پر قانون ہوتا ہےاور حکومت بزور طاقت اسے منواتی ہے۔

۴-معاشی حقوق: اس سے مراد وہ حقوق ہیں جنہیں بروئے کار لاکر انسان اپنی روزی روٹی کا انتظام کرسکے ان بنیادی حقوق کے ضمن میں کچھ ذیلی حقوق بھی آتے ہیں، جنہیں (نقشہ صفحہ نمبر:) پر تحریر کیا جاتا ہے:

زندگی کا حق:

ہر شخص کو اس دنیا میں رہنے کا حق حاصل ہے، اور کسی مملکت یا اسٹیٹ کو اسے سلب کرنے کا اختیار نہیں، اسی وجہ سے قتل کو ایک سنگین جرم بتلایا گیا ہے کہ ایک فرد کے قتل سے گویا پوری انسانیت کی موت ہوتی ہے، عقلی طور پر اس حق کا ملنا سمجھ میں آتا ہے، کیونکہ انسان کو جانی تحفظ جب مل نہ پائے اور وہ خطرات میں رہتے ہوئے زندگی بسر کرے تو اس کو چین وسکون نصیب نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی کام، خواہ ذاتی ہو کہ قومی، ملکی ہو یا عالمی، مناسب طریقہ سے انجام دیا جاسکتا ہے، اس لئے حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسے قوانین وضع کریں جس سے کسی بھی فرد کے لئے زندہ رہنے کا حق پورے طور پر حاصل ہوسکے، اس لئے تمام ممالک میں ناحق قتل کی سزا نہایت سنگین اور بہت سخت رکھی گئی ہے، اس حق کو درج ذیل دلائل سے ثابت کیا جاسکتا ہے: ”**من قتل نفسا بغير نفس أو فساد فى الأرض فكأنما قتل الناس جميعا**“ (مائدہ:۳۲) اسی طرح دوسروں کے قتل بجائے خود اپنے کو قتل کرنے اور خودکشی کو شریعت بری نگاہ سے دیکھتے ہوئے اسے بھی جرم عظیم قرار دیتی ہے:

”**ولا تقتلوا أنفسكم إن الله كان بكم رحيما، ومن يفعل ذلک عدوانا وظلما فسوف نصليه نارا وكان ذلک على الله يسيرا**“ (نساء:۲۹)۔

ارشاد نبوی ہے: ”**من قتل نفسه بحديدة فحديدته بيده يتوجأبها (يضرب بها) فى نار جهنم خالدا مخلدا فيها أبدا**“ (بخاری: کتاب الطب باب شرب السم والدواء به)۔

قتل وغارت گری کو روکنے اور حق حیات برقرار رکھنے کے لئے شریعت نے فسادیوں کے لئے سخت سزائیں تجویز کیں، اور اس کے بالمقابل حیات انسانی کے تحفظ کو پوری انسانیت کی تعمیر سے تعبیر کیا ہے، "**من أحياها فكأنما أحيا الناس جميعا**" (مائدہ:۳۲)۔

دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں جس کی مذہبی کتابوں میں کسی ایک فرد کے قتل کو ساری انسانیت کے قتل اور کسی ایک فرد کو بچانے کو ساری انسانیت کو بچانے کے مرادف بتلایا گیا ہو، یہ اسلام کے امن پسند ہونے کی واضح اور بین دلیل ہے۔

مساوات وبرابری کا حق:

بنو آدم سب کے سب برابر ہیں، کسی کو کسی پر فوقیت نہیں، اس لئے عوام حق مساوات سے مستفیض ہوں گے، حکومت کی ذمہ داری ہوگی وہ سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے، ذات پات، رنگ وروپ سے ماوراء ہر ایک کے لئے قانون برابر ہوں گے، اقرباء پروری اور روابط کی وجہ سے بھید بھاؤ نہ ہوگا، اس کی دلیل درج ذیل ہے:

"**قال رسول الله ﷺ: لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ولا الأسود على أحمر إلا بالتقوى**" (مسند احمد: حدیث رجل من أصحاب النبی ﷺ الرقم:۲۲۳۹۰)۔

احکام کو نافذ کرنے میں کسی سفارش کو دخل نہ ہوگا، خواہ وہ کتنا ہی قریبی کیوں نہ ہو، قانون سب کے لئے برابر ہوں گے، مشہور واقعہ ہے کہ کسی عورت نے چوری کر لی تھی تو لوگوں نے حضرت اسامہ سے اس سلسلے میں تخفیف کے لئے سفارش کرنے کو کہا، انہوں نے جا کر سفارش کی تو آپ ﷺ ان کی بات سن کر بہت غصہ ہوئے اور فرمایا: اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا (بخاری ابواب الحدود، باب کراہیۃ الشفاعۃ فی الحدود)۔

انصاف پانے کا حق:

ہر شخص کو انصاف پانے کا بھی مکمل حق حاصل رہے گا، تاکہ انسانیت کی تکریم سلامت رہے، اس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے: "**إن الله يأمر بالعدل والإحسان**" (نحل:۹۰) (اور لوگوں سے مطالبہ کیا ہے کہ فیصلہ کے وقت انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں)۔

"**وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل**" (نساء:۵۸)۔ حتی کہ دشمنوں کے ساتھ بھی عدل وانصاف کا حکم دیا گیا ہے کہ ایسے افراد کے بارے میں فیصلہ کرتے وقت دشمنی کا ظہور نہ ہونے پائے جس سے ناانصافی وجود میں آئے، ارشاد خداوندی ہے: "**ولا يجرمنكم شنان قوم على أن لا تعدلوا، إعدلوا هو أقرب للتقوى**" (مائدہ:۸)۔

شہری حقوق کا بیان:

اس میں زندہ رہنے کا حق سب سے مقدم ہے، اس کا بیان قدرتی حقوق کے ضمن میں گذر چکا ہے۔

جائداد یا ملکیت کا حق:

مال ومتاع اور جائداد کی محبت فطرت انسانی میں ودیعت کی گئی ہے اوران کے حصول کے لئے انسان انتھک کوشش کرتا ہے، اورخون پسینہ بہا کر اموال اور جائداد کی ذخیرہ اندوزہ کرتا ہے، اس لئے اس بات کا حق ملنا چاہئے کہ ان جائداد و املاک میں اس کی ملکیت ثابت ہو اور اس سے نفع اٹھا سکے، شہریوں کے لئے اچھی زندگی گزارنا اسی وقت ممکن ہوگا جب انہیں اطمینان ہو کہ انہیں ان کے املاک سے محروم نہ کیا جائے گا ان اموال پر ان کی اجارہ داری قائم ہوگی، اس حق کی وجہ سے مملکت کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ ہر شہری کی جائداد اور املاک کی حفاظت کرے اور اس کے تئیں قوانین وضع کرے، اسی وجہ سے اگر کوئی شخص کسی کے اموال کی چوری کرتا ہے تو حکومت اسے گرفتار کر کے سزا دیتی ہے، اس حق کے ثبوت کو اسلام کے قانون میراث سے اخذ کیا جا سکتا ہے، کیونکہ متوفی کے اموال میں وراثت جاری ہونے کا مفہوم ملکیت کو متضمن ہے، نیز نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: کسی کا مال کسی کے لئے اس کی رضامندی کے بغیر حلال نہیں۔

"**ألا لا يحل مال امرئ إلا بطيب نفس منه**" (مشکاۃ ۲۵۶ کتاب البیوع بالغصب العاریۃ)، نیز آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

"**فإن دمائكم وأموالكم وأعراضكم بينكم حرام كحرمة يومكم هذا، فی شهركم هذا، فی بلدكم هذا**" (بخاری: کتاب العلم، قول النبی: رب مبلغ أوعی من سامع)۔

حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک بلیغ اور جامع خطبہ دیا تھا، مذکورہ حدیث اسی خطبے حجۃ الوداع کے موقع پر آپ ﷺ نے ایک بلیغ اور جامع خطبہ دیا تھا، مذکورہ حدیث اسی خطبے کا ایک ٹکڑا ہے، اس حدیث میں آپ نے اموال کو دوسرے پر حرام قرار دیا ہے، یہ اس بات کا غماز ہے کہ مالک کی اس میں ملکیت قائم ہے۔

۵- خاندانی زندگی کا حق:

شہریت کے حقوق میں سے ایک حق خاندانی زندگی کا حق ہے، اس کے تحت آدمی کو پوری آزادی ہوتی ہے کہ وہ ایک خاندانی زندگی گذارے، کسی کی مداخلت کئے بغیر اپنی رائے سے شادی کرے، اور اولاد کی پرورش وتربیت کرے، ان کو تعلیم دلائے اور خاندان والوں کے ساتھ تعاون وامداد کا معاملہ کرے، ضرورت کے موقع پر حکومت ان چیزوں کے تعلق سے قانون بھی بنا سکتی ہے، بشرطیکہ وہ اسلامی تعلیمات کے منافی اور مغائر متضاد نہ ہو، مثلاً ہمارے ہندوستان میں اٹھارہ سال سے

کم عمر کی لڑکی کی شادی قانونا جرم ہوتی ہے، اور طلاق کی صورت میں عدت کے بعد بھی نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر ہی عائد ہوتی ہے، گوکہ یہ قانون شہریت کے مخالف ہے۔

آزادی تحریر وتقریر اور اظہار رائے کی آزادی کا حق:

جن ممالک میں جمہوری نظام قائم ہے وہاں اس حق کی بڑی اہمیت ہوتی ہے، کیونکہ جمہوریت کی بنیاد ہی رائے عامہ پر ہوتی ہے، اس حق کے مطابق ہر شہری کو آزادی کے ساتھ اپنی رائے کے اظہار کا حق بذریعہ تحریر وتقریر حاصل ہوتا ہے بشرطیکہ اس سے کسی طبقے کے مذہبی جذبات مجروح نہ ہوں، یا کسی مخصوص فرد کی ہتک عزت نہ ہوتی ہو، ان جمہوری ممالک میں اگر عوام سے یہ حق سلب کرلیا جائے تو وہ معاشرتی اور سماجی زندگی میں حصہ نہیں لے سکتے اور یہ چیز جمہوریت کے حق میں نہیں جاتی، بلکہ اس کو شدید نقصان پہنچاتی ہے۔

البتہ اگر اضطراری حالات میں ملک کا تحفظ اس سے خطرے میں بڑے یا بغاوت کا اندیشہ ہو، یا مختلف اہل مذاہب کے درمیان نفرت وعداوت پھیلے تو حکومت اس پر عارضی طور پر پابندی عائد کرسکتی ہے۔

نوٹ: واضح ہو کہ یہ حق اسلامی طرز حکومت کے اسلوب کے خلاف ہے۔ کیونکہ جمہوریت کا نظام اسلام کے نظامہائے حکومت سے میل نہیں کھاتا، مسلمان اس پوزیشن میں نہیں ہیں کہ اس نظام کو بدل دیں اور متبادل نظام کو فروغ دیں، مجبوری کے حالات میں اس نظام کو قبول کیا جاسکتا ہے۔

تفصیل ''سیاسی حقوق'' کے ضمن میں انشاءاللہ آئے گی۔

مذہبی آزادی کا حق:

شہریوں کے حقوق میں ایک حق مذہبی آزادی کا ہے، اس حق کی وجہ سے تمام لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے اور شعائر کو انجام دینے کی اجازت ہوگی، جمہوری ملک میں بسنے والے افراد کو حکومت یہ حق عطا کرتی ہے، اور ان کے مذہبی امور میں مداخلت نہیں کرتی، اور نہ کسی فرقے پر اس کا مذہب چھوڑنے کا پابند کرتی ہے، یہ مذہبی آزادی شریعت کے بھی منافی نہیں، کیونکہ اسلام نے بھی غیر مسلموں کو ان کے مذہب پر چھوڑ دیا ہے، مشہور قاعدہ ہے: ''**نترک وما یدینون**'' (بحر ۸/۲۲۲ طبع زکریا) اسی لئے فقہ اسلامی میں ''احکام الذمیین'' کا مستقل باب قائم کیا جاتا ہے، اس حق کے ثبوت پر درج ذیل دلائل قائم کئے جاسکتے ہیں:

''**لکم دینکم ولی دین**'' (کافرون:٦) ہر ایک کے لئے علاحدہ علاحدہ دین ہے اور اس اختیار کو سلب کرنے کے سلسلے میں سورہ بقرہ کی (آیت نمبر ۲۵۶) نازل ہوئی کہ کسی کو دین میں زبردستی داخل نہیں کیا جاسکتا، ''**لا إکراہ فی**

الدین"(سورۂ بقرہ:۲۵۶)، نیز فرمایا گیا:"أفأنت تکرہ الناس حتی یکونوا مؤمنین"(یونس:۹۹)حتی کہ دوسرے مذاہب کے شعار اوران کے معبودان باطلہ کو برا کہنے سے بھی منع کیا گیا ہے۔

"ولا تسبوا الذین یدعون من دون الله فیسبوا الله عدوا بغیر علم"(انعام:۱۰۸)ان تمام دلائل سے یہ بات ثابت ہوئی کہ جمہوری ملک میں بسنے والے انسان یا اسلامی مملکت میں بسنے والے غیر مسلمین کو مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔

۸-قانونی برابری کا حق:

شہریوں کے حقوق میں سے ایک حق قانونی برابری کا ہے،اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون سارے شہریوں کے لئے یکساں ہو،ذات پات،رنگ ونسل یا کسی اور بنا پر ان کے ساتھ کسی قسم کی تفریق نہ ہو،امیر اور غریب سب کے لئے یکساں قانون ہو،اس لئے کہ اگر ان میں تفریق ہونے لگے یا دوہرا میعار برتا جانے لگے تو حقیقی آزادی ختم ہوجائے گی اور قانون جانبدارانہ بن جائے گا،نتیجۃً معاشرہ میں بدامنی پھیلے گی اور چین وسکون کے ساتھ رہنا دوبھر ہوجائے گا،اس کے مقابل اگر حکومت قانونی مساوات کو سامنے رکھ کر خاطی ومجرم کو سزا دے تو معاشرہ پھلے پھولے گا اور امن کی فضا ہموار ہوگی،اس حق کے بغیر شہریوں کو انسانوں کی طرح جینا مشکل ہوجائے گا۔

تنبیہ شریعت اسلامیہ نے غلام اور آزاد کے درمیان فرق کیا ہے،مراعات اور حدود وسزاؤں میں تفریق ہے،اس لئے اگر اسلامی تناظر میں مذکورہ حق کو دیکھا جائے تو وہ آزاد آدمی کے ہوں گے۔اس حق پر درج ذیل حدیث شاہد بن سکتی ہے:

"لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطع محمد یدها"(بخاری کتاب الحدود باب کراہیۃ الشفاعۃ فی الحدود)۔

اسی طرح حدود کے سلسلے میں وہ ساری آیات جو رنگ ونسل اور ذات پات سے پرے عمومی الفاظ کے ساتھ نازل ہوئی ہیں قانونی برابری کے حق میں دلیل بن سکتی ہیں،مثلاً:

"ولکم في القصاص حیاة یا أولي الألباب"(سورۂ بقرہ:۱۷۹)۔

"الزانیة والزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة"(سورۂ نور:۲)۔

"السارق والسارقه فاقطعوا أیدیهما جزاء بما کسبا نکالا من الله"(سورۂ مائدہ:۳۸)۔

۹-تعلیم حاصل کرنے کا حق:

شہریوں کے لئے حصول تعلیم کا حق ثابت کیا جائے گا،اور حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ اپنے شہریوں کی تعلیم کا

انتظام کرے، کیونکہ امی اور ناخواہ افراد سے کسی معاشرے یا حکومت کی ترقی متصور نہیں، اسلام نے اپنے آغاز ہی سے تعلیم پر مکمل ضرور دیا ہے، چنانچہ جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی، وہ علم ہی سے متعلق ہے، فرمایا گیا: "اقرأ باسم ربک الذی خلق" (علق:۱) (پڑھئے اس رب کے نام سے جس نے آپ کو پیدا کیا ہے)، نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

"**طلب العلم فريضة على كل مسلم ،وفيي رواية، مسلمة**" (مرقاۃ ۱/ ۲۸۴، نقاب العلم طبع امدادیہ) علم کا طلب کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے۔

ضروریات دین کے بقدر علم دین سیکھنا جس سے حرام وحلال کی تمیز ہو، فرائض وواجبات سے آگہی ہو فرض ہے، یہ اسی وقت ممکن ہے جب کسی مملکت میں شہریوں کو حصول تعلیم کا حق دیا گیا ہو، حصول تعلیم کا یہ حق سارے شہریوں کو یکساں ملے گا، رنگ ونسل کے اعتبار سے تفریق نہ ہوگی اور ہر طبقے کے افراد اس سے بہرہ ور ہوں گے، اور اپنی آرزو کے مطابق تعلیم حاصل کرنے کے مجاز۔

۱۰- تاسیس بزم اور کمیٹی بنانے کا حق:

شہریوں کو اپنے مقاصد کو بروئے کار لانے اور اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انجمنوں کے قیام یا اپنے پیشہ وحرفت یا متعلقہ ذمہ داری کے تعلق سے کمیٹی کے قیام کی اجازت ہوگی، اس حق کے تحت کسی مذہب کے مخصوص افراد اپنی مذہبی انجمنیں یا کسی مخصوص پیشہ سے متعلق افراد اپنے متعلقین کے واسطے کمیٹی بنا سکتے ہیں، حکومت کو انہیں بند کرنے کا حق نہیں ہوگا، البتہ اگر کوئی کمیٹی ملک کی سالمیت کے لئے خطرہ ہو، یا حکومت کے خلاف بغاوت کرنے پر اس کی اساس وبنیاد ہو تو حکومت اسے خلاف قانون قرار دے کر اس کو موقوف کرنے کی مجاز ہوگی، یہ حق بظاہر قواعد اسلامیہ سے متعارض بھی نہیں معلوم ہوتا ہے۔

۱۱- سرکاری علاج ومعالجہ کا حق:

شہریوں کو سرکاری طور پر علاج ومعالجہ کرانے کا حق ہوگ، ااور حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ شیریوں کی سہولیات کے لئے ایسے شفاخانے اور اسپتالوں کو قائم کرے، ظاہر بات ہے کہ معاشرے میں بسنے والے سبھی افراد یکساں نہیں بلکہ ان میں ہر اعتبار سے فرق ہوتا ہے، امیر غریب، تعلیم یافتہ ناخواندہ، معزز شریف ہر طرح کے ہوتے ہیں اور انسانوں کے ساتھ حالات بھی بدلتے ہیں، کبھی تندرست ہوتا ہے تو وہ کبھی مرض کے جملے کا شکار ہوتا ہے، غریب ناتواں آدمی کو اگر بیماری لگ جائے تو وہ اپنی تنگدستی کے باعث علاج پر قادر نہیں ہوسکتا، ایسے لوگوں کے علاج کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ سرکار اور حکومت ومملکت ان کی کفالت اور ذمہ داری اٹھائے۔

۱۲-آمدورفت کا حق:

شہریوں کو اپنے ملک میں بلا روک ٹوک سفر کرنے اور ادھر ادھر آنے جانے کی اجازت ہوگی، البتہ اگر کسی ملک کے حالات فرقہ وارانہ فسادات یا کسی اور وجہ سے ناگفتہ بہ ہو جائیں تو حکومت عارضی طور پر اس حق کو موقوف کر سکتی ہے، جیسے کرفیو کے ایام میں افراد کو ان کے مقامات میں نظر بند کر دیا جاتا ہے۔

سیاسی حقوق کا بیان:

اس کے ضمن میں عموماً ان حقوق کو بیان کیا جائے گا جو جمہوری طرز کے ممالک میں رہنے والے افراد کو حاصل ہوتے ہیں، مثلاً الیکشن میں حصہ لینا، یہ بات پہلے گذر چکی ہے کہ جمہوریت اور اسلام کے نظامہائے مملکت میں منافات اور تغائر ہے، کیونکہ جمہوریت کا ارتکاز تین چیزوں پر ہے، قانون سازی، قضا اور احکام کا نفاذ۔

جمہوریت میں مقنّنہ یا قانون ساز اداروں کو قانون وضع کرنے کا حق ہوتا ہے، جبکہ قانون بنانے والی ذات صرف اور صرف اللہ رب العزت کی ہے "**ان الحکم إلا للہ**" (انعام:۵۷، یوسف ۴۰-۶۷) "**ألا له الخلق والأمر تبارک الله رب العالمین**" (اعراف: ۵۴) دوسری بنیاد قضا ہے، اس نظام میں ارباب حل وعقد کو اسی کے دستور کے موافق فیصلہ کرنا لازم ہوتا ہے، خواہ وہ فیصلے اسلامی دستور سے میل نہ کھاتے ہوں اور یہ چیز بہ نص قرآنی جائز نہیں: "**ومن لم یحکم بما أنزل الله فأ ؤلئک ھم الظالمون**" (مائدہ:۴۵)، "**فاحکم بینھم بما أنزل الله ولاتتبع أھواء ھم**" (مائدہ:۴۸)۔

حتی کہ اس کے وضع کردہ دستور کے خلاف فیصلے کرنے کو نا قابل تلافی جرم تسلیم کیا جاتا ہے، تیسری چیز احکام کا نفاذ ہے، اس میں صرف انہیں احکام کا نفاذ ممکن ہے جو آئین جمہوریت کے موافق ہوں وہ اسلام سے موافقت رکھتے ہوں یا نہیں اس کی طرف توجہ نہیں دی جاتی ہے۔

ظاہر بات ہے کہ مذکورہ بالا تینوں چیزیں اسلامی نصوص سے متصادم ومعارض ہیں، اس لئے جزئیات سے مل کر جو شئی مرکب ہوگی وہ بھی ناجائز ہوگی، کیونکہ ناجائز چیز کا مجموعہ بھی ناجائز ہوتا ہے۔

جن جمہوری ممالک میں مسلمان آباد ہیں ان کے سامنے دو راستے رہ جاتے ہیں: اول یہ کہ وہ اس نظام سے کنارہ کشی اختیار کر لیں اور اس کے متعلقات میں کسی بھی طرح حصہ نہ لیں، دوم یہ کہ اس کو دل سے برا سمجھتے ہوئے اپنا لیں، پہلی صورت اختیار کرنا مسلمانوں کی رہی سہی اہمیت اور حیثیت ختم کرنے کے مرادف ہوگا، اس طرح مسلمانوں کے عائلی قوانین کا تحفظ بھی خطرے میں پڑ سکتا ہے، دوسری صورت اس کو دل سے برا سمجھتے ہوئے اختیار کرنے کی ہے، یہ فسطائی طاقتوں کو آگے بڑھنے سے روکنے کا مؤثر ذریعہ ہے، اگر دونوں میں تجزیہ کیا جائے تو یہ دوسری صورت اہون اور اخف نظر آتی ہے اور فقہاء

نے لکھا ہے کہ ایسے نازک حالات میں اگر دو مفسدے جمع ہوجائیں تو اخف اور اہون اختیار کیا جاسکتا ہے، اس لئے اس طریقہ کو قبول کرنے اور اس کے متعلقات میں حصہ لینے کی گنجائش ہوگی، بلکہ یہی صورت ان مسلمانوں کے لئے بہتر اور نفع بخش ثابت ہوسکتی ہے جب جمہوریت کو بدرجہ مجبوری قبول کرلیا گیا ہوتو اس کے جتنے حقوق ہوں گے ان کا ثبوت بھی ہوگا، کیونکہ قاعدہ ہے: ''إذا ثبت الشئ ثبت بلوازمه'' (العنایہ)۔

اس تمہید کے بعد ہم اصل موضوع کی طرف لوٹتے ہیں، سیاسی حقوق سے مراد وہ حقوق ہیں جو شہریوں کو حکومت کی تعمیر وتشکیل کے سلسلے میں حاصل ہوتے ہیں، ان حقوق کے حاملین حکومت کی پالیسیوں پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، انہیں حقوق کی بدولت، حکومت کو آمرانہ وجابرانہ طرز اختیار کرنے یا عام شہریوں کے خلاف قانون پاس کرنے سے روکنے کے مجاز ہوتے ہیں۔

۱۳- ووٹ دینے کا حق:

ان میں سب سے پہلا حق ووٹ دینے کا ہے، اس حق کی وجہ سے شہری اپنی مرضی سے اپنے پسند کے آدمیوں کو قبضہ یا قانون ساز اداروں بلدیہ اور نگر پنچایتوں میں بھیجتے ہیں، جمہوری ممالک میں یہ حق عاقل بالغ شہری کو حاصل ہوتا ہے، نابالغ اور مجون و پاگل میں چونکہ سیاسی بصیرت نہیں ہوتی، اس لئے ان کو اس حق سے محروم رکھا جاتا ہے، یہ طریقہ بظاہر اسلامی طرز سے مغائر ہے، کیونکہ ووٹ دے کر کسی انسان کو اپنا حاکم بنانا اور اس کے لئے حاکمیت کا اعتراف کرنا ہے جو صرف اللہ کے لئے خاص ہے، مگر مجبوری میں یہ حق جمہوری ممالک میں مسلمانوں کو ملے گا، جیسا کہ سیاسی حقوق کی تمہید میں گذر چکا ہے۔

۱۴- الیکشن لڑنے کا حق:

سیاسی حقوق میں سے ایک حق الیکشن لڑنے کا ہے، ہر فرد کو انتخابات میں امیدوار بننے کا حق حاصل ہوگا، اس حق پر کسی فرد یا جماعت کی اجارہ داری نہ ہوگی، جمہوری نظام میں الیکشن کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اس میں امیدواران ازخود اپنے رفقاء اور حمایت کنندگان کے ساتھ پرچہ نامزدگی داخل کرتے ہیں اور بہ ظاہر یہ دعوی کرتے ہیں کہ ہم اس منصب کے اہل ہیں اور درپردہ آپ اپنے کو اس عہدے کے لئے پیش کرکے اس عہدہ کے طلب گار ہوتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ طریقہ اور اس ذمہ دارانہ منصب کا بزبان خود مدعی وطالب ہونا اسلامی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا، کیونکہ رسول اکرم ﷺ نے اپنے قول وعمل سے امت کو یہ تعلیم دی ہے، کہ طالب عہدہ کو منصب سے سرفراز نہ کیا جائے، چنانچہ آپ نے حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ کو نصیحت کی ہے کہ امارت کو طلب مت کرنا، اگر تمہیں وہ عہدہ سوال کرکے دیا گیا ہے تو اس کی ذمہ داری تمہیں پر سونپ دی جائے گی (اللہ کی مدد شامل حال نہ ہوگی) اور اگر بن مانگے وہ عہدہ ملا تو تمہاری مدد کی جائے گی۔

''**لا تسأل الإمارة، فإن أعطيتها عن مسئلة وكلت إليها، وإن اعطيتها من غير مسئلة أعنت عليها**''(مسلم: کتاب الإمارۃ باب النہی عن طلب الإمارۃ) اس لئے مناسب اور بہتر طریق کار یہ ہوگا کہ کوئی شخص خود مدعی بن کر کھڑا نہ ہو، بلکہ مسلمانوں کی کوئی جماعت اسے اس کام کا اہل سمجھ کر نامزد کرے۔

۱۵-سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا حق:

ہر شہری کو سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا حق حاصل ہوگا، بشرطیکہ مطلوبہ عہدے کے لئے درخواست دہندہ میں اس لحاظ کی قابلیت وصلاحیت موجود ہو اور اس سلسلے کی وہ ساری شرائط پوری کرتا ہو۔

البتہ اسلامی مملکت کے وہ کلیدی عہدے جس میں اسلام اور آزادی شرط ہے، ان سرکاری عہدوں پر غیر مسلمین اور غلاموں کو مامور کرنا درست نہ ہوگا، بقیہ اس کے علاوہ مناصب میں شرائط پوری کرنے والے افراد حقدار ہو سکتے ہیں۔

۱۶-حکومت پر نکتہ چینی کا حق:

سیاسی حقوق میں یہ حق بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس حق کے مطابق شہریوں کو حکومت کے ان تصرفات پر اعتراض کا حق ہوتا ہے جو ان کے مفاد میں نہ ہوں اور اس سے ان کا نقصان ہوتا ہو، یا کوئی قانون جو کسی مذہب کے اصول سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متصادم ہو تو اس عقیدے کے حاملین اس قانون کے خلاف نکتہ چینی یا اعتراض کے مجاز ہوں گے، اور اسلامی مملکت ہونے کی صورت میں حکومت کے اقدامات جو نصوص اور اسلامی قوانین کے خلاف ہوں تو رعایا کو مخالفت کرنے کا حق حاصل ہوگا، اس کی دلیل حضور ﷺ کا وہ فرمان ہوگا جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ: تم میں سے اگر کوئی کسی خلاف شرع کام کو دیکھے تو (استطاعت ہونے کی صورت میں اس کو ہاتھ سے بدل دے (روک دے) اور اگر قدرت نہ ہو تو زبان سے منع کرے، اس پر بھی قدرت نہ ہو تو کم از کم دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا سب سے کم درجہ ہے۔

''**من رأى منكم منكرا فليغيره بيده، فإن لم يستطع فبلسانه، فإن لم يستطع فبقلبه، وذلك أضعف الإيمان**''(مسلم کتاب الایمان، بیان کون النہی عن المنکر من الایمان) اسی طرح حضرت عمر فاروقؓ کا ارشاد کہ اگر میں حکومت درست طریقہ سے نہ چلا سکوں تو مجھے دستبردار کر دینا۔

۱۷-سیاسی انجمن قائم کرنے کا حق:

سیاسی حقوق میں سے ایک ''سیاسی انجمن'' بنانے کا ہے، اس حق کو استعمال کرتے ہوئے شہریوں کو یہ اختیار ہے کہ وہ علاحدہ سیاسی جماعت کی تشکیل کر سکتے ہیں، برسر اقتدار حکومت ان کو اپنی پارٹی میں شامل کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی اور نہ ہی تاسیس سے منع کر سکتی ہے۔

۱۸-عدالتی چارہ جوئی کا حق:

ہر شہری کو عدالتی چارہ جوئی کا حق ملے گا، تاکہ ظلم وجور، ناانصافی اور حق تلفی کی صورت میں وہ انصاف پاسکیں، اس کی نظیر شریعت میں موجود ہے نبی کریم ﷺ کے پاس لوگ اپنی شکایات لے کرآتے تھے، اور آپ ان کے درمیان فیصلہ کرتے تھے، بعد میں صحابہ کرام نے بھی اس اسوہ کو باقی رکھا ہے، اور یہ حضرات صحابہ لوگوں کی شکایات سن کر ان کے درمیان انصاف قائم کرتے تھے، تاریخ کے بے شمار صفحات اس جیسے واقعات سے بھرے پڑے ہیں۔

۱۹-معاشی حقوق کا بیان:

کام کرنے کا حق: ہر شہری کو کام کرنے کا حق ملے گا، اور اس کو بروئے کار لا کر وہ اپنی روزی روٹی کا انتظام کرنے کے مجاز ہوں گے، نیز حکومت کی ذمہ داری ہوگی کہ وہ شہریوں کے واسطے روزگار کے مواقع فراہم کرے، بے روزگاری کو ملک سے ختم کرنے کی کوشش کرے۔

۲۰-مناسب اجرت پانے کا حق:

شہریوں کو یہ حق بھی حاصل ہوگا ان کے لئے حکومت مناسب اجرتوں کا تعین کرے، یعنی یہ نہ ہو کہ انہیں مل مالک یا کارخانے دار، یا حکومت برائے نام اجرت دیں، بلکہ انہیں کم سے کم اتنی اجرت ملے کہ وہ نہ صرف اپنی اور اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرسکیں، بلکہ ان کا معیار زندگی بھی اونچا ہو، نیز حکومت کی ذمہ داری یہ بھی ہوگی کہ ان کے کام کے اوقات مقرر کرے، تاکہ زیادہ کام کرنے سے یا بہت زیادہ محنت کرنے سے ان کی صحت پر برا اثر نہ پڑے، اس حق کے ثبوت پر نبی کریم ﷺ کے اس فرمان سے استدلال کیا جاسکتا ہے: "**ثلاثة أنا خصمهم يوم القيامة، ومن كنت خصمه خصمته يوم القيامة......رجل استأجر أجيرا فاستو فى منه ولم يوفه أجره**" (ابن ماجہ کتاب الاحکام باب أجر الإجراء)۔

۲۱-معاہدہ کرنے کا حق:

اس سے مراد یہ ہے کہ شہریوں کو یہ حق ملنا چاہئے کہ وہ لین دین اور خرید وفروکت کے سلسلے میں کسی بھی قسم کا معاہدہ کرسکتے ہیں، حکومت صرف اس صورت میں دخل دے گی جب وہ معاہدے عام انسان اخلاق کے منافی ہوں یا اسلامی مملکت ہو تو ان معاہدوں پر پابندی لگا سکتی ہے جو قواعد اسلامیہ سے متعارض ہوں، اس کی دلیل نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان ہے: "**المسلمون على شروطهم إلا شرطا حرم حلالا أو أحل حراما**" (ترمذی: کتاب الاحکام باب ما ذکر عن رسول اللہ ﷺ فی الصلح)۔

پناہ گزینوں کے حقوق:

۵- تاریخی اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو قدیم معاشرہ میں اجنبیوں اور پناہ گزینوں کو پناہ لینے والے ممالک میں کسی قسم کے حقوق حاصل نہیں تھے، بلکہ اجنبی آدمی اپنے خطے اور اقلیم کا دشمن سمجھا جاتا تھا، اس پر قابو پا کر اس کی بیع وشراء ہوتی تھی اس معاشرے میں ایک اجنبی آدمی عرصہ دراز تک عمومی حقوق تو درکنار ان بنیادی حقوق سے بھی محروم رہا کرتا تھا جو اس کے وجود کے لئے لازم تھے اور انسانیت جن کی متقاضی تھی، مثلاً شادی کرنے کا حق، وراثت پانے کا حق، اپنے معاملات میں تصرف کرنے کا حق، ملکیت کا حق وغیرہ وغیرہ، مگر بعد میں حالات میں سدھار ہوا تو ان کے ساتھ کرم واحسان اور ہمدردی کا معاملہ ہونے لگا، اسلام نے ان حقوق کی بنیاد کو اور مستحکم کردیا، البتہ اس میں پناہ گزینوں کے تعلق سے کوئی ایسا واضح اور مکمل قانون بظاہر نہیں ملتا، جس طرح عائلی یا عباداتی قوانین بسط وتفصیل کے ساتھ ملتے ہیں، ہاں ہجرت اور دوسرے ممالک میں پناہ لینے کے واقعات ملتے ہیں، ان واقعات سے لوگوں کے طریقہ زیست، انصار ومہاجرین کے آپسی معاملات سے ان حقوق اور دستور کو اخذ کیا جاسکتا ہے، اس سلسلے کی سب سے اہم پیش رفت نبی کریم ﷺ کے حکم سے صحابہ کرام کا حبشہ اور خود نبی کریم ﷺ اور ان کے رفقاء کا مدینہ منورہ ہجرت کرنا ہے۔

اسلام کے دستور سیر ومغازی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پناہ گزینوں کے تعلق سے سب سے پہلی آیت غالبا سورہ حشر کی (آیت نمبر ۹) ہے، جو ان کے خصوصی حقوق یا ان کے ساتھ حسن معاملہ کی غماز ہے۔اس آیت سے ایسے چند امور مستفاد ہوتے ہیں جن سے پناہ گزینوں کے حقوق کی طرف رہنمائی مل سکتی ہے، مثلاً:

۱- مہاجرین اور پناہ گزینوں کے آنے پر ان کے ساتھ خوشی کا اظہار کرنا۔

ان کے ساتھ احسان کرنا اور ان کو ترجیح دینا۔

ان کا استقبال کرنا، خواہ وہ مالدار ہوں یا غریب۔

پناہ لینا جائز ہے ناگزیر حالات میں۔

ان کے علاوہ پناہ گزینوں کو اصولی درج ذیل حقوق حاصل ہوں گے:

۱- دارالاسلام میں داخلے اور بہ قدر حاجت رکنے کا حق: اگر کوئی شخص اپنی زندگی ومال ومتاع کی سلامتی کے واسطے دارالاسلام کی پناہ لینا چاہے تو امام المسلمین یا اس کے نائب کے لئے مندوب ہے کہ اس غرض سے بسنے والے افراد کو داخلے کی اجازت دے، مذکورہ حالات میں ایسے مضطر کو دارالاسلام میں داخلے کا حق شریعت نے عطا کیا ہے، مسلمان کے حق میں تو ظاہر ہے غیر مسلمین کو پناہ دینے سے اگر ملکی قومی ملی مصالح متاثر نہ ہوں تو انہیں بھی اجازت دی جاسکتی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد

ہے:"وإن أحد من المشركين استجارک فأجره حتى يسمع كلام الله"(توبہ:٦)۔

۲-مذہبی آزادی کا حق: ہر پناہ گزیں کو اس کے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی، اس کو دین چھوڑنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا، فرمان باری ہے:

"لا إكراه في الدين قد تبين الرشد من الغي" (بقرہ:۲۵٦)۔

۳-نفس کے تحفظ کا حق:

یہ حق عام ہے، شہری، مہاجر اور پناہ گزیں ہر ایک کو ملے گا، خصوصیت سے پناہ گزینوں کے حقوق میں اسکو ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ پناہ گزینوں کو ثانوی درجہ میں رکھا جاتا ہے، ملکی قومی سطح پر ان کی خاطر خواہ اہمیت و وقعت نہیں ہوتی، حالانکہ اسلام کا اصول یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان دار الاسلام میں کسی معاہد کو بھی قتل کر دیتا ہے تو اسے بھی عندالاحناف قتل کیا جاتا ہے، ہدایہ میں ہے:"يقتل الحر بالحر......والمسلم بالذمي"(ہدایہ ۴/ ۵٦۲ کتاب الجنایات باب مایوجب القصاص)۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:"من قتل معاهدا لم يرح رائحة الجنة، وإن ريحها توجد من مسيرة أربعين عاما"(بخاری: کتاب الجزیہ باب اثم من قتل معاہدا بغیر جرم)۔

حضرت علیؓ کے زمانے میں ایک مسلمان نے ایک غیر مسلم کو قتل کر دیا تھا، جرم ثابت ہونے کے بعد حضرت علیؓ نے اس کو پکڑ لیا اور فرمایا، جس کے لئے ہمارا ذمہ ہو تو اس کا خون ہمارے خون کے مانند ہے"من كان له ذمتنا فدمه كدمائنا"(سنن کبری للبیہقی ۸/ ٦۲ کتاب الخراج باب بیان ضعف الجزالذی ر ۴ ۵۹۳ طبع دار الکتب)۔

حضرت ابن عمرؓ سے مروی ہے کہ ایک مسلمان نے ایک معاہد کو قتل کر دیا تھا تو آپ ﷺ نے اس مسلمان کو قصاصا قتل کروایا ہے الختار ۱۰/ ۱٦۵ طبع زکریا)۔

۴-عقل کے تحفظ کا حق:

عقل انسان کی ایک بیش بہا نعمت ہے اسی کے ذریعہ وہ دیگر مخلوقات سے ممتاز ہوتا ہے اور اس کو استعمال کر کے ضلالت و گمراہی سے محفوظ رہتا ہے پناہ گزینوں کو ان کے عقل کا تحفظ ملے گا، چنانچہ کوئی ایسا فعل جس سے ان کی عقل سلب ہو یا اس میں فتور آئے، مثلاً ٹارچر کرنا، درست نہیں ہوگا اور اس سلسلے میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کا حکم یکساں ہوگا، اس حق پر درج ذیل آیات سے استدلال ممکن ہے:"كذلك يبين الله لكم آياته لعلكم تعقلون"(بقرہ:۲۴۲)"قد بينا لكم الآيات إن كنتم تعقلون"(آل عمران:۱۱۸)۔

۵-عزت وآبرو کے تحفظ کا حق:

انسان کی عزت وآبرو اس کا قیمتی سرمایہ ہے، اور فطرت بھی اس بات کا تقاضہ کرتی ہے کہ کسی آدمی کی آبرو کو تار تار نہ کیا جائے، کیونکہ بسا اوقات اس سانحے کے بعد آدمی اپنی زندگی کو موت پر ترجیح دیتا ہے، چنانچہ بہت واقعات سننے میں آتے ہیں کہ آدمی نے بےعزت ہوکر خودکشی کی طرف قدم بڑھا لیا اس لئے شریعت نے پناہ گزینوں کو اپنی عزت وناموس کے تحفظ کا حق عطا کیا، لہذا ان پر کیچڑ اچھالنا بہتان لگانا درست نہ ہوگا، مسلمان کے حق میں یہ تمام امور ظاہر ہیں، غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہوگا، درمختار میں ہے: "**ویجب کف الأذی عنه ویحرم غیبته کالمسلم**" (الدر المختار مع رد المحتار ۶/ ۲۸۲ کتاب الجہاد باب المستامن)۔

۶-مناسب گھر بنانے کا حق:

پناہ گزینوں کو اس بات کا حق ملے گا کہ وہ رہنے کے لئے مناسب ٹھکانہ اختیار کرلیں، مگر شرط یہ ہوگی کہ اس سے پڑوسی مسلمان کو ضرر لاحق نہ ہو، مسلمانوں کے مکانات کی طرح ان کی بھی حرمت ثابت ہوگی، اس لئے بغیر اجازت اندر جانا شرعا ممنوع ہوگا، اسی طرح بغیر کسی سبب شرعی کے ان کے مکانات تنگ کرنا ان کی زمین کو دبانا شرعا درست نہ ہوگا۔

۷-تعامل وتملک کا حق:

پناہ گزینوں کو لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے کا حق ہوگا، اگر انہیں لباس پوشاک، اشیاء خورد ونوش، اور سواری گاڑی کی ضرورت پڑے تو وہ خریدنے کے مجاز ہوں گے اور بیع وشراء کے بعد وہ اس کے مالک بھی، مسلمان کے حق میں تو یہ ظاہر ہے کفار کا بھی یہی حکم ہوگا۔

حضرت عبدالرحمن بن ابی بکرؓ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے ساتھ تھے کہ ایک طویل القامت مضبوط ہٹا کٹا مشرک بکریاں ہانکتا ہوا آیا، حضور ﷺ نے فرمایا: یہ بیچنے کے لئے ہے یا عطیہ کے لئے اس نے کہا: بیچنے کے لئے، پھر آپ ﷺ نے اس میں سے کچھ بکریاں خریدیں (بخاری، کتاب البیوع، باب الشراء والبیع مع المشرکین)۔

۸- آزادی کا حق: پیدائشی طور پر ہر شخص آزاد ہے، کوئی کسی کا غلام نہیں، تمام انسان برابر ہیں انسان ہونے کے ناطے کوئی ایسی حرکت روا نہ ہوگی جو انسانیت کی تکریم کے خلاف ہو "**ولقد کرمنا بنی آدم وحملناهم فی البر والبحر**" (اسراء: ۷۰)، اس لئے پناہ گزیں بھی آزاد رہیں گے، اور انہیں یہ حق ملے گا۔

۹-تعلیم کا حق:

تعلیم پر انسان کا بنیادی حق ہے،اسی کے ذریعہ خیر وشر میں تمیز پیدا کرنے کا ملکہ حاصل ہوتا ہے،اس لئے شریعت نے دوسرے لوگوں کے ساتھ پناہ گزینوں اور مہاجرین کو بھی اس حق سے سرفراز کر رکھا ہے۔

۱۰-واپس نہ کئے جانے کا حق:

پناہ گزینوں نے حالات خراب ہونے کی وجہ سے جس خطے سے ہجرت کی ہے، انتشار وفسادات کی حالت میں انہیں ان کے مقامات کی طرف لوٹایا نہیں جائے گا، یہ حق تمام حقوق میں سب سے اہم ہے اور ان کے لئے ہر دل عزیز بھی نبی کریم ﷺ کے مشفق چچا حضرت ابوطالب سے جب قریش نے ان کے بھتیجے کو سپرد کرنے کا مطالبہ کیا تو انہوں نے منع کرتے ہوئے فرمایا:''**امض علی أمرک وافعل ما حببت فو اللہ لا أسلمک**'' (بدایہ والنہایہ ۵۶/۳ دار احیاء التراث العربی)۔

پناہ گزینوں کو ان کے خطے میں واپس کرنے سے فقہ اسلامی کا اصول: مستامن کے ذمہ کو نہ توڑنا، کی خلاف ورزی لازم آتی ہے، نیز اس میں غدر اور دھوکہ بھی ہے،اس لئے انہیں واپس نہ کریں گے۔

شاہ نجاشی نے بھی مہاجرین مسلمان کو ابوسفیان کے حوالے کرنے سے منع کر دیا تھا۔

نیز امان کے لئے عربی زبان کا ہونا ضروری نہیں، بلکہ کسی بھی زبان کا کوئی لفظ امان پر دلالت کرتا ہو تو اس سے امان کا تحقق ہو جاتا ہے، پناہ دینا بھی ایک امان ہے، اس لئے بھی انہیں واپس نہیں کیا جائے گا،حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں:

''**ان مترس بالفارسیة هو الأمان، فمن قلتم له ذلک ممن لا یفقه لسانکم فقد امنتموه**'' (البدایہ والنہایہ ۱۰۳/۳، ۱۰۴ دار الحدیث القاہرہ)۔

اس مسئلہ پر شرح کبیر کے اس جزئیہ سے بھی استدلال کیا جا سکتا ہے، کہ اگر کوئی حربی امان لے کر دار الاسلام میں داخل ہوا ہو اور کفار اس کا مطالبہ کر رہے ہوں اور واپس کرنے کی صورت میں اس کے قتل کر دیئے جانے کا امکان ہو تو اس کو ان کے حوالے نہیں کیا جائے گا۔

''**فإن دخل حربی منهم إلینا بأمان فطلبوا مفاداة الأسیر بذلک المستأمن وکره ذلک المستامن وقال: إن دفعتمونی إلیهم قتلونی، فلیس ینبغی لنا أن ندفعه إلیهم، لأنه فی أمان منا**'' (شرح السیر الکبیر للشیبانی ۳۰۰/۳ حیدرآباد دکن)۔

ان حقوق کے علاوہ: حق عدل، حق حیات، جو انسان کے لئے ضروری اور لابدی ہوتے ہیں اور جن کا بیان شہریوں

کے حقوق میں گزرا، اس حق سے بھی پناہ گزیں بہرور ہوں گے، کیونکہ یہ حقوق فطری ہیں ان کے بغیر کسی بھی فرد کا زندگی گزارنا نہایت دشوار ہوتا ہے۔

شہریوں کے خصوصی حقوق:

وہ حقوق جو سیاسی امور سے متعلق ہیں: مثلاً ووٹ دینا، انتخاب میں حصہ لینا، الیکشن لڑنا، قانون ساز اداروں کا ممبر بننا، سیاسی عہدوں پر مامور ہونا، یہ سب شہریوں کو حاصل ہوتے ہیں، پناہ گزینوں کے تعلق سے احقر کی ناقص رائے یہ ہے کہ اگر ملک کی مصلحت انہیں اس سے محروم رکھنے کی متقاضی ہو تو انہیں محروم رکھا جا سکتا ہے۔

سوڈان میں اسی پر عمل ہے: اس سلسلے کی قرارداد درج ذیل ہے:

"**ولا يجوز لأي لا جئي ممارسة أي نشاط سياسي أثناء وجوده فى السودان**" (الجوء في العالمين العربي الاسلامی:٦)۔

ہندیونین میں انگریز یا امریکن یا دوسرے ملکوں کے رہنے الے آباد ہیں انہیں وہ (سیاسی) حقوق حاصل نہیں جو ہندوستانی شہریوں کو حاصل ہیں، مثلاً نہ تو وہ ووٹ دے سکتے ہیں اور نہ وہ کسی الیکشن میں کھڑے ہو سکتے ہیں، اور نہ انہیں سرکاری ملازمت کرنے کا حق حاصل ہے (اصول سیاسیات ۲ ۱۳، م ہاشم قدوائی)۔

٦- غیر مسلم ممالک میں شہریت اختیار کرنا:

غیر مسلم ممالک میں شہریت اختیار کرنے کے تعلق سے بنیادی طور پر دو نظریئے پائے جاتے ہیں:

اول: غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرنے سے آدمی اپنے مذہب کا پابند ہو، شعائر اسلام پر عمل کرنے کی اجازت ہو تو ان ممالک میں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، یہ رائے امام محمد عبدہ کی طرف منسوب ہے، ان کا کہنا ہے کہ جو مسلمان یورپی ممالک میں مقیم ہیں انہیں وہاں سے ہجرت کرنا لازم نہیں، کیونکہ انہیں مذہبی آزادی حاصل ہے، اس رائے سے اتفاق کرنے والے امام مراغی بھی ہیں، انہوں نے بھی آزادی ملنے کی صورت میں ہجرت کو ضروری قرار نہیں دیا، بلکہ انہوں نے لکھا ہے کہ بعض دفعہ ان مقامات میں مقیم رہنے سے محاسن اسلام کے پھیلنے اور لوگوں کے اسلام میں داخل ہونے کے مواقع پیدا ہوتے ہیں، جیسے آج کل انگلینڈ اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی صورت حال ہے، کہ لوگوں پر اسلام کی صداقت وحقانیت وا ہو رہی ہے اور لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہو کر قلبی و ذہنی سکون جو وہاں کا نازک اور حساس مسئلہ ہے، سے بہرہ ور ہو رہے ہیں، البتہ اگر وہاں رہنے سے دین واخلاق، مال وعزت پر خوف ہو تو کسی مامون جگہ ہجرت کرنا واجب ہو جائے گا (تفسیر منار ۵/ ۲۹۱، تفسیر مراغی ۲۰/ ۱۳۳)۔

دلائل:"إن الذين توفاهم الملائكة ظالمي أنفسهم قالوا فيم كنتم قالوا كنا مستضعفين فى الأرض قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها فأولئک ماواهم جهنم وساء ت مصيرا"(سورۂ نساء:۹۷)۔

ابتداء مکہ مکرمہ میں جب دین پر عمل کرنا دشوار تھا تو اس وقت وہاں سے مدینہ منورہ زادہا اللہ شرفا کی طرف ہجرت نہ صرف فرض تھی، بلکہ ایمان کی علامت سمجھی جاتی تھی، لیکن جن افراد نے قدرت کے باوجود ہجرت نہ کی انہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، یعنی وہ ایک گناہ کے مرتکب ہوئے، ان کی موت کے وقت فرشتوں سے جو باتیں ہوئیں اس مکالمے کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے، وجہ استدلال یہ ہے کہ ہجرت اس وقت فرض تھی جب دین پر عمل دشوار ہوگیا تھا، اس لئے جن مقامات میں عمل ممکن ہو وہاں سے ہجرت فرض نہ ہوگی وہاں پر قیام جائز رہے گا۔

"عن الزبير بن العوامؓ: قال رسول الله ﷺ: البلاد بلاد الله، والعباد عباد الله فحيثما أصبت خيرا فأقم"(مسند احمد: مسند الزبیر بن العوام/۱۳۴٦) (سب شہر اللہ کے شہر ہیں اور سب بندے اللہ کے بندے، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہوں وہاں اقامت کرو)۔

اسلام کے ابتدائی دور میں نبی کریم ﷺ کے فرمانے کی وجہ سے صحابہ کرام کی ایک جماعت نے حبشہ ہجرت کی اور اسے اپنا مستقر ٹھکانہ بنایا ہے، جبکہ وہاں عیسائی حکومت تھی اور پوری رعایات بھی نصرانیت پر قائم تھی۔

عقلی اعتبار سے بھی ان ممالک میں سکونت کی گنجائش معلوم ہوتی ہے، کیونکہ اسلام ایک آفاقی مذہب ہے کسی خطے اور قبیلے کے ساتھ خاص نہیں، اور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پیغام کو پوری دنیا میں پھیلائیں اور تبلیغ دین ان ممالک میں سکونت اختیار کئے بغیر ممکن نہیں۔

البتہ حالات کے اعتبار سے کسی مسلمان کے لئے غیر مسلم ملک میں سکونت اختیار کرنے کے بارے میں تفصیل ہوگی اور حالات کے اعتبار سے حکم میں فرق آئے گا اور درج ذیل احکام مرتب ہوں گے: بلا کراہت جائز، مستحب اور موجب اجر وثواب، واجب، مکروہ، حرام۔

اگر کسی مسلمان کو اس کے وطن میں ناحق ایذا پہنچائی جائے یا بلا جرم کے قید و بند کی صعوبتیں دی جائیں یا مال و دولت کو آمرانہ طور پر غصب کیا جائے اور کوئی مامون جگہ نہ مل سکے تو غیر مسلم ملک میں تین شرط کے ساتھ رہنا جائز ہوسکتا ہے:

۱-اس ملک میں دین پر عمل کرنے کی آزادی ہو اور آدمی کو یقین ہو کہ وہ اپنے مذہب کا پابند رہے گا۔

۲-ماحول سے اس کے عقیدے خراب ہونے کا اندیشہ نہ ہو اور وہاں رائج فواحش ومنکرات سے بچے رہنا ممکن ہو۔

خصوصا نوجوان غیر شادی شدہ طبقہ، کیونکہ ان ممالک میں فتنوں کے چوپٹ دروازے کھلے رہتے ہیں۔آدمی کے پاس اتنا علم ہو کہ وہ شکوک وشبہات کا ازالہ کرنے پر قادر ہو۔

”قد سئل الشیخ عبد الله بن جبر ین ما حکم الحصول علی الجنسیة الکافرة أجاب بقوله: من اضطر إلی طلب جنسیة دولة کافرة کمطارد من بلده، ولم یجد مأوی، فیجوز له ذلک بشرط أن یظهر دینه ویکون متمکنا من أداء الشعائر الدینیة، وأما الحصول علی الجنسیة من أجل مصلحة دنیویة محضة، فلا أری جوازه“ (اسلام ویب: مرکز الفتوی، رقم الفتوی: ۱۸۸۱۴۳ شروط جواز الحصول علی الجنسیۃ الکافرۃ)۔

یا کوئی شخص اپنے معاشی مسئلے میں الجھن کا شکار ہو اور اسے اپنے ملک میں تلاش بسیار کے باوجود جائز ملازمت اور معاشی وسائل حاصل نہ ہوں اور اسے فقر وفاقہ کی نوبت آپہنچے اور غیر مسلم ملک میں جائز ملازمت مل رہی ہو تو مذکورہ بالا تینوں شرائط کے ساتھ وہاں رہنے کی اجازت ہوگی، کیونکہ اہل علم نے مصیبت کے نزول کے وقت اپنے وطن سے نکلنے کی اجازت دی ہے۔

”ذکر ابن العربی فی أحکام القرآن عند قوله تعالی: وإذا أخرجه الذین کفروا الآیة (توبه ۴۰)فی هذه الآیة دلیل علی جواز الفرار من خوف العدو وترک الصبر علی ما ینزل من بلاء الله وعدم الاستسلام المؤدي إلی الآلام والهموم“ (احکام القرآن لابن العربی ۲/ ۵۱۴، سورۃ توبہ: ۴۰ دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ حصول رزق بھی شریعت کا ایک حکم ہے اور اسے ایک فریضہ سے تعبیر کیا گیا ہے **”عن عبد الله بن مسعود قال: قال رسول الله ﷺ: طلب کسب الحلال فریضة بعد الفریضة، رواه البیهقی فی شعب الایمان“** (مشکاۃ کتاب البیوع باب الکسب وطلب الحلال) اور اپنے ہاتھ کی کمائی کو شریعت بہت پسندیدہ نگاہ سے دیکھتی ہے۔

”عن رافع بن خدیج قال: قیل یا رسول الله! أي الکسب أطیب؟ قال: عمل الرجل بیده وکل بیع مبرور“ (مشکاۃ، کتاب البیوع باب الکسب وطلب الحلال)۔

اور اس کے لئے شریعت نے کسی خاص مکان اور مخصوص جگہ کی قید نہیں لگائی، بلکہ آزادی دے رکھی ہے کہ جہاں مرضی ہو اپنا رزق تلاش کرو، فرمان باری تعالی ہے:

”هو الذي جعل لکم الأرض ذلولا فامشوا في مناکبها وکلوا من رزقه وإلیه النشور“ (سورۂ ملک ۱۵)۔

اس حکم میں ایک اور صورت بھی داخل ہوسکتی ہے (یعنی وہاں رہنا جائز ہوگا) جو ہندوستان اور اس جیسے ممالک پر

منطبق ہے جہاں پر مسلمان اپنے دین اور جان و مال کے لحاظ سے (عمومی حالات میں) محفوظ ہیں اور جہاں پر انہیں آزادی مکمل طور پر حاصل ہے، اور شعائر دین پر بلا تکلیف وایذاء کے عمل پیرا ہوتے ہیں، مذکورہ بالا حالات میں اس جیسے مما لک میں بھی سکونت اختیار کرنا جائز ہوگا، کیونکہ وہ شرعی ہجرت اس وقت واجب ہوتی ہے جب کسی ملک کے حالات دینی اعتبار سے ناگفتہ بہ ہوں اور وہاں کے مسلمانوں کو اپنا دین و مال وعزت بچانا دشوار ہو اور مذہب پر پابندی لگادی گئی ہو یا عمل کرنے کی صورت میں شدید جانی و مالی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہو، ہاں اس بات کے استحباب سے قطعا انکار کی گنجائش نہ ہوگی کہ آدمی وہاں سے ہجرت کر کے کسی مسلم ملک میں پناہ لے لے بشرطیکہ اس کا حصول متعذر نہ ہو، کیونکہ وہاں رہ کر جو دینی مصالح ہو سکتے ہیں، غیر مسلم ملک میں وہ نہیں ہوسکتے، مثلاً خیر ومعروف کی کثرت، منکرات وفحواش کی قلت، علماء ومشائخ کی زیارت مسلمان کی جماعت میں کثرت پیدا کرنا اور ان کی معاونت، کفار سے عدم اختلاط اور عدم تکثیر سواد کفار وغیرہ وغیرہ۔

حضور ﷺ کے عم محترم حضرت عباسؓ اسلام لانے کے بعد مکہ میں ہی مقیم تھے اور فتح مکہ سے کچھ پہلے ہجرت کی ہے، اسی طرح حضرت نعیم نحامؓ نے جب مدینہ منورہ ہجرت کا ارادہ کیا تو ان کی قوم بنو عدی ان کے پاس ائی اور کہا: آپ ہمارے درمیان ہی رہیں یہاں سے ہجرت نہ کریں، جو آپ کو تکلیف پہنچانے کی کوشش کرے گا، ہم اس سے نمٹیں گے، اور جن یتیموں اور بے سہارا عورتوں کی کفالت کرتے تھے کرتے رہیں۔

چنانچہ وہ ہجرت سے رک گئے، پھر اس کے بعد ہجرت کی تو آپ ﷺ نے ان سے فرمایا، تمہاری قوم میری قوم سے بہتر ہے، میری قوم نے مجھے نکالا اور میرے قتل کا ارادہ کیا، اور تمہاری قوم نے نہ صرف تمہیں روکا، بلکہ تمہاری حفاظت کا بھی وعدہ کیا (مغنی: ۱۳/ ۱۵۱، کتاب الجہاد مفصل فی الہجرۃ طبع دار عالم الکتب الریاض)۔

ابن قدامہ علیہ الرحمہ اپنی مایہ ناز تصنیف ''المغنی'' میں رقم طراز ہیں:

''فالناس في الهجرة على ثلاثة أضرب: أحدها: من تجلب عليه وهو من يقدر عليها، ولا يمكنه إظهار دينه أولا تمكنه إقامة واجبات دينه مع المقام بين الكفار، فهذا تجب عليه الهجرة، بقول الله تعالى: ''إن الذين توافاهم الملائكة ظالمي أنفسهم قالوا: فيم كنتم، قالوا: كنا مستضعفين في الأرض، قالوا۔ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها، فاولئک ماواهم جهنم و ساء ت مصيرا''، وهذا وعيد شديد يدل على الوجوب، الثاني: من لا هجرة عليه، وهو من يعجز عنها: إما لمرض أو إكراه على الإقامة، أو ضعف من النساء والوالدان وشبههم، فهذا لا هجرة عليه، لقول الله تعالى:'' إلا المستضعفين من الرجال والنساء والولدان لا يستطيعون حيلة ولا يهتدون سبيلا، فأولئک عسى الله

أن يعفوعنهم، وكان الله عفوا غفورا"، ولا توصف باستحباب، لأنها غير مقدور عليها، والثالث:من تستجب له ولا تجب عليه، وهو من يقدر عليها، ولكنه يتمكن من إظهار دينه، وإقامته فى دار الكفر فتستجب له ليتمكن من جهادهم، وتكثيرا المسلمين ومعونتهم، ويتخلص من تكثير الكفار ومخالطتهم، ورؤية المنكر بينهم، ولا تجب عليه، لامكان إقامة واجب عينه بدون الهجرة" (المغنی ۱۳/۱۵۱ کتاب الجہاد،فصل فی الہجرۃ دار عالم الکتب الریاض)۔

مذکورہ عبارت سے یہ بات بھی عیاں ہوگئی کہ مشرکین کے ساتھ رہنے میں جو وعیدیں احادیث میں وارد ہوئی ہیں، وہ ان مقامات پر محمول ہیں جہاں مسلمانوں کو اپنے دین پر عمل کرنا مشکل ہو، یا عقیدہ خراب ہونے کا اندیشہ ہو، یا جان و مال عزت آبرو اور اہل وعیال پر خوف ہو۔

حضرت مفتی شفیع علیہ الرحمہ کی عبارت اس سلسلے میں بھی کافی چشم کشا ہے، جس کو نقل کرنا افادیت سے خالی نہیں، بغرض افادیت نقل کی جاتی ہے:

''جس دارالکفر میں عام احکام دینیہ پر عمل کرنے کی آزادی ہو وہاں سے ہجرت فرض واجب تو نہیں، مگر مستحب بہر حال ہے، اور اس میں دارالکفر ہونا بھی ضروری نہیں، دارالفسق جہاں احکام الہیہ کی خلاف ورزی اعلانا ہوتی ہو اس کا بھی یہی حکم ہے، اگرچہ وہاں کے حکمراں کے مسلمان ہونے کی بناء پر اس کو دارالاسلام کہا جاتا ہو، یہ تفصیل حافظ ابن حجر علیہ الرحمہ نے تحریر فرمائی ہے، اور قواعد حنفیہ میں کوئی چیز اس کے منافی نہیں، اور مسند احمد کی ایک روایت جو ابو یحیی مولی زبیر بن عوام سے منقول ہے وہ بھی اس پر شاہد ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''**البلاد بلاد الله والعباد عباد الله حيثما أصبت خيرا فأقم**'' (معارف القرآن ۶/۷۱۱،سورۂ عنکبوت ۵۶) (سب شہر اللہ کے شہر ہیں اور سب بندے اللہ کے بندے ہیں، اس لئے جس جگہ تمہارے لئے اسباب خیر جمع ہو جائیں وہاں اقامت کرو)۔

مستحب: غیر مسلم ممالک میں رہنے سے مقصود اگر دین کی اشاعت ہو، یا وہاں رہنے والے مسلمانوں کو دین اور احکام اسلام سے روشناس کرانا ہو، اور انہیں ثابت قدمی پر ابھارنا ہو تو یہ نہ صرف مستحب، بلکہ موجب اجر وثواب بھی ہوگا، کیونکہ بہت سے صحابہ کرام اور تابعین عظام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اسی نیک مقصد سے اور دینی جذبے سے سرشار ہوکر غیر مسلم ممالک میں سکونت اختیار کی ہے، اور بعد میں یہ چیزیں ان کے مناقب میں شمار ہوئیں۔

واجب: غیر مسلم ممالک میں کوئی مفتی اور مستند عالم ہو اور لوگ اس سے فیض یاب ہو رہے ہوں اور وہ دین اسلام کی ترویج اور احکامات الہیہ کی اشاعت کا ذریعہ اور سبب ہو اور اس کے وہاں سے منتقل ہونے میں ضرر لاحق ہو تو ایسے شخص کو

ان مقامات پر سکونت اختیار کرنا واجب ہوگا۔

مکروہ: اگر کسی کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل ہیں کہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے تو محض عیش وعشرت یا معیار زندگی بلند کرنے کے لئے غیر مسلم ممالک کی طرف ہجرت اور سکونت کراہت سے خالی نہ ہوگی، کیونکہ وہاں رائج فواحش ومنکرات سے آدمی کے دین واخلاق متاثر ہونے کا نہ صرف اندیشہ ہوتا ہے، بلکہ صورت حال یہ دیکھی گئی ہے کہ وہاں رہنے سے دینی حمیت کمزور ہونے کے ساتھ ساتھ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے آدمی پگھل جاتا ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

"فالمشابهة والمشاركة في الأمور الظاهرة توجب مشابهة ومشاكلة فى الأمور الباطنة على وجه المسارقة والتدريج الخفي، وقدرأينا اليهود والنصارى الذين عاشروا المسلمين هم أقل كفرا من غيرهم، كما رأينا المسلمين الذين أكثروا من معاشرة اليهود والنصارى هم أقل إيمانا من غيرهم ممن جرد الاسلام" (اقتضاء الصراط المستقیم: ۱/۴۸۸ کتاب الأعیاد طبع مکتبہ الرشید الریاض)۔

(ظاہری امور میں مشابہت وشرکت باطنی امور میں مشابہت کی طرف آہستہ آہستہ اس طور پر منتج ہوتی ہے کہ آدمی کو اس کا احساس نہیں ہوتا ہم نے مسلمانوں کے ساتھ رہنے والے بہت سے یہود ونصاری کو دیکھا ہے کہ وہ مسلمانوں سے دور رہنے والے یہود ونصاری کے مقابلے میں کافرانہ حرکت کے مرتکب ہوتے ہیں، یہی فرق یہود ونصاری کے ساتھ رہنے والے اور ان سے علاحدہ رہنے والے مسلمانوں میں ہے کہ ان کے ساتھ رہنے والوں میں دینی حمیت کم ہوتی ہے)۔

اسی وجہ سے حدیث شریف میں شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے، چنانچہ حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے، **"من جامع المشرک و سکن معه فإنه مثله"** (ابوداؤد: کتاب الجہاد باب الاقامۃ بأرض الشرک)۔

اسی طرح آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں مشرکین کے درمیان رہنے والے مسلمانوں سے بری ہوں (ابوداؤد کتاب الجہاد باب النہی عن قتل من اعتصم بالسجود)۔

مراسیل ابی داؤد میں حضرت مکحول سے مروی ہے کہ اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو (مراسیل ابی داؤد)۔

اسی وجہ سے فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ حصول یابی کی غرض سے مسلمانوں کا دار الحرب میں سکونت اختیار کرنے اور ان کی جماعت وتعداد میں اضافہ کرنے سے دین خطرے میں پڑ جاتا ہے اور یہ ایسا سبب ہے جس سے اس کی عدالت مجروح

ہوتی ہے، کیونکہ ایسا آدمی جھوٹی گواہی دینے میں نہیں جھجھکتا (تفصیل کے لئے دیکھئے: تکملہ البحرالرائق ۷/۱۵۱)۔

بعض صورت میں غیر مسلم ممالک میں رہنا حرام ہے، اس کو مفتی تقی عثمانی صاحب نے تحریر فرمایا ہے: وہ لکھتے ہیں: اگر کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے کے لئے اور دوسرے مسلمانوں پر اپنی لڑائی کے اظہار کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کرتا ہے، یا دارلکفر کی شہریت اور قومیت دارالاسلام کی قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے، یا اپنی پوری عملی زندگی بود و باش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے، ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقا حرام ہے، جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں (فقہی مقالات: ۱/۲۳۵ طبع زمزم دیوبند)۔

۷- مسلمان ہی درحقیقت دارالاسلام کا باشندہ ہوتا ہے، لیکن ضرورت کی وجہ سے اگر کفار امان لے کر بلفظ دیگر مستامن بن کر داخل ہونا چاہیں تو اسلام اس سے منع بھی نہیں کرتا، بلکہ فقہاء کرام نے تو یہاں تک صراحت کی ہے اگر وہ امان لے کر ذمی بن کر دارالاسلام میں رہیں گے تو وہ حرمت میں مسلمانوں کے مانند ہو جائیں گے، پہلے آبادی کی قلت کے سبب ان طریق کو اپنانے میں کوئی دقت نہ تھی، مگر اب آبادی کی کثرت، دیانت کے فقدان اور ہر ملک کی اپنی علاحدہ خارجی و داخلی پالیسی کی وجہ سے حالات تبدیل ہو گئے ہیں اور مستقل ''شہریت'' کا مسئلہ سامنے آتا ہے، سوالنامے میں جو ''غیر مسلم کو مسلم ممالک میں بسانے کا مسئلہ ہے، اس کے جواب کے لئے ہم تین امور پر بحث کرتے ہیں: اس سے کسی صحیح نقطے تک رسائی ہوسکتی ہے:

۱- امان یا ذمہ اور شہریت میں حقیقت کے اعتبار سے فرق ہے یا دونوں ایک ہیں، صرف الفاظ بدلے ہوئے ہیں؟ اگر ایک ہیں تو غیر مسلموں کو شہریت دی جاسکتی ہے یا نہیں؟

۲- کس طرح کے کافر کو امان دی جاسکتی ہے؟

۳- مملکت اسلامیہ کے کن خطوں میں مستقلا امان دے کر غیر مسلم کو ٹھہرایا جاسکتا ہے؟ جہاں تک پہلی بحث کا تعلق ہے تو اگر ہم اس پر غور کریں تو دونوں میں حقیقت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں لگتا، دونوں ہی یکساں نظر آتے ہیں، صرف الفاظ کا فرق معلوم ہوتا ہے، کیونکہ شہریت کہتے ہیں کسی فرد کا کسی اقلیم، ملک سے منسوب ہو جانا، جیسے ہندوستانی پاکستانی، امریکی وغیرہ اور اس کے بنیادی تین عناصر ہیں، عوام، ملک اور حکومت، شہریت کا یہ مفہوم شریعت اسلامیہ میں موجود ہے، شریعت اسلامیہ کی ایک اصطلاح ''دارالاسلام'' ہے، اس میں بھی تینوں عناصر ہوتے ہیں، چنانچہ اس کے باشندہ کو ''اہل دار الاسلام'' کہا جاتا ہے، جیسے اس کے مقابل ''دار الحرب'' کے باشندے کو ''اہل دار الحرب'' کہتے ہیں، اب یہ دارالسلام کا باشندہ اگر مسلمان ہو تو کوئی اشکال نہیں، اگر غیر مسلم امان کے ذریعہ داخل ہوں اور ذمی بن کر رہنا چاہیں تو وہ بھی اہل دار

الاسلام میں سے ہوجاتے ہیں،فقہاء کی عبارات ملاحظہ ہوں:

"**یقول الکاسانی: والذمي من أهل دار الاسلام**"(بدائع الصنائع، کتاب الطہارۃ، نیز دیکھئے: شرح السیر الکبیر، المغنی،شرح منتہی الارادات)۔

خلاصہ یہ کہ ذمی بھی دارالاسلام کے فرد میں سے ایک فرد ہے ان کے جان واموال مسلمانوں کے جان واموال کی طرح محترم ہیں۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ امان اورشہریت دیناایک شئی ہے تو شرعاان کوشہریت دیجاسکتی ہےاورانہیں دارالاسلام کاشہری بنانا جائز ہوسکتا ہے۔

احمد طہ السنوسی کہتے ہیں کہ ان کوشہری بنانا جائزنہیں، ان کی دلیل یہ ہے کہ: ذمیوں کو وہ حقوق کبھی بھی حاصل نہیں ہوسکتے جومسلمانوں کو حاصل ہوتے ہیں، چنانچہ سیاسی حقوق مسلمانوں کو ملتے ہیں ذمیوں کونہیں، جزیہ کا ادا کرنا مسلمانوں پرنہیں ہے ذمیوں پرواجب ہے، زکاۃ ادا کرنے کے مکلّف مسلمان ہوتے ہیں ذمی نہیں، یہ ساری چیزیں اس بات پر دال ہیں کہ ذمی شہریت نہیں پاسکتا، کیونکہ اگر اس کوشہریت دی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ سارے حقوق جو مسلمانوں کے ساتھ خاص ہوتے ہیں ایک شہری ہونے کے ناطے انہیں بھی ملیں، جیسا کہ آج کی دنیامیں ہورہا ہے۔

لیکن اس دلیل میں بظاہر پختگی معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ جن مسلم ممالک میں ذمیوں اور مسلمانوں کے درمیان مساوات کا قانون نافذ ہے توصرف ان حقوق میں مساوات برتی جاتی ہے جن کی بنیادعقائد و دیانت پرنہیں ہوتی، رہے وہ حقوق جوعقائد و دین پر مبنی ہیں ان میں تفریق برتی جاتی ہے،لیکن یہ چیزیں ذمیوں کوشہری بنانے سے مانع جوازنہیں بن سکتیں، کیونکہ ان ممالک میں بھی بسااوقات اس کے اپنے شہریوں میں تفریق ہوتی ہے، جب کہ سارے لوگ شہری کہلاتے ہیں،اس لئے ان کوشہری بنانا جائز ہوگا۔

غیرمسلموں کوشہریت دینے کے دلائل:

کافروں کوذمی بنانے کے بعدمملکت اسلامیہ جوحقوق انہیں فراہم کرتی ہے، یہ سارے وہی حقوق عامہ ہیں جوکسی ملک میں شہری کوعطا ہوتے ہیں، جن حقوق کو حاصل کئے بغیرکسی فرد کا معاشرہ میں زندگی گذارنا مشکل ہوتا ہے،ان میں سرفہرست جان واموال اورآزادی کا حق ہے انہیں جان کے تحفظ کا حق حاصل ہے، چنانچہ اگرکوئی مسلم کسی ذمی معاہدکوقتل کرتا ہے اس پربھی حدقصاص جاری ہوتی ہے اوراسے قصاصاقتل کیاجاتا ہے، درمختار میں ہے:"**یجب القود أي القصاص بقتل کل محقون الدم وهو المسلم والذمي، فیقتل......المسلم بالذمي**"(الدروفی ہامشہ)۔

”لاطلاق الكتاب والسنة وحديث ابن السلمانی و محمد بن المنكدر، أن رسول الله ﷺ أتي برجل من المسلمين قد قتل معاهدا من أهل الذمة، فأمر به فضرب عنقه، وقال: أنا أولى من وفی بذمته أو قال علی رضی الله عنه: انما بذلوا الجزية لتكون دمائهم كدمائنا وأموالهم كأموالنا“(الدرالمختار مع ردالمحتار ۱۰/ ۱۶۵ کتاب الجنایات طبع زکریا)۔

اور انکو جسمانی تکلیف پہنچانے سے منع کیا گیا ہے،فرمان نبوی ﷺ ہے:”ألامن ظلم معاهدا كلفه فوق طاقته، أو أخذمنه شيئا لغير طيب نفس فأناحجيجه يوم القيامة“(ابوداؤد: کتاب الخراج باب فی تعشیر اہل الذمۃ)وفی حديث آخر: دمن آذمى ذميا فأنا خصمه، ومن كنت خصمه خصمته يوم القيامة“(جامع صغیر ۲/ ۴۷۳)۔

قرآن کریم نے بھی ان پر ظلم کرنے سے منع کیا ہے، چنانچہ امن پسند ذمیوں کے بارے میں فرمایا:”فلا عدوان إلا على الظالمين“ (سورۂ بقرہ: ۹۳)۔

نبی ﷺ کے بعد صحابہ کرام نے بھی ان کے ساتھ خیر خواہی برتی اور ان کے جان و اموال کو محفوظ رکھا، چنانچہ حضرت عمرؓ نے پوری خلافت میں انہیں تحفظ عطا کیا تھا،اور زندگی کے آخری ایام میں ان کے ساتھ خیر و بھلائی کی وصیت کی۔

حضرت علیؓ کا فرمان اوپر گذر چکا ہے،البتہ اگر وہ کسی جرم کے مرتکب ہوں تو وہ استثنائی حالت ہے بقدر جرم انہیں سزادی جاسکتی ہے۔

دار اسلام کے وہ علاقے جہاں ان کا گذرنا یا اقامت اختیار کرنا ،مثلاً حرم مکہ و مدینہ علی حسب اختلاف العلماء ممنوع ہو، ان مقامات کے علاوہ وہ آنے جانے کے مجاز ہوں گے حتی کہ اگر بغرض تجارت دارالحرب جانا چاہیں اور ان کے لوٹنے کا اطمینان ہو تو وہاں بھی جانے کی اجازت ہوگی، علامہ شامی لکھتے ہیں:”قلت: والمراد الخروج على وجه اللحاق بهم، وإذلو خرج لتجارة مع آمن عوده عادة لا يمنع كالمسلم“ (ردالمحتار ۶/ ۲۸۳ کتاب الجہاد باب المستامن زکریا)۔

البتہ مستقل رہائش کے تعلق سے حنفیہ کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان اقامت کی وجہ سے مسلمانوں کو دقت و پریشانی ہو تو انہیں مصر سے علاحدہ کسی مخصوص جگہ پر بسایا جائے گا اور اگر پریشانی نہ ہو تو انہیں مسلمانوں کے بستیوں میں رہنے کی اجازت ہوگی، تاکہ وہ لوگ محاسن اسلام کو قریب سے دیکھ سکیں (الاشباہ مع الحموی ۳/ ۹۹ ۳ الفن الثالث، احکام الذمی دارالکتب العلمیہ بیروت)۔

اسی طرح انہیں مکانات کا تحفظ حاصل ہوتا ہے، کیونکہ مکان انسان کے رازوں کا امین ہوتا ہے، اور یہیں وہ اپنے خاندان والوں کے ساتھ چین وسکون کی زندگی گذارتا ہے، اس لئے فطری بات ہوتی ہے کہ ان مکانات کی حرمت ہو، اس وجہ

سے شریعت نے بھی ذمیوں کے مکانات کی حرمت کو برقرار رکھا ہے، چنانچہ بغیر اجازت اور رضامندی کے ان کے گھروں میں داخلہ ممنوع ہوگا، قرآن کریم نے دوسرے کے گھروں میں بلا اجازت داخل ہونے سے منع کیا ہے، اور عقد ذمہ کی وجہ سے وہ بھی مسلمانوں کے مثل ہوئے تو انہیں آیات سے ان کے مکانوں میں داخلہ بغیر اجازت ممنوع ہوگا (سورۂ نور: ۲۸،۲۷)۔

اسی طرح اسلام نے ان کی مذہبی آزادی کو برقرار رکھا ہے اور انہیں زبردستی دین میں داخل نہیں کیا جاتا ہے، "**لا إکراہ فی الدین**" (سورۂ بقرہ: ۲۵۶)، البتہ انہیں دین کی دعوت، اسلام کے محاسن حکمت ودانائی کے ساتھ بتائے جاتے رہیں گے، نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ ہوا تھا، اس وثیقے میں آپ نے درج ذیل مضمون بھی تحریر کروائے، "**ولنجران و حاشیتها جوار اللہ وذمة محمد النبي رسول اللہ ﷺ علی أموالهم وأنفسهم وأرضهم وملتهم**" (کتاب الخراج لأبی یوسف: ۷۲ فصل قصۃ نجران وأہلہا دار المعرفۃ)۔

اسی طرح انہیں وہ سارے معاشرتی حقوق دیئے گئے ہیں جو کسی ملک میں رہنے والے باشندوں کو ملتے ہیں، مثلاً ان کے ساتھ بیع وشراء کرنا جائز ہے، بیمار پرسی اور عیادت جائز ہے، ضیافت کرنا جائز ہے، اس طرح کے حقوق کو ابن نجیمؒ نے "الاشباہ" میں "الفن الثالث" میں "احکام الذمی" کے عنوان سے بہت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔

"**ولا تکرہ عیادۃ جارہ الذمی...... ولا تکرہ ضیافة**" (الاشباہ ۳/ ۴۰۲ طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

اسی طرح شریعت نے انہیں تعلیمی آزادی دے رکھی ہے، چنانچہ وہ اپنی اولاد کو اگر اپنے دین ومذہب کے موافق تعلیم دیں تو شریعت ان پر قدغن نہیں لگاتی۔

مسلمانوں نے جب خیبر فتح کرلیا تو مال غنیمت میں تورات کے کچھ نسخے ملے تھے، آپ ﷺ نے انہیں یہودیوں کو لوٹانے کا حکم دیا تھا۔

اسی طرح اظہار رائے کی آزادی حاصل ہوتی ہے اور حکومت کی عام سہولیات سے بھی وہ متمتع ہوتے ہیں، مثلاً مواصلات، آبی وسائل وغیرہ، اور ضرورت کے موقع پر بیت المال سے ان کی کفالت بھی کی جاتی ہے، چنانچہ سعید بن مسیّبؒ سے مروی ہے کہ ایک یہودی کے گھر پر صدقہ کیا تھا اسی طرح جب مکہ میں قحط پڑا تو آپ ﷺ نے کچھ چیزیں وہاں بھجوائیں تھیں، تاکہ ضرورت مندوں پر انہیں خرچ کردیا جائے۔

حضرت عمر فاروقؓ جب دمشق سے واپس آرہے تھے تو ان کا گزر کچھ مجذوم نصاری کے پاس سے ہوا تھا تو آپ نے ان پر صدقہ کرنے اور کچھ وظیفہ مقرر کرنے کا حکم دیا تھا (احکام الذمیین ۱۰۲-۱۰۴ طبع موسسۃ الرسالۃ)۔

درمختار میں ہے: "**ولا شئ لذمي في بیت المال إلا أن یهلک بضعفه نیعطیه ما لیسدجوعته**" (الدر

المختار مع رد المحتار ۶/۳۵۲ کتاب الجہاد باب العشر والخراج طبع زکریا)۔

اسی طرح شریعت انہیں دار الاسلام میں معاشی اور تجارتی سرگرمی کی اجازت دیتی ہے، فقہاء کی عبارات سے واضح ہے کہ ذمی معاملات وتجارات اور تمام تصرفات میں مسلمانوں کے مانند ہیں، علاوہ ان چند امور کے جنہیں مستثنی رکھا گیا ہے، مگر خمر وخنزیر کی ان کے اپنے علاقے میں بیع وشراء کرنا۔

ثانیا:

وہ عہدے جن میں دیانت لازمی نہیں ہوتی ان عہدوں پر ذمیوں کو مامور کیا گیا ہے، اس سلسلے کے ہم یہاں چند نظائر نقل کررہے ہیں۔

۱-غزوہ بدر کے موقع پر ستر کفار قیدی بنائے گئے تھے، جو فدیہ دے کر خلاصی حاصل نہ کر سکے تھے، آپ ﷺ نے انہیں انصار کے دس دس بچوں کو فن کتابت سکھانے پر مامور کیا تھا۔

سیرت کی کتابوں میں یہ واقعہ ملتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ۶ ھ میں مکہ کا رخ کر کے ذو الحلیفہ پہنچے تھے تو ایک کافر کو قریش کے احوال معلوم کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا، حالانکہ یہ خطرناک کام تھا، مگر آپ کو اس پر اعتماد تھا، اس لئے یہ نازک ذمہ داری اس کو سونپی تھی، اس لئے معلوم ہوا کہ جس پر اطمینان ہو اس کو عہدہ دیا جا سکتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے پاس قیساریہ کے قیدی آئے ان میں بعض کتابت جانتے تھے تو آپ نے ان کو سارے مسلمانوں کو سکھانے پر مامور کیا تھا۔

سلیمان بن عبد الملک نے رملہ فلسطین میں مسجد کی تعمیر کے دوران ایک نصرانی جس کا نام البطریق تھا مسجد کی نگرانی اور نفقات پر مامور کیا تھا۔

مسلمانوں نے جب مصر فتح کر لیا تو بازنطینی عاملوں کو ان کے عہدوں پر برقرار رکھا گیا۔ حضرت معاویہؓ کا کاتب ''سرجون'' نامی نصرانی تھا۔ اموی دور حکومت میں ''اثنا سیپوس'' نامی نصرانی حکومت کے کلیدی عہدے پر فائز رہ چکا ہے، حتی کہ کوئی بھی رجسٹر ان کے ناموں سے خالی نہیں رہا ہے۔ عباسی دور حکومت میں ابو جعفر المنصور کے زمانے میں ''موسیٰ'' نامی یہودی جاسوس رہ چکا ہے، اسی وجہ سے مغرب کے متعصب مؤرخ بھی یہ کہنے پر مجبور ہوئے۔

ہمیں بہت تعجب ہوتا ہے جب ہم اسلامی تاریخ میں غیر مسلموں کو حکومت کے مناصب پہ دیکھتے ہیں (احکام الذمین ۷۹-۸۰)۔

ان تمام حقوق اور واقعات سے یہ بات واضح ہوئی ہے کہ شرعاً ان کو شہریت دی جاسکتی ہے، شرعاً ناجائز نہیں ہے، البتہ فی زماننا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو آباد کیا جاسکتا ہے، علاحدہ مسئلہ ہے، اس کا بیان آگے آرہا ہے۔

دوسری بحث: کس طرح کے کافروں کو امان دی جائے گی؟

یہود و نصاری جو اہل کتاب ہوں ان سے عقد ذمہ کرنا (انہیں شہریت دینا) جائز ہے، اور اس کا ثبوت نص قرآنی ہوتا ہے، اس میں کسی کا اختلاف نہیں (بدائع ۹/ ۴۲۸، کتاب السیر دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

مجوسیوں کو بھی ذمی بنانا جائز ہے (بدائع ۹/ ۴۲۸ - ۴۳۳ دار الکتب العلمیہ)۔

مشرکین عرب کو ذمی بنانا جائز نہیں ان کے سامنے دو راستے ہیں، یا تو وہ اسلام قبول کرلیں، ورنہ ان سے جہاد ہے، ان سے جزیہ لینا جائز نہیں، کیونکہ سورۂ توبہ آیت / ۵ مشرکین عرب کے بارے میں آئی ہے، ان سے قتال کا حکم ہے، ان کے راستے کو چھوڑنے سے منع کیا گیا ہے، ہاں اگر وہ توبہ کرلیں، یعنی مسلمان ہوجائیں تو راستہ چھوڑ دیا جائے گا (بدائع ۹/ ۴۲۸ کتاب السیر بیان ما یتعرض لہ و ملا یتعرض لہ دار الکتب العلمیہ)۔

مرتدین سے بھی عقد ذمہ کرنا جائز نہیں، ان کے سامنے صرف دو راستے ہیں یا تو وہ دین کی طرف لوٹ جائیں یا وہ قتال کے لئے تیار ہوجائیں (ہامش البدائع ۹/ ۴۲۹ کتاب السیر دار الکتب العلمیہ)۔

تیسری بحث: کن خطوں میں مستقلاً امان دی جاسکتی ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فقہاء کرام نے دار الاسلام کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، حرم، حجاز اور ان کے علاوہ کے مقامات، حرم میں غیر مسلموں کا اپنا وطن اور مسکن بنانا قطعاً جائز نہیں ہے۔

حجاز: اس سے مکہ مکرمہ، مدینہ منورہ، یمامہ اور ان کے دیہات طائف خیبر وغیرہ مراد ہیں، اس میں ذمیوں کو سکونت اختیار کرنا جائز نہیں، یہ ائمہ اربعہ کا متفق علیہ مسئلہ ہے (بدائع ۹/ ۴۵۰ کتاب السیر طبع دار الکتب العلمیہ بیروت)۔

نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا: "**لا يجتمع دينان في جزيرة العرب**" (مسند احمد ۶/ ۲۷۵ طبع مکتبہ میمنیہ)۔

"**وقال أيضا: لأخرجن اليهود والنصارى من جزيرة العرب حتى لا أدع إلا مسلما**" (کتاب الجہاد والسیر، اخراج الیہود والنصاری من جزیرۃ العرب)۔

ان دونوں کے علاوہ جو زمین ہے وہاں مستقلاً اقامت اختیار کرنا جائز ہوگا، علامہ کاسانی نے ذمیوں کے پورے احکام بیان کرنے کے بعد لکھا ہے: "**هذا الذي ذكرنا حكم أرض العجم**" (بدائع ۹/ ۴۵۱ کتاب الجہاد دار الکتب العلمیہ)۔

خلاصہ: ایسا غیر مسلم جو مرتد نہ ہو اسے حجاز کے علاوہ میں شہریت دینا جائز ہوگا، البتہ اگر ان کو مستقل شہری بنانے سے اسلام کا نقصان ہو یا مسلمانوں کو ضرر ہو یا ملکی قومی مذہبی مصالح متاثر ہوں تو ان کو شہری نہیں بنایا جائے گا۔

نقشہ:

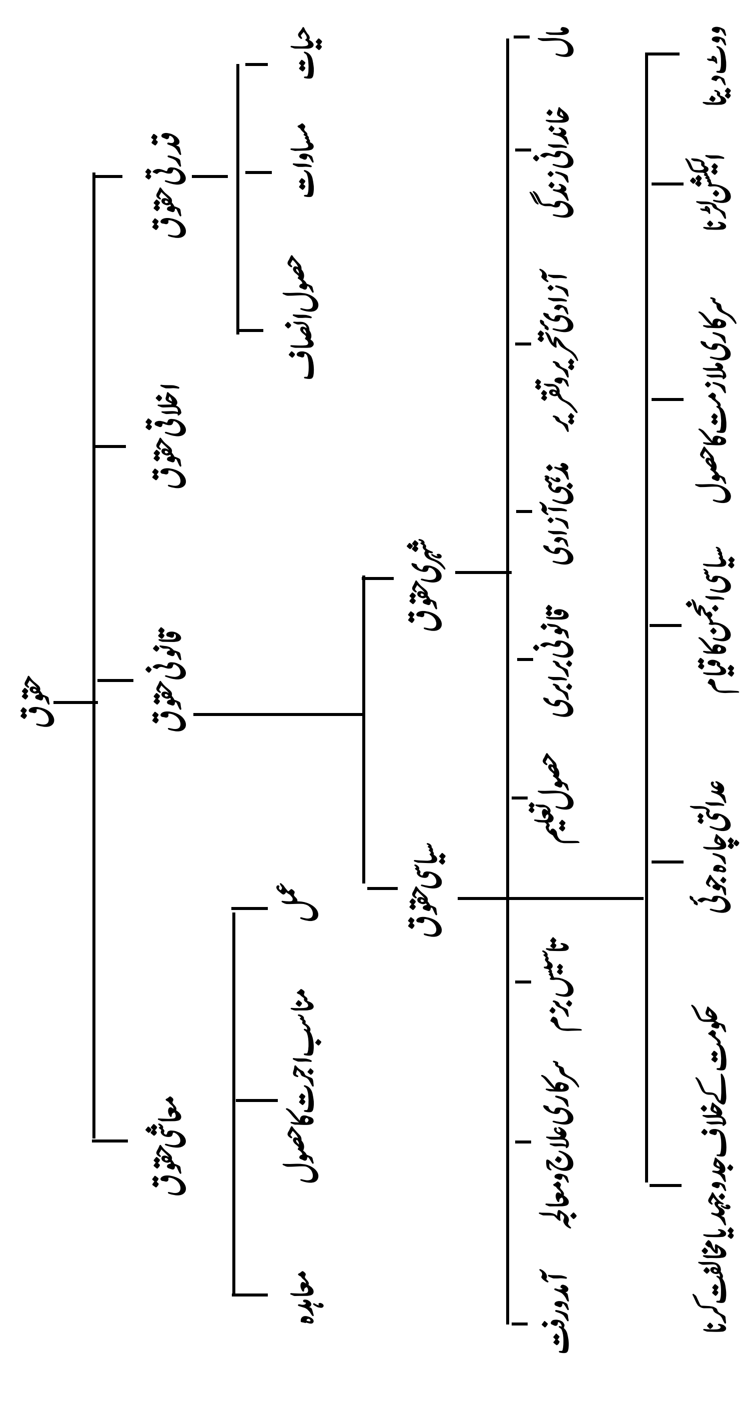
حقوق
قدرتی حقوق
اخلاقی حقوق
قانونی حقوق
معاشی حقوق
حیات
مساوات
حصول انصاف
عمل
مناسب اجرت کا حصول
معاہدہ
شہری حقوق
سیاسی حقوق
مال
خاندانی زندگی
آزادی تحریر و تقریر
مذہبی آزادی
قانونی برابری
حصول تعلیم
تاسیس بزم
سرکاری علاج و معالجہ
آمدورفت
ووٹ دینا
الیکشن لڑنا
سرکاری ملازمت کا حصول
سیاسی انجمن کا قیام
عدالتی چارہ جوئی
حکومت کے خلاف جدوجہد یا مخالفت کرنا

اسلام میں شہریت کی بنیادیں

مولانا محمد فخر عالم نعمانی☆

شہریت کی تعریف:

شہریت موجودہ قانون کی نگاہ میں فرد اور حکومت کے درمیان ایک مخصوص سیاسی اور قانونی رابطہ کا نام ہے جس کی بنیاد پر ایک دوسرے پر کچھ حقوق عائد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے بعض تقاضوں اور واجبات کی تعمیل کرنی پڑتی ہے، یہ وہ قانونی رشتہ ہے جس کی بنیاد پر ایک فرد کا وجود اور تشخص اس حکومت کی طرف منسوب ہوجاتا ہے، جہاں کا وہ شہری ہے، مثلاً ہندوستانی، پاکستانی، امریکی اور سعودی وغیرہ۔

شہریت کی دو قسمیں ہیں:

۱- پیدائشی شہریت: جس ملک میں بچہ کے والدین رہتے ہیں پیدا ہونے والے بچے کو بلا اختیار اس ملک کی شہریت مل جائے۔

۲-اختیاری شہریت: وہ ہے جو کوشش کر کے حاصل کی جائے، مثلاً اس ملک کی کسی لڑکی سے شادی کر لی جائے یا حکومت سے درخواست کر کے شہریت حاصل کی جائے۔

جیسے امریکی آئین کی چودھویں ترمیم ۱۸۶۸ء کے مطابق ہر امریکی شہری کو اپنی ریاست کی شہریت اور وفاق کی شہریت حاصل ہے، امریکن والدین کی اولاد، خواہ وہ کہیں پیدا ہوا امریکی شہری ہی ہوگا، اسی طرح امریکہ میں پیدا ہونے والا بچہ، خواہ اس کے والدین غیر ملکی ہوں، امریکی ہوگا، جو لوگ امریکہ کی شہریت اختیار کرنا چاہتے ہیں انہیں انگریزی زبان امریکی تاریخ اور طرز حکومت کے اصولوں سے واقف ہونا، دس سال تک امریکہ میں مقیم رہنا اور یہ حلف لینا پڑتا ہے کہ وہ گذشتہ دس سال سے کسی ایسی تنظیم سے منسلک نہیں ہے جس کا مقصد امریکی حکومت کا تختہ الٹنا ہے (قوانین عالم ۲/ ۵۲)۔

پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد سابقہ ملک کی شہریت منسوخ ہوجاتی ہے اور کبھی

☆ خادم تدریس والافتاء جامعہ ربانی، منوراشریف، سمستی پور۔

یہ بھی ممکن ہے کہ نئے ملک کی شہریت حاصل ہونے کے بعد بھی سابقہ ملک کی شہریت برقرار رہے۔ یہ مختلف ملکوں کے اپنے اپنے معاہدات کی روشنی میں طے پاتا ہے کہ کس ملک کے شہری کے ساتھ کیا معاملہ روا رکھا جائے، پھر جب کوئی شخص کسی غیر اسلامی ملک کا شہری بن جاتا ہے تو اس کو وہ تمام حقوق ومراعات حاصل ہوجاتے ہیں جو ایک پیدائشی شہری کو حاصل ہوتے ہیں، تشکیل حکومت کے عمل میں شرکت کرسکتا ہے، اقتصادی مسابقت میں حصہ لے سکتا ہے، ملازمت حاصل کرسکتا ہے، زمین وجائداد خرید سکتا ہے اور تمام وہ ضمانتیں جو بحیثیت شہری ملنی چاہئے مل جاتی ہیں، اسی کے ساتھ اس پر بعض واجبات اور مطالبات بھی عائد ہوتے ہیں جن کی تکمیل بحیثیت فرد اس کو کرنی پڑتی ہے، فوجی خدمات اس سے لی جاسکتی ہیں، ملک کے آئین کا احترام اور اس کی اطاعت لازم ہوجاتی ہے، مقررہ ٹیکسوں کی ادائیگی کا وہ پابند ہوتا ہے، وطنیت کا یہ تصور اور وطن کے ساتھ اس قسم کی وابستگی اسلامی تعلیمات کا جز لاینفک رہی ہے، نبی کریم ﷺ اور آپ کے جانثار مہاجرین صحابہؓ نے جب مکہ کو خیر باد کہا اور مدینہ کو اپنا وطن قرار دیا تو نبی کریم ﷺ نے اس کی محبت دل میں جاں گزیں ہونے کی دعا فرمائی (صحیح بخاری جلد ۲ر ص ۶۶۷، حدیث نمبر: ۱۷۹۰ دار ابن کثیر بیروت ۱۹۸۷)۔

شہریت کی بنیاد:

۱- اس سلسلے میں قرآن کریم کی کوئی آیت یا حدیث پاک میں کوئی روایت تو موجود نہیں ہے، البتہ فقہاء کرام کی چند جزئیات سے اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے، اس فقہی جزئیہ کو ہم اصول کے طور پر اپنا سکتے ہیں۔

علامہ کاسانیؒ مستامن کی بحث میں لکھتے ہیں کہ اگر وقتی قیام کے ارادہ سے دار الاسلام میں آنے والا شخص (مستامن) ایک مخصوص مدت تک قیام کرلے، یا وہاں کے متوطن سے شادی کرلے، یا کوئی خراجی زمین خرید لے تو اس کو ذمی، یعنی دار الاسلام کا باقاعدہ شہری قرار دیا جائے گا (البدائع الصنائع ۶ر۷۸، مکتبہ زکریا دیوبند ۱۹۹۸، الاحکام السلطانیہ للماوردی ر ص ۱۴۶)۔

اسی طرح وطن کے سلسلہ میں جو تفصیلات فقہی کتابوں میں مذکور ہیں ان تفصیلات سے بھی اس مسئلہ پر روشنی پڑتی ہے۔

"وطن أصلی وهو مولد الرجل والبلد الذی تأهل به" (المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی ۲ر ۳۵،۳۶، دار الکتب العلمیہ، بیروت لبنان ۲۰۰۴ء) (وطن اصلی مقام پیدائش ہو یا اس نے وہاں شادی کی ہو)۔

"أو بلدة أخرى اتخذ هادارا وتوطن بها مع أهله وولده ولیس من قصده الارتحال عنها، بل التعیش بها" (بدائع الصنائع ۱ر ۲۸۰، مکتبہ زکریا دیوبند ۱۹۹۸) (کسی مقام پر اس نے اپنا گھر بنالیا ہو اور اہل وعیال کے ساتھ وہاں مستقل بود وباش کا ارادہ کرلیا اور وہاں سے واپسی کا کائی ارادہ نہ ہو)۔

فقہاء کرام کی ان جزئیات سے تین باتیں سامنے آتی ہیں جن کو شہریت کے مسئلہ میں بنیاد بنایا جاسکتا ہے:

۱-ولادت، یعنی اس جگہ اس کی پیدائش ہوئی ہو، ۲-نکاح، یعنی جہاں کسی شخص کا وہاں کی کسی شہری خاتون سے رشتہ ازدواج قائم ہوا ہو، ۳-مستقل بودوباش کا رادہ، یعنی جس جگہ مستقل رہنا چاہتا ہو واپسی کا ارادہ نہ ہو۔

حضرت علامہ محمود ابن مازہ بخاری شہیدؒ متوفی ۶۱۶ھ نے اپنی کتاب ''المحیط البرہانی فی الفقہ النعمانی'' میں ذکر فرمایا ہے کہ یہ تینوں بنیادیں مستقل حیثیت رکھتی ہیں ان میں سے ایک بھی بنیاد موجود ہو تو شہریت حاصل ہوجائے گی، اس بنیاد پر اگر کسی شخص کو دو الگ الگ مقامات پر ان میں سے کوئی ایک چیز حاصل ہوجائے تو اسے دوہری شہریت حاصل ہوگی اور دونوں جگہیں اس کے لئے وطن اصلی ہوں گی۔

''وإن كان له أهل بلدة فاستحدث بلدة أخرى أهلا فكل واحد منهما وطن أصلي، وروى أنه كان لعثمان رضى الله عنه أهل بمكة وأهل بمدينة، وكان يتم الصلوة بهما جميعا''(المحیط البرہانی ۳۶/۲)۔

(اگر کسی کے اہل وعیال ایک شہر میں ہوں پھر دوسرے شہر میں اس نے شادی کرلی تو دونوں شہروں کی شہریت اسے حاصل ہوں گی، روایت میں آتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی ایک بیوی مکہ معظّمہ میں رہتی تھیں اور دوسری اہلیہ مدینہ منورہ میں اور دونوں جگہ وہ نماز پوری پڑھتے تھے)۔

مسلم ملک میں کسی بیرونی مسلمان کو شہریت دینے کا حکم:

اسلام کا شہری اصول عام حالات کے لئے یہی ہے کہ آنے والے مہاجرین کو اسلامی حکومت قبول کرے، واپس نہ کرے، قرآن کریم میں ارشاد ہے: **''یا یها الذین آمنو إذا جائتكم المؤمنات مهاجرات فامتحنوهن الله اعلم بإيمانهن فإن علمتموهن مومنات فلا ترجعوهن إلى الكفار''**(سورۂ ممتحنہ:۱۰) اگرچہ یہ حکم مخصوص پس منظر میں، یعنی صلح حدیبیہ کے موقع پر دیا گیا تھا، لیکن حنفیہ کے نزدیک صلح حدیبیہ کا واقعہ دائمی نہیں تھا وقتی تھا بعد میں اس کو منسوخ کردیا گیا، صلح منسوخ ہونے پر یہی آیت دال ہے (فتح القدیر ۴۶۰/۵، دارالفکر بیروت لبنان ۱۹۷۷)۔

دوسری بات یہ ہے کہ اگر اسلامی ریاست غیر مسلم ملکوں سے مہاجرین کے معاملہ میں کوئی معاہدہ کرلے جس کی رو سے دوسرے ملکوں کے مہاجرین کو اسلامی حکومتیں اپنے یہاں مستقل سکونت نہ دے سکتی ہو تو یہ شرط حنفیہ کے نزدیک باطل ہے اور اس طرح کے کسی معاہدہ کو پورا کرنا ضروری نہیں ہے (فتاوی ہندیہ جلد ۱۹۷/۲ دارالفکر بیروت لبنان)۔

اسی طرح قرآن کریم کی ایک دوسری آیت کریمہ: **''إن الذين توفاهم الملائكة ظالمى أنفسهم قالوا فيم كنتم قالوا كنا مستضعفين فى الأرض قالوا ألم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها فأولئك**

ماواهم جهنم وسات مصيرا"(سورۂ نساء:۹۷)اس آیت کریمہ کی عبارت النص ودلالۃ النص جہاں دارالکفر کی اقامت کو جرم قرار دے رہی ہے وہیں اشارۃ النص اسلام کی بنیاد پر قائم ہونے والی حکومت کومہاجرین کے لئے دارالاسلام میں قیام کی گنجائش کو بھی ثابت کر رہی ہے، اسلام نے ہمیشہ دارالکفر میں قیام کو ناپسند کیا ہے، نبی کریم ﷺ نے ارشادفرمایا:"**لا تساكنوا المشركين ولا تجامعوهم فمن ساكنهم أو جامعهم فهو مثلهم**" (ترمذی کتاب السیر باب ماجاء فی کراہیۃ المقام بین اظہر المشرکین ۱/۲۸۹) (مشرکوں کے ساتھ رہن سہن اور اٹھنے بیٹھنے سے پرہیز کرو جو ان کے ساتھ رہن سہن یا اٹھنا بیٹھنا کرے گا انہیں کی طرح سمجھا جائے گا)۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں:"**من جامع المشرك وسكن معه فإنه مثله**"(ابوداؤد کتاب الجہاد باب فی الاقامۃ بارض الشرک ۲/۷۳ مکتبہ رحیمیہ دیوبند) (جوشخص مشرکوں کے ساتھ رہنا سہنا کرے گا اسی کے مثل ہوگا)۔

ایک موقع پر ارشادفرمایا:"**انا برئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين، قالوا يارسول الله! ولم؟ قال: لاترآى ناراهما**"(ترمذی کتاب السیر باب ماجاء فی کراہیۃ المقام بین اظہر المشرکین ۱/۲۸۹) (میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو،لوگوں نے عرض کیا یارسول اللہ! کیوں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: دونوں اتنی دور رہیں کہ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کی آگ نہ دیکھ سکے)۔

اسی طرح دارالہجرت پہلی اسلامی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد مختلف علاقوں میں اسلام قبول کرنے والے لوگوں کو دارالہجرت منتقل ہونے کی باقاعدہ دعوت دی گئی، حضرت سلیمان بن بریدہ کی روایت جو مختلف کتابوں میں مذکور ہے۔

"**إذا لقيت على والله من المشركين فادعهم إلى ثلاثة خصال أو خلال فأيتهن أجابوك فاقبل منهم وكف عنهم ثم أدعهم إلى الاسلام، فإن أجابوك فاقبل منهم وكف عنهم، ثم ادعهم إلى التحول من دراهم إلى دار المهاجرين وأخبرهم أنهم فعلواذلك فلهم ما للمهاجرين وعليهم ما على المهاجرين**"(مسلم شریف کتاب الجہاد باب تامیر الامام الامراء علی البعوث وصیۃ ایاہم ۲/۸۲)۔

(غیرمسلموں سے سامنا ہو تو ان کو تین باتوں کی دعوت دو، اگر ان میں سے کوئی ایک بات بھی قبول کرلیں تو جنگ سے گریز کرو ان کو اسلام کی دعوت دو اگر وہ قبول کرلیں تو جنگ سے گریز کرو، پھر ان کو اپنے ملکوں سے دارالہجرت منتقل ہوجانے کی دعوت دو اور ان کو بتاؤ کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کو وہی ملے گا جو مہاجرین کو ملتا ہے اور ان پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو مہاجرین پر عائد ہوتی ہیں)۔

نبی کریم ﷺ کا یہ فرمان مملکت اسلامی کے سربراہان پر مسلم مہاجرین کی ذمہ داری کو ثابت کر رہی ہے، کیونکہ ہجرت کے حکم سے قبل مقام ہونے کا وجود شرط ہے، بغیر مقام ہجرت کے ہجرت کا حکم بے معنی ہے۔

۳-مسلم ملک میں مسلم پناہ گزیں کا حکم:

سیاسی پناہ گزینوں کی دو قسمیں ہیں: ۱-سیاسی پناہ کا قیام وقتی ہو، ۲-سیاسی پناہ گزین کا قیام وقتی نہ ہو مستقل ہو، عام طور پر سیاسی پناہ گزینوں کا قیام کسی ملک میں وقتی ہوتا ہے، جب تک ان کے ملک کے حالات خراب ہوتے ہیں تب تک وہ پناہ لئے رہتے ہیں، جیسے ہی ان کے ملک کے حالات اچھے ہوتے ہیں وہ پناہ گزین اپنے ملکوں کو واپس لوٹ جاتے ہیں، اگر کسی طرح کا کوئی مسلم پناہ گزیں اپنے ملک کے مسائل کی بنیاد پر کسی مسلم ملک میں وقتی قیام کے ارادہ سے پناہ حاصل کرلے تو اس کو عام شہری کا درجہ نہ دے کر اس کے ساتھ سیاسی پناہ گزینوں جیسا برتاؤ کرنے میں شرعا کوئی حرج نہیں ہے، اس کی مثال عہد نبوت میں موجود ہے، نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کے بارے میں جو مدینہ سے باہر قیام پذیر تھے، ارشاد فرمایا: ”**فإن أبوأن يتحولوا منها فأخبرهم أنهم يكونون كأعراب المسلمين يجرى عليهم حكم الله الذى يجرى على المؤمنين، ولا يكون لهم فى الغنيمة والفئ شئ، إلا أن يجاهد وامع المسلمين**“ (مسلم شریف کتاب الجہاد باب تامیر الامام الامراء علی البعوث ۲/ ۸۲)۔

(اگر یہ لوگ دار الہجرت میں واپس ہونے پر رضامند ہوں تو ان کو خبر دار کردو کہ وہ اعرابی مسلمان کے درجہ میں ہوں گے اور حکم الٰہی کے اسی طرح پابند ہوں گے جس طرح دیگر مسلمان پابند ہیں، مگر ان کو مال غنیمت اور فیٔ میں کوئی حصہ نہیں ملے گا جب تک کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شرکت نہ کریں، نیز اسلام کا متفقہ قاعدہ ہے کہ ”**المغنم بالمغرم فى الإسلام**“ (درر الحکام شرح مجلۃ الاحکام ۱/ ۹۰) (نفع نقصان کے ساتھ جڑا ہوا ہے)۔

سیاسی پناہ گزیں کا قیام مستقل ہو:

لیکن اگر کوئی مسلم پناہ گزیں مستقل طور پر اپنا ملک خیر باد کہہ کر مسلم ملک میں آباد ہونا چاہتے ہیں تو اس کو شہریت سے محروم کرنا اور مستقل شہریوں کا درجہ نہ دینا ان کے ساتھ امتیازی برتاؤ کرنا، پناہ گزینوں جیسا معاملہ کرنا، قدیم باشندوں جیسا سلوک نہ کرنا درست نہ ہوگا، فرمان نبی کے خلاف ہوگا، کیونکہ مذکورہ روایت میں ”**إلا أن يجاهد وامع المسلمين**“ کی شرط ہے، یعنی اگر کوئی مسلم پناہ گزیں مستقل شہری بن کر مجاہدوں کے ساتھ جہاد میں شریک ہو (یعنی ملک کے مفاد میں حصہ لے) تو اس کو بھی ایک عام شہری کی طرح تمام سہولیات فراہم کی جائیں گی، قرآن کریم میں بھی اس کا واضح ثبوت موجود ہے: ”**ان الذين آمنوا وهاجروا وجاهدوا بأموالهم وأنفسهم فى سبيل الله والذين أووونصروا**

أولئک بعضهم أولياء بعض" (سورۂ انفال:۷۲)۔

"والمومنين والمؤمنات بعضهم اولياء بعض" (سورۂ توبہ:۷۱)۔

حدیث شریف میں ہے: "من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا وأكل ذبيحتنا فهو المسلم له ماللمسلم وعليه ما على المسلم" (صحیح بخاری شریف ۱/ ۱۵۳، حدیث نمبر ۳۸۵ دار ابن کثیر بیروت ۱۹۸۷ء) (جو ہماری طرح نماز پڑھے ہمارے قبلہ کا استقبال کرے اور ہمارا ذبیحہ کھائے وہ مسلمان ہے، اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمان کو حاصل ہے اور اس پر وہ تمام واجبات عائد ہوں گی جو مسلمانوں پر عائد ہوتی ہیں)۔

۶-مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ملک میں شہریت کا مسئلہ:

متقدمین فقہاء نے مسلمانوں کو ایک غالب قوت تسلیم کرتے ہوئے غیر مسلموں کے مسائل ومعاملات پر گفتگو کی اور مسلمان اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کی جو نوعیت ممکن تھی اسی کے مطابق احکام کا استخراج کیا، اسی لئے عام فقہی کتابوں میں بالعموم ایک ہی انداز کی بحثیں ملتی ہیں، اس دور میں یہ کہاں سوچا جاسکا تھا کہ تاریخ پھر اپنے آپ کو دہرائیگی اور مسلمان پھر کبھی مدینہ کے ابتدائی دور یا حبشی اور مکی دور میں پہنچ جائیں گے، حالانکہ حدیث پاک میں اشارہ کردیا گیا تھا کہ "بدأالاسلام غريبا وسيعود كما بداء" (رواہ مسلم، مشکوۃ شریف باب الاعتصام بالکتاب والسنہ/ص۲۹) (یعنی دین کا آغاز جس غربت کے ساتھ ہوا ہے وہ تاریخ پھر اپنے اپ کو دہرائے گی)۔

غیر مسلم ملکوں کی قسمیں:

فقہاء نے غیر مسلم ملکوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے، اور ان تینوں کے الگ الگ احکام بیان کئے ہیں: ۱-پہلی قسم ان غیر مسلم ممالک کی ہے جہاں بحیثیت مسلمان کسی شخص کا قیام سخت مشکل ہو، دین پر قائم رہ کر وہاں رہنا ممکن نہ ہو، ایسے ملکوں میں جانا وہاں قیام کرنا باتفاق فقہاء کسی مسلمان کے لئے جائز نہیں ہے (احکام القرآن للجصاص ۳/ ۲۲۸، المدونۃ الکبری ۵/ ۱۵۶۵، غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے مسائل/ ۱۶، قاموس الفقہ ۵/ ۳۳۳)۔

دوسری قسم ان غیر اسلامی ممالک کی ہے جہاں کھل کر دین پر عمل کرنے کی آزادی نہ ہو، جان ومال عزت وآبرو پر خطرات کے بادل منڈلاتے رہتے ہوں، مگر مسلمانوں کے لئے کوئی دوسری جائے ہجرت نہ ہو، یا ہجرت کے اخراجات کے متحمل نہ ہوں، ایسے مسلمانوں پر باتفاق فقہاء ہجرت واجب نہیں ہے اور ان ملکوں میں اقامت ان کے لئے باعث گناہ نہیں ہے (احکام القرآن ۳/ ۲۲۸)۔

۳-تیسری قسم ان غیر اسلامی ممالک کی ہے جہاں مسلمانوں کے لئے بحیثیت ایک اقلیت کوئی خطرہ نہ ہو، مذہبی

آزادی حاصل ہو سکے یا اس کی نسلوں کے دین وایمان کو مکمل تحفظ فراہم ہو، ایسے ملکوں میں اقامت اختیار کرنے کے بارے میں علماء کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

۱-ایک رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کے لئے ایسے ملکوں میں جانا یا رہنا بھی جائز نہیں، اگر قدرت میسر ہو تو مقیم مسلمانوں کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب ہے، یہ رائے فقہاء مالکیہ کی ہے اور شافعیہ کا ایک قول بھی اسی کے مطابق ملتا ہے (المدونۃ ۵/۱۵۶۵)۔

۲-دوسری رائے یہ ہے کہ ایسے ملکوں میں جانا قیام کرنا درست ہے اور مقیم مسلمانوں کے لئے وہاں سے ہجرت کرنا واجب نہیں ہے، یہ رائے حنفیہ اور حنابلہ کی ہے اور شافعیہ کا صحیح مسلک بھی یہی ہے (احکام القرآن للجصاص ۲/۳۰۵ اعلاء السنن للتھانوی ۱۲/۳۶۱)۔

دور حاضر کے علماء کے بھی نظریات مختلف ہیں: ۱-علماء کا ایک طبقہ عدم جواز کا قائل ہے، ۲-اور دوسرا طبقہ جواز کا قائل ہے۔

الف-ایک طبقہ اس کو خروج عن الاسلام اور صریح ارتداد کے مترادف قرار دیتا ہے اور ایسے تمام حضرات پر مرتدین کے احکام جاری کرنے کے قائل ہیں جو غیر مسلم ملکوں میں مقیم ہیں (فتاوی الامام محمد رشید رضا ۵/۱۷۵۰)۔

ب-دوسرا طبقہ اس کو ارتداد نہیں کہتا، بلکہ صرف معصیت قرار دیتا ہے (مجلہ فقہ اسلامی ۲/۱۱۵۶)۔

۲-پھر جواز کے قائلین میں بھی دو رائیں ہیں: الف-ایک کی رائے یہ ہے کہ اس کی گنجائش صرف بوقت ضرورت ہے، عرب علماء میں شیخ احمد بن احمد الخلیلی اور رکن مجمع الفقہ الاسلامی کی یہی رائے ہے، مصری دار الافتاء نے بھی اسی کے مطابق فتوی دیا ہے (فتوی نمبر ۸۸۹، ۲۰۰۰ء)۔

ب-دوسری رائے اصلا جواز کی ہے، البتہ حالات وظروف اور اغراض ومقاصد کے لحاظ سے حکم کی نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے، عصر حاضر کے جمہور علماء کی یہی رائے ہے، اس رائے کے حامل چند مشہور نام یہی ہیں: ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ڈاکٹر محمد رفت عثمانی، ڈاکٹر وہبہ زحیلی، مفتی محمد تقی عثمانی، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی اور مفتی اختر امام عادل قاسمی وغیرہ۔

قائلین عدم جواز کے دلائل:

جو حضرات عدم جواز کی رائے رکھتے ہیں ان کے موقف کی درج ذیل دلیلیں ہیں:

۱-"ألم تر إلى الذين يزعمون أنهم آمنوا بما أنزل إليك، وما أنزل من قبلك يريدون أن يتحاكموا إلى الطاغوت وقد أمروا أن يكفروا به ويريد الشيطان أن يضلهم ضلالا بعيدا" (سورۂ نساء: ۶۰)۔

طاغوت سے مراد وہ نظام قانون ہے جو اسلامی شریعت کے خلاف ہو، غیر مسلم ملک میں شہریت حاصل کرنا گویا باختیار اسلامی نظام قانون سے نکال کر طاغوتی نظام قانون میں داخل ہونا ہے، ظاہر ہے کہ یہ اسلام سے انحراف ہے (فتاوی محمد رشید رضا مصری ۵/ ۱۷۵۵)۔

۲-بعض احادیث سے بھی ان حضرات نے استدلال کیا ہے جن میں صراحت کے ساتھ غیر مسلموں کے درمیان اقامت وسکونت سے منع کیا گیا ہے، "**لاتساكنوا المشركين ولاتجامعوهم فمن ساكنهم أو جامعهم فهو مثلهم**" (ترمذی باب ماجاء فی کراہیۃ المقام کتاب السیر ۱/ ۲۸۹) (مشرکوں کے ساتھ نہ رہو اور نہ ان کے ساتھ اکٹھے ہو جو ان کے ساتھ رہے گا یا اکٹھے ہوگا وہ انہیں کی طرح سمجھا جائے گا)۔

۳-"**أنا بري من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين**" (ترمذی کتاب السیر باب ماجاء فی کراہیۃ المقام بین اظہر المشرکین ۱/ ۲۸۹) (میں ہر ایسے مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہتا ہو)۔

جب غیر اسلامی ملکوں میں مقیم مسلمانوں کو ان ملکوں کے چھوڑ دینے کا حکم دیا جا رہا ہے تو مسلم ملکوں سے منتقل ہو کر وہاں جانے کی اجازت کیسے مل سکتی ہے؟

عقلی استدلال:

ایک عقلی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ ایک مسلمان کے غیر اسلامی ملک میں جانے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خود اپنے آپ کو اسلامی قوانین کے سایہ سے نکال کر غیر اسلامی قوانین کے لئے پیش کر رہا ہے، ظاہر ہے کہ کسی صاحب ایمان کو اس کی اجازت نہیں دی جاسکتی (مقدمات ابن رشد مع المدونۃ الکبری ۹/ ۳۱۵۹، المدونۃ الکبری الامام المالک ۵/ ۱۵۶۵)۔

قائلین جواز کے دلائل:

جمہور علماء کے پیش نظر وہ قرآنی آیات ہیں جن میں اسلام کی آفاقیت اور اس کی دعوت عامہ کا ذکر موجود ہے، مثلاً "**هو الذى أرسل رسوله بالهدى و دين الحق ليظهره على الدين كله ولو كره المشركون**" (سورۂ توبہ: ۳۳)، "**وما أرسلنك إلاكافة للناس بشيرا و نذيرا ولكن أكثر الناس لا يعلمون**" (سورہ سبا: ۲۸)، ان آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت دینا کے ہر خطے میں پہنچانا اس امت کا منصبی فریضہ ہے، اس کا تقاضا ہے کہ مسلمان اسلامی ملکوں سے نکل کر غیر اسلامی ملکوں میں جائیں اور اسلام کی دعوت چاردانگ عالم میں پہنچائے۔

صحابہ کرام کا عمل ہمارے لئے بہترین نمونہ ہے کہ انہوں نے سخت مشکل حالات میں اپنا وطن چھوڑ کر غیر اسلامی ملکوں کا سفر کیا، وہاں قیام کیا اور دین کی دعوت دینا کے گوشے گوشے میں پہنچائی۔

قول راجح:

مذکورہ مباحث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جمہور کا موقف ہی زیادہ مضبوط اور لائق ترجیح ہے۔ کیونکہ اب غیر اسلامی ممالک کی صورتحال بدل گئی ہے، آج ان ممالک میں فکر وعقیدہ اور اظہار خیالات ونظریات کی آزادی ہے، اگر عدم جواز کی رائے مان بھی لی جائے تو اس کو استعماری دور پر محمول کیا جائے گا، جبکہ غیر مسلم ملکوں میں کسی صاحب ایمان کا داخلہ مشکل تھا اور اس کو ارتداد کے مترادف مانا جاتا تھا، اب وہ صورت حال باقی نہیں، آج وہاں اسلامی ادارے، دینی تحریکات و تنظیمات کی خاصی تعداد خدمت دین میں مصروف ہے اور ان کے لئے کوئی قانونی یا سیاسی رکاوٹ نہیں ہے، اس لئے آج ان ممالک میں نہ اسلام کے لئے کوئی خطرہ ہے اور نہ مسلمانوں کے لئے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ مسلمانوں کے وہاں داخلہ یا اقامت کو ممنوع قرار دیا جائے۔

کسی عمل کے لئے قیام: اس کی کئی صورتیں ہیں:

الف- اپنے ملک میں معاش کے بنیادی وسائل میسر نہ ہوں، اس کی وجہ سے کوئی مسلمان غیر مسلم ملک چلا جائے اور وہاں اقامت اختیار کرے تو جمہور فقہاء کے نزدیک اس کی اجازت ہے (المبسوط للسرخسی ۱۰/۸۸، احکام القرآن للعربی ۱/۵۱۵)۔

ب- بنیادی وسائل معاش اپنے ملک میں میسر ہوں جس سے زندگی گذر بسر ہوسکتی ہو، مگر اپنی یا اپنے خاندان کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں قیام کرے تو اس کی بھی گنجائش ہے (احکام القرآن لابن العربی ۱/۴۸۶، الجامع لاحکام القرآن للقرطبی ۵/۳۵۱)۔

ج- تجارتی مقاصد کے تحت غیر اسلامی ملکوں میں قیام کیا جائے، جمہور فقہاء کے نزدیک یہ بھی جائز ہے (المبسوط للسرخسی ۱۰/۸۸)۔

بعض اماموں کے نزدیک دنیوی اغراض کے لئے غیر اسلامی ملک میں قیام جائز نہیں ہے (مقدمات ابن رش ۳۱۵۹/۹)۔

طبی اغراض کے تحت قیام:

اگر کسی مرض کا مناسب علاج مسلم ملک میں میسر نہ ہو تو اس کے لئے غیر مسلم ملک کا سفر کرنا اور صحت کے لئے قیام کرنا جائز ہے (فتاوی ورسائل للمسافرین علماء کی ایک جماعت/۳۹)۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو شہریت دینے کا حکم:

فقہی کتابوں میں فقہاء کرام نے اس مسئلہ کو اہم ذمہ کے نام سے ذکر کیا ہے اوران سے متعلق احکام کو پوری تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔

ذمی کی تعریف:

ذمی ہر ایسے غیر مسلم کو کہتے ہیں جس کو حکومت نے جزیہ دے کر ملک میں عام شہری کی طرح رہنے کی اجازت دی ہو اوراس کے بدلے جان ومال کی حفاظت کی ضمانت لی ہو (موسوعہ فقہیہ (اہل الذمہ) ۷/ ۱۳۵)۔

مملکت اسلامی کے اقسام:

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے اسلامی مملکت کو کافروں کے قیام کے اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم فرمایا ہے:

۱-حرم شریف میں کافروں کا داخل ہونا بھی ممنوع ہے۔

"الحرم فلا يجوز للكافر أن يدخله ذميا كان أو مستامنا، وإذا جاء رسول من دار الكفار إلى الإمام والإمام فى الحرم لا بأن له فى دخول الحرم" (تفسیر المظہری ۴/ ۱۶۰ زکریا بکڈ پو دیوبند)۔

۲-حجاز- بلاد حجاز میں کافروں کے داخل ہونے کی گنجائش تو ہے، لیکن اقامت ممنوع ہے۔

"والقسم الثانى من بلاد الاسلام-الحجاز فلا يجوز للكافر الاقامة فيها أكثر من مقام السفر وهو ثلالة أيام لكن جاز له دخولها" (حوالہ بالا)۔

جزیرۃ العرب میں کافروں کے لئے شہریت ممنوع ہونے کی وجہ حضرت عمرؓ کی روایت ہے جو نبی کریم ﷺ سے مروی ہے: **"لأخرجن اليهود والنصرى من جزيرة العرب حتى لاأدع فيها إلا مسلما"** (مسلم شریف، کتاب الجہاد والسیر باب اجلاع الیہود من الحجاز ۲/ ۹۴)۔

"لا يجتمع دينان فى جزيرة العرب" (مسند احمد ۶/ ۲۷۵ طبع المیمنیہ)۔

اور دوسری وجہ حضور کی وصیت ہے: **"عن ابن عباسؓ ان رسول الله ﷺ أوصى بثلاث-قال: أخرجوا المشركين من جزيرة العرب"** (بخاری شریف کتاب الجہاد باب جوائز الوفد ۲/ ۴۲۹)۔

(حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے تین وصیتیں فرمائیں: پہلی وصیت یہ تھی کہ مشرکوں کو جزیرۃ العرب سے باہر نکال دو، اسی وجہ سے جزیرۃ العرب میں کسی غیر مسلم کو شہریت نہیں دیئے جانے پر فقہاء کرام متفق ہیں)۔

۳-باقی اسلامی مملکت، حرم وحجاز کے علاوہ باقی اسلامی مملکت میں چند شرطوں کے ساتھ غیر مسلموں کو شہریت دی جاسکتی ہے، جن شرطوں کی تعمیل غیر مسلم شہریوں کے لئے ضروری ہے۔

کتاب الٰہی کا احترام کریں، ناموس رسالت میں گستاخی نہ کریں، دین اسلام کی تحقیر نہ کریں، کسی مسلم خاتون کی عصمت وعفت کو تارتار نہ کریں، کسی مسلمان کو فتنہ میں مبتلا نہ کریں، باطل کی مدد اوران کے لئے جاسوسی نہ کریں، مسلمانوں کے شہر میں علی الاعلانیہ شراب وخنزیر فروخت نہ کریں، کھلم کھلا فواحش کا اظہار و ارتکاب نہ کریں (الاحکام السلطانیہ للماوردی ر ص ۱۴۵، موسوعہ فقہیہ ۷ ر ۱۳۵، وزارت اوقاف کویت ۱۹۹۳)۔

مگر وہ غیر مسلم جو دارالاسلام کے باشندے نہ ہوں ان کو ضرورت سے زائد دارالاسلام میں ٹھہرنے کی اجازت نہ دی جائے۔

☆☆☆

مروجہ نظامِ شہریت اور اسلامی شریعت

مولانا احمد نور عینی قاسمی ☆

مروجہ نظامِ شہریت — ایک تعارف:

کسی بھی مملکت کی آبادی کا قانونی فرد بننے اور ہر قسم کے شہری وسیاسی حقوق وفرائض حاصل کرنے کے لئے اس مملکت کی شہریت کا حصول ضروری ہے، کسی بھی مملکت میں دوطرح کے لوگ رہتے ہیں، ایک: شہری، دوسرے: غیر ملکی یا اجنبی، شہری کے لغوی معنیٰ ''شہر کا باشندہ'' کے ہیں اور سیاسیات کی اصطلاح میں اس سے مراد مملکت کا وہ باشندہ ہے جسے قانوناً مملکت کے تمام حقوق شہریت سے استفادہ کا حق حاصل ہوتا ہے اور مملکت کی طرف سے عائد ہونے والے فرائض کی انجام دہی قبول کرنی پڑتی ہے، غیر ملکی شخص چونکہ مملکت کا قانونی باشندہ نہیں ہوتا، اس لئے اسے بہت سارے حقوق حاصل نہیں ہوتے، مثلاً وہ ووٹ نہیں دے سکتا، الیکشن نہیں لڑسکتا وغیرہ، اسی طرح وہ بہت سے فرائض سے بھی سبک دوش رہتا ہے۔

شہریت کی قسمیں (Kinds of Citizenship)

شہریوں کی دو قسمیں ہیں: پیدائشی شہری (Natural Citizen) اور اکتسابی شہری (Naturalised Citizen) ان دونوں قسموں کے پیش نظر حصولِ شہریت کے دوطریقے مروج ہیں: پیدائشی اور اکتسابی۔

۱- پیدائشی شہریت (Natural Citizenship)

پیدائشی شہریت سے مراد پیدائش کی بنیاد پر ملنے والی شہریت ہے، اس کے لئے کسی قانونی کاروائی کی ضرورت نہیں؛ بلکہ بچہ کا پیدا ہوجانا ہی حصولِ شہریت کے لئے کافی ہے، پیدائش کی بنیاد پر حاصل ہونے والی شہریت کے دو اُصول ہیں، ایک: جائے پیدائش کا اُصول، دوسرا: خونی رشتہ کا اُصول، پہلے کو اصطلاح میں "Jussoli" اور دوسرے کو "Jussan Guinis" کہا جاتا ہے، پہلے اُصول کے مطابق بچے کے والدین کی شہریت سے قطع نظر بچے کی جائے پیدائش

☆ شعبۂ تحقیق وتالیف: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

کا اعتبار کیا جاتا ہے، سیاسیات کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ارجنٹائنا میں اسی اُصول پر عمل ہے؛ لہٰذا ارجنٹائنا کی سرزمین پر پیدا ہونے والا ہر بچہ ارجنٹائنا کا شہری ہے، خواہ اس کے والدین غیر ملکی ہوں اور ارجنٹائنا سے باہر پیدا ہونے والا ہر بچہ غیر ملکی ہے، خواہ اس کے والدین ارجنٹائنا کے شہری ہوں، دوسرے اُصول کے مطابق بچہ کی جائے پیدائش سے قطع نظر اس کے والدین کی شہریت کا اعتبار کیا جاتا ہے، جرمنی، سویڈن اور سوئزرلینڈ وغیرہ میں اسی اُصول پر عمل ہے؛ لہٰذا جرمنی کی شہریت رکھنے والے والدین کا ہر بچہ جرمنی کا شہری ہے، خواہ وہ جرمنی کے باہر پیدا ہوا ہو اور غیر ملکی والدین کا ہر بچہ غیر ملکی ہے خواہ وہ جرمنی کی سرزمین پر پیدا ہوا ہو، اس وقت دنیا کی زیادہ تر مملکتیں اسی خونی رشتے کے اُصول پر عمل پیرا ہیں؛ البتہ بعض مملکتیں مثلاً: امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ اپنے شہریوں کے متعلق خونی رشتے کے اُصول پر اور غیر ملکیوں کے بچوں کے متعلق جائے پیدائش کے اُصول پر عامل ہیں۔

۲- اکتسابی شہریت (Naturalised Citizenship)

اکتسابی شہریت کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص پیدائشی طور پر کسی مملکت کا شہری ہے؛ لیکن وہ کسی دوسری مملکت کا شہری بننا چاہتا ہے، تو وہ اب اس دوسری مملکت کی جو شہریت حاصل کرے گا وہ اکتسابی شہریت کہلائے گی، اکتسابی شہریت حاصل ہونے کے ضابطے ہر مملکت میں یکساں نہیں ہیں، فی الجملہ جو طریقے رائج ہیں وہ حسبِ ذیل ہیں :

(۱) زمین خریدنا، (۲) سرکاری ملازمت اختیار کرنا، (۳) لمبے عرصے تک قیام کرنا، (۴) غیر ملکی والدین کے بچوں کو بالغ ہونے کے بعد شہریت کا اختیار حاصل ہونا، (۵) غیر ملکی عورت کا کسی شہری سے شادی کرنا، (٦) حصولِ شہریت کی درخواست داخل کرنا۔

شہریت سے محرومی کے اسباب

مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر کسی بھی شہری کی شہریت منسوخ کی جاسکتی ہے :

(۱) کسی دوسری مملکت کی سرکاری ملازمت اختیار کرنا، (۲) طویل مدت تک مملکت سے باہر رہنا، (۳) مملکت سے غداری کرکے یا میدانِ جنگ سے راہِ فرار اختیار کرکے کسی دوسری مملکت میں پناہ لینا، (۴) کسی دوسری مملکت کی باضابطہ شہریت اختیار کرنا، (۵) کسی شہری عورت کا کسی غیر ملکی سے شادی کرنا۔

شہریوں کے حقوق

مملکت کے شہریوں کو مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہوتے ہیں :

(۱) زندہ رہنے کا حق ، (۲) جائداد یا ملکیت کا حق ، (۳) خاندانی زندگی کا حق ، (۴) آزادی تحریر وتقریر یا اظہار رائے کا حق ، (۵) مذہبی آزادی کا حق ، (۶) قانونی برابری کا حق ، (۷) حصولِ تعلیم کا حق ، (۸) انجمن یا تنظیم وغیرہ بنانے کا حق ، (۹) کام کرنے کا حق ، (۱۰) آپسی لین دین اور عقد و معاہدہ کا حق ، (۱۱) شخصی آزادی کا حق ، (۱۲) ووٹ دینے کا حق ، (۱۳) انتخاب لڑنے کا حق ، (۱۴) حکومت اور سیاست دانوں کے خلاف تنقید کرنے کا حق ، (۱۵) سیاسی پارٹی یا سیاسی و نیم سیاسی تنظیم بنانے کا حق ، (۱۶) سرکاری ملازمت حاصل کرنے کا حق ، (۱۷) شکایتوں کے ازالے کے لئے درخواست دینے کا حق ، (۱۸) حقوق کو منوانے کا حق وغیرہ۔

شہریوں کے فرائض

مملکت کی طرف سے شہریوں پر عائد ہونے والے وہ فرائض جن کی بجا آوری ازروئے قانون ضروری ہے ، حسبِ ذیل ہیں :

(۱) قانون کی اطاعت ، (۲) اسٹیٹ کے ساتھ وفاداری ، (۳) ٹیکس کی ادائے گی ، (۴) امن اور قانون کو برقرار رکھنے میں حکومت کے ساتھ تعاون ، (۵) مملکت کی مدافعت وغیرہ (دیکھئے : اُصولِ سیاسیات : ڈاکٹر محمد ہاشم قدوائی : ۱۳۱-۱۵۳ ، ط : ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ ، پرنسپل آف پولیٹکل سائنس : این گلکرسٹ : ۲۳۲-۲۳۸)۔

اسلام میں شہریت کا تصور

’’شہریت‘‘ یا ’’الجنسیة‘‘ یا "Citizenship" جدید دور کی وضع کردہ اصطلاحات ہیں ، فقہ اسلامی کا ذخیرہ ان سے نا آشنا ہے ؛ لیکن شہریت کا جو بنیادی مفہوم ہے یعنی کسی مملکت کا مستقل باشندہ بننا ، اس کا واضح تصور فقہ اسلامی کے ذخیرے اور خاص کر ’’سیر‘‘ کے ابواب میں ہمیں بہ کثرت ملتا ہے ، فقہاء اسلام مسلم مملکت کے باشندے کو ’’من أهل دارالإسلام‘‘ یا ’’من أهل دارنا‘‘ سے ، غیر مسلم مملکت کے باشندے کو ’’من أهل دارالحرب‘‘ یا ’’من أهل دارهم‘‘ سے اور معاہد مملکت کے باشندے کو ’’من أهل دارالموادعة‘‘ یا ’’من أهل دارالموادعين‘‘ سے تعبیر کیا کرتے تھے ، مثلاً بدائع الصنائع میں ہے :

’’لا تقبل شهادة المستأمن على الذمي ؛ لأنه ليس من أهل دارالاسلام حقيقة وإن كان فيها صورة ؛ لأنه ما دخل دارنا للسكنى فيها ؛ بل ليقضي حوائجه ثم يعود عن قريب ، فلم يكن من أهل دارالإسلام ، والذمي من أهل دارالإسلام ‘‘ (بدائع فصل فی شرائط رکن الشہادۃ ، کتاب الشہادۃ : ۵/۴۲۳)۔

مستامن کی گواہی ذمی کے خلاف قبول نہیں کی جائے گی ؛ کیوں کہ وہ (مستامن) حقیقت میں دارالاسلام کا باشندہ

نہیں ہے؛ اگر چہ صورتاً وہ دارالاسلام میں قیام پذیر ہے، اس لئے کہ وہ ہماری مملکت میں رہائش اختیار کرنے نہیں آیا؛ بلکہ وہ اپنی ضروریات پوری کرنے آیا ہے اور پھر بہت جلد ہی وہ واپس لوٹ جائے گا؛ لہٰذا وہ دارالاسلام کا باشندہ نہیں ہے، جب کہ ذمی دارالاسلام کا باشندہ ہے۔

''...... **لأن الحربی المستأمن من أهل دارالحرب ، وإنما دخل دارالإسلام علی سبیل العاریة لقضاء بعض حاجاته لا للتوطن ، فلا یبطل حکم دارالحرب فی حقه کالمسلم إذا دخل دارالحرب بأمان ؛ لا یصیر بالدخول من أهل دارالحرب** ......''۔ (بدائع، کتاب النکاح، الفصل الأخیر: ۲/۶۵۸)۔

...... کیونکہ غیر ملکی مستامن دارالحرب کا باشندہ ہے اور دارالاسلام میں وقتی طور پر اپنی بعض ضروریات پوری کرنے آیا ہے، دارالاسلام کو اپنا وطن بنانا اس کا مقصد نہیں ہے؛ اسی وجہ سے دارالحرب میں امان کے ساتھ داخل ہو تو وہ محض دارالحرب میں داخل ہونے کی وجہ سے دارالحرب کا باشندہ نہیں کہلائے گا۔

شرح السیر الکبیر میں ہے :

''**لو أن هولاء المستامنین کانوا من أهل دارالموادعة دخلوا إلینا بتلک الموادعة**'' (باب ما یجب علی المسلمین نصرتهم: ۵/۱۷۱، من المکتبة الشاملة، الإصدار الثانی)

اگر یہ مستامنین دارالموادعہ کے باشندے ہوں تو یہ لوگ اس (سابقہ) معاہدہ کی وجہ سے (پر امن طور پر) ہماری مملکت میں داخل ہو سکتے ہیں۔

مذکورہ بالا عبارتیں بہ طور مثال پیش کی گئی ہیں؛ ورنہ اس طرح کے بے شمار مسائل کتبِ فقہ میں موجود ہیں جو دارالعہد، دارالحرب اور دارالاسلام: تینوں داروں کی مستقل علاحدہ شہریت کا تصور پیش کرتے ہیں، بدائع کی مذکورہ بالا عبارت میں موجود ''توطن'' کا لفظ شہریت کے سلسلہ میں بالکل صریح ہے؛ کیوں کہ اس لفظ میں شہریت کا مفہوم پایا جاتا ہے؛ چنانچہ ''القاموس الوحید'' میں ہے:

''**توطن البلد**'': وطن بنانا (القاموس الوحید: ۱۸۶۸، ط: کتب خانہ حسینیہ دیوبند)۔

اور ظاہر ہے شہریت بھی کسی ملک کو اپنا مستقل وطن بنانے کے لئے حاصل کی جاتی ہے؛ لہٰذا فقہ اسلامی کی رو سے مستامن گو دارالاسلام میں اقامت پذیر رہتا ہے؛ لیکن چونکہ اس کا مقصد دارالاسلام کو اپنا مستقل وطن بنانا نہیں ہوتا، اس لئے وہ دارالحرب کا شہری ہے، ذمی چوں کہ دارالاسلام کو مستقل اپنا وطن اور مسکن بنا لیتا ہے، اس لئے وہ دارالاسلام کا شہری ہے، دارالاسلام کی طرف ہجرت کر کے آنے والا مسلمان دارالاسلام کا شہری ہے اور معاہد مملکت کے باشندگان دارالعہد کے شہری ہیں۔

اسلامی شہریت کی بنیادیں

اسلام نے شہریت حاصل کرنے والے کے اعتبار سے حصولِ شہریت کی دو بنیادیں مقرر کی ہیں: غیر مسلموں کے لیے عقد ذمہ اور مسلمانوں کے لیے ہجرت۔

(۱) عقد ذمہ: کسی غیر مسلم کا ادائیگی جزیہ پر رضامند ہوکر اسلامی قانون کے تحت دارالاسلام میں مستقل رہائش اختیار کرنے کا عقد کرنا ''عقد ذمہ'' کہلاتا ہے، موسوعہ فقہیہ میں ہے :

''عقد الذمة : اقرار بعض الكفار على كفره بشرط بذل الجزية والتزام أحكام الاسلام الدنيوية''(موسوعہ فقہیہ: ۷/۱۲۱)۔

(عقد ذمہ: بعض کفار کو ان کے کفر پر برقرار رکھنا، اس شرط کے ساتھ کہ وہ جزیہ ادا کریں اور اسلام کے دنیوی احکام کی بجا آوری کریں)۔

اس کی اصل قرآن کریم کی یہ آیت: **''قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لاَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللهِ وَلاَ بِالْيَوْمِ الآخِرِ وَلاَ يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللهُ وَرَسُوْلُهُ وَلاَ يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ أُوْتُوا الْكِتَابَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ صَاغِرُوْنَ ''** (سورۂ توبہ: ۲۹)۔

(جنگ کرو اہل کتاب میں سے ان لوگوں کے خلاف جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان نہیں لاتے اور جو کچھ اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا ہے اسے حرام نہیں کرتے اور دین حق کو اپنا دین نہیں بناتے (ان سے لڑو) یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں)۔

اور حضور ﷺ کا یہ ارشاد ہے: **''...... وإذا لقيت عدوك من المشركين فادعهم إلٰى ثلاث خصال أو خلال ، فأيتهن ما أجابوك فاقبل منهم وكف عنهم : ثم ادعهم إلى الإسلام ...... فإن هم أبوا فاسئلهم الجزية ، فإن هم أجابوك فأقبل منهم وكف عنهم ، فإن هم أبوا فاستعن بالله وقاتلهم ''** (مسلم: کتاب الجہاد، باب تأمیر الإمام الأمراء: ۴۵۲۲)۔

(جب (جنگ میں) تیری ملاقات مشرک دشمنوں سے ہو تو ان کو تین باتوں کی دعوت دے، ان تینوں میں سے جس بات پر بھی وہ آمادہ ہو جائیں تو اسے قبول کرلے اور ان سے ہاتھ روک لے، انھیں اسلام کی دعوت دے......اگر انکار کریں تو جزیہ کا مطالبہ کر، اگر وہ اس پر رضامند ہو جائیں تو ٹھیک ہے، ورنہ اللہ سے مدد طلب کر اور شمشیر آزمائی شروع کردے)۔

مذکورہ بالا آیتِ قرآنی اور حدیث نبوی دونوں کا مفہوم یہی ہے کہ اگر غیر مسلم جزیہ دینے پر آمادہ ہو جائے تو اسے

دارالاسلام کا باشندہ بنالیا جائے گا اوراس کی جان و مال سے تعرض نہیں کیا جائے گا، گویا عقد ذمہ کرنا جدید اصطلاح میں مسلم اسٹیٹ کی شہریت اختیار کرنا ہے؛ (تفصیل کے لئے دیکھئے: غیرالمسلمین فی المجتمع الإسلامی: ۷، شرح السیر الکبیر باب الوقت الذی یمکن فیہ: ۵/ ۱۴۹، درمختار مع ردالمحتار: ۶/ ۲۸۷، مغنی المحتاج: ۴/ ۲۳۸، الانصاف: کتاب الجہاد، باب الامان: ۱۳/ ۲۵۶، مغنی المحتاج: ۴/ ۲۳۸، المغنی: مسالۃ أمان الرجل والمرأۃ: فصل، طلب الامان لیسمع کلام اللہ: ۱۳/ ۷۹، درمختار مع ردالمحتار: ۶/ ۲۸۷، بدائع الصنائع: کتاب السیر، فصل الامان المؤبد: ۶/ ۷۹، المغنی: مسالۃ أمان الرجل والمرأۃ: فصل دخلت الحربیۃ إلینا: ۱۳/ ۸۲، درمختار مع رالمحتار: ۶/ ۸۳)۔

غیرمسلموں کو مسلم مملکت کی شہریت دینے کے لئے زمانہ وحالات اور علاقہ ومکان کی مناسبت سے سیاسی وانتظامی مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے فقہاء کے صراحت کردہ مذکورہ بالا طریقوں میں کسی ایک کو یا چند کو یا سبھی کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے؛ البتہ شہریت کے طالب کو رجسٹریشن کا پابند بنانا اور حکومت کی طرف سے منظوری کے بعد ہی اسے شہریت دینا موجودہ حالات میں ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۲) ہجرت : فقہاء نے دارالاسلام کا شہری بننے کے لئے جس عقد ذمہ پر تفصیلی بحث کی ہے، وہ غیرمسلموں کے ساتھ خاص ہے، مسلمانوں کو دارالاسلام کا شہری بننے کے لئے اس طرح کے کسی عقد کا کوئی تذکرہ نہ فقہ اسلامی کے عظیم ذخیرے میں ملتا ہے اور نہ تاریخ اسلامی کے ضخیم لٹریچر میں؛ کیونکہ شرعی نقطۂ نظر سے ''دائرۂ اسلام'' میں آجانا ہی ''دارالاسلام'' میں آنے اور آبسنے کی اجازت حاصل کرلینا ہے، تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ دارالحرب کا کوئی مسلمان جب تک ہجرت کرکے دارالاسلام کے حدود میں داخل نہ ہوجائے وہ دارالاسلام کا حقیقی شہری نہیں کہلائے گا اور مملکت اسلامیہ کو اس پر ولایت حاصل نہیں ہوگی؛ البتہ دینی اُخوت اور دین کی بنیاد پر ہرجائز نصرت کا تعلق بہرصورت برقرار رہے گا؛ چنانچہ ارشاد باری ہے :

''وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَا لَكُمْ مِّن وَلاَيَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَإِنِ اسْتَنصَرُوْكُمْ فِيْ الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيْثَاقٌ وَاللهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْر''(الانفال:۷۳)۔

(اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت نہیں کی تو تمہیں ان پر ولایت حاصل نہ ہوگی؛ تاآں کہ وہ ہجرت کرلیں اور اگر وہ دین کے معاملہ میں تم سے مدد طلب کریں تو ان کی مدد کرنا تم پر ضروری ہے، مگر ان لوگوں کے خلاف جن سے تمہارا معاہدہ ہو اور اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے)۔

سورۂ ممتحنہ کی دسویں آیت میں بھی اس بات کے اشارے موجود ہیں؛ فرمانِ باری ہے :

''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِذَا جَاءكُمُ الْمُؤْمِنَاتُ مُهَاجِرَاتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ اللهُ أَعْلَمُ بِإِيْمَانِهِنَّ فَإِنْ

عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنَاتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ "(الممتحنۃ:۱۰)۔

(اے ایمان والو! جب مومن عورتیں تمہارے پاس ہجرت کر کے آئیں توتم ان کا امتحان لے لیا کرو، اللہ ان کے ایمان سے زیادہ واقف ہے، پس اگر تمہیں معلوم ہوجائے کہ وہ لوگ (حقیقت میں) ایمان والی ہیں تو پھر تم انھیں کافروں کے پاس واپس نہ بھیجو)۔

یہ آیت گومہاجر عورتوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے؛ لیکن اس سے یہ عمومی اُصول سمجھ میں آتا ہے کہ جب کوئی شخص ہجرت کر کے دارالاسلام آئے اور اس کا مسلمان ہونا مشکوک نہ ہوتو اسے دارالاسلام میں باضابطہ سکونت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی اور وہ دارالاسلام کا مستقل شہری شمار ہوگا۔

مملکت مدینہ کے قیام کے فوراً بعد معلوم انسان تاریخ کا جوسب سے پہلا تحریری دستور ترتیب دیا گیا اس کی پہلی دفعہ میں ہی اسلامی شہریت کے اس اُصول کا ذکر موجود ہے (الوثائق السیاسیۃ، ڈاکٹر حمید اللہ:۵۹)۔

مروجہ نظامِ شہریت کی شرعی حیثیت

یہ بحث پیچھے گذر چکی ہے کہ اسلامی تعلیمات میں شہریت کے بنیادی تصور (یعنی کسی مملکت کا مستقل باشندہ بننا اور مملکتوں کے اختلاف سے حقوق وفرائض کا مختلف ہونا) کو تسلیم کیا گیا ہے؛ لیکن چونکہ مروجہ نظام شہریت کی رو سے دارالاسلام کی شہریت کا تعدد لازم آتا ہے، ہر مسلم مملکت کی علاحدہ شہریت ہے اور شہریت کا یہ تعدد حقوق وفرائض کے سلسلہ میں مسلمانوں کو اجنبی اور شہری کے خانوں میں تقسیم کرتا ہے، اس لئے یہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک جدید مسئلہ ہے، اس مسئلہ پر بحث کرنے سے پہلے شہریت کے سلسلہ میں چند باتوں کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے؛ تاکہ دائرۂ بحث کی تحدید ہوجائے :

- شہریت کا ایک مفہوم یہ ہے کہ دارالاسلام اور دارالحرب کی الگ الگ شہریتیں تسلیم کی جائیں اور دارالحرب کی مختلف مملکتوں کی شہریتوں کو مستقل الگ شہریت کا درجہ دیا جائے، فقہ اسلامی میں اس کی صراحت موجود ہے؛ لہٰذا یہ دائرۂ بحث سے خارج ہے۔
- شہریت سے اگر مراد کسی مملکت (دار) کا مستقل باشندہ بننا ہوتو اس کا بھی واضح تصور فقہ اسلامی میں موجود ہے، اس لیے اس پر بحث کرنا بے سود ہے۔
- شریعت میں چونکہ بہ غرضِ تعارف علاقہ وقبائل کی طرف نسبت کرنا جائز ہے؛ اس لیے شہریت کا یہ پہلو کہ علاقے کی طرف نسبت کر کے مصری شہری یا فلسطینی شہری کہا جائے، کسی بحث کا محتاج نہیں ہے۔

○ مسلمانوں کے سلسلہ میں اصل تو یہی ہے کہ مسلمان دارالاسلام کے جس حصے کو چاہیں اپنا مسکن بنائیں؛ لیکن موجودہ دور کے پیچیدہ نظامِ حکومت میں اس اصل پر مطلقاً عمل کرنے میں کاروبارِ سلطنت حرج اور ضرر سے دوچار ہوسکتا ہے، اس لیے ''الحرج مدفوع'' اور ''الضرر یزال'' جیسے فقہی قواعد کی رو سے نو واردین اور مہاجرین کو رجسٹریشن کا پابند بنایا جاسکتا ہے؛ لیکن اس سلسلہ میں اصل یہی ہے کہ ان کی درخواست قبول کرلی جائے؛ البتہ کسی شرعی مانع اور معقول عذر کی وجہ سے ان کی درخواست رد کی جاسکتی ہے۔

○ وہ مباح اُمور جن کے جواز اور عدمِ جواز کے سلسلہ میں شریعت خاموش ہو اور ان کے جائز ہونے کی صراحت شرع میں وارد نہ ہوئی ہو، ایسے مباح اُمور کے بارے میں مسلم مملکتوں کے حکمراں باہمی رضامندی سے ''**الأصل في الأشياء الاباحة**'' اور ''**المسلمون علی شروطهم**'' کی رو سے شہریت سے متعلق قانون سازی کرسکتے ہیں۔

○ مذکورہ بالا باتیں اس قدر واضح ہیں کہ ان پر بحث کرنا تحصیل حاصل ہے؛ لیکن قومیت کو قوانین شہریت کا مدار بنانا، دارالاسلام کو کسی مرکز کے تابع کرنے کے بجائے ہر مملکت کو مستقل مملکت کی حیثیت دینا، مسلمانوں کے حقوق و فرائض کا جغرافیائی سرحدوں تک سمٹ آنا، علاقہ وملک کی بنیاد پر مسلمانوں کے حقوق وفرائض تقسیم کرنا، ان کو ملکی وغیر ملکی شہری واجنبی اور مستقل باشندہ و پناہ گزین کے خانوں میں باٹنا، حصولِ شہریت کے طریقہ کار اور فسخ شہریت کے اسباب کے سلسلہ میں وضعی قوانین نافذ کرنا --- مروجہ نظامِ شہریت سے متعلق یہ وہ اُمور ہیں جو بحث وتحقیق کے متقاضی ہیں اور ان ہی اُمور کی وجہ سے شہریت کا مروجہ نظام ایک جدید مسئلہ بن گیا ہے، اس مسئلہ کی تکییف شرعی کی بابت دونوں طرح کے نقاطِ نظر ہیں، ایک جواز کا نقطۂ نظر اور دوسرا عدم جواز کا، ان دونوں نقاطِ نظر کے دلائل حسبِ ذیل ہیں :

جواز کے دلائل :

(۱) ولاء الموالاۃ: اس ولاء کی تعریف موسوعہ فقہیہ میں یوں مذکور ہے:

"**هو أن يعاهد شخص شخصاً آخر علی أنه إن جنی فعليه أرشه وإن مات فميراثه له**" (ولاء: ۱۲۸/۴۵)

وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ساتھ اس بات کا معاہدہ کرے کہ اگر وہ جنایت کرے گا تو وہ دوسرا شخص اس کا تاوان ادا کرے گا اور اگر وہ مرجائے گا تو وہ دوسرا شخص اس کی میراث پائے گا۔

حنفیہ نے اس کی توضیح یوں کی ہے:

"تفسير ولاء الموالاة أن يسلم الرجل على يدى رجل فيقول للذى أسلم على يديه أو لغيره واليتک على أنى إن مت فميراثى لک وإن جنيت فعقلى عليک وعلى عاقلتک ، وقبل الأخر منه ، فهذا هو نفس ولاء الموالاة "(المحیط البرہانی:۴/۱۸۷،دار الکتب العلمیہ، بیروت)۔

ولاء الموالاۃ کی توضیح یہ ہے کہ ایک آدمی کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ پر ایمان لائے، پھر جس کے ہاتھ پر ایمان لایا ہے اس سے یا کسی اور سے کہے کہ میں آپ سے عقد موالاۃ کرتا ہوں، اس بات پر کہ اگر میں مرجاؤں تو میری میراث آپ کو ملے گی اور اگر میں کوئی جنایت کروں تو میرا تاوان آپ یا آپ کے عاقلہ کے سر ہوگا اور دوسرا شخص اس موالات کو قبول کرلے تو اسی کا نام ولاء الموالاۃ ہے۔

ولاء الموالاۃ کی مذکورہ بالا تعریف وتوضیح سے جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ کہ اس کے ذریعہ موالات کرنے والے (المولی الاسفل) اور جس کے ساتھ موالات کی گئی (المولی الاعلیٰ) دونوں کو کچھ حقوق حاصل ہوتے ہیں اور دونوں پر فرائض عائد ہوتے ہیں؛ لہٰذا اگر کوئی شخص کسی دوسرے نسب اور خاندان کے فرد سے ولاء الموالاۃ کرے تو مولیٰ اعلیٰ کو مولی اسفل کی میراث حاصل کرنے کا حق ہوتا ہے اور مولی اسفل کی جنایت کا تاوان ادا کرنے کا فریضہ مولی اعلیٰ پر عائد ہوتا ہے، اور مولی اسفل کا فریضہ بنتا ہے کہ مولی اعلیٰ کو اپنی میراث کا وارث کا بنائے، جس طرح اس ولاء کے ذریعہ کسی دوسرے نسب اور خاندان کے فرد سے حقوق وفرائض متعلق ہوتے ہیں، جو ولاء الموالاۃ نہ کرنے والے سے متعلق نہیں ہوتے اسی طرح مملکت بھی ایک بڑا قومی خاندان ہے اور اگر کوئی شخص شہریت حاصل کرے تو اس سے وہ حقوق وفرائض متعلق ہوتے ہیں جو شہریت حاصل نہ کرنے والوں سے متعلق نہیں ہوتے؛ لہٰذا جب ولاء الموالاۃ شرعاً جائز ہے تو عقدِ شہریت بھی شرعاً جائز ہوگا۔

(۲) "عن أبى الدرداء قال : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم : ما أحل الله فى كتابه فهو حلال وما حرم فهو حرام و ماسكت منه فهو عفو ، فاقبلوا من الله عافيته ، فإن الله لم يكن لينسى شيئاً ، ثم تلا :" وما كان ربک نسياً " رواه البزار والطبرانى فى الكبير وإسناده حسن ورجاله موثقون " (مجمع الزوائد: کتاب العلم، فی اتباع الکتاب والسنۃ ومعرفۃ الحلال والحرام: ۱/۴۱۶، ۷۹۴)۔

(حضرت ابودرداء سے مروی ہے وہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے اپنی کتاب میں جو چیز حلال کی ہے وہ حلال ہے اور جو حرام کی ہے وہ حرام ہے اور جس سے خاموش رہا وہ معاف ہے تو تم اللہ کی عافیت قبول کرو؛ کیونکہ اللہ کوئی چیز بھولتا نہیں، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور تمہارا رب بھولنے والا نہیں ہے، اس کو بزار نے اور معجم

کبیر میں طبرانی نے روایت کیا ہے، اس کی سند حسن درجہ کی ہے اور اس کے راوی ثقہ ہیں۔

اس حدیث میں یہ واضح حکم ہے کہ جن چیزوں کی حلت وحرمت مذکور نہ ہو؛ بلکہ وہ مباح درجہ کی ہوں تو وہ جواز کے دائرے میں رہیں گی، موجودہ نظام شہریت کا تعلق بھی اسی قبیل سے ہے، اس لئے اسے اختیار کرنا شرعاً جائز ہوگا۔

(۳) فقہ کا مشہور قاعدہ ہے ''**الأصل فی الأشیاء الإباحة**'' اس قاعدہ کی رو سے فقہاء نے بے شمار مسائل کو مباح ہونے کی وجہ سے جائز قرار دیا ہے، موجودہ نظام شہریت بھی اسی اصل کی رو سے مباح ہے؛ لہٰذا حاکموں کو یہ اختیار ہے کہ وہ اسے قانون کی شکل میں نافذ کرسکیں، اس کی نظیر تدوین دواوین کا نظام ہے، جو ''**الأصل فی الأشیاء الإباحة**'' کے تحت مباح تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو باضابطہ مملکت کے ایک نظام کی شکل دی۔

(۴) موجودہ نظامِ شہریت کا تعلق ایک طرح سے بین الاقوامی قانون و معاہدے سے ہے اور معاہدے کی پابندی شرعاً ضروری ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

'' **یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا أَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ** '' (المائدۃ:۱) (اے ایمان والو! اپنے عقد ومعاہدے پورے کرو)۔

اور آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

''**الصلح جائز بین المسلمین الا صلحاً حرم حلالاً أو أحل حراماً ، والمسلمون علی شروطهم إلا شرطاً حرم حلالاً أو أحل حراماً -- قال أبو عیسی هذا حدیث حسن صحیح** '' (کتاب الأحکام، فی الصلح بین الناس:۱۳۵۲)۔

مسلمانوں کے درمیان صلح جائز ہے؛ البتہ وہ صلح جس میں حرام کو حلال یا حلال کو حرام کیا گیا ہو، مسلمانوں کو اپنی شرطیں پوری کرنی چاہئیں؛ البتہ وہ شرطیں جو حرام کو حلال یا حلال کو حرام کرتی ہوں (ناجائز ہیں)۔

لہٰذا بین الاقوامی معاہدے کی وجہ سے مسلم مملکتوں میں مروجہ شہریت کے نظام کو اپنانا اسلامی مزاج کے عین مطابق ہے۔

(۵) بالفرض اگر موجودہ نظامِ شہریت کو اصلاً ناجائز مان بھی لیا جائے تو بھی شہریت کا حصول ایک مجبوری بن گئی ہے ؛ کیوں کہ اس کے بغیر کوئی بھی شخص کسی دوسری مملکت کا باشندہ نہیں بن سکتا ، اس لئے '' **الضرورات تبیح المحظورات** '' قاعدے کے تحت شہریت کا یہ نظام جواز کے دائرے میں آجائے گا۔

عدم جواز کے دلائل :

(۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

''أمرت أن أقاتل الناس حتى يشهدوا أن لا إله إلا الله وأن محمدا عبده ورسوله ، وأن يستقبلوا قبلتنا ويأكلوا ذبيحتنا وأن يصلوا صلا تنا ، فإذا فعلوا ذلک حرمت علينا دماؤهم وأموالهم إلا بحقها، لهم ما للسلمين وعليهم ما على المسلمين ...... قال أبوعيسىٰ : هذا حديث حسن صحيح غريب من هذا الوجه'' (ترمذی، کتاب الإیمان، ماجاء فی قول النبی أمرت بقتالهم: ۲۶۰۸)۔

مجھے یہ حکم ملا ہے کہ میں لوگوں سے رزم آرائی کروں؛ تا آں کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں اور یہ کہ وہ ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کریں، ہمارا ذبیحہ کھائیں اور ہماری طرح نماز پڑھیں، جب لوگ ایسا کرلیں تو ہم پر ان کے جان و مال سے ناحق تعرض کرنا حرام ہوجائے گا، ان کو وہ حقوق حاصل ہوں گے جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور ان پر وہ فرائض عائد ہوں گے جو مسلمانوں پر عائد ہیں۔

اس حدیث میں مسلمانوں کو حقوق حاصل ہونے اور ان پر فرائض عائد ہونے کی بنیاد اسلام کو بنایا گیا ہے اور جنس ووطن اور علاقہ وملک سے قطع نظر تمام مسلمانوں کو حقوق وفرائض کے سلسلہ میں یکساں درجہ دیا گیا ہے۔

وہ قبائل جو مملکت مدینہ کی حدود میں داخل نہیں تھے؛ بلکہ بعد میں مملکت مدینہ کے ساتھ الحاق کرلیا تھا ان کو بھی آپ ﷺ نے یہی بتایا کہ ان میں سے جو لوگ ایمان قبول کرلیں ان کو وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ہمیں حاصل ہیں اور ان پر وہی فرائض عائد ہوں گے جو ہم پر عائد ہیں؛ مثلاً آپ ﷺ نے شاہان حمیر کے قاصد کے ہاتھ یہ پیغام بھیجا کہ :

''انه من أسلم من يهودى أو نصرانى فإنه من المؤمنين ، له مالهم وعليه ماعليهم '' (سیرت ابن ہشام، قدوم رسول ملوک حمیر بکتابہم: ۲/۵۸۸)۔

(جو کوئی یہودی یا نصرانی اسلام قبول کرلے تو وہ مومنین میں سے ہے، اسے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ان (مسلمانوں) کو حاصل ہیں اور اس پر وہی فرائض عائد ہوں گے جو ان (مسلمانوں) پر عائد ہیں)۔

اور عمرو بن حزم رضی اللہ عنہ کو یمن روانہ فرماتے ہوئے آپ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا :

''من أسلم من يهودى أو نصرانى إسلاماً خالصاً من نفسه ودان بدين الإسلام ، فإنه من المؤمنين ، له مثل مالهم وعليه مثل ما عليهم '' (سیرت ابن ہشام: کتاب الرسول لابن خالد: ۲/۵۹۴)

(جو کوئی یہودی یا نصرانی خالص اسلام قبول کرلے اور دین اسلام کا پیرو بن جائے تو مومنین میں سے ہے، اسے وہی حقوق حاصل ہوں گے جو ان مومنین کو حاصل ہیں اور اس پر وہی فرائض عائد ہوں گے جو ان پر عائد ہیں)۔

اسی طرح قبیلۂ غفار کے نام آپ ﷺ نے یہ نامہ مبارک رقم فرمایا :

”...... أنهم من المسلمین ، لهم ما للمسلمین وعلیهم ما علی المسلمین“ (طبقات ابن سعد، ذکر بعثت الرسول)

(قبیلۂ بنو غفار کے لوگ مسلمانوں میں سے ہیں، انھیں وہی حقوق حاصل ہیں، جو مسلمانوں کو حاصل ہیں اور ان پر وہی فرائض عائد ہیں جو مسلمانوں پر عائد ہیں)۔

یہی بات حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے **مملکتِ** فارس کے معرکہ آراؤں سے کہی تھی :

”فإن أسلمتم فلکم مثل الذی لنا وعلیکم مثل الذی علینا“ (ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی الدعوۃ قبل القتال :۱۵۴۸، وحدیث سلمان حدیث حسن)

(اگر تم اسلام قبول کرلو تو تمہیں بھی اسی طرح کے حقوق حاصل ہوں گے جو ہمیں حاصل ہیں اور تم پر بھی اسی طرح کی ذمہ داریاں عائد ہوں گی جو ہم پر عائد ہیں، امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے)۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی یہ حدیث اس بات کی مزید وضاحت کرتی ہے کہ اگر مملکت فارس کی فارسی قوم بھی حلقہ بہ گوش اسلام ہوجائے تو اسے بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو عرب کی قوم کو حاصل ہیں اور اس پر بھی وہی فرائض عائد ہوں گے جو عربوں پر عائد ہیں؛ کیونکہ حقوق وفرائض کی بنیاد اسلام ہے؛ نہ کہ نسل وملک، مگر موجودہ نظامِ شہریت میں حقوق وفرائض کی بنیاد ملک ومملکت ہے نہ کہ اسلام، یہی وجہ ہے کہ ایک مسلم مملکت کے باشندے کو دوسری مسلم مملکت میں اجنبیوں کے درجہ میں رکھا جاتا ہے، اسی لئے موجودہ نظامِ شہریت اپنے وضعی اُصولوں کے ساتھ شرعاً ناقابل قبول ہے۔

(الف) مملکت کی مدافعت کا فریضہ: مروجہ نظام شہریت کے مطابق اجنبیوں پر مملکت کی دفاع کا فریضہ عائد نہیں ہوتا، جب کہ اسلامی شریعت کا مطالبہ یہ ہے کہ اگر کسی علاقہ میں دشمن حملہ بول دیں اور اس علاقے کے مسلمان اپنا دفاع نہ کرسکیں یا سہل انگاری کی وجہ سے جہاد میں حصہ نہ لیں تو آس پاس کی مملکت کے مسلمانوں پر جہاد فرض ہوجائے گا، ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے قومیت ووطنیت کی بحث کے ذیل میں اس بات کو شامی کے حوالے سے اپنے خاص اُسلوب میں یوں بیان کیا ہے:

(۲) حصولِ شہریت کے جو طریقے ابتداء بحث میں ذکر کئے گئے ہیں، فقہاء نے ذمیوں کو اسلامی شہریت دینے کے لئے توفی الجملہ ان کا تذکرہ کیا ہے؛ لیکن یہ کہیں نہیں ملتا کہ مسلمانوں کو دارالاسلام کی شہریت حاصل کرنے کے لئے کسی نئے عقد کی ضرورت ہو، فقہ اسلامی کا ذخیرہ بھی اس طرح کے عقد شہریت سے ناآشنا ہے اور تاریخ اسلامی بھی اس کی کوئی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے؛ لیکن موجودہ دور میں مسلمان شہریت حاصل کیے بغیر نہ کسی مسلم مملکت کو اپنا وطن بنا سکتا ہے اور نہ وہاں کے حقوق سے استفادہ کرسکتا ہے۔

(۳) مروجہ قوانین میں شہریت سے محرومی کے جو اُصول ہیں وہ بھی اسلامی احکام سے میل نہیں کھاتے ،شہریت سے محرومی کے جو اسباب پیچھے ذکر کیے گئے ہیں ،ان میں سے کوئی سبب بھی ایسا نہیں ہے ،جس کی وجہ سے کوئی مسلمان دارالاسلام کی شہریت سے محروم ہوجائے ؛ بلکہ فقہ حنفی کی رو سے تو ان اسباب کی وجہ سے کوئی غیر مسلم شہری بھی اسلامی شہریت سے محروم نہیں ہوگا ؛ کیونکہ غیر مسلم شہری کی شہریت صرف دو وجوہ سے ہی منسوخ ہوسکتی ہے : ایک یہ کہ وہ دارالحرب کی شہریت اختیار کرلے ،دوسرے یہ کہ غیر مسلموں کا کوئی گروہ دارالاسلام کے کسی علاقہ کو اپنے قبضہ میں لے کر مسلم حکومت سے برسرِ پیکار ہوجائے (دیکھئے : بدائع ، کتاب السیر ،فصل الامان المؤبد : ۶/۸۲)۔

(۴) قرآن کی یہ آیتیں : ''أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا'' (النساء : ۹۷) ''يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا إِنَّ أَرْضِيْ وَاسِعَةٌ فَإِيَّايَ فَاعْبُدُوْنِ'' (العنکبوت : ۵۶) اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ مسلمان دارالاسلام کے جس حصے میں چاہیں اپنی زندگی گزاریں ؛ لہٰذا ان کو ذمیوں کی طرح کسی نئے عقد کا پابند بنانا صحیح نہیں ہے اور قرآن کریم کی اس آیت میں : ''إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللهَ وَرَسُوْلَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ ...... أَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْأَرْضِ'' (المائدۃ : ۳۳) کسی فرد کو کسی علاقہ میں رہنے نہ دینے اور وہاں سے جلاوطن کرنے کو بہ طور سزا کے ذکر کیا گیا ہے ، جس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی مسلمان دارالاسلام کے کسی علاقے کو اپنا مسکن بنانا چاہے تو اس سلسلہ میں اصل یہی ہے کہ اس کو وہاں رہنے کی اجازت دی جائے ؛ البتہ اگر کسی شرعی مانع اور معقول عذر کی وجہ سے اجازت نہ دی جائے تو یہ استثنائی صورت ہے۔

(۵) آپ ﷺ کا ارشاد مبارک ہے :

''**المسلمون تتكافأ دماؤهم ، يسعى بذمتهم أدناهم ، ويجير عليهم أقصاهم وهم يد على من سواهم**'' (أبوداؤد ، الجهاد ، فی السریۃ ، ترد علی أهل العسکر : ۲۷۵۱)۔

(تمام مسلمانوں کا خون برابر ہے ، ان کے ادنیٰ شخص کے بھی ذمہ کی پابندی سب پر ضروری ہے ، ان میں کا دور دراز رہنے والا شخص بھی ان پر کسی کو پناہ دے سکتا ہے اور تمام مسلمان اپنے علاوہ کے لئے ایک متحدہ طاقت ہیں) (شیخ البانی نے اس حدیث کے صحیح ہونے کی صراحت کی ہے ، دیکھئے : صحیح وضعیف سنن أبی داؤد : ۲۷۵۱ ، طبع مرکز نور الاسلام لابحاث القرآن والسنۃ ، اسکندریہ)۔

اس حدیث نبوی کا ایک ایک جملہ مسلمانوں کی وحدت اور حقوق وفرائض میں تمام مسلمانوں کی یکسانیت کا غماز ہے کہ تمام مسلمانوں کے خون کی قیمت برابر ہے ، ان سب کا ذمہ ایک ہے ، ان میں سے کوئی ایک بھی کسی کو پناہ دے دے

تو تمام پر اس کی پاسداری ضروی ہے، اور رنگ ونسل اور ملک وطن کے اختلاف کے بغیر تمام مسلمان ایک جماعت ہیں اور اپنے سوا کے خلاف ایک متحدہ طاقت ہیں، ان باتوں کو اگر مروجہ نظام شہریت میں تلاش کیا جائے تو ان کا دائرہ مملکت کی جغرافیائی سرحدوں تک محدود ہوتا نظر آئے گا۔

(۶) دستور نبوی کی دفعات: مدینہ میں اسلامک اسٹیٹ قائم ہونے کے بعد آپ ﷺ نے جو دستور ترتیب دیا تھا، اس میں اسلامی شہریت کے اُصول بجا طور پر ہمیں ملتے ہیں، دستورِ مدینہ کا اگر بہ غور جائزہ لیا جائے تو ہمیں شہریوں کی دو قسمیں نظر آتی ہیں: ایک وہ جنھیں شہریت حاصل کرنے کے لئے معاہدے کی ضرورت پڑی تھی، یعنی غیر مسلم شہری اور دوسرے وہ جنھیں حصولِ شہریت کے لئے کسی معاہدے کی ضرورت نہیں پڑی، یعنی مسلم شہری، پھر مسلم شہری دو طرح کے تھے، ایک وہ جو مدینہ کے پیدائشی شہری تھے، یعنی انصار اور دوسرے وہ جو اکتسابی شہریت کے حامل تھے، یعنی مہاجرین۔ دستور کی دفعات میں موجود شہریت سے متعلق بعض باتیں قابل ذکر ہیں:

- دستور کی دفعہ ۳۶ (الف) کے تحت یہ حکم ہے کہ کوئی بھی شخص حضور کی اجازت کے بغیر فوجی کاروائی کے لئے مدینہ سے باہر نہ نکلے، اس دفعہ کے الفاظ ہیں:

"**وأنه لا يخرج منهم أحد إلا بإذن محمد**" (الوثائق السياسية، ڈاکٹر حمید اللہ: ۶۱)۔

اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی شخص محمد (ﷺ) کی اجازت کے بغیر باہر نہیں جاسکتا۔

شارحین دستور نے اس خروج سے فوجی کاروائی کے لئے باہر نکلنا مراد لیا ہے، (دیکھئے: رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی وجانشینی: ۶۴، سیرۃ الرسول کی آئین ودستوری اہمیت، ڈاکٹر طاہر القادری: ۵۱) یہاں یہ بات وضاحت کی محتاج نہیں ہے کہ سیاستِ خارجہ کے باب میں جنگی مہم جوئی جس طرح ایک نازک مسئلہ ہے اسی طرح سیاست داخلہ کے باب میں غیر ملکیوں کا مملکت کی مستقل شہریت اختیار کرنا ایک اہم مسئلہ ہے، اس لئے اس دفعہ پر قیاس کا تقاضا یہ تھا کہ مدینہ میں آبسنے والوں کے لئے بھی یہ دفعہ لگائی جاتی کہ کسی بھی شخص کو حضرت محمد ﷺ کی اجازت کے بغیر مدینہ کا مستقل باشندہ بننے کی اجازت نہیں ہے؛ لیکن اس کے برخلاف یہ کہا گیا کہ جو کوئی مسلمان مدینہ کے مسلمان شہریوں کی تابع داری اختیار کرے، پھر (ہجرت کرکے) ان کے ساتھ آملے وہ سیاسی وحدت کا ایک فرد ہوگا، یعنی مملکت کا ایک شہری ہوگا:

"**هذا كتاب من محمد النبى بين المؤمنين والمسلمين من قريش وأهل يثرب ومن تبعهم فلحق بهم وجاهد معهم ، أنهم أمة واحدة من دون الناس**" (الوثائق السیاسیة: ۵۹)۔

(یہ ایک حکم نامہ ہے نبی اور اللہ کے رسول محمد کا قریش اور اہل یثرب میں ایمان لانے والوں اور ان لوگوں کے

مابین جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہو جائیں اور ان کے ہم راہ جنگ میں حصہ لیں، تمام (دنیا کے) لوگوں کے بالمقابل ان کی ایک علاحدہ سیاسی وحدت ہوگی)۔

ان دفعات میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ مسلمانوں کو مملکتِ اسلامیہ کی سیاسی وحدت کا فرد بننے کے لئے کسی عقد کی ضرورت نہیں ہے، جیسا کہ غیر مسلموں کو حصولِ شہریت کے لئے عقد و معاہدے کی ضرورت ہے، یہی وجہ ہے کہ جو کوئی بھی مسلمان ہو کر مدینہ آیا اسے شہریت کے لئے کوئی عقد نہیں کرنا پڑا، اس کے برعکس ان ہی غیر مسلموں کو مملکت مدینہ کی شہریت دی گئی، جنھوں نے مملکت سے اس کا معاہدہ کیا۔

- دستور کی دفعہ: ۱۷ کے مطابق تمام مسلمانوں کی صلح ایک ہی ہوگی، دفعہ کے الفاظ ہیں :

"وإن سلم المؤمنين واحدة" (حوالۂ سابق: ۶۰)۔

(اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی)۔

اس وحدت صلح کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کوئی ایک صلح کرلے تو سب پر اس کی پابندی ضروری قرار پائے؛ چونکہ جنگ کی حالت میں کسی مسلمان کا دشمن سے صلح کرنا مملکت کی مصلحت کے خلاف ہے، اس لئے یہ حکم دیا گیا کہ جب تک صلح تمام مسلمانوں کے مفاد میں نہ ہو اس وقت تک صلح نہ کی جائے؛ چنانچہ اسی دفعہ میں یہ الفاظ بھی بڑھائے گئے :

اللہ کی راہ میں لڑائی ہو تو کوئی ایمان والا کسی دوسرے ایمان والے کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا، جب تک کہ یہ صلح ان سب کے لئے برابر اور یکساں نہ ہو۔ (الوثائق السياسية: ۶۰، ۷، رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی و جانشینی: ۶۲)

جب کہ غیر مسلموں کی شہریت کے باب میں ہمیں صلح و معاہدہ کی وحدت کا یہ رنگ نظر نہیں آتا، یہی وجہ ہے کہ بنو قینقاع نے جب معاہدہ شکنی کی تو صرف ان ہی کو جلاوطن کیا گیا، بنونضیر اور بنوقریظہ کے معاہدہ کو برقرار رکھا گیا اور بنونظیر نے جب عہد کی پامالی کی تو صرف ان ہی کا محاصرہ کیا گیا، بنوقریظہ پر کسی بھی طرح کی آنچ آنے نہ دی گئی؛ لیکن جب بنو قریظہ نے بھی غداری کی تو انھیں بھی مار بھگایا گیا، دستور نبوی کی مذکورہ بالا دفعہ اور یہودی قبائل سے متعلق سیرت نبوی کا یہ روشن پہلو اس بات پر دال ہیں کہ غیر مسلموں کی صلح اور ان سے کئے جانے والے معاہدے قبائل اور علاقوں کی بنیاد پر تو ہو سکتے ہیں؛ لیکن مسلمانوں کی صلح صرف اور صرف اسلام کی بنیاد پر استوار ہوگی --- افسوس کہ مروجہ نظام شہریت کے وضعی قوانین کو اپنانے کی وجہ سے مسلمانوں کی صلح اور ان کے معاہدے جو کبھی آفاقی تھے، اب مملکت کی حدود تک سمٹ آئے ہیں۔

○ دستورِ مدینہ میں جن غیر مسلموں کو حقوق دیئے گئے ہیں، ان کے قبائل کا نام بہ نام تذکرہ بھی کر دیا گیا ہے، (دیکھئے: دفعہ:۲۵-۲۳، الوثائق السیاسیة:۶۱) کیوں کہ یہی وہ قبائل تھے، جنھوں نے معاہدہ کے ذریعہ حق شہریت حاصل کیا تھا: اس کے برخلاف مسلمانوں کو ایک جسدِ واحد قرار دیا گیا ہے؛ چنانچہ دفعہ:۱۵ میں ہے :

''وإن المؤمنين بعضهم موالي بعض دون الناس ''(الوثائق السیاسیة:۶۰)۔

(اور ایمان والے باہم بھائی بھائی ہیں (ساری دنیا) کے لوگوں کے مقابل)۔

'' وإن سلم المؤمنين واحدة'' (حوالۂ سابق) (اور ایمان والوں کی صلح ایک ہی ہوگی)۔

اور بعض دفعات میں تو '' جمیعاً'' اور '' کافةً'' کے تاکیدی الفاظ لاکر حق شہریت کے اس مسئلہ کو بالکل واضح کر دیا گیا، جیسا کہ دفعہ:۱۳ کے الفاظ ہیں :

''وأن المؤمنين المتقين أيديهم على كل من بغى منهم أو ابتغى دسيعة ظلماً أو إثماً أو عدوانا أو فسادا بين المؤمنين وأن أيديهم عليه جميعاً ولو كان ولد أحدهم ''(حوالۂ سابق)۔

(اور متقی ایمان والوں کے ہاتھ ہر اس شخص کے خلاف اٹھیں گے جو ان میں سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا ایمان والوں میں فساد پھیلانا چاہے اور ان کے ہاتھ سب مل کر ایسے شخص کے خلاف اُٹھیں گے، خواہ وہ ان میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو)۔

اور دفعہ:۲۱ میں ہے :

''وأن المؤمنين عليه كافة ولا يحل لهم إلا قيام عليه '' (حوالۂ سابق:۶۱)۔

(اور تمام ایمان والے قاتل کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اس کے سوا انھیں کوئی اور چیز جائز نہ ہوگی)۔

دستور کی مذکورہ بالا دفعات یہ صراحت کرتی ہیں کہ انھیں غیر مسلموں کو حق شہریت حاصل ہوگا، جن کا مملکت کے ساتھ معاہدہ ہو، اس کے برخلاف مسلمانوں کے حق شہریت کی بنیاد اسلام ہے، تمام مسلمان دارالاسلام کے برابر درجہ کے شہری ہیں، تمام کو یکساں حق شہریت حاصل ہے اور تمام کے حقوق بھی یکساں ہیں اور فرائض بھی، علاقہ وقبائل کا اختلاف ان کے حقوق وفرائض کو مختلف نہیں کرسکتا۔

(۷) مروجہ نظام شہریت کو مسلم مملکتوں میں نافذ کرنے کی وجہ سے علاقہ واریت اور قومیت پروان چڑھ رہی ہے اور اسلامی قیادت کی وحدت و مرکزیت دن کے خواب کی حیثیت اختیار کرتی جارہی ہے، اس لئے شرعاً اس کا جواز سمجھ میں نہیں آتا۔

فقہاء کرام کی تائید:

فقہاء کرام نے بھی اس بات کی تائید کی ہے کہ دارالاسلام کی حدود میں خواہ کتنی ہی مملکتیں وجود میں آجائیں، مملکتوں کا یہ تعدد مسلمانوں کے حقوق وفرائض اوران کے احکام پر چنداں اثر انداز نہیں ہوگا؛ کیوں کہ دارالاسلام ٹکڑیوں میں بٹ جانے کے باوجود بھی ایک مملکت کے حکم میں ہے، جب کہ دارالحرب کی ہر مملکت مستقل حیثیت کی حامل ہے؛ چنانچہ مبسوط میں ہے :

"...... **لأن دارالإسلام دار أحكام ، فبإختلاف المنعة والملک ، لا تتباين الدار فيما بين المسلمين ؛ لأن حكم الإسلام يجمعهم ، فأما دارالحرب ليست بدار أحكام ولكن دار قهر ، فبإختلاف المنعة والملک تختلف الدار فيما بينهم** " (كتاب الفرئض ، مواريث أهل الكفر:۳/ ۳۳)۔

(...... کیونکہ دارالاسلام دار احکام ہے؛ لہٰذا لشکر واقتدار کے اختلاف سے مسلمانوں کے درمیان دار مختلف نہیں ہوگا؛ کیوں کہ اسلام کا حکم سب کو شامل ہے، رہی بات دارالحرب کی تو وہ دار احکام نہیں ہے؛ بلکہ دار قہر ہے؛ لہٰذا لشکر واقتدار کے تفاوت سے ان کے درمیان دار بھی مختلف ہوجائے گا) (مزید تفصیل کے لئے دیکھئے: کتاب الفرائض، انواع الحجب: ۸/ ۵۷۳، تبیین الحقائق، کتاب الفرائض، العصبات: ۶/ ۲۴۰، الفقہ الاسلامی وأدلتہ، کتاب الفرائض الباب السادس، المیراث، المانع الثانی القتل: ۱۰/ ۷۲۶۲، اختلاف الدار: ۲/ ۲۰۴، أحکام الذمیین والمستامنین، الباب التمہیدی، الفصل الثانی، البحث الأول: الذمیون: ۳۷، الشریعۃ الاسلامیۃ والقانون الدولی: ۹۱، ط: القاہرۃ ۱۹۷۱، حقوق غیر المسلمین فی الدولۃ الإسلامیۃ: ۷۷، مکتبۃ الفہد الوطنیۃ، السعودیۃ، المذہب السیاسی فی الاسلام: ۱۲۹، ط: دارالاضواء، بیروت)۔

حاصل کلام یہ کہ اسلام شہریت کے اس بنیادی تصور کو تسلیم کرتا ہے کہ کسی مملکت کا مستقل باشندہ بنا جائے اور مملکت (دار) کے اختلاف سے احکام مختلف ہوں، یہی وجہ ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے دارالحرب، دارالعہد اور دارالاسلام کے احکام یکساں نہیں ہیں؛ لیکن دارالاسلام کی شہریت کا تعدد، مسلمانوں کے لئے حصولِ شہریت کا لزوم اور دارالاسلام کے مسلم باشندوں کے درمیان حقوق وفرائض کی بابت علاقہ وملک کی بنیاد پر ملکی وغیر ملکی کی تقسیم اسلامی مزاج کے بھی خلاف ہے اور اسلامی تعلیمات کے بھی مغائر، نیز مروجہ قوانین میں حصولِ شہریت کے ذرائع، شہریت سے محرومی کے اسباب اور شہریت کی وجہ سے حاصل ہونے والے حقوق وسہولیات اور عائد ہونے والے فرائض وواجبات کے جو اُصول ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے ان کا جواز سمجھ میں نہیں آتا؛ کیوں کہ اسلام جغرافیائی تقسیم کی وجہ سے مسلمانوں کو تقسیم نہیں کرتا، اس کی نظر میں دارالاسلام کے سارے شہری برابر ہیں، دارالاسلام کی حدود میں کھنچی علاقائی سرحدوں کی لکیریں مسلمان شہریوں کے حقوق وفرائض کے درمیان تفریق کی لکیر نہیں کھینچ سکتیں؛ لہٰذا مسلم مملکتوں کی طرف سے مسلمانوں کو یہ اجازت ہونی

چاہئے کہ وہ دارالاسلام کے جس گوشے وعلاقے کو چاہیں اپنا مسکن بنائیں، مسلم مملکتوں کی جغرافیائی سرحدیں بھی مہاجرین ونوواردین کے لئے سراپا استقبال ہوں اور مسلم حکمرانوں کے دِل بھی قومیت وعلاقائیت سے پرے ہوکر پورے عالم اسلام کے مسلمانوں کی بے لوث محبت کے لئے وا ہوں۔

البتہ یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ موجودہ دور کے پیچیدہ نظام حکومت میں اگر شہریوں کی تعداد کا اور آبادی کی شرح کا صحیح اندازہ نہ ہو تو مملکت کو انتظامی اُمور مثلاً: معاشی منصوبہ بندی و بجٹ سازی وغیرہ میں مشکلات سے دو چار ہونا پڑسکتا ہے، اس لئے انتظامی مصلحت کے پیش نظر نوواردین ومہاجرین کو اس بات کا پابند بنایا جاسکتا ہے کہ وہ متعلقہ حکومتی دفتر میں اپنا رجسٹریشن کرائیں اور اپنا نام و دیگر تفصیلات کا اندراج کرائیں، اگر کوئی نووارد واقعتاً اسلام یا مسلمانوں یا مسلم مملکت کے لئے ضرر کا باعث ہو تو ''الضرر یزال'' قاعدے کے تحت اس کو واپس کیا جاسکتا ہے، تاہم یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ اندراج کی یہ کاروائی محض انتظامی نوعیت کی ہوگی، اس کی وجہ سے شریعت اسلامیہ کی طرف سے حاصل ہونے والے حقوق وسہولیات اور فرائض وواجبات میں کچھ تبدیلی نہیں ہوگی، وہ جیسے پہلے حاصل تھے اب بھی حاصل رہیں گے اور اگر اندراج کی اجازت نہ ملے تب بھی حاصل رہیں گے۔ ہذا ما عندی واللہ اعلم بالصواب!!

رجسٹریشن کی درخواست قبول کرنا:

شہریت کی درخواست کے بجائے رجسٹریشن کی درخواست کا لفظ اس لئے استعمال کیا گیا کہ شہریت کے لفظ سے ذہن مروجہ نظام شہریت کی طرف جاتا ہے جو کہ اسلامی مزاج کے خلاف ہے؛ کیونکہ جب کوئی مسلمان دارالاسلام کے کسی علاقے کو اپنا مسکن بنالے تو وہ پورے دارالاسلام کا شہری ہوجاتا ہے، علاقوں کے بدلنے سے اس کے حقوق وفرائض نہیں بدلا کرتے؛ البتہ ''وجعلناکم شعوباً وقبائل لتعارفوا'' (سورۂ حجرات: ۱۳) کے پیش نظر مسلمان دارالاسلام کے جس علاقے میں آباد ہوں بغرضِ تعارف اس علاقے کی طرف اپنے آپ کو منسوب کرسکتے ہیں، مثلاً مصری، فلسطینی وغیرہ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی ہمیں اس کی مثال ملتی ہیں، جیسے بلال حبشی، سلمان فارسی، صہیب رومی وغیرہ؛ لہٰذا اگر شہریت سے مراد حقوق وفرائض سے قطع نظر کسی علاقہ کا مستقل باشندہ بننا اور اس علاقہ کی طرف اپنی نسبت کرنا ہو تو مصری شہری اور فلسطینی شہری وغیرہ الفاظ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے۔

بہرحال یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی مسلم مملکت کا مستقل باشندہ بننا چاہے اور اس کے لئے وہ متعلقہ حکومتی دفتر میں درخواست پیش کرے؛ تاکہ اس کا رجسٹریشن ہوسکے، تو کیا حکومت پر اس کی درخواست قبول کرنا ضروری

ہوگا؟ اس سلسلہ میں اگر ایک نظر اس عقد شہریت پر ڈال لی جائے جسے فقہاء نے عقد ذمہ کے نام سے ذکر کیا ہے تو یہ مسئلہ بہت آسانی کے ساتھ حل ہوجائے گا۔

احناف نے عقد ذمہ قبول کرنے کو مطلقاً واجب قرار دیا ہے، شوافع نے بھی جاسوس کے استثناء کے ساتھ وجوب کی بات کہی ہے، حنابلہ نے بھی وجوب کا موقف اختیار کیا ہے، بشرطیکہ درخواست گزار کی طرف سے کسی غداری کی اندیشہ نہ ہو، مالکیہ نے گو مصلحت کو بنیاد بنایا ہے؛ لیکن فی الجملہ وجوب کی بات کہی ہے، (دیکھئے: عنایہ مع الفتح، کتاب السیر، فصل فی الامان: ۵/ ۴۵۴، مغنی المحتاج، کتاب عقد الجزیۃ: ۴/ ۲۴۳، الانصاف، کتاب الجہاد، باب عقد الذمۃ: ۱۰/ ۳۹۳، شرح مختصر خلیل للخرشی، باب احکام الجہاد، فصل فی مقدمۃ الجزیۃ: ۱۰/ ۱۲۵) --- یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ موجودہ دور میں غیر مسلموں کے عقد ذمہ کو قبول کرنے کے بارے میں حکومت کا کیا موقف ہونا چاہئے، یہاں بتانا یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی رو سے جب غیر مسلموں کا عقد ذمہ قبول کرنا واجب ہے تو مسلمانوں کی طرف سے پیش کی جانے والی مستقل سکونت اختیار کرنے کی درخواست قبول کرنا بہ درجہ اولیٰ واجب ہوگا، الا یہ کہ کسی درخواست کو قبول کرنا اگر اسلامی نقطۂ نظر سے مسلمانوں یا مسلم مملکت کی مصلحت کے خلاف ہو تو پھر اس کی درخواست رد کی جاسکتی ہے، اس سلسلہ میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے اس عمل سے استدلال نہیں تو کم از کم استیناس کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کو بعض انتظامی مصلحتوں کی وجہ سے مدینہ سے باہر منتقل کردیا تھا اور مدینہ میں رہنے کی ان کو اجازت نہیں تھی؛ کیوں کہ ان کا مدینہ میں رہنا بعض پہلوؤں سے مسلمانوں کے حق میں مفید نہیں تھا؛ لہٰذا اگر کسی کی درخواست قبول کرنا مسلمانوں اور مسلم مملکت کے مفاد کے خلاف ہو تو اس کی درخواست رد کرنے کی گنجائش ہوگی؛ لیکن یہ استثنائی صورت ہے، اصل یہی ہے کہ درخواست قبول کرلی جائے۔

پناہ گزینوں کے حقوق (Rights of Refugees)

کسی بھی مسلم مملکت میں پناہ حاصل کرنے والے مسلمان دو طرح کے ہوسکتے ہیں، ایک وہ جو اپنے وطن سے ہجرت کرکے آئے ہوں اور پناہ دہندہ مملکت میں مستقل سکونت اختیار کرنا چاہتے ہوں، ایسے پناہ گزین کو مملکت کا مستقل باشندہ بنالیا جائے گا؛ کیوں کہ ان مفلوک الحال وستم رسیدہ مہاجرین کو بلا کسی عذر شرعی کے مستقل سکونت کی اجازت نہ دینا ہجرت کے مقصد کو نظر انداز کرنا ہے؛ بلکہ ہجرت کے مقدس فریضے کا سد باب کرنا ہے، دوسرے وہ پناہ گزین ہیں، جو عارضی طور پر مقیم ہوں اور وطن کے حالات سازگار ہونے کے منتظر ہوں، ایسے پناہ گزینوں (Refugees) کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان کے درمیان اور اس مملکت کے قدیم باشندوں کے درمیان حقوق وفرائض کے باب میں فرق روا رکھا جاسکتا ہے؟ کیا اس مملکت کے باشندوں کو ملنے والی بہت سی سہولیات سے انھیں محروم رکھا جاسکتا ہے؟

فقہ اسلامی میں ہمیں دار الحرب، دار العہد اور دار الاسلام کے احکام میں اختلاف نظر آتا ہے؛ لیکن دار الاسلام کی حدود میں واقع علاقہ و ملک کے اختلاف سے احکام میں کوئی اختلاف نظر نہیں آتا؛ کیوں کہ یہ بات پیچھے گذر چکی کہ دار الاسلام کے تمام شہریوں کو برابر درجہ کے حقوق حاصل ہیں، اور ان پر مساوی درجہ کے فرائض عائد ہیں اور تمام شہریوں کو حکومت کی طرف سے یکساں سہولتیں حاصل ہیں اور علاقہ و وطن کا اختلاف اس سلسلہ میں کوئی معنی نہیں رکھتا، اس لئے حقوق و فرائض کے سلسلہ میں علاقہ و ملک کی بنیاد پر ملکی و غیر ملکی اور پناہ گزین و شہری کے نام پر دار الاسلام کے مسلم شہریوں کے درمیان تفریق کرنا شرعاً صحیح نہیں ہے، شیخ مفتی محمد عبدہ کے نظریات سے یقیناً اختلاف کیا جاسکتا ہے؛ لیکن ان کا یہ فتویٰ مبنی بر حقیقت ہے:

"لا جنسية فى الإسلام ، ولا امتياز فى الحقوق بين مسلم ومسلم" ۔(فتاویٰ ازہر: ۵/ ۳۷۴، المکتبۃ الشاملۃ)

(اسلام میں (مروجہ) شہریت کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور مسلمانوں کے درمیان حقوق کے سلسلہ میں کوئی اختلاف روا نہیں رکھا جاسکتا ہے)۔

البتہ پناہ گزینوں کو دیئے جانے والے سیاسی حقوق میں سے دو طرح کے حقوق، یعنی انتخاب لڑنے یا سیاسی عہدہ حاصل کرنے کا حق اور ووٹ دینے کا حق قابل توجہ ہیں:

(۱) موجودہ دور میں عوام اپنے نمائندے محلوں، قریوں اور شہروں یعنی علاقوں کی بنیاد پر منتخب کرکے ایوانِ حکومت میں بھیجتے ہیں، یہ نمائندے اپنے علاقوں کے ذمہ دار بھی ہوتے ہیں اور ان علاقوں میں رہنے والے باشندوں کے وکیل بھی ہوتے ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ پناہ گزین جن علاقوں میں عارضی طور پر مقیم ہیں ان کا ان علاقوں سے تعلق نہیں اور نہ ہی وہاں مستقل سکونت اختیار کرنا ان کا ارادہ ہے اور یہ بات بھی واضح ہے کہ ایوانِ حکومت میں پہنچنے والے نمائندے اپنے علاقوں کے مستقل باشندوں کے وکیل ہوتے ہیں، نہ کہ عارضی طور پر قیام کرنے والے لوگوں کے، اس لئے پناہ گزینوں کو اگر ووٹ دینے سے روکا جائے تو اس کی گنجائش ہے، اس سلسلہ میں ہمیں دستورِ مدینہ کی بعض دفعات سے رہنمائی ملتی ہے، آپ ﷺ نے مملکت مدینہ تشکیل دینے کے بعد وہاں کے قبائل کی مستقل اکائیاں بنادی تھیں اور اس وقت ہر قبیلہ اپنے آپ میں ایک محلّہ ہوا کرتا تھا، گویا کہا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے مملکت کو محلوں کی بنیاد پر مستقل اکائیوں میں بانٹ دیا تھا، ہر قبیلہ اپنے محلے کا ذمہ دار تھا اور دیت ادا کرنا اور قیدیوں کو چھڑانا ہر ایک محلّہ کی مستقل اپنی ذمہ داری تھی اور اس ذمہ داری کو ادا کرنے میں --- عام حالات میں --- صرف اس قبیلے کے لوگ ہی شریک تھے، (دیکھئے: دفعہ: ۴-۱۱، رسول اللہ ﷺ کی حکمرانی اور جانشینی، ڈاکٹر حمید اللہ: ۶۰-۶۱) --- اسی طرح موجودہ دور میں بھی حکومت کی بہت ساری ذمہ داریاں

علاقائی اکائیوں میں تقسیم ہیں اور ہر علاقے کا مستقل اپنا ایک ذمہ دار ہوتا ہے جو اپنے علاقے کی نمائندگی بھی کرتا ہے اور پناہ گزینوں کا تعلق چونکہ اس علاقے سے نہیں ہے اس لئے انھیں اس علاقے کا ذمہ دار اور نمائندہ منتخب کرنے کا حق دینا بے سود ہے، اس کی مزید وضاحت آپ ﷺ کے اس ارشاد سے ہوتی ہے جو آپ ﷺ نے انصار سے فرمایا تھا :

''أخرجوا إلي اثنی عشر نقیباً منكم ، یكونون علىٰ قومهم '' (مجمع الزوائد:۹۸۸، کتاب المغازی، ابتداء امر الأنصار:۶/ ۱۵۲)۔

(تم اپنے میں سے بارہ نقیب منتخب کر کے لاؤ وہ اپنی قوم (اپنے اپنے قبیلوں) کے ذمہ دار ہوں گے)۔

اس زمانے میں قبائلی نظام رائج تھا، اس لئے آپ ﷺ نے قبیلوں کی بنیاد پر نمائندے منتخب کرائے اور '' أخرجوا '' اور '' منكم '' کے ذریعہ یہ بات بھی واضح کردی کہ نمائندے انصار ہی میں سے ہوں اور انصار ہی انھیں منتخب کریں، موجودہ دور میں نمائندگی کے لیے قبائلی نظام کے بجائے علاقائی نظام رائج ہے، اس لئے حکومت کی طرف سے یہ اعلان کیا جاسکتا ہے کہ جس علاقے کا نمائندہ منتخب کیا جارہا ہے اسی علاقے کے باشندوں کو انتخاب کرنے کا حق ہے، عارضی طور پر رہائش پذیر لوگوں کو اس کا حق نہیں۔

(۲) عہدے اور منصب اسلامی نقطۂ نظر سے '' حق '' نہیں؛ بلکہ عظیم '' ذمہ داری '' ہیں، ایسی عظیم ذمہ داری مظلوم پناہ گزینوں کے کاندھوں پر ڈالنا بجائے خود ایک ظلم ہے؛ اس لئے پناہ گزینوں کو الیکشن لڑنے اور سیاسی عہدہ و منصب حاصل کرنے سے دور رکھا جاسکتا ہے اور اگر ان پناہ گزینوں میں سے کوئی شخص یہ عہدہ و منصب طلب کرے تو حدیث نبوی کی رو سے اسے عہدہ و منصب نہ دینا جائز ہے؛ چنانچہ یہ آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

''إنا والله لا نولی علی عملنا هذا من سأله أو حرص علیه '' (بخاری، کتاب الاحکام:۸/ ۱۴۷)۔

(خدا کی قسم ہم اپنے اس کام کا کسی ایسے شخص کو ذمہ دار نہیں بنائیں گے جو اسے طلب کرے یا اس کی لالچ کرے)۔

تاہم اتنی بات ضرور ہے کہ اگر کسی پناہ گزین کے اندر صلاحیت و قابلیت ہو اور اس کو اس کی صلاحیت کے اعتبار سے کوئی عہدہ و منصب تفویض کرنا مسلم مملکت اور مسلمانوں کے مفاد میں ہو تو ایسا کرنا شرعاً ناجائز بھی نہیں ہے۔

غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا:

غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی مختلف امکانی صورتیں ہیں اور ہر صورت کا حکم بھی ایک جیسا نہیں ہے :

(۱) یہودیوں کا ملک اسرائیل چونکہ مسلمانوں کی زمین غصب کر کے ناجائز طور پر تشکیل دیا گیا ہے، اس لئے اس ملک کی مستقل شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ اس کے عہدیداروں کو شہریت کی درخواست پیش کرنا اس بات

کا اعتراف کرنا ہے کہ یہ ملک ان غاصبوں کا ہے اور اس کا وجود جائز بنیادوں پر استوار ہے۔

(۲) وہ ممالک جو ٹھیٹھ معنوں میں دار الحرب ہوں، جہاں دین پر عمل کرنا دشوار ترین امر ہو، مذہبی آزادی حاصل نہ ہو اور انفرادی زندگی میں بھی اسلامی احکام کی بجا آوری مشکل ہو تو ایسے ملک کی بھی شہریت اختیار کرنا صحیح نہیں ہے؛ کیونکہ ایسے ممالک سے بہ صورتِ امکان ہجرت واجب ہے؛ چہ جائے کہ وہاں کی شہریت اختیار کی جائے، صلح حدیبیہ سے پہلے مکہ بھی اسی طرح کا دار الحرب تھا؛ اس لئے قدرت ہونے کے باوجود کسی عذرِ شرعی کے بغیر وہاں سے ہجرت نہ کرنے والوں کے بارے میں سنگین وعید نازل ہوئی :

''أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَأُوْلَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَسَاءَتْ مَصِيْراً'' (النساء: ۹۷)

(کیا اللہ کی زمین کشادہ نہیں تھی کہ تم وہاں ہجرت کر جاتے، یہی ہیں وہ لوگ جن کا ٹھکانہ جہنم ہے اور یہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے)۔

(۳) کسی مسلمان کو اس کے ملک میں روزگار کے ذرائع میسر نہ ہوں، پوری تگ و دو کے باوجود بھی کسی مسلم ملک میں روزی روٹی کا کوئی باقاعدہ انتظام نہ ہو پائے اور تنگی کی وجہ سے فاقہ کشی کی نوبت بھی آجاتی ہو، ایسے شخص کو اگر کسی غیر مسلم ملک میں ملازمت ملے یا روزگار کا کوئی ذریعہ ہاتھ آئے جس کی وجہ سے وہ وہاں کی شہریت اختیار کرلے تو اس کی گنجائش ہے؛ کیونکہ یہ اضطرار کی حالت ہے؛ لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اپنے دین و ایمان کے سلسلے میں مامون ہو؛ کیوں کہ حفظ دین کا درجہ حفظ نفس سے بڑھا ہوا ہے۔

(۴) یہی حکم اس شخص کے بارے میں بھی ہوگا جو اپنے ملک میں ناحق ظلم وستم کا شکار ہو، بلا کسی جرم کے قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہو، اربابِ اقتدار کی چیرہ دستیوں سے زندگی اجیرن بن گئی ہو اور کوئی دوسرا مسلم ملک بھی شہریت دینے پر آمادہ نہ ہو یا اگر کسی دوسرے مسلم ملک میں شہریت مل بھی جائے تو بھی ظالموں کے ہاتھ وہاں تک پہنچنے کا قوی اندیشہ ہو، جس کی وجہ سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کے سوا اس کے سامنے اور کوئی راستہ نہ ہو۔

(۵) کوئی شخص فاقہ کشی کا شکار نہ ہو اور نہ ہی ظلم وستم سے دوچار ہو اور جس ملک کی شہریت اختیار کر رہا ہو وہاں مذہب پر عمل کرنے کی مکمل آزادی ہو؛ لیکن تہذیب وتمدن کے نام پر بدتہذیبی کا ایسا سیلاب ہو کہ سفینۂ ایمان دین بے زاری کے گرداب میں غرقاب ہوجائے اور اس کے پاس ''عشق'' کی عظیم دولت کی فراوانی بھی نہ ہو کہ ''عشق خود ایک سیل ہے سیل کو لیتا ہے تھام''، جس کی وجہ سے ماحول میں ڈھل جانے اور ایمانی حمیت کے ختم ہوجانے کا قوی اندیشہ ہو تو ایسے شخص کے لئے اس غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے؛ کیونکہ موت تک اسلامی احکام پر کاربند رہنا فرض ہے :

"يَآ يُّهَا الَّذِيۡنَ آمَنُوۡا اتَّقُوۡا اللهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلاَ تَمُوۡتُنَّ إِلاَّ وَأَنتُم مُّسۡلِمُوۡنَ " (آل عمران:۱۰۲)۔

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہرگز نہ مرو، مگر اس حال میں کہ تم مسلمان رہو)۔

نیز آپ ﷺ کا ارشاد ہے :

"أنا برئ من كل مسلم يقيم بين أظهر المشركين " (ابوداؤد، کتاب الجہاد، النہی عن قتل من اعتصم بالسجود: ۲۶۴۵)۔

(میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکوں کے درمیان اقامت اختیار کرے)۔

علامہ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس شخص کے بارے میں ہے جو اپنے دین و ایمان کے سلامت رہنے کے سلسلہ میں مامون نہ ہو :

"وهذا محمول على من لم يأمن على دينه "(فتح الباری: الجہاد والسیر، وجوب النفیر :۶/۴۸)۔

(یہ حدیث اس شخص کے بارے میں ہے جو اپنے دین پر مامون نہ ہو)۔

(۶) کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں خالص دعوتی نقطۂ نظر سے رہائش اختیار کرنا چاہے؛ تاکہ وہ غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے، اسلام پر ہونے والے اعتراضات کا جواب دے، لوگوں کے شبہات کا ازالہ کرے یا مسلمانوں کے درمیان تعلیم و تبلیغ کا فریضہ انجام دے اور کفر کے اندھیروں میں ہوا کی تندی و تیزی سے بے پروا ہو کر اسلام کی شمع روشن کرے، تو ایسے شخص کا اس غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا صرف جائز ہی نہیں؛ بلکہ امر مستحسن ہے اور اس کا یہ عمل قابل ستائش ہے، غیر مسلم ملکوں میں موجود صحابہ کرام ﷺ کی قبریں جواز کی دلیل کے لئے کافی ہیں۔

(۷) کوئی شخص دعوتی مقصد کے تحت کسی غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہتا ہے؛ لیکن ساتھ میں اس کا ارادہ معاشی استحکام پیدا کرنا بھی ہے تو یہ صورت بھی شرعاً جواز کے دائرے میں ہوگی، اللہ تعالیٰ نے عازمینِ حج کو ایامِ حج میں تجارت کی اجازت دیتے ہوئے فرمایا :

"لَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ أَن تَبۡتَغُوۡا فَضۡلاً مِّن رَّبِّكُمۡ " (البقرۃ:۱۹۸)۔

(تم پر کچھ حرج نہیں ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو)۔

یعنی کسی کا اصل مقصد حج کرنا ہو اور ساتھ میں وہ تجارت بھی کرے تو اس کی اجازت ہے، کذا ہذا۔

(۸) اگر مذکورہ بالا صورتوں میں سے کوئی صورت نہ ہو، یعنی جس مملکت کی شہریت حاصل کرنی ہے، وہ دارالحرب

بھی نہ ہو، اسرائیل جیسی ریاست بھی نہ ہو، مذہب پر عمل کرنے میں دشواری بھی نہ ہو، ماحول میں ڈھل جانے کا اندیشہ بھی نہ ہو اور شہریت حاصل کرنے والا فاقہ کشی سے دوچار بھی نہ ہو، ظلم وستم کا شکار بھی نہ ہو اور اس شہریت حاصل کرنے کے پیچھے کوئی خاص دعوتی مقصد بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے اور حسب ذیل روایات سے استدلال کیا جاتا ہے :

○ "عن النبي ﷺ قال: أنا بریئ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین ، قالوا : یا رسول الله ! لم ؟ قال : لا ترائئ نارا هما" (أبوداؤد، کتاب الجہاد، النہی عن قتل من اعتصم بالسجود: ۲۶۴۵)۔

(رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان اقامت اختیار کرے، صحابہ نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! ایسا کیوں؟ آپ نے جواب دیا: ان دونوں کی آگ میں امتیاز نہیں ہو سکے گا)۔

○ "من جامع المشرک وسکن معه فإنه مثله" (أبوداؤد، کتاب الجہاد، فی الاقامة بأرض الشرک: ۲۷۸۷)

جو مشرک کے ساتھ میل جول رکھے اور ان کے ساتھ سکونت اختیار کرے تو وہ اس مشرک جیسا ہے۔

○ " لا تساکنوا المشرکین ولا تجامعوهم ، فمن ساکنهم أو جامعهم فهو مثلهم " (ترمذی، کتاب البر، ماجاء فی کراہیۃ المقام بین أظہر المشرکین: ۱۶۰۵)۔

(مشرکوں کے ساتھ سکونت اختیار مت کرو اور ان سے میل ملاپ نہ رکھو، جو کوئی ان کے ساتھ سکونت اختیار کرے گا یا ان سے میل ملاپ رکھے گا تو وہ ان ہی جیسا شمار ہوگا)۔

○ "لا تترکوا الذریة ؛ یعنی بإزاء العدو " (مراسیل لأبی داؤد، باب ماجاء فی إنزال الذریۃ السواحل والثغور: ۱/۲۵۳)۔

(اپنی اولاد کو نہ چھوڑو، یعنی دشمن کے درمیان)۔

ان احادیث کی وجہ سے عام طور پر غیر مسلم مملکت کی شہریت حاصل کرنے سے منع کیا جاتا ہے؛ لیکن خیال ہوتا ہے کہ یہ احادیث عام نہیں ہیں؛ کیوں کہ اگر یہ عام ہوتیں تو غیر مسلم ملک کے شہریوں پر بہر صورت ہجرت واجب ہوتی؛ حالانکہ ایسا نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ شارحِ حدیث علامہ ابن حجرؒ نے اس نہی کو مخصوص صورتِ حال پر محمول کیا ہے، وہ فرماتے ہیں :

"أنا بریئ من کل مسلم یقیم بین أظهر المشرکین ، وهذا محمول علی من لم یأمن علی دینه" (فتح الباری، کتاب الجهاد والسیر، وجوب النفیر: ۶/۴۸)

(آپ ﷺ کا ارشاد) مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرنے والے ہر مسلمان سے میں بری ہوں، کا

مصداق وہ شخص ہے جو اپنے دین کے سلسلہ میں مامون نہ ہو۔

لہٰذا اگر کوئی شخص اپنے دین وایمان کے سلسلہ میں مامون اور مطمئن ہو اور اسلام مخالف ماحول میں ڈھل جانے کا اندیشہ نہ ہو تو خواہ اس کا مقصد خالص معاشی فوائد حاصل کرنا ہی کیوں نہ ہو اسے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی گنجائش ہونی چاہئے۔

غیر مسلموں کو مسلم ملکوں کی شہریت دینا:

غیر مسلموں کو مسلم ملکوں کی شہریت دینا شرعاً جائز ہے، کتبِ فقہ میں عقد ذمہ کے عنوان سے اس کی تفصیلات ملتی ہیں، اس عقد ذمہ کی مشروعیت سورۂ توبہ کی جزیہ والی آیت سے ثابت ہے، آپ ﷺ نے بھی دستور مدینہ میں یہودی قبائل کو مملکتِ مدینہ کے شہری ہونے کی حیثیت دی تھی، دورِ نبوی، دورِ خلفاء راشدین اور بعد کے ادوار میں بھی اہل ذمہ کو مسلم مملکت کی شہریت حاصل رہی؛ اس لئے مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا شرعی نقطۂ نظر سے درست اور جائز ہے؛ البتہ اس سلسلہ میں تین باتیں قابل ذکر ہیں۔

(۱) آپ ﷺ کا ارشاد ہے: ''**أخرجوا المشركين من جزيرة العرب**'' (بخاری: کتاب الجزیۃ، باب إخراج الیہود: ۳۱۶۸) اور ''**لا يجتمع دينان في جزيرة العرب**'' (مؤطا امام مالک، الجامع: فی إجلاد الیہود من المدینۃ: ۱۶۷۱) غیر مسلموں کو مسلم مملکت کی شہریت دینے کے سلسلہ میں ان احادیث کو نظر انداز کر دینا سنگین غلطی ہوگی۔

(۲) استعمار کی سیاہ تاریخ ہمارے پیش نظر رہنی چاہئے کہ یہ استعمار جہاں بعض ملکوں میں شمشیر وآہن کی جھنکار کے ساتھ آیا، وہیں بعض دوسرے ملکوں میں رہائش اختیار کرنے کے بہانے دبے پاؤں آیا اور آہستہ آہستہ اپنے قدم مضبوط کئے؛ لہٰذا گو فقہاء نے غیر مسلموں کی درخواستِ شہریت کو قبول کرنا واجب قرار دیا ہے؛ لیکن اس طرح کے استعماری عناصر کو شہریت دینے کے سلسلہ میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

(۳) مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنے کے سلسلہ میں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ کہیں ان کی بڑھتی تعداد مسلم مملکت کے لئے خطرے کا باعث نہ ہو اور وہ اپنی کثیر تعداد کی وجہ سے ووٹ کی طاقت کے ذریعہ اسلامی مملکت کی ہی بیخ کنی کر دیں، یا بغاوت کر کے اپنی الگ مملکت قائم کر لیں، اسرائیل کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے کہ یہ ناجائز مملکت ۱۹۴۸ء میں یک بہ یک تشکیل نہیں پا گئی؛ بلکہ پہلے وہاں یہود آباد ہونے شروع ہوئے اور برطانیہ کی سرپرستی میں اپنے قدم مضبوط کئے، پھر اس کے بعد اقوامِ متحدہ سے قرارداد پاس کرائی۔

☆☆☆

چوتھا باب

مختصر تحریریں

شہریت سے متعلق جوابات

مولانا زبیر احمد قاسمی☆

۱- اسلامی نقطہ نظر سے شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے امن چین کی خوشحال زندگی اور معاشی طور پر فارغ البالی کے حصول کے ساتھ دائرہ شریعت میں ہونے والے تمام ہی توقعات وامکانات کی تکمیل کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

۲- کسی مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والے مسلمان کو اپنے ملک میں رہتے ہوئے جان مال عزت وآبرو یا دین وایمان کے تعلق سے کوئی خطرہ لاحق ہوتو اب اگر وہ اپنی اس مجبوری کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہے تو میرے خیال سے اس مسلم ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا ضروری ہونا چاہیے، بشرطیکہ اس کی وجہ سے خود اس مسلم ملک کو کوئی ضرر شدید لاحق نہ ہو؛ البتہ اگر اس کو اس طرح کی کوئی مجبوری نہیں محض اپنی خواہش سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو مسلم ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا ضروری نہیں ہونا چاہیے۔

۳- اگر کسی علاقہ میں مسلمانوں پر ظلم وزیادتی ہورہی ہو جس کی وجہ سے وہاں کے مسلمان کسی مسلم ملک میں پناہ لینے پر مجبور ہوں تو انسانی ہمدردی اور اسلامی اخوت کا تقاضا ہے کہ وہاں کی حکومت ان مظلوم تارکین وطن کو وہ تمام شہری حقوق اور سہولتیں عطا کرے جو اس ملک کے قدیم باشندوں کو حاصل ہیں، اور یہ بات عقلاً شرعاً کسی اعتبار سے درست معلوم نہیں ہوتی کہ ان مظلوموں کو پناہ گزیں یا دوسرے نمبر کا شہری قرار دیا جائے، اسلام کی روشن تعلیم ہمیں یہی سبق دیتی ہے؛ چنانچہ کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آکر جب مسلمانوں نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو مدینہ میں انہیں پناہ گزیں یا دوسرے نمبر کا شہری قرار نہیں دیا گیا، بلکہ وہاں کے قدیم باشندوں نے ان تارکین وطن مسلمانوں کے ساتھ اخوت وہمدردی کا ایسا معاملہ کیا جس کی مثال پیش کرنے سے دنیا عاجز ہے؛ بلکہ اس سلسلہ میں تو ہمارے مسلم حکمرانوں کو غیر مسلم حکمرانوں سے سبق لینا چاہیے کہ تقسیم ہند کے بعد جب دونوں ملکوں میں فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے جس کے نتیجہ میں بہت سے ہندو، سکھ وغیرہ پاکستان

☆ ناظم الجامعۃ العربیہ اشرف العلوم کنہواں سیتامڑھی (بہار)۔

چھوڑ کر ہندوستان آگئے، تو یہاں کی حکومت نے انہیں پناہ گزیں کا درجہ نہیں دیا، بلکہ انہیں مستقل شہریت دیکر وہ تمام حقوق دیئے جو یہاں کے قدیم باشندوں کو حاصل تھے، اور وہ یہاں کے معاشرے میں اس طرح ضم ہوگئے کہ آج یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ کون یہاں کا قدیم باشندہ ہے اور کون پاکستان سے آیا ہوا ہے۔

۴- آج کی سیاسی اصطلاح میں حقوق شہریت کا جو تصور ہے بنیادی اعتبار سے یہ وہی حقوق ہیں جو آج سے چودہ سو سال پہلے اسلام نے ذمیوں کو عطا کیا ہے، اور ذمیوں کے سلسلہ میں اسلام کا یہ اصول مشہور ہے: "**لهم مالناوعليهم ماعلينا**" اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اسلامی نقطۂ نظر سے اسے وہ تمام حقوق حاصل ہونے چاہئیں جو وہاں کے قدیم باشندوں کو حاصل ہیں، مثلاً جان، مال، عزت وآبرو کے تحفظ کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق سرکاری اداروں، مثلا سرکاری اسکول، سرکاری ہسپتال وغیرہ سے استفادہ کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، ایک جگہ سے دوسری جگہ پیشگی اجازت کے بغیر آمد ورفت کا حق، ووٹ دینے کا حق، بحیثیت امیدوار الیکشن میں شرکت کا حق وغیرہ۔

"وحقوق أهل الذمة من حيث الاساس كحقوق المواطنة والقاعدة المعروفة عندنا: ,,لهم مالناوعليهم ماعلينا،، فهم يتمتعون بكامل الحقوق فى عقيدتهم وعباداتهم وأحوالهم الشخصية ويستفيدون من حماية الدولة لأموالهم ودماء هم وأعراضهم ،ولهم حقهم فى كفالة الدولة أسوة بالمسلمين ... ويتمتعون بحق اللجوء إلى القضاء لحما يتهم من كل أنواع الظلم حتى ولوكان المهتم هو الخليفة نفسه فحق الذمى بماقاضاته كحق أى فرد من المسلمين..... . إننا نرى أن المواطنة فى هذا العصرتتفق فى عناصرها الأساسية مع "عقد الذمة"،" (المسلم مواطنا فی اوروپا ص ۶۰)۔

۵- اسلامی نقطہ نظر سے پناہ گزینوں کو شہریوں کی طرح وہ تمام حقوق حاصل ہونگے جن کا تعلق انسان کی بنیادی ضروریات سے ہے، مثلا جان، مال، عزت وآبرو کے تحفظ کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، مذہبی آزادی وغیرہ۔

"ذهب جمهورالفقهاء إلى أنه إذاوقع الأمان من الإمام أو من غيره بشروطه وجب على المسلمين جميعا الوفاء به، فلايجوز قتلهم ولاأسرهم ولاأخذ شئى من مالهم ولا التعرض لهم بعصمتهم ولا أذ يتهم بغير وجه شرعى " (الموسوعۃ الفقہیۃ ۷/۳ ۱۷۰)۔

البتہ وہ حقوق جن کا تعلق انسان کی بنیادی ضرورتوں سے نہیں، بلکہ وہ آسائش وسہولت یا شہری اعزاز کے قبیل سے

ہے تو میرے خیال سے وہ پناہ گزینوں کو حاصل نہیں ہونگے ،مثلاً ووٹ دینے کا حق ،امیدوار کی حیثیت سے الیکشن میں حصہ لینے کا حق وغیرہ۔ واللہ اعلم بالصواب

۶- ضرورت ومجبوری کی وجہ سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا درست ہوگا،اور محض معاشی فوائد کی غرض سے مکروہ ہوگا؛ چنانچہ اس سلسلہ میں مفتی تقی عثمانی صاحب نے جو کچھ فرمایا ہے اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے:

اگر کسی مسلمان کو اپنے ملک میں جان ومال، دین وایمان اور عزت وآبرو کا خطرہ درپیش ہو تو اس کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا جائز ہے بشرطیکہ وہاں جا کر اپنے اور اپنے اہل وعیال کے دین وایمان کی حفاظت اور وہاں کی برائیوں سے اجتناب کا پختہ ارادہ ہو۔ دلیل اس کی ہجرت حبشہ کا واقعہ ہے کہ غیر مسلم ملک ہونے کے باوجود صحابہ کرام نے وہاں اقامت اختیار کیا۔ اس طرح اگر اس کو اپنے ملک میں بقدر ضرورت روزی میسر نہ ہو تو اس معاشی مجبوری کی وجہ سے بھی شرط مذکورہ کے ساتھ درست ہوگا؛ کیونکہ کسب معاش فرض ہے اور اللہ تعالی نے اس کو کسی خاص جگہ کے ساتھ مقید نہیں کیا؛ چنانچہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے: **"هوالذی جعل لکم الأرض ذ لولا فامشوا فی مناکبها وکلوا من رزقه"** (سورۂ ملک:۱۵)، البتہ اس طرح کی اگر کوئی مجبوری نہ ہو تو محض معاشی فوائد کی غرض سے جانا کراہت سے خالی نہیں اور یہی صورت ان احادیث کا مصداق ہے جن میں نبی پاک ﷺ نے غیر مسلموں کی بستیوں میں قیام کرنے سے منع فرمایا ہے (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ص ۳۲۸)۔

۷- غیر مسلموں کو مسلم ممالک میں آباد کرنا فی نفسہ درست ہے، البتہ اگر ان کو مستقل شہریت دینے میں ملک وملت کا کوئی نقصان ہو تو درست نہیں ہوگا۔

"وقال الحنفية وهورواية عند المالكية ورواية عن أحمد: يجوز عقد الذمة لجميع الكفار، إلاعبدة الأوثان من العرب " (موسوعہ فقہیہ ۷/ ۱۲۴)۔

"الأصل أن إعطاء الأمان أوطلبه مباح وقد يكون حراما أومكروها إذاكان يؤدی إلی ضرر أو إخلال بواجب أومندوب " (موسوعہ فقہیہ ۶/ ۲۳۴)۔

خلاصۂ بحث

(۱) اسلام میں حصول شہریت کے لئے امن چین کی خوشحال زندگی اور معاشی طور پر فارغ البالی کے حصول کے ساتھ دائرہ شریعت میں ہونے والے تمام ہی توقعات وامکانات کی تکمیل کو بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔

(۲) اگر کسی مسلمان کو اپنے ملک میں جان، مال، عزت وآبرو اور مذہبی آزادی کے تعلق سے کوئی خطرہ ہو پھر وہ اس

مجبوری کی وجہ سے کسی مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا چاہتا ہوتو میرے خیال سے اس صورت میں مسلم ملک پر درخواست قبول کرنا شرعاً ضروری ہوگا؛ البتہ اس طرح کی اگر کوئی مجبوری نہ ہو محض اپنی خواہش سے جانا چاہتا ہے تو درخواست قبول کرنا شرعاً ضروری نہیں، حاکم چاہے تو قبول کرے اور اگر ملکی مصلحت کے خلاف سمجھے تو رد کرے۔

(۳) اگر کسی علاقہ کے مسلمان اپنے اوپر ظلم وزیادتی سے تنگ آکر کسی مسلم ملک میں پناہ لینے پر مجبور ہوں تو وہاں کی حکومت کے لئے یہ بات جائز نہیں ہوگی کہ ان تارکین وطن مظلوموں کو صرف پناہ گزیں کا درجہ دے اور انہیں مستقل شہری تسلیم نہ کرے۔

(۴) اگر کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اسلامی نقطہ نظر سے اسے وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو وہاں کے قدیم باشندوں کو حاصل ہیں۔

(۵) جو حقوق انسان کی بنیادی ضرورت کے قبیل سے ہیں وہ شہری کی طرح پناہ گزیں کو بھی حاصل ہوں گے اور جو حقوق آسائش وسہولت یا شہری اعزاز کے قبیل سے ہوں وہ پناہ گزیں کو حاصل نہیں ہوں گے۔

(۶) ضرورت ومجبوری کی وجہ سے غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنا جائز ہے، اور بغیر کسی مجبوری کے محض معاشی فوائد کے حصول کے لئے مکروہ ہے۔

(۷) مسلم ممالک میں غیر مسلموں کو مستقل شہریت دیکر آباد کرنا فی نفسہ جائز ہے، الا یہ کہ ان کو مستقل طور پر آباد کرنے میں ملک وملت کا کوئی نقصان ہو تو درست نہیں۔

☆☆☆

ممالک اسلامیہ میں غیر مسلم کو شہریت دینے کا مسئلہ

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی ☆

۱- غیر مسلم کی شہریت کے تعلق سے اولا ''الموسوعۃ الفقہیہ'' (۷/۱۲۵) سے یہ تحریر عرض ہے:

''وجمهور الفقهاء (الحنفية والشافعية والحنابلة) على أن مدة الإقامة فى دارالإسلام للمستامن لا تبلغ سنة فإذا أقام فيها سنة كاملة أوأكثر تفرض عليه الجزية ويصير ذميا'' (موسوعہ فقہیہ ۷/۱۲۵)۔

(جمہور فقہاء کا قول ہے کہ مستامن کے لئے دارالاسلام میں اقامت ایک سال نہ ہوگی، ایک سال یا اس سے زائد ہونے پر اس پر جزیہ عائد کردیا جائے گا اور وہ ذمی بن جائے گا)، معمولی فرق کے ساتھ یہ دوسری تحریر المستشار شیخ فیصل مولوی کی پیش ہے:

''قال الفقهاء: لو دخل غير المسلم المستامن بلاد المسلمين، فإن أقصى مدة يسمح له بالإقامة فيها سنة واحدة، فإذا استمر فى دار الاسلام أكثر من سنة من تاريخ دخوله أو من تاريخ انذار الإمام له با لخروج اكتسب جنسية دارالاسلام، وأصبح ذميا عند جمهور الفقهاء من الحنفية والشافعيه و الحنابله'' (المسلم مواطنا فی اوروبا ص ۱۸)۔

(فقہاء کہتے ہیں اگر غیر مسلم مستامن مسلم ملک میں داخل ہو تو اس کی وہاں سکونت زیادہ سے زیادہ ایک سال ہوگی اگر اس کی تاریخ دخول یا امام کے اسے نکلنے کا حکم دینے کی تاریخ سے ایک سال سے زیادہ ہو جائے تو پھر اسے دارالاسلام کی شہریت مل جائے گی اور وہ ذمی ہو جائے گا، حنفیہ وشافعیہ وحنابلہ کا یہی مسلک ہے)۔

عقد ذمہ کن لوگوں کے ساتھ ہوگا اس کے تحت فقہاء کے آراء عرض ہیں، حنفیہ کے قول اور امام مالک وامام احمد بن حنبل کے ایک قول میں یہ ہے کہ بت پرست عربوں کے علاوہ تمام کفار کے ساتھ عقد ذمہ کرنا درست ہے، لیکن مالکیہ کے

☆ شیخ الحدیث دارالعلوم مئو۔

مشہور قول کے مطابق عقد ذمہ ہر طرح کے کفار کے ساتھ جائز ہے، کتابی ہو یا غیر کتابی، عربی بت پرست اور غیر عربی بت پرست کے درمیان کوئی فرق نہیں۔

"**وقال الحنفية وهو رواية عند المالكية ورواية عن أحمد: يجوز عقد الذمة بجميع الكفار، إلا عبدة الأوثان من العرب**" (موسوعہ فقہیہ ۷/۱۲۲)۔

ذمی کے شہریت دینے کے کئی فوائد ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی عبادات اور اخلاق ومعاملات کو دیکھ کر متاثر ہوں، نیز ممکن ہے کہ اسلام بھی قبول کرلیں۔ احقر کی رائے ہے کہ یہ شہریت محدود پیمانہ پر دی جانی چاہئے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ تعداد میں مسلمانوں سے زیادہ ہوجائیں اور پھر مستقبل میں مسلمانوں اور خود ان کے ملک کے لئے مسائل پیدا ہوجائیں جو اہل خبر پر مخفی نہیں۔

اگر وہ غیر مسلم غیر ملکی یا مسلم غیر ملکی تعلیمی یا اقتصادی یا طبی میدان میں اختصاص رکھتا ہو اور مستقبل میں اس سے کسی طرح کے ضرر کا امکان نہ ہو اور ملک کو اس کی خدمات کی اشد ضرورت ہو تو میرے خیال میں کسی مدت کے بغیر اسے شہریت دی جاسکتی ہے، عمرو بن عاصؓ والی مصر کو جب مشہور عیسائی طبیب اتوشیوس یا اسطیوس جسے قسطنطنیہ کے عیسائی دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا اس کے فضل وکمال کی شہرت کا پتہ چلا تو انہوں نے اسے بلایا ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ "اکرمہ وورى له موضعا" (ص ۱۰۴)۔ اور اس کی عزت کی اور خاص حیثیت اس کی ان کی نظر میں قائم ہوگئی، قفطی نے اس واقعہ کا ذکر کرکے لکھا ہے: "**فلازمه و كان لا يكاد يفارقه**" (ص ۲۳۲)۔ اور اس کو عمرو بن عاصؓ نے اپنے ساتھ رکھ لیا اور مشکل ہی سے وہ اس سے الگ ہونا چاہتے تھے (معارف جلد ۶۶ ماہ نومبر ۱۹۵۰ء، ص ۳۴۳، ۳۴۴)۔

مسلمان کے کسی اسلامی ملک کے شہری بننے کے لئے کتنی مدت درکار ہوگی اس سلسلہ میں ڈاکٹر جمال الدین عطیہ کی کتاب "النظریۃ العامۃ للشریعۃ الاسلامیۃ" کے ترجمہ "اسلامی شریعت کا عمومی نظریہ" کے صفحہ (۳۱۳) سے ایک عبارت پیش ہے:

"جو مسلمان کسی غیر اسلامی ملک کا شہری ہو اگر وہ اسلامی ملک کا شہری بننا چاہے تو اس کے لئے صرف اتنا ضروری ہے کہ اپنی اس خواہش کا اعلان کردے اور کسی اسلامی ملک میں محض دو ہفتے ٹھہرنے سے وہ اس ملک کا شہری ہوجائے گا اور اس کے وہی حقوق وفرائض ہوں گے جو اس ملک کے دوسرے شہریوں کے ہیں، اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ مسلمان ملکوں کی شہریت کے قوانین اور دستوروں میں یہ صراحت کردی جائے کہ ہر مسلمان کو اسلامی مملکت کی شہریت حاصل کرنے کا حق ہے"۔

احقر کی رائے یہ ہے کہ سترہویں فقہی سمینار میں فقہ اکیڈمی نے ''وطن اصلی کے ساتھ دوسری جگہ مستقل قیام اور قصر و اتمام کے احکام'' کے ذیل میں جو دو تجاویز پاس کی ہیں اسے شہریت کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے، جو درج ذیل ہیں:

۱-جائے ملازمت وتجارت میں طویل اقامت کے ساتھ ذاتی مکان بھی بنالینا دائمی قیام کی نیت پر دلالت کرتا ہے، اس لئے مذکورہ جگہ وطن اصلی شمار کی جائے گی۔ ۲-جائے ملازمت وتجارت میں ذاتی مکان تونہیں بنایا، بلکہ کرایہ کے مکان یا ادارہ وکمپنی کے فراہم کردہ مکان میں اہل وعیال کے ساتھ مستقل قیام کی نیت سے رہائش پذیر ہے تو اس جگہ کو وطن اصلی کا حکم حاصل ہوگا۔ واضح ہو کہ ان دونوں قراردادوں ۱-ذاتی مکان بنالینا، ۲-کرایہ وادارہ ہی کا مکان سہی، لیکن اہل و عیال کے ساتھ مستقل قیام کی نیت کو جنسیت کی بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔

۲- وہ مسلمان جو دارالحرب میں رہتے ہوں اور اظہار دین پر قدرت نہ ہو تو وہاں سے ان کے لئے ہجرت ضروری ہے، اس صورت میں دوسرے مسلم ملک کے لئے ان کی درخواست قبول کرنا شرعاً ضروری ہونا چاہئے، بصورت دیگر اگر اس ملک کی کوئی سیاسی مجبوری نہ ہو تو درخواست قبول کرلینا چاہئے۔

۳- شہری سہولیات تو دی جائیں گی، مگر شہری حقوق نہیں، محمد محمود فیض آبادی (مبادی سیاسیات/ص۶۹) پر لکھتے ہیں: ''شہری کے معنی شہر کے باشندہ کے ہیں، لیکن اصطلاحاً اس سے مراد مملکت کے فقط وہ ارکان جنہیں ملکی دستور اور قوانین کے تحت مدنی وسیاسی حقوق حاصل ہوں، ان کے مقابلے میں اجانب کو چند شخصی تحفظات ضرور حاصل ہوتے ہیں، لیکن وہ مدنی اور سیاسی حقوق سے محروم ہوتے ہیں''۔

پناہ گزیں وقتی طور پر کہیں پناہ لیتے ہیں، پناہ دینے والوں اور پناہ چاہنے والوں دونوں کے ذہن میں یہ بات ہوتی ہے کہ ان کے حالات کے سازگار ہونے کے بعد وہ اپنے ملک لوٹ جائیں گے، اس لئے انہیں شہری تسلیم نہ کیا جانا درست ہے۔

۴- مذکورہ ساری چیزیں اسلامی نقطہ نظر سے شہری و سیاسی حقوق ہیں اور ایک شہری کو یہ تمام حقوق حاصل ہونے چاہئیں۔

۵- اس کا جواب ۳ میں گذر چکا ہے، جو شہری وغیر شہری ہونے پر منحصر ہے۔

۶- جن اسباب کے تحت غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت ہے وہ یہ ہیں:

''إن اضطر إليه مسلم بسبب أنه أوذى فى وطنه أو اضطهد بالسجن أو مصادرة أمواله للغير ماذنب أو جريمة ولم يجد لنفسه مأمنا إلا فى مثل هذه البلاد، فإنه يجوز له التجنس بهذه الجنسيات

دون إلی کراهة بشرط أن یعزم علی نفسه المحافظة علی دینه، وفی حیاته العلمیة والابتعاد عن المنکرات الشائعة هناک، والدلیل علی ذلک أن الصحابة رضی الله عنهم هاجروا إلی الحبشة بعد ما اضطهدوا من قبل أهل مکة والحبشة یومئذ یسودها الکفار"(بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ للشیخ محمد تقی عثمانی ص ٣٢٨)

(اگر کوئی مسلمان اپنے وطن کے چھوڑنے پر اس لئے مجبور ہوگیا کہ اسے وہاں ایذاء پہنچائی جارہی ہو، ظلما قید کیا جارہا ہو، اس کا مال غیروں کے لئے بدون کسی گناہ اور جرم کے مباح سمجھا جارہا ہو اور وہ اپنے لئے کوئی فریادرس و پناہ گاہ بھی نہیں پاتا ہو تو اس صورت میں غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا بغیر کسی کراہت کے درست ہے، بشرطیکہ اس کا دینی شعائر پر باقی رہنا اور منکرات سے بچنا درجہ یقین پر ہو، صحابہ کرامؓ نے مشرکین مکہ کے ظلم سے پریشان ہوکر حبشہ ہجرت فرمائی، جبکہ وہاں کا فرمارواکافر تھا)۔

شیخ فیصل مولوی اپنے مقالہ "**قضایا الأمة–المسلم موطنا فی أوروبا**"(ص ١٨-١٩) پر بھی یہی تحریر فرماتے ہیں:"**والمسلم یمکنه أن یعیش خارج دارالاسلام وحتی فی دارالحرب إذا کان متمکنا من إظهار دینه، وإذا کان بعض الفقهاء تحد ثوا عن وجوب الهجرة من دارالحرب، فقد کان ذلک مشروطا بعدم القدرة علی إظهار الدین......ولا بد أن یشیر إلی أن الأحناف لا یوجبون الهجرة من دار الحرب فی جمیع الظروف لقول رسول الله ﷺ:"لا هجرة بعد الفتح، ولکن جهاد و نیته"، وهذا یؤکد أن جمهور المذاهب والعلماء یرون مشروعیة العیش المشترک مع غیر المسلمین، ولو کان ذلک تحت سلطان غیر اسلامی**"۔

(مسلمانوں کے لئے دارالاسلام کے علاوہ حتی کہ دارالحرب میں بھی سکونت کی گنجائش ہے، بشرطیکہ وہ شعائر دینی پر مضبوطی سے کاربند رہے، اگرچہ بعض فقہاء نے دارالحرب سے ہجرت کرجانے کا حکم دیا ہے، مگر وہ اسی صورت میں ہے جبکہ اظہار دین پر استطاعت نہ ہو......ضروری ہے کہ حنفیہ کے مسلک کی طرف رہنمائی کردی جائے کہ وہ تمام حالتوں میں دارالحرب سے ہجرت کے قائل نہیں ہیں، بسبب حدیث رسول اللہ ﷺ:"**لا هجرة بعد الفتح ولکن جهاد ونیة**" کے اور یہ جمہور علماء وائمہ کے مذہب پر بھی دلیل ہوگی، کیونکہ وہ حضرات غیر مسلمین کے ساتھ مشترک زندگی گذارنے کے قائل ہیں، اگرچہ وہ حکومت غیر اسلامی ہو)۔

شیخ فیصل مولوی کی ایک تحریر اور ملاحظہ فرمائیں:"**إن المهاجرین إلی الحبشة من أصحاب رسول الله ﷺ هاجروا فرارا من الاضطهاد الذی کان یمارس علیهم فی مکة، و عند قیام دولة الإسلام فی**

المدینة کان بمکانهم أن یعود وا إلیهاویعیشوا مع أخوانهم المسلمین لکنهم فضلوا البقاء فی الحبشة یعیشون مع أهلها غیر المسلمین وظلموا هناک سبع سنوات بعد الهجرة، ولم یعودوا إلی المدینة إلا فی غزوة خیبر فی السنة السابعه للهجرة الخ......بل ان عیش المسلم مع غیر المسلمین فی مجتمع غیراسلامی لا یقل فی درجة الفضل عن العیش فی دولة إسلامیة" (قضایاالامۃ-المسلم موطنا فی اوردبا رص ۱۴-۱۵)۔

صحابہ کرام پر جو کفار مکہ کی طرف سے پیہم مظالم کئے جارہے تھے جس کے سبب ان حضرات نے حبشہ کی جانب ہجرت فرمائی ان کا قیام وہاں مدینہ میں اسلامی حکومت کے قیام کے بعد تک رہا حبشہ سے مدینہ خیبر کے سال، یعنی سن سات ہجری میں آئے...... بلکہ مسلمانوں کا غیر مسلمین کے ساتھ غیر اسلامی معاشرہ میں زندگی گذارنا اسلامی معاشرہ میں زندگی گذارنے کے اعتبار سے افضلیت میں کمتر نہیں ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب جواز کی دوسری صورت رقم فرماتے ہیں:

"**وکذالک إن اضطرإلیه مسلم بسبب إذ لم تیسیر له فی بلده وسائل المعاش الضروریة التی لا بدله منها ولم یجدها إلا فی مثل هذه البلاد، فإنه یجوز له ذلک بالشرط المذکور، ولأن ذلک کسب المعاش فریضة، بعد الفریضة ولم یقیده الشرع بمکان دون مکان، قال الله تعالی:" هو الذی جعل لکم الأرض ذلولا فامشوا فی مناکبها وکلوا من رزقه وإلیه النشور**" (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ رص ۳۲۹) (ایسے ہی اگر اس کے ملک میں اس کے معاشی وسائل مفقود ہوں کہ ضروریات زندگی بھی میسر نہیں ہو پارہی ہیں تو اس کے لئے بھی مذکورہ شرط کے ساتھ اجازت ہے، کیونکہ کسب معاش فرض کے بعد دوسرا فریضہ ہے جس کے لئے کسی مکان مخصوص کی شرط نہیں، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:" وہی ہے جس نے کیا تمہارے آگے زمین کو پست اب چلو پھرو اس کے کندھوں پر اور کھاؤ اس کی کچھ دی ہوئی روزی اور اسی کی طرف جی اٹھنا ہے)۔

اس کے بعد مفتی تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر معیار زندگی کو بلند کرنے کی خاطر وہ غیر مسلم ممالک کا سفر کرتا ہے تو اس کی اجازت نہ ہوگی ابوداؤد وترمذی سے روایت پیش کرنے کے بعد تحریر فرماتے ہیں:"**قال الخطابی فی شرحه فیه وجوه، أحدها: معناه لا یستوی حکما هما قاله بعض أهل العلم، وقال بعضهم: معناه أن الله قد فرق بین دارالاسلام والکفر فلا یجوز لمسلم أن یساکن الکفار فی بلادهم حتی إذا أوقدوانارا کان منهم بحیث یراها، وفیه دلالة علی کراهة دخول المسلم دارالحرب للتجارة والمقام فیها أکثر من مدة أربعة ایام......ومن هنا ذکر بعض الفقهاء أن سکنی دارالحرب وتکثیر سوادهم لأجل المال فما**

یسقط العدالة"(بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ص۳۳۰) مذکورہ تحریر سے معلوم ہوا کہ دار الحرب میں چار یوم سے زیادہ قیام کراہت سے خالی نہیں، حتی کہ بعض فقہاء نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ تکثیر مال کی غرض سے دار الحرب کا قیام عدالت کو ساقط کر دیتا ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع سے المتشار شیخ فیصل مولوی کی تحریر "قضایا الامۃ-المسلم موطنا فی ادروبا ص۹۳" پیش کردی جائے: "**من هذه المصطلحات قولهم:(كل كافر حربى) وقولهم:(الأصل فى العلاقات بين المسلمين وغيرهم الحرب) إن خطورة أمثال هذه المصطلحات هى فى اعتبار ها مبادى ثابتة لا تخضع لظروف معينة أن اعتبار الكافر حربيا، يعنى إباحة دمه وماله ومعاملة بأحكام الحرب من جواز الكذب والاحتيال فضلا عن البعض والكراهية والفقهاء الذين يردون هذه المصطلحات يجمعون على أن حالة الحرب تنتهى بالعهد، لكن هذه العهود كانت نادرة فى التاريخ فلم توثر على استعمال هذه المصطلحات**"۔

شیخ نے مذکورہ عبارت "**أورتبه اليوم دار عهد وليست دار حرب**" کے ذیل میں تحریر فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس جیسی سنگین اصطلاحات جن کو ٹھوس بنیاد کے طور پر تسلیم کیا جائے متعین احوال وکیفیات کے تابع نہ ہو کر اور مطلقا یہ کہہ دیا جائے کہ کافر حربی ہے اس کا خون ومال مباح ہے اور ہر کافر کے ساتھ حربی جیسا معاملہ کیا جائے تو یہ ایک طرف کذب اور دھوکہ دہی کے جواز کو لازم کرتا ہے تو دوسری طرف دونوں کے مابین بغض ونفرت کو جنم دیتا ہے، الخ۔ موصوف دوسری سرخی ص۹۵ پر اس طرح لگاتے ہیں: "**علة القتال الحرابة وليس الكفر**"۔

مفتی تقی عثمانی صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اگر یہی غیر مسلم ملکوں میں رہائش اعزاز وافتخار کی غرض سے یا مسلم شہریت پر اس کی افضلیت کی خاطر ہو تو یہ حرام ہے اور اس کی دلیل کی چنداں ضرورت نہیں۔

"**أما إذا كان التجنس بالجنسيات الأجنبية اعتزاز ابهاو افتخارا أو لتفضيلها على الجنسيات المسلمة......فإن ذلک حرام مطلقا ولا حاجة إلى التدليل ذلک**" (بحوث فی قضایا فقہیہ معاصرہ ص۳۳۰-۳۳۱)۔

یہی بات "قضایا الامۃ" کے مقالہ نگار ص۱۶ پر مختصرا تحریر فرماتے ہیں: "**فانالانرى وجوب الهجرة من حيث الأصل ونرى أنهاعلى أصل الإباحة ويمكن أن يتحول الحكم فيها إلى الاستحباب أوالوجوب أو الكراهة أو التحريم حسب الظروف الخاصة بكل مسلم**"۔

میرے خیال میں ہجرت کی بنیادی وجہ وجوب نہیں، بلکہ اباحت ہے، ہاں خاص ظروف واحوال کے اعتبار سے کبھی

استحباب کبھی وجوب، کبھی کراہت کبھی حرام ہو جاتی ہے۔

۷- سید جلال الدین انصر عمری ''القرطبی لاحکام القرآن'' کی یہ تحریر پیش فرماتے ہیں: ''**انما ھی من یرید سماع القرآن والنظر فی الإسلام فأما الإجازة لغیر ذلک فإنما ھی لمصلحة المسلمین، والنظر فیما تعود علیھم به منفعة**'' (غیر مسلموں سے تعلقات اور ان کے حقوق/ص ۲۶۰) اگر محارب قوم کا کوئی فرد قرآن اور اس کی تعلیمات کو سمجھنے کے علاوہ اگر اسلامی ریاست میں آنا چاہے تو اگر مفاد کا تقاضا ہو تو اجازت دی جائے گی، ورنہ نہیں۔

☆☆☆

تبدیلئ وطن کے جواز اور تحصیل شہریت کا حکم

مفتی حبیب اللہ قاسمی☆

اس میں شک نہیں کہ ماضی بعید میں کسی بھی ملک میں جانے اور رہنے اور قیام پذیر ہونے اور اس کو وطن بنانے کے لئے کوئی دقت نہیں تھی جن دقتوں کا سامنا آج دنیا کے انسانوں کو کرنا پڑ رہا ہے، بالخصوص مسلمانوں کے لئے تبدیلئ وطن اور کسی بھی وطن میں جا کر متوطن ہونا اور شہریت حاصل کرنا ایک اہم اور نازک تر مسئلہ بن گیا ہے؛ بلکہ بالتدریج مسلمانوں کے لئے وہ روئے زمین بظاہر تنگ ہوتی دکھائی دے رہی ہے جس کی وسعت اور جس کی ملکیت اور جس پر دسترس کا عام اعلان پیغام خداوندی میں موجود ہے؛ لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ معاشی، ثقافتی اور تہذیبی عموم نے اپنے دامن کو اتنا وسیع کرلیا ہے کہ ان چیزوں کے حصول کے لئے سفر اور مسافرت اور بعض مواقع پر بعض ضرورتوں کے تحت توطن اور اقامت پذیری سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔

کسی بھی مسلمان کا کسی بھی ملک میں جانا اور وہاں اپنی ضروریات کی تکمیل کی حد تک قیام پذیر رہنا نہ غیر شرعی ہے نہ غیر اسلامی؛ البتہ اتنا ضرور ہے کہ خواہ مخواہ غیر ضروری چیزوں کو ضروری بنا کر اس کی تحصیل کے لئے میسر راحت کو ترک کر کے خیالی اور موہوم چیزوں کی تحصیل کے لئے اپنے کو ذلت اور رسوائی کے حوالے کرنے کی اجازت شریعت نے نہیں دی ہے، ارشاد نبوی ﷺ ہے:" لا ينبغي للمؤ من أن يذل نفسه " اور نہ ہی اس زمانے میں ہجرت کو واجب یا فرض کہا جاسکتا ہے؛ البتہ حد اباحت میں اس کو رکھتے ہوئے اس کی اجازت ضرور دی جاسکتی ہے۔

لیکن ہر مسلمان کو یہ یاد رکھنا ہوگا کہ اس کے ایمان اور اسلام اور شعائر اسلام کا تحفظ ہر حال میں ضروری ہے؛ لہذا کسی ایسی جگہ کو وطن بنانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی جہاں مسلمان کی جان، مال، عزت وآبرو، دین اور اسلام، شریعت ومذہب کو خطرہ ہو، ان چند تمہیدی سطور کے بعد سوالات کے جوابات سپرد قلم ہیں۔

۱- کسی بھی ملک میں اس کے شہری ہونے کے لئے یا شہری بننے کے لئے دستوری طور پر جو قانون اس ملک کا ہے اس

☆ جامعہ اسلامیہ دار العلوم، مہذب پور، اعظم گڈھ۔

کو تسلیم کئے بغیر کوئی بھی ملک اس کو شہریت کی اتھارٹی نہیں دے سکتا، چاہے وہ کتنے ہی دنوں تک وہاں مقیم رہ چکا ہو، یا طویل زمانے سے اس کی تجارتی سرگرمیاں رہی ہوں، یا طویل زمانے سے وہاں قیام پذیر ہو،لیکن جب تک اس ملک کے وضع کردہ قانون کے دائرے میں وہ شخص نہیں آئیگا اس وقت تک قانونی شہریت اس کو نہیں حاصل ہوسکتی، اس مسئلہ میں اسلامی قانون دوسروں پر نہ تھوپا جاسکتا ہے، نہ اسکی آڑ میں شہریت حاصل کی جاسکتی ہے،اس لئے کہ ہر ملک کے اپنے بنائے ہوئے اصول اور دستور کی پابندی اور اسکے دائرے میں رہتے ہوئے شہریت کے حاصل کرنے کی جدوجہد ہی قابل قبول ایک راہ ہے۔

۲- ہر ملک کے اپنے قوانین ہوتے ہیں انکا اپنا دستور ہوتا ہے اس دستور کے مطابق ہر ملک چلتا ہے، اس لئے کسی ملک پر شریعت کی آڑ میں کسی درخواست کو قبول کرنے کا آرڈیننس جاری نہیں کیا جاسکتا۔

۳- ظلم بہرحال ظلم ہے اور مظلوم کی فریادرسی اور دادخواہی اور نصرت کا حکم اسلام نے دیا ہے ارشاد نبوی ہے: ''**انصر أخاک ظالما أو مظلوما**'' جب آج تک ہندوستان چھوڑ کر اسلام کے نام پر پاکستان گئے ہوئے مسلمانوں کو اسلامی ملک میں مہاجر بن کے نام پر رہنا پڑ رہا ہے اور وہ وہاں کے پرانے مقیم شہریوں کی طرح شہری نہیں بن سکے تو دوسرے کسی ملک کو کس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ پناہ گزینوں کو آپ شہری تسلیم کریں۔

۴- جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ ہر ملک کا اپنا دستور اور نظام ہے وہ اپنے دستور کے مطابق اپنے شہریوں کو جتنے حقوق دے گا اتنے حقوق کا وہ شہری مالک ہوگا اس سے آگے بڑھنے کی اس کو اجازت نہیں ہوگی۔

۵- پناہ گزینوں کے حقوق سے متعلق بحیثیت مظلوم اسلام کا دامن بہت وسیع ہے وہ ان کی ہر طرح کی نصرت واعانت کو پسند ہی نہیں کرتا، بلکہ اس کی ترغیب دیتا ہے۔

۶- مسلمان کے لئے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں بشرطیکہ اسکا دین وایمان اسلام اور شعائر اسلام مکمل طور پر محفوظ ہو، بصورت دیگر بقاء وتحفظ دین وایمان کی خاطر اس ملک کو چھوڑنا ضروری ہوگا۔

۷- ماضی میں دارالاسلام میں بہت سے غیر مسلم پوری آزادی اور تحفظ جان ومال کے ساتھ دارالاسلام میں آباد رہ چکے ہیں جس کے نظائر کتب سیر وتاریخ میں موجود ہیں۔

☆☆☆

شہریت، حصول شہریت اور حقوق

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی☆

ایک دور تھا جب ہمارے دلوں میں یہ خیال جاگزیں تھا کہ ''ہر ملک، ملک ماست کہ ملکِ خدائے ماست'' یہ وہ دور تھا، جب انسان اس قدر متمدن اور مہذب نہیں ہوا تھا، دیواریں علاقائیت قبائلیت اور سرحدوں کی قائم تھیں، لیکن انسانوں کا اپنے پسندیدہ ملک میں بود و باش اختیار کرنا مشکل نہیں تھا، پاسپورٹ، ویزا، اقامۃ، بطاقۃ اور کفالۃ جیسی اصطلاحیں وجود میں نہیں آئی تھیں اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کی جاتی تھی، قوت وطاقت کے بل پر ایک دوسرے کو زیر کرنے کا عمل حکمراں اور اس کے ٹولے تک محدود رہتا تھا، شہریت کے مسائل، معاملات پر بہت حاوی نہیں ہوا کرتے تھے، جلاوطنی کے واقعات کے باوجود بعض مخصوص حالات کے علاوہ وہاں کی آبادی کو شہریت سے محروم نہیں کیا جاتا تھا، بلکہ فاتح قوم کو بھی فتح کے نتیجے میں شہریت مل جاتی تھی۔

مگر اب زمانہ بدل گیا ہے، قدریں بدل گئی ہیں، ہر ملک کے اپنے مسائل ہیں، وسائل کی محدودیت نے دل کی دنیا کو بھی تنگ کر دیا ہے، اس لیے ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ شہریت کے حصول کے لیے کچھ معیار مقرر کیے جائیں، ان باتوں کا ذکر کیا جائے جن کو بنیاد بنا کر اسلام میں شہریت حاصل کرنے یا ہونے کی شکلیں طے کی جائیں۔

۱- شہریت (Citizen Ships) کا مطلب ہوتا ہے کسی بھی ملک میں قانونی طور پر مستقل رہنے کا حق، یہ رہنا کسی بھی مقصد سے ہوسکتا ہے؛ لیکن قانونی طور پر ہونا چاہئے، مستقل کی قید اس لیے لگائی گئی ہے کہ سیاحت کے لئے جتنے دن آدمی رہتا ہے یا کاروبار، تعلیم اور دوسرے مقاصد سے جز وقتی رہائش اختیار کرتا ہے، وہ بھی قانونی ہوتا ہے، لیکن اسے ہم شہریت کے ذیل میں نہیں لا سکتے، کیونکہ ان صورتوں میں وہاں رہنے والے کو شہری حقوق حاصل نہیں ہوتے اور زائرین، واردین صادرین کو اصطلاح میں شہری نہیں کہا جاتا۔

عربی میں اس سے قریب تر لفظ وطن ہے، جہاں انسان قیام پذیر ہوتا ہے۔

☆ نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ۔

”كلمة الوطن فى اللغة تشير إلى الأرض التى يقيم عليها الانسان وهو(محل الانسان)“(المسلم مواطنا فی اوربا: ۳۴بحوالہ مختار الصحاح للرازی دار القلم بیروت)۔

(لغت میں وطن کا اطلاق زمین کے اس حصہ پر ہوتا ہے جہاں انسان ٹھہرا ہوا ہے اور وہی انسان کا وطن ہے)۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اوطان کو ”مَسٰكِنَ تَرْضَوْنَهَا“(سورۂ توبہ: ۲۴) سے تعبیر کیا ہے، یعنی جہاں وہ رہنے پر راضی ہے۔ شریعت میں ایک اصطلاح وطن اصلی کی مستعمل ہے، جس کا اطلاق پیدائشی اور انتقال مکانی کے بعد جس کو وطن بنالیا گیا ہو دونوں پر ہوتا ہے اور دونوں کا حکم شرعی یکساں ہے، صاحب ’’بدائع‘‘ لکھتے ہیں:

”وطن أصلي: وهو وطن الإنسان فى بلدة أو بلدة أخرى اتخذ ها دارا أو توطن بها مع أهله وولده وليس من قصده الارتحال عنها،بل التعيش بها“ (بدائع الصنائع ۱/۲۸۰)۔

(وطن اصلی انسان کی وہ جگہ ہے جہاں وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ رہنے لگا اور وہاں گھر بنالیا اور سے اس کا کوچ کا ارادہ نہ ہو، بلکہ وہاں زندگی گذارنے کا ارادہ ہو)۔

ڈاکٹر محی الدین قرۃ داغی لکھتے ہیں:

”والخلاصة أن الوطن هو المكان الذى ولد فيه أو أقام فيه الانسان فى حياته وشبابه وارتبط بحبه والحنين إليه وإلى أهله (المواطنة فى الإسلام وحقوق المواطنين غير المسلمين فى ظله)“(المسلم مواطنا فی اوربا ۳۵)۔

خلاصہ یہ ہے کہ وطن وہ جگہ ہے جہاں آدمی پیدا ہوا یا اپنی زندگی وجوانی میں وہاں قیام پذیر ہوگیا اور اس سے اور وہاں کے رہنے والوں سے قلبی محبت اور وارفتگی کا تعلق ہو گیا ہو۔

گویا کہ وطن اصلا وہ ہے جہاں وہ پیدا ہوا، یا دوسری جگہ جہاں وہ پورے لوازمات زندگی کے ساتھ قیام پذیر ہو گیا، اس شخص کے معاملہ میں شہریت کی بنیاد واساس ہے، مغربی قوانین بھی اس کی طرف مشیر ہیں، اوران کے یہاں بھی تعامل یہی ہے۔

لیکن شہریت یک طرفہ معاملہ نہیں ہے یہ ایک تعلق ہے شہری اور مملکت کا، اور ایک دوسرے کے حقوق اس سے متعلق ہیں، اس لیے کسی آدمی کا یوں ہی کسی ملک میں جا کر بود و باش اختیار کرنا شہریت کے لیے کافی نہیں ہوگا۔

الشیخ فیصل مولوی لکھتے ہیں:

”المواطنة لم تعد مجرد انتماء إلىٰ أرض معينة، بل هى انتماء أيضا إلى الناس الذين يسكنون هذه الأرض وإلى النظام الذى يحكم علاقاتهم وأحوالهم “ (المواطنۃ والدیمقراطیۃ فی البلاد العربیۃ ۳۰)۔

مواطنہ محض کسی متعین سرزمین سے منسوب ہونے کا نام نہیں ہے؛ بلکہ یہ تعلق ان لوگوں کے ساتھ بھی ہے جو اس زمین پر رہتے ہیں، اور اس نظام کی طرف ہے جو ان کے احوال وعلائق کے سلسلہ میں فیصل ہیں۔

مغربی ممالک میں شہریت کے جو اصول رائج ہیں، ان سے وطنیت اور جنسیہ کے الفاظ ایک دوسرے کے مترادف معلوم ہوتے ہیں، ان کے یہاں جو تعریف مروج ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ؛

"علاقة بين فردودولة كما يحددها قانون تلك الدولة وبما تتضمنه تلك العلاقة من واجبات وحقوق (ایضا)۔

شہریت، فرد اور حکومت کا ایک تعلق ہے، جو اس ملک کے قوانین کے اعتبار سے متعین ہوتا ہے اور وہ تعلق فرائض وحقوق کو شامل ہوتا ہے۔

۲- اسی لیے کسی انسان کا کسی خاص علاقہ میں بود وباش کے ارادہ سے چلا جانا اس ملک کی نگاہ میں اسے شہری نہیں بناتا دوسرے ملک جا کر کوئی مسلمان بھی مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو شرعی طور پر اسے وہاں کے مروجہ قوانین کی پاسداری کرنی ہوگی اور ان مراحل سے اسے گذرنا ہوگا اور صرف اس بنیاد پر کہ جانے والا مسلمان ہے، اور وہ ملک بھی جہاں جارہا ہے مسلمان ہے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ لازماً اسے شہریت دیدینی چاہئے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخاۃ قائم کیا اور اس مواخاۃ کے ذریعہ مقامی باشندوں میں سے جو مسلمان تھے، ربط وتعلق کی شکل نکالی گئی اور ہر دو کے حقوق وفرائض مواخاۃ کے ذریعہ قائم ہوئے۔ اور مدینہ کے دوسرے باشندوں کے ساتھ معاہدوں کے ذریعہ ارتباط پیدا کیا گیا۔

میرا خیال یہ ہے کہ جس طرح گھر کے حد میں بلا اجازت داخل ہونا ممنوع ہے، ویسے ہی ملک، وطن وغیرہ وسیع معنی میں گھر کی طرح ہے اور حکمراں اور حکومت کے قوانین گھر کی چہار دیواری کے مانند ہیں، اس لیے دوسرے ملک میں بغیر اجازت (ویزہ) کے داخلہ شرعاً ممنوع ہوگا، اور جس طرح دوسرے کے گھر میں بلا اجازت رہنا ممنوع ہے، وہاں مستقل بود وباش اختیار کرنا بھی ممنوع ہوگا۔

۳- اب اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس دوسرے ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً ضروری نہیں ہوگا۔ البتہ اگر شہریت کی درخواست کسی مسلمان کی طرف سے آتی ہے اور جس ملک میں رہ رہا تھا وہاں کے احوال اس کے لیے نامساعد ہورہے ہیں تو مسلم ملک کو اخلاقی طور پر اس کی مجبوری اور مظلومی، نیز اپنے ملک کے حالات ووسائل کو سامنے رکھ کر اسے شہریت دیدینا

چاہیے، تاکہ ایک مظلوم کی مدد ہو سکے، حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **"أنصر اخاک ظالما أو مظلوما"** (البخاری ۲/۱۰۲۸) اپنے بھائی کی مدد کرو چاہے وہ ظالم ہو یا مظلوم ہو۔ اور اگر ملکی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے اور وسائل مزید بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تو یہ اخلاقی ذمہ داری بھی نہیں ہوگی اللہ رب العزت کا ارشاد ہے:

"لا یُکَلِّفُ اللہ نَفْساً اِلَّا وُسْعَهَا" (سورۂ بقرہ: ۲۷)۔

۴- اب اگر کسی ملک نے شہریت دینے کا فیصلہ کیا، تو اس ملک کے جو قوانین ہوں گے اسی کے مطابق اس کو حقوق حاصل ہوں گے، عموماً جب کوئی ملک شہریت دیتا ہے تو اس شہری کو دوسرے شہری کی طرح ووٹ دینے، انتخاب میں امیدوار بننے، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کے حصول، سرکاری شفاخانوں میں علاج کی سہولت، روزگار، معاشی تگ ودو، عدالتی چارہ جوئی اور حصول انصاف سے متعلق تمام حقوق حاصل ہوتے ہیں اور قدیم شہری اور جدید شہری میں ان حقوق اور تقاضوں میں تفریق شرعاً درست نہیں ہوگا، لیکن یہ معاملہ صرف حقوق وفرائض سے متعلق ہوگا، جہاں تک اہمیت کا معاملہ ہے اس ملک کے قدیم شہری کو اپنی قدامت کی وجہ سے زیادہ اہم سمجھنا غیر شرعی نہیں ہوگا، تمام ادارے، تنظیموں میں قدیم نمک خواروں اور خدمات گاروں کی اہمیت جدید لوگوں کی بہ نسبت زیادہ ہوتی ہے، یہ معاملہ تنخواہ اور مراعات تک میں ہوتا ہے تو ملکی پیمانے پر ایسا ہونا فطری ہے، خود قرآن کریم کی آیت: **"وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَار"** (سورۂ توبہ: ۱۰۰) سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

۵- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ پڑوسی ملک میں ایسے احوال پیدا ہو جاتے ہیں کہ کسی خاص طبقے اور مذہب کے ماننے والے کا وہاں قیام دشوار ہو جاتا ہے اور لوگ تیزی سے پڑوسی ملک کی سرحد کو عبور کرنے لگتے ہیں، متعلقہ ملک پر یک بارگی بوجھ بڑھ جاتا ہے۔ اخلاقی طور پر بین الاقوامی قوانین کی روشنی میں متعلق ملک کو ان لوگوں کے لیے زیست کا سامان کرنا پڑتا ہے، ان لوگوں کی حیثیت پناہ گزیں کی ہوتی ہے ان کے شہری حقوق نہیں ہوتے؛ لیکن بقاءِ زیست کے لیے ملکی حکومت فکر مند ہوتی ہے۔ یہ نووارد ین اصلاً شہری نہیں، مہمان ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ مہمانوں جیسا سلوک ہونا چاہیے۔ حضور ﷺ کا ارشاد ہے: **"من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلیکرم ضیفه"** (ترمذی وابن ماجہ) ان کے بن بلائے مہمان ہونے کی وجہ سے شرعی احکام پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔

۶- ملکی حالات کی وجہ سے کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمان اپنی ضرورت، مجبوری یا محض معاشی فوائد کے لیے غیر مسلم ملک کا رخ کرے، اور وہاں کی شہریت حاصل کر لے، میرے خیال میں ایسا کرنا شرعاً درست ہوگا، ہجرت حبشہ کو سامنے رکھیں تو یہ ہجرت غیر مسلم ملک سے غیر مسلم ملک کی طرف ہے۔ معلوم ہوا کہ کسی مسلمان کا ایک غیر مسلم ملک سے منتقل ہو کر دوسرے

غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔احادیث میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔

ضمادی الازدی مکہ مکرمہ آکر مسلمان ہوئے اور پھر اپنی قوم میں لوٹ گئے (البخاری ۸۸۹/۲)، جو سب کے سب کفار تھے،عمرو بن عسبۃ السلمی مکہ مکرمہ میں مسلمان ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہنے کی خواہش کا اظہار کیا، آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: تم لوگوں کا حال دیکھ رہے ہو، اپنے خاندان کی طرف لوٹ جاؤ(اخرجه مسلم كتاب الجمعة باب تخفيف الصلوٰة والخطبة)اسی طرح طفیل بن عمر دوسیؓ حضرت ابوذر غفاریؓ وغیرہ کو بھی اسلام لانے کے بعد غیر مسلم ملک لوٹنے کا حکم ہوا جس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلم ملک میں بود و باش اختیار کرنے میں شرعا کوئی حرج نہیں ہے، بلکہ اگر یہ دعوت اسلام کے مواقع بڑھادیتا ہوتو مستحسن ہے۔تمام انبیاء ورسل نے غیر مسلم ملک میں ہی بود و باش باقی رکھا اور دعوت کا کام کرتے رہے۔

یہی وجہ ہے کہ جمہور علماء مسلم وغیر مسلم کی مخلوط اور مشترکہ رہائش اور بود و باش کو شرعی قرار دیتے ہیں؛ چاہے یہ رہائش غیر مسلم حاکم کے تحت ہی کیوں نہ، اس کی بنیاد ''**لا هجرة بعد الفتح ولكن جهاد ونية**'' (صحيح مسلم: كتاب صلاة المسافرين رقم ۸۳۲) ہے شیخ فیصل مولوی لکھتے ہیں:

''**وهذا يؤكد أن جمهور المذاهب والعلماء يرون مشروعية العيش المشترك مع غير المسلمين ولو كان ذالك تحت سلطان غير إسلامي**'' (اخرجہ البخاری کتاب الجہاد والسیر باب وجوب النفیر وما یجب من الجہاد والنیۃ)۔

اس سے یہ بات مؤکد ہوتی ہے کہ تمام مذاہب اور علماء غیر مسلم کے ساتھ مشترکہ رہائش کو شرعی سمجھتے ہیں، چاہے یہ زندگی غیر اسلامی فرماں روا کے زیر سایہ گذرے۔

البتہ ضروری ہے کہ مسلمان ان اعمال وعقائد سے اپنی براءت کا اظہار کردے جو غیر مسلموں کے یہاں پائے جاتے ہیں، اس میں گھل مل اور رَل مَل اس طرح نہ جائے کہ تہذیبی اور ثقافتی اعتبار سے مسلم اور غیر مسلم میں تمیز کرنا دشوار ہوجائے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار یہ اعلان کروایا گیا۔

''اِنِّیْ بَرِیْءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ'' (المسلم مواطنا فی اوربا:۱۹) (میں بری ہوں ان چیزوں سے جن کو تم شریک ٹھہراتے ہو)۔

''اِنِّیْ بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ'' (سورۂ انعام:۱۹) (میں بری ہوں ان چیزوں سے جن کی تم عبادت کرتے ہو)۔

''اِنِّیْ بَرِیْءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ'' (سورۂ شعراء:۲۱۶) (میں بری ہوں ان اعمال سے جو تم کرتے ہو)۔

۷- اس کے برعکس یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ کیا مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا، اس کا جواب یہ ہے کہ حرمین شریفین کو چھوڑ کر کسی بھی ملک اور کسی بھی علاقہ میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی

حیثیت سے آباد کیا جا سکتا ہے، کیونکہ یہ امت دعوت ہیں، اور مسلمانوں کی قربت سے ان کے حق قبول کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں اور یہ صلہ رحمی کی تعلیمات کے عین مطابق بھی ہے کہ ان کو تمام شہری حقوق دیئے جائیں؛ البتہ ایسے کلیدی مناصب جن پر پہنچ کر یہ مسلمانوں کے لیے خطرات پیدا کر سکیں، اس سے احتراز کیا جائے گا، ان کی حیثیت ذمی کی ہوگی اور جو مقررہ ٹیکس سرکار کی طرف سے نافذ کیا جائے گا اس کی ادائیگی انہیں کرنی ہوگی۔

☆☆☆

شہریت-اسلامی تناظر میں

ڈاکٹر مفتی محمد فہیم اختر ندوی☆

'شہریت' جسے عربی میں 'المواطنة' اور انگریزی میں Citizenship اور Nationality کہتے ہیں، اپنے جدید مفاہیم کے ساتھ معاصر دور کی پیداوار ہے۔ لیکن اس کے ابتدائی خدوخال سے اسلام کی تاریخ نا آشنا نہیں ہے۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے حکم سے جب مکہ کے مظلوم و مقہور مسلمانوں نے مدینہ ہجرت کی اور آخر میں جناب محمد رسول اللہ ﷺ نے مکہ کو خیر باد کہا اور مدینہ تشریف لائے تو مدینہ شہر میں ایک اجتماعیت کی بنیاد رکھی گئی۔ اس اجتماعیت کے شہری عناصر چند فریقوں پر مشتمل تھے، جن میں مکہ سے آئے ہوئے مہاجر مسلمان، مدینہ کے رہنے والے انصار مسلمان، مدینہ کے رہنے والے یہودی قبائل اوس و خزرج اور بت پرست سب شامل تھے۔ رسول اکرم ﷺ نے اس شہر کے نظم ونسق Administration، امن و امان Security اور انصاف Justice کو منظم کرنے کے لئے ایک معاہدہ نامہ تیار کرایا، تاریخ اسلام میں یہ معاہدہ 'میثاق مدینہ' کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے مفصل دفعات میں ایک دفعہ کے الفاظ یہ تھے کہ:

"إنهم أمة واحدة من دون الناس" (یہ سارے فریق دوسرے لوگوں کے مقابلہ میں ایک امت ہوں گے)۔

دوسری دفعہ میں لکھا تھا کہ:

"إن يهود بنى عوف أمة مع المومنين لليهود دينهم وللمسلمين دينهم" (یہود بنی عوف مومنین کے ساتھ مل کر ایک امت ہیں، یہود کے لئے ان کا دین اور مسلمانوں کے لئے ان کا دین ہے)۔

ایک دفعہ کے الفاظ تھے:

"إن بينهم النصر على من حارب أهل هذه الصحيفة" (تفصیل کے لئے دیکھئے: ڈاکٹر محمد حمید اللہ، مجموعة الوثائق السیاسیة۔ صفحات: ۵۹-۶۲، طبعہ خامسہ، دار النفائس بیروت، ۱۹۸۵ء)۔

☆ مولانا آزاد نیشنل اردو یونورسٹی، حیدرآباد۔

(اس معاہدہ کے شرکاء کے خلاف جنگ پیش آتی ہے تو باہمی مدد ضروری ہوگی)۔

ان چند متعلقہ دفعات سے واضح ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے جس اجتماعیت کی بنیاد رکھی تھی، اس میں مختلف اہل مذاہب شریک تھے۔ شہر کی حفاظت ان سب کی مشترکہ ذمہ داری تھی۔ شہر پر حملہ ہو یا اس معاہدہ میں شامل فریقوں میں سے کسی فریق پر حملہ ہو تو اس کی مدد اور شہر کا مقابلہ تمام فریقوں پر لازم تھا۔ گویا شہر کی داخلی حفاظت، یعنی Internal Security اور خارجہ پالیسی، یعنی بیرونی حملہ سے مقابلہ اس پورے شہر والوں کے لئے لازم تھا۔ البتہ داخلی معاملات اور بالخصوص اپنے مذہبی معاملات میں ہر فریق کو خود مختاری اور اپنے مذہب پر عمل کی آزادی تھی غور کیا جائے تو شہریت کے موجودہ تصور کی بنیاد میں یہی بات شامل ہے۔ گویا میثاق مدینہ کے ذریعہ ایک نئے وطن کا قیام عمل میں لایا گیا۔

موجودہ دور میں ایک ملک کے رہنے والے باشندے اس ملک کے شہری سمجھے جاتے ہیں۔ ملک سے تعلق ان کے درمیان ایک مشترک رابطہ ہوتا ہے۔ ملک کے قانون اور دستور کے سب پابند ہوتے ہیں۔ اور ایک طرف تمام شہریوں کو متنوع قسم کے یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں، دوسری جانب ملک کی حفاظت وترقی اور داخلی امن وامان کی بابت ان سب پر کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

شہریت کے موجودہ تصور میں بتدریج ارتقاء آتا گیا اور مختلف ممالک عالمی سطح پر طے پانے والے معاہدوں سے وابستہ ہوتے گئے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ شہریت عطا کرنے کے کچھ اصول اور ضوابط طے کر لئے گئے ہیں۔ اور ان کی بنیاد پر کسی فرد یا افراد کو شہریت دی جاتی ہے۔ شہریت کے حصول کا سب سے اہم ذریعہ پیدائش ہے۔ جو افراد ملک میں پیدا ہوتے ہیں وہ فطری طور پر اس ملک کے شہری قرار پاتے ہیں۔ اسی لئے اب بہت سے ملکوں میں صداقت نامہ پیدائش Birth Certificate کا لزوم اور اس کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے۔ اسی طرح والدین کی شہریت بھی حصول شہریت کا ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ شادی کے ذریعہ بھی شہریت حاصل کی جاتی ہے۔ نیز ایک طویل عرصہ تک قیام کے بعد بھی شہریت کا استحقاق پیدا ہو جاتا ہے۔ حصول شہریت کے ان ضوابط میں باہم کچھ فرق بھی ہے۔ کم وبیش یہی صورت حال مسلم ممالک کی بھی ہے۔

شہریت کے رائج الوقت تصور اور اس سے وابستہ حقوق واختیارات کی وجہ سے ہی موجودہ دور میں پناہ گزینوں کا مسئلہ بھی پیدا ہوا ہے۔ پہلے یہ ممکن تھا کہ اگر ایک مقام پر رہائش دشوار ہو یا ضرورت درپیش ہو تو اپنی پسند کے کسی بھی علاقہ میں رہائش اختیار کر لی جاسکتی تھی۔ اسلام کے تصور عالمگیریت اور دعوتی ضرورت کے تحت یہ بات ضروری بھی تھی۔ چنانچہ اسلامی ممالک کی سرحدیں مسلمانوں کے لئے ہمیشہ کھلی رہی تھیں، اور علماء وفقہاء اور صوفیاء عظام کے ذریعہ دین کی اشاعت وخدمت اور مسلمانوں کی اصلاح وتربیت کی عظیم الشان تاریخ اسی ذریعہ سے رقم ہوتی رہی تھی۔ لیکن جدید دور میں شہریت کے مذکور

الصدر تصور کے رواج نے اس عظیم اور اہم دینی ضرورت اور اسلامی عالمگیریت پر بندش قائم کردی ہے۔اب ایک ملک سے نکل کر دوسرے ملک میں قیام اور پھر وہاں بود و باش اختیار کرنا موجودہ قانون شہریت کے دائرہ میں ہی ممکن رہ گیا ہے۔اور یہ بھی کچھ زیادہ سہولت بخش اور آسان نہیں ہے۔اسی وجہ سے کسی ملک کی جنگی صورت حال کی وجہ سے یا افراد کی انفرادی مشکلات کی وجہ سے ایک ملک سے نکل کر دوسرے ملک میں جانے والے افراد ایسے پناہ گزیں کی حیثیت رکھتے ہیں جنھیں ملک کے اصلی باشندوں کی طرح شہریت کے تمام حقوق حاصل نہیں ہوتے ہیں۔اور یہ پناہ گزیں اگر بڑی تعداد میں ہوں تو ان کی زندگی بے انتہا مشکلات و مصائب کی آماجگاہ بن جاتی ہے۔یہ ایک نئی صورت حال ہے، اور اس کے نتیجہ میں جہاں افادیت اور دعوت کے بہت سے راستے بند ہوئے ہیں، وہیں افراد کے انسانی حقوق اور ضروریات کے حوالے سے متعدد سوالات پیدا ہوئے ہیں۔کچھ ایسے ہی سوالات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱-شہریت کے حصول کی بنیاد:

جیسا کہ اوپر کی سطور میں مذکور ہوا، موجودہ قوانین کی رو سے اب یہ بات ممکن نہیں ہے کہ کوئی فرد اپنی ذاتی پسند کے تحت ایک ملک سے نکل کر بلا روک ٹوک کسی دوسرے ملک میں جا کر آباد ہو جائے۔اور وہاں کے اصل باشندوں کی طرح تمام سہولیات سے مستفید ہو۔بلکہ شہریت کے حصول کیلئے درخواست دینی اور حکومت کی جانب سے منظوری حاصل ہونی ضروری ہے۔شرعی نقطہ نظر سے ایک مسلم ملک کے اندر کسی بھی مسلمان کو قیام کی اجازت ہونی چاہئے۔اس کے لئے کسی خاص مدت تک قیام یا وہاں معاشی سرگرمیاں انجام دینے جیسے کسی عمل کی قید ضروری نہیں ہونی چاہئے۔بالخصوص اس موقع پر جب اپنے دین کے تحفظ اور عقیدہ و عمل کی آزادی کے لئے اپنے ملک سے ہجرت ضروری ہوگئی ہو۔صحابہ کرام نے اسی ضرورت کے تحت مکہ سے مدینہ ہجرت کی تھی اور پوری اسلامی تاریخ میں ایسی ہجرتیں پیش آتی رہی ہیں۔سیر و سیاحت اور سفر کی یہ سہولت دین کی نشر و اشاعت کے لئے ضروری تھی۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

''**ومن يهاجر في سبيل الله يجد في الأرض مرغما كثيرا و سعة**''(نساء:۱۰۰)۔

(جو کوئی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں پناہ لینے کے لئے بہت جگہ اور بسر اوقات کے لئے بڑی گنجائش پائے گا)۔

بلکہ بسا اوقات ایسی ہجرت ضروری ہو جاتی ہے۔قرآن میں ایسے موقع کے لئے پوچھا گیا ہے کہ:

''**الم تكن أرض الله واسعة فتهاجروا فيها**''(نساء:۹۸)۔

(کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟)۔

موجودہ دور میں آبادی کی کثرت اور شہری وسائل کی محدودیت، نیز امن وامان کی برقراری کے پیش نظر اگر کوئی مسلم ملک عطائے شہریت کے لئے کچھ اصول وضوابط اور شرائط طے کرتا ہے تو نظم وضبط کی سہولت کے لئے اس کی گنجائش ہونی چاہئے۔لیکن کسی مسلمان کو مسلم ملک میں معقول وجوہات کی موجودگی کے باوجود شہریت دینے سے انکار درست نہیں ہوگا۔

۲- مذکورہ بالا تفصیل کی رو سے کسی مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اگر اپنے دین وعقیدہ کے تحفظ کے لئے یا اپنی کسی ضرورت کے تحت دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہتا ہے تو اس کی درخواست قبول کرنا ضروری ہوگا۔ ہاں اگر کسی دینی یا دنیاوی ضرورت کے بغیر صرف خواہش کے تحت دوسرے ملک کی منتقلی چاہتا ہے تو ایسی درخواست کو قبول کرنے کا فیصلہ ارباب ملک ملکی مفاد کے پیش نظر کرنے میں خود مختار ہوں گے۔

۳- پناہ گزینی کا مسئلہ:

پناہ گزینی موجودہ وقت کا ایک انتہائی اہم اور سنگین مسئلہ ہے۔مختلف ملکوں میں مسلم آبادی ظلم وجبر اور بدترین استحصال کا شکار ہے۔ بہت سی جگہوں پر تو ان کی جان و مال اور عزت وآبرو کی بربادی سامان ارزاں بن چکی ہے۔ لٹے پٹے یہ بے سروسامان مسلمان سرحدی علاقوں کے مسلم ملکوں میں جان وعزت اور دین و مذہب کی پناہ لیتے ہیں۔ایسے پناہ گزیں اس وقت لاکھوں نہیں کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ان کے مصائب کی سنگینی بیان سے باہر ہے۔ (واضح رہے کہ یونائیٹیڈ نیشن رفیوجی ایجنسی (UNRA) کے مطابق 2012 تک دنیا بھر میں 15.4 ملین رفیوجی تھے۔شام کے پناہ گزینوں کی تعداد اور ان کے مصائب تو ابھی تازہ زخم کی مانند ہے)۔ شہریت کے موجودہ قوانین انھیں پناہ دہندہ ملک کا شہری نہیں بننے دیتے۔حالانکہ یہ لٹے پٹے ضرور ہوتے ہیں، پر اعلی دماغی قابلیت،قوت بازو،عزم وحوصلہ اور فکر ونظر کے مالک بھی ہوتے ہیں،انھیں اگر باعزت شہری کا درجہ دے کر ملک کی آبادی میں شامل کرلیا جائے،اور اگر ان کی تعداد زیادہ ہے تو مختلف مسلم ممالک اپنے اپنے یہاں معقول تعداد کو تقسیم کرلیں تو یہ پناہ گزیں ملک کی معیشت اور قوت میں اضافہ کا ذریعہ بن جائیں اور خود ان کی کسمپرسی ختم ہوجائے۔ نبی کریم ﷺ نے مکہ اور مختلف علاقوں سے آکر مدینہ میں بسنے والوں کو اس طرح مدینہ کے شہری سماج میں ضم کرلیا تھا کہ وہ وہاں کی قدیم آبادی کے لئے بوجھ Liability نہیں، بلکہ سرمایہ Asset بن گئے تھے۔ایسے پناہ گزینوں کو یہ اختیار بھی رہے گا کہ جب ان کے ملکی احوال درست ہوں گے تو وہ اپنی مرضی سے وہاں لوٹ سکتے ہیں۔ یہ بات کس طرح درست ہوسکتی ہے کہ مصیبت کے مارے مسلم پناہ گزینوں کو سرحد پر جانوروں سے بدتر زندگی گذارنے کے لئے چھوڑ دیا جائے۔ وہ ایک مسلم ملک میں بنیادی انسانی حقوق جیسے نوکری، تجارت، اندرون ملک آزادانہ سفر اور ملکی ترقی میں حصہ داری وغیرہ سے صرف اس لئے محروم رکھے جائیں کہ وہ کسی دوسرے ملک سے آئے ہیں؟ اسلامی اخوت تو ایسی مصیبت کے موقع پر ان کی باعزت

امداد ونصرت کولازمی قرار دیتی ہے۔قرآن اور حدیث کی بے شمار تعلیمات اس سلسلہ میں موجود ہیں۔

۴- ملک کے ہر شہری کو اپنی انسانی اور مذہبی زندگی کو بہتر طور پر گذارنے، نیز ملک کے نظم ونسق اور نظام کو چلانے میں یکساں طور پر شامل ہونے کے لئے جتنے بھی قسم کے حقوق واختیارات ہوسکتے ہوں وہ سب شہریت کے حقوق تسلیم کئے جائیں گے۔موجودہ قوانین ان تمام حقوق کو تسلیم کرتے ہیں۔اسلامی شریعت تو انسانی عزت واحترام، آزادی واختیار، عدل وانصاف، معاشی جدوجہد اور تعلیم وصحت کے باب میں دنیا کے دوسرے قوانین کے مقابلہ زیادہ وسعت وفراخی رکھتی ہے۔

۵- پناہ گزیں اگر مختصر مدت کیلئے ہیں تو ان کے لئے عام شہریوں سے ہٹ کر قوانین بنائے جاسکتے ہیں، کیونکہ اس صورت میں ان کی حیثیت مہمان کی ہے۔ہاں یہ ضروری ہے کہ ان کو بنیادی انسانی حقوق جیسے صحت وعلاج اور تعلیم کی فراہمی، رزق حلال کی تلاش کے مواقع، مذہبی عبادات کی ادائیگی اور باعزت وپرامن رہائش کی سہولیات حاصل ہوں۔لیکن اگر پناہ گزیں طویل مدت کے لئے آئے ہوئے ہیں، اور عموماً جنگی احوال سے دوچار ممالک سے جان بچا کر آنے والے پناہ گزیں غیر یقینی صورت حال کا شکار ہونے کی وجہ سے طویل مدتوں کے لئے آجاتے ہیں تو ایسے مسلم پناہ گزینوں کو مکمل شہری حقوق فراہم کرنا کسی بھی مسلم ملک کا مذہبی اور اخلاقی فریضہ ہے۔

۶- غیر مسلم ملک کی شہریت:

موجودہ وقت میں بدقسمتی سے امن وامان، معاشی فارغ البالی کے مواقع، ظلم واستبداد سے تحفظ، قانون وانصاف کی بالادستی اور آزادی رائے کے حوالے سے کئی غیر مسلم ممالک متعدد مسلم ملکوں سے بہتر ریکارڈ رکھتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ مسلم ملکو ں سے نکل کر غیر مسلم ملکوں میں شہریت اختیار کرنے والے عام مسلمانوں اور مسلم علماء ودانشوروں کی معقول تعداد دیکھی جاسکتی ہے۔یہ ان کے لئے اختیار نہیں بلکہ ضرورت ہے۔ان علماء، زعماء اور دانشوروں کو یہ اجازت حاصل نہ ہو تو نہ صرف وہ اپنی ذاتی زندگی میں مضرتوں کے شکار ہوں گے، بلکہ امت مسلمہ کو ان کی ذات سے پہنچنے والے بہت سارے دینی ودنیاوی فوائد سے محرومی ہوگی۔غیر مسلم ملکوں میں ان کی موجودگی دعوتی نقطہ نظر سے بھی باعث افادیت ہورہی ہے۔نیز وہاں کی قدیم مسلم اقلیتوں کی بھی بہتر دینی رہنمائی ممکن ہورہی ہے۔

جہاں تک معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنے کا مسئلہ ہے تو اگر دینی مفادات متاثر ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کی بھی اجازت ہونی چاہئے۔

دراصل ایسی صورت میں ایک مسلمان کے لئے داعیانہ کردار کا حامل ہونا ضروری ہے۔یہی وہ وصف تھا جسے لے کر صحابہ کرام مدینہ سے نکل کر دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئے اور دین اسلام کی روشنی سے ان علاقوں کو منور کردیا۔ورنہ اسلام کی

تبلیغ دنیا کے دور دراز خطوں میں کیونکر ممکن ہوسکتی تھی۔

۷۔ جزیرۃ العرب کی مخصوص مذہبی نوعیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی موجود ہے کہ جزیرۃ العرب میں دو دین باقی نہ رہیں۔ اس خطہ کو چھوڑ کر دیگر مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا۔ رسول اللہ ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کو عہد نامہ دیا تھا کہ ان کے لئے مذہبی آزادی برقرار رہے گی۔ خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے فتح بیت المقدس کے موقع پر اہل جابیہ کو جان و مال اور کنیسہ وصلیب کی آزادی دی تھی۔ حضرت خالد بن ولیدؓ نے اہل حیرہ و اہل حمص کے ساتھ اور حضرت عمرو بن العاصؓ نے اہل مصر کے ساتھ صلح میں انھیں مذہبی آزادی عطا کی تھی۔ یہ سارے لوگ مسلم زیر انتظام علاقوں میں غیر مسلم شہری کے طور پر باقی رکھے گئے تھے۔

☆☆☆

کسی دوسرے مسلم یا غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا

مفتی محمد جعفر ملی رحمانی☆

۱- اسلام میں شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کے لئے کسی ملک میں مستقل بود و باش اختیار کر لینے کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے، اس کی تائید فقہ اسلامی کے اس قانون سے بھی ہوتی ہے کہ اگر کوئی آدمی کسی مقام پر مع اہل وعیال مستقل بود و باش اختیار کرتا ہے تو وہ مقام اس کے حق میں وطن اصلی بن جاتا ہے، جیسا کہ ''البحر الرائق'' میں ہے: ''**والوطن الأصلي هو وطن الإنسان في بلدته أو بلدة أخرى اتخذها دارا وتوطن بها مع أهله وولده و ليس من قصده الارتحال عنها بل التعيش بها**'' (البحر الرائق ۲/۲۳۹، بدائع الصنائع ۱/۲۸۰)۔

رہیں معاشی سرگرمیاں، یا مخصوص مدت تک کسی جگہ پر قیام تو یہ ایسی چیز نہیں ہے کہ اسے شہریت حاصل ہونے یا حاصل کرنے کی بنیاد بنایا جائے، کیونکہ آج کے اس عالمگیریت (Globalization) کے زمانے میں آدمی کی سکونت کہیں ہوتی ہے، اور اس کی معاشی سرگرمیاں کہیں اور، نیز دور حاضر میں نقل وحمل اور آمد ورفت کی سہولیات بھی اس قدر میسر ہیں جو ماضی میں نہیں تھیں۔

۲- اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہئے تو اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا شرعاً مستحب اور اخلاقی طور پر ضروری ہے، کیونکہ اسلام ضعیف ومجبور، لاچار اور بے بس لوگوں کے ساتھ نصرت، مودت اور اخوت و بھائی چارگی کی تعلیم دیتا ہے، بشرطیکہ اس طالب شہریت شخص کا قیام ملک وملت کے حق میں دینی، سماجی اور معاشرتی اعتبار سے نقصان دہ نہ ہو۔

۳- الف: یہ بات شرعاً درست نہیں ہے۔

ب- یہ بات جائز نہیں مانی جاسکتی (بلکہ قدیم باشندوں کی طرح تارکین وطن پناہ گزینوں کو بھی شہری ہونے کی

☆ اکل کوا، مہاراشٹر۔

سہولتیں دی جانی چاہئے، کیونکہ حفاظت نفس، نسل، مال، عزت و آبرو مقاصد شریعت میں سے ہے، نیز بنی نوع انسان مکرم و محترم ہیں، خصوصا ایک مسلم کی حرمت تو کعبہ کی حرمت سے بھی بڑھی ہوئی ہے، اور زمین پوری کی پوری اللہ کی ملک ہے، کسی کی ذاتی ملکیت نہیں، اس لئے مظلوم و مجبور اور پناہ گزیں مسلمانوں کو قدیم شہری باشندوں کی طرح مراعات نہ دینا گویا ایک مسلمان کی حرمت کو پامال کرنا ہے)۔

۴- ایک مسلمان جب کسی ملک یا شہر کو اپنا وطن اصلی اور مستقل مستقر بنالے، تو پھر اسلامی نقطہ نظر سے اس کو وہ تمام مراعات وحقوق حاصل ہوں گے، جو عام شہریوں کو حاصل ہوتے ہیں، جیسے ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق، روزگار کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ و دو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق، اسی طرح اس کے جان و آبرو کی حفاظت، ذاتی ملکیت کی حفاظت، شخصی آزادی، آزادی اظہار رائے، عقیدہ و مسلک کی آزادی، عدل وانصاف۔

۵- پناہ گزیں کا حکم مستامن کی طرح ہے، اور ایک مستامن کو کسی ملک میں پناہ لینے پر جو حقوق حاصل ہوتے ہیں وہ تمام حقوق پناہ گزینوں کو حاصل ہوں گے، اور ان کے نفس، نسل، عقل، مال اور دین و مذہب تمام چیزوں کی حفاظت لازم ہوگی۔

نوٹ: اگر پناہ گزیں مسلمان ہیں اور اس ملک یا شہر میں مستقل سکونت اور بود و باش اختیار کر چکے ہیں تو انہیں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو دیگر باشندوں کو حاصل ہیں، البتہ اگر پناہ گزیں غیر مسلم ہیں، تو پھر انہیں سیاسی (Political) اعتبار سے ملکی انتخابات میں حصہ لینے اور امیدوار بننے کا حق حاصل نہیں ہوگا، کیونکہ ووٹ کی ایک حیثیت شہادت کی بھی ہے اور کافر کی شہادت مسلمان کے خلاف ناقابل قبول ہے، کیونکہ شہادت میں بھی ایک قسم کا غلبہ "**تنفیذ القول علی الغیر**" پایا جاتا ہے، اور قاعدہ مسلمہ ہے: "اسلام غالب ہوتا ہے، مغلوب نہیں"۔

۶ (الف) - کسی ضرورت و مجبوری کی بنا پر، مثلاً مسلمانوں کی آبادی میں جان و مال کو تحفظ حاصل نہ ہو، ہمہ وقت بلا کسی جرم کے گرفتار ہو جانے یا قتل کر دیئے جانے کا شدید خطرہ لاحق ہو، اور غیر مسلموں کی مخلوط آبادی میں رہائش اختیار کرنے کے علاوہ بچنے کی کوئی صورت نہ ہو، مسلمانوں کی آبادی میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں، اور غیر مسلموں کے علاقہ میں رہنے سے جائز ملازمت کا حصول آسان ہو، یا کوئی مسلمان حلال روزی کی خاطر غیر مسلموں کی آبادی میں رہ جائے، یا غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینے کی نیت ہو، یا جو مسلمان غیر مسلموں کے ساتھ مقیم ہیں ان کو دین اسلام پر جمے رہنے کی تلقین کرنا مقصود ہو، تو ان تمام صورتوں میں چند شرطوں کے ساتھ غیر مسلم ملک میں شہریت وجنسیت اختیار کرنے کی اجازت ہوگی:

۱-غیر مسلم ممالک میں یا شہروں میں رہائش اختیار کرنے والا شخص احکام اسلام پر مکمل طور پر کاربند رہے۔

۲-وہاں مروجہ منکرات ومحظورات سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ رکھے۔

۳-اس کے پاس دینی وشرعی اتنا علم ہو کہ جس سے وہ احکام اسلام سے متعلق پیدا ہونے والے شکوک وشبہات کو دفع کر سکتا ہو۔

۴-اس کے پاس اتنا تقوی ودیانت ہو جو اسے شہوات سے روک سکے۔

۵-ایسے ملک کی شہریت اختیار کرے جو اسے فوج میں داخلہ مسلمانوں کے خلاف جنگ اور غیر اسلامی امور کی انجام دہی پر مجبور نہ کرے۔

ب-جب اپنے ملک میں بقدر کفاف معاشی وسائل حاصل ہوں اس کے باوجود محض معاشی فوائد، خوشحالی وخوش عیشی، یا سماج ومعاشرہ میں معزز بننے، یا دوسرے مسلمانوں پر اپنی بڑائی کا اظہار، فخر ومباہات، یا اپنی عملی زندگی میں غیر مسلموں کا طرز اختیار کر کے ان جیسا بننے کی غرض سے غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا جائز نہیں ہے۔

نوٹ: خصوصا آج کے اس دور میں مسلمانوں کو مخلوط آبادی میں رہائش پذیر ہونا مناسب نہیں، بلکہ مسلمانوں کی اپنی الگ آبادی ہونی چاہئے، یا مسلم اکثریتی علاقوں میں رہنا بہتر ہے، تاکہ مسجد کی وجہ سے نماز کا اہتمام، اور مکتب کی وجہ سے اپنی اولاد کی بنیادی تعلیم کا نظم ہو سکے، مخلوط علاقے میں رہنے سے پڑوس کی وجہ سے تہذیب کا اثر پڑتا ہے، جیسا کہ ماضی میں اس کا تجربہ ہو چکا ہے، ان کے درمیان رہن سے نفع کم اور مضرت وخطرات زیادہ ہیں، اور مزید یہ کہ غیر مسلموں میں رہنے کی وجہ سے ان کی تہذیب کے اثرات سے نئی نسل کا متاثر ہو جانا بھی یقینی ہے، جس سے عقائد، عادات وعبادات پر زد پڑ سکتی ہے، اور قومی وملکی حالات کے پیش نظر، اور آئے دن ہونے والے فسادات کی وجہ سے جانی ومالی نقصان سے بچنے کی تدبیر بھی یہی ہے کہ ان علاقوں میں سکونت اختیار نہ کی جائے۔

۷- جزیرۃ العرب کے علاوہ علاقوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا، البتہ سیاسی طور پر پناہ لینے والے غیر مسلموں کی طرف سے کسی فتنے، بغاوت یا ظلم کا اندیشہ ہو، جس سے مسلم حکومت کو خطرہ ہو، یا غیر مسلموں کی اکثریت ہو جاوے اور مسلمان اقلیت میں آکر تعطل کا شکار ہو جاوے، تو پھر ایسے حالات میں غیر مسلموں کو مستقل شہریت دینے سے احتراز ضروری ہے۔

☆☆☆

شہریت کا مسئلہ-قرآن وسنت کی روشنی میں

مفتی محمد ابوبکر قاسمی☆

یہ زمین اللہ رب العزت کی ہے وہی ساری کائنات کا خالق و مالک ہے، اس نے تخلیق انسانی کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ "**وإذ قال ربک للملائکة إنی جاعل فی الأرض خلیفة**"(سورۂ بقرہ:۳۰) (یاد کرو اس وقت کو جبکہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں) اس آیت میں غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسان اس زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے، پھر جب حضرت آدم علیہ السلام کو اس دنیا میں بھیجا گیا تو فرمایا گیا: "**ولکم فی الأرض مستقر و متاع إلی حین**"(سورۂ بقرہ:۳۶) (اور تم سب آدم کی ذرایت کو زمین میں ٹھہرنا ہے اور ایک مقررہ مدت تک فائدہ اٹھانا ہے)، اسی طرح ارشاد باری ہے: "**هو الذی خلق لکم ما فی الأرض جمیعا**"(سورۂ بقرہ:۲۹) (اللہ رب العزت ہی نے تم سب کے لئے ان تمام چیزوں کو پیدا کیا ہے جو زمین میں ہے)، اسی طرح سورہ رحمان:۱۰ میں فرمان باری ہے: "**والأرض وضعها للأنام**" (اور زمین کو اللہ تعالی نے لوگوں کے لئے بنایا ہے)۔

ان تمام آیات کے مطالعہ اور ان میں غور و تدبیر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زمین اور اس کی ساری چیزیں انسانوں کے فائدہ کے لئے بنائی گئی ہیں، البتہ خود انسان کو اللہ تعالی نے اپنی عبادت اور خلافت کے لئے پیدا فرمایا ہے، چنانچہ "سورۂ ذاریات" میں ارشاد باری تعالی ہے: "**وما خلقت الجن والإنس إلا لیعبدون**" (ذاریات:۵۶)، نیز ارشاد باری تعالی ہے: "**هو الذی جعلکم خلاف فی الأرض**"(سورۂ فاطر:۳۹)۔

لہذا ہر انسان پر لازم ہے کہ خدا کی عبادت کرے اسی کو معبود جانے، اللہ رب العزت کی مخلوق کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، کوئی فتنہ وفساد کا کام نہ کرے، "**لا تفسدوا فی الأرض**" (سورۂ بقرہ:۱۱) (زمین میں فساد و بگاڑ کو نہ پھیلاؤ)، لیکن یہ انسان ضعیف البنیان جب کوئی عہدہ و منصب یا مال و دولت پالیتا ہے تو پھر اپنے ہی جیسے انسان کو خاطر میں نہیں لاتا، چنانچہ قارون نامی شخص حضرت موسی علیہ السلام کے زمانہ میں نہایت مالدار شخص گذرا ہے، جس کا تفصیلی تذکرہ سورہ قصص میں

☆ مہتمم جامعہ رحیمیہ برہم پورا۔

ہے:"إن قارون کان من قوم موسی فبغی علیهم"(سورۂ قصص:۷۵) حضرت موسیٰ نے اس کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا: "وأحسن کما أحسن الله إلیک ولا تبغ الفساد فی الأرض، إن الله لا یحب المفسدین" (سورۂ آیت:۷۷) جس طرح اللہ تعالی نے تم پر احسان کیا ہے تم بھی لوگوں پر احسان کرو، زمین میں فساد نہ پھیلاؤ، کیونکہ اللہ تعالی فساد پھیلانے والوں کو پسند نہیں کرتا)، جب وہ اپنے برے عمل سے باز نہ آیا تو اللہ تعالی نے اسے زمین میں دھنسا دیا"فخسفنا به وبداره الأرض"(سورۂ قصص:۸۱)۔

اس سے پتہ چلا کہ اگر کوئی شخص خدا کی عبادت و بندگی کرے، اللہ کے بندوں کو نہ ستائے، لوگوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اگر اللہ تعالی نے اسے مال و دولت سے نوازا ہے تو اللہ کے کمزور بندوں پر خرچ بھی کرے، حق بات کا انکار نہ کرے تو وہ زمین پر رہنے کا مستحق ہے، جب اس دنیا میں کم انسان تھے تو جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہاں رہ گیا جب انسانوں کی آبادی بڑھی علاقے تقسیم ہوئے، ممالک، صوبہ اظلاع تقسیم ہوئے تو اب جو شخص جس علاقہ میں آباد اور سکونت پذیر ہے اور وہاں اس کو عبادت و بندگی کی سہولت حاصل ہے تو اس کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ وہیں دین پر عامل بن کر اور دین کا داعی بن کر رہے، ہاں حصول علم کے لئے یا کاروبار و تجارت کے لئے یا سیر و سیاحت کے لئے یا حصول صحت کے لئے اسی طرح دوست و احباب سے زیارت و ملاقات کے لئے یا لوگوں کو دین کی دعوت دینے کے لئے جہاں چاہے جا سکتا ہے اور عارضی طور سے رہ سکتا ہے، رہا شہریت و وطنیت کے حصول کے لئے کس چیز کو بنیاد بنایا جائے تو اسلامی حکومت کا فریضہ ہے کہ اگر کوئی مسلمان ہے اور کفار و فجار کے ظلم سے تنگ آ کر ترک وطن کرنا چاہتا ہے تو حسب گنجائش اسے جگہ مہیا کرے، اسی طرح کسی مسلمان کا کوئی مورث کہیں رہ رہا تھا، وہ وفات پا گیا تو اس کا وارث شرعی بھی اپنے مورث کی جگہ رہ سکتا ہے، خواہ وہ کہیں کا باشندہ ہو، مرتد، قاتل ناحق اور شادی شدہ زانی کو تو جینے ہی کا حق حاصل نہیں ہے، بلکہ عندالشرع وہ واجب القتل ہے تو ایسے شخص کو یا کسی باغی اور طاغی کو کسی بھی ملک میں جگہ دینا جائز نہیں ہے، البتہ مومنوں اور اپنے نیک بندوں کے لئے اللہ تعالی نے اپنی وسعت ارضی کا اعلان کیا ہے، سورۂ عنکبوت میں ارشاد باری تعالی ہے:"یعبادی الذین آمنوا إن أرضی واسعة فإیای فاعبدون"(عنکبوت:۵٦)۔

لہذا کسی مومن کو کسی بھی جائز مقصد کے لئے کوئی بھی اسلامی حکومت اپنے یہاں عارضی اور دائمی جگہ دے سکتی ہے، البتہ اگر کسی کافر کو کسی خاص مصلحت سے جگہ دے تو عارضی جگہ دے، ہاں کسی بھی ملک کے قدیم باشندوں کو وہاں سے نہ بھگائے، سورہ توبہ میں ارشاد ربانی ہے:"وإن أحد من المشرکین استجارک فأجره حتی یسمع کلام الله، ثم أبلغه مأمنه"(سورۂ توبہ:٦)۔

۲- کسی مسلم ملک میں کسی دوسرے ملک کے شہری کو جگہ دینا:

کوئی بھی مسلم ملک اپنے یہاں کسی دوسرے ملک کے مسلم باشندے کو کسی مجبوری کی وجہ سے یا کسی دوسری مصلحت کی وجہ سے جگہ دے سکتا ہے، البتہ کسی کافر کو بلاسخت مجبوری کے اپنے یہاں مستقل رہائش کی جگہ نہ دے، ہاں کوئی مظلوم ہو اور وہ پناہ کا طالب ہو تو اسے عارضی پناہ دی جاسکتی ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے: ''**وإن أحد من المشركين استجارك فأجره حتى يسمع كلام الله ثم أبلغه مأ منه**'' (سورۂ توبہ: ۶)۔

یہ آیت بڑی معنی خیز ہے اور کسی کافر کو پناہ دینے کے سلسلہ میں جبکہ وہ مظلوم ہو خاص مصلحت سے عارضی پناہ دینے اور پھر اپنے ٹھکانے تک اسے پہنچا دینے کا صاف اعلان کرتی ہے، آگے آیت (۱۱) میں تو یہ اقامت صلوۃ اور ایتاء زکوۃ کی شرط کے ساتھ متصف اشخاص کو مسلمانوں کا دینی بھائی کہا گیا ہے، اور مشرکین کی فطرت اور حقیقت سے مسلمانوں کو آگاہ کیا گیا ہے، لہذا مسلم حکمراں کو کفار ومشرکین اور یہود ونصاری کو شہریت دینے کا فیصلہ کرتے ہوئے ان ہدایات ربانی کو بھی ملحوظ رکھنا چاہئے:

''**كيف يكون للمشركين عهد**'' (سورۂ توبہ: ۷)، ''**كيف وان يظهروا عليكم لا يرقبوا فيكم إلا ولا ذمة**'' (سورۂ توبہ: ۸)، ''**فقاتلوا أئمة الكفر**'' (سورۂ توبہ: ۱۲)، ''**إنما المشركين نجس**'' (سورۂ توبہ: ۲۸)، ''**لتجدن أشد الناس عداوة للذين آمنوا اليهود والذين أشركوا**'' (مائدہ: ۸۲)۔

۳- کسی مسلم ملک میں کسی دوسرے ملک کے مظلوم پناہ گزین مسلمانوں کو شہریت سے محروم رکھنا؟

اگر کسی ملک یا خاص خطہ میں مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کے سبب وہاں کے مسلم باشندے کسی دوسرے ملک میں ہجرت کر جائیں تو انہیں صرف عارضی پناہ دینا اور حقوق شہریت سے محروم رکھنا کسی مسلم ملک کے حکمراں کے لئے جائز نہیں ہے، ایسے نازک حالات میں تو انسانیت کے ناطے کافر حکمراں بھی مسلمانوں کو پناہ دے دیتے ہیں، چنانچہ جب مسلمانوں نے کفار مکہ کے مظالم سے نجات کی خاطر حبشہ کی طرف ہجرت کیا تھا تو وہاں کے کافر بادشاہ نے مسلمانوں کو بھرپور پناہ دیا تھا جس کا تفصیلی تذکرہ اسلامی تاریخوں میں موجود ومحفوظ ہے، لہذا مسلم ملک کے مسلم حکمراں کا مظلوم پناہ گزین مسلمانوں کو اپنے ملک میں شہریت سے محروم رکھنا سراسر ظلم وعدوان ہے۔

۴- حقوق شہریت کا دائرہ، اسلامی نقطہ نظر:

اسلامی ملک کا باشندہ اپنے مذہب، عقل، مال، نسب اور جان کے تحفظ کا پانچ بنیادی حق رکھتا ہے اور جو اس حق کو سلب کرے اس کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے، رہا ووٹ دینے یا امیدوار بننے یا ملازمت یا علاج کا حق تو ان

امور کے سلسلہ میں حسب صلاحیت اور حسب لیاقت حکومت قانون وضع کر سکتی ہے، مستحق کو اس کا جائز حق دیا جائے اور غیر مستحق کو خلاف شرع مقرر کر کے خیانت کرنے سے بچا جائے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:" **ان الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات إلى أهلها**"(سورۂ مائدہ:۵۸)،"**وقال النبى ﷺ إذا وسد الأمر إلى غير أهله فانتظر الساعة**"(رواہ البخاری حدیث۵۹)۔

ہر ایک مقام سے دوسرے مقام تک بغیر پیشگی اجازت کے آمدورفت کی ہر باشندہ کو عام حالات میں اجازت ہوگی، فتنہ وفسادات کے حالات کا استثناء ہوگا، ارشاد باری تعالی ہے:"**قل سيروا فى الأرض**"(سورۂ نمل: ۶۹، سورۂ عنکبوت:۲۰، روم:۴۲)"**سيروا فيها ليالى وأيّاما آمنين**"(سبا:۱۸)۔

۵-مظلوم پناہ گزینوں اور عام شہریوں کے حقوق:

مذہب جان و مال، عقل اور نسب کے تحفظ کا پانچ بنیادی حق ہر انسان کو حاصل ہے، اسی طرح دینی تعلیم کی تحصیل کی اجازت سب مسلمانوں کے لئے یکساں ہے، رہا دنیاوی حقوق اور اسباب معیشت مہیا کرنے کے حقوق اسی طرح کوئی عہدہ ومنصب حاصل کرنا تو اس کی اجازت لیاقت اور ضرورت کو دیکھ کر دی جائے، تاکہ ملک وملت کا نظم درست رہے، معصیت اور گناہ کے کاموں کے کرنے کی اجازت دینا یا مجرمین کو سزا دینے میں ڈھیل دینا ہرگز کسی بھی اسلامی ملک کے لئے جائز نہیں ہے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے:" **تعاونوا على البر والتقوى ولا تعاونوا على الإثم والعدوان**" (مائدہ:۲)۔

۶-کسی مسلمان کا کسی غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا:

عام حالات میں کسی مسلمان کو اپنا ملک اپنا علاقہ چھوڑ کر غیر مسلموں کے ساتھ رہنا ان کے ساتھ موالات کرنا ممنوع ہے، ہاں کسی سخت مجبوری یا دین کی دعوت کو پھیلانے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک میں جا کر شہریت اختیار کر کے رہنا شرعا درست ہوگا، رہا صرف معاشی فوائد کے لئے غیر مسلم ملک میں شہریت حاصل کر کے مستقل رہنا تو یہ بھی کوئی پسندیدہ عمل نہیں ہے، ہاں اگر اس میں دعوت دین کی نیت کو شامل کرلیں تو پھر اجازت ہوسکتی ہے"**قال النبي ﷺ: إنما الأعمال بالنيات**"(بخاری)۔

۷-مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہریت دینے کا حکم:

مسلم ملکوں میں خصوصا جزیرۃ العرب میں غیر مسلموں کو مستقل شہریت دے کر بسانا ہرگز ہرگز جائز نہیں ہے، کیونکہ مشرکین ومنافقین اور یہود وہنود ہرگز ہرگز بھروسہ کے لائق نہیں ہیں،"**عن ابن عباس أوصى(النبي ﷺ)عند موته بثلاث (إحداها)أخرجوا المشركين من جزيرة العرب**"(بخاری کتاب الجهاد باب/۱۷۵، حدیث نمبر:۳۰۵۳)۔

شہریت اور شہری حقوق کے حصول کا مسئلہ

مولانا عبداللہ کاوی والا☆

۱- جب کوئی کسی ملک میں دائمی طور پر بود و باش اختیار کرنا چاہے تو اس کو حق شہریت ملنا چاہئے، چاہے اس ملک کی معاشی سرگرمیاں انجام دے یا انجام نہ دے۔

۲- مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان دوسرے مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہے مجبوری کی وجہ سے، خاص کر اپنے ایمان واسلام کی حفاظت کے خاطر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہے اور وہاں اپنے ایمان واسلام کی حفاظت کا یقین ہو تو ایسے مجبور مسلمان کو دوسرے مسلم ملک کی شہریت کی درخواست کو قبول کرنا ضروری رہے گا، اور اگر درخواست صرف خواہش کی وجہ سے ہے تو دوسرے مسلم ملک کو اس کی درخواست قبول کرنے یا نہ کرنے کا اختیار رہے گا، چاہے قبول کرے اور نہ چاہے تو قبول نہ کرے۔

۳- مظلوم مسلمانوں کو مسلم ملک میں جہاں پناہ کے لئے پہنچے ہیں ان کو مکمل شہری حقوق قدیم باشندوں کی طرح دینا چاہئے، یہ ایک قسم کا حق ہے جو انصاف والی غیر متعصّبانہ بات ہے، ''انما المؤمنون اخوة'' (سورۂ حجرات:۱۰) کا کردار ہے، اسلام میں عصبیت نہیں ہے، ان کو پناہ گزیں کا درجہ دینا اور قدیم باشندوں کی طرح حقوق نہ دینا یہ بھی ظلم ہے اور عصبیت قبل الاسلام جہالت والا کام ہے؛ جبکہ اسلام میں ذمہ طلب کر کے رہنے والے غیر مسلموں کو تمام شہری حقوق دینے کا حکم فقہ و احادیث میں موجود ہے، تو مظلوم مسلمان کو یہ حق کیوں حاصل نہیں ہوگا، بایں وجہ مظلوم پناہ گزیں مسلمانوں کو ملک کے قدیم باشندوں کی طرح تمام حقوق، سہولتیں ملنی چاہئے اور دینی چاہئے۔

۴- سوال میں مذکورہ تمام حقوق قدیم باشندوں کی طرح پناہ گزیں مسلمانوں کے لئے مانے جائیں گے، قدیم باشندوں کی طرح مکمل شہریت دینا چاہے۔

☆ دار الافتا، دار العلوم عربیہ اسلامیہ بھروچ، گجرات۔

۵- پناہ گزینوں کو وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو قدیم شہریوں کو حاصل ہیں، ان میں کوئی تفریق نہیں ہوگی۔

۶- غیر مسلم ملک میں اگر مسلمان کے اور مسلمان کی اولاد اور نسل کے ایمان واسلام کی حفاظت ہوتی ہو تو اس مسلمان کے لئے کسی غیر مسلم ملک کی شہریت حاصل کرنا، اختیار کرنا، چاہے کسی مجبوری کی وجہ سے ہو یا معاشی فوائد کی وجہ سے ہو اس کی اجازت ہوگی، اور اگر مسلمان اور اولاد کے ایمان واسلام کے لئے ایمان واسلام کا خطرہ ہو تو غیر مسلم کی شہریت اختیار کرنے کی اجازت نہ ہوگی؛ کیونکہ اصل ایمان واسلام کی حفاظت مقصود ہے۔

۷- غیر مسلم اگر اسلام ومسلمان اور مسلم ملک کے لئے خطرہ ہو تو ایسے غیر مسلم، جیسا کہ یہود ومشرکین، عیسائی، مسلم ملکوں میں رہ کر مسلم ملکوں کے خلاف خانہ جنگی شروع کردینے کا قوی خطرہ ہو ان کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا نہیں چاہئے، ان کے علاوہ وہ غیر مسلم جن سے کوئی خطرہ نہ ہو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا، مقامات مقدسہ، جیسے مکۃ المکرّمہ، مدینہ منورہ کے علاوہ کہ وہاں درست نہیں ہے، وہاں کی ممانعت نص سے ثابت ہے، خاص کر مکہ مکرمہ کے لئے۔

☆☆☆

شریعت اسلامی میں شہریت کی اساس

مفتی محمد سلمان منصور پوری☆

۱- موجودہ دور میں شہریت کا معاملہ مذہبی سے زیادہ سیاسی بن گیا ہے، اور یہ بھی دراصل دنیا کی بالا دست طاقتوں کے بچھائے ہوئے جالوں میں سے ایک جال ہے؛ تا کہ ان کے برپا کردہ نظام کو پورے عالم میں نافذ کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے، اور انسانوں کی نقل وحرکت پر ان کی بھرپور نظر رہے، ورنہ اسلامی نقطہ نظر سے غیر اسلامی ملکوں کے غیر مسلم شہریوں کے لئے تو اسلامی ملک میں آنے اور بود وباش اختیار کرنے کے لئے اجازت شہریت وغیرہ کی ضرورت پڑتی ہے؛ لیکن مسلم یا غیر مسلم ملکوں کے مسلمان شہریوں کے لئے کسی مسلم ملک میں رہائش شرعاً ممنوع نہیں ہے، اور اس کے لئے کسی اجازت کی بھی شرعاً ضرورت نہیں ہے۔

البتہ چونکہ اس وقت ساری دنیا اقوام متحدہ کے بنائے ہوئے چارٹر اور منشور سے متفق ہوکر گویا ایک معاہدہ کی پابند ہو چکی ہے، اس معاہدہ میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی بھی ملک کا شہری دوسرے ملک میں ویزے کے بغیر نہ تو داخل ہوسکتا ہے اور نہ رہائش اختیار کرسکتا ہے، اور اس میں مسلم اور غیر مسلم ملکوں کی کوئی تخصیص نہیں ہے، اقوام متحدہ سے جڑے ہوئے سبھی ممالک اس کے پابند ہیں، تو جب تک یہ معاہدہ باقی ہے اس کے موافق عمل کرنا شریعت کے خلاف نہیں ہے، اس کی تائید صلح حدیبیہ کے واقعہ سے ہوتی ہے، جس میں یہ شرط لگادی گئی تھی کہ مکہ کا کوئی شخص مسلمان ہوکر مدینہ جائے گا تو اس کو وہاں رہنے نہیں دیا جائے گا، چنانچہ جب حضرت ابوبصیر رضی اللہ عنہ مدینہ آئے تو آپ ﷺ نے انہیں واپس فرمادیا۔

❍ ”ثم رجع إلى المدينة، فجاء أبوبصير رجل من قريش، فأرسلوا في طلبه، فدفعه إلى الرجلين فخرجا به“ (بذل المجهود بیروت ۹/ ۴۹۲-۴۹۳)۔

❍ ”فقال النبي صلى الله عليه وسلم: أكتب هٰذا ما قاضى عليه محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم وقص الخبر، فقال سهيل: وعلى أنه لا يأتيک منا رجل وإن كان على دينک إلا رددته

☆ جامعہ قاسمیہ شاہی مرادآباد۔

إلينا، فأنكر المسلمون على هٰذا الشرط، فجاء أبوجندل بن سهيل بن عمرو فوقع الإصرار والإنكار في رده؛ لكن ردَّه رسول الله صلى الله عليه وسلم"(بذل المجہود بیروت ۹/ ۴۹۱-۴۹۲)

○" وكان فيما اشترط سهيل بن عمرو أنه قال: لا يأتيك منا أحد وإن كان على دينك إلا رددته إلينا وخلَّيت بيننا وبينه وأبى سهيل أن يقاضى رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا على ذٰلك، فكره المؤمنون ذٰلك وامتعضوا فتكلموا فيه، فلما أبى سهيل أن يقاضى رسول الله صلى الله عليه وسلم إلا على ذٰلك كاتبه رسول الله، فرد رسول الله صلى الله عليه وسلم أبا جندل بن سهيل بن عمرو إلى أبيه سهيل بن عمرو ولم يأت رسول الله صلى الله عليه وسلم أحدٌ من الرجال إلا ردَّه في تلك المدة، وإن كان مسلماً" (بخاري شريف ۲/ ۶۰۱ رقم: ۴۰۸۲، فتح الباري رقم: ۴۱۸۱)۔

اس تمہید کی روشنی میں متعلقہ سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

(۱) شہریت دینے کا اختیار حکومت کو ہے، وہ اپنی مصلحت دیکھ کر جس کو چاہے شہریت دے جس کو چاہے انکار کردے، اور وہ اپنے طور پر اس کے لئے جو مناسب سمجھے، معیار بنا سکتی ہے۔

○ "المستفاد: يجب أن يعلم بأن الأمان كما يجوز مرسلاً يجوز معلقاً بالشرط" (فتاویٰ تاتارخانیۃ زکریا ۷/ ۶۷ رقم: ۱۷۹۹)۔

○" وللإمام أن يؤقت في ذٰلك ما دون السنة كالشهر والشهرين" (ہدایۃ مع الفتح ۶/ ۲۲)۔

۲- کوئی بھی مسلمان کسی مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنے کی کوشش کرسکتا ہے؛ لیکن اس مسلم ملک پر اس کی درخواست قبول کرنا اقوام متحدہ کے منشور کے اعتبار سے ضروری نہیں ہے؛ البتہ اگر درخواست دہندہ کے حالات اس کے متقاضی ہوں کہ اس کو مسلم ملک میں شہریت دی جائے، تو اسلامی اخوت کی بنیاد پر ایسے افراد کو شہریت دینے میں دریغ نہیں کرنا چاہئے۔

○" يجب أن يعلم بأن الأمان كما يجوز مرسلاً يجوز معلقاً بالشرط"(فتاویٰ تاتارخانیۃ زکریا ۷/ ۶۷، رقم: ۱۷۹۹)۔

○" مستفاد: إذا رأى الإمام أن يصالح أهل الحرب أو فريقاً منهم وكان ذٰلك مصلحة للمسلمين، فلا بأس به، لقوله تعالىٰ: ﴿وإن جنحوا للسلم فاجنح لها وتوكل على الله﴾ "(ہدایۃ مع الفتح ۵/ ۴۴۰)۔

۳- مسلم حکومتوں کا شرعی اور اخلاقی فرض یہی بنتا ہے کہ وہ مجبور اور بے کس مسلمانوں کو اپنے یہاں بلا کر ان کو مکمل شہری

حقوق سے نوازیں، اوران میں اور مستقل شہریوں میں کوئی تفریق نہ کریں؛ لیکن اگر قومی یا بین الاقوامی مصلحت اس میں کسی وجہ سے مانع ہو، تو اسلامی حکومت کوایسے مسلمانوں کو شہریت دینالازم نہ ہوگا۔

○ ”القاعدة العامة في حقوق أهل الذمة: أن لهم مالنا وعليهم ما علينا، وهٰذه القاعدة جرت على لسان فقهاء الحنفية وتدل عليها عبارات فقهاء المالكية والشافعية والحنابلة“ (بدائع الصنائع زکریا ٦/١١١، المغني لابن قدامة ٥/٨/٢٤٧، بحوالہ: الموسوعة الفقهية ٧/١٢٧)۔

○” ويؤيدها بعض الآثار عن السلف: فقد روي عن علي بن أبي طالب أنه قال: إنما قبلوا الجزية لتكون أموالهم كأموالنا ودماؤهم كدمائنا“(الموسوعة الفقهية ٧/١٢٧)۔

○ ”قال النبي صلى الله عليه وسلم: ألا من ظلم معاهداً أو انتقص حقه أو كلّفه فوق طاقته أو أخذ منه شيئاً بغير طيبِ نفسٍ منه، فأنا حجيجه يوم القيامة“(أبوداؤدشریف بیروت ٣/٤٣٧، رقم:٣٠٥٢)۔

٤- شہریت کے اندر آزادی سے متعلق تمام حقوق آتے ہیں، اوراس کی تعیین کرنا حکومتوں کا کام ہے، حکومت جوبھی ذمہ داریاں شہریوں پر عائد کرے اور جو سہولتیں انہیں عطا کرے، ان کی پابندی ہونی چاہئے۔

○” أما بعد: فقد نزل عليَّ رسلكم راجعين إلى قريتكم، فإذا جاء كم كتابي هٰذا فإنكم اٰمنون لكم ذمة الله وذمة رسوله، وإن رسول الله غافر لكم سيئاتكم، ولا ظلم ولا عدوىٰ وإن رسول الله جاركم مما منع منه نفسه، وإن عليكم رجع ما خرجت نخلكم، فإن سمعتم وأطعتم فإن على رسول الله صلى الله عليه وسلم أن يكرم كريمكم ويعفو عن سيئكم وأن ليس عليكم أمير إلا من عند أنفسكم أو من أهل رسول الله صلى الله عليه وسلم“ (طبقات ابن سعد ١/٢٨، ٢/٣٠)۔

○” إن القاعدة العامة في حقوق أهل الذمة هي: أن لهم مالنا وعليهم ما علينا حيث قال علي رضي الله عنه: إنما قبلوا الجزية لتكون أموالهم كأموالنا ودماؤهم كدمائنا“ (بدائع الصنائع زکریا ٦/١١١، القوانين الفقهية /١٠٥، المذاهب للشيرازي ٢/٢٥٦، الأحكام السلطانية للماوردي /٢٤٧، المغني ٨/٤٤٥، بحوالہ: المواطنة في الإسلام وحقوق المواطنين غير المسلمين في ظله/٢٠)۔

○” ولنجران وحاشيتهم جوار الله، ومن سأل منهم حقا فبينهم النصف غير ظالمين ولا مظلومين، ولا يؤاخذ أحداًمنهم بظلم آخر، وعلى ما فيه هٰذه الصحيفة جوار الله وذمة النبي صلى الله عليه وسلم الخ“ (الطبقات الكبرىٰ لابن سعد ٢/٣٦،فتوح البلدان للبلاذري ١/٦٧-٧٨، بحوالہ: المواطنة في الإسلام وحقوق المواطنين غير

المسلمین فی ظلہ ۱۸)۔

۵- شریعت میں پناہ گزینوں کی الگ سے اصطلاح نہیں ہے، یہ ایک سیاسی اصطلاح ہے، شرعی حکم تو یہی ہے کہ جو شخص بھی اسلامی ملک میں رہائش اختیار کرے، اس کو برابر کے حقوق ملنے چاہئیں، اور پناہ گزینی کی وجہ سے تفریق نہیں ہونی چاہئے۔

○" القاعدة العامة في حقوق أهل الذمة: أن لهم مالنا وعليهم ما علينا وهٰذه القاعدة جرت على لسان فقهاء الحنفية وتدل عليها عبارات فقهاء المالكية والشافعية والحنابلة، ويؤيدها بعض الآثار عن السلف، فقد روي عن علي بن أبي طالب رضي الله عنه أنه قال: إنما قبلوا الجزية لتكون أموالهم كأموالنا ودماؤهم كدمائنا" (الموسوعة الفقهية ۷/۱۲۷، بدائع الصنائع ۶/۱۱۱، المغني لابن قدامة ۵/۷۴۸، بحوالہ: الموسوعة الفقهية ۷/۱۲۷)۔

○" وفي كتاب النبي صلى الله عليه وسلم لأهل نجران: ولنجران وحاشيتها جوار الله وذمة محمد رسول الله صلى الله عليه وسلم على أموالهم وملتهم وبيعهم، وكل ما تحت أيديهم" (أخرجه البيهقي في دلائل النبوة ۵/۳۸۵، البداية والنهاية ۵/۴۸)۔

○" وعلى ذٰلك فلأهل الذمة حق الإقامة آمنين مطمئنين على دمائهم وأموالهم وأعراضهم وعلى الإمام حمايتهم كل من أراد بهم سوءاً من المسلمين أوأهل الحرب أو أهل الذمة؛ لأنه التزم بالعهد حفظهم من الاعتداء عليهم فيجب عليه الذب عنهم ومنع من يقصدهم بالأذى من المسلمين أو الكفار، واستنقاذ من أسر منهم واسترجاع ما أخذ من أموالهم سواء كانوا مع المسلمين أم منفردين عنهم في بلدهم؛ لأنهم بذلوا الجزية لحفظهم وحفظ أموالهم" (بدائع الصنائع بيروت ۷/۱۱۱، الشرح الصغير للدردير ۱/۱۴۰، المهذب ۲/۲۵۶، كشاف القناع ۳/۱۳۹، المغني ۸/۵۳۵، بحوالہ: الموسوعة الفقهية ۷/۱۲۷)۔

○" وحكم أموالهم حكم أموال المسلمين في حرمتها" (ابن عابدين ۳/۲۷۳، بحوالہ: الموسوعة الفقهية ۷/۱۲۸)۔

○" لأهل الذمة أن يقيموا في دار الإسلام آمنين مطمئنين على أنفسهم وأموالهم ما لم يظهر ما ينتقص به عهدهم؛ لأنهم إنما بذلوا الجزية لتكون أموالهم كأموالنا ودماؤهم كدمائنا، والمسلمون على شروطهم" (الموسوعة الفقهية ۷/۱۲۸)۔

۶- مسلمانوں کے لئے غیر مسلم ممالک کی شہریت اختیار کرنے کی گنجائش ہے، بشرطیکہ وہ اپنے دین وایمان کے تحفظ کا پختہ انتظام کرلیں، اگر ایسا انتظام نہ ہو تو ان ممالک میں بود وباش اختیار کرنا درست نہ ہوگا۔

O" فقد جاء في تاريخ ابن كثير: قال محمد بن اسحق: فلما رأى رسول الله صلى الله عليه وسلم ما يصيب أصحابه من البلاء وما هو فيه من العافية بمكانه من الله عزوجل، ومن عمه أبي طالب وأنه لا يقدر على أن يمنعهم مما هم فيه من البلاء، قال لهم: لو خرجتم إلى أرض الحبشة، فإن بها ملكاً لا يظلم عنده أحد وهي أرض صدق، حتى يجعل الله لكم فرجاً مما أنتم فيه، فخرج عند ذٰلک المسلمون من أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى أرض الحبشة مخافة الفتنة وفراراً إلى الله بدينهم، فكانت أول هجرة كانت في الإسلام فكان أول من خرج من المسلمين عثمان بن عفان وزوجته رقية بنت رسول الله صلى الله عليه وسلم" (البدایۃ والنہایۃ بیروت ۴/۱۶۶-۱۶۷، مسند احمد ۱/۴۶۱)۔

O" جواز الهجرة إلى دار الكفر والبقاء فيها حيث إن هؤلاء الأصحاب بقوا إلى عام خيبر حيث يقول جعفر رضي الله عنه: فخرجنا حتى أتينا المدينة فتلقاني رسول الله صلى الله عليه وسلم واعتنقني ثم قال: ما أدري أنا بفتح خيبر أفرح أم بقدوم جعفر" (البدایۃ والنہایۃ ۴/۱۷۹، معجم الکبیر للطبرانی ۲/۱۰۸/۱۴۷۸، مجمع الزوائد ۶/۳۰)۔

O "والمسلم يمكنه أن يعيش خارج دار الإسلام وحتى في دار الحرب إذا كان متمكناً من إظهار دينه، وإذا كان بعض الفقهاء تحدثوا عن وجوب الهجرة من دار الحرب فقد كان ذٰلک مشروطاً بعدم القدرة على إظهار الدين" (الموسوعۃ الفقہیۃ باب دار الحرب نقلاً عن نہایۃ المحتاج ۸/۸۲، کشاف القناع ۳/۴۳، اسنی المطالب ۴/۲۰۴، المغنی ۸/۴۵۶، عمدۃ القاری ۱/۳۵، الانصاف ۴/۱۲۱، بحوالہ: المسلم موطناً فی اوروبا ۱۸)۔

O" عن أبي هريرة رضي الله عنه قال: جاء الطفيل بن عمرو إلى النبي صلى الله عليه وسلم فقال: إن دوساً قد هلكت عصت وأبت فادع الله عليهم، فقال: اللّٰهم اهد دوساً وأْت بهم" (بخاری شریف ۲/۶۳۰، رقم: ۴۲۱، السیرۃ الحلبیۃ ۱/۵۱۳)۔

O "فهٰذا ضماد الأزدي أسلم ثم رجع إلى قومه وعاش معهم حتى هاجر رسول الله صلى الله عليه وسلم إلى المدينة الخ" (مسلم شریف، کتاب الجمعۃ ۱/۲۸۴)۔

۷- مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو ذمی کی حیثیت سے حقوقِ شہریت عطا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، دورِ نبوت اور دورِ صحابہ سے ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے، بشرطیکہ قومی، ملی اور ملکی مصلحت کے خلاف نہ ہو۔

O "ولنجران وحاشيتها جوار الله وذمة محمد النبي رسول الله على أموالهم وأنفسهم وملتهم

وغائبتهم وشاهدهم وعشيرتهم وبيعهم وكل ما تحت أيديهم من قليل أو كثير لا يغير أسقف من أسقفيته ولا راهب من رهبانيته" (الوثائق السياسية للعهد النبي ۱۴۰، الطبقات الکبریٰ لابن سعد ۲/۱/۳۶، ۸۴-۸۵،فتوح البلدان للبلاذري ۱/۶۷-۸۷، بحوالہ: المواطنة في الإسلام وحقوق المواطنين غير المسلمين في ظله/ ۴۰، بحوالہ: المسلمون مواطناً في اوروبا/ ۴۲، اخرجه البیهقي في دلائل النبوة ۵/ ۳۸۵، البداية والنهاية ۵/ ۴۸)۔

❍" **جمهور الفقهاء على أن عقد الذمة مع غير المسلمين يتولى إبرامه الإمام أونائبه؛ لأن ذٰلک يتعلق بنظر الإمام وما يراه من المصلحة"** (الخرشي ۳/ ۱۴۳، القليوبي ۴/ ۲۲۸، مغني المحتاج ۴/ ۲۴۳، المغني لابن قدامة ۸/ ۵۰۵، كشاف القناع ۳/ ۱۱۶، بحوالہ: الموسوعة الفقهية ۷/ ۱۲۲)۔

❍" **لأن عقد الذمة فيه التزام أحكام الإسلام فيما يرجع إلى المعاملات"** (السير الكبير ۵/ ۱۸۷۰، بحوالہ: الموسوعة الفقهية ۷/ ۱۲۶)۔

❍" **وهو في الأسارى بالخيار إن شاء قتلهم؛ لأنه عليه السلام قد قتل، وإن شاء استرقهم؛ لأن فيه دفع شرهم مع وفور المنفعة لأهل الإسلام، وإن شاء تركهم احراراً ذمة للمسلمين"** (ہدایۃ مع الفتح ۵/ ۴۶۰)۔

☆☆☆

مسلم ملکوں میں غیر مسلم کی شہریت کا مسئلہ

مفتی ظہیر احمد کانپوری☆

جیسا کہ آپ کے سوال سے واضح ہے کہ شہریت کا مسئلہ موجودہ دور کی پیداوار ہے، اسلام میں اور قدیم زمانہ میں اس کی وہ حیثیت نہیں تھی جو موجودہ دور میں بن چکی ہے، اس کے مختلف اسباب ہیں۔

موجودہ دور میں شہریت جس کو عربی زبان میں مواطنت یا جنسیہ یا انگریزی میں Nationality کہا جاتا ہے، جو انگریزی کے لفظ Nation کی طرف منسوب ہے، دور جدید میں Nation وہ جدید اسٹیٹ ہے جو ایک مخصوص علاقہ اور خطہ کے رہنے والے لوگوں کے ملک تک محدود ہے، کہ وہ اس خطہ اور علاقہ میں رہنے والے لوگوں کو ہی اپنا شہری اور باشندہ تسلیم کرتی ہے، اور انہی کو وہ تمام یا جملہ شہری حقوق دیتی ہے، اس خطہ اور علاقہ سے باہر رہنے والوں کو وہ اپنا شہری اور باشندہ تصور نہیں کرتی ہے، ان شہری حقوق میں ملکی انتظام میں حق شراکت بھی ہے۔

اس Nation State کی بنیاد جمہوریت Democracy اور سیکولرزم Secularism پر ہے۔ جو بندوں کو لامحدود اختیارات تفویض کرتی ہے، کہ لوگ جس چیز کو چاہیں جائز قرار دیں اور جس کو چاہیں ناجائز قرار دیں، اور مذہب و دین کا نیشن اسٹیٹ میں کوئی دخل نہیں۔

اور اس نے مذہب و دین اور حکومت و سیاست کے درمیان ایک خط فاصل کھینچ دیا، کہ مذہب بندہ اور خدا کے مابین تعلق کا نام ہے، اور حکومت و سیاست فرد و حکومت کے درمیان تعلقات کا نام ہے، مذہب و دین سے حکومت کا کوئی تعلق نہیں، جو کلیسا اور جدید نظریات کے حامل نصاری سائنسدانوں کے درمیان ٹکراؤ کا نتیجہ تھا۔

بہر حال ان لوگوں نے ایک مخصوص خطہ اور علاقہ کے لوگوں کو ہی ایک Nation (قوم) تک محدود کر کے صرف انہی کو اپنا شہری تسلیم کر کے صرف انہی کو جملہ شہری حقوق کا حق دار قرار دیا۔

جبکہ اسلام میں مذہب و سیاست، دین اور حکومت علاحدہ چیزیں نہیں، بلکہ حکومت و سیاست بھی دین اسلام کا ایک

☆ مسجد حلوہ سوہن، پٹکاپور، کانپور۔

حصہ ہے، جائز اور ناجائز قرار دینے کا حق صرف اللہ اور اس کے رسول کو ہے، انسانوں کو نہیں، شریعت اسلامیہ میں اصلا ہر شخص کو کسی بھی جگہ رہنے کا حق حاصل ہے جس پر نصوص دلالت کرتے ہیں۔

"**لله ملک السموات والارض**"(سورۂ بقرہ:۲۸۴)(حکومت اور سلطنت صرف اللہ ہی کے لئے ہے) لہٰذا اس کے احکام وقوانین جاری ہوں گے، بندہ تو اس کا خلیفہ اور نائب ہے، "**انی جاعل فی الأرض خلیفة**"(سورۂ بقرہ:۳۰)(انسان کے ذمہ لازم ہے کہ اس کے احکام وقوانین کا زمین پر نفاذ کرے)۔

"**ومن لم یحکم بما أنزل الله فاولئک هم الکافرون، الظالمون،الفاسقون**"(سورۂ مائدہ:۴۴،۴۵،۴۷)اور ساری کی ساری زمین اللہ ہی کی ہے، "**لله مافی السموات وما فی الأرض**"(سورۂ بقرہ:۲۸۴)اللہ نے روئے زمین پر کہیں بھی رہنے جانے اور گھومنے کی اجازت دی ہے، "**قل سیروا فی الأرض**"، لہٰذا اس کے رہنے گھومنے پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا ہے، سارے کے سارے انسان ایک کنبہ کے افراد ہیں، "**لقول النبی** ﷺ **الخلق عیال الله**"(الحدیث) "**ولقوله تعالی: یا یها الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا**"(سورۂ حجرات:۱۳)،اور دوسری جگہ ارشاد نبوی ﷺ ہے:"**الدنیا خلقت لکم وإنما خلقتم للأخرة**"، ارشاد باری تعالی"**والمومنون والمؤمنات بعضهم أولیاء بعض**"(سورۂ توبہ:۷۱)، ان تمام نصوص کی روشنی سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام کسی مخصوص علاقہ کے لوگوں کو ہی اپنا شہری نہیں تسلیم کرتا، بلکہ جو بھی اسلامی نظریات کا حامل ہو اور اسلامی قوانین کی بالادستی قبول کرتا ہو وہ اسلامی مملکت کا شہری اور باشندہ ہے، خواہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو، جبکہ وہ دنیاوی امور میں اسلامی احکامات کا پابند ہو عقد ذمہ کے ماتحت۔

اسی طرح حکومت اسلامیہ ایک نظریاتی ریاست ہے جو کسی مخصوص علاقہ تک محدود نہیں، بلکہ وہ تمام روئے زمین کو شامل ہے اور اس کا ہر وہ شخص شہری ہے جو اس نظریہ کا حامی اور قائل ہو باغی نہ ہو، اور ان سب کو جملہ حقوق شہریت حاصل ہوں گے، البتہ اسلام میں انتظام ملکی، یعنی حکومت اسلامیہ کے قیام اور اس کے چلانے کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے، غیر مسلم کی ملکی نظام کے چلانے میں، یعنی اس کی Keypost پر کوئی شرکت نہیں ہوسکتی ہے، جیسا کہ عصری نیشن اسٹیٹ کے نظام میں ہے، اسلام میں نظام حکومت چلانے کے لئے مسلمان ہونے کی قید اس لئے ہے کہ اسلامی احکام کے نافذ کرنے کے لئے یہ ناگزیر ہے کہ وہ نافذ کرنے والا اس نظریہ کا حامل ہو کہ اسلامی حکومت دراصل حکومت الٰہیہ ہے اور حاکم محض اس کا نائب اور خلیفہ ہے، البتہ اسلامی ملک میں رہنے اور بود وباش اختیار کرنے کے لئے مسلمان ہونا ضروری نہیں، بلکہ اس کے لئے صرف اس نظام کو تسلیم کرنے کی شرط ہے جس کو عقد ذمہ کہا جاتا ہے، موجودہ دور میں بھی باغی کو حکومت میں شریک ہونے کی اجازت

نہیں، گو کہ وہ مذہبی بنیاد پر کسی کو حکومت میں شرکت سے نہیں روکتے، چونکہ ان کے نزدیک مذہب امور سیاست میں قابل لحاظ ہی نہیں، ہاں اگر کوئی مذہبی یا غیر مذہبی غیر ملحدان کے نظام کا مخالف ہوگا تو وہ بھی ان کے نظام حکومت میں شرکت کا اہل نہیں۔

لہذا اسلامی مملکت میں اصلاً کوئی بھی مسلمان کسی بھی مسلم ملک میں رہ سکتا ہے، بلکہ غیر مسلم بھی کسی بھی مسلم ملک میں سکونت اختیار کرسکتا ہے اور ایک اسلامی ملک کا شہری بن سکتا ہے، بشرطیکہ وہ عقد ذمہ کرلے۔

بغیر عقد ذمہ صرف امان لے کر اسلامی ملک میں داخل ہونے کے بعد زیادہ سے زیادہ قیام کی مدت فقہاء کرام نے ایک سال قرار دی ہے، جیسا کہ (موسوعہ فقہیہ باب اہل الذمۃ نقلاعن البدائع ۷/۱۱۷ باب اہل الذمہ، اوراحکام السلطانیہ، للماوردی ۱۴۶/ والاحکام السلطانیہ لابی یعلی ۱۴۵/، فتح القدیر ۵/ ۲۷۲ الخراج لابی یوسف ۱۸۹/ ناقلاعن المسلم مواطنا فی اوربا للشیخ فیصل مولوی رص ۱۸) میں صراحت ہے۔

اس طرح غیر مسلم کے لئے کسی بھی اسلامی ملک میں مستقل سکونت اختیار کرنے اور شہری بننے کے لئے صرف عقد ذمہ ضروری ہے اور بس، اور مسلم کو کسی بھی اسلامی ملک میں رہنے اور سکونت اختیار کرنے کے لئے اصلا کوئی شرط نہیں، البتہ اس کی صحیح شناخت اور اس کے احوال کی جانچ کے لئے کچھ وقت متعین کیا جاسکتا ہے، تاکہ اس مدت میں اس کے اخلاق واطوار اور احوال پر نگاہ رکھی جائے کہ وہ واقعی مسلم ہے اور اسلامی ملک کے لئے خطرہ تو نہیں۔

اور غیر مسلموں کے لئے اسلامی حکومت میں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو کسی بھی مسلمان کو حاصل ہیں، اس میں کسی قسم کی کوئی تفریق نہ ہوگی، اسی طرح ان کی وہ تمام ذمہ داریاں اور فرائض ہوں گے جو کسی مسلم کے فرائض اور ذمہ داریاں ہوں گی۔

اس سلسلہ میں فقہاء کا قاعدہ مشہور ہے: ”**لهم مالنا وعليهم ما علينا**“ (ابن حبان) اور مسلمانوں کے کسی بھی اسلامی ملک میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت کے سلسلہ میں درج ذیل نصوص ہیں: ”**والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض** (سورہ:۷۱)، **يايها الناس انا خلقنا كم من ذكر وانثى وجعلناكم شعوبا وقبائل لتعارفوا، يايها الناس اتقوا ربكم الذى خلقكم من نفس واحدة، لله ما فى السموات وما فى الأرض، لله ملك السموات والارض**“ (سورۂ حجرات:۱۳)۔

اسی طرح اصولی طور پر کوئی بھی مسلم کسی بھی مسلم ملک کی مستقل شہریت بلاشرط حاسل کرسکتا ہے، مگر موجودہ احوال میں ملکی نظام کی درستگی اور اس کو صحیح طریقہ پر چلانے کے لئے اور یک طرفہ نقل مکانی کو روکنے کے لئے کچھ شرائط عائد کئے جاسکتے ہیں، جو ملکی نظام کے چلانے میں معاون ہوں۔

اس پس منظر میں شہریت سے متعلق سوالات کے جوابات درج ذیل ہیں:

۱-اسلامی مملکت میں حق شہریت کے لئے صرف مسلمان ہونا کافی ہے، جبکہ غیر مسلموں کے لئے عقد ذمہ لازم ہے، بغیر عقد ذمہ کے وہ بطور امان کے ایک سال تک اسلامی حکومت میں رہ سکتے ہیں، غیر مسلم کے لئے عقد ذمہ کرنے سے پہلے آزمائشی مدت جو امان کی مدت ہے اس سے کم یا زیادہ متعین کی جاسکتی ہے، اسی طرح مسلمان کے لئے اس کی آزمائش کے لئے کچھ وقت متعین کیا جاسکتا ہے۔

۲-اس کی درخواست کو قبول کرنا ضروری ہوگا، بشرطیکہ وہ ملکی نظام کی شرائط کو قبول کرتا ہو جو شرائط ملکی نظام کو چلانے کے لئے ضروری ہوں، اور اس کی پختہ جانچ پرکھ کے بعد کہ کہیں وہ مسلم کے نام پر غیر مسلم جاسوس نہ ہوں۔

۳-مسلم پناہ گزینوں کی مدد کرنا مسلم ملک کے لئے شرعا واجب ہے، آپ ﷺ نے امت مسلمہ کو جسد واحد قرار دیا، لہذا مسلم تارکین وطن اور پناہ گزینوں کو دوسرے مسلمان ممالک میں اسی ملک کے قدیم باشندوں کی طرح تمام سہولیات مہیا کرانی چاہئے، ان کے مابین تفریق درست نہیں۔

۴-یہ تمام حقوق حاصل ہوں گے، یعنی ووٹ دینے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونے کا حق، سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، روزگار حاصل کرنے کا حق، عدالتی چارہ جوئی کا حق، معاشی تگ ودو کا حق، انصاف حاصل کرنے کا حق، ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمد ورفت کا حق وغیرہ سارے حقوق، حقوق شہریت تصور کئے جائیں گے اور ان کی فراہمی مملکت اسلامی کے حاکم پر لازم ہیں۔

۵-پناہ گزیں اگر شہریت کے حصول کے لئے درخواست دیتے ہیں تو ان کو حقوق شہریت دینا لازم ہوگا، ورنہ صرف ان کی انسانی اور اسلامی برادری سے تعلق رکھنے کے نقطہ نظر سے ہر طرح کی مدد لازم ہوگی۔

۶-بالکل اجازت ہوگی، اس لئے کہ اب دار الحرب سے بھی ہجرت کرنا واجب اور ضروری نہیں، آپ ﷺ کا فرمان ہے: **"لا هجرة بعد الفتح ولكن جهاد ونية"** (مجلّہ کتاب الجہاد والسیر باب وجوب النفیر وما یجب من الجہاد والنیۃ، دیکھئے: المبسوط ۱۰/۶ نا قلا رص ۱۶-۱۹)۔

مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو بھی مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا درست ہوگا، جبکہ وہ اسلامی اسٹیٹ کے لئے خطرہ نہ ہوں اور جب تک عقد ذمہ کی پابندی کرتے رہیں، ان کا عقد ذمہ مؤبد ودائی ہوگا، بغیر عقد ذمہ کے مستقل شہری کی حیثیت حاصل نہیں اور بغیر عقد ذمہ کے بطور امان کے زیادہ سے زیادہ ایک سال رہ سکتے ہیں، جیسا کہ اس کے پہلے صراحت کی جاچکی ہے۔

ایک سال تک امان (Visa) پر رہنے کے بعد یا تو وہ واپس اپنے ملک چلا جائے یا پھر عقد ذمہ کرے۔

موجودہ حالات میں اسلامی ملک اس مدت کو بطور آزمائش کے بھی عقد ذمہ کرنے کی شرط لگا سکتی ہے کہ اس غیر مسلم کا کیسا برتاؤ ہے، اسلامی ملک کے لئے مفید ہے یا نہیں، جیسا کہ عصر حاضر میں بھی بیشتر ممالک میں اس طرح کی شرط ہے کہ شہریت کے لئے کم از کم پانچ سال بطور (Visa) کے عارضی طور پر رہنا ہوگا اس کے بعد ہی اس ملک کی شہریت دی جاتی ہے، لیکن یہ ضابطہ صرف غیر مسلم کے لئے ہوگا۔

جہاں تک دوسرے ملک سے آنے والے مسلمان کا تعلق ہے تو اس کو کسی عقد ذمہ کی ضرورت نہ ہوگی، محض درخواست کافی ہوگی، لیکن Probation Period مسلم کے لئے بھی موجودہ حالات میں متعین کیا جا سکتا ہے کہ اس مدت میں اس کی سرگرمیوں کے بارے میں اور اس کے صحیح العقیدہ مسلمان ہونے کے بارے میں معلوم ہو سکے، ورنہ دوسرے غیر مسلم ممالک بطور جاسوس کے اپنے لوگوں کو مسلمان بنا کر بھی بھیج سکتے ہیں۔

☆☆☆

عصر حاضر میں حصول شہریت کا مسئلہ

مولانا حافظ کلیم اللہ عمری مدنی ☆

۱- شہریت کے تعلق سے ہر ملک کا اپنا ایک مخصوص قانون اور نظام مقرر ہوتا ہے، ہر ملک کے قانون کی ایک حیثیت بھی ہوتی ہے، لہذا ہر ملک اپنے بنائے ہوئے قانون کا پابند ہوگا، محض بود و باش اختیار کرنے کو یا معاشی سرگرمیاں انجام دینے کو یا طویل مدت کے قیام کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا، بلکہ ہر ملک کی معاشی واقتصادی اور سیاسی حالات کے پیش نظر وہ ملک شہریت دینے کے اصول وضوابط تیار کرنے کے کا مجاز ہوگا۔

۲- صورت مسؤلہ میں اگر ایک مسلم یا غیر مسلم ملک میں بسنے والا مسلمان اپنی کسی مجبوری یا خواہش کی وجہ سے دوسرے مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنا چاہے تو اس دوسرے مسلم ملک پر اس کی درخواست کو قبول کرنا شرعاً کوئی ضروری نہیں ہوگا، بلکہ ہر ملک کے امیگریشن کے قوانین کا لحاظ کرنا ضروری ہوگا، شہریت دینے کے لئے اپنے وضع کردہ قانون اور ملک کی سلامتی مقدم رکھنا لازم ہوگا، البتہ کسی مجبور انسان کو ضرورۃً پناہ دینا اور اسے حالات سازگار ہونے تک اپنے ملک میں پناہ گزین یا مہاجر کا درجہ دینا من باب الاستحسان ہوگا،

۳- مذکورہ مسئلہ سیاسی مصلحتوں پر مبنی ہے، ہر ملک اپنے شہریوں کو سہولتیں اور رعایتیں دینے کا مجاز ہے، کلی طور پر مہاجرین یا تارکین وطن کو اپنے شہریوں کے سارے حقوق دینا ممکن نہیں ہے، بلکہ ہر ملک اپنے شہریوں کی جان ومال، عزت وآبرو، اور ان کے دینی اور مذہبی آزادی کی حفاظت کا ضامن ہے، اس لئے کہ ان سے ٹیکس وصول کرتا ہے، اور انتخابات کے وقت ان باتوں کا معاہدہ بھی ہوتا ہے، گویا ان وعدوں کو پورا کرنا شہریوں کو راحت پہنچانا، امن عام فراہم کرنا حکومت وقت کی ذمہ داریوں میں شامل ہے، البتہ ان مہاجرین کی حیثیت ایک مہمان کی ہے، ان کے لئے پوری رعایتیں دینا یا سہولتیں فراہم کرنا، یعنی شہریوں کی طرح حکومت کے واجبات میں سے نہیں ہے،، زیادہ سے زیادہ مستحبات میں شامل ہوگا۔

☆ استاذ ومفتی جامعہ دارالسلام عمرآباد۔

۴- مذکورہ حقوق ہر شہری کو فراہم کرنا حکومتوں کا فرض عین اور ان کا فرض منصبی بھی ہے، بلکہ نا گہانی حالات میں جان و مال کا تحفظ فراہم کرنا بھی واجبات میں شامل ہوگا۔

۵- مہاجروں کو مدنی دور کے سارے حقوق فراہم کرنا حکومت وقت کا اخلاقی فریضہ ہوگا، یعنی ان مجبوروں کے ساتھ ہمدردی کرنا اسی طرح ممکن ہے جس طرح مدنی دور میں مواخاۃ، یعنی بھائی چارگی کا ماحول قائم کیا گیا، اس طریقہ سے بہت سارے اقتصادی وسماجی ومعاشرتی مسائل حل ہوسکیں گے، البتہ ان مہاجروں کو مقامی باشندوں کی طرح سو فیصد حقوق حاصل ہوں یہ ناممکنات میں سے ہے، زیادہ سے زیادہ ان پناہ گزینوں کو حق تعلیم وتعلم، اقتصادی ومعاشی سرگرمیوں کی آزادی، جان ومال کا تحفظ دینا، ان کی عزت وآبرو کی سلامتی کے لئے ہر ممکن قانون بنانا اور اس پر عمل کرانا یہ ساری باتیں حکومت کی سرپرستی میں عمل میں آئیں گی، البتہ شہریوں کے حقوق خاصہ، جیسے سرکاری نوکری، سرکار بنانے کی آزادی، انتخابات میں امیدوار کی حیثیت سے اپنے آپ کو پیش کرنے وغیرہ کے مخصوص حقوق صرف شہریوں کو حاصل ہوں گے، اور پناہ گزین کی حیثیت مہمانوں یا مہاجروں کی ہوگی، جب ان لوگوں کی ملکی حالت پرامن ہوگی تو یہ لوگ اپنے وطن عزیز واپس لوٹ جائیں گے۔

۶- مسلمان کے لئے ضرورت ومجبوری کی بنا پر یا محض معاشی فوائد کی غرض سے غیر مسلم ملک کی شہریت اختیار کرنے کی شرعاً اجازت ہوگی، بشرطیکہ اسلام پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، مذہبی آزادی پوری طرح میسر ہو، جان ومال عزت وآبرو کا تحفظ شامل ہو، دین کی حفاظت مقدم ہو، اس صورت میں جواز کا حکم رہے گا، ورنہ نہیں، یعنی دینی تشخص محفوظ نہ ہو یا دینی وضع قطع، داڑھی یا پردہ پر پابندی عائد ہو، شعائر اسلام کا مذاق اڑایا جاتا ہو تو یا غیر اسلامی کلچر کا فروغ ہو، ایسی جگہ میں شہریت حاصل کرنے کی کوشش اور تگ ودو جائز نہیں ہے، مسلمان ایسے مقام میں زندگی بسر کرے جہاں اسلام زندہ رہے، ورنہ اس کی زندگی موت کے برابر ہے، معاذ اللہ

۷- مسلم ملکوں میں غیر مسلموں کو مستقل شہری کی حیثیت سے آباد کرنا اس وقت درست ہوگا، جبکہ اسلامی شعائر متاثر نہ ہوں، ان کی وجہ سے شرک کا دروازہ نہ کھل جائے، یا غیر اسلامی تہذیب کو فروغ دینے کے مسائل کھڑے نہ ہوں، عام طور پر جنہیں شہری تسلیم کئے جائیں تو لازماً ان کو سارے حقوق (مذہبی، تعلیمی، سماجی، اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی) دینا حکومتوں کی ذمہ داری ہوجاتی ہے، لہذا غیر مسلموں کو شہریت نہ دینا بہتر ہے، زیادہ سے زیادہ انہیں پناہ گزینوں کی طرح انسانی ہمدردی اور دعوتی نقطہ نظر سے مسلم ملکوں میں موقتاً پناہ دینا مناسب ہوگا۔

☆☆☆

شہریت سے متعلق بعض اہم مسائل

مفتی سعید اسعد قاسمی☆

۱- قرآن کریم کی آیت: ''**والذین آووا ونصروا أولئک هم المومنون حقا**'' (انفال: ٧٤) اور: ''**ولقد بوأنا بنی إسرائیل مبوأ صدق**..........'' (سورۂ یونس: ۹۳) یہ دونوں آیتیں شہریت کے لئے بنیادی اصول کی ہیں، یعنی اس طرح کہ کسی ملک میں ایک مسلمان کا اس نیت اور مقصد سے کہ معاشی نظام کو بہتر بنا سکیں گے، مستقل قرار پکڑنا عند اللہ محبوب ہے، جسے موجودہ زمانہ میں شہریت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح حدیث شریف میں ہے حضرت ابو درداء روایت کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ارشاد فرمایا: جنگ کے موقعوں پر مسلمانوں کا خیمہ دمشق نامی شہر کے جانب واقع مقام غوطہ ہوگا اور دمشق شام کے بہترین شہروں میں سے ہوگا۔

''**عن أبی درداء أن رسول الله ﷺ قال: إن فسطاط المسلمین یوم الملحمة بالغوطة إلی جانب مدینة یقال لها: دمشق من خیر مدائن**'' (السنن لأبی داؤد: ۵۹۱/۲، ۵۹۰)۔

حدیث مذکورہ میں فسطاس سے مراد رہائشی جگہ اور مقام ہے۔ فقہاء کرام نے وطن اصلی کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جہاں انسان پیدا ہو یا اس نے کسی اور جگہ کو مستقل جائے سکونت بنا لیا ہو اور تا حیات وہاں قیام کا عزم ہو۔ صاحب ''بدائع الصنائع'' علامہ کاسانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

''**وطن أصلی وهو وطن الإنسان فی بلدة أو بلدة أخریٰ اتخذها دارا أو وطنا بها مع أهله وولده ولیس من قصده الارتحال عنها، بل التعیش بها**'' (بدائع الصنائع: ۲۸۰/۱)۔

لہٰذا مذکورہ بالا مباحث کی روشنی میں راقم السطور کی رائے یہ ہے کہ کسی ملک میں ایک مسلمان کا اس مقصد سے مستقل بود و باش اختیار کرنا کہ اس سے معاشی نظام کو بہتر بنا سکیں گے یہ آج کی شہریت کی بنیاد قرار پائے گی۔

☆ رفیق دار القضاء امارت شرعیہ آسنسول بردوان۔

۲- اگر غیر مسلم ملک سے آنے والا مسلمان وہاں کے غیر مسلموں کے ظلم واستبداد سے تنگ آکر بدرجہ مجبوری دوسرے پرامن مسلم ملک میں بودوباش اختیار کرنے کی درخواست پیش کرتا ہے تو ایسی صورت میں مسلم ملک کے لئے اس کی درخواست قبول کرنا شرعاً واجب وضروری ہے۔ بشرطیکہ شرعی وسائل اور رقبہ میں اس کے آباد کرنے میں گنجائش موجود ہو۔

''سورہ انفال'' میں ہے: ''**وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر** ''(انفال:۷۲)۔

مذکورہ آیت ان لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جنہوں نے مکہ سے ہجرت نہ کرکے مدینہ کے مسلمانوں سے اپنی جگہ پر مقیم رہتے ہوئے مدد کی درخواست کی تو ایسی صورت میں مدینہ میں زندگی بسر کرنے والے صحابہ کرام پر ان کی مدد کو واجب قرار دیا گیا۔اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ''الجامع لاحکام القرآن للقرطبی'' میں علامہ قرطبی رقم طراز ہیں:

''**الثانیة قوله :وان استنصروکم فی الدین فعلیکم النصر، یرید أن یدعو هؤلاء المؤمنون لم یهاجروهم أرض الحرب عونکم بنصر أو مآل لاستنقاذهم فأعینوهم، فذلک فرض فلا تخذلوهم**''
(الجامع لأحکام القرآن للقرطبی ۲۷/۸)۔

اب رہا یہ سوال کہ بلا مجبوری محض خواہش کی بنیاد پر درخواست پیش کرے تو اس کا حکم کیا ہے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر یہ شخص عالم دین ،علم دوست ہے،اس کے اس ملک میں آباد ہونے سے ملک میں بسنے والے مسلمانوں کا بھلا ہوگا تو اس کی درخواست بھی قبول کرنی چاہئے،البتہ اس کا قبول کرنا واجب وضروری نہیں ہے۔

۳- مسلمانوں پر جہاں کہیں بھی ظلم ہو تو دنیا کے دوسرے مسلمانوں پر اپنی اپنی وسعت کے مطابق ان کی امداد واعانت ایک دینی فریضہ ہے،''احکام القرآن'' میں ہے: جس نصرت کی نفی کی گئی تھی وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان : ''**والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولیاء بعض** ''(سورۂ توبہ:۷۱) تمام مومن مرد اور مومنہ عورت ایک دوسرے کے حمایتی ہیں، کے حوالہ سے منسوخ ہوگئی۔

''**ولیس یمتنع أن یکون نفی الولایة مقتضیا للأمرین جمیعا من نفی التوارث والنصرة ثم نسخ نفی المیراث بایجاب التوارث بالأرحام مهاجراکان أوغیر مهاجر، وإسقاطه بالهجرة، فحسب ۔ ونسخ نفی إیجاب النصرة بقوله والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولیاء بعض** ''(احکام القرآن:۹۸/۳)۔

حدیث شریف میں ہے: رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کہ تم اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

''**قال رسول الله ﷺ :انصر أخاک ظالما أو مظلوما** ''(صحیح البخاری:۱۰۹۲۸/۲)۔

قرآنی آیات اور حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کسی مسلمان پر ظلم ہو تو دنیا کے مسلمانوں پر حسب

استطاعت ووسعت اللہ رب العزت کے فرمان: ''لا یکلف اللہ نفسا الا وسعها'' (سورۂ توبہ:٢٨٦) کے تحت تعاون شرعاً لازم وضروری ہے، لہٰذا اگر کوئی مظلوم مسلمان کسی مسلم ملک میں آکر قیام کرے اور اس کا وہاں مستقل ٹھہرنے کا ارادہ ہو، اپنے سابق ملک لوٹنا محال اور ناممکن ہو تو اس کے ساتھ بھی قدیم شہری کی طرح معاملہ کیا جائے گا؛ البتہ اگر مستقل ٹھہرنے کا ارادہ نہ ہو چند روز ہی قیام کا ارادہ ہو اور اپنے ملک لوٹ جانے کا پروگرام ہو تو لوٹتے وقت تک اس کی دادرسی ایک دینی فریضہ ہے، لہٰذا اخلاقی طور پر بحیثیت مہمان اس کا اعزاز واکرام شریعت اسلامیہ کا محمود ومطلوب ہے؛ اس لئے کہ حدیث شریف میں ہے۔

''عن أبی هريرة قال: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه'' (صحیح البخاری:٨٨٩/٢)۔

(حضور اقدس ﷺ نے فرمایا: جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ پہونچائے اور جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو وہ اپنے مہمانوں کا اکرام کرے)۔

٤- اگر شہریت اختیار کرنے والا مسلمان ہے اور ملک بھی اسلامی ہے تو امام جصاص رازی کی صراحت کے مطابق اس کو مذکورہ تمام حقوق حاصل ہوں گے۔

''ونسخ نفی إيجاب النصرة بقوله تعالىٰ: والمؤمنون والمؤمنات بعضهم أولياء بعض'' (التوبہ: ٧١)۔

قرآن کریم میں ہے: ''إ ن الله يأمركم أن تؤدوا الأمانات الى أهلها وإذا حكمتم بين الناس أن تحكموا بالعدل، إن الله نعما يعظكم به إن الله كان سميعا بصيرا'' (سورۂ نساء:٥٨)۔

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے علامہ قرطبی تحریر فرماتے ہیں: ''والأظهر فی الآية أنها عامة فی جميع الناس فهی تتناول الولاة فيها إليهم من الأمانات فی قسمة الأموال ورد الظلمات والعدل فی الحكومة'' (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی:١٦٥/٥)۔

مذکورہ بالا آیت کی روشنی میں راقم السطور کے نزدیک پناہ گزیں کو ایک شہری ہونے کے ناطے قدیم شہری کی طرح شہریت کے تمام حقوق حاصل ہوں گے۔ جیسے ووٹ ڈالنے کا حق، انتخاب میں امیدوار ہونا، سرکاری ادارہ میں ملازمت، سرکاری تعلیمی اداروں میں تعلیم کا حق، سرکاری اسپتال سے علاج وروزگار کا حق۔

٥- مسلم پناہ گزیں کو بھی تمام مراعات وسہولیات فراہم کرانا مسلم ملک کی اخلاقی ذمہ داری ہے۔ حدیث شریف: ''من

كان يؤمن بالله واليوم الآخر فلا يؤذ جاره ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليكرم ضيفه"(صحیح البخاری: ۸۸۹/۲) کی روشنی میں مذکورہ حکم سمجھ میں آتا ہے؛ البتہ مسلم پناہ گزیں پر بھی پناہ گزینوں سے متعلق ان تمام قوانین کی پابندی کرنی ہوگی۔جن کی صراحت ملک کے دستور میں ہے اوراس کی دلیل قرآن کریم کی یہ آیت ہے: "**أوفوا بالعهد إن العهد كان مسئولا**"(بنی اسرائیل:۳۰)۔

۶- ایک مسلمان اپنی زندگی گذارنے میں قرآن وسنت کا پابند ہے،اس کے بتائے ہوئے اصول وضوابط کی روشنی میں ہی اسے زندگی گزارنی ہوگی، چنانچہ اس سلسلہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: آگاہ ہوجاؤ! میں ایسے مسلمانوں سے جو(بلاضرورت شرعی) مشرکین کے ساتھ بودوباش اختیار کرتا ہو بری ہوں۔

"**قال النبی ﷺ: ألا إني بريء من كل مسلم مع مشرك**" (مصنف ابن ابی شیبۃ:۲۸۶/۲۰)۔

لہذا محض معاشی فوائد کی خاطر ایک مسلمان کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں شہریت اختیار کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

۷- چند مخصوص شہر مکہ، مدینہ اور یمامہ کے اطراف کو چھوڑ کر کسی بھی ملک میں غیر مسلم رہائش اختیار کرسکتا ہے،اس لئے کہ حضور ﷺ نے صرف جزیرۃ العرب میں مشرکین کے داخلہ کو منع فرمایا ہے: "**أخرجوا المشركين من جزيرة العرب**" (صحیح بخاری:۴۲۹/۱)۔

مذکورہ شہروں کے علاوہ میں بودوباش اختیار کرنے کی اجازت قرآن کریم کی آیت سے بھی ملتی ہے: "**لا ينها كم الله عن الذين لم يقاتلوكم في الدين ولم يخرجوكم من دياركم أن تبروهم وتقسطوا إليهم إن الله يحب المقسطين**"(ممتحنۃ:۸)۔

البتہ جہاں تک ان مسلم ملکوں میں ان کو ملنے والے سیاسی حقوق کی بات ہے تو اس سلسلہ میں صاف واضح ہے:

"**فالله يحكم بينكم يوم القيامة ولن يجعل الله للكافرين على المؤمنين سبيلا**"(نساء:۱۴۴)۔

لہذا مسلمانوں کے برابر ان کو کلیدی عہدوں پر جو قانون سازی سے متعلق ہیں، بحال نہیں کیا جاسکتا ہے؛ لیکن ان کی مذہبی آزادی، جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت، نیز کسی شر انگیزی کے بغیر تعلیم اور حصول انصاف کا تعلق ہے تو یہ چیزیں ان کو حاصل ہوں گی، اسی کے ساتھ وہ تعزیری قوانین اور اسلامی دستور کے مطابق تمام حدود کے بھی پابند ہوں گے۔

☆☆☆

شہریت کے فقہی وقانونی اصول وضوابط

مولانا ضیاء اللہ عباس ندوی☆

اسلام ایک مکمل نظام حیات ہے جو انسان کے تمام گوشہ ہائے زندگی پر محیط ہے جو انسان کی ہر ہر موڑ پر صحیح رہنمائی کرتا ہے، اس کے پاس خدا کی طرف سے لایا ہوا ایک ایسا دستور حیات ہے جس میں تمام انسانوں کی بھلائی وکامیابی موجود ہے، اس نے انسانوں کو مکمل مساوات وعدل بھائی چارگی شفقت ومہربانی اور انسانیت کا درس دیا حجۃ الوداع کے موقع پر حضور ﷺ نے اپنے خطبہ میں جو انسانوں کو حقوق شہریت کے منشور اعظم دیئے وہ تاریخ تمدن میں نہایت ہی اہم درجہ رکھتے ہیں، ان میں تفصیل سے آپ نے رعایا کے حقوق وفرائض کا تذکرہ فرمایا۔

یہ ایک بڑی ہی تلخ حقیقت ہے کہ جدید دنیا کے ایک بڑے حصے نے یورپ کے علاقائی نیشنلزم کو ایک طے شدہ اصول کے طور پر قبول کرلیا ہے اور عالم اسلام میں بھی بہت سے ایسے مسائل پیدا ہوگئے ہیں جو نہیں ہونے چاہئے تھے، دکتور علی محی الدین القرہ داغی نے اپنے مقالہ (دراسہ علی ضوء الکتاب والسنہ) المصطلحات السیاسیۃ والاجتماعیۃ میں (ص۵۲) پر مواطنت کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

”المواطنة لغة مصدر واطن، وأصله من وطن بالمكان يطن وطنا أى اقام به اتطن البلد أى اتخذه بلداً واستوطن البلد، ولكن الفقهاء استعملو(وطن الاقامة) فى مقابل بلد السفرأى الموضع الذى استقرفيه أو يستقرفيه مدة يخرج بها المسافر عن الأحكام السفر مثل خمسة عشر يوما“۔

مواطنہ لغۃ مصدر ہے واطن سے اس کی اصل وطن یطن وطنا بالمکان ہے سکونت اختیار کرنا شہریت اختیار کرنا کسی ملک کو وطن اقامت بنانا، لیکن فقہاء کرام نے وطن اقامت کو مسافر کے معنی میں استعمال کیا ہے جس آدمی مدت سفر سے نکل جاتا ہے اور مقیم ہوجاتا ہے، مثلاً پندرہ دن کی نیت سے کسی جگہ سکونت اختیار کرنا مقیم ہوجانا۔

آگے چل کر عصر حاضر میں شہریت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

☆ اقصی کالونی، لکھنؤ (یوپی)۔

"العرف المعاصر (الوطنی) الذی یتبنی الفکر الوطنی ویدافع عنه أو یجعله الوسیلة الجامعة بین المواطنین فی الحقوق والواجبات(المواطن) الذی له جنیه ذلک البلد کما أن هناک من یفرق المواطنین إلی مواطنین اصلیتین لهم حقوق اکثر ومواطنین متجنین لهم حقوق اقل "(حوالہ سابق)۔

موجودہ دور میں شہریت (وطنیت) اس کو کہتے ہیں جس کی بنیاد پر وطنیت کی بنیاد رکھی جائے اور اس کی طرف سے دفاع کیا جائے یا جس کو ایک اہم وسیلہ بنایا جائے جس کے ذریعہ تمام حقوق وواجبات حاصل ہوسکیں، یا یہ کہ موجودہ دور میں شہری ہر اس شخص کو کہا جاتا ہے جو اس ملک کا اصل باشندہ ہو جہاں اس کی پیدائش ہوئی ہو جس کی بنیاد پر اسے شہریت کے وہ سارے حقوق حاصل ہوگئے ہوں جو دوسروں کو حاصل نہ ہوں۔

ڈاکٹر ہاشم قدوائی اصول سیاسیات میں (صفحہ ۱۳۲) پر شہریت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شہری کے لفظی معنی شہر کے رہنے والے کے ہیں، لیکن علم سیاسیات میں اس سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جو کسی نہ کسی ریاست کا رکن ہو اور اس حیثیت سے حقوق کا مالک ہو اور اپنے فرائض انجام دیتا ہو، مثلاً شہری کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوتا ہے جو غیر شہریوں کو حاصل نہیں ہوتا اسی طرح ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنے ملک کی حفاظت کرنے میں حصہ لے، لیکن کسی غیر ملکی کو اس کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا۔

شہریت سے مراد شہری کا مرتبہ ہے جس کی رو سے اسے اپنی ریاست میں ہر قسم کے شہری اور سیاسی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور اسے فرائض بھی انجام دینے ہوتے ہیں، آگے چل کر شہریت کی قسمیں اور حاصل ہونے کے طریقے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: شہری دو طرح کے ہوتے ہیں، قدرتی (Natural) اور بنائے ہوئے (Naturalised) شہریت حاصل کرنے کے دو طریقے ہیں ایک طریقہ پیدائش کے ذریعہ شہریت کے حقوق حاصل کرنے کا ہے اور دوسرا کسی ملک میں بود وباش اختیار کرکے شہری بننے کا ہے، انہیں بنایا ہوا شہری (Naturalised Citizens) کہتے ہیں، پیدائش کے ذریعہ شہریت حاصل کرنے کے بھی دو اصول ہیں ایک تو جائے پیدائش Jussoli کی بنیاد پر، دوسرے آبائی حق یا خونی رشتے (Jussanguinis) کی بنیاد پر، ظاہری بات ہے کہ موجودہ دور میں شہریت کے حقوق حاصل کرنے کے لئے لازم وضروری ہے، جیسے نسل رنگ زبان علاقہ خونی رشتہ، یہ تمام چیزیں اسلام میں ناقابل قبول ہیں، فقہاء اسلام نے ان کو اس لائق بھی نہ جانا کہ ان پر بحث کی جائے، انہوں نے دار الاسلام کو ہمیشہ ایک سیاسی وحدت کے طور پر تسلیم کیا ہے اور اسی بنیاد پر فقہ وسیر کے جملہ احکام کو مرتب کیا ہے، مختلف ریاستوں کے باوجود جنہیں بیک وقت دار الاسلام کہا جاتا تھا، دنیائے اسلام میں مشترکہ شہریت کا اصول تھا جو شخص ایک مسلم ریاست کا شہری تھا اس کو دوسرے مسلم ملک کی شہریت خود بخود حاصل ہوتی تھی۔

اس بات کوموکد کرتے ہوئے دکتور علی قرہ داغی اپنے مقالہ کے صفحہ ۱۵ پر لکھتے ہیں:

"إن مما لا شک فيه أن الإسلام يقيم المجتمع والأمة والدولة على أساس روابط العقيدة والدين وسعى جاهدا لتحقيق الأخوة الحقيقة تأصيلا وتنظيرا وتطبيقا وتفعيلا، فقال تعالى:" إنما المومنون اخوة"(سورۂ حجرات:۱۰)بهذا الأسلوب الحصرى الواضح ويفرض على المسلمين جميعا حقوق الأخوة من الولاء والنصرة والتعاون والتكافل والتضامن"۔

اس میں کوئی شک نہیں اسلام میں حکومت قومیت اور سوسائٹی کی بنیادعقیدہ اور دین کی بنا پر ہے اور اسی لئے تمام تگ اور کوشش کی جاتی ہیں، تاکہ فطری، فکری اصلی اور حقیقی تمام اعتبار سے اسلامی اخوت و بھائی چارگی ان کے درمیان پیدا ہوسکیں، جیسا کہ اللہ تعالی کا قول ہے: تمام مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں، آگے چل کر اسلام میں شہریت حاصل ہونے کے لئے کس بات کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے کہ تحت لکھتے ہیں:

"الوطن فى المفهوم الاسلامى هو الوطن الكبير لأمة الاسلامية، حيث كان المواطن مسلما أو كافرا فى الدولة الإسلامية عند الخلافة الراشدة إلى سقوط الدولة العثمانية يصول ويحول فى عرض العالم الإسلامى وطوله دون قيد ولا شرط فكانت جنسية الإسلام فاينما أقام فهو وطنه له حقوقه وعليه الواجبات، فالمسلم ولاء ة الإسلامى الكبير"۔

اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک مسلمان جو اسلامی ملک میں رہ رہا ہے اگر دوسرے اسلامی ملک میں آئے تو آتے ہی اس ملک میں اسے تمام حقوق حاصل ہوجائیں گے، جو اسلامی ملک میں نہیں رہتے ہیں تو اگر وہ اس اسلامی ملک کا باشندہ ہونا چاہتا ہے تو داخل ہوتے ہی اپنی خواہش کا اعلان کردے اور پندرہ دن ٹھہرنے کے بعد وہ اس ملک کا شہری ہو جائے گا اور اس کے بھی وہی حقوق وفرائض ہوں گے جو دوسرے شہریوں کے ہیں (خطبات بھاولپور ص ۲۰۱۹)۔

یہ باتیں قرآن کی مندرجہ ذیل آیتوں سے معلوم ہوتی ہیں:

"إنما المومنون إخوة "(سورۂ حجرات:۱۰)،"والمومنون والمومنات بعضهم أولياء بعض "(سورہ توبہ:۱۷)،"إن هذه أمتكم أمة واحدة وأناربكم فاتقون"(سورۂ مومنون:۵۲)۔

حربی اور مستامن کے حقوق:

یہ توحکم مسلمانوں کے لئے تھا، مستامن یا حربی جو دارالحرب سے تعلق رکھتا ہو اس کے لئے فقہاء کرام نے یہ اصول وضع کیا ہے "الجباية بإزاء الحماية، الخراج بالضمان" اگر وہ ایک سال تک اسلامی ریاست میں قیام پذیر رہے تو

اس کے بعد اس کو وہ تمام حقوق حاصل ہوجائیں گے جو ایک شہری کو حاصل ہوتے ہیں، اسی طرح اس پر وہ تمام فرائض بھی عائد ہوجائیں گے جو اسلامی ریاست میں ایک شہری پر عائد ہوتے ہیں، ایک سال کی شرط اس لئے عائد کی گئی کہ جو مسامن یا ذمی اسلامی ریاست میں ایک سال رہے تو ایک سال کے بعد اس پر جزیہ عائد ہوجائے گا، اس کی وجہ وہی ہے جو اوپر اصول بیان ہوا کہ۔مستامن کے لئے علاوہ ازیں حصول شہریت کا ایک اور طریقہ علماء نے بیان کیا ہے اور وہ اسلامی ریاست کے کسی شہری سے شادی ہے، اگر مستامن اسلامی ریاست کی کسی خاتون شہری سے شادی کرلیتا ہے تو بھی اس کو شہریت کے حقوق حاصل ہوجائیں گے، اس گفتگو سے پتہ چلا کہ اسلامی ریاست میں انہیں دوقسموں کا تصور ہے، تیسری کوئی قسم نہیں، ایک تو وہ مسلمان شہری جو ابتداء سے ہی اسلامی ریاست کا شہری ہے، اور دوسرے وہ غیر مسلم مستامن جو عارضی طور پر اجازت لے کر اسلامی ریاست میں آئے اور پھر یہیں کا ہوکر رہ جائے، اسی کلیہ کو امام شافعیؒ نے اپنی کتاب ''الام'' میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے: ''**إن دار الإسلام لا تکون دار مقام لأحد المسلم أو معاهد**''، فقہاء اسلام نے یہ بھی لکھا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم اسلامی ریاست میں دوران قیام اسلام قبول کرلے تو وہ اسلام قبول کرتے ہی اسلامی ریاست کا شہری بن جائے گا (خطبات بہاولپور ص ۳۲۳ تا ۳۳۴)۔

اوپر جتنی باتیں ہم نے اسلام میں شہریت حاصل ہونے کے لئے ایک اسلامی ملک میں بیان کی ہیں اس سے یہ بات معلوم ہوگئی کہ ایک مسلمان عالم اسلام کے ہر اسلامی ملک کا بالقوہ شہری ہے، یعنی اس کے لئے کسی درخواست قبول کرنے کی ضرورت نہیں، اسی طرح اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ اگر مسلمان کسی اسلامی ملک میں پناہ لیتے ہیں تو وہ اس اسلامی ملک میں آتے ہی اس کے شہری شمار ہوں گے اور ان کے ساتھ کسی طرح کا امتیازی سلوک کرنا اور دوسرے درجہ کا شہری سمجھنا کسی طرح بھی جائز نہیں، اسی طرح قدیم شہریوں کی طرح ان کو بنیادی سہولیات فراہم نہ کرنا جائز نہ ہونا یہ چیزیں اخوت اسلامی کے بالکل منافی اور متضاد چیزیں ہیں۔

ڈاکٹر وہبہ زحیلی ''الفقہ الاسلامی وادلتہ'' (۷/۸۲۵) پر اہم قرارات اور فیصلے نقل کئے ہیں جو اسلامی نقطہ نظر سے مانے بھی گئے ہیں، جن میں پہلا اساسی حق یہ ہے:

''**البشر فی کل اقطارهم أسرة واحدة مخلوقون من نفس واحد مستاوون فی الکرامة الإنسانیة، وفی أصل التکلیف والمسئوولیة أکرمهم عند الله اتقاهم**''

''**یولد الإنسان حرا ولاعبودیة لغیر الله تعالی ولیس لمخلوق أن یستعبده أو یذله أو یشغله**''۔

تمام انسان ایک کنبہ ہے وہ انسان ہونے کے ناطے انسانیت میں برابر ہے، ان میں بھی سب سے بہتر وہ ہے جو

سب سے زیادہ متقی ہے، ہر انسان آزاد ہے، اللہ کے علاوہ کسی اور کی عبودیت جائز نہیں، ہر شخص کو آزادی کے ساتھ شریعت کے حدود میں رہتے ہوئے اپنی رائے کے اظہار کا حق بذریعہ تحریر وتقریر حاصل ہے، ہر شہری کو ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔، اسی طرح ہر شہری کو انتخابات میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے، اسی طرح ووٹ دینے کا حق حاصل ہے(الدولۃ الاسلامیہ رص ۸۲۹)۔

اسی طرح ہر شہری کو سرکاری اداروں میں ملازمت کا حق، نیز سرکاری ہسپتالوں میں علاج کا حق اور عدالتی چارہ جوئی کا حق حاصل ہے۔

ہر شہری کو ایک مقام سے دوسرے مقام پر کسی پیشگی اجازت کے بغیر آمدورفت کا حق حاصل ہے(شرعۃ حقوق الانسان فی الاسلام رص ۸۲۲، ۸۳۱)۔

شریعت اسلامی میں حالت امن میں غیر مسلموں کی آخری قسم جو ریاست میں موجود ہوتی ہے یا ہوسکتی ہے وہ مستامن، یعنی پناہ گزینوں کی ہے، مستامن کے لغوی معنی امان طلب کرنے کے ہیں، لیکن اصطلاح میں دوسرے ملک بالعموم دارالحرب کا باشندہ جو کسی عارضی قیام یا سفر کی غرض سے (امان یا اجازت نامہ یا ویزا) لے کر دارالاسلام آیا ہو، فقہاء اسلام نے عموماً مستامن کی اصطلاح دارالحرب کے باشندوں کے لئے ہی استعمال کی ہے، دارالعہد یا دارالصلح کے باشندوں سے چونکہ اجتماعی طور پر معاہدہ دوستی موجود ہے، اس لئے ان کے لئے اگر وہ دارالاسلام آئے تو مستامن کی اصطلاح شاید غیر موزوں سمجھی گئی، تاہم دور جدید کے مصنفین مثلاً ڈاکٹر عبدالکریم زیدان نے ہر غیر ملکی کے لئے جو عارضی طور پر قیام کے لئے دارالاسلام آئے مستامن ہی کی اصطلاح استعمال کی ہے، اور یہی قاعدہ عام ہے، "**المستامن بمنزلة أهل الذمة فی دارنا مستامن**" ہمارے علاقہ کی حدود میں ایسا ہی سمجھا جائے گا، جیسا کہ ذمی سمجھا جاتا ہے، لیکن مستامن کو سیاسی حقوق حاصل نہیں ہوتے، کیونکہ وہ دارالاسلام کا شہری نہیں، ہاں دوسرے حقوق عامہ سے مستامن بھی متمتع ہوسکتا ہے، انہیں حقوق میں سے یہ بھی ہے کہ بیت المال اس کا کفیل ہے۔

مستامن کو دارالاسلام میں ٹھہرنے کے لئے جتنی مدت متعین کردی گئی ہے اس مدت تک اسے دارالاسلام میں قیام کا حق حاصل ہے، اس مدت کے دوران مستامن کو مختلف قسم کی انفرادی آزادی حاصل رہے گی، لیکن اسلامی حکومت حالات کے تقاضے سے اگر اس کو نکالنا ضروری سمجھے تو نکال سکتی ہے، انفرادی حقوق کے سلسلے میں مستامن کو مسلمانوں وغیر مسلموں کے ساتھ مالی معاملات کرنے کا بھی حق حاصل ہے اور منقول غیر منقول جائداد بنانے کا بھی حق ہے، بلکہ اسے یہاں تک حق ہے کہ وہ مسلمانوں سے حق شفعہ پر کوئی جائداد لے لے اسلام نے مستامن کو جو حقوق دیئے ہیں وہ غیر ملکیوں کے ان حقوق سے

بہت زیادہ وسیع ہیں جو انہیں نئے ممالک میں حاصل ہوتے ہیں، کیونکہ اکثر ملکوں میں غیر ملکی جائداد کا مالک نہیں ہوسکتا ،مستامن پر یہ بھی پابندی ہے کہ وہ ایسی چیزیں لے کر دارالاسلام سے نہ جائے جن سے حربی ملکوں کو قوت پہنچے، لیکن مستامن اگر ایسی چیزوں کو لے کر داخل ہوا تھا تو ان چیزوں کو لے جانے کا بھی حق دیا جائے گا (خطبات بھاولپور رص ۳۲۸)۔

غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا حکم زمانہ، حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کی اغراض و مقاصد کے اعتبار سے مختلف ہوجاتا ہے۔

مفتی تقی عثمانی صاحب (فقہی مقالات رص ۲۳۲) میں ''مغربی ممالک کے چند جدید فقہی مسائل'' کے تئیں جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں: اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جا رہی ہو، یا جیل میں اس کو ظلما قید کر دیا جائے یا اس کی جائداد ضبط کر لی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنے کی اس کے پاس کوئی صورت نہ ہوتو ایسی صورت میں اس شخص کے لئے کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا بلا کراہت جائز ہے، اسی طرح اگر کوئی معاشی مسئلہ سے دوچار ہے اور تلاش بسیار کے بعد بھی اسے اپنے ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ روٹی کپڑا کا بھی محتاج ہوجائے تو اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے، اس لئے کہ حلال رزق کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے۔

اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرے کہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا، یا وہاں مقیم مسلمانوں کو شریعت کے احکام بتلائے گا تو یہ نہ صرف جائز، بلکہ موجب اجر و ثواب ہے۔

اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوش حال اور عیش و عشرت کی زندگی گزارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں (فقہی مقالات جلد اول رص ۲۳۲، ۲۳۳ مفتی تقی عثمانی)۔

غیر مسلمین اگر اسلامی ممالک میں مستقل شہری کی حیثیت سے قیام کرنا چاہیں تو ایسے لوگوں کو مستقل باشندگان کی حیثیت سے آباد کرنا حکومت وقت کے لئے ضروری ہوگا، تاکہ وہ اسلام کے محاسن سے پورے طور پر واقف ہوسکیں اور اسلام کو سمجھ کر اس پر عمل کرسکیں۔

☆☆☆

اسلامی نقطہ نظر سے حقوق شہریت

مولانا محمد ثوبان اعظم القاسمی☆

موجودہ زمانے میں ''قانون شہریت'' انتظامی نقطہ نگاہ سے ایک لازمی ضرورت ہے، تاکہ ملکی نظم ونسق باقی رہے اور دراندازی اور دیگر مفاسد عامہ اور خاصہ سے حفاظت ہو، توضیح مسئلہ کے لئے مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت اس مسئلہ میں درپیش مسائل کا حل پیش کیا گیا ہے۔

دارالاسلام:

دارالاسلام میں دوسرے ممالک کی طرح انتظامی طور پر اگر ''قانون شہریت'' موجود ہے تو شرعی نقطہ نظر سے ایسا ہونا نہ صرف یہ کہ مناسب ہے، بلکہ ضروری ہے، تاکہ داخلی اور خارجی خطرات سے ملک محفوظ رہے۔

دوسرے ممالک کی طرح دارالاسلام بھی دوسرے ممالک کے خواہش مندوں کو حقوق شہریت دینے میں شرعاً مختار اور آزاد ہے، رعایا کی حفاظت بیرونی اور اندرونی مفاسد سے، مقاصد شریعت میں سے ہے۔

دارالاسلام مظلوموں کی امداد اپنی استعداد کے مطابق کرے گا، اور پناہ گزینوں کو نصرت حتی المقدور دے گا، ضرورت محسوس کرنے پر اپنی استطاعت کے مطابق حقوق شہریت عارضی یا دائمی فراہم کرے گا، اس لئے کہ ہر ملک اپنی استعدادوں سے خود زیادہ واقف ہوتا ہے، اور انتظامی پریشانیوں اور مجبوریوں سے خود زیادہ آگاہ ہوتا ہے، دوسروں کی خواہشوں اور تنقیدوں کی پرواہ نہیں کرے گا، انسانی ہمدردی اور اسلامی اخوت ہوتے ہوئے بھی بعض مواقع پر مجبوریاں سد راہ ہوتی ہیں، اور شریعت میں ملکوں کی مجبوریوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔

اسلامی ممالک میں غیر مسلم ماہرین صنعت وحرفت وتجار سے استفادہ کے لئے اجازت شہریت دائمی یا عارضی جائز ہوگی، جب تک ہر قسم کی دہشت گردی اور ہر قسم کی جاسوسی سے مامونیت رہے گی۔

اسلامی نقطہ نظر سے حقوق شہریت میں ہر قسم کے جائز انسانی آرام وسکون کے امور ہوں گے، مگر ملکی مصالح سب پر مقدم ہوں گے۔

☆ مہتمم وشیخ الحدیث مدرسہ عربیہ اسلامیہ خانپور میرٹھ۔

دارالاسلام کی شہریت اور اس کی حصولیابی کے قوانین:

دارالاسلام کے لئے ضروری ہے کہ وسعت حاصل ہو تو اپنے ممالک میں حقوق شہریت دینے میں مسلمانوں کو ترجیح دے، نیز مسلم ممالک کی مصنوعات جو معیار کے مطابق ہوں دوسروں کی مصنوعات پر ترجیح دے۔

مسلمانوں کو چاہئے کہ عارضی یا دائمی ہجرت میں یا حصول معاش کے لئے دوسرے ممالک کی شہریت اختیار کرنے میں دارالاسلام کو ترجیح دے اور وہاں کی شہریت عارضی اور دائمی کے لئے کوشش کرے، شہریت کے حصول کے بعد اسلامی ممالک کے تمام قوانین کی پابندی کرے، اس لئے کہ معاہدے کی پاسداری اور احسان شناسی کی اسلامی شریعت سخت تاکید کرتی ہے، جیسے حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ”لادین لمن لا عهد له“ (وہ دیندار نہیں جو معاہدہ کا پابند نہیں)، نیز حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنے بھائی کی ظالم اور مظلوم دونوں حالتوں میں مدد کرو، مطلب حدیث واضح ہے، ظالم مسلمان کو ظلم سے باز رکھنا اور مظلوموں کو ہر قسم کے ظلموں سے محفوظ کرنا ضروری ہے، نیز مظلوموں کی ہر قدم پر امداد کرنا اسلامی اور انسانی فرائض میں شامل ہے۔

دارالاسلام میں شہریت کی بنیاد حفاظت دین، حفاظت جان وآبرو، حفاظت مال، اور ضرورت معاش کی تکمیل، اور حفاظت عقل اور حفاظت نسل ہوگی؛ چونکہ شریعت اسلامی مذکورہ چیزوں کی حفاظت کے لئے نازل کی گئی ہے۔

دارالاسلام حقوق شہریت دینے میں اپنے ملکی مصالح کا لحاظ رکھے گا؛ اس لئے کہ پہلے سے جس رعایا کا راعی ہے اس کے بارے میں ”ذمہ دار“ سے ذمہ دارانہ (قیامت کے دن) سوال کیا جائے گا، ثانیاً غیر ملکی مسلم شہریوں کی حسب استعداد ذمہ داری قبول کرے گا، اور حسب موقع فیصلہ میں آزاد ہوگا، خواہ پناہ گزیں مسلمانوں کا مسئلہ شہریت ہو یا دوسرے مسلم شہریوں کا جو اپنی ضرورتوں کے لئے ویزا کے خواہشمند ہوں، اور خواہ پوری نصرت کا مسئلہ ہو یا تھوڑی امداد کا، بہرنوع دار الاسلام شرعاً حسب موقع فیصلہ میں آزاد ہوگا، اور صاحب معاملہ پر اطاعت واجب ہوگی۔

دارالحرب یا غیر مسلم ممالک کے احکام حصول شہریت:

کسی غیر مسلم ملک میں مستقل رہائش اختیار کرنا اور اس کی قومیت اختیار کرنا اور اس ملک کے ایک باشندے اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے اس کو اپنا مستقل مسکن بنالینا ایک ایسا مسئلہ ہے، جس کا حکم زمانہ اور حالات کے اختلاف اور رہائش اختیار کرنے والوں کے اغراض ومقاصد کے اختلاف سے مختلف ہوجاتا ہے، مثلاً:

۱- اگر ایک مسلمان کو اس کے وطن میں کسی جرم کے بغیر تکلیف پہنچائی جارہی ہو یا اس کو جیل میں ظلماً قید کرلیا جائے، یا اس کی جائداد ضبط کرلی جائے اور کسی غیر مسلم ملک میں رہائش اختیار کرنا اور اس ملک کا ایک باشندہ بن کر وہاں رہنا بلاکراہت

جائز ہے، بشرطیکہ وہ اس بات کا اطمینان کرلے کہ وہ وہاں جاکر عملی اور اعتقادی زندگی میں دین اسلام کے احکام پر کاربند رہ سکے گا، اور وہاں رائج شدہ منکرات وفواحشات سے اپنے کو محفوظ رکھ سکے گا۔

۲- اسی طرح اگر کوئی شخص معاشی مسئلہ سے دوچار ہوجائے اور تلاش بسیار کے باوجود اسے اپنے اسلامی ملک میں معاشی وسائل حاصل نہ ہوں حتی کہ وہ نان جویں کا بھی محتاج ہوجائے، ان حالات میں اگر اس کو کسی غیر مسلم ملک میں کوئی جائز ملازمت مل جائے جس کی بنا پر وہ وہاں رہائش اختیار کرلے تو مذکورہ بالا دو شرائط کے ساتھ اس کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا جائز ہے؛ اس لئے کہ حلال کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد ایک فرض ہے، جس کے لئے شریعت نے کسی مکان اور جگہ کی قید نہیں لگائی، بلکہ عام اجازت دی ہے کہ جہاں چاہو رزق حلال تلاش کرو، چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے:

"هو الذى جعل لكم الأرض ذلولا فامشوا فى مناكبها وكلوا من رزقه وإليه النشور" (ملک/۱۵)

(وہ ایسی ذات ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو مسخر کردیا، اب تم اس کے راستوں میں چلو اور خدا کی روزی میں سے کھاؤ اور اسی کے پاس دوبارہ زندہ ہوکر جانا ہے)۔

۳- اسی طرح اگر کوئی شخص کسی غیر مسلم ملک میں اس نیت سے رہائش اختیار کرلے کہ وہ وہاں کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دے گا اور ان کو مسلمان بنائے گا جو مسلمان وہاں مقیم ہیں ان کو شریعت کے صحیح احکام بتائے گا، اور ان کو دین اسلام پر جمے رہنے اور احکام شرعیہ پر عمل کرنے کی ترغیب دے گا، اس نیت سے وہاں رہائش کرنا صرف یہ نہیں کہ جائز ہے، بلکہ موجب اجر وثواب ہے، چنانچہ بہت سے صحابہؓ نے اسی نیک ارادے اور نیک مقصد کے تحت غیر مسلم ممالک میں رہائش اختیار کی، جو بعد میں ان کے فضائل ومناقب اور محاسن میں شمار ہونے لگیں۔

۴- اگر کسی شخص کو اپنے ملک اور شہر میں اس قدر معاشی وسائل حاصل ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے شہر کے لوگوں کے معیار کے مطابق زندگی گذار سکتا ہے، لیکن صرف معیار زندگی بلند کرنے کی غرض سے اور خوش حالی اور عیش وعشرت کی زندگی گذارنے کی غرض سے کسی غیر مسلم ملک کی طرف ہجرت کرتا ہے تو ایسی ہجرت کراہت سے خالی نہیں، اس لئے کہ اس صورت میں دینی یا دنیاوی ضروریات کے بغیر اپنے آپ کو وہاں رائج شدہ فواحشات ومنکرات کے طوفان میں ڈالنے کے مترادف ہے اور بلاضرورت اپنی دینی اور اخلاقی حالت کو خطرہ میں ڈالنا کسی طرح بھی درست نہیں، اس لئے کہ تجربہ اس پر شاہد ہے کہ جو لوگ صرف عیش وعشرت اور خوشحالی کی زندگی بسر کرنے کے لئے وہاں رہائش اختیار کرتے ہیں ان میں دینی حمیت کمزور ہوجاتی ہے، چنانچہ ایسے لوگ کافرانہ محرکات کے سامنے تیز رفتاری سے پگھل جاتے ہیں، اسی وجہ سے حدیث شریف میں

شدید ضرورت اور تقاضے کے بغیر مشرکین کے ساتھ رہائش اختیار کرنے کی ممانعت آئی ہے۔

چنانچہ ''ابوداؤد'' میں حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: جو شخص مشرک کے ساتھ موافقت کرے اور اس کے ساتھ رہائش اختیار کرے وہ اسی کے مثل ہے (ابوداؤد: کتاب الضحایا)۔

حضرت جریر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: میں ہر اس مسلمان سے بری ہوں جو مشرکین کے درمیان رہائش اختیار کرے، صحابہؓ نے سوال کیا، یا رسول اللہ! اس کی کیا وجہ ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: اسلام کی آگ اور کفر کی آگ دونوں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، تم یہ امتیاز نہیں کرسکو گے کہ یہ مسلمان کی آگ ہے یا مشرکین کی آگ ہے۔

حضرت امام خطابیؒ تحریر فرماتے ہیں: مختلف اہل علم نے اس قول مبارک کی شرح مختلف طریقوں سے کی ہے، چنانچہ بعض اہل علم کے نزدیک اس کا معنی یہ ہے کہ مسلمان اور مشرک حکم کے اعتبار سے برابر نہیں ہوسکتے، دونوں کے مختلف احکام ہیں، اور دوسرے اہل علم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالی نے دار الاسلام اور دار الکفر دونوں کو علاحدہ کردیا ہے، لہذا کسی مسلمان کے لئے کافروں کے ملک میں رہائش ان کے ساتھ اختیار کرنا جائز نہیں، اس لئے کہ جب مشرکین اپنی آگ روشن کریں گے اور یہ مسلمان ان کے ساتھ سکونت اختیار کئے ہوئے ہوگا تو دیکھنے سے لوگ یہی خیال کریں گے کہ یہ بھی انہیں میں سے ہے، علماء کی اس تشریح سے یہ بھی ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر کوئی مسلمان تجارت کی غرض سے بھی دار الکفر جائے تو اس کے لئے وہاں پر ضرورت سے زیادہ قیام کرنا مکروہ ہے (معالم السنن للخطابی ۳/ ۴۳۷)۔

اور ''مراسیل ابوداؤد عن المکحول'' میں روایت ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: اپنی اولاد کو مشرکین کے درمیان مت چھوڑو (تہذیب السنن ابن قیم ۳/ ۴۳۷)۔

اسی وجہ سے فقہاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ صرف ملازمت کی غرض سے مسلمانوں کا دار الحرب میں رہائش اختیار کرنا اور ان کی تعداد میں اضافہ کرنا اور اس کا سبب بننا ایسا فعل ہے جس سے اس کی عدالت مجروح ہوجاتی ہے (تکملہ رد المحتار ۱/ ۱۰۱)۔

۵- کوئی شخص سوسائٹی میں معزز بننے اور دوسرے مسلمانوں پر اظہار بڑائی کے لئے غیر مسلم ممالک میں رہائش پذیر ہوتا ہے یا دار الکفر کی شہریت اور قومیت کو دار الاسلام کی شہریت اور قومیت پر فوقیت دیتے ہوئے اور اس کو افضل اور برتر سمجھتے ہوئے ان کی قومیت اختیار کرتا ہے یا اپنی پوری عملی زندگی میں بود وباش میں ان کا طرز اختیار کر کے ظاہری زندگی میں ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لئے اور ان جیسا بننے کے لئے رہائش اختیار کرتا ہے تو ان تمام مقاصد کے لئے وہاں رہائش اختیار کرنا مطلقا حرام ہے جس کی حرمت محتاج دلیل نہیں۔

۶- تربیت اولاد کے لئے غیر مسلم ملکوں میں اجتماعی اور انفرادی زندگی میں مضبوط علم دین اور مضبوط تربیت کا انتظام

فرض ہوگا، ورنہ صورت اور نام کے اعتبار سے بظاہر اولاد مسلمان ہوگی اور انجاماً کافر ہوگی، جو اہل تجربہ پر مخفی نہیں۔

۷- غیر مسلم ملکوں میں مسلمانوں کے قیام کی اجازت "**تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الإثم والعدوان**" (سورۂ مائدہ:۲) کے اصول پر ہوگی، یعنی مسلمانوں کے لئے اجتماعی یا انفرادی ہر قسم کے نقصانات والی ملازمت اختیار نہ کرنا ضروری ہوگا۔

☆☆☆

پانچواں باب

اختتامی امور

مناقشہ:

شہریت اور اس سے متعلق مسائل

مولانا عتیق احمد بستوی:

ماشاء اللہ آپ حضرات نے بڑی توجہ کے ساتھ عرض مسئلہ سنا اور اب انشاء اللہ آپ کی باری ہے، اس موضوع پر جو سوالات اٹھائے گئے ہیں وہ بھی آپ کے سامنے ہیں اور جو آراء پیش کی گئی ہیں وہ بھی آپ کے سامنے ہیں، میری درخواست یہ ہے کہ جو حضرات اظہار خیال فرمانا چاہتے ہیں، کوئی نئی بات پیش کرنا چاہتے ہیں وہ اپنا نام کسی کاغذ پر لکھ کر رضا کار آپ کے اردگرد موجود ہیں ان کے ذریعہ یہاں بھیج دیں۔

میرے بزرگو اور دوستو! مسئلہ بہت ہی اہم اور نازک ہے، مولانا اختر امام عادل صاحب نے جو عرض پیش کیا اس میں اس بات کو انہوں نے بیان کیا ہے کہ آج ہم جس صورتحال سے دوچار ہیں وہ مغلوبیت کی صورتحال ہے، غلبہ کی صورتحال ہوتی تو ہمارے اختیار میں ہوتا اور ہم اسلام کی جو اصل تعلیم ہے اس کی روشنی میں غور کرتے کہ کیا سسٹم ہونا چاہئے، کیا نظام ہونا چاہئے، مگر حقیقت حال یہ نہیں ہے، اس لئے یہ بھی ہماری نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونا چاہئے۔ میں آپ سے یہی عرض کروں گا کہ جو ہماری اصل تعلیمات ہیں جس کو کہ ہمیں برپا کرنا ہے، نافذ کرنا ہے وہ بھی ہمارے ذہنوں کے اندر رہو اور اس کی چھاپ ہماری تحریر کے اندر ہو اور مغلوبیت کی بنیاد پر جو صورتحال ہے اس کا بھی لحاظ کرنا ضروری ہے، ان دونوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں تجاویز مرتب کرنی ہے، ایک خاص بات یہ ہے کہ آپ حضرات صاحب علم ہیں اور آپ کو معلوم ہے کہ بنوامیہ کے دور تک دارالاسلام کی وحدت رہی، خلافت راشدہ اور خلافت بنوامیہ جب تک رہی تب تک دارالاسلام گویا ایک تھا اور عالم اسلامی ایک تھا اور اس کے بعد بنوعباس کے دور میں جب اندلس میں مسلمانوں، یعنی امویوں کی حکومت قائم ہوئی تو اس وقت سے گویا دو مسلم ملک اس طرح سے قائم ہوئے اور اس وقت فقہاء نے اس پر گفتگو کی اور کافی بحث کی کہ کیا دو دارالاسلام ہوسکتے ہیں یا نہیں، اس تعلق سے سب بحثیں آپ کے سامنے ہیں، رہی بات دارالحرب میں تعدد کی تو اس کی تو فقہاء نے صراحت کی ہے، لیکن دارالاسلام میں بھی کیا تعدد ہوسکتا ہے؟ اور میراث کے موضوع پر آپ جب مطالعہ کرتے ہیں تو تباین

دار اور تباین مذہب کے مختلف اسباب آپ کے سامنے آتے ہیں، تباین دار کی بحث میں اب بھی ہم شاید فتوی دیتے ہیں کہ اگر دو مسلمان دو مسلم ملکوں میں رہتے ہیں تو دونوں ایک دوسرے کے وارث ہوں گے، اور اس طرح کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں جو ہمارے ذہن میں ہیں ان سب پر ہم کو روشنی ڈالنی ہے اور یہ جو وطنیت کا مسئلہ ہے یا شہریت کا اس کو جوڑنا وطن اصلی وطن اقامت سے یہ مجھے کچھ خلط ملط سی بات لگتی ہے، وطن اصلی اور وطن اقامت کی گفتگو بالکل الگ چیز ہے اس سے کچھ استیناس کریں وہ الگ مسئلہ ہوا، لیکن اصل جس موضوع پر ہم گفتگو کر رہے ہیں کہ شہریت کی بنیادیں کیا ہیں اور کیا ہوسکتی ہیں شرعا، یہ مسئلہ اور پھر فقہاء نے جو بحث کی ہے مسافر کے احکام اور وطن اصلی اور وطن اقامت کے احکام کہ شادی کرنے سے وطن اصلی بن جاتا ہے اور پیدائش سے وطن اصلی بن جاتا ہے وہ ظاہر ہے کہ وہ وطنیت اور شہریت کے معنی میں نہیں ہے، اس لئے اس مسئلہ سے زیادہ استیناس شاید مناسب نہ ہوتو اس پر بھی ہم توجہ فرمائیں۔

لیکن صورتحال یہ ہے کہ عالم اسلام کی اجتماعیت تو بکھر گئی یہ واقعہ ہے اور ہم مغلوبیت کے دور میں ہیں، لیکن اس وقت جو حالات ہیں اور صورتحال ہے دنیا کی کہ آج جو مسلمانوں کے اجتماعی مفادات ہیں دینی ہوں، سماجی ہوں یا سیاسی ہوں وہ سارے خطرے میں ہیں اور مسلم ملکوں میں کوئی ایسا اتحاد نہیں ہے کم سے کم مسلمانوں کے معاملات پر کچھ موضوعات پر دباؤ ڈال سکے، پریشر ڈال سکے اور ان کا تحفظ کر سکے اور شہریت کا مسئلہ بھی مجھے کہنے دیجئے کہ شہریت کے مسئلہ میں جتنی تنگی ہمارے مسلم ممالک میں ہے مغربی ملکوں میں نہیں ہے، امریکہ ہو، یا کناڈا ایک آدمی وہاں جاتا ہے رہتا ہے محنت کرتا ہے کچھ دنوں میں اس کو حق مل جاتا ہے وہ وہاں کا شہری ہوجاتا ہے اور اس کو سارے حقوق حاصل ہوجاتے ہیں، لیکن یہ واقعہ نہیں ہے کہ مسلم نسلیں گذر جاتی ہیں کسی مسلم ملک میں آباد ہوئے ایک نسل دو نسل اور شہریت سے محروم رہتے ہیں، ظاہر ہے یہ کھلا ہوا ظلم ہے، ان حالات کا بھی ہمیں تجزیہ کرنا چاہئے اور ہمیں اپنے فیصلوں اور تجاویز میں اس پر کچھ نہ کچھ ضرور کہنا چاہئے، ظاہر ہے کہ اس وقت جو شام کی صورتحال ہے شام سے بڑی تعداد میں پناہ گزیں ترکی میں اور آس پاس میں لاکھوں کی تعداد میں، ان کے جو حالات ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں ظاہر بات ہے یہ بھی مسئلہ ہے کہ ان سارے لوگوں کو شہریت دینا اس کے جو تقاضے ہیں اس کے جو لوازمات ہیں آسان نہیں ہے، یہ مجبوری بھی ہے، لیکن جب تک جہاں تک ممکن ہو کرنا چاہئے، پاکستان کا مسئلہ جب افغانستان پر حملہ ہوا تو لاکھوں کی آبادی منتقل ہوئی پاکستان میں کتنے دنوں تک رہی اور اب بھی کچھ نہ کچھ لوگ ہیں کچھ مسائل ایسے ہیں جو مسلمانوں کے اجتماعی مفادات سے متعلق ہیں، ٹھیک ہے خلافت نہیں، اجتماعیت نہیں، لیکن ایسا کچھ تو ہونا چاہئے کہ مسلم ملک جو اسلامی ممالک کہلاتے ہیں وہ جو عالمی مسائل ہیں ان پر ان کی کچھ تو آواز ہو؟ وہ اس پر کچھ دھیان دیں، بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ جو چیز یہاں سے پیش کی جائے گی اس میں تمام اہل علم کی آراء اور مبتلا بہ کے حالات کا جائزہ ہوگا

اوراس کی کچھ رہنمائی ہوگی اور ہماری جو مجبوریاں ہیں انشاء اللہ اس کو بھی ہم پیش نظر رکھیں گے، اس سلسلہ میں انشاء اللہ ہم کچھ کریں گے، **قد جاء فينا ضيفنا المكرم الدكتور عز الدين بو زغيبه رئيس قسم الدراسات والنشر والشئون الخاصة لمركز "جمعه الماجدالامارات العربية المتحده" نرحبه ترحيباً حاراً، وهكذا نرحب الشيخ هاشم الندوی ، إن شاء الله سوف نستفيد من خطابه فی اليوم الآتی ، نرحبه ترحيباً حاراً**۔ اب میں دعوت دیتا ہوں مولانا شاہین جمالی صاحب کو۔

مولانا شاہین جمالی:

میں سمجھتا ہوں کہ فقہاء کے سارے احکام خلیفۃ المومنین، امیر المومنین یا امام المومنین سے متعلق ہیں، اب جبکہ دنیا کے نظام سیاسی میں صرف دو نظام رائج ہیں کنگڈم یا سیکولر ڈیموکریسی اور کوئی مسلم ملک اسلامی ملک نہیں ہے، ایسی صورتحال میں ہماری یہ ساری بحثیں کیا کچھ افادیت ومعنویت رکھتی ہیں اور کیا ان جزئیات کا انطباق ان مسلم ملکوں پر بھی ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اس کو واضح کیا جائے۔

مولانا عثمان گورینی:

مجھے اسلامی مملکت میں پناہ گزینوں اور قدیم شہریوں کے مابین امتیاز کے معاملہ میں بات کرنی ہے، یعنی سیاسی پناہ جو محدود مدت کے لئے لی جاتی ہے جس میں یہ شرط ہوتی ہے کہ اگر ان کے ملک کے حالات درست ہوجائیں گے تو لوٹ جائیں گے ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں ان پناہ گزینوں کی مہمانوں کی حیثیت ہوگی اور اس پر جو استدلال کیا گیا ہے وہ بہت ہی کمزور روایت سے کیا گیا ہے، مجھے اسی سلسلہ میں کچھ عرض کرنا ہے وہ یہ کہ جو لوگ کسی مسلم ملک میں پناہ گزیں کی حیثیت سے مقیم ہوجائیں ان کے درمیان اور وہاں کے مستقل باشندوں کے درمیان فرق وامتیاز کرنا شرعاً درست نہیں معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ آپ ﷺ اور آپ کی تعلیمات یہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم مسلم ملک میں مقیم ہوجائے اور وہاں کا مستامن ہوجائے تو اس کے لئے اکثر معاملات میں چند مذہبی معاملات کو چھوڑ کر اس ملک کے مستقل باشندوں کا حکم اختیار کرلیتا ہے اور اس کو تمام وہی حقوق حاصل ہوتے ہیں اور تمام وہی فوائد حاصل ہوتے ہیں اور تمام احکام بھی وہی حکم عائد ہوتے ہیں، جیسا کہ کتب فقہیہ میں اس کی صراحت ہے تو اس سے بدلالۃ النص یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسلم مسلم ملک میں پناہ گزیں ہوجائے وہاں کی وطنیت اختیار کرلے یا وہاں رہائش پذیر ہوجائے تو اس کو بھی وہی حقوق حاصل ہونے چاہئیں، یہ فرق کرنا کہ نہیں وہ مہمان ہے اور یہ مستقل شہری ہے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

اور جس روایت سے اس کا استدلال کیا گیا ہے اس کا تعلق بھی اس سے نہیں ہے، کیونکہ اگر کوئی جہاد میں شریک ہو

اس میں معاون ہوتو اس کو مال فیئ میں حصہ ملتا ہے اور جس کا دور کا واسطہ نہیں ہے وہ اس کا حقدار نہیں ہے، اس لئے کہ مال غنیمت میں حصہ ملنا اور مال فیئ میں حصہ ملنا اس کی معاونت پر ہے، اس لئے اس کا حقدار ہے، لیکن جو لوگ اس میں معاون نہیں ان کو حصہ کیسے مل سکتا ہے؟ اور دوسری بات مجھے یہ کہنی ہے کہ اسرائیل کی شہریت اختیار کرنا یہ درست نہیں ہے تو اس کے حکم میں مجھے کوئی اختلاف نہیں، کیونکہ اسرائیل کے ذریعہ سے مسلمانوں پر ظلم وتعدی کی جاتی ہے تو جو لوگ اس کا حصہ بنیں گے وہ اس میں معاون بنیں گے اس میں شریک ہوں گے، اس لئے جائز نہیں، یہ بات اپنی جگہ درست ہے، لیکن جو دلیل دی گئی ہے وہ دلیل بڑی عجیب سی لگتی ہے، اس لئے کہ مسلمانوں کی زمین غصب کر کے قائم کی گئی ہے یہ ریاست اس میں تو کوئی فقہاء کی صراحت ہے کہ تغلب غیر مسلمین سے ان کی ملکیت ثابت ہوجاتی ہے، پھر اس پر یہ مسئلہ کہنا کہ ان کی ملکیت الگ ہے اور ان کی ملکیت غصب کی ہے، اس لئے وہاں قیام صحیح نہیں ایسے تو پھر کسٹوڈین کا مسئلہ اٹھ جائے گا اور پھر ہندوستان میں بہت زمین مسلم نوابوں کی زمینداروں کی سب زمینیں ان سے لے لی گئیں تو اب ان کی شہریت خطرے میں پڑ جائے گی کہ اس کی شہریت اختیار کرنا جائز نہیں، اس لئے مجھے دلیل پر اشکال ہے اس کے حکم پر کوئی اشکال نہیں ہے۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام صدیقی صاحب:

مجھے مولانا اختر امام عادل صاحب سے بڑے ادب کے ساتھ ایک بات یہ کہنی ہے کہ آپ نے جو ہماری رائے لکھی وہ ہم نے جمال الدین بن عطیہ کی کتاب جس کا ترجمہ مولانا عتیق صاحب نے کیا ہے، ان کا قول نقل کیا ہے، لیکن ہم نے اپنی رائے اس کے نیچے چار پانچ سطروں کے بعد لکھی ہوئی ہے اور خلاصہ جوابات میں بھی لکھا ہوا ہے، اس لئے صفحہ دو اور صفحہ چھ پر ہماری رائے موجود ہے، محترم موصوف نے ہماری رائے دوسری لکھی، بڑے ادب کے ساتھ ان سے درخواست ہے۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

بہتر بات ہے، اور بھی بعض حضرات کی تحریر آئی ہے مولانا اختر امام عادل صاحب کے عرض کے متعلق، اور بھی جن لوگوں کا احساس ہو عرض کے سلسلہ میں وہ لکھ کر دیدیں، تاکہ آئندہ عرض کی اشاعت کے وقت اس کی تصحیح کر لی جائے۔

مولانا ولی اللہ مجید قاسمی:

السلام علیکم، میں جو کہنا چاہ رہا تھا مولانا عتیق صاحب نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے، کہ وطنیت یا شہریت کا جو مفہوم ہے ظاہر ہے کہ مغرب کی طرف سے ایجاد کردہ ہے اور یہ اسٹیٹ کی بالادستی اور حکمرانی سے مربوط ہے، علامہ اقبال نے کہا تھا:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے

جو پیرہن ہے اس کا وہ ملت کا کفن ہے

اس لئے اس کے لئے اسلام یا کتاب وسنت میں بنیادیں تلاش کرنا اور یہ کہنا کہ نہیں کتاب وسنت میں اس کی نظیریں موجود ہیں یہ صحیح نہیں ہے، زیادہ سے زیادہ بس یہی کہا جاسکتا ہے کہ ہم لوگ مقہوری یا مغلوبی یا مجبوری کی زندگی گزار رہے ہیں، اس میں کچھ استثنائی شکلیں ہوسکتی ہیں، ظاہر ہے کہ ہم کیا کرسکتے ہیں، اس لئے چار وناچار اس کو ماننا ہی ہے، دوسرے یہ کہ انہوں نے جو حدیث نقل کی ہے صحیح مسلم کے حوالہ سے، میرا خیال ہے کہ انہوں نے حدیث کاٹ دی ہے، کیونکہ اصل مفہوم کچھ خلط ہوگیا ہے یا خبط ہوگیا ہے، حدیث میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ جب تم غیر مسلموں کے پاس جاؤ تو ان کو تین باتوں کی دعوت دو ایک تو یہ ہے کہ تم ان کو اسلام قبول کرنے کے لئے کہو اور اسلام قبول کرنے کے بعد انہیں آمادہ کرو کہ وہ مدینہ آجائیں شارح لکھتے ہیں کہ یہ حکم اس وقت تھا جب مدینہ کی طرف ہجرت کرنا لازمی وضروری تھا، اور پھر ان کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ وہ اعرابی ہجرت نہ کریں تو ان کو کہا گیا ہے اعراب المسلمین، لیکن مدینہ کے جو مہاجرین ہیں ان کو یہ حکم حاصل نہیں ہوں گے، یعنی مال غنیمت وفیئ میں سے نہیں ملے گا اس کے بعد کہا گیا ہے کہ وہ اگر مدینہ آجائیں تو ان کو تمام حقوق حاصل ہوں گے اور پھر یہ کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو ان کو ذمہ کے لئے کہا جائے، ان تین چیزوں کی دعوت دینے کی بات کہی گئی ہے، تو حدیث پوری نقل کی جاتی تو شاید یہ اشکال نہ ہوتا کسی کو۔

مولانا ظہیر احمد کانپور:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، مجھ کو دو چیزوں سے متعلق بولنا ہے، ایک یہ ہے کہ شہریت کی بنیاد کیا ہے؟ دوسرا حقوق شہریت کے سلسلہ میں، ظاہر ہے کہ موجودہ دور میں جو شہریت وغیرہ کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے، جسے ہم یہاں پر استعمال کررہے ہیں، اس میں شہریت الگ چیز ہے اور نیشنلٹی الگ چیز ہے، جو شہری حقوق ہیں وہ اصل میں شہریت سے ہی متعلق ہیں یہاں پر ہماری جو بحث ہورہی ہے، اس میں دونوں چیزیں الگ الگ ہیں، دونوں میں کافی فرق ہے، لیکن اصل میں یہاں پر دونوں مل گئے ہیں، لیکن بہرحال جو پہلی چیز ہے یعنی شہریت جس کو ہم بنیاد مان رہے ہیں، موجودہ دور کے اعتبار سے تو ظاہر ہے کہ وہ فرد اور حکومت کے درمیان رشتے کا نام ہے اور جس کو ہمارے پروفیسر صاحب نے بھی ذکر کیا ہے وہ دراصل علاقائیت پر مبنی ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اصل بنیاد علاقائیت ہے، کسی بھی چیز میں، اب اس میں جو خونی رشتے ہیں یا دیگر چیز ہے یا رجسٹریشن ہے یا کچھ دن سکونت پذیر وہاں پر رہنا ہے یہ بھی صرف علاقائیت ہی کی بنیاد پر ہوتی ہے، تو یہ تو موجودہ دور میں اصل میں علاقائیت ہے لیکن اسلام میں اگر دیکھا جائے تو اس میں شہریت یا جنسیت کی بنیاد اسلام کا غلبہ قبول کرلینا ہے، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی شرط اور کوئی قید نہیں ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ کے دور میں بھی وہاں مسلمان بھی رہتے

تھے، اور غیر مسلم بھی رہتے تھے ایسا نہیں ہے کہ اسلامی حکومت قائم ہوجانے کے بعد میں سارے غیر مسلموں کو وہاں سے نکال دیا گیا ہو، بلکہ وہ عقد ذمہ کے تحت میں رہا کرتے تھے تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جو بنیاد ہے وہ اسلام کا غلبہ قبول کر لینا ہے، ظاہر ہے کہ مسلمان تو مانتا ہی ہے، جب ہی وہ مسلم ہوگا، لیکن غیر مسلم بھی اس میں شریک ہوجائیں گے جب وہ عقد ذمہ کریں گے تو وہ بھی اس کا حصہ بن جائیں گے، تو اصل بنیاد یہ ٹھہری کہ کوئی شخص اسلام کی طاقت کو قبول کر لے تو وہ غیر مسلم گویا شہری ہوسکتا ہے، یہ تو ہے جس کو ہم جنسیت یا نیشنلٹی کے معنی میں موجودہ دور کے تقابل میں اسلام کے نقطہ نظر سے بنیاد مان سکتے ہیں، اور دوسری چیز جہاں تک حقوق شہریت کی بات ہے تو وہ جو جملہ حقوق ہیں جو تمام شہریوں کو حاصل ہوں گے اس میں ہمارے یہاں فرق ہے مسلم اور غیر مسلم میں، وہ فرق یہاں پر آتا ہے کہ انسانی بنیادوں پر جو شہری حقوق ہیں اس میں تو سب شریک ہوں گے، لیکن غیر مسلموں کے لئے حکومت چلانے کے حق کا جہاں تک تعلق ہے، غیر مسلم اس میں شریک نہیں ہوگا، کیونکہ ہمارے یہاں انسان خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اور حکومت الٰہیہ میں وہ نائب کے درجہ میں ہے وہ اسلامی احکام کو نافذ کرنے والا ہے تو اس کے اندر تو ایمان کی شرط ہمارے یہاں ہے، لہذا اس میں غیر مسلم شریک نہیں ہوسکتا ہے، گویا شہری حقوق میں تو بحیثیت بشر غیر مسلم بھی شریک ہوں گے، اور حکومت کے جو دیگر عہدے ہیں موجودہ دور میں اس میں بھی وہ شریک ہوں گے، لیکن اسلام کی جو کی پوسٹیں (Key Posts) ہیں اور امیر المؤمنین ہونا ہے اس کے اندر غیر مسلم شریک نہیں ہوسکتا۔

مولانا احمد نور عین قاسمی:

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ، چند وضاحتیں اور چند سوالات ہیں، عرض مسئلہ میں جس طرح میرا موقف بیان کیا گیا اس سے ایسا لگ رہا ہے کہ میں اسلام میں شہریت کا بالکل ہی مخالف ہوں، ایسا نہیں ہے، بلکہ میں نے بھی اسلام میں شہریت کی بنیادوں کو قبول کیا ہے، ہاں مروجہ شہریت کی بنیاد چونکہ سیکولرائزیشن ہے، لہذا اس کی اسپرٹ اور روح نیشنلٹی ہے، اس لئے میں نے مروجہ شہریت کے نظام کو من وعن قبول کر لینے کو قبول نہیں کیا ہے، دوسری وضاحت یہ ہے کہ عرض مسئلہ میں کہا گیا ہے کہ رجسٹریشن اور شہریت میں کوئی فرق نہیں ہے، حالانکہ میں نے جو بات لکھی ہے رجسٹریشن کے سلسلہ میں وہ ہے اقامت کے سلسلہ میں رجسٹریشن، یعنی اقامت موبدہ کے سلسلہ میں رجسٹریشن کا پابند ہونا کے سلسلہ میں کہی ہے کہ اگر مسلم حکومت چاہے تو رجسٹریشن کا پابند بنا سکتی ہے، اس کی گنجائش ہے، جبکہ شہریت کا تصور ہے اور اس کا مکمل کنسپٹ ہے اس میں اس کے حقوق اور فرائض ہیں اس کے قبول کرنے کے اور اس کے منسوب ہونے کے پورے اصول ہیں تو اس طرح رجسٹریشن اور شہریت میں فرق ہے، ایک اور وضاحت ہے کہ مسلم مملکت میں عرض مسئلہ میں کہا گیا کہ ہمیں مغلوبیت کے دور کو دیکھنا چاہئے

کہ بنو امیہ کے دور میں جب مسلم مملکت کا تعدد ہوگیا تھا اس کو دیکھنا چاہئے تو عرض یہ ہے کہ اس وقت مسلم مملکت کا تعدد ضرور ہوگیا تھا، لیکن شہریت کا تعدد نہیں ہوا تھا، دوسری بات یہ ہے کہ کیا مسلم ملک کے تعدد کو کیا فقہاء نے قبول کیا ہے؟ چند کے علاوہ کسی نے قبول نہیں کیا۔

دو سوالات ہیں، پہلا یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے بھی کہا کہ شہریت میں مروجہ نظام شہریت کی بنیاد سیکولرائزیشن ہے، ہم نے عرض مسئلہ میں جو باتیں دیکھیں اس میں ہم نے دیکھا کہ فقہاء نے عقد ذمہ کے سلسلہ میں غیر مسلموں کو شہری بنانے کے سلسلہ میں جو باتیں اور بنیادیں لکھی ہیں ہم نے بھی مسلمانوں کو شہری بنانے کے سلسلہ میں وہی باتیں لکھی ہیں، تو کیا یہ سیکولرائزیشن نہیں ہے؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ شہریت کے سلسلہ میں جو سوالات کئے گئے اس کا تعلق کس سے ہے، حکومت سے یا عوام سے، اگر عوام سے ہے تو ''الضرورات تبیح المحظورات'' کے دائرہ میں بہت سی باتیں جائز ہو جاتی ہیں، اگر حکومت سے ہے تو پھر معذرت خواہانہ انداز مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

آخری نام جو میرے پاس آیا تھا وہ یہ ہے، آپ حضرات کی گفتگو ہوگئی ہے اور اب مولانا خالد سیف اللہ صاحب اظہار خیال فرمائیں گے، میں درخواست کرتا ہوں کہ وہ اظہار خیال فرمائیں، کسی اور کو اظہار خیال کرنا ہو تو ابھی ہمارے پاس وقت ہے، مجھے حیرت ہے کہ اتنے مختصر نام کیوں آئے، آپ سب نے پورا موضوع پڑھ لیا ہے، تلخیصات پڑھ لیے اور عرض پڑھ لیا، نقصان تھوڑا ہمارا ہوگیا کہ مناقشہ کم ہوگیا۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی:

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، یہ بڑا اہم اور نازک موضوع ہے، اور بین الاقوامی اور عالمی حالات سے اس کا تعلق ہے، اور ہماری شہریت فرد کے لئے بھی ہے، محلّہ کے لئے اور شہرت کے لئے بھی اور پورے عالم کے لئے بھی، اس لئے علماء ایسے مسائل سے دست کش نہیں ہوسکتے، اسی پس منظر میں یہ عنوان رکھا گیا ہے، آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ سوالنامہ میں ابتدائی چار سوالات اور ساتواں سوال، یعنی پانچ سوالات ان کا تعلق حکومت سے ہے، اور دو سوالات جو سوال نمبر ۵ اور ۶ ہے اس کا تعلق افراد سے ہے، ہمیں کسی مسئلہ پر رائے قائم کرتے ہوئے اس کے پس منظر کو بھی سامنے رکھنا چاہئے اور موجودہ حالات بھی ہمارے پیش نظر ہونے چاہئیں، ہماری فقہ کی کتابوں میں مستقل ''کتاب السیر'' کے عنوان موجود ہیں، لیکن آپ دیکھئے کہ وہاں شہریت کے موضوع پر کوئی خاص بحث نہیں کی گئی ہے، یہاں تک کہ مسلم ممالک ہی نہیں غیر مسلم ممالک تک کا حال یہ ہے کہ خود ہندوستان میں ہندوستان کے جنوبی علاقہ سے بحیثیت داعی جو مسلمان یہاں آئے، کہیں ان کو ملک میں شہریت کے

لئے درخواست دینی نہیں پڑی، یعنی شاید اس جدید جمہوری دور کے مقابلہ اس زمانہ میں انسانی قدریں زیادہ زندہ تھیں، اور انسانوں کو انسانوں سے درندوں کی طرح خوف نہیں کھائے جاتا تھا، بلکہ ان کا استقبال کیا جاتا تھا، اس وقت جو سوالات ہمارے درمیان اٹھ رہے ہیں وطنیت کے، یہ دراصل موجودہ مغربی نظام کا پیدا کیا ہوا ہے۔

اور میرا خیال ہے کہ مغربی ممالک نے بیک وقت اس سے دو فائدے اٹھائے ہیں: ایک طرف اس نے اسے اپنے درمیان اتحاد کا ذریعہ بنایا اور دوسری طرف اس کو عالم اسلام میں تفریق کا ذریعہ بنایا، جب چرچ اور عوام کے جنگ میں اور حکومت کی جنگ میں جب یہ بات طے ہوگئی کہ مذہب کا سیاست میں کوئی رول نہیں ہوگا، تو اہل مغرب کے پاس کوئی ایسی چیز باقی نہیں رہ گئی جو ان کے لئے نقطہ اتحاد بن سکے، جو ان کے مختلف طبقات کو متحد کرسکے تو انہوں نے وطنیت وقومیت کو بڑھاوا دیا، عالم اسلام میں چونکہ مذہب مسلمانوں کی وحدت کی بنیاد تھی، اسی لئے اسی قومیت کو اسی تصور کو انہوں نے مسلمانوں میں تفریق پیدا کرنے اور چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم کرنے کا ذریعہ بنایا، علامہ اقبال کا یہ شعر جو ابھی ہمارے دوست مولانا ولی اللہ مجید قاسمی نے پڑھا کہ

”ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے“

اسی پس منظر میں علامہ اقبال نے یہ شعر کہا ہے، اور آپ محسوس کرسکتے ہیں کہ خلافت عثمانیہ کا سقوط اسی بنیاد پر ہوا اور اس کا منحوس سایہ آج تک عالم اسلام پر موجود ہے، دنیا کے جو حالات ہیں ان کو بھی سامنے رکھنا چاہئے، بعض مسلم ممالک یہاں تک کہ بعض خلیجی ممالک ایسے ہیں جہاں بہت سے ایسے بے آسرا لوگ ہیں جن کے پاس ضابطہ میں کہیں کی شہریت حاصل نہیں ہے، کسی خاص ملک سے ان کا پس منظر تھا اور پرانا تعلق تھا وہاں کی حکومت سے یہاں کی حکومت کا کچھ اختلاف ہوگیا وہاں کے قدیم باشندوں کو نکالا نہیں گیا، لیکن ان کی شہریت ان سے چھین لی گئی۔

ابھی ہمارے ایک دوست نے اس آیت سے استدلال کیا جو مہاجرات کے سلسلہ میں ہے: ”**فامتحنوهن الله أعلم بإيمانهن**“ (سورۂ ممتحنہ: ۱۰)، ان کا امتحان لو، لیکن کیا یہ امتحان ایمان تھا یا امتحان وفاداری تھا؟ کیا قرآن نے یہ حکم دیا کہ ان کی وفاداری کا امتحان لو؟ علماء نے تو یہ کہا کہ ان کا امتحان لو کہ کیا واقعی وہ مسلمان ہیں، یا مسلم معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے کے لئے اور فساد پیدا کرنے کے لئے تو داخل نہیں ہوئی ہیں، لیکن آج حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں پر عالم اسلام کی زمین جتنی تنگ ہے دنیا کی کوئی زمین اتنی تنگ نہیں، اور یہ مغرب کا ایک فتنہ ہے جس کا صور اس نے عالم اسلام میں پھونکا ہے، چھوٹے چھوٹے ممالک ہیں بڑے بڑے وسائل ہیں ان کو ہدایت دی جاتی ہے کہ آپ مسلمانوں کو اور نئے لوگوں کو زیادہ شہریت نہیں

دیں گے، ورنہ آپ کا تشخص ختم ہو جائے گا، آپ کی شناخت مٹ جائے گی، آپ کے یہاں ارہاب پیدا ہوگا، دہشت گردی پیدا ہوگی، مقصود یہ ہے کہ جو مالی وسائل ہیں چھوٹے چھوٹے ملکوں کے پاس، جو عالم اسلام میں جو ملک طاقت حاصل کر سکتے ہوں یہ وسائل ان تک نہیں پہنچے، تو یہ صورتحال ہے، وطنیت کے بڑھے ہوئے تصور میں، آپ دیکھئے برما میں کیسے قیامت برپا ہوئی اعداد وشمار کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ برما کے مسلمانوں کی جانیں وہاں کے ظالم حکمرانوں کے ظالمانہ رویہ کی وجہ سے زیادہ گئی یا پڑوسی مسلم مملکت کی بے اعتنائی کی وجہ سے زیادہ گئی، پوری پوری کشتیاں ڈبو دی گئیں سمندر میں، تو یہ ٹھیک ہے کہ ہمارے موجودہ حالات کیا ہیں، اور اس لحاظ سے ہمیں کیا عمل کرنا چاہئے، لیکن ہمیں اسلام کا جو بنیادی تصور ہے اس سلسلہ میں وہ پیش کرنا چاہئے، جیسا کہ حضرت مولانا عتیق صاحب نے فرمایا عباسی دور اور عباسی دور میں بھی اندلس میں جو اموی حکومت قائم ہوگئی اس سے پہلے پورا عالم اسلام متحد تھا، قاضی ابوالحسن ماوردی وغیرہ نے ''الاحکام السلطانیہ'' میں جب تعدد وطن کی بحث کی ہے انہوں نے بھی جو بنیاد بنایا ہے وہ بیچ میں سمندر کے حائل ہونے کو، کہ اگر دو الگ الگ خطوں میں دو مسلم حکومتیں قائم ہو جائیں اور بیچ میں سمندر حائل ہو یا کوئی ایسی چیز حائل ہو جس کی وجہ سے بیک وقت دونوں ملکوں کے نظام کو نہ دیکھا جا سکتا ہو تو وہاں اس کی گنجائش ہے کہ ایک سے زیادہ مملکت کو تسلیم کر لیا جائے۔

تو میں سمجھتا ہوں کہ اب سب سے بڑا مسئلہ عالم اسلام میں شہریت کے سلب کر لینے کا ہے، دیکھئے حضرت ابوذر غفاریؓ کے واقعہ کو وہ حجر کا واقعہ ہے شہریت ختم نہیں ہوئی تھی، ایسا نہیں تھا کہ ان سے کوئی ایسا معاہدہ ہوا ہے حجر کا ہے جو آپ پڑھتے ہیں کہ کن حضرات پر حکومت کو بعض اوقات مصلحت کی بنا پر حجر کی اجازت ہے، تغریب، حبس یہ تو ملتے ہیں ہماری فقہ کی کتابوں میں، لیکن کسی مسلمان کو مسلمان ہونے کے باوجود حکومت سے کسی خاص موقف پر اتفاق نہ ہونے کی بنا پر اس کو شہریت سے محروم کر دیا جائے اس کا میں نہیں سمجھتا کہ ہماری فقہ کی کتابوں میں کوئی ذکر بھی ہے، ہمیں ہمیشہ احکام پر رائے دیتے ہوئے میں سمجھتا ہوں کہ حالات کو ذہن میں رکھنا چاہئے، ہمارے بہت ہی قابل احترام دوست نے اسرائیل کے بارے میں کہا کہ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ وہاں کی شہریت نہیں لینی چاہئے، لیکن جن فلسطینی کو اسرائیل سے اجاڑ دیا گیا ہے اور جن کو اسرائیل شہریت دینا نہیں چاہتا ہے اس کے بارے میں آپ کیا کہیں گے؟ اسرائیل تو چاہتا ہے کہ اس ملک کا نقشہ ایسا تبدیل ہو جائے کہ ہم عربوں کو مغلوب کر چکے ہیں اب مغلوب تر ان کو بنا دیں، ان کے ثقافتی ورثہ کو مٹا دیں، ان کی تاریخ کو مٹا دیں، ان کی پہچان اور شناخت کو ختم کر دیں، کیونکہ ان کا تصور یہ ہے کہ یہ خدا کی زمین ہے کہ جس کو اسرائیل کے لئے دی ہے جس کو حضرت یعقوبؑ اور حضرت اسحاقؑ کی اولاد کے لئے دی ہے، تو ہمیں رائے قائم کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ فقہاء نے جو استیلاء کا حکم بیان کیا ہے اس کا مطلب استعمار کو قبول کرنا نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق انفرادی معاملات سے

ہے، کسی نے کسی دشمن فوج نے کسی چیز پر قبضہ کرلیا اور وہ چیز فروخت ہوتے ہوئے ہم تک پہنچ گئی اس کو مال مغصوبہ سمجھیں یا مال مملوکہ سمجھیں، لیکن ہم استعمار کو جواز بخش دیں جو ہماری زمین ہے جو عالم اسلام کا علاقہ ہے اگر کوئی بالا دست طاقت جور وظلم کے ذریعہ اس پر قابض ہو جائے تو اس کی ملکیت قبول کرنے کو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اپنے آپ کو نقصان پہنچانے والی بات ہوگی، تو میری گزارش کا منشا صرف یہ تھا کہ یہ واقعی بہت اہم مسئلہ ہے ہمارے یہاں سے ایسی تجویز منظور ہونی چاہئے جس میں عالم اسلام کے لئے بھی ایک پیغام ہو اور جس میں مسلمانوں کے لئے بھی ایک پیغام ہو، کہ ان کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟ خاص کر غیر مسلم ممالک کی شہریت کے سلسلہ میں کیا رویہ ہونا چاہئے اور ہم کو اس فکری پس منظر کو اور آج کے دور کے تاریخی پس منظر کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے، آپ کو معلوم ہے کہ خلافت عثمانیہ کو یعنی ترکوں کی حکومت جو اخیر میں باقی رہی اس میں یہ شرط لگائی گئی کہ آپ خلافت کو زندہ نہیں کریں گے، کیونکہ ان کو مسلمانوں کے اتحاد سے زیادہ کسی چیز سے بغض نہیں تھا، اور مسلمانوں کے اختلاف سے زیادہ کسی چیز سے مسرت نہیں تھی۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

اللہ کا فضل ہے کہ بہت ہی فکر انگیز باتیں اور بنیادی باتیں آپ کے سامنے آئیں، اور شاید آپ حضرات کو معلوم ہو کہ اسرائیل تنہا وہ ملک ہے جس کا ہر یہودی شہری ہے، خواہ وہ امریکہ میں ہو یا کناڈا میں ہو یا ہندوستان میں ہو اس کی شہریت وہاں محفوظ رہتی ہے کہ وہ اسرائیل کا شہری ہے، مذہب کی بنیاد پر، ہمارے یہاں صورتحال جو ہے وہ آپ کے سامنے ہے، مولانا نے فرمایا کہ تاریخی پس منظر کو اور حالات کو بھی سامنے رکھنا ضروری ہے، بہت بنیادی چیز ہے، خلافت عثمانیہ کے خاتمہ کے بعد علامہ اقبال نے جو کہا تھا کہ

چاق کردی ترک ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

تو کیا کچھ اس کے بعد ہوا اور جو کچھ عالم اسلام میں ہو رہا ہے اسی منحوس قدم کا اثر ہے کہ اب جو ملک بڑے بڑے ہیں ان کو بھی حصہ بخرہ کرنا ہے، چھوٹے چھوٹے ہو گئے تو ہو گئے، اب مزید جو بڑے بڑے دکھتے ہیں ان کو بھی حصوں میں بانٹنا ہے، تو یہ سارے حالات ہمارے ذہنوں میں ہونے چاہئیں اور میرے پاس کئی کاغذات ایک ساتھ آئے ہوئے ہیں، تھوڑا گھبرایا بھی کہ کافی نام آ گئے ہیں اظہار خیال کے لئے، لیکن اس میں سے کئی تحریریں ہیں جس میں یہ اظہار کیا ہے کہ عرض مسئلہ میں ہماری رائے صحیح طور پر پیش نہیں کی گئی ہے، انشاء اللہ اس کو دیکھ کر کے صحیح کر دیا جائے گا، اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ بہت ہی سنجیدہ ماحول میں اس موضوع پر آپ حضرات نے اظہار خیال کیا اور کر رہے ہیں، اور میں سمجھتا ہوں کہ چونکہ

پوری تیاری آپ نے کی تھی عرض بھی پورا پڑھا آپ نے پہلے سے اور ساتھ میں تلخیصات بھی تفصیل کے ساتھ دی جا چکی ہیں، اس لئے ہمارے شرکاء نے زیادہ بحث کی ضرورت محسوس نہیں کی، اور بہت سے سوالات والے طلباء بھی اس میں شریک ہوئے ہیں مختلف دارالافتاء کے اور مختلف معاہد کے، ان حضرات نے کچھ چیزیں بھیجی ہیں جو ذاتی سوالات ہیں، ظاہر ہے کہ یہ اس کا موقع نہیں ہے کہ ان چیزوں کی یہاں وضاحت کریں، کوئی متعلق چیز ہوتو الگ چیز ہوتی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ میرے پاس ڈاکٹر صاحب تشریف لائیں جو عرشی ہونے کے باوجود انہوں نے فرشی گفتگو کی ہے اور ہماری زبان میں گفتگو کی ہے، تشریف لائیں۔

ڈاکٹر عرشی خان:

کچھ سوالات تھے جن میں آپ نے سوال کیا کنگڈم اور ڈیموکریسی سے متعلق، جس میں آپ نے کہا کہ ہم اسلامی پروسپیکیٹو، یعنی اسلام کا جو شہری قانون ہے اس کی کیا حیثیت ہے جب کنگڈم اور ڈیموکریسی ہے تو پھر کیا ضروری ہے کہ ہم اسلام کے شہری قانون کو نافذ کریں؟ بہت اہم سوال ہے، میرے خیال سے یہاں پر میرا تعلق دنیاوی علوم سے زیادہ ہے، دیکھنے میں میں مفتی لگتا ہوں، لیکن ہوں نہیں بالکل، ہاں، نالج نہیں ہے میرے پاس تعلیم نہیں ہے میرے پاس تو میں کیا کرسکتا ہوں میں جاہل ہی آپ کے سامنے، لیکن دنیاوی تعلیم میں کچھ تھوڑا بہت جانکاری حاصل کی ہے خاص کر میں نے کئی ملکوں کا دورہ کیا ہے زیادہ تر مغربی ممالک کا تو واقف ہوں، ایک بہت بڑے دنیاوی عالم ہیں جن کا نام ہے انٹونی گراسفی، انہوں نے کہا کہ ''سیاسی حلقے میں اپنے وجود کو قائم کرنے کے لئے فکری حلقے میں اپنے وجود کو دکھانا پڑتا ہے''، مطلب انہوں نے پولیٹیکل ہرمونی کو کلچرل ہرمونی سے لنک کیا ہے، ایک میں مثال دے رہا ہوں آپ کو ۱۹۸۰ء کے بعد آپ دیکھئے کہ لگاتار آل انڈیا ریڈیو، دوردرشن کہ انہوں نے طرح طرح کے ایپیسوڈ اور رامائن مہابھارت شروع کردیا، اس کے بعد ۱۹۸۴ء سے بابری مسجد کے خلاف انہوں نے مہم شروع کی، اس سلسلہ میں بہت سارے اسپیکر، بہت سارے ریڈیو پروگرام اور بہت سارے جلسے انہوں نے کئے اور پھر دھیرے دھیرے ان کے لوگ ذرائع ابلاغ میں پھیلتے گئے، جگہ جگہ ان کی بہت سی چیزیں ہوتی رہتی ہیں، وہ جو کلچرل مینیفسٹرل ہے ان کا وہ کہتے ہیں کہ اگر آپ سے یہ نہیں ہوگا تو پولیٹکل میدان میں بھی آپ کی مضبوطی نہیں آئے گی، میرے خیال سے آپ لوگوں کی جو بات میں نے سنی اور جو میں سمجھ پایا، مجھے یہ لگا کہ چاہے کوئی اگری کرے یا نہ کرے آپ سے، پوری دنیا منظور نہ کرے مان لیجئے، لیکن آپ اپنے ذہنی خزانے کو محفوظ رکھے ہوئے ہیں، اس لئے کہ ہمارے پاس یہی ایک سرمایہ بچا ہے جس کو ہم کمبٹ کرسکتے ہیں۔

اسی لئے میں آپ کو بتاؤں کہ اس وقت پوری دنیا میں صرف ذہنی جنگ چل رہی ہے، اس لئے کہ امریکی سیاست کا

میں طالب علم ہوں، آپ دیکھئے کہ ہر جگہ انہوں نے شور برپا کررکھا ہے کہ مسلم ارہاب، مسلم جہاد وغیرہ وغیرہ کیا کیا چیزیں، اور خود ان کا کیا کیا کام ہے وہ میں نہیں کہہ سکتا، لیکن ان کو جو خطرہ ہے مسلمانوں سے وہ بیسکلی اسلام میں جو مضبوطی ہے اس کا جو فکری ٹھوس پن اور مضبوطی ہے اس سے خطرہ ہے، اس لئے میں نہیں سمجھتا ہوں کہ اس کی اہمیت نہیں ہے کہ کنگڈم اور سیکولر نظام میں، بلکہ اس کی اہمیت خود اپنے آپ میں ہے، اور ہوسکتا ہے کہ ایک وقت آئے جب اس کی اہمیت کو دنیا سمجھ لے، اور دوسری چیز ایک سوال تھا کہ جو سیاسی پناہ گزیں ہیں وہ جب کسی مسلم ملک میں جائیں تو وہاں ڈیفریشٹ نہیں کرنا چاہئے وہاں کے عوام ہیں، لیکن جیسا کہ ایک صاحب نے کہا کہ مسلم مما لک میں حالات اور خراب ہیں، خاص کر کے میں آپ کو ایک بات بتاؤں گلف کنٹریز ہیں ان کے اندر ایک شہری جیسے قطر کے جو شہری ہیں وہ بحرین میں جاسکتے ہیں آپس میں آجاسکتے ہیں رہ بھی سکتے ہیں، جس کو ریسی ڈینشیل پرمٹ بولتے ہیں تو اس طرح کی چیزیں پورے یوروپی یونین میں ہے، ۲۸ ممبران کے یونین مما لک ہیں آپس میں ان میں ریسی ڈینشیل پرمٹ ہے جیسے میں اٹلی میں ہوں پروفیسر ہوں اور میں رسیا میں جا کر لیکچر بھی دے رہا ہوں اور رہ بھی رہا ہوں، میرا وہاں بھی گھر ہے یہاں بھی ہے، اس کو ریسی ڈینشیل پرمٹ بولتے ہیں، ریسی ڈینسی جتنا سال رکھنا چاہیں رکھ سکتے ہیں، آپ کی مدت جیسے جرمنی میں ہے آٹھ سال دس سال اور ہندوستان میں بھی ہے بارہ سال چودہ سال تو اگر آپ اس کی مدت پوری کرتے ہیں تو آپ نیشنلائزیشن کے ذریعہ وہاں کے سیٹیزن بن سکتے ہیں، لیکن مسلم مما لک میں جیسا کہ آپ نے کہا کہ مدتیں گزر گئیں اور پیڑھی پیڑھی گذر گئی، لیکن نہیں بن پائے، دیکھئے سب سے امپورٹنٹ چیز ہے، ابھی ابھی اسرائیل پر بات ہوئی، دیکھئے فلسطین پر میں نے کام کیا ۱۹۹۹ء سے، دیکھئے اسرائیل میں اگر کوئی یہودی فلسطین میں کسی مسلم لڑکی سے شادی کرلیتا ہے مان لیجئے تو اسرائیل کے کورٹ نے ہمیشہ کے لئے اس کو شہریت دینے سے انکار کردیا، آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم نہیں لیں گے وہ دینے کو تیار نہیں ہیں، جبکہ ان کا جو قانون ہے ۱۹۵۰ء کا وہ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی یہودی جیسے ہی اسرائیل میں قدم رکھتا ہے وہ وہاں کی شہریت حاصل کرلیتا ہے، خالی یہودی ہونا چاہئے، واحد ملک ہے پوری دنیا میں جہاں پر مذہب کی بنیاد پر شہریت ملتی ہے اور اس میں رہ سکتا ہے، اس لئے آپ دیکھیں کہ پورے اسرائیل میں ۹۰ ملک کے لوگ وہاں پر ہیں اور امریکہ میں ۶۸ کنٹریز کے۔

اور ایک آخری سوال یہ تھا ایک صاحب کانپور سے تھے شاید، زیادہ تر مغربی ملکوں میں لوگ نیشنلٹی کو اور سیٹیزن شپ کو ایک مانتے ہیں، لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود اپنا فریم آپ لوگ رکھیئے یہ امپورٹنٹ ہے، مان لیجئے مجھے اگر کام کرنا ہو تو میں کہاں دیکھوں گا، آپ کی بات کوئی مانے یا نہ مانے وہ سب چھوڑ دیجئے آپ کا فریم ہوگا تبھی کمپیٹیشن ہوگا فریم نہیں ہوگا تو کمپیٹیشن نہیں ہوگا، اور اس میں ضرورت اس بات کی ہے کہ بڑے بڑے جو عالم ہیں جن کو معلومات ہے بڑا نالج ہے قرآن

پاک کا، تو وہ خوب گہرائی سے مطالعہ کر کے اپنی رائے کو پیش کریں، وہ ذرا بھی نہ سوچیں کہ کسی کو پسند آرہی ہے کہ نہیں، اس لئے کہ اب فریم کی بات ہے، ہم نے جو یہاں پر فریم دیا وہ نیشنل فریم ہے، وہ نیشنل اسٹائل کا فریم ہے وہ آپ کے سامنے آ گیا، میرے اسٹائل کا ہی مکان ڈھونڈنا چاہئے جس کو بولتے ہیں پاراڈائم، اسپٹونولوجی، میری اسپٹونولوجی نہیں ہے اور جب تک ہم اس کو ڈیولوپ نہیں کریں گے تو ہماری جو آگے کی نسلیں ہیں وہ کام نہیں کریں گی، مجھے بہت اچھا لگا آپ لوگوں کے بیچ میں۔

مولانا عتیق احمد بستوی:

الحمد للہ مناقشہ اور گفتگو مکمل ہوئی، انشاء اللہ اب اس وقت کچھ کتابوں کا اجراء بھی کرنا ہوگا جس کو یہاں یعنی جامعہ علوم القرآن کے لوگوں نے شائع کیا ہے، اور صدارتی کلمات آپ کو معلوم ہے کہ اس مجلس کی صدارت حضرت مولانا قاری عبد اللہ سلیم صاحب فرما رہے ہیں جو دار العلوم دیوبند کے قدیم استاذ اور سچی بات یہ ہے کہ اس وقت آپ شیکاگو میں ہیں شیکاگو میں آپ کا جو ادارہ ہے معہد تعلیم الاسلام وہ غیر معمولی کارنامہ حضرت قاری صاحب کا ہے یہ سمجھئے کہ یہاں جیسے ہمارے مدارس ہوتے ہیں اسی نہج پر وہاں کے حالات کی رعایت کرتے ہوئے مولانا نے وہاں ادارہ قائم کیا ہے لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے، اور وہاں جا کر دل خوش ہوتا ہے اور لگتا ہے کہ اپنے ماحول میں ہم پہنچ گئے، حضرت مولانا کی صدارت ہے انشاء اللہ ان کا صدارتی خطاب بھی ہوگا اس سے پہلے جو مہمان تشریف لائے ہوئے ہیں موقع غنیمت ہے کہ ہم ان سے استفادہ کریں۔

مولانا عبد اللہ سلیم صاحب شیکاگو (صدارتی کلمارت):

بسم الله الرحمن الرحيم، الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين سيدنا محمدوعلى آله وصحبه أجميعن، أما بعد! میں آج ہی جب عصر کی اذان ہو رہی تھی تب پہنچا صبح پانچ بجے گوہاٹی سے جس ہوٹل میں قیام تھا وہاں سے روانہ ہوا اور ساڑھے تین بجے بڑودہ فلائٹ پہنچی، عصر کی نماز کے بعد یہ حکم ملا کہ مغرب کے بعد جو نشست ہے اس کی صدارت کرنی ہے علاوہ اس کے کہ میں تھکا ہوا اور اپنے اندر وہ بڑی بات ہے کہ قابلیت نہیں ہے، یہاں بڑے بڑے بزرگ اصحاب افتاء اور فقہ کے ماہرین، اسی طرح سے حدیث کے اندر ان کا اونچا مقام ہے ایسے افراد تشریف رکھتے ہوں تو میرے جیسے فرد جس کو طالب علم کہنا بھی مشکل ہے اس کو یہ اہم ذمہ داری دینا میرے لئے ہی بہت ہی حیرت انگیز ہے، اگرچہ اس سے پہلے ہانسوٹ میں فقہ اکیڈمی کا جو سمینار ہوا تھا اور اس کے بعد رامپور میں وہاں بھی مجھے یہ شرف بخشا گیا تھا تو اس کے باوجود میرا تاثر یہی ہے کہ میں اس کا اہل نہیں ہوں۔

بہر حال جو موضوع ہے اس نشست کا وہ تو بہت ہی اہم ہے، بہت نازک ہے، اس میں نہ صرف یہ کہ نصوص شرعیہ

میں گہری بصیرت کی ضرورت ہے، بلکہ جو مروجہ قوانین ہیں ممالک اور بلاد میں ان سے بھی اگر ماہرانہ نہیں تو کماحقہ واقفیت ہونا بھی ضروری ہے، اگران دونوں چیزوں میں سے کسی ایک چیز میں بھی کمی رہی تو کسی نتیجہ تک پہنچنا اور وہ نتیجہ مفید ہو، مشکل ہے، اس سلسلہ میں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ میرے خیال سے شیخ نے اس پر اشارہ بھی کیا ہے کہ جو نصوص ہیں ان میں جو احکام منصوصہ ہیں کون سے ہیں جو ابدی اور دوامی ہیں اور کون سے وہ ہیں جو موقت ہیں، وقتی ہیں، ان میں سے کچھ کا اندازہ تو احادیث سے ہی ہوجاتا ہے کہ یہ وقتی تھے اور یہ ابدی تھے اور کچھ کا اندازہ ہوتا ہے حضرات صحابہ کرام کے طرز عمل سے، مثلاً اس میں جو خلاصہ ہے کہ جو مباحث ہمارے سامنے پڑھ کر بھی سنایا گیا کہ اگر ایک امیر کے ہوتے ہوئے دوسرا امیر کھڑا ہو تو اس کو قتل کردو، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی خلافت کے بعد حضرت امیر معاویہؓ مدعی ہوئے اور ان کا نظام سلطنت قائم ہوا، ان سے جہاد ضرور کیا گیا، لڑائی کی گئی، مگر جو بھی نتیجہ اس کے بعد نکلا سب اپنی اپنی جگہ پر یہ کہئے کہ مطمئن ہوگئے جو امیر معاویہؓ کے ساتھ تھے وہ ادھر رہے جو حضرت علیؓ کے ساتھ تھے وہ ادھر رہے کسی نے اس کے بعد یہ نہیں کہا کہ وہ واجب القتل ہے کہ ایک امام کے ہوتے ہوئے وہ کھڑے ہوگئے ان کا ساتھ دینے والوں سے ہمارا ہمیشہ کا مقاطعہ ہو یہ نہیں ہوا، تو اس کے معنی یہ ہوگئے کہ ایک امیر کے ہوتے ہوئے دوسرا امیر اگر کھڑا ہو تو اس کو قتل کردو شاید صحابہ نے اس میں کسی درجہ میں تاویل کرلی ہوگی یا اس حکم کو موبد نہ سمجھا ہوگا، اس میں بہرحال دیکھنا ہوگا اور بطور نظیر کے اس سے دوسرا مسائل میں بھی مدد لی جاسکتی ہے، اسی طرح جو مقاصد ہیں شریعت کے، احکام ہیں شریعت میں اس میں بھی یہ دیکھا جاتا ہے کہ یہ مقاصد شریعت میں موبدہ ہیں یا موقتہ ہیں، تو یہ چیزیں ہم کو دیکھنی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس وقت کے جو حالات ہیں جس کے بارے میں سوال وجواب میں بھی اور مضمون نگار حضرات نے بھی اس پر بحث کی ہے کہ یہ شہریت کا مسئلہ اور یہ سارے جو مسئلے ہیں یہ بدعت ہے مغربی ملکوں کی اور ان کی سیاست کی دین ہے، لیکن سوال تو یہ ہے کہ اب پوری دنیا اسی کی لپیٹ میں ہے اور ہم اس کو نظر انداز کرکے خالصتا اسلامی نقطہ نظر سے جو ایک مسلمان ملک ہے اس کی رہنمائی کرنے کے واسطے ہم اکٹھے ہوئے ہیں اور ہم جو فیصلہ کریں گے وہ اگر سو فیصد نہیں تو کم سے کم پچاس فیصد تو مانیں گے، مسئلہ یہ نہیں ہے، مسئلہ ہے اس وقت پوری دنیا کا، اب مان لیجئے کہ مثلاً امریکہ ہے، امریکہ میں جو صورت ہے ابھی وہ ہمارے ڈاکٹر صاحب نے بھی ذکر کیا کہ وہاں نیشنلزم، سیٹیزن شپ اور نیچورلائزیشن یہ سب جو ہیں ایک ہی مقصد کے لئے استعمال ہوتے ہیں، حالانکہ لغوی اعتبار سے ان میں کافی فرق ہے، چنانچہ وہاں ایک ادارہ ہے حکومت کا ڈپارٹمنٹ آف مائگریشن اینڈ نیچورلائزیشن تو جو وہاں پناہ گزیں ہوں جن کو گرین کارڈ دیا جاتا ہے بطور سند کے تو وہ ہیں مائگریٹس اور دوسرا ہے نیچورلائزیٹ کے معنی، یعنی جس کی یہاں پیدائش ہوئی ہو یا وہ یہاں آنے کے بعد ایک مدت تک

یہاں ٹھہرا رہا مائگریٹ کے طور پر اور اس کو یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ یہاں کی سیٹیزن شپ لے اور جب سیٹیزن شپ مل جائے گی تو اس کی نیشنلٹی امریکن بن جائے گی، اب یہ مسئلہ ہے وہاں، تو وہ چاہتے یہ ہیں کہ دوسرے ملک بھی اسی کو اختیار کریں، چنانچہ اب جو یہ بات آرہی ہے کہ بھائی یہ خلیجی ملک اور اسلامی ملک ان کی بہت ہی بری حالت ہے اور وہ دوسرے ملکوں کے اور دوسرے ملکوں کے پیدا ہوئے لوگ یہاں آکر بس گئے ہیں اور کئی کئی نسلیں بس گئی ہیں، لیکن ان کو وہ سہولتیں شہریت کی نہیں دی جارہی ہیں مثلاً، کیا مجبوریاں ہیں آخر اس کو دیکھنے کی ضرورت ہے، آج صورت حال یہ ہے کہ جس روز وہ اس بات کو کھول دیں گے کہ عام مسلمان جو بھی آکر رہنا چاہے وہ رہ سکتا ہے اسی وقت مغربی ملکوں کا ان پر دباؤ ہوگا کہ بھائی ہمارے ملکوں کے جو غیر مسلم ہیں ان کو کیسے روک سکتے ہیں، اگر مسلمان ہمارے ملک میں آکر رہنا چاہتے ہیں تو تمہارے ملک میں غیر مسلم جائے گا تو کیسے روک سکتے ہو، ظاہر بات ہے ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ وہ غیر مسلم ہے اور ہم مسلمان ہیں، یہ فلسفہ جو ہے ان کے سامنے تو نہیں پیش کیا جاسکتا، اس لئے پھر ہمارے لئے یعنی مسلمانوں کے لئے ہی مشکل ہوگی کہ وہاں نہ جائیں۔

تیسری بات اس میں یہ بھی دیکھنے کی ہے میرے خیال میں ابھی اس پر بحث نہیں ہوئی وہ یہ ہے کہ کیا کوئی بھی اسلامی ملک اپنے باشندوں کو چاہے وہ کسی بھی بنیاد پر ہو وہ روک سکتا ہے کہ صاحب یہ ملک چھوڑ کر کسی اور ملک میں نہ جائیں، چاہے وہ مسلم ملک ہو یا غیر مسلم ملک، مثلاً فنکار ہیں، ارباب علم ہیں ان کے جانے سے ملک کو نقصان ہو رہا ہے اگر وہ بعض زائد مفادات کے واسطے یا کسی اور وجہ سے دوسرے ملک میں چلے جائیں چاہے وہ اسلامی ملک ہی کیوں نہ ہو، لیکن اس ملک کو تو نقصان پہنچ رہا ہے، اس کے لئے شاید ہم کو اس سے سند مل جائے کہ جب ابتداء میں ہجرت کا حکم تھا کہ اس کے بغیر کسی شخص کو مسلمان یا مومن ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک وہ ہجرت نہ کرلے اور پھر بعد میں کہا گیا کہ **"لا هجرة بعد الفتح"**، یہ کیوں ہوا، کہ فتح مکہ سے پہلے مدینہ طیبہ بطور اسلامی اسٹیٹ قائم ہو رہا تھا ضرورت تھی کہ مسلمان وہاں آئیں، مسلمان اگر نہیں آئیں گے تو ظاہر ہے کہ وہاں جو مملکہ ہے وہ طاقتور نہیں ہوگی اور مضبوط نہیں ہوگی تو اس سے ہم سند لے سکتے ہیں کہ کوئی ملک اپنے ماہرین کو باہر جانے سے روک دے ایسی کوئی صورت ہوسکتی ہے، اسی طرح سے اور ایک مسئلہ یہ بھی اسی واقعہ سے نکالا جاسکتا ہے جو میں نے عرض کیا ہجرت کا، مثال کے طور پر کوئی ایک ملک ہے جس میں آبادی بہت تھوڑی ہے مسلمانوں کی اور مسلم ملک ہے اور وہ چاہتے ہیں کہ صاحب یہاں مائگریشن ہو، تاکہ ہم مسلمانوں کی تعداد یہاں بڑھ جائے اور اگر ہم نے آبادی نہ بڑھائی تو پھر غیر مسلم آئیں گے اور ہم ان کو روک نہ سکیں گے تو یہ وہ چیز ہے جس کے لئے اصل میں ضرورت کے مطابق قوانین بنانے پڑتے ہیں، ابھی مثلاً اسرائیل کی بات آئی تو یہ کوئی اسرائیل ہی کی اختراع تھوڑے ہی ہے، بلکہ مغربی ملکوں نے بھی یہی چاہا کہ ایک یہودی جو دنیا میں کہیں بھی ہو اسرائیل میں اس کی شہریت مان لی جائے، تاکہ یہودی دنیا میں

جہاں بھی ہو سب کھینچ کر یہاں آجائیں تو اس کی ایک مصلحت ہے، تو معلوم ہوا کہ شہریت کا ایک الگ انداز ہے، اسی طرح یہ معلوم ہوا کہ یہودی اور اسرائیلی وہ اسرائیل کا بھی شہری مانا جائے گا اور امریکہ کا بھی شہری مانا جائے گا، ظاہر ہے کہ یہ بالکل الگ نوعیت کی ایک چیز ہوگئی ہے، اس لئے یہ جو سارے مسائل ہیں جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، ہمیں ان کا گہرائی سے مطالعہ اس طرح کرنا ہوگا کہ ان کے پیچھے سیاستیں کیا ہیں اور ان کے کیا اثرات پڑ رہے ہیں؟، ہم کو جو فیصلے کرنے ہیں وہ ان کی سیاستیں اور ان کے اثرات جو ہیں ان کو سامنے رکھ کر کے جس سے کہ مسلمانوں کو دنیا بھر میں نقصان نہ پہنچے، ان چیزوں کو بھی دیکھنا ہوگا، ورنہ یہ مسئلہ کوئی ایسا نہیں ہے کہ جس کو ایک دونشستوں میں حل کیا جائے میری گزارش یہ ہے کہ ایسے مسائل میں یہ مسئلہ اور اس طرح کے اور بھی جو مسائل ہوں ان کو ایک ہی نشست واجلاس میں ختم نہ کیا جائے، بلکہ اس کو پھر جو کانفرنس ہوگی انشاءاللہ آئندہ سال اس میں اس کو ضرور رکھا جائے۔

اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ جتنی بحثیں یہاں پر ہو چکی ہیں ان کو یہیں ختم کیا جائے، مکرر نہ ہو اور پھر نئے سرے سے وہاں بحث شروع ہو جائے اور اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ جن لوگوں نے اب یہاں بحث میں حصہ لیا ہے وہاں ان کو مزید سوچنے سمجھنے کا موقع ملے گا اور اس سے اور راہیں کھلیں گی، دوسری صورت یہ ہے کہ جس طرح سب کی رائیں جمع کی جاتی ہیں اسی طرح ایک کمیٹی بنادی جائے کہ وہ اس پر مزید غور وفکر کر کے اور لوگوں سے رابطہ قائم کر کے اور پھر یکجا مرتب کر دیا جائے ساری چیزوں کو اور پھر آنے والی کانفرنس میں اس کو لایا جائے اور اس پر بحث ہو، ایسے مسائل کا ایک نشست میں اور ایک کانفرس میں حل ہونا مشکل ہے میری یہی گزارش ہے، بہر حال اس مسئلے پر اور زیادہ کچھ میں عرض نہیں کر سکتا، کیونکہ جیسا کہ میں نے کہا کہ مجھ پر تو لفظ طالب علم بھی فٹ نہیں بیٹھتا چہ جائے کہ عالم ہونا، آخر جاہل آدمی کیا بولے گا جتنا بھی میں نے بولا اس کو حکم کی تعمیل ہی سمجھئے اور عشاء کی اذان بھی ہوگئی ہے، اللہ سبحانہ وتعالی اس اجتماع کو قبول فرمائے اور آنے والوں کے آنے کو اور اسی طرح منتظمین کے انتظام کو قبول فرمائے اور اجر عظیم عطا فرمائے اور ہم سب کے علم میں، عمل میں اور حال میں اللہ تعالی خیر وبرکت عطا فرمائے اور ہم سے راضی ہو اور مسلمانوں اور اسلام کو شوکت نصیب ہو، وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین۔

☆☆☆